اُردو

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

جلد ۱۳ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ع | حصہ ۵۲

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

مرحوم دهلی کالج

(۴)

(از اڈیٹر)

کالج کے اساتذہ

پرنسپل

جدید تنظیم کے وقت جب سنہ ۱۸۲۵ ع میں کالج کی صورت قائم ہوئی تو جے - ایچ ٹیلر مجلس مقامی کے ' جو کالج کی انتظامی کمیٹی تھی ' سکرٹری اور کالج کے سکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوے - ابتدا میں ان کا تقرر ۱۷۵ روپے ماہانہ پر ہوا بعد میں تین سو روپے ہو گئے - ان کے ذمے بہت سے دوسرے کام تھے اور کالج پر بہت کم وقت صرف کر سکتے تھے ' لہذا مجلس مقامی نے سنہ ۱۸۳۷ ع میں یہ تجویز کی کہ مسٹر ٹیلر کالج کے پرنسپل مقرر کئے جائیں اور ان کی تنخواہ آٹھ سو روپے ماہانہ قرار دی جاے - گورمنٹ نے اس تجویز کی منظوری کو بعض حالات کی دریافت پر ملتوی رکھا اور کالج یو نہیں چلتا رہا —

سنہ ۱۸۳۹ ع میں جنرل کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج کا ایک پرنسپل مقرر کیا جاے جو اپنا تمام وقت کالج کے فرائض انجام دینے میں صرف کرے اور مشرقی شعبے نیز انگلش انسٹی ٹیوشن کی عام نگرانی کرے اور انگریزی شعبے کی اعلی جماعتوں کو سائنس اور ادب کی اعلی

شاخوں میں تعلیم دے اور اس کے ساتھہ ھی مقامی مجلس کے سکرٹری کی خدمات بھی انجام دے - یہ تجویز منظور ھوی اور سنہ ۱۸۴۱ ع میں مسٹر ایف بٹروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ۶۰۰ روپے ماھانہ پر ھوا —

یہ بہت قابل اور صاحب علم شخص تھے، انھوں نے مشرقی شعبے میں مغربی علوم کی ترویج میں بڑی کوشش کی اور دیسی زبان میں ترجمے کے ذریعہ علم کی اشاعت کے بڑے حامی تھے - چنانچہ دھلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام و ترقی میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا اور یہی اس کے سکرٹری تھے - اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ علوم مفیدہ کا دیسی زبان میں ترجمہ کیا جاے یا کتابیں تالیف کی جائیں - مسٹر بٹروس نے جس مستعدی اور حقیقی سرگرمی اور خلوص سے اس سوسائٹی کے ترقی دینے اور کتابوں کے ترجمے کرانے میں کوشش کی وہ نہایت قابل قدر ھے اور ان کا احسان اردو زبان پر ھمیشہ رھے گا - دھلی کالج میں انھوں نے بہت سی اصلاحیں کیں اور مشرقی شعبے کی تعلیم کو قابل اطمینان حالت میں چھوڑا اور اس کو مغربی علوم کی تعلیم میں انگریزی شعبے کے برابر برابر کر دیا، کمی جو کچھہ تھی وہ صرف کتابوں کی تھی - سنہ ۱۸۴۵ ء میں بوجہ بیماری دو سال کی رخصت لے کر انگلستان چلے گئے - مسٹر بٹروس نے در اصل استعفا داخل کیا تھا اور درخواست یہ کی تھی کہ فی الحال وہ دو سال کے لیے جارھے ھیں، اس اثنا میں اگر ان کی صحت اچھی ھوگئی تو بلا خیال ان کے استعفے کے انھیں ھندوستان آنے پر بحال کردیا جاے - گورمنٹ نے یہ بات منظور کر لی - لیکن افسوس انھیں پھر آنا نصیب نہ ھوا —

ان کی جگہ ڈاکٹر اے سپرنگر، ایم - ڈی اسسٹنٹ سرجن بنگال سروس کا تقرر ھوا اور کالج کو مسٹر بٹروس کا نعم البدل مل گیا —

ڈاکٹر سپرنگر عربی زبان و ادب کے عالم تھے اور اس لیے دلی کے مسلمان شرفا اور اهل علم میں انھوں نے جلد اثر پیدا کرلیا اور شہر میں وہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے - دوسرے' دھلی ورنیکلر سوسائٹی جس نے اردو زبان کے ذریعے مغربی علوم کی اشاعت میں بڑا کام کیا تھا اور مشرقی شعبے کے طلبہ کی تعلیم اور تشویق علم میں بڑی مدد دی تھی' اس کے وہ روح و رواں تھے۔ انھوں نے کالج کی ترقی اور اصلاح میں بڑی مستعدی اور شوق سے کام کیا - نصاب تعلیم میں خاص کر مشرقی شعبے کے نصاب میں معقول اصلاحیں کیں - چنانچہ نصاب کی خاطر تاریخ یمینی کو ایڈٹ کیا اور چھپوایا ' حماسہ اور متنبی کے نسخے بہم پہنچائے اور عربی ادب کے نصاب میں شریک کرائے - انتظامی حالت بھی ان کے زمانے میں بہت اچھی رھی - علاوہ اس کے وہ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکرٹری بھی تھے اور اسی جوش سے کام کر رہے تھے جیسے ان کے پیشرو مسٹر بٹروس —

فروری سنہ ۱۸۴۸ع میں ڈاکٹر صاحب بحکم گورمنٹ آف انڈیا لکھنؤ میں خاص کام پر متعین کئے گئے ۔ وھاں انھیں شاھان اودہ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کا کام تفویض کیا گیا - یہ فہرست ان کی بڑی یادگار ہے اور بڑی قابلیت اور محنت سے تیار کی گئی ہے - ڈاکٹر صاحب کی غیر حاضری میں هیڈ ماسٹر (مسٹر ٹیلر) ان کے قائم مقام هوے —

ڈاکٹر صاحب لکھنؤ میں خاصی مدت تک رہے - وهاں کا کام ختم هو گیا تو چودہ جنوری سنہ ۱۸۵۰ ع کو اپنی اصل خدمت پر عود کیا - لیکن انھیں اپریل سنہ ۱۸۵۰ ع کو بہ وجہ علالت شملہ چلے گئے - اس کے بعد مئی سنہ ۱۸۵۰ ع میں ان کی خدمات بنگال میں منتقل کر دی گئیں تو پرنسپلی کی خدمت پر مسٹر جے کارگل کا تقرر ھوا —

مسٹر کارگل کے چلے جانے کے بعد سنہ ۱۸۵۴ ء میں مسٹر ٹیلر قایم مقام پرنسپل ہوگئے۔ یہ بہت پرانے استاد تھے اور ابتدا سے ان کا تعلق کالج سے چلا آرھا تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ ء کی شورش میں یہی پرنسپل تھے اور جس بے کسی کی حالت میں وہ مارے گئے اس کا ذکر اس سے قبل ھوچکا ھے۔ ان کے قتل کا سب کو رنج تھا' خاص کر ان کے طالب علموں کو بہت صدمہ ھوا۔

مسٹر ٹیلر نے دلی کالج میں تیس برس تک ھیڈ ماسٹری کی اور دو تین سال تک پرنسپل رھے۔ وہ طلبہ پر پدرانہ شفقت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب میری اولاد ھیں اور ان سے بہتر اولاد ھو نہیں سکتی' کیونکہ یہ سب صاحب لیاقت نیک سیرت اور نیک اطوار ھیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ کا طلبہ پر بہت گہرا اثر تھا۔ وہ ان سے سچی محبت کرتے تھے۔ بعض (ھندو) طلبہ نے تو ان کے اخلاق سے متاثر ھوکر اپنا مذھب تک بدل دیا۔

ناظم صاحب تعلیمات ممالک مغربی شمالی نے مسٹر ٹیلر کی وفات پر مفصلۂ ذیل الفاظ لکھے۔

" میں مسٹر ٹیلر کی بیش بہا کار گزاری کی تصدیق کرتا ھوں۔ گورمنٹ کے کسی محکمے میں ان سے زیادہ صادق اور قابل قدر کوئی شخص نہ تھا۔ ان کے طویل قیام دھلی اور طلبہ سے گہری واقفیت نیز اس ادب و احترام کی وجہ سے جو دھلی والے ان کا کرتے تھے اور بوجہ اس اثر کے جو وہ کالج کے ھندوستانی اساتذہ پر رکھتے تھے' انھوں نے بہت سی اصلاحیں بغیر کسی مخالفت کے جاری کیں اور کالج کو بڑی

ترقی کے درجے تک پہنچا یا —

جب کالج سنہ ۱۸۶۴ع میں پھر کُھلا تو مسٹر ایڈمنڈ ولمٹ بی - اے ' ترنٹی کالج - کیمبرج انگلستان سے آے اور پرنسپلی کی خدمت پر فائز ہوے۔ لیکن تھوڑے ھی دن ھوے تھے کہ ان پر ایک ایسا حادثہ گزرا کہ کالج ان کی خدمات سے محروم ھوگیا اور ان کی ملازمت کا بہت سا حصہ بیماری میں کٹا - وہ ریاضی کے بڑے عالم تھے اور کالج کے درجوں اور انٹرینس کی جماعت کو ریاضی پڑھاتے تھے - علاوہ اس کے وہ اردو اور عربی سے انگریزی ترجمے کی بھی تصحیح کرتے تھے —

مسٹر بٹروس ' داکٹر سپرنگر اور مسٹر ٹیلر یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ھیں کہ انھوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی - طلبہ اور اساتذہ پر ان کا بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی ان کا ادب کرتے تھے - خاص کر مشرقی شعبے کی اصلاح اور اُردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بٹروس اور ڈاکٹر سپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر ھے —

انگریز اساتذہ میں پروفیسر ایلس بھی خاص طور پر قابل ذکر ھیں - وہ انگریزی ادب کے بڑے فاضل مانے جاتے تھے اور ان کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ھوا تھا - پرنسپل ان دو پروفیسروں کی جان سمجھتے تھے اور بے حد تعریف کرتے تھے - طلبہ سے ان کا ایسا اچھا برتاو تھا کہ وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے ' لیکن انھیں شراب کی ایسی دھت لگ گئی کہ اس نے بالکل تباہ کردیا - کچھ دنوں انھوں نے مسٹر ولمٹ کے جانے کے بعد پرنسپلی بھی کی - لیکن ان کی ھر وقت کی شراب نوشی کا یہ نتیجہ ھوا کہ کئی بار تنزل ھوا اور آخر پروفیسری سے سیکنڈ ماسٹر کر دئے گئے - لیکن اس حالت

میں بھی کالج کی جماعتیں درس کے لیے انھیں کے پاس بھیجی جاتی تھیں —

مشرقی شعبہ کے بعض اساتذہ

عربی کے صدر مدرس مولوی مملوک علی بڑے جیّد عالم تھے اور شہر ھی میں نہیں بلکہ دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی - مولوی کریم الدین اپنی کتاب طبقات الشعرا ے ھند میں لکھتے ھیں کہ " مدرس اول مدرسۂ دھلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ھیں - عہدۂ میر مولوی بمشاھرہ سو روپیہ ماھواری مدرسہ میں مقرر ھیں - حق یہ ھے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاھئے ویسی نہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ھوتے ھیں اور واقع میں بنائے مدرسۂ عربی ان کی ذات سے مستحکم ھے - فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ھیں - ھر ایک علم و فن سے جو ان زبانوں میں ھیں، مہارت تامہ اُن کو حاصل ھے - اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ھوتی ھے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذھن چسپاں ھوجاتا ھے گویا اس فن کو اول ھی سے جانتے تھے - اور جس کار پر مامور ھیں اُس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ھوا - مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ھوا ھے کہ شاید کبھی کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ھوا ھو - بندہ کے زعم میں یہ ھے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اُٹھایا ھوگا - اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ھے - کوئی کتاب کسی فن کی مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھادیں گے گویا اس کو حفظ کر رکھی ھے - اس لیے رات دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طالبا پڑے رھتے ھیں، ھر وقت ان کو گھیرے رھتے ھیں - اور وہ خلیق اس طرح کے ھیں کہ کسی سے انکار نہیں کرسکتے، سب کو پڑھاتے ھیں.......... عمر ان کی

سنہ ۱۸۴۷ ع میں ساتھہ برس کی ھوگی - بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ھیں - تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارھویں اور بارھویں کا کیا ھے - حق یہ ھے کہ علم ھندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ھے - اصل وطن ان کا نانوتہ ھے مدت سے شاھجہاں آباد میں رھتے ھیں " - مولوی صاحب نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا —

مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے - مصنف اور شاعر بھی تھے - ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں - ان کی بعض تصانیف اب تک پڑھی جاتی ھیں - شہر میں ان کی بڑی عزت تھی - علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی ' جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ھیں - حدائق البلاغت (تصنیف شمس الدین) کا ترجمہ اردو میں کیا - شعراے اردو کا انتخاب بھی تیار کیا تھا جو اسی زمانے میں طبع ھوکر شایع ھوا —

ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ھے - سنہ ۱۸۴۰ ع میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹننٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ھونا چاھئے - مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ ھمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ھیں - ایک مرزا نوشہ ' دوسرے حکیم مومن خاں ' تیسرے امام بخش صہبائی - لفٹننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا - مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے ' انھوں نے تو انکار کردیا - مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپیہ ماھانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا - مولوی امام بخش

کا کوئی ذریعۂ معاش نه تها انهوں نے یه خدمت چالیس روپیه ماهانه کی قبول کرلی - بعد میں پچاس هوگئے —

مولوی سبحان بخش جن کی کتاب " محاورات هند " مشهور هے اور کئی بار چهپ چکی هے، دلی کالج کے قابل اور کار گزار مدرس تهے - پرنسپل نے اپنی رپوٹوں میں جا بجا ان کی تعریف کی هے - وفیات اعیان ترجمۂ تاریخ ابن خلکان انهیں کا کیا هوا هے - تزک تیموری کا ترجمه بهی اردو میں کیا - اس کے علاوه ایک تذکرۂ مفسرین اور ایک تذکرۂ حکما بهی لکها —

ماسٹر وزیر علی اور ماسٹر امیر علی بهی دهلی کالج کے قابل اور مشهور اساتذه میں سے تهے —

ماسٹر رام چندر کالج هی کے ایک ممتاز طالب علم تهے جو بعد میں سائنس کے ماسٹر هوگئے اور اب تک ماسٹر رام چندر هی کے نام سے مشهور هیں - رپوٹوں میں ان کی کارگزاری کی بہت تعریف کی گئی هے - ریاضی کے بڑے استاد تهے - اس علم میں ان کی تصانیف بهی هیں - سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دیتے تهے اور طلبه ان سے بے حد خوش تهے اور بڑی محنت کرتے تهے - ان کا ذکر قدیم طلبه کے ضمن میں تفصیل سے کیا جائے گا —

ضیاءالدین بهی (جو بعد میں شمس العلما ڈاکٹر ضیاءالدین هوے) اسی کالج کے طالب علم تهے - سنه ۱۸۶۴ ع میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی کی خدمت پر مقرر کیے گئے اور بعد میں پروفیسر هوگئے —

ماسٹر پیارے لال بهی کالج هی کے طالب علم تهے اور ابتدا میں یهیں مدرس هوے - ان کی کار گزاری کی بهی تعریف کی گئی هے - ان کے مفصل حالات قدیم طلبه کے تحت میں بیان کئے جائیں گے —

بهیروں پرشاد بهی یہیں کے طالب علم تھے جو بی ۔ اے میں تمام یونیورسٹی میں اول آے تھے ' اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر هوگئے —

مولوی ذکاءالله بهی یہاں کے طالب علم اور سینیر پرسیں اس کالج تھے ۔ انهوں نے بهی ابتدا میں دهلی کالج هی میں بیس روپے ماهانه پر مہندس کی خدمت قبول کرلی تهی —

مولوی احمد علی دهلی کے رهنے والے تھے ' مدرسهٔ دهلی میں مبتدیوں کو فارسی پڑهاتے تھے ۔ قواعد اردو مسمی به " چشمهٔ فیض " انهیں کی تالیف هے —

میر اشرف علی مدرسه میں ملسی تھے اور بہت قابل مدرس تھے ۔ تاریخ کشمیر کا فارسی سے اردو میں ترجمه کیا ۔ رسالهٔ اصول حساب کی تالیف میں رامو هردیو سنگهه کو مدد دی اور بریف سروے آف هسٹری کے اردو ترجمے کی اصلاح کی ۔ مولوی کریم الدین نے اُن کے اخلاق اور لیاقت کی بہت تعریف لکهی هے —

پنڈت رام کشن دهلوی بهی اسی مدرسه میں مدرس تھے انگریزی اور فارسی میں بہت اچهی قابلیت تهی اور اردو بهی خوب لکهتے تھے ۔ ایک رساله علم طب میں انگریزی سے ترجمه کیا اور اصول قوانین دیوانی و فوجداری ' اصول قانون مالگذاری ' اصول قوانین گورنمنٹ ' سیراسلام کے چوتھے باب اور میکناٹن کے اصول دهرم شاستر کا ترجمه کیا ۔ قواعد صرف و نحو انگریزی ڈاکٹر اس پر نگر کی مدد سے اردو میں تالیف کی ۔ اور ایک کتاب فن زراعت پر " مزید الاموال باصلاح الاحوال " کے نام سے لکهی —

ماسٹر حسینی مدرسه میں بچوں کی تعلیم پر مقرر تھے ۔ تاریخ مغلیه کا ترجمه اردو میں کیا ۔ تاریخ ایران (مولفهٔ دو ندر) کا اردو ترجمه

بھی انھیں کا ھے۔ علاوہ ان کے میکناتن کی شرح شریف ' قانون محمدی فوجداری (مولفۂ میکناتن)' قانون وراثت اسلامی (موافقہ میکناتن) ' سکیپ وتھہ کے خلاصۂ قانون دیوانی' قانون فوجداری کے ترجمے انھیں کے قلم کے ممنون ھیں—

ھر دیو سنگھ منشی گری کی خدمت پر مامور تھے۔ بہت معقول ' ھوشیار اور خلیق شخص تھے۔ رسالۂ پیمائش (دو حصوں میں) انھیں کی تالیف ھے جو بعد اصلاح مولوی قادر علی طبع ھوا - پروفیسر ڈیمورگن کی کتاب اصول حساب کا ترجمہ اردو میں کیا جس کی اصلاح منشی اشرف علی نے کی اور سوسائٹی نے طبع کرایا —

ماسٹر نور محمد تحتانی جماعتوں کے مدرس تھے۔ انھوں نے تاریخ بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا - تاریخ مغلیہ کے ترجمے میں ماسٹر حسینی بھی شریک تھے —

مولوی حسن علی خاں فارسی کے مدرس تھے ' بہت قابل اور ھوشیار شخص تھے - قانون مال' گلستان سعدی اور الف لیلہ (منتخب) کا ترجمہ اردو میں کیا - اور پرنسپل صاحب کی فرمائش سے کرۂ ارضی کا بھی ترجمہ کیا - یہ سب کتابیں سوسائٹی نے طبع کرائیں —

کالج کے بعض قدیم طالب علم

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ھے ' اسی طرح انسان اپنے کرموں سے اور ایک ادارہ اپنے کاموں سے جانچا جاتا ھے۔ دلی کالج کا پھل اس کے وہ سپوت ھیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے اور جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں مشتعل تھا اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا - علم کے وہ پجاری آج ھماری زبان کے دیوتا ھیں -

اُن کے نام اردو زبان کی تاریخ میں روشن ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں
جن کی جگمگاہٹ کبھی کم نہ ہوگی۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب دلی کالج
نیا نیا قایم ہوا تھا اور دلی کے شریف مگر غریب گھرانوں کے بھولے
بھالے بچے جنھوں نے قدیم خیالات اور اخلاق اور آخری زمانے کے زوال یافتہ
ماحول میں پرورش پائی تھی، جوق جوق اس سرچشمۂ علم کے کنارے جمع
ہو رہے تھے۔ وہ زمانے کی نیرنگیوں سے بے خبر اور اس دور کے انقلاب سے
جو سروں پر منڈلا رہا تھا نچنت اپنے شفیق استادوں کی زیر نگرانی ایک
نئے مطالعے میں مصروف تھے۔ کلی کے کھلنے کی ایک آن ہوتی ہے جس میں
وہ پھول بن جاتی اور اپنی معصومیت کو کھو کر زندگی کی نئی منزل میں
جا پہنچتی ہے۔ لڑکپن سے نکل کر شباب کی سرحد میں پہنچنے کا ایک
خاص وقت ہوتا ہے جب کہ بھولے پن کو خیر باد کہہ کر انسان کشمکش حیات
کے ایک عجیب وغریب عالم میں جا پہنچتا ہے۔ یہی وقت ایک شوقین
طالب علم پر گزرتا ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی کتابوں کے ورق
لوٹنے میں مصروف ہے، کہ اسی الٹ پلٹ میں دفعتاً اس کے دل کا قفل کھلتا
ہے اور وہ اپنے سینے کو ایک نئی روشنی سے معمور اور اپنے آپ کو ایک
نئے عالم میں پاتا ہے۔ یہ ایک عجیب وقت ہے جس کی کیفیت بیان کرنے
سے زبان قاصر اور مصور کا قلم عاجز ہے۔ دلی کا لڑکا جس نے گھر کی
چار دیواری اور پرانی روایتوں اور قصوں میں پرورش پائی ہے، بغدادی
قاعدہ، قرآن کی دوچار سورتیں یا ایک آدھ مذہبی رسالہ یا زیادہ سے زیادہ
کریما مامقیماں پڑھ کر اس قصر میں قدم رکھتا ہے جہاں زمانے کے بعض
نباضوں نے آدم گری کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہاں جاکر وہ نئی صورتیں،
نیا رنگ، نئی بات چیت دیکھتا ہے: اول اول ڈرتا، گھبراتا، جھجکتا اور

جھینپتا ہے اور پھر کچھ دنوں بعد یہی بھیانک مقام اس کا گہوارا ہو جاتا ہے - اب ایک وقت آتا ہے جب کہ مغربی علوم کی صدا اس کے کانوں میں اپنی کم زور مگر شیریں زبان کے ذریعے سے پہنچتی ہے- وہ جدید ہیئت کی کہانی سنتا اور علوم طبیعیات کے تجربے دیکھتا ہے - اس کے دل میں ولولہ، اور دماغ میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اور پرانی روایتوں کی بنیاد متزلزل ہوتی ہے، اس کا شوق اور بڑھتا ہے اور لکچر کا ایک ایک لفظ کانوں سے سنتا نہیں، پیتا ہے، اس کی نظریں طبیعیات کے تجربے میں اس طرح گڑی ہوئی ہیں کہ گویا وہ اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا - اس کا انہماک اسے ایک اور ہی عالم میں لے جاتا ہے، اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے، دل اُمنگوں سے چھلکنے لگتا ہے، آنکھوں میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے جو چاند تاروں میں نظر آتی ہے نہ سورج میں - وہ روحانی مسرت ہے - کولمبس کو امریکہ پاکر وہ خوشی نہوی ہوگی جو اس طالب علم کو یہ نئی دنیا پاکر ہوی ہے - پہلے وہ طالب علم تھا اب عاشق ہے - پہلے وہ لیلیٰ تھا اب مجنوں ہے - یہی عشق، یہی جنوں اُسے وہاں تک لے جائے گا جسے منزل مقصود کہتے ہیں- وہ کالج سے چل کر گھرجاتا ہے، اس کے قدم بڑتے ہیں لیکن اُسے کچھ معلوم نہیں کہ کہاں جارہا ہے، بازار میں بھیڑ لگی ہوئی ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے، گھوڑے گاڑیاں، پالکیاں آرہی جارہی ہیں، شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، لیکن اس پر نہ دھکا پیل کا کچھ اثر ہے نہ لوگوں کے شور و غل کا - وہ نہ کچھ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے - اس کی آنکھوں میں وہی سماں چھارہا ہے جو اس نے کالج میں دیکھا تھا، اس کے کانوں میں وہی آواز گونج رہی ہے جو اس نے کالج میں سنی تھی - وہ

گھر پہنچتا ہے اور نہایت بے تابی اور شوق سے اپنے بزرگوں کے سامنے سائنس کے عجائبات اور تجربے بیان کرتا ہے اور باغ باغ ہوا جاتا ہے - اس کے ماں باپ اس کی انوکھی باتیں سن سن کر سہمے جاتے ہیں اور دل ہی دل میں کہتے ہیں خدا خیر کرے اس کے لچھن تو اچھے نہیں معلوم ہوتے - اسے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ اس نے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے - وہ اپنے حال میں مگن ہے وہ اس عالم میں نہیں ' کہیں اور ہے - یہ تھی پہلی کرن آفتاب علم کی جس نے بھولے طالب علم کے صاف دل کو منور کردیا - یہ وہی نور ہے جو ہم تک پہنچا ہے اور پشت ہا پشت تک پہنچتا رہے گا -

اب میں انہیں چند سپوتوں کا مختصر سا ذکر کرنا چاہتا ہوں - ان کے نام ہی اس بات کے سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ دلی کالج کیا چیز تھا اور اس نے کیا کام کیا - ماسٹر رام چندر ' شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد ' شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد ' شمس العلما مولوی محمد ذکاءالله ' شمس العلما ڈاکٹر ضیاءالدین یہ ایسے مشہور و معروف بزرگ ہیں کہ ان کے حالات بیان کرنا فضول ہیں - اردو داں لوگ ان کے حالات اور ان کے کارناموں سے بہت کچھ واقف ہیں - ہماری زبان پر ان کے ایسے احسانات ہیں کہ ہم کبھی بھول نہیں سکتے - مولوی نذیر احمد ' مولوی محمد حسین آزاد وہ لوگ ہیں جن کی تصانیف اردو زبان میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی - مولوی ذکاءالله نے ریاضی کی تمام شاخوں پر ادنی سے اعلی درجے تک نیز تاریخ ' جغرافیہ ' اخلاق ' طبیعیات وغیرہ پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں جو بجاے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہیں - مولوی ضیاءالدین بھی ایک بڑے عالم تھے اور کالج میں عربی پروفیسر ہوگئے تھے ' افسوس کہ ان کی یادگار سواے رسوم ہند کے پہلے حصے کے

کوئی اور نہیں پائی جاتی ہے - لیکن اس میں بھی استاد کا کمال کہیں کہیں ضرور نظر آتا ہے - ماسٹر رام چندر ان سب میں سینیر اور قابل شخص تھے - ریاضی اور سائنس کے بڑے استاد تھے اور ریاضی کے فن میں بڑا نام پایا - افسوس لوگ انہیں بھولتے جاتے ہیں اس لیے میں یہاں ان کا مختصر سا ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں - ایک بات عجیب یہ ہے کہ ان سب حضرات نے نیز دیگر قدیم طلبہ نے تعلیم کے بعد زندگی مدرسی سے شروع کی - بہت سے آخر تک مدرس رہے اور بعض جو مدرسے دوسرے مدارج پر پہنچے وہ اگرچہ مدرس تو نہ رہے مگر عمر بھر معلم رہے اور اپنی تعلیم سے اہل وطن کو فائدہ پہنچایا کیے - یہ سب کالج کے سینیر اسکالر تھے - لیاقت کا وظیفہ پاتے تھے - مضمون نویسی میں ان سب نے انعام اور تمغے پائے اور پرنسپلوں کی رپوٹوں میں ان کی بڑی تعریف پائی جاتی ہے —

اب میں ماسٹر رام چندر کا تھوڑا سا حال بیان کرتا ہوں —

ماسٹر رام چندر سنہ ۱۸۲۱ ع میں پانی پت میں پیدا ہوے - ان کے باپ سندر لال دہلی کے باشندے اور کائستھ تھے اور دہلی میں نائب تحصیل داری اور تحصیل داری کی خدمتوں پر رہے - پانی پت اس وقت مستقر ضلع تھا —

سندر لال دفعتاً بیمار ہوئے اور سنہ ۱۸۳۱ ع میں انتقال کرگئے - ایک بیوہ اور چھ بیٹے چھوڑے ' جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا - رام چندر کی عمر اس وقت نو سال کی تھی - ماں نے پالا پوسا اور ابتدائی تعلیم دلائی - شروع میں انھوں نے مکتب میں تعلیم پائی پھر سنہ ۱۸۳۳ ع میں انگلش اسکول میں داخل ہو گئے - اس وقت ہر طالب علم کو

دو روپیہ سہینہ دیا جاتا تھا اور درجۂ اول و دوم کے تمام طالب علموں کو پانچ روپے ماھانہ وظیفہ ملا کرتا تھا - رام چندر بچپن ھی سے لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے - اس مدرسے میں چھہ سال رھے اور خوب دل لگا کر پڑھا —

ابھی ان کی عمر گیارہ ھی برس کی ھوگی کہ رواج کے مطابق شادی ھوگئی - شادی ایک خوش حال کائستھہ خاندان میں ھوئی تھی ' لیکن لڑکی گونگی بہری تھی - شاید روپے کے لالچ میں (جیسا کہ ھمارے ھاں اکثر ھوتا ھے) یہ عقد کر دیا گیا —

فکر معاش کی خاطر تعلیم چھوڑ کر محرری کی خدمت کرلی - اس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کی تھی - دو تین سال نوکر رھے - سنہ ۱۸۴۱ ع میں جب دلی کا مدرسہ کالج ھوگیا تو وہ پھر اس میں داخل ھوگئے - دو تین سال جو تعلیم چھٹ گئی تھی تو انھیں بہت زیادہ محنت کرنی پڑی - انھوں نے سینیر وظیفے کے مقابلے کی کوشش کی ' یہ وظیفہ تیس روپے ماھانہ کا تھا ' مقابلے کے امتحان میں کامیاب ھوے - ان کے بھائیوں کو بھی وظیفہ ملتا تھا - اس سے خاندان کی گذر ھوئی چلی جاتی تھی اور انھیں اس طرح سے قدرے بے فکری ھوگئی تھی —

رام چندر تین سال تک ھر امتحان میں کامیاب ھوتے رھے - اٹھائیس فروری سنہ ۱۸۴۴ ع میں کالج کے شعبۂ مشرقی میں پچاس روپے مشاھرہ پر یوروپین سائنس کے مدرس ھوگئے - اس زمانے میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ھوئی تھی ' انھوں نے اس کے لیے اردو میں الجبرا اور علم مثلث (Trigonometry) پر کتابیں لکھیں - یہ کتابیں نصاب تعلیم کے کام آئیں ' جن سے مشرقی شعبے کے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا —

اسی زمانے میں ماسٹر رام چندر نے ایک ماہانہ رسالہ فوائدالناظرین کے نام سے نکالا جو بعد میں مہینے میں دو بار نکلنے لگا - اس میں اکثر علمی بحثیں ہوتی تھیں - ان نئے خیالات کو پڑھ کر لوگ ان کو بد مذہب اور ملحد کہتے تھے —

اس رسالے کے علاوہ انھوں نے ایک اور رسالہ " محب ہند " کے نام سے شایع کیا، لیکن اپنے شہر اور ملک والوں سے انھیں کچھہ مدد نہ ملی - البتہ انگریز افسروں نے امداد کی مثلاً سرجان لارنس جو اس وقت دہلی میں میجسٹریٹ تھے، ڈاکٹر راس (سول سرجن) ، مسٹر گبن (جج دہلی) ان رسالوں کے متعدد نسخے خریدتے تھے جس سے طبع کا خرچ نکل آتا تھا - لیکن حالات کچھہ ایسے بدل گئے کہ یہ رسالے بند کرنے پڑے اور پانچ سال چلانے کے بعد سنہ ۱۸۵۲ ع میں ان دونوں کا خاتمہ ہو گیا —

یہ بہت اچھے مدرس تھے اور اپنے شاگردوں پر بہت شفقت کرتے تھے اور بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے، انھوں نے محنت کر کے اس زمانے میں مشرقی زبانوں اور خاص کر عربی میں معقول استعداد پیدا کرلی تھی -

ماسٹر رام چندر کو ریاضی سے خاص لگاؤ تھا اور انھوں نے اپنے مطالعہ سے اس میں بہت کچھہ ترقی کرلی تھی - شروع میں ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے کئے- اس سے ان کا ذوق اور بڑھ گیا - ان میں ایک ان کا جبر و مقابلہ ھے جو اس فن کی انگریزی کتابوں کی مدد سے تالیف کیا اور سوسائٹی نے طبع کرایا - اس کے علاوہ ایک رسالہ اصول علم مثلث بالجبر اور تراشہاے مخروطی میں اور علم ہندسہ بالجبر میں لکھا - سنہ ۱۸۵۰ ع میں جبکہ وہ مغربی سائنس کے مدرس تھے اور فوائدالناظرین نکالتے تھے انھوں نے اپنی کتاب کلیات و جزئیات (Maxima & Minima) شایع کی —

یہ کتاب کلکتہ میں چھپی - کلکتہ کے اخباروں اور رسالوں اور خاص کر کلکتہ ریویو نے اس پر مخالفانہ تنقید کی جس سے ماسٹر صاحب کو بہت مایوسی ہوئی —

سنہ ۱۸۵۱ ع کی تعطیلوں میں یہ کلکتہ گئے اور وہاں بعض دوستوں نے کلکتہ ریویو کی تنقید کا جواب لکھنے کا مشورہ دیا - انہوں نے جواب لکھا جو انگلش مین میں چھپا —

کلکتہ میں دھلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے اُنھیں آنریبل ڈی بیتھیوں (D. Bethune) ممبر سو پریم کونسل و پریزیڈنٹ لا کونسل و کونسل آف ایجوکیشن سے ملایا - انہوں نے ماسٹر صاحب سے ان کی کتاب کا ایک نسخہ طلب کیا اور ۵و سو روپے پیش کئے —

ماسٹر صاحب نے یہ کتاب اپنے خرچ سے چھپوائی تھی جس کے لیے انھیں بہت تردد اور فکر کرنا پڑا اور قرض لینا پڑا - مسٹر بیتھیوں نے ان کی کتاب کے نسخے انگلستان میں متعدد اصحاب کے نام بھیجے جن میں سے ایک پروفیسر ڈی مارگن (A. De Morgan) ایف - آر - ایس' ایف - سی - پی - ایس. آف ٹرنٹی کالج کیمبرج' پروفیسر ریاضیات لندن یونیورسٹی تھے- پروفیسر مارگن نے اس کتاب کی بہت قدر کی اور کورٹ آف ڈائرکٹرز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور (۲۴ جولائی سنہ ۱۸۵۶ ع کو) ان کے چیرمین کرنل سائیکس کو ایک خط اس بارے میں لکھا جو لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کو بھیج دیا گیا - پروفیسر موصوف نے اس خط میں ماسٹر رام چندر کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی تھی اور یہاں تک لکھا تھا کہ رام چندر کی کتاب کے انتخابات اس ملک (انگلستان) کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شریک کئے جائیں - غرض ایک مدت کی باھمی مراسلت کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز کے معزز ممبروں نے ایک

خلعت پنج پارچہ اور دو ھزار روپیہ نقد بطور انعام ماسٹر رام چندر کے لیے منظور کیا - سنہ ۱۸۵۹ ع میں مسٹر ولیم ڈی آرنالڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے دھلی میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور وھاں کے تمام امرا و شرفا اور عہدہ داروں کو اس شرکت کی دعوت دی۔ اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ " فضیلت پناہ ' ماسٹر رام چندر کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات حسنہ پر سرکار کی طرف سے خلعت عطا کیا جاے - چنانچہ یہ خلعت اور رقم اس جلسے میں ماسٹر صاحب کو عطا کی گئی ھے - اس کے علاوہ ماسٹر صاحب نے ایک اور کتاب شایع کی جس میں تفرقی احصا (Differential Calculus) کا ایک نیا طریقہ بیان کیا۔ اس پر پروفیسر کلانڈ (اڈنبرا یونیورسٹی) اور پروفیسر فشر (سینٹ اینڈریوس) نے بہت اچھی راے کا اظہار کیا - ان کتابوں کے شایع ھونے سے ماسٹر رام چندر کی شہرت بڑھ گئی اور ان کے ایجاد کردہ طریقے یورپ اور ھندوستان کے کالجوں میں رائج ھو گئے —

غدر کے زمانے میں جو مصیبت ان پر نازل ھوئی اس کا سر سری ذکر پہلے آ چکا ھے - جنوری سنہ ۱۸۵۸ ع میں وہ نیٹو ھیڈ ماسٹر ٹامسن سول انجنیرنگ کالج کے مقرر ھوے - ستمبر ۱۸۸۵ ع میں دھلی ڈسٹرکٹ اسکول کے ھیڈ ماسٹر ھو گئے —

لیکن اس کے کچھہ عرصے کے بعد ان کی صحت میں فرق آ گیا اور انھوں نے ۲۴ مئی سنہ ۱۸۶۲ ع کو علمی پنشن کی درخواست کی ۔ غرض ایک طویل مراسلت اور واقعات و قواعد کی چھان بین کے بعد ایک سو پچیس روپیہ ماھانہ کی پنشن منظور ھوئی - اس کے بعد وہ پٹیالہ میں ناظم تعلیمات ھو گئے - وھاں سے بھی اسی قدر پنشن ملی —

عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد ان کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا تھا۔ اس جھمیلے میں پڑ کر انہوں نے مذہبی بحث مباحثے کی کتابیں لکھنی شروع کردی تھیں جو ان کے شان کے شایاں نہیں تھیں۔ وفات سنہ ۱۸۸۰ ع میں ہوئی —

میں نے ماسٹر رام چندر کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ انہوں نے شروع سے آخر تک دھلی کالج میں تعلیم پائی تھی اور اس کالج کے طلبہ کے صحیح نمائندے تھے۔ وہ بہت سادہ مزاج تھے اور سادہ ہندوستانی کپڑے پہنتے تھے اور لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔

ان کے علاوہ اس کالج کے اور بھی بہت سے ایسے طالب علم ہیں جنہوں نے کالج میں اور کالج چھوڑنے کے بعد جہاں رہے امتیاز اور اعزاز حاصل کیا۔ چند صاحبوں کے نام اور مختصر حالات یہاں لکھے جاتے ہیں —

مسٹر پتمبر بھی کالج کے قابل طلبہ میں سے تھے۔ ماسٹر رام چندر کے ہم جماعت اور سینیر اسکالر شپ پاتے تھے۔ کالج سے سنہ ۱۸۴۵ ع میں انجینیری کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ یہ پہلے دیسی سول انجینیر تھے جو دھلی میں مقرر ہوے —

موتی لال دھلوی (کشمیری پنڈت) کالج کے نہایت ممتاز طلبہ میں سے تھے۔ انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ انگریزی مضمون نویسی میں گبنز اور مرتی متکات کے میڈل حاصل کیے (سنہ ۱۸۴۹ و ۵۰ ع)۔ کالج میں سینیر اسکالرشپ پاتے تھے۔ ان کے وظیفے کی توسیع کے لیے گورنمنٹ میں سفارش کی گئی تو منظوری دیتے وقت خصوصیت کے ساتھ اُن کے متعلق یہ الفاظ لکھے گئے تھے کہ وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ہے کیونکہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی

هے اور اپنی فرصت کا وقت ترجمه کرنے اور اُردو رسالوں کے ادت (مرتب) کرنے میں صرف کرتا هے - ختم تعلیم پر سنه ۱۸۵۰ میں بورڈ آف ایڈ منسٹریشن لاهور کے فارسی مترجم هو گئے تھے - کئی سال پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی رهے - حکام بالا دست اور گورنمنٹ کی نظروں میں بہت اعتبار تھا - پھر اکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ جج هو گئے تھے - اس آخری عہدے سے پنشن پائی اور گجرات (پنجاب) میں قیام پذیر هو گئے - لاهور میں باسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا —

اگرچه یه ایسے محکمے میں چلے گئے تھے جہاں تعلیم و تعلم کا چرچا نه تھا لیکن ان کا علمی شوق همیشه قائم رها - پلوٹارک کے تذکرۂ سسرو کا ترجمه اردو میں کیا جو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرف سے شایع هوا - طالب علمی کے زمانے میں ایک تذکرۂ شعرا لکھا تھا - تعلیم نسواں اور صغر سنی کی شادی پر انگریزی میں دو رسالے لکھے - دو کتابیں مسمرزم کے موضوع پر انگریزی سے اُردو میں ترجمه کیں - اُردو فارسی میں بھی بڑی دستگاہ تھی' بسمل تخلص کرتے تھے - یه اُن لوگوں میں سے هیں جن پر دهلی کالج کو فخر هے -

بھیروں پرشاد بھی بڑے قابل طالب علم تھے - کالج کی رپوٹوں میں جا بجا ان کی تعریف پائی جاتی هے - سنه ۱۸۶۶ ع میں انھوں نے لاله وزیر سنگھ کا وظیفه (مالیتی ایک سو بیس روپے) مقابلے میں حاصل کیا - بی - اے کے امتحان میں پنجاب کے تمام طلبه میں اول رهے - آرنلڈ گولڈ میڈل حاصل کیا - کالج هی میں اسسٹنٹ پروفیسر هوگئے - اپنے وقت میں بہت مشہور تھے —

پنڈت من پھول' ذات کے برهمن' دلی کے رهنے والے' کالج کے قدیم طلبه میں سے تھے - غالباً مولوی ذکاء الله کے هم جماعت اور ماسٹر رام چندر

کے شاگرد تھے - کالج کی رپورٹوں میں ان کا ذکر تعریف کے ساتھہ آیا ھے۔ پنجاب گورمنٹ کے میر منشی ھوگئے تھے۔ انھیں کی سعی سے مولانا محمد حسین آزاد سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر کے دفتر میں اول اول پندرہ روپے کے ملازم ھوگئے تھے —

ماسٹر پیارے لال دھلی کے رھنے والے تھے۔ دھلی کالج میں تعلیم پائی اور ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی کی شاگردی کا فخر حاصل کیا — بعد تکمیل تعلیم سررشتۂ تعلیم میں ملازمت کی - گڑگانوں اسکول کی ھیڈ ماسٹری کے بعد دھلی نارمل اسکول کی ھیڈ ماسٹری پر مامور ھوگئے۔ پھر سنہ ۱۱۱۶ میں پنجاب گورمنٹ بک ڈپو کے کیوریٹر ھوے - بک ڈپو ٹوٹا تو مدارس کے انسپکٹر کے عھدے پر مقرر ھوے —

دھلی سوسائٹی جو ایک علمی اور ادبی انجمن تھی سنہ ۱۸۶۵ ع میں دھلی میں قائم ھوئی - یہ انجمن ماسٹر صاحب کی مساعی کی بہت کچھہ ممنون ھے - جب تک لاھور تشریف نہیں لے گئے وھی اس کے سکرٹری رھے - اس انجمن میں لکچر ھوتے اور مضامین پڑھے جاتے تھے اور علوم و فنون اور معاشرت و قانون وغیرہ پر مباحث ھوتے تھے۔ جب آپ دھلی سے بک ڈپو کی خدمت پر جانے لگے تو سوسائٹی کی جانب سے آپ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا جس پر دھلی کے سر برآوردہ عمائد اور سوسائٹی کے ارکان کے دستخط تھے۔ مرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھہ یہ عبارت رقم فرمائی :—

" فقیر اسداللہ خاں غالب کہتا ھے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم و اندوہ ھوا ھے وہ میرا جی جانتا ھے - بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں ھے " —

اُردو، فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ نہایت خلیق ملنسار معاملہ فہم اور سلیم الطبع شخص تھے، روا داری اور بے تعصبی ان کا شعار تھا —

ایک بار کسی کمیٹی کی شرکت کے سلسلے میں ماسٹر صاحب کو دہلی سے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ میجر فلر اس زمانے میں سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ ماسٹر صاحب میجر فلر سے ملنے گئے تو انھوں نے لفظ ایجاد کی تذکیر و تانیث کا سوال کیا۔ ماسٹر صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے دفتر میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو زبان کا پورا ماہر ہے اور ایسے مسائل پر رائے دینے کا اہل ہے۔ چنانچہ آزاد بلائے گئے اور اُن سے وہی سوال کیا گیا۔ جواب سے میجر صاحب کا اطمینان ہوگیا اور مولانا آزاد کو بہت جلد ترقی مل گئی۔ خواجہ حالی مرحوم بھی لاہور بک ڈپو میں ماسٹر صاحب ہی کی سعی اور توسط سے پہنچے۔ اس کے علاوہ مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، مولوی اوجان ولی، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ، مرزا ارشد گورگانی وغیرہ کو لاہور میں لانے کے ماسٹر صاحب ہی باعث ہوئے اور اس جماعت نے اُردو کی خدمت بڑی سرگرمی اور تن دہی سے کی اور اسی وقت سے پنجاب میں اُردو کا چرچا اور ذوق پیدا ہوا —

ماسٹر صاحب باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے علمی اور ادبی خدمت بھی کرتے رہے۔ چنانچہ ذیل کی چند کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے ہیں —

۱ – قصص ہند حصہ اول۔

۲ – قصص ہند حصہ سوم۔

۴ ـ رسوم ہند کا ابتدائی نصف حصہ ۔

۵ ـ تاریخ انگلستان (کلاں) ۔

۶ ـ دربار قیصری سنہ ۱۸۷۷ ع تالیف مسٹر ویلر کا ترجمہ ۔

۷ ـ رسالۂ اتالیق کے اکثر مضامین ۔

رسالۂ اتالیق پنجاب کے بھی ایڈیٹر رہے ۔ سنہ ۱۹۱۴ع میں انتقال کیا * ۔

سری رام ایم ۔ اے بھی کالج کے طالب علم تھے ۔ پہلے سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے ۔ اس کے بعد ریاست الور میں برسوں دیوان یا وزیر اعظم رہے ۔ بہت منتظم اور نیک نام تھے ۔

حکم چند دہلی کے رہنے والے بڑے ذہین اور قابل طالب علموں میں سے تھے ۔ امتحانات میں ہمیشہ اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کی ۔ ایم اے میں کلکتہ یونیورسٹی میں اول آئے ۔ حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہوگئے تھے اور اعلیٰ خدمات پر فائز ہوئے ۔ قانون میں ان کی قابلیت مسلم تھی ۔ ان کی تالیف Res Judicata نے بہت شہرت حاصل کی ۔

نند کشور بی ۔ اے دلی کے رہنے والے تھے ۔ پنجاب میں انسپکٹر مدارس کے عہدے سے پنشن لی ۔ کیفی صاحب (پنڈت برجموہن دتاتریہ) فرماتے ہیں کہ مجھ سے ملاقات تھی ۔ کئی سال ہوئے انتقال ہوگیا ۔

ماسٹر کدارناتھ نے بھی دہلی کالج میں تعلیم پائی ۔ گورمنٹ ہائی اسکول میں سکنڈ ماسٹر ہوگئے ۔ رائے صاحب کدارناتھ سابق سشن جج نے بھی اسی کالج میں تعلیم پائی ۔ بڑے عہدے پر پہنچے لیکن اس سے بڑھ کر ان کی سب سے بڑی اور قابل تعریف یادگار رامجس کالج ہے جو بڑی کامیابی سے

---

* ماسٹر صاحب مرحوم کے اکثر حالات ہمیں حضرت کیفی دہلوی سے معلوم ہوئے ۔

چل رہا ہے - تعلیمی معاملات میں بڑی دل چسپی ہے- ہندو کالج ٹوٹتے ٹوٹتے انھیں کی بدولت بچ گیا -

پیر زادہ محمد حسین ایم - اے' (شیشن جج) اور خواجہ محمد شفیع ایم - اے (وظیفہ یاب جج سمال کاز کورٹ) دونوں اسی کالج کے متعلم ہیں - دونوں نے نام پایا - پیر زادہ صاحب کا ترجمہ سفر نامہ ابن بطوطہ بڑی قابل قدر چیز ہے - اس پر جو جا بجا انھوں نے نوٹ لکھے ہیں ان سے ان کی وسعت نظر اور علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے - خواجہ صاحب نے بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں —

میر ناصر علی اڈیٹر صلاے عام بھی دلی کالج ہی کے طالب علم ہیں -

مدن گوپال (ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی) دہلی کالج ہی کے طالب علم تھے لیکن کالج ٹوٹنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ایم - اے' کامیاب ہوے - الہ‌آباد کی سند وکالت (ہائی کورٹ) بھی حاصل کی - دہلی میں وکالت شروع کی - پھر ولایت سے بیرسٹر ہوکر آے اور لاہور میں وکالت کرنے لگے - اپنے وقت میں پنجاب کے سر برآوردہ وکیل سمجھے جاتے تھے - کئی قانونی کتابیں لکھیں Punjab Tenancy Act اور Revenue Act وغیرہ - پروفیسر جیوانز کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا - پنجاب یونیورسٹی کے قیام میں ڈاکٹر لائٹنر کے بڑے معین و معاون تھے —

ماسٹر جانکی پرشاد ذات کے برہمن تھے' بعد میں عیسائی ہوگئے اور ان کے نام کے ساتھہ ریورنڈ لکھا جاتا تھا - برسوں سینٹ‌سٹیفن ہائی اسکول دہلی میں ہیڈ ماسٹر رہے - لایق شخص تھے —

دھرم نراین (ابن بشن نراین) کالج کے نہایت قابل اور ذہین طلبہ میں سے تھے - پولیٹکل اکانومی (معاشیات) کا ترجمہ اردو میں کیا - کچھہ حصہ

تاریخ انگلستان کا بھی ترجمہ کیا - دونوں کتابیں اسی زمانے میں سوسائٹی نے چھاپ دی تھیں -

شیونراین بھی کالج کے بہت ہونہار اور قابل طالب علموں میں سے تھے - تذکرۂ دیواس تھیمیز (پلوٹارک) کا ترجمہ اردو میں کیا - ہندوستان کا ایک جغرافیہ اردو میں لکھا - ارلوٹ کے رسالۂ عام طبیعیات کا ترجمہ بشرکت سروپ نراین کیا -

مولوی کریم الدین بھی کالج کے طالب علم تھے - پانی پت کے رہنے والے تھے پھر دلی ہی میں بس گئے اور ایک مطبع قایم کرلیا - ان کی متعدد تالیفات ہیں جن میں سے بعض اب بھی مشہور ہیں - بہت جفاکش اور قابل شخص تھے اور مدرسہ کی تربیت اور تعلیم نے ان میں علمی ذوق اور تالیف کا شوق پیدا کردیا تھا - ان کی بعض تالیفات یہ ہیں -

۱ - تعلیم النساء لڑکیوں کی تعلیم پر جس میں آٹھ باب ہیں -

۲ - گلدستان ہند (جس میں کئی باب ہیں - قصے ' نصائح ' منتخب اشعار وغیرہ) -

۳ - تذکرۂ شعرائے ہند جس کا دوسرا نام طبقات شعرائے ہند ہے - یہ گارساں دتاسی سے ماخوذ ہے - اس کی تالیف میں ڈاکٹر فلین بھی شریک تھے - علاوہ ترجمہ کے انہوں نے مختلف تذکروں سے بھی حالات جمع کر کے اضافہ کئے -

۴ - گلدستۂ نازنیناں - یہ شعرائے ہند کے کلام کا انتخاب ہے -

۵ - تذکرۃ النسا - اس میں نامور عورتوں کے تذکرے ہیں -

۶ - ترجمۂ ابوالفدا - اول و دوم چہارم و پنجم جلد کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر سپرنگر کی فرمائش سے کیا -

۷ - تاریخ شعرائے عرب سوسائٹی کے لئے لکھی اور سنہ ۱۸۴۷ع میں

طبع ہوئی ـــ

ان کے علاوہ اور بھی کئی رسالے ان کی تالیف سے ہیں -

ان کے علاوہ پنڈت کاشی ناتھ ، آتما رام ، لچھمن داس وغیرہ کالج کے مشہور طلبہ میں سے تھے جن کا ذکر کالج کی رپورٹوں میں آتا ہے -

---

خاتمہ

یہ ہے مختصر روداد مرحوم دہلی کالج کی - کالج نہیں رہا مگر اس کا کام زندہ ہے - اردو زبان و ادب کے سنوارنے اور بنانے میں جو خدمت اس نے کی ہے وہ کبھی فراموش نہیں ہوسکتی - ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں اس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا بہت کچھہ اثر ہے- یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی - ایک صدی پہلے اس کا خیال آنا اور اس پر عمل کرنا غیر معمولی ہمت کا کام تھا - اس وقت بھی یہی اعتراض کیا جاتا تھا جو اب کیا جاتا ہے کہ اردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مغربی علوم اور جدید سائنس کے بار کی متحمل ہوسکے- اس وقت یہ اعتراض بہت کچھہ بجا تھا مگر ان لوگوں نے ہمت نہیں ہاری ' لکچروں کے ذریعے ' کتابیں ترجمے کر کر کے اپنا کام جاری رکھا اور جس اصول پر کام شروع کیا گیا تھا اسے صحیح ثابت کر کے دکھا دیا - وہ زبانیں جن کا آج دنیا میں طوطی بول رہا ہے اور جن کے خزانے علم و ادب سے معمور ہیں ان کی نسبت بھی چند صدی پہلے یہی کہا جاتا تھا جو آج ہماری زبانوں کے متعلق کہا جاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں ہر قسم کے خیالات

کے ادا کرنے کی قوت موجود ھے بشرطیکہ ادا کرنے کے لیے کوئی خیال بھی دل میں ھو اور بے لوث اور پر جوش کام کرنے والے بھی ھوں - ھمارے ملک میں دلی کالج اس کی سب سے پہلی اور کامیاب نظیر ھے جس کے بعد کسی دلیل و حجت اور تجربے کی ضرورت باقی نہیں رھتی - اور یہی وہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغرب و مشرق کا سنگھم قائم ھوا - ایک ھی چھت کے نیچے' ایک ھی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھہ ساتھہ پڑھایا جاتا تھا - اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے ' معلومات کے اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے پختہ ' روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ھماری زبان اور ھماری سوسائٹی پر ھمیشہ رھے گا - اگر دلی کالج نہ ھوتا تو کیا ماسٹر رام چندر' مولانا آزاد ' مولانا نذیر احمد 'مولوی ذکاءاللہ ' ماسٹر پیارے لال جیسے لوگ پیدا ھو سکتے تھے ؟ یہ اگر دلی کالج میں نہ ھوتے تو کیا ھوتے ؟ اس میں قیاس دوڑانے کی بہت کچھہ گنجائش ھے - لیکن میں اس کا بار آپ پر ڈالنا نہیں چاھتا اور خود انھیں میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کرتا ھوں - مولانا نذیر احمد ایک جگہ لکھتے ھیں کہ اگر میں دلی کالج میں داخل نہ ھوتا تو کیا ھوتا۔ وہ اپنے خاص انداز میں فرماتے ھیں کہ :

معلومات کی وسعت' راے کی آزادی ' ٹالریشن (در گزر) ' گورنمنٹ کی سچی خیر خواھی ' اجتہاد علی بصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے

عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں اُن کو میں نے کالج ہی میں سے سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال ' متعصب ' اکھل کھرا ' اپنے نفس کے احتساب سے فارغ ' دوسروں کے عیوب کا متجسس ' بر خود غلط

ترک دنیا بمردم آموزند

خویشتن سیم و غلہ اندوزند

مسلمانوں کا نادان دوست ' تقاضاے وقت کی طرف سے اندھا بھرا ،" صم " بکم " عمی " فہم لا یرجعون ما اصابنی من حسنۃ فی الدین او فی الدنیا فمن الکالج " —

یہ کالج اس جدید عہد میں ہماری تہذیب و علم کی ترقی کے سلسلے میں ایک ایسی کڑی ہے جو کبھی جدا نہیں ہو سکتی۔ گو ہم اپنی غفلت یا ناشکری سے اس کا نام بھلا دیں مگر اس کا کام نہیں بھلا سکتے۔ کیوں کہ اتنی مدت کے بعد بھی ہم اُسی رستے کی طرف عود کررہے ہیں جس پر وہ گام زن تھا۔ وہی طریقے اختیار کر رہے ہیں جو اس نے کیے تھے اور انہیں اصولوں پر کار بند ہورہے ہیں جو اس نے قائم کیے تھے۔ گویا پوری ایک صدی کے بعد اس مرحوم نے جامعۂ عثمانیہ کی جون میں دوبارہ جنم لیا ہے اور اس بھولی ہوئی داستان کو پھر تازہ کردیا ہے —

اب یہ ارباب جامعہ کا فرض ہے کہ اس قدیم سنت کو زندہ رکھیں ' اپنی زبان کی جڑیں مضبوط کریں ' مغربی علوم کو اپنی زبان کے ذریعے سے پھیلائیں۔ جدید سے جدید علم کے پڑھانے اور تحقیقات کرنے کا

سامان بہم پہنچائیں ۔ مشرقی زبانوں کی تعلیم صحیح اصولوں پر
دیں تاکہ بجاے اس کے کہ ہم اپنی زبانوں کی تحصیل کے لیے
یورپ جائیں اہل یورپ ان کی تکمیل کی خاطر ہمارے پاس آئیں۔
نئی چیزوں اور نئے خیالات کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں ۔
ہمارے پرانے طریقۂ تعلیم میں جو عیوب تھے وہ خارج کریں مگر اس
کی خوبیوں کو رواج دیں تاکہ طلبہ میں علم کا سچا شوق اور تحقیق
و تلاش کی لگن پیدا ہو ۔ نہ اپنے اسلاف سے شرمندہ ہوں ۔ اور نہ جدید
علمی ترقی سے در ماندہ —

کلام چکبست پر ایک تنقیدی نظر

از

(جناب صغیر احمد صدیقی صاحب بی ۔ اے)

تمہید اقبال نے شاعر کو " دیدۂ بینائے قوم " قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح شاعر ساری قوم کا ہمدرد ہوتا ہے اسی طرح آنکھ کی ہمدردی سارے جسم سے ہوتی ہے ۔ کوئی عضو " مبتلائے درد " ہو آنکھ ضرور آنسو بہائے گی ۔ مگر یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے ۔ حالی کا مقولہ شاید حقیقت سے زیادہ قریب ہے ۔ وہ شاعر کو " قوم کی زبان " قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ قوم کے تمام جذبات و تاثرات کا صحیح ترجمان ہوتا ہے خواہ وہ غم و الم سے متعلق ہوں یا بہجت و مسرت سے ۔ شاعر واقعی سوسائٹی کا کوئی عضو معطل نہیں ' وہ خوب جانتا ہے کہ انسانیت اس سے کیا مانگتی ہے ' اس کی قوم اس سے کس شے کی طلبگار ہے ' اس کی اپنی ہستی اس سے کیا چاہتی ہے ۔ وہ اپنے موضوع شاعری سے خوب واقف ہوتا ہے جو انہیں جذبات و خیالات تک محدود نہیں ہوتا جو اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں ۔ شاعر اپنے گرد و پیش سے پوری طرح متاثر ہوتا ہے ' اپنے ماحول کے تغیر و تبدل کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے ' پیکار زندگی میں اس کے ہم قوموں کی نبرد آزمائیاں اس کی رجز خوانی کی محتاج ہوتی ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان کی جادہ پیمائیاں اس کی حدی خوانی کی طلبگار۔ پھر وہ ان سب

سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے - وہ ایک ایسا مطرب ہے جو محفل میں رہ کر محفل کے لیے گاتا ہے اور پھر تحسین و ستائش سے بے پروا اور اس کا نغمہ گو اسی کے دل سے نکلتا ہے مگر شورش محفل سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور ساری محفل کے لیے " رہزن تمکین و ہوش "-

ہر سچا شاعر دنیا میں ایک خاص پیغام لے کر آتا ہے - اسی وجہ سے کہہ گئے ہیں " شاعری جز ویست از پیغمبری " - اس پیغام سروش کا مفہوم وہ خاص تعلیم ہے جس کی تبلیغ شاعر اپنے کلام سے کرتا ہے جو اس کے تمام کلام میں جاری و ساری معلوم ہوتی ہے - شاعر اپنی قوم کا رہبر ہے لیکن اس کا کام صرف منزل مقصود کو بتا دینا اور اپنے دلکش ترانوں سے لوگوں میں جوش رہروی پیدا کرنا ہے - یہیں اس کی رہبری اور اس کی جد و جہد ختم ہو جاتی ہے - اس کے آگے پند و موعظت کا درجہ ہے جہاں شعریت کا فقدان ہو جاتا ہے جو شاعر کی حیثیت سے اگر فروتر نہیں تو بالکل جدا تو ضرور ہے - بہر حال ہر سچا شاعر دنیا میں ایک خاص پیغام لے کر آتا ہے - اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ اور ماحول کے نقطۂ نظر سے اس کا پیغام بے معنی اور بے محل نہ ہو - مثلاً اگر قوم کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہو ، قومی زندگی پر ایک سکتہ کی حالت یا جمود کی کیفیت طاری ہو اس وقت اگر کوئی شاعر بجائے درس عمل دینے کے ، بجائے قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کے جگانے اور قوم کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے کے عیش و مسرت کے ترانے گائے تو ہم اسے کبھی سچا شاعر نہیں کہہ سکتے - اس کے پہلو میں فطرت نے ایک حساس قلب نہیں ودیعت کیا ، اس کی شاعری انسانیت کے لیے ایک سبز باغ ہے جس کے پھولوں کے پس پردہ کانٹے ہیں جس کے پھلوں کی شیرینی اپنے اندر نہیں

معلوم کتنی تلخیاں رکھتی ہے —

ماحول

چکبست جس ماحول میں پیدا ہوے سیاسی ، اقتصادی اور مذہبی ہر حیثیت سے بہت شور انگیز تھا۔ جس زمانے میں انہوں نے ہوش سنبھالا ، اسے ہندوستان کا زمانۂ احیا کہنا بیجا نہ ہوگا ۔ سنہ ۱۹۰۸ ع سے آزادی کی جد و جہد صحیح معنوں میں شروع ہوجاتی ہے۔ قومی لیڈر میدان عمل میں اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف کار نظر آتے ہیں ۔ سنہ ۱۴ ع میں یورپ میں جنگ عظیم چھڑجاتی ہے اور اس کے سیاسی اور اخلاقی نتائج مترتب ہونے لگتے ہیں۔ سنہ ۱۹ ع سے ترک موالات کی تحریک زور پکڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ قومیت کا احساس اپنے ارتقائی منازل نہایت سرعت کے ساتھ طے کرتا ہے ۔ پان اسلامزم اور خلافت کی تحریک افراد کو علحدہ " ربط ملت " پر مائل کرتی ہے۔ معاشی ارتقا کے ساتھ سرمایہ و محنت کا تنازع شروع ہو جاتا ہے ۔ دیموقراطیت لوگوں کے خیالات میں جاری و ساری ہو جاتی ہے ۔ کانگریس اور مسلم لیگ قایم ہوجاتے ہیں۔ ملک کی اقتصادی اور اجتماعی حالت میں بھی تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ پردہ کے ضروری اور غیر ضروری ہونے کے متعلق مباحث چھڑ جاتے ہیں۔ ایک کافی تعداد ہندوستانی خوانین کی بر افگندہ نقاب ہوکر ملک کی فلاح و بہبودی کے لیے مردوں کے دوش بدوش مصروف کار ہو جاتی ہے۔ تعلیم نسوان کی نوعیت کے متعلق مخالف اور موافق جماعتیں قائم ہوجاتی ہیں ۔ جدید طرز معاشرت کے نقطۂ نظر سے ہیئت اجتماعی کی تہذیب کی کوشش کی جاتی ہے۔ آزادی رائے ایک حد تک حاصل ہو جاتی ہے۔ ہندووں میں گئو رکشا کے لیے پوری سرگرمی دکھائی جاتی ہے ۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ افراد کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے ۔

فنون لطیفہ میں دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے - رومانیت و اصلیت کی طرف طبیعت کا رجحان ہوتا ہے - فطرت کی پرستش شروع ہوجاتی ہے - فن نقد کی ترقی کے ساتھہ علم و ادب کا معیار بلند ہوجاتا ہے —

ہندوستان کے سیاسی ' اقتصادی اور علمی انقلاب کے ساتھہ اردو شاعری کی دنیا میں بھی بہت کچھہ تبدیلی واقع ہوتی ہے آزاد کی کوششیں ' کرنل ھالرائڈ کی سرپرستی میں ' بارور ثابت ہوتی ہیں - لوگ قدیم طرز شاعری سے اُکتا جاتے ہیں - پرانے فرسودہ مضامین میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی - زمانے اور مادوں کا اقتضا کچھہ اور ثابت ہوتا ہے جو قدیم طرز شاعری سے پورا نہیں ہو سکتا - حالی اور اسمعیل میرٹھی آزاد کی صدا پر لبیک کہتے ہیں اور اردو شاعری کا رخ ایک نئی شاہراہ کی طرف پھر جاتا ہے - غزل گوئی اردو شاعری کی مرادف نہیں رہ جاتی - طرح طرح کے موضوع پر نظمیں لکھی جاتی ہیں - اور نظموں کی تراکیب موضوع کے حسب حال بنائی جاتی ہیں - مفید اور بکار آمد مضامین کی طرف توجہ کی جاتی ہے - انگریزی نظموں کے ترجمے کئے جاتے ہیں - سادگی بیان کا لحاظ رکھا جاتا ہے - مناظر فطرت سے دلچسپی دکھائی جاتی ہے - جدت خیال اور مضمون آفرینی پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے - سطحی خیالات اور حسن و عشق کے پرانے توہمات سے لوگ گریز کرتے ہیں - فلسفہ و تصوف زیادہ مستقل اور منظم طریقے سے شاعری میں داخل ہوجاتے ہیں - رکیک و سخیف اور مبتذل مضامین چھوڑ دیے جاتے ہیں - غرض کہ وہ باتیں ظہور میں آتی ہیں جن کو جدید شاعری کی ایک شاندار ابتدا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے —

چکبست دنیا میں ایک حساس قلب ' ایک درد مند دل لیکر آئے تھے انکی طبیعت زود اثر تھی - انکی ذکاوت حس بڑھی ہوئی تھی - ان پر ان

تمام انقلابات کا گہرا اثر پڑا جس کا انعکاس ان کے کلام میں موجود ہے۔ اُن کا موضوع شاعری ان کے زمانے اور ماحول کے اقتضا کے بموجب ہے۔ انکی شاعری ان تمام قوتوں اور تحریکوں کی آئینہ دار ہے جو ملک کے ہیجان و انتشار اور سوسائٹی کی تہذیب و ترتیب کا باعث ہوئیں ۔ جن کا مقصد، جن کا منتہا، جن کا نصب العین قومیت و حریت کا حصول تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ قدیم طرز شاعری ان کے خیلات و جذبات کا متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ پبلک کو اس سے دلچسپی پیدا ہوگی جو نئے طرز شاعری سے پیدا ہو رہی ہے مگر پرانی روش سے قطعی گریز کرنا نا ممکن تھا لہذا انہوں نے قدیم و جدید طرز کو ملاکر ایک نیا طرز اپنے موضوع کے حسب حال بنا لیا ۔

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں عروس شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ بحیثیت شاعر انہوں نے اپنے ملک کو کیا پیغام پہنچایا ۔ اپنے زمانے اور ماحول سے کس حد تک متاثر ہوے اور ملک و قوم کی کیا خدمت کرسکے ۔

چکبست اور شعرائے متقدمین

چکبست اُن شعرا میں سے تھے جنہیں "تلمیذ الرحمان" کہا جاتا ہے اور یوں بھی شاعری کی دنیا میں استادی اور شاگردی کی رسم بے معنی ہے کیونکہ یہاں تو سب کچھ خداداد ہے جو بزور بازو حاصل نہیں ہوسکتا ۔ البتہ چکبست نے اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ ضرور کیا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے ۔ جن میں سے غالب، آتش اور سب سے زیادہ انیس کا رنگ نمایاں ہے ۔ زبان کی سادگی و صفائی، روز مرہ کا استعمال، بندش الفاظ اور کلام میں کہیں کہیں قناعت و استغنا کی شان آتش کی یاد دلاتی ہے۔

نظر آتا ہے فقیری میں تماشاے جہاں تہ ساغر دیدۂ جمشید کا پیمانہ ہے
لطف شاہی کی تمنا غیر کے دل میں رہے ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنو کا نام ہے
کلفت دنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے
مرد قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس پانوں پھیلا کر دو دیکھا ہاتھ پھیلاتا نہیں
چھٹکی ہوئی ہے گور غریباں پہ چاندنی ہے بیکسوں کو فکر چراغ مزار کیا
بہار گل میں دیوانوں کا صحرا میں پرا ہوتا جدھر اٹھتی نظر کوسوں تلک جنگل ہرا ہوتا

اسکے علاوہ وہ نظم ملاحظہ ہو جس کا مطلع یہ ہے۔

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

علاوے تخیل ' فلسفیانہ زاویۂ نگاہ ' فارسی کی لطیف تراکیب اندر غالب کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

مٹا نا تھا اسے بھی جذبۂ شوق فنا تجھکو
نشان قبر مجنوں دام ہے صحرا کے دامن میں
جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوے گلشن میں
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشان ہونا
چاک ہوکر کفن غنچہ بنا جامۂ گل
کھل گیا رنج سے شادی کا نمایاں ہونا

کہیں کہیں دونو کے خیالات ایک ہی سمت پرواز کرتے ہیں۔

چکبست ۔ کہا غنچے نے ہنس کر واہ کیا نیرنگ عالم ہے
وجود گل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا

غالب — ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل
یک جہاں زانوے تامل در قفاے خندہ ہے

چکبست — عقل کیا چیز ہے اک وضع کی پابندی ہے
دل کو مدت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

غالب — ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگئی رسم و رہ عام بہت ہے

چکبست — درد الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہوگئے

غالب — رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اس کے علاوہ چکبست نے کچھہ غزلیں غالب کی غزلوں پر لکھی ہیں -

سب سے زیادہ نمایاں رنگ میر انیس کا ہے جو چکبست کے تمام کلام پر چھایا ہوا ہے اور جہاں تک کہ طرز بیان کا تعلق ہے چکبست انہیں کے مقلد ہیں - ' رامائن کا ایک سین '' اور ' جلوہ صبح ' میں یہ رنگ زیادہ گہرا ہے چنانچہ پہلے انہیں کو پیش کیا جاتا ہے -

' رامائن کا ایک سین '' پڑھکر انیس کے مراثی کا وہ سماں پیش نظر ہو جاتا ہے جب شہداے کربلا رن کی رخصت لیتے ہیں - کلام میں وہی ترنم آمیز روانی ' تاثرات کا مد و جزر اور اس کے ساتھہ کلام کا اتار چڑھاؤ ' الفاظ کی وہی نشست اور وہی ترتیب ' جذبات کا تعمق اور وہ جملہ صفات جو انیس کے یہاں اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں اس نظم میں بھی پائی جاتی ہیں -

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال

دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے

گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ! نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ!

جنبش ہوی لبوں کو بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہاے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرہ کا رنگ حالت دل کھولنے لگا

ہر موے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا

اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا

درد دل غریب جو صرف بیاں ہوا

خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں

سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہونگی ہاں

کسطرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں

جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیجدوں!!

ایسے بھی نامراد بہت آئینگے نظر گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر

رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا!!

پھول پھول لا کے باغ تمنا اُجڑ گیا

چکبست کی نظم "جلوۂ صبح" انیس و دبیر کے صبح کے مناظر کی یاد دلاتی ہے۔ انیس کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ وہی فارسی کی خوبصورت تراکیب اور ترشے ہوے الفاظ ان کے یہاں بھی ہیں۔ ان کا

تخیل صرف آفتاب و ماهتاب، روشنی و تاریکی میں الجھہ کر نہیں رہ جاتا، بلکہ صبح کے پر کیف و بو قلموں مناظر پر پوری طرح چھا جاتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انیس کو دبیر سے ممتاز کرتی ہے۔ چکبست نے دونوں باکمالوں کے طرز بیان کو یہاں ملایا ہے۔ شوکت الفاظ، مضمون آفرینی اور منظر نگاری تینوں کا اجتماع کیا ہے۔ مگر پھر بھی انیس کا رنگ اتنا غالب ہے کہ جگہہ جگہہ سے جھلکتا ہے —

چکبست :- جب رنگ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور
دبیر :- گویا کہ رنگ آئینہ سے دور ہو گیا
چکبست :- ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
انیس :- چھٹکے ہوے ستاروں کا ذروں پہ تھا گماں
چکبست :- مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
انیس :- مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
چکبست :- ہنگام سحر باد سحر چلتی تھی پیہم
انیس :- چلنا نسیم صبح کے جھونکوں کا دمبدم
چکبست :- ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
انیس :- شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہاے آبدار
چکبست :- ہر شاخ و شجر میں شجر طور کا نقشا
انیس :- سر سبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا
چکبست :- تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
انیس :- سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

غرض کہ یہ بھی اسی خرمن کے بکھرے ہوے دانے ہیں۔ ان امثلہ سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ چکبست انیس کے کلام سے کس حد تک متاثر

ہوے ہیں اور کہاں تک ان کی تقلید کی ہے ۔ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔
چکبست اپنی بعض نظموں میں تمہید ویسی ہی لکھتے ہیں جیسی میر انیس
اپنے مراثی میں۔ " موقع عبرت " کی تمہید ملاحظہ ہو :—

ہاں نور ازل جلوۂ گفتار دکھادے ہاں شمع زباں مطلع انوار دکھادے
ہاں طبع رواں قلزم زخسار دکھادے ہاں رنگ سخن گلشن بیخار دکھادے
گلزار معانی کا مہکتا نظر آے
طوطی چمنستاں میں چہکتا نظر آے

ہو حسن بیاں میں چمنستاں کا تجمل ہر نکتہ رنگیں نظر آے صفت گل
ہر معنیٔ پیچیدہ بنے طرۂ سنبل عاشق ہوں سخن پر جو سنیں صورت بلبل
جو شعر ہو طوبیٰ کا وہ ثانی نظر آے
کوثر کی طبیعت میں روانی نظر آے

اور میر انیس ایک مرثیہ کی تمہید یوں شروع کرتے ہیں :—

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملادوں قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرہ کی چمک مہر منور سے ملادوں کانٹے کو نزاکت میں گل تر سے ملادوں
گلدستۂ معنی کو نئے رنگ سے باندھوں
ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اس کے علاوہ چکبست کی نظم " قوم کے سور ماؤں کو الوداع " میں
انیس کے رزمیہ کی شان پائی جاتی ہے :—

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں کچھ نئی شاں سے جانباز کُھن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوے شمشیر وکفن جاتے ہیں تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

ظاہر ہے کہ چکبست نے تمہید کا یہ طریقہ اور رزمیہ کا یہ انداز انیس ہی کی تقلید میں اختیار کیا ہے —

زبان اور طرز بیان

خواجہ آتش اور میر انیس کے اثر سے ان کے کلام میں صفائی ، سادگی اور ایک ترنم آمیز روانی پیدا ہوگئی ہے - ان کی بندش الفاظ بہت چست ہے - وہ اس معاملے میں آتش کے ہم نوا ہیں جن کے شعر کا حوالہ انہوں نے دیباچہ گلزار نسیم میں دیا ہے :—

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شوکت الفاظ جس کی تعریف وہ دیباچۂ گلزار نسیم میں کرتے ہیں ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی - ان کے الفاظ سادے اور شیریں ہوتے ہیں - فارسی کی وہی تراکیب جو نا مانوس نہیں چکبست کے کلام میں ملیں گی - فصاحت اُن کے کلام کا خاص جز ہے - وہ ہر موقع پر فصیح لفظ لانے کی کوشش کرتے ہیں - مثلاً رامائن کے ایک سین کے دو مصرع ملاحظہ ہوں :—

ع :— کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں

ع :— دامان داشت دامن مادر سے کم نہیں

مگر چکبست نے کہیں کہیں غریب الفاظ بھی استعمال کئے ہیں - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسدس میں اکثر قوافی بھرتی کے لانے پڑتے ہیں اور قافیہ کی قید بلا سے فصاحت کا قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے - چکبست بھی چند جگہوں پر اپنی چادر سے باہر پانوں نکالنے پر مجبور ہوجاتے ہیں —

ع :— کیا کہوں رنگ جوانی میں جو اس راغ کے تھے

ع :— جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گذر

ع :-   وہ بیبرگ ہوں کہ اک گوشہ ہے صحرائے عدم میرا

چکبست عموماً کلام کی اصلی ترتیب قائم رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اس کی مثالیں دینا غیر ضروری ہے۔ ان کے مراثی، قومی نظمیں، راماٸن کا ایک سین، قریب قریب تمام نظمیں اس صفت کی نمایاں طور پر مظہر ہیں۔ سوائے چند مقامات کے جہاں کلام میں تعقید پائی جاتی ہے۔ مثلاً "فریاد قوم" میں کہتے ہیں :-

ع :-   جگہہ سے اپنی ہے چھوڑ کی زمیں سر کی

بہت بھدے قسم کی تعقید ہے مگر چونکہ اکبر سے قافیہ ملانا تھا جس کا ذکر دوسرے مصرع میں لانا ضروری تھا اس لیے مجبوری تھی ۔

چکبست نے اپنے کلام میں روز مرہ اور محاورہ کا بھی التزام کیا ہے۔ اس کی مثالیں اکثر ملیں گی :-

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید   اندھا کئے ہوے ہے زر و مال کی امید

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کردو   فقیر قوم کے آے ہیں جھولیاں بھر دو

ذرا اثر نہ ہوا قوم کے جیبوں پر   وطن سے دور چھری چل گئی غریبوں پر

دیکھنا ہیں حسن کے جلوے تو میخانے میں آ   تیرے کعبہ میں تو بس واعظ خدا کا نام ہے

چکبست کبھی کبھی ایسے ہندی الفاظ بھی لاتے ہیں جو نا مانوس و غریب نہیں ہوتے :-

ع :   ست جسے کہتے ہیں وہ آگ ہے دمساز ان کی

ع :   قوم غافل نہیں ماتا تری غمخواری سے

ع :   تو گرفتار سہی ہے تری شکتی آزاد

ع :   زمیں ہند کی اُگلے گی سور بیر اپنے

چکبست کے کلام میں کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی

ہیں۔ مگر ایک شاعر کے کلام میں زبان کی غلطیوں کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہے۔ اردو تنقید کا وہ زمانہ قریب قریب گذر گیا جب صرف زیر و زبر کی غلطیاں نکالنا اور زبان کی خوبیوں کی تعریف کرنا ایک نقاد کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اور نہ وہ شاعری اب رہ گئی ہے جو سوائے زبان کے ہیر پھیر کے کوئی غیر فانی عنصر اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ موجودہ شاعری کا موضوع اس کی زبان سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اب سب سے زیادہ قابل غور شاعر کے تخیلات ہیں۔ اس کی وہ قوت ہے جس سے وہ لوگوں کے جذبات پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس وہ کارنامے ہیں جو اسے پیغمبر کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں —

چکبست کا کلام سخافت و ابتذال سے بالکل مبرا ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک خاص قسم کی متانت و نقاہت پائی جاتی ہے جو غالباً ان کے موضوع شاعری کی ممنون احسان ہے۔ ان کے کلام میں فصاحت کے ساتھ بلاغت بھی پائی جاتی ہے جس کا مفہوم اقتضاے حال کے بموجب ایراد کلام ہے مثلاً جب رام چندر جی ماں سے رخصت لینے کے لیے جاتے ہیں تو وہ بے قراری ظاہر کرتی ہیں اور اپنی بدنصیبی کا گلہ کرتی ہیں؛ اس وقت رام چندر جی انہیں جس انداز سے تلقین صبر کرتے ہیں بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر انسانی نفسیات سے خوب واقف ہے۔ مصیبت پڑنے پر انسان اس کی تاویل یوں کر لیتا ہے کہ یہ مصلحت خداوندی ہے' شائد اسی میں کوئی صورت بہتری کی نکل آئے۔ تلقین صبر بھی اکثر یونہیں کرتے ہیں۔ یہ فطرت انسانی ہے۔ پھر جس طرح خزاں کے ساتھ بہار اور بہار کے ساتھ خزاں ہونا ضروری ہے اسی طرح رنج و خوشی بھی لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ پہلے

رام چندر جی بھی کہتے ہیں :—

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی　　　کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

پھر صبر کرنے اور صبر دلانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک وہی شخص دنیا میں مصیبت زدہ نہیں بلکہ سیکڑوں اس سے بھی زیادہ آفت رسیدہ ہیں اور سب اس کو برداشت کرتے ہیں۔ چنانچہ چکبست رام چندر جی کی زبان سے یہ بھی کہلواتے ہیں —

تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار　　　ماتم‌کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

مصیبت سے پہلے گھبرانا نہیں چاھئے کیوں کہ صبر تو خود بخود آجاتا ہے۔ نہیں معلوم کتنی تکالیف اور مصیبتیں انسان پر پڑتی ہیں مگر یہ ایسا سخت جان ہے کہ رو پیٹ کر جھیل جاتا ہے۔ رام چندر جی بھی یہی کہتے ہیں :—

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار　　　کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار

صبر اور تلقین صبر کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ مصیبت سے نجات ملنے کے بعد کی کیفیت پر غور کرے اور اسی ڈھارس اور اُمید میں مصیبت کا زمانہ گذار دے کہ اس کے بعد جو راحت ملے گی اس کا نعم البدل ہوگی۔ یہ بھی فطرت انسانی کا ایک خاص نکتہ ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں :—

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام　　　بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام

ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام　　　قائم اُمید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

رام چندر جی یہ سب کچھ کہتے ہیں مگر اس خیال سے کہ ماں کو جدائی کے غم کے ساتھ اس بات کا بھی انتشار ہوگا کہ معلوم نہیں مجھ پر صحرا میں کیا گذرے، جنگل کی زندگی کی تعریف کرتے ہیں اور

بتاتے ھیں کہ خدا ھر حال میں بندوں کی خبر رکھتا ھے۔ یہی نہیں بلکہ اس تعریف کو انتہا تک پہنچا دیتے ھیں کہ :—

ع: داماں دشت دامن مادر سے کم نہیں

چکبست نے اس تقریر کا جو اثر ماں کے اوپر دکھایا ھے کس قدر اقتضاے حال کے موافق ھے۔ کہتے ھیں :—

یہ گفتگو ذرا نہ ھوئی ماں پہ کارگر ھنس کر وفور یاس سے لڑکے پہ کی نظر

مصرع ثانی میں "لڑکے" کی جگہ "بیٹے" کا لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا مگر یہاں جو بلاغت لفظ "لڑکے" نے پیدا کی ھے وہ لفظ "بیٹے" سے ناممکن تھی :—

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستان
لاکھوں برس کی عمر ھو دیتے ھو ماں کو گیان

یہ شعر کس قدر بلیغ ھے۔ ماں یہ سب جانتی ھے مگر مامتا کی آنچ بری ھوتی ھے اس لئے ملول و رنجیدہ ھے۔ یہی وجہ ھے کہ لڑکے کی ناصحانہ تقریر کو "داستان" سے تعبیر کرتی ھے۔ دوسرے مصرع کی بلاغت محتاج بیان نہیں۔ فطرت انسانی کا ادعا اور صورت حال کا اقتضا یہی تھا اور شاعر نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ "لاکھوں برس کی عمر ھو" میں ایک خاص لہجہ ھے۔ ایک خاص بزرگی کی شان ھے —

"فریاد قوم" میں ھندوؤں میں جذبۂ عمل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ھیں، افریقہ میں قوم کی بے آبروی پر غیرت دلاتے ھیں، ان کی غفلت پر ملامت کرتے ھیں اور ان کو کام کرنے کے لیے ابھارتے ھیں اور آخر میں یہ کہتے ھیں —

مگر وہ کیا ہیں کسی کی بھی گر نہو امداد
اثر دکھائے کی جادو کا قوم کی فریاد
اٹھیں گے خاک کے تودوں سے دستگیر اپنے
زمین ہند کی اگلے گی سور بیر اپنے

تمام لعن طعن کے بعد ہندوؤں کی امداد کی طرف سے یہ استغنا اور یہ دکھانا کہ قوم انکی محتاج نہیں بلکہ زمین ہند اپنے ہیرو کو دوبارہ پیدا کرے گی کس قدر بلیغ ہے —

صنائع و بدائع تشبیہات واستعارات

چکبست کے کلام میں صنائع و بدائع بھی ہیں مگر جہاں کہیں ہیں بالکل غیر اختیاری طور پر اور تصنع سے پاک - تشبیہات و استعارات شاعری کی جان ہیں اور ان کے کلام میں ان کی بہت لطیف مثالیں ملتی ہیں - انھوں نے صرف پرانی فرسودہ تشبیہات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں جدت پیدا کی ہے اور بعض تو بالکل نئے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں - مثلاً سیر دہرہ دوں میں فرماتے ہیں -

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ　　کھڑے ہیں کوہ وشجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں　　یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

" سیر دہرہ دوں " میں پہاڑوں کے متعلق لکھتے ہیں —

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا　　یہ بل زمین کی تیوری پہ آگیا کیسا

مسز بسنت کی مدح میں کہتے ہیں - ع :

ترے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبح وطن

آصف الدولہ کے امام باڑہ کی تعریف میں لکھتے ہیں :

بے خودی کہتی ہے آیا یہ فضا میں کیوں کر
کسی استاد مصور کا ہے یہ جلوۂ خواب

جدید رنگ شاعری کتنا نمایاں ہے۔ یہ سب انگریزی ادب کا اثر ہے۔ پھر کہتے ہیں۔ ع :

ایسے عالم میں وہ کُہرے سے اُبھرنا اس کا
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز

تشبیہ جتنی بعید و غریب ہو اتنی ہی بلیغ ہوتی ہے۔ اس قسم کی اکثر تشبیہات چکبست کے کلام میں موجود ہیں۔ جو تشبیہات محسوسات کی ہوتی ہیں اور متحرک کیفیات سے متعلق ہوتی ہیں ان کی تعریف خاص طور پر مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں کی ہے۔ چکبست کے یہاں بھی اس قسم کی تشبیہات پائی جاتی ہیں —

نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا　　سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا
یاں چاندنی دکھاتی ہے امید کی جھلک　　دریا کی لہر دل ہے کسی بے قرار کا

اس کے علاوہ اور بہت سی تشبیہات ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں جن میں سے چند یہاں بغیر کسی انتخاب کے پیش کی جاتی ہیں —

پھیلی ہو جیسے گورِ غریباں میں چاندنی　　عالم یہ ہے خوشی میں دل داغدار کا
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے　　جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی
آنکھ کہتی ہے یہ بادل ہیں کالے کالے　　بال کھولے ہوئے ہیں سانولی صورت والے
دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو　　پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
شباب آیا ہے پیدا رنگ ہے رخسار نازک سے　　فروغ حسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گلشن میں

چکبست کے ابتدائی کلام میں بعض تشبیہات بہت طول طویل ملتی ہیں مثلاً مہادیو گووند ریناڈے کے مرنے سے جو افتاد قوم پر پڑی ہے اس کی تشبیہ کئی بندوں میں دیتے ہیں جو رومانیت سے مملو ہیں۔ پہلا بند یہ ہے —

کشتی ہو جیسے کوئی تلاطم میں مبتلا اور جوش میں ہو موجہ و گرداب جابجا
ہو ابر و باد و برق سے طوفان اک بپا تاریک شب کی سر پہ ہو چھائی ہوئی بلا
برپا ہو شور رعد موافق ہوا نہ ہو
اور ساحل مراد کا کوسوں پتا نہ ہو

حسن التعلیل :-

کیا کونپلیں دکھاتی ہے عالم اُبھار کا آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا
طلوع صبح کیا ہے مرثیہ ہے رونق شب کا ازاے رنگ رخ مہتاب کا نور سحر ہوکر
سبزہ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کر سر اٹھانے کی جگہہ گلشن ایجاد نہیں
شب کو بہار پردۂ شبنم میں رو گئی انجام سوچ کر چمن روزگار کا
حسن کی دولت سے تھے گلہاے نورس بے خبر دیکھکر رنگ چمن کانٹے نگہباں ہوگئے
پردۂ خاک سے دل جام بکف نکلا ہے مے کی تاثیر سے کچھ کم نہیں تاثیر بہار

مراعات النظیر

چکبست کے کلام میں رعایات لفظی کی بڑی مثالیں ہیں مگر یہ صنعت ان کے کلام میں بالکل ثانوی حیثیت رکھتی ہے - وہ الفاظ کے چکر میں پڑکر معانی کو گرفت سے نہیں جانے دیتے —

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پر فن میں
کہ زیور ہو گیا طوق غلامی اپنی گردن میں
سدھاری منزل ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تن خاکی کو شاید روح نے گرد سفر جانا
ہے تڑپتا کون دل جینے سے کس کا سیر ہے
بال کس نے لاش پر کھولے یہ کیا اندھیر ہے

اس کے علاوہ " مرقع عبرت " کی تمہید ملاحظہ ہو —

ایہام
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

طباق
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

تضاد
نیند میں ہو گا سماں عالم ہشیاری کا
خواب دیکھیں گے یہاں قوم کی بیداری کا

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوے گلشن میں

جلادی دل کو میرے قلب دشمن کی سیاہی نے
کدورت واں بڑھی اور یاں کھلے جوہر صفائی کے

تلمیح
چکبست نے ہندوستان کے عہد ماضی کی اساطیر کی طرف مراجعت کی ہے۔ یہ بھی ان کی ایک امتیازی صفت ہے۔ انہوں نے صرف پرانی فرسودہ تلمیحات پر اکتفا نہیں کیا۔ لیلیٰ و مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے عہد ماضی کی روایات اور تواریخ کے خاص خاص افراد کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے —

مٹنے کی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا جہاں میں بھیشم وار جن کا نام ڈوبے گا
قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو روح پرتاب کی جنت میں نہ شرمندہ ہو
گو تم نے آبرو دی اس معبد کہن کو سرمد نے اس زمین پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

منظر نگاری
چکبست کی صرف تین نظمیں ایسی ہیں جن میں صحیح معنوں میں منظر نگاری کی گئی ہے "جلوہ صبح" "کشمیر" اور "سیر دہرہ دوں"۔ "جلوہ صبح" میں جیسا کہ لکھا جا چکا ہے انہوں

نے انیس کی تقلید کی ہے ۔ ان کا تخیل صرف آفتاب و ماہتاب کی روشنی و تاریکی میں الجھ کر نہیں رہ جاتا بلکہ صبح کے تمام بوقلموں مناظر پر پوری طرح چھا جاتا ہے ۔ اس نظم کی منظر نگاری بالکل تخیلی ہے ۔ اس کے عناصر قریب قریب وہی ہیں جو انیس کے یہاں پائے جاتے ہیں ۔ مناظر میں کوئی انفرادیت نہیں ہے ۔ یہ مختلف دلفریب و رنگین صبحوں کے ارتسامات ہیں جن کو شاعر نے اپنے تخیل سے یکجا کیا ہے ۔ اس نظم کی رنگینی اس لطافت کی محتاج ہے جسے ایک چابکدست مصور ہی کا موے قلم پیدا کرسکتا ہے ۔ اقبال کی ایک نظم " کنار راوی " یوں شروع ہوتی ہے —

(ع) سکوت شام میں محو سرود ہے راوی

صرف ایک مصرع ہے لیکن اس میں تاثرات کی ایک دنیا مضمر ہے ۔ الفاظ اور ان کی نشست کس قدر ترنم آمیز ہے ۔ محاکات کتنی مکمل ہے ' شام کا دھندھلکا چھا رہا ہے ' شفق کا رنگ پھیکا پڑ چکا ہے ' کچھ ستارے آسمان پر جھلملا رہے ہیں ' گرد و پیش ایک مرعوب کرانیے والی خاموشی میں ملفوف ہے ۔ دریاے راوی نہایت نرم روی سے بہہ رہی ہے اور سطح کی ننھی ننھی لہروں کا تصادم کچھ مبہم سا ترنم پیدا کر رہا ہے ۔ شاعر اس منظر کو خاموشی سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے —

(ع) سکوت شام میں محو سرود ہے راوی

تمام الفاظ اس قدر پر ایہام ہیں کہ وہ پڑھنے والے کے تخیل کو مجبور کرتے ہیں کہ اس منظر کو پیش کرے ۔ یہی کیفیت محاکات کی اصلی شان ہے جو " جلوہ صبح " میں مفقود ہے جس میں پڑھنے والے کی توجہ تمام تر زور تخیل کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور خود مناظر کی طرف مبذول نہیں ہوتی —

دوسری نظم "کشمیر" میں جو "مرقع عبرت" کا ایک حصہ ہے انھوں نے زیادہ کامیاب منظر نگاری کی ہے۔ مقامی رنگ نے اس نظم میں جان ڈال دی ہے۔ اور انفرادیت پیدا کردی ہے جو ایک منظر کو دوسرے سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ اس نظم میں محاکات نسبتاً زیادہ مکمل ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی :—

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا چشموں سے پہاڑوں کے وہ اُڑتا ہوا پھینا
گاتے ہوے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا ڈل کا وہ سر شام ادھر کروٹیں لینا
وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا منارہ بھی چمکتا نظر آنا

جزئیات کا بیان منظر میں کس قدر اصلیت پیدا کردیتا ہے۔ شاعر کے تخیل کی پرواز اس کو مناظر کے حدود سے باہر نہیں لے جاتی۔ تصنع کے نہ ہونے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منظر کا عکس لے لیا ہے —

پھر کہتے ہیں :—

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے بکھرے ہوے وہ دامن کہسار پہ لالے
اُڑتے ہوے بالائے ہوا برف کے جہالے دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے لکوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دروں میں

یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری مصوری کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی ہے۔ تصویر کتنی متحرک ہے اور کتنی دلکش۔ اس بند میں شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی ہے جس کی مثال ایک رنگین شیشے کی ہے جو چشم تماشا کے سامنے منظر کو اپنے رنگ میں رنگ کر پیش کرتا ہے بلکہ سادہ الفاظ ہیں جن کی مثال ایک بالکل شفاف اور بیرنگ شیشے

کی ہے جو منظر کو ہو بہو اپنے اصلی رنگ میں دکھاتا ہے —

اس نظم میں رومانیت کی بڑی دھلک ہے جو تیسری نظم "سیر دیرہ دون" میں مکمل طور پر پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں :—

نکلے نہ صدا ایسی مغنی کے گلو سے آتی ہے جو آواز ترنم لب جو سے

ہم دیکھہ چکے ہیں کہ چکبست کی نظم "جلوہ صبح" زور تخیل، شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ دوسری نظم "کشمیر" میں یہ عناصر نسبتاً کم ہیں اور سادگی بیان و محاکات اسی قدر زیادہ جس کے ساتھہ مقامی رنگ اور اس کے پہلو بہ پہلو انفرادیت مل کر اس کی منظر نگاری کو زیادہ مکمل بنا دیتے ہیں۔ رومانیت کی ابتدا "کشمیر" میں پائی جاتی ہے۔ خارجی رنگ دونوں میں ہے مگر "جلوہ صبح" میں زیادہ گہرا ہے اور "کشمیر" میں نسبتاً کم۔ تیسری نظم "سیر دیرہ دون" میں تخیل، محاکات، داخلی رنگ، مقامی رنگ، انفرادیت اور رومانیت مل کر چکبست کو ان کی منظر نگاری کے معراج کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔ اس نظم میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ شاعر جن ارتسامات کو پیش کرتا ہے اُس کے ساتھہ اس کا اپنا تاثر و تکیف بالکل مدغم ہو جاتا ہے۔ اسی امتزاج کا نتیجہ وہ شعریت ہے جو اس نظم کی امتیازی صفت ہے۔ ان مصرعوں کی شعریت ملاحظہ ہو —

م: یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون

ع: بجائے خاک کے اُڑتا ہے رنگ سبزہ کا

ع: تصویر کھنچی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں

لطیف تشبیہات و استعارات اس نظم میں عجیب گل کاری کرتے ہیں :—

ازل میں تھی جو فضا اُس کی یادگار ہے یہ نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ
طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آ کے مسافر مقام کرتے ہیں ق یہ سنتری اُنھیں پہلے سلام کرتے ہیں
بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھاگیا کیسا یہ بل زمین کی تیوری پر آ گیا کیسا
نگاہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

جدت یہ رنگ شاعری کتنا نمایاں ہے :—

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

شاعر اپنے کو فطرت کے اس اچھوتے خلوتکدے میں اس " حریم خاص میں " علایق دنیوی سے ماوراء اور لوازمات انسانی سے دور پاتا ہے :—

بس ایک عالم ہو' چار سمت طاری ہے نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

دوسرا مصرع گرے کے مشہور عالم مرثیہ کا یہ مصرعہ یاد دلاتا ہے —

Far from the madding crowds ignoble strife.

یہ وہ جگہ ہے جہاں مطربۂ فطرت ہنگامۂ دنیا سے دور اپنے خاموش ترانے بلند کرتی ہے۔ وہ ترانے جو سامعہ نواز نہیں بلکہ دلنواز ہیں۔ یہاں کا سکوت موسیقی سے معمور ہے وہ موسیقی جو ساز سے ناآشنا مگر سوز سے بیگانہ نہیں :—

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں یہ صوت کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

شاعر کی روح فطرت کے اس نغمۂ سرمدی کو سنتی ہے اور اس کی ہم نوا ہو جانا چاہتی ہے —

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر
ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں لے ہو کر

ورڈس ورتھ کی طرح چکبست بھی فطرت کو انسان سے جدا نہیں تصور کرتے۔ سب ایک ہی "ہستی بیدار" کے کرشمے ہیں جو کائنات کے مظاہر و آثار، فطرت کے مناظر اور انسان و حیوان میں جاری و ساری ہیں —

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں بیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

آبشار سے اپنی ہستی کا موازنہ یوں کرتے ہیں —

ہے جسم خاک یہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے اس میں وہی روانی ہے

اقبال نے اپنی نظم " جگنو " میں اسی خیال کو اس بہتر پیرایہ میں بیان کیا ہے —

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

غرض کہ چکبست کی یہ نظم منظر نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ اور جس شعر پر اس منظر کو ختم کیا ہے وہ ان کے کیف و بیخودی کی انتہا ہے اور اس نظم کی شعریت پر مہر صداقت —

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے　　بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

فلسفۂ زندگی

میتھیو آرنالڈ نے شاعری کو تنقید حیات قرار دیا ہے۔ شاعر حیات اور مظاہر حیات کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اپنے کلام میں پیش کرتا ہے اور اسے ترتیب دے کر ہم اس کا فلسفۂ حیات اخذ کرتے ہیں۔ شاعر اور فلسفی میں دل و دماغ کا فرق ہوتا ہے۔ شاعر جو چیز جذباتی وجدان سے حاصل کرتا ہے فلسفی اسے عقلی وجدان سے، مگر شاعر کا نظریہ زود اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمارے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام پر بہت جلد تسلط حاصل کرلیتا ہے۔ بر خلاف اس کے فلسفی کا نظریہ خاص پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق یکسر فہم و ادراک، تفکر و تدبر سے ہوتا ہے۔ فلسفی سمجھتا ہے اور سمجھاتا ہے مگر شاعر محسوس کرتا ہے اور دوسروں کو محسوس کراتا ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ جو سمجھہ میں آے محسوس نہ ہو مگر ایسا زیادہ ہوتا ہے کہ محسوس ہو اور سمجھہ سے باہر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اکثر ان رموز حیات کی بھی عقدہ کشائی کرتا ہے جو فلسفی کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔

متقدمین شعراے اردو نے شاعری کے اس پہلو کو تقریباً نظر انداز کردیا۔ وہ عموماً غزل اور قصیدے میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے خیالات میں اتنا تناقص ہے کہ ان سے کوئی فلسفۂ حیات مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ہی غزل میں اکثر دو متضاد خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چونکہ چکبست نے غزلیات میں بھی طبع آزمائی کی ہے اس لیے پرانی روش کے زیر اثر ربط فکر نہ قائم رکھہ سکے۔ دوسرے اس صنف سخن میں غزل مسلسل کے سوا ارتباط خیال ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلیات میں ان کا تفلسف باہم کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ مگر چونکہ چکبست قدیم و جدید روش کے نقطۂ اتصال پر تھے اس لیے ادب انگریزی

اور جدید طرز شاعری کے اثر سے ان کے خیالات میں نسبتاً زیادہ تطابق ہے جس سے ان کا فلسفۂ حیات اخذ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں لاحق ہوتی - یہی نظریہ مع اپنے تمام لواحق کے ان کے سارے کلام کو متاثر کرتا ہے —

چکبست کی تعلیم اخلاق ان کے فلسفۂ زندگی سے اس قدر پیوستہ ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا - محض آسانیٔ تفہیم کے لیے دعنوان جدا کر کے تفریق کرلی گئی ہے —

ان کا ایک مشہور شعر ہے —

زندگی کیا ہے' عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

یہ شعر ان کے ابتدائی کلام کا ہے - اس کو ان کے فلسفۂ زندگی سے کوئی تعلق نہیں جو چکبست کا مذہب ہے - زندگی اور موت کو صرف عناصر کے ترتیب و انتشار سے تعبیر کرنا ایک ماہر حیاتیات کا کام تو ہو سکتا ہے مگر ایک شاعر کا نہیں - اس کا نظریہ کچھ اور ہے وہ زندگی اور موت کو کہیں زیادہ اہم نگاہوں سے دیکھتا ہے —

زندگی تلخی ایام کا افسانہ ہے زہر پینے کے لیے عمر کا پیمانہ ہے

چکبست کے فلسفۂ حیات میں ایک خاص چیز ان کا مسئلۂ تقدیر ہے - قدیم شعرائے اردو نے مسئلۂ تقدیر کو جس صورت میں پیش کیا ہے چکبست نے اسے بالکل الٹ دیا - یہیں آکر ان کی رجائیت جسے افسردگی کہنا زیادہ بہتر ہوگا غالب آجاتی ہے - وہ انسان کو فاعل مختار قرار دیتے ہیں اور زندگی کو ایک سلسلہ سمجھتے ہیں اعمال اور ان کے نتائج کا - تقدیر اور گردش لیل و نہار محض اعتباری چیزیں ہیں —

اعمال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی تقدیر کیا ہے گردش لیل و نہار کیا

یہ خود انسان کے اپنے افعال ہیں جو اس کی بربادی کا باعث بنتے ہیں ورنہ فطرت کو کسی سے پرخاش نہیں - اس کے لیے سب یکساں ہیں - لہذا گردش لیل و نہار کا گلہ بیکار ہے کہ یہ اپنی کمزوری کے اعتراف کا ایک بے جا طریقہ ہے - اگر انسان میں ہمت ہے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے —

نہ دشمن ہے زمیں میری نہ دشمن آسماں میرا — تہ و بالا کیا ہے گردش اعمال نے مجھ کو

ہم کوستے ہیں گردش لیل و نہار کو — خود ہی مٹا کے جوہر ایمان و آبرو

بندۂ تقدیر قسمت کا گلا کرتے رہے — اہل ہمت منزل مقصود تک آ بھی گئے

چکبست کی شاعری تمام تر درس عمل ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اعمال پر اتنا زور دیتے ہیں اور تقدیر کو بے معنی قرار دیتے ہیں - ورنہ ظاہر ہے کہ حالات اور مواقع بھی بہت کچھ انسان کی کامیابی و ناکامی کے باعث ہوتے ہیں - پھر تناسخ کا ماننے والا کبھی جبری نہیں ہو سکتا - کیونکہ جن حالات کی ناموافقت سے ہم اپنی ناکامی کو منسوب کریں گے ان کو وہ گذشتہ زندگی کے اعمال قبیحہ کے نتائج قرار دے گا' اور چکبست بھی تناسخ کے قائل ہیں —

فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا — عروس جاں نیا پیراہن ہستی بدلتی ہے

اسیری کے لیے ہم روح کو آزاد کرتے ہیں — نکل کر اپنے قالب سے نیا قالب بسائے گی

چکبست کا فلسفۂ محبت ان کے فلسفۂ حیات کا ایک خاص جز ہے - قدیم شعرائے اردو اکثر محبت کی برائی کرتے ہیں اور اگر تعریف بھی کرتے ہیں تو یوں کہ عشق کی دو قسمیں بتاتے ہیں ایک عشق مجازی اور ایک عشق حقیقی - عشق حقیقی کو قابل احترام جذبہ قرار دیتے ہیں اور عشق مجازی کو ایک آفت ناگہانی بلکہ " سیلاب بلا " سے تعبیر کرتے ہیں -

چکبست نے محبت کو صرف ایک جذبہ قرار دیا ہے اور اسے انسانی صفات کا جوہر بتایا ہے —

دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے خاک کے پتلے اسی جوہر سے انسان ہو گئے

وہ بھی مغربی شعرا کی طرح محبت کو حیاتِ انسانی کی ابتدا اور انتہا قرار دیتے ہیں —

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

موت انسان کو فنا نہیں کر سکتی اور یہی ایک جذبہ محبت کا انسان کے بقائے دوام کا باعث ہو سکتا ہے —

مردِ میدانِ محبت زندۂ جاوید ہیں موت آ جانے سے تو انسان مر جاتا نہیں

چکبست نیرنگیِ عالم اور بے ثباتیِ عالم سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور یہاں جو ان کے مزاج میں ایک قسم کی قنوطیت ہے جو غالباً شعرائے متقدمین کا اثر ہے اپنی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

زندگی کا چکر بڑی عجیب چکر ہے۔ ایک کی موت دوسرے کی زندگی ہے۔ خزاں کی رخصت بہار کی آمد آمد ہے۔ اور بہار کا خاتمہ خزاں کی تمہید۔ دریا کی بقا قطرے کے فنا ہو جانے میں ہے اور غنچوں کی موت بھی کیا کیا گل کھلاتی ہے —

کہا غنچے نے ہنس کر واہ کیا نیرنگِ عالم ہے
وجودِ گل جسے سمجھے ہیں سب وہ ہے عدم میرا
دیکھنا نیرنگ سازیِ طلسمِ نو بہار
پیرہن کلیوں کے پھولوں کے گریباں ہو گئے

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کائنات محض ایک تماشا گاہ ہے جہاں فطرت ایک لاعبانہ انداز سے اپنا دستِ تطاول دراز کرتی رہتی ہے تو

انسان کے وجود کی کیا ضرورت تھی جس میں رنج و غم اور تکالیف کے محسوس کرنے کی اتنی قوت ہے —

اگر کون و مکاں اک شعبدہ ہے اس کی قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لیے آیا قدم میرا

یہ وہی پرانا سوال آفرینش انسان کی علت غائی کا ہے اور چکبست یہاں صرف سوال کرکے چھوڑ دیتے ہیں- زندگی کی خواہش راز ہستی ہے ورنہ موت آسان ہے اور رنج و غم کا مزا تلخ —

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

حیات بعدالممات کے متعلق کہتے ہیں :-

سنتے ہیں روح کبھی رہتی ہے ارمانوں سے
مر کے بھی چین کی صورت دل ناشاد نہیں

ذوق کا مشہور شعر ہے -

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جب وہ اپنی افسردگی سے پریشان ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں -

ختم ہوتا نہیں کیوں ہستیء ناشاد کا راگ　پا بہ گل جسم سہی روح تو مجبور نہیں

جب ان کی قنوطیت ان کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے تو وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ رنج و غم ابتہاج و مسرت محض اپنے احساسات کا نام ہے -

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی　اس گلشن جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

مگر ان کی قنوطیت صرف اپنے خیالات تک محدود رہتی ہے ' وہ اس کی تعلیم نہیں دیتے - کیونکہ وہ نتیجہ ہے جذبات کے موسمی اضمحلال

کا جس سے کسی کو مفر نہیں - جب کام کا وقت آتا ہے ' تعلیم اخلاق اور درس عمل دینا ہوتا ہے تو ان کی رجائیت عود کر آتی ہے اور خیالات کا یہ تشائم بالکل دور ہو جاتا ہے - ان کی قنوطیت بے وجہ نہیں ہے یہ لازمی تھا کہ ان کے زمانے کی سیاسی فضا اور ان کی مرثیہ گوئی ان کے خیالات پر یہ رنگ بھی چڑھادے جسے ہم آگے چل کر زیادہ واضح کریں گے —

اخلاقیات

لکھا جا چکا ہے کہ پند و موعظت ' رشد و ہدایت شاعر کا فرض نہیں ' مگر ہر ملک کے شعرا نے زمانہ اور ماحول کے اقتضا کے بموجب اس اصول میں تبدیلی کی ہے - پھر نصیحت کے بھی کئی طریقے ہیں مثلاً غالب کا شعر ہے —

نہ سنو گر برا کہے کوئی		نہ کہو گر برا کرے کوئی

کس قدر بے کیف شعر ہے اگر اسے شعر کہا جا سکتا ہے - معمولی سے معمولی فہم و ادراک کا آدمی بھی اسے جانتا ہے - صرف عمل کرنے نہ کرنے کی بات ہے اور " نہ کہو " " نہ سنو " ایسے خوشگوار الفاظ نہیں کہ وہ لوگوں کو ادھر مائل کر سکیں - دنیا کے بڑے بڑے جلیل القدر پیغمبر اس کی تلقین کر چکے - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتنوں نے اس پر عمل کیا اور کتنے کریں گے - اب اگر غالب کے ان دو مصرعوں کا کسی پر کوئی خاص اثر پڑ سکے تو اسے شاعری کا سب سے بڑا معجزہ قرار دینا چاہئے - واعظ اور شاعر میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ واعظ اپنی نصیحت کھلم کھلا کرتا ہے اور شاعر شعریت کے پس پردہ - یہ صفت شاعر کی ذات سے اتنی وابستہ ہے کہ اس کے عدم وجود میں وہ کم از کم شاعر نہیں کہا جا سکتا - چکبست اسی شعریت کے پردہ میں اخلاقی تعلیم دیتے

ہیں۔ ان کے کلام میں یہ پردہ کہیں کہیں سے چاک ہو جاتا ہے ' مگر اس کا کیا علاج کہ جس ماحول میں وہ پیدا ہوے اخلاق کے اعتبار سے اصلاح کا محتاج تھا۔ جس کے بغیر قومی ترقی ناممکن تھی۔ بڑے بڑے مصلحین قوم سوسائٹی کی اخلاقی حالت درست کرنے میں منہمک تھے۔ پھر ایک شاعر جو قوم کے جذبات و خیالات کا ترجمان ہے ان سب باتوں سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ داخلی شاعری لازمی طور پر شاعر کی فطرت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ پروفیسر ڈیوڈ میسن انگریزی شاعر شیلی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ شیشے کے مکان میں رہتا تھا پتھر کے مکان میں نہیں۔ یعنی اس کی شاعری ایک شفاف شیشہ ہے جس کے ذریعے سے ہم اس کی فطرت کو عریاں دیکھتے ہیں۔ یہیں وہ موقع ہوتا ہے جہاں شاعر بلا کسی پند و نصیحت کے بالکل غیر محسوس طریقے پر اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس تعلیم کی نوعیت منحصر ہوتی ہے خود اس کی فطرت و افتاد طبیعت پر۔ مثال کے لیے غالب ہی کا شعر لیجئے۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

حضرت نیاز فتحپوری "شہاب کی سرگذشت" میں لکھتے ہیں "کس قدر مرتفع سطح پر پہنچ کر غالب نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ عام شعرا کے کلام سے یہ ایسا ہی ممتاز ہے جیسے رات کو آسمان کی بلندی میں چکور کی آواز زمین کے دوسرے طیور کی نغمہ سرائی سے ' جواہر طرف کلہ ' محسوس چیز ہے لیکن اس پر اعتماد نظر' حسن کی رسوائی ہے۔ ' اوج طالع لعل و گہر ' غیر محسوس ہے لیکن ' ذہنیات ' کی زندگی اسی سے وابستہ ہے "۔ یا فانی کا ایک شعر لیجئے اور شاعر کے وسعت ظرف اور حوصلے کی داد دیجئے —

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

چکبست کی شاعری میں داخلی رنگ بہت گہرا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر ان کی فطرت اور طبیعت کا صحیح مرقع ہوتا ہے - اور چونکہ خود ان کا اخلاقی معیار بہت بلند تھا اس لیے ان کی شاعری بہترین تعلیم اخلاق بن جاتی ہے —

چکبست کا مذہب " انسانیت " ہے - وہ انسان کے لیے انسانیت کو مقدم سمجھتے ہیں - " پاس انسان " اور " خدمت انسان " ہر شخص کا فرض قرار دیتے ہیں - تہذیب و تمدن کا سارا نظام اسی پر قائم ہے - J.S.Mill کا خیال تھا کہ خدا کو بے دلیل پہچاننے کا زمانہ گزر چکا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ Social Feeling کو اس کا قائم مقام بنایا جاے - چکبست ایک حد تک اس کے ہمخیال ہیں - ان کا بھی خیال ہے کہ بجاے " خوف خدا " کے اگر ہمارے دل میں " پاس انسان " ہے تو ہم بھی وہی کر سکتے ہیں جو ایک خدا سے ڈرنے والا - چنانچہ کہتے ہیں —

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے\
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ اس کو خوف خدا کہیں گے

پھر کہتے ہیں

یا خوف خدا یا خوف سقر ہیں دو ہی ایماں تیرے واعظ\
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گداز محبت بھی

چکبست کے خیال سے ہر وہ مسلک جو انسانیت کو زائل کرنے کی طرف مائل ہے باطل ہے - وہی شریعت قابل تسلیم ہے جو ہمارے دل میں انسان کی محبت پیدا کرے - انسانیت اصل مذہب ہے اور مذہب کے فروعات میں اختلاف و افتراق بے معنی —

واجب نہیں مذہب کے مسائل میں بھی حجت
بازیچۂ اطفال ہیں ہفتاد و دو ملت
بس قابل تسلیم اسی کی ہے شریعت
جس دل میں ہو انسان کے ایسے درد محبت
تہذیب پسندیدۂ آفاق یہی ہے
مذہب یہی ملت یہی اخلاق یہی ہے

پھر دنیا میں رہ کر دنیوی فرایض سے بے نیاز ہو جانا ' مذہب کی پیروی اتنی کرنا کہ زندہ در گور ہو جانا اور اپنے کو وقف عقبیٰ کردینا انتہاے خودی ہے جب کہ انسانیت ' مظلوم انسانیت ان کی مدد کی محتاج ہے ' ان کی ہمدردی کی طالب ہے - چکبست ایسے لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں —

انسان کی محبت کو سمجھتے ہیں یہ آزار
ہمدردیٔ قومی سے انھیں آئے نہ کیوں عار
رہتے ہیں سدا فکر میں عقبیٰ کی گرفتار
دنیاے کے فرائض سے نہیں ان کو سروکار
یوں جادۂ تسلیم و رضا مل نہیں سکتا
ان میں وہ خودی ہے کہ خدا مل نہیں سکتا

پھر کہتے ہیں

آشنا ہوں کان کیا انسان کی فریاد سے
شیخ کو ملتی نہیں فرصت خدا کی یاد سے

خدمت انسان کی جو وقعت چکبست کی نگاہوں میں تھی ذیل کے شعر سے معلوم ہوگی :

خدمت انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے

دل کے آئینے پہ الفت کی جلا کرتے رہے

یہی جذبات ان کے جذبۂ وفا کو بہت استوار بنا دیتے ہیں ۔ وہ "تمنائے وفا میں" مرنے کو اپنی آبرو سمجھتے ہیں اور راہ وفا میں ہمیشہ ثابت قدم رہتے ہیں یہاں تک دشمنوں کی بیوفائی بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرسکتی بلکہ ان کے لیے درس وفا بن جاتی ہے —

بروں سے بھی یہاں برتاو رکھتے ہیں بھلائی کے

بنایا با وفا اس دل کو صدقے بے وفائی کے

جلا دی دل کو میرے قلب دشمن کی سیاہی نے

کدورت واں بڑھی اور یاں کھلے جوہر صفائی کے

دشمن کی ذات سے وفا کی توقع رکھنا سراب سے آب کی تمنا رکھنا اور یخ سے شرار طلب کرنا ہے کیونکہ اس کی بے وفائی فطری ہے ۔ ہاں مگر دوستوں کا " دشمن ارباب وفا ہوجانا " غضب ہے ۔ اس کی بیوفائی دل توڑ دینے والی ہوتی ہے اور یارائے ضبط کا سخت ترین امتحان ۔ مگر چکبست یہاں بھی کامیاب رہتے ہیں —

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بے وفائی سے

وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

حسن ظن ہو تو ایسا ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ دوستی کا حق اگر کسی کو ہوسکتا ہے تو ایسے ہی شخص کو ہوسکتا ہے —

ان کی علاوہ ہمت ان کی رجائیت کا آئینہ ہے ۔ وہ مصیبت سے نہیں گھبراتے کہ یہیں انسان کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے براو فلک سچ

کہتا ہے کہ انسان کامیابی کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے - وہ کیا اور اس کی کامیابی کیا - سوال تو صرف "جوہر مردانہ" کا ہے جس کا اندازہ مصیبت ہی پڑنے پر ہوتا ہے —

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا

وہ حوادث زندگی کا مقابلہ نہایت پا مردی سے کرنے کو تیار ہیں - ان کا جوش عمل ایک سیلاب ہے جو ان عارضی رکاوٹوں سے نہیں تھم سکتا —

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی
دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

دوسروں کی نگاہوں میں گر جانا معمولی بات ہے کہ اس کا مداوا ممکن ہے مگر اپنی آنکھوں میں پست ہوجانا کمال بزدلی ہے اور لا علاج - شکست کوئی غیر معمولی چیز نہیں کہ اس کے بغیر فتح کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا مگر اعتراف شکست کامیابی کی امید کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیتا ہے - امکان کی دنیا بہت وسیع ہے اور ایک ذرا سی ہمت درکار :

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

فرومائگی دل کا علاج ناممکن ہے ورنہ ہر پھول گلشن بہ داماں اور ہر قطرہ بحر بے کراں ہو سکتا ہے - شعر —

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہیں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

مقصد زندگی نا معلوم ' غایت آفرینش معدوم اور نظام کائنات محض

ایک تماشا ۔ یہ سب درست ہے ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہماری ہستی کا منشا بے حسی اور مردہ دلی ہرگز نہیں جو خود زندگی کے منافی ہے ۔ شوق عمل تقاضاے مردانگی ہے ۔ یہاں آکر چکبست کی رجائیت اور قنوطیت کا بے مثل امتزاج ہوتا ہے اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا عنصر غالب ہے —

زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

چکبست کے اشعار میں ان کی تمکنت اور خودداری نمایاں طور پر جھلکتی ہے ۔ دل ضبط سے ناشاد رہے مگر لب شرمندۂ فریاد نہ ہو ۔ اگر ضبط کی طاقت نہ ہو تو فریاد کی جرات بھی نہ ہو ' دست سوال دراز کرنا کیا معنی ۔ اگر جذبۂ شوق کامل ہے تو مطلوب خود آجائے گا ۔ مثل مشہور ہے کہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے مگر چکبست کنویں کو اپنے پاس بلا کر پیاس بجھاتے ہیں —

دل وہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے
لب وہ لب ہے جو نہ شرمندۂ فریاد رہے
جذبۂ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں کہ دریا کو بلا لیتے ہیں

وہ اپنے درد و غم میں کسی کو شریک کرکے اس کے ممنون احساں نہیں ہوسکتے ۔ ان کی خودداری بھلا اس بار گراں کی کب متحمل ہوسکتی ہے —

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریک درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بار الم میرا

چشم تماشا سے دور پردۂ شب میں شبنم کی گوہر باریاں نمود و نمائش

سے کتنی بے نیاز ہوتی ہیں - گریباں صبح چاک ہوتا ہے اور سورج کی پہلی کرن پھولوں کے دامن موتیوں سے ٹکے ہوئے پاتی ہے - اسی طرح ایک سچے شاعر کا فیض " محتاج نمائش " نہیں - وہ فطرتاً عزلت پسند ہوتا ہے اور شہرت سے کنارہ کش - شہرت تو اسے خود ڈھونڈھ لیتی ہے - چکبست کہتے ہیں —

ان کی رباعی کا ایک شعر ہے —

کس واسطے جستجو کروں شہرت کی

اک دن خود ڈھونڈھ لے گی شہرت مجھکو

منزل عیش مجھے گوشۂ گمنامی ہے دل وہ یوسف ہے جسے فکر خریدار نہیں

دنیائے محبت کے رسم وآئین جداگانہ ہیں - وہاں کوشش خود اپنا حاصل ہے اور اس سے زیادہ ہوس لا حاصل - جستجو خود منزل مقصود ہے اور اس سے زیادہ کی تلاش گمراہی - شجر محبت خود اپنا ثمر ہے - اس شعر کی رجائیت ملاحظہ ہو

چمن زار محبت میں اسی نے باغبانی کی

کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

ان کے کلام میں قناعت کی جھلک اور استغنا کی بڑی شان ہے - اس کے متعلق اشعار " چکبست اور شعرائے متقدمین " کی تحت میں دیے جا چکے ہیں —

تصوف — چکبست کے فلسفۂ حیات اور اخلاقیات کے سلسلہ میں کچھ ان کے تصوف پر لکھنا ضروری ہے کہ ان کی شاعری کے گلدستۂ گلہائے رنگا رنگ میں یہ پژمردہ پھول بھی ہے - انھوں نے ایک پوری نظم " جلوۂ معرفت " کے عنوان سے لکھی جس میں فلسفۂ ویدانت کا اتمام کیا ہے - وہی برق تجلی جو کبھی بالائے طور لہرائی تھی ساحل ہند پر بھی چمک جاتی

ہے۔ صہبا کدۂ عرفان سے اہل دل توحید کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ وہاں میں کثرت فی الوحدت کی تلقین کی جاتی ہے۔ ذرہ و خورشید ایک اسی رشتۂ نور میں منسلک ہیں۔ جوشش شباب و روانیٔ آب کا عنوان وہی ہے۔ رگ گل میں خون جگر، نوک خار میں خلش نشتر، حسن میں تمکنت، دیوانے میں جوش وحشت، شمع میں شعلۂ دلگداز، پروانے میں محبت کا سوز و ساز، گلزار میں رنگ و بو، کہسار میں آب جو، قلب مجذوب میں شوق فراواں، دل شاعر میں درد پنہاں بن کر وہی سمایا ہے۔

تکاپوے جنوں سواد لامکاں پر ختم ہوتی ہے اور منزل مقصود پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ جسے ابتدا سمجھے تھے وہی انتہا ہے۔ خودی حرف غلط، خدا لفظ بے معنی اور جلوۂ جانانہ کی ضیا پاشیوں میں امتیار من و تو فراموش۔ چکبست کہتے ہیں —

کہتے ہیں خودی کس کو خدا نام ہے کس کا
دنیا میں فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

درد کا شعر ہے —

جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرے
جس کی خاطر تجھے تکا پو ہے

غالب کے نقطۂ نگاہ میں "جلوۂ یکتائی معشوق" کائنات کی حقیقت اور خود بینیٔ حسن تکوین آب و گل کی علت ہے۔ چکبست کے خیال سے دنیا کسی کے حسن سحر طراز کا طلسم ہے اور "نقشبندیٔ کون و مکاں" اسی کی فسوں کاریوں کی رہین منت —

کس کے فسون حسن کا دنیا طلسم ہے ہیں لوح آسماں پہ یہ نقش و نگار کیا
جادو کسی کے حسن کا چلتا ہے رات دن بے کار نقشبندیٔ کون و مکاں نہیں

نزاع کفر و ایماں راز ہستی سے نا واقفیت ہے اور زندگی ایک ایسا خواب جس کی تعبیر نہیں —

یہ حیات عالم خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دین میں خراب ہے جسے علم راز جہاں نہیں

میر کا شعر ہے ۔ اختصار ملاحظہ ہو ۔

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ہم جسے ذات سمجھتے ہیں محض مجموعہ صفات ہے ۔ اصل ذات کا ادراک ہم کو نہیں ہوتا —

جو ظہور عالم ذات ہے یہ فقط ہجوم صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسم وہم و گماں نہیں

مصحفی کہتے ہیں —

سیر جہاں سے ہم کو خبر ہے بھی اور نہیں
اک واہمہ سا پیش نظر ہے بھی اور نہیں
دیکھے تک آنکھ کیوں کے غافل جو تو تو پھر
ہستی تیری برنگ شرر ہے بھی اور نہیں

چکبست کو نہ رنگ مائل کرتا ہے اور نہ بو فریفتہ کرتی ہے ۔ یہ محض صفات ہیں جو محسوسات میں سے ہیں ۔ ان کو اصل ذات کی جستجو ہے جو ان سب کی مبداء ہے اور جو حدود چمن میں نہیں ہے —

ہے رنگ آنکھ کو محسوس اور دماغ کو بو
وہ شے جو اصل میں گل ہے کہیں چمن میں نہیں

چکبست کا مسلک بھی وہی ہے جو بے سجادہ رنگین کن کی

تلقین کرتا ہے —

مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا رند مشرب ہوں
وہی ایماں ہے جو کچھ کہے پیر مغاں میرا

یہی نہیں بلکہ وہ اپنے پیر مغاں اور اس کے حلقۂ ارادت کو جنت میں بھی نہیں بھولتے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں —

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبت پیر مغاں کے ہیں

چکبست بحیثیت سوشل ریفارمر

چکبست کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی سوسائٹی مغربی تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے لگی تھی اور اس اعتبار سے بہت کچھ تغیر پیدا کر چکی تھی۔ اس معاملے میں دو جماعتیں تھیں ایک تو ان قدیم خیال حضرات کی جو مغرب کی کورانہ تقلید کو فرض سمجھتے تھے اور ہر چیز کو تہذیب جدید کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے میانہ روی کو بہتر قرار دیا۔ لیکن حد اعتدال کے تعین میں ان میں بھی آپس میں اختلاف ہو گیا۔ چکبست نے بھی اعتدال پسند کیا۔ مگر ان کی حد اعتدال اکبر الہ آبادی کی حد اعتدال سے نسبتاً بڑھی ہوئی ہے۔ پھر بھی جب ان جماعتوں کی تفریق کی جائے گی تو اعتدال پسند لوگوں کے زمرہ میں چکبست کا بھی شمار ہوگا اور اکبر کا بھی —

بہرحال چکبست اعتدال پسند ہیں۔ وہ یورپ کی کورانہ تقلید کے قائل نہیں۔ وہ صرف اس تقلید کو روا رکھتے ہیں جو ملک کی فلاح و بہبودی کا باعث ہو سکے۔ ان کی نظم "دردِ دل" کے دو بند ملاحظہ ہوں —

حیم اکبر سے جو پورب کے ہوے ہیں ممتاز
ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر اُنھیں ناز
بیریاران طریقت سے ہے غیروں سے ہے ساز
وہ بنائی ہوئی چتون وہ انیلے انداز!
لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرفداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

ان کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھہ سروکار
ظاہری شان و نمائش پہ دل و جاں ہیں نثار
ہیں وہ سمجھنے میں کہاں غیرت قومی کے شرار
جن سے مغرب میں ہوے خاک کے پتلے بیدار
سیر یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو و لعب سیکھا ہے

ان بندوں میں طنز خوب ہے - خصوصاً پہلے بند کی ٹیپ کا مصرع ثانی - بے ساختگی ہے مگر منہ پھٹ نہیں ' شوخی ہے مگر سنجیدگی لیے ہوے - چکبست کی طنز اکبر کی طنز سے جدا ہے - اکبر کی طنز زیادہ مضحکہ خیز اور ہجو آمیز ہے - چکبست کی طنز زیادہ لطیف و سنجیدہ ہے - اکبر الہ آبادی خنجر سے کام لیتے ہیں چکبست نشتر سے —

مغرب کی جو بات قابل تقلید ہے اس کی کسی کو پروا نہیں - اصلاح و آزادی کے لیے یورپ کی تقلید ضروری سمجھی جاتی ہے مگر کوئی اپنے کو اس کا اہل نہیں بناتا —

آزادی و اصلاح کے جب آتے ہیں اذکار تقلید ہو یورپ کی یہی رہتی ہے گفتار
موجود مگران میں وہ جوہر نہیں زنہار مغرب میں جو تہذیب و ترقی کے ہیں اسرار

وہ حب وطن خون میں شامل نہیں رکھتے
گو ولولے رکھتے ہیں مگر دل نہیں رکھتے

اکبرالہ آبادی عموماً نقائص کو بتلا کر خاموش ہو جاتے ہیں ' وہ صرف ہنس پڑتے ہیں - یہ اصول اچھا ہے کیونکہ پند و موعظت سے انسان فطرتاً بھاگتا ہے - مگر چکبست صرف تنقیص پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ راہ راست پر بھی بلاتے ہیں - اور عموماً شعریت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ورنہ کلام پھیکا اور بے کیف ہو جاتا ہے - جس کی مثالیں ان کے ابتدائی کلام میں زیادہ ہیں —

عورتوں کی آزادی کے معاملے میں بھی وہ اعتدال پسند ہیں - ان کی ایک پوری نظم " پھول مالا " ہے جس میں وہ قوم کی لڑکیوں سے تخاطب کرتے ہوے بتاتے ہیں کہ آزادی کا صحیح معیار کیا ہے - اس نظم میں انہوں نے بتایا ہے کہ وہی آزادی محمود ہے جو قومیت کے منافی نہ ہو - بالکل مغربی عورتوں کا طرز و انداز ان کی ظاہری نمود نمایش کبھی ایک ہندوستانی عورت کے لیے مستحسن نہیں کہی جا سکتی —

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

یہ مد نظر رکھتے ہوے کہ یورپ کی نمود و نمائش کو وہ در خور ستائش نہیں قرار دیتے سمجھ میں نہیں آتا کہ یورپ کے رنگ و روغن

سے ان کا کیا مطلب ہے جس کی مبارکباد وہ اس قدر فیاضی سے دیتے ہیں اور قوم کے نقش سے ان کا کیا مفہوم ہے جس کے قائم رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا یورپ کے رنگ و روغن کے ساتھ بقائے نقش قومی ممکن بھی ہے یا نہیں اور آیا اس کے داغدار ہوجانے کا تو احتمال نہیں؟ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور چکبست کی شاعری نے ان کی اچھی پردہ داری کی ہے —

وہ عورتوں کی آزادی کو اسی حد تک پسند کرتے ہیں جہاں تک کہ شرم و حیا کی پابندی اجازت دے سکتی ہے —

رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

وہ انھیں وفا کی تعلیم دیتے ہیں، بچوں کی تربیت پر متوجہ کرتے ہیں اور قدیم خیال بزرگوں کے احترام کی تلقین کرتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں —

ہم تو ہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

ایک روشن خیال ہندو کی طرح چکبست بھی بیوہ عورتوں کی شادی کے موافق ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کے فرقے میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی۔ اس کے خیر مقدم میں چکبست نے اپنی نظم " برق اصلاح " لکھی۔ اور ان کے اس شوق اصلاح کی خوب داد دی۔ انھوں نے بتایا کہ جبر کرنا اخلاق کی شان نہیں۔ ہندوستان کی اس جہالت کی وجہ سے نہیں معلوم کتنے بے گناہوں کا شباب بلکہ سرمایۂ حیات مٹی میں مل گیا —

آج اس ظلم کی بنیاد ہلی جاتی ہے
خاک میں صحبت دیرینہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے اب سنگ دلی جاتی ہے
یاں کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی ہے
سرد قوموں کو سبق یوں ہی سکھا دیتے ہیں
دل میں جو تہانتے ہیں کرکے دکھا دیتے ہیں

چکبست انسان کی آزادی کے لیے مذہب کی غیر ضروری بیڑیوں کو توڑ دینا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس قسم کی تحدید و امتناع سے ارتقاے قومی کا سد باب ہوتا ہے —

حالت زخم سے جب حالت نا سور ہوئی
فکر مرہم دل پر درد کو منظور ہوئی
جور مذہب کی بلا قوم سے کافور ہوئی
شکر ہے کالے کی گردن سے چھری دور ہوئی
غم نہیں دل کو یہاں دین کی بربادی کا
بت سلامت رہے انسان کی آزادی کا

چکبست ہندو مسلم اتفاق کے زبردست حامی ہیں - وہ خوب سمجھتے ہیں کہ بغیر اتحاد کے قومیت کا کوئی مفہوم نہیں اور آپس کے تنازع قومیت کی جڑ کاٹتے ہیں - اغیار ہنستے ہیں اور وطن کی تضحیک ہوتی ہے —

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تفرقے کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی ہے

کہ ان کا طے ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ خصوصاً جب طرفین خود مصالحت پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے ۔ چنانچہ بہت مایوسی کے ساتھہ کہتے ہیں کہ

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرز ہندو دیکھہ کر رنگ مسلماں دیکھہ کر
اذان سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھہ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

تعصب کا کانٹا دل میں ایسا پیوست ہوگیا ہے کہ

جدا سینے سے دل ہو دست و بازو قوم کے شل ہوں
مگر دل سے جدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا

ہندوستان کی جو حالت ہندو مسلم نا اتفاقی سے ہوگئی ہے اس کی اس سے بہتر کیا تصویر ہوسکتی ہے —

گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے
اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا

پھر جو لوگ اس تعصب کو مٹانا چاہتے ہیں ان کو متعصب قرار دیتے ہیں لہذا جب چارہ گر کو قاتل سمجھیں گے تو زخم کا اندمال معلوم

جسے ہے فکر مرہم کی اسے قاتل سمجھتے ہیں
الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا

مگر جب معاملات کے روشن رخ پر آتے ہیں تو خود بھی فکر مرہم کرتے ہیں ۔ وہ نغمۂ ناقوس اور آوازہ اذاں کو آزادی کی لے میں ملا دینا چاہتے ہیں ۔ وہ تمہارے آزادی کے رشتے میں قوم کے اجزائے پریشاں کو وابستہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اغیار سچ کہتے ہیں کہ رنگ وطن یکساں نہیں

ہے اور خاک ہند کا دامن " قوس قزح " بنا ہوا ہے - لیکن اگر سب آزادی کے طلب گار بن جائیں اور غلامی کا بادل ہٹ جائے تو پھر یہ تمام رنگ اس ایک نور میں مبدل ہو جائیں جو ان سب کا منبع و مرجع ہے جس سے یہ پھوٹ نکلے تھے —

رقیب کہتے ہیں رنگ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں!
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

چکبست نے ایک نظم شراب کی برائی میں بہ عنوان " آب انگور " لکھی ہے - اور شعریت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے - مگر شراب نے جو حیثیت اردو شاعری میں حاصل کرلی ہے خواہ وہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے نظم بے کیف سی معلوم ہوتی ہے - خدا بھلا کرے مولف کا کہ اس نظم کے بعد ہی " برسات " کی نظم رکھی ہے - جس کا مطلع یہ ہے —

ہے دلاتی یاد سے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی

چونکہ سنا ہے کہ شراب معرفت کے لیے کسی موسم کی تخصیص نہیں اور صرف وہی شراب ہے جو بلا موسم پی جاتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس " مے نوشی " سے ہمارے رند پارسا کا کیا مفہوم ہے - بہر حال اس کے پڑھنے سے پہلی نظم کا تنغض رفع ہو جاتا ہے —

چکبست کا زمانہ ہندوستان کے معاشی و اقتصادی ارتقا کا زمانہ تھا پرانے اخلاقیات کے اصول بہت کچھہ اپنا مفہوم بدل چکے تھے - قناعت کا مفہوم سستی اور کاہلی ہوگیا - (ع) تکیہ خدا پر کیجئے دروازہ بھیڑیے - دولت کی برائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس کا حاصل کرنا بے سود سمجھنے لگے اور اہل دولت کو بری نظروں سے دیکھنے لگے - چنانچہ چکبست نے ایک نظم دولت کی تعریف میں سپرد قلم کی ہے جو بالکل جدید نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ دولت بذات خود اچھی بری نہیں - یہ اس کا مصرف ہے جو اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے - اب اگر ہم اچھائی کے متلاشی ہیں تو یہ کیا ضرور کہ ترک دولت کریں اور تکالیف اُٹھائیں اور کیوں نہ اسے حاصل کرکے اچھے کاموں میں صرف کریں اور فائدہ اٹھائیں - لاریب کہ دولت کی ہوس ضرورت سے زیادہ بڑہ کر مخرب اخلاق ہو جاتی ہے مگر یہ انسان کا قصور ہے نہ کہ دولت کا —

زر آپ نہیں دشمن اخلاق و ادب ہے
جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے

پھر دولت کو ہم مذہبی کاموں میں لگا سکتے ہیں ' اس سے ہم غربا کی مدد کرسکتے ہیں - دولت حاصل کرکے دوسروں کی پرورش کرنا قناعت کرکے اپنا پیٹ پال لینے سے بہتر ہے - دولت و ثروت حاصل کرکے غریبوں پر چشم عنایت رکھنا - قناعت کرکے جاہ و ثروت پر ٹھوکر مار دینے سے بہتر ہے - اسی حالت کی ایک تشبیہہ دیتے ہیں - شعریت ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے —

یا باغ میں کھلتا ہے دم صبح گل تر
کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسر

بلتا ہے عروسان جہاں کے لیے زیور
دستار میں نوشہ کے رہا کرتا ہے اثر
لیکن نہ کسی وضع پہ اس رنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا

حب وطن اور حب قومی

اردو شعرا میں چکبست سے زیادہ حب وطن اور حب قومی کسی کے کلام میں نہیں ملے گا - اس لیے انھیں اردو کا بڑا قومی شاعر کہنا بے جا نہ ہوگا - ان کی شاعری یکسر " ترانۂ ہندی " ہے - ان کا نغمہ بھی ہندی ہے اور لے بھی - ان کا سارا کلام ان کے جذبۂ و طنیت وقومیت سے متاثر ہے —

" خاک ہند " میں کہتے ہیں —

شیدائے بوستاں کو سرو چمن مبارک
رنگین طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

مادر ہند کی عظمت مسلم ہے - اس کے لیے فیض قدرت کا ابدی سر چشمہ کھلا ہوا ہے - اس کی جبیں حسن ازل کے نور سے تابندہ ہے - ہر صبح آفتاب عالمتاب کی اشعۂ اولین ہمالہ کی چوٹیوں کو سنہرے موبات میں گوندھتی تھیں - اس وقت جب کہ سارے جہان پر ابر وحشت طاری تھا اور جہل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی یہ سر زمین چشم و چراغ عالم تھی - اس وقت جب کہ محفل یونان بھی محتاج شمع تھی اس وادیٔ کہن میں

مہر دانش ضو افشانی کررہا تھا - ہندوستان کی یہ گذشتہ عظمت ' اس کی تہذیب دیرینہ ' اس کے رنگا رنگ مناظر ' اس کے عہد ماضی کے مذہبی پیشوا ' اس کے جلیل‌القدر تاجدار ' جن کا گانا وہ اپنی نظم " خاک ہند " میں گاتے ہیں ان کے لیے باعث فخر بھی ہیں اور باعث عبرت بھی —

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

وہ دیکھتے ہیں کہ گلشن ہند کے برگ و ثمر اب بھی تروتازہ ہیں - طاوس جنگلوں میں مصروف رقص ہیں ' برق میں وہی تڑپ اور رعد میں وہی گرج ہے ' فغاں ناقوس اب تک پر جوش اور کیفیت اذان فردوس گوش ہے ' مگر دل کے حوصلے پست ہیں اور سینوں میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی ہمت باقی ہے - چنانچہ کہتے ہیں —

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

ان کا درد مند دل ہندوستان کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتا - وہ بے تاب ہو جاتے ہیں - جذبات کا تراکم و تلاطم اور انسان کا دل جس کی حقیقت ایک قطرۂ خون سے زیادہ نہیں ! جام چھلک جاتا ہے - روح کے اس گریۂ معصوم میں ایک توازن پیدا ہوجاتا ہے - یہی موسیقی ہے جو اس بند میں الفاظ کا جامہ پہنے ہوے ہے —

برسوں سے ہورہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

روح کے انتہائی حزن و ملال کی کیفیت میں جذبات کی اس سوگوار فضا میں کلام کی روانی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے دھندھلکے میں چشمہ آب بہہ رہا ہے۔ پھر ان کی رجائیت ان کی افسردگی پر غالب آتی ہے اور ایک ایسے جوش تمنا کے ساتھ جو مایوسی کے رد عمل کا لازمی نتیجہ ہے پکار اٹھتے ہیں —

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چمن میں گلچیں بھی ہے اور عندلیب بھی۔ گلچیں کی دراز دستی صرف دامن گل تک ہے۔ مگر بلبل کی نگاہ میں تو اس کے خس و خاشاک بھی قابل قدر ہیں کہ انہیں سے اس کے آشیاں کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہیں دیوانہ و ہشیار کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ چکبست کہتے ہیں —

ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
ہم پوجتے ہیں باغ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

قوم کی محبت میں چکبست مست و سرشار ہیں۔ دیوانے ہیں اور ایسے

کہ اپنی دیوانگی کو صد ہزار دانش کے عوض دینا پسند نہ کریں گے - یہ نسخہ ان کے ہاتھ ایسا لگا جس سے وہ نہ صرف دوسروں کے دل تسخیر کر لیتے ہیں بلکہ خود ان کی روح اس سے کسب فیضاں کرتی ہے - وہ قوم کے دکھ درد سے اتنا متاثر ہیں کہ اپنا رنج و غم فراموش کر بیٹھتے ہیں -

دل کئے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے
قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

وہ ہندوستان کی غلامی کو دیکھتے ہیں' ان کا دل کڑھتا ہے- پھر ہندوستانی اس غلامی کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ انہیں یاد بھی نہیں آتا کہ وہ کبھی آزاد بھی تھے —

یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

طائر چمن کو قفس کے آب و دانہ سے کیا انس ہو سکتا ہے- مگر بے بال و پری میں اس کا بھی تو ڈر ہے کہ "چھوڑ نہ دے صیاد کہیں"- یہ اپنی بے بسی کی انتہا ہے کہ ہم اغیار کے دست نگر بھی ہیں اور ممنون احسان بھی' اسیر بھی ہیں اور بار کش منت صیاد بھی -

آب و دانہ سے قفس کے کچھ ہمیں الفت نہیں
بے پرو بالی سے اپنی عاشق صیاد ہیں

غلامی اب بہر صورت مجبوری ہے اور اکثر قوموں پر یہ وقت پڑا ہے - مگر سب سے زیادہ مایوس کن ذہنیت کی غلامی ہے' کیونکہ غلامی کے احساس کے مٹ جانے سے آزادی کے تمام امکانات محو ہو جاتے ہیں —

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پر فن میں

کہ زیور ہو گیا طوق غلامی اپنی گردن میں

لوگوں کی یہ حالت کہ بچوں سے لے کر بڈھوں تک ہر شخص غلط کاریوں میں مبتلا ہے - فکر مداوا کون کرے - مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید آپس کا تعصب، تعلیم کی کمی، عسرت و افلاس، غرض ہر وہ خرابی جو ایک قوم کے لیے "دیباچۂ زوال" ہوسکتی ہے موجود - چکبست اسے محسوس کرتے ہیں اور کس مایوسی سے کہتے ہیں —

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی

پر اب عروج وہ علم و کمال و فن میں نہیں

رگوں میں خون ہے وہی دل وہی جگر ہے وہی

وہی زبان ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں

وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس

خدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں

وہی ہوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے

وہی چمن ہے پہ وہ باغباں چمن میں نہیں

اور پھر کس قدر بیزار ہو کر کہتے ہیں —

غرور وجہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا

بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

ایسی ناگفتہ بہ حالت میں مصلحین کا رنگ اور بھی دگرگوں ہے - حمیت قومی سے دلوں کو مس نہیں - زور بیاں اور طرز بیاں سے لوگوں کے دل لبھانا چاہتے ہیں - اس سے ان کی شہرت تو ضرور بڑھ جاتی ہے مگر قوم کے مفاد کی کوئی صورت نہیں نکلتی - لیکن ان کا مقصد تو محض

اپنا نام و نمود ہے جو حاصل ہے - چکبست یہ دیکھتے ہیں اور کس حسرت سے کہتے ہیں —

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

چکبست ہندوستان کے لیے آزادی کے خواہاں ہیں - کوئی آرزو ہے تو یہ اور ارمان ہے تو یہ اور وہ بھی یوں جیسے گنگا کی موجوں میں تاروں کا عکس جھلملاتا ہے - پھر بے تابی کا یہ عالم ہے —

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

وہ اس آزادی کے حصول کے لیے جو ان کے نقطۂ نگاہ سے ہر ہندوستانی کی زندگی کا تنہا نصب‌العین ہونا چاہئے سب کچھہ کرنے کے لیے تیار ہیں - مادر ہند کی تصویر سینہ پر آویزاں ' بیڑیاں پیر میں اور کفنی گلے میں - یہ اس چکبست کی تصویر ہے جو آزادی کا عاشق ہے جس کی فریاد و فغاں پر مہر خاموشی لگادی گئی ہے ' جو آزادی کے جنون میں کانٹوں کے فرش کو پھولوں کا بستر سمجھتا ہے اور شور سلاسل کو نغمۂ آزادی میں مدغم کر لیتا ہے —

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی
اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادر ہند کی تصویر ہو سینہ پہ بنی
بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی
ہو یہ صورت سے عیاں عاشق آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوق وفا کا یہی جوہر ہوگا
فرش پھولوں کا ہمیں کانٹوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جاے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا
قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو سرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

آزادی کے جذبات اور ولولے کبھی پابند نہیں کیے جاسکتے - دنیا کی کوئی قوت ان سے وہ نہیں چھین سکتی جو ان کا فطری حق ہے - یہ وہ چیزیں ہیں جن کی وسعت ' جن کی پہنائی ' جن کی پرواز کبھی حلقۂ زنجیر میں محدود نہیں ہوسکتی —

پاک ہے جوش سخن خوف کی تدبیروں سے
ولولے روح کے آزاد ہیں زنجیروں سے
زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے
دلی اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

ہمارا پا بہ زنجیر ہونا تو علامت ہے ہماری آزادی کی جب تک ضمیر آزاد ہے ' طوق و سلاسل کا کوئی مفہوم نہیں —

در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آزادی کی کیا نوعیت ہے جس کے لیے چکبست اس قدر عریاں طور پر بے تاب نظر آتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں

آزادی کے متعلق ان کا سیاسی مطمح نظر کیا تھا ؟ ان کی ایک نظم جو لکھنؤ میں دسمبر سنہ ۲۲ ع کی کانگریس کے اجلاس میں گائی گئی تھی ان کے نظریے کی حامل ہے - اس کا آخری بند یہ ہے —

اس خاک دل نشیں پر بادل سا چھا رہا ہے
طوفان بے کسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دور حسرت دنیا سے جا رہا ہے
مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آرہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اس اجمال کی تفصیل ان کے کلام میں نہیں ملتی - وہ ڈومینین اسٹیٹس کے قائل ہیں - کیوں قائل ہیں اور کن اصول کے ماتحت اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ نہیں بتاتے اور بحیثیت ایک شاعر کے ان کا یہ فرض بھی نہیں - اسٹافرڈ بروک کو ٹنی سن کا نظریۂ آزادی اسی وجہ سے نہیں پسند آیا کہ وہ نہ صرف عوام کے جذبات کے منافی تھا بلکہ جن اصول کے ماتحت ٹنی سن اس کی تکمیل چاہتا تھا حد درجہ غیر شاعرانہ تھے اور نتیجہ کے رو نما ہونے کا امکان صرف مستقبل بعید میں ہو سکتا تھا - چکبست کا نظریہ اتنا مایوس کن نہیں - وہ اپنی شاعرانہ پیش بینی سے کام لے کر ایک خاص ملہمانہ انداز سے فرماتے ہیں —

لیکن یہ دور حسرت دنیا سے جارہا ہے
مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آرہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

بس یہی ایک شاعر کا فرض ہے۔ وہ منزل مقصود کے طرف اشارہ کرتا ہے اور اپنے نغموں سے جوش رہروی پیدا کرتا ہے۔ جادۂ پیمائی کے اصول نہیں بتاتا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ جس طرف وہ اشارہ کر رہا ہے وہی منزل مقصود کیوں ہے۔ یہ تفصیل کچھہ نثر ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ "صبح امید" کے رسالوں میں اس کے متعلق چکبست کے کچھہ رشحات قلم مل جائیں۔ یہاں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت ایک شاعر کے انھوں نے اپنے نظریۂ آزادی کو کس صورت میں پیش کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں تو چکبست اگر اپنے کلام میں آزادی کی تعین نہ کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح ان کی نظمیں پوری قوم کو جس میں کہ ہر خیال کے لوگ شامل ہوتے زیادہ مستقل طریقے سے متاثر کرتیں۔ چکبست نے اپنے اس نظریۂ آزادی کو ایک جگہ یوں پیش کیا ہے۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں —

مجھہ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

اس میں "کون کہتا ہے" کا ٹکڑا کس قدر پر معنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ اور دوسری طرف سے جو عذر پیش ہوا ہے اس کے جواب میں اپنے حق کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم کو تمہارے حصے سے کوئی سروکار نہیں۔ پھر صیاد چمن میں طائر کی نواسنجیاں سننے کے لیے تو رہتا نہیں۔ اس کا کام تو

دام تزویز بچھانا ہے - اس کی طرف سے یہ بے نیازی یا تو انتہائے مجبوری ہے یا ایک مرتبہ کچھ کھو کر سیکھ لینے پر اعتماد —

چکبست کو قوم کے ان رہنماؤں سے جو واقعی قوم کے لیے اپنا دل دکھاتے ہیں سچی ہمدردی ہے - وہ ان کے ایثار و محبت کی دل کھول کر داد دیتے ہیں اور دوسروں کے لیے ان کی مثال قائم کرتے ہیں - ان کی نظم " مسز بسنت کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا " ان کی اس دلی ہمدردی کا بین ثبوت ہے —

لہلہاتا ہے محبت کا ترے دل میں چمن
ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر ہمیں تیرا دامن
تری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن
تیرے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبح وطن
دل پر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری

وہ غریب‌الوطن ہندوستانیوں کو بھی نہیں بھولتے اور ان کے مصائب و آلام کا حال سن کر تڑپ جاتے ہیں - اہل وطن کو ان کی امداد پر مائل کرتے ہیں اور ان کی غفلت پر نفرین ' کبھی التجا کرتے ہیں ' کبھی لعنت و ملامت ' کبھی خوشامد ہے ' کبھی قہر و عتاب اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی نظم " فریاد قوم " " لہو کے رنگ میں ڈوبی ہوئی " ہے - وہ " افسانہ " نہیں ہے بلکہ " مرثیہ " ہے ایک قوم کا جس میں آثار زندگی مٹ چکے ہیں۔ افریقہ میں ہندوستانیوں پر مظالم ہوتے ہیں اور فلک جفا جو کے لیے کوئی " طرز ستم " باقی نہیں رہ جاتا ہے - چکبست اس سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں —

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد و قوم کے دم ساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز
وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر اپنا
"ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر اپنا"

چکبست کی قومی نظمیں ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جذبات کی بہترین مظہر ہیں اور ضرورت بھی اسی کی تھی کیونکہ اگر ہندوستان کو کسی طبقہ سے امید ہو سکتی تھی تو وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی کا طبقہ تھا اور ہندوستان کا مستقبل بہت کچھ اسی کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر ایک مردہ دل آدمی بھی ایک خاص طرح کی زندگی اور قوت عمل محسوس کرتا ہے - چکبست خود بھی مست شباب ہیں مگر اس مستی میں بھی پاؤں کو لغزش نہیں ہوتی۔ خیالات بھکتے ہیں اور ان کی پرواز عالم بالا ہی کی طرف رہتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں -

مست کر دیتی ہے ایسا یہ شراب سر جوش
نظر آتی ہے مئے حسن سے دنیا مدہوش
سیر جنت میں رہا کرتے ہیں چشم و لب و گوش
مجھ سے کہتا تھا جوانی میں مرا بادہ فروش
ہر گھڑی عالم بالا پہ نظر رہتی ہے
کہیں انساں کو دنیا کی خبر رہتی ہے

پھر اسی ترنگ میں کہتے ہیں -

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

کوئی چیز برق کی سرعت کے ساتھہ جسم کی رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے —
مسزبسنت کی نظم میں کہتے ہیں —

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جاے
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جاے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جاے
پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جاے
ہوں خبردار جنوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھہ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

ان کے نزدیک حاصل شباب حب وطن ہے اور جوانی کا بہترین معیار حب‌وطن کا جوش —

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سوداے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

قوم کے سورماؤں کو یوں الوداع کہتے ہیں

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں
کچھہ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

چکبست اپنی آتش نوائیوں سے ہمارے دلوں میں آگ لگا دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نغمے سلا دینے والے نہیں ہیں بلکہ خواب سے بیدار کر دینے والے ہیں۔ ان کی وطنی اور قومی شاعری ایک بانگ جرس ہے جو ہر گُم کردۂ منزل کو

اپنی جانب بلاتی ہے - ایک فوجی باجہ ہے جو تھکے ماندے سپاہیوں میں شوق وہ نوروں پیدا کرتا ہے - وہ ترانہ ہے ایک مضطرب اور بے چین روح کا جو سکون و جمود سے گھبرا کر ہیجان و تلاطم کی متلاشی ہو اور افسانہ ہے ایک درد مند دل کا جو قوم کی غفلت شعاریوں سے بیزار ہوکر چیخ اُٹھتا ہے —

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے

نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے

لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے

نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ

جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

مراثی | شعرائے متقدمین کے یہاں مرثیہ ایک مذہبی چیز ہوکر رہ گیا - اور اس کا اطلاق زیادہ تر واقعۂ کربلا کے متعلق مراثی پر ہونے لگا - اس میں شک نہیں کہ ہمارے مرثیہ گو شعرا نے اس قسم کے مراثی کو ان کے معراج کمال پر پہونچا دیا - اور اس کو اتنی ترقی دی جس کی نظیر کسی زبان کی شاعری میں نہیں مل سکتی - اور واقعہ ہے کہ ان کا جو احسان اردو شاعری پر ہے اس کا اعتراف زبان قلم سے ممکن نہیں - مگر مرثیہ کے حدود تو اور زیادہ وسیع ہیں جس میں کہ قومی اور شخصی مراثی بھی شامل ہیں - قومی مراثی کی جستجو شعرائے متقدمین کے یہاں بے کار ہے - اس لیے کہ وہ قومیت کے مفہوم ہی سے نا آشنا تھے - ہاں شخصی مراثی کی دو چار مثالیں شاید تفحص و کاوش کے بعد مل جائیں - مثلاً ایک تو غالب کا مرثیہ ہے جو عارف کی موت پر لکھا گیا تھا - جس کا ایک شعر یہ ہے —

کیوں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ایک مرثیہ مومن نے اپنی معشوقہ کی موت پر لکھا ہے ۔ اس مرثیہ میں مضمون آفرینی ، مبالغہ اور رعایات لفظی کی بہتات سے گمان ہوتا ہے کہ یہ محض تخیلی نظم ہے —

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جان کو کیا ہوا
دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے
کیا جانے اس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا
اس دست رشک پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا
شبنم کو پھر ہے جانب خورشید التفات
شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی
برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اس لب پہ کیا بنی
کچھ زخم بے مزا ہیں نمکداں کو کیا ہوا
بوے قبائے یوسف گل ہے نسیم میں
اس کی شمیم عطر گریباں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو
اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا

دعوی ہے شوخیوں کا غزالان دشت کو
اس خوش نظر کی جنبش مژگاں کو کیا ہوا
کتاں ہے سینہ چاک رخ ماہ دیکھ کر
اس روے غیرت مہ تاباں کو کیا ہوا

مگر تخیل اور صنایع و بدایع کے ساتھ جذبات و احساسات بھی ہیں جو بیک وقت پر درد اور تیز ہیں —

پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب
نعش اس کی جاے ہے سر بازار ہاے ہاے

اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ نظم واقعہ پر مبنی ہو۔ بہر حال اس میں کچھ خوبیاں ضرور ہیں جو مرثیہ کا رنگ قائم رکھتی ہیں —

اردو شاعری کے دور جدید میں سب سے پہلے مرثیہ لکھنے والے ' میرا مطلب قومی و شخصی مرثیے سے ہے ' حالی تھے ۔ ان کا سب سے زیادہ مشہور مرثیہ غالب کی موت پر لکھا گیا ہے ۔ اس میں کلام کی سادگی اور بےساختگی قابل داد ہے —

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے دہر   تو نے کی جس سے بیوفائی کی

یہ انسان کی فطرت ہے کہ کسی کے مرنے سے اس کی اپنی فضا میں جو خلا پیدا ہو جاتا ہے اس پر خاص طور سے آنسو بہاتا ہے اور یہیں سے اس غمناک واقعہ کی اہمیت کا اندازہ کرتا ہے۔ اپنے ذاتی رنج و غم کا اظہار کرنے سے مرثیہ کی شان بڑھ جاتی ہے ۔ ملٹن اور گرے کے مراثی پر یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں اپنے نقصان اور اپنے رنج و غم کا اظہار نہیں کیا گیا ہے ۔ مگر حالی کے مرثیہ میں یہ باتیں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہیں —

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل کس سے داد سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

کس قدر بے چارگی کا اظہار کیا ہے - اور کس قدر سچے جذبات ہیں۔ کلام کا درد ملاحظہ ہو —

لوگ کچھ پوچھنے کو آے ہیں اہل میت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں

غالب کے عیوب ایسی خوبی سے پیش کئے ہیں کہ محاسن بن گئے ہیں اور تصنع نہیں معلوم ہوتا -

بے ریائی تھی زہد کے بدلے زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

تمام مرثیہ میں صرف چند اشعار نکلیں گے جن میں تصنع سے کام لیا گیا ہو مثلاً —

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

مگر بحیثیت مجموعی یہ مرثیہ بے نظیر ہے —

حالی کے بعد اور شعرا نے بھی اس میدان میں قدم بڑھایا - مگر چکبست ان سب میں سبقت لے گئے - ان کی کامیابی یقینی تھی - ایک تو جس رنگ شاعری کو انہوں نے اختیار کیا تھا مرثیہ گوئی کے لیے موزوں تھا - مرثیہ میں بیان سادہ زبان صاف اور شیریں ہونی چاہئے - کلام میں روانی اور ترنم چاہئے - مبالغہ و اغراق سے کلام پاک ہو - واقعیت اور اصلیت کو زیادہ دخل ہو - جذبہ نگاری مرثیہ کے لیے ضروری ہے - تخیل میں آورد نمایاں نہ ہو - استعارات و تشبیہات بہت لطیف و

سنجیدہ ہوں ورنہ تصنع معلوم ہو گا - شاعر کے جذبات سچے ہوں تا کہ بناوٹ نہ معلوم ہو- کلام میں سوز و گداز ہو- یہ سب صفات چکبست کی شاعری میں پائی جاتی ہیں- دنیا کے سب سے بڑے مرثیہ گو کی تقلید کر کے ان کی زبان اور ان کا طرز بیان خاص طور پر مرثیہ گوئی کے لیے موزوں ہو گیا- علاوہ بریں وہ فطرت کی طرف سے ایک بے چین ہو جانے والا دل لائے تھے جو رقیق سے رقیق جذبات کی پرورش کر سکتا تھا - قومیت کی تبلیغ ان کی شاعری کا نصب العین تھا- قومی لیڈران سے جو ہمدردی ان کو تھی بیان کی جا چکی ہے- واقعیت اور اصلیت کو انھوں نے اپنی تمام شاعری میں ملحوظ خاطر رکھا- پھر ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ کون اس میں کامیاب ہو سکتا تھا- اقبال کی بھی کچھ نظمیں ہیں جن کو مرثیہ کہا جا سکتا ہے- مگر واقعہ یوں ہے کہ اقبال کی شاعری مرثیہ گوئی کے لیے موزوں نہیں ہے- کلام کا سوز و گداز زور تخیل کا ساتھ نہیں دیتا - بڑی بڑی تراکیب فارسی اور تابناک الفاظ نوحہ خوانی کے لیے موزوں نہیں ہیں- تخیل کی رنگینی مرثیت کی شان کے منافی ہے - یہی وجہ ہے کہ اکثر جذبات کے بیان میں تصنع معلوم ہونے لگتا ہے- اقبال کی نظم "گورستان شاہی" انگریزی شاعر گرے کے مشہور عالم مرثیہ کو دیکھ کر لکھی گئی ہے ۔ مگر انھیں وجوہات سے دونوں میں بعد المشرقین ہے —

چکبست کے مراثی میں انفرادیت خاص چیز ہے جو واقعیت اور اصلیت کی جان ہے - ہر مرثیہ دوسرے سے ممتاز ہے" ہر ایک کے جذبات جدا گانہ ہیں، طرز بیان مختلف ہے- ہر مرثیہ میں سیرت نگاری مختلف ہے-

پنڈت بشن نرائن در کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے -

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے حسن اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے

گوکھلے کے اوصاف یوں بیان کئے جاتے ھیں —

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

بال گنگا دھر تلک کی تعریف کرتے ھیں -

جان نثار ازلی شہر دکن کا وارث
پیشواوں کے گرجتے ھوے رن کا وارث
شور ماتم نہ ھو جھنکار ھو زنجیروں کی
چاھئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

ایک کی سیرت دوسرے سے جدا ھے اور خاص خاص صفتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز ھیں۔ پھر ساتھ ھی ساتھ لب و لہجہ اور طرز بیان مختلف ھوجاتے ھیں - الفاظ کا انتخاب موقع و محل کے موافق ھوتا ھے۔ جیسا کہ اوپر لکھی ھوئی مثالیں بتاتی ھیں —

حسن بیان چکبست کے تخیل کو جذبات و احساسات کی دنیا سے آگے نہیں بڑھنے دیتا بلکہ وہ اس کی مدد سے دوسروں کے جذبات بر انگیختہ کرنے میں کامیاب ھوجاتے ھیں —

بال گنگا دھر تلک کے مرثیہ میں کہتے ھیں۔

بے کسی چھائی ھے تقدیر پھری جاتی ھے
قوم کے ھاتھہ سے تلوار گری جاتی ھے

گوپال کرشن گوکھلے کے مرثیہ میں کہتے ھیں —

خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بابو گنگا پرشاد کے مرثیہ میں کہتے ہیں:

پیڑ سر سبز ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے
ڈوبتی کرنوں سے فواروں میں اک تاب بھی ہے
گل نو خیز بھی ہیں سبزۂ شاداب بھی ہے
شام کا وقت بھی ہے مجمع احباب بھی ہے
تو کہاں ہے کہ جو اس باغ کا شیدائی ہے!
تجھ سے ملنے کے لئے فصل بہار آئی ہے!

جب زمانے میں ترے اوج کی نوبت آئی
زندگی ختم ہوئی موت کی ساعت آئی
کام کچھ بھی نہ جوانی کی ریاضت آئی
صبح پیری نہیں آئی کہ قیامت آئی
روشنی جس کی تھی ہر سو وہ ستارا ڈوبا
مٹ گئی شام اودھ قوم کا تارا ڈوبا

یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن
اپنے بچوں کو نگلتی ہے زمیں کی ناگن
داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دل سوز وطن
اس کے صدمے سے لرزتا ہے یہ ایوان کہن
چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے
قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

الفاظ کا انتخاب مختلف مراثی میں کتنا مختلف ہے۔ زبان کتنی

صاف ہے۔ کلام میں کیسی روانی ہے اور الفاظ کی اصلی ترتیب کیسی قایم رہتی ہے۔ اوپر لکھے ہوے بندوں کی ٹیپ میں کس قدر زور ہے۔ انیس یاد آتے ہیں۔ آخری شعر کی رومانیت قابل تحسین ہے جدید شاعری کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ جذبات ابھارنے کا طریقہ بھی کتنے نفسیاتی پہلولئے ہوے ہے—

جہاں چکبست اپنے ذاتی جذبات کا اظہار کرتے ہیں کلام میں بہت سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے —

دو قدم لاش تری دوش پہ ہم دھر نہ سکے
آخری فرض محبت کا ادا کر نہ سکے

" نشتر یاس " میں کہتے ہیں —

دعائیں دیتے تھے جس گود میں کھلا کے تجھے
اسی میں آج سلایا کفن پنہا کے تجھے

گنہ گار ہوے لکھنؤ میں لا کے تجھے
خاموش بیٹھے ہیں اب خاک میں ملا کے تجھے

دعا کا غم نہ دوا کی ہے جستجو باقی
جو دل میں ہے تو ہے مرنے کی آرزو باقی

کتنے سچے اور مطابق فطرت جذبات ہیں - یہ بند بلاغت کا اچھا نمونہ ہے۔ کسی عزیز کے مرنے کے بعد عزاداروں کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا صحیح مرقع ہے۔ دوا و دعا کی کد و کاش ختم، وہی اضمحلال و افسردگی؛ وہی سو گوار خاموشی جو جذبات کے تلاطم کے بعد طاری ہوتی ہے اور وہی بے بسی کی آخری تمنا یعنے مر رہنے کی آرزو —

چکبست کی مرثیہ گوی بھی ایک حد تک ان کے قلوطیت کی ضامن ہے۔ وہ جب اپنے احبا و اعزا کی موت سے متاثر ہوکر بزم ہستی کو دیکھتے ہیں تو ان کا زاویۂ نگاہ اس قومی شاعر سے بالکل جدا ہوتا ہے

جو پیغام عمل دیکر زندگی کو سعی پیہم کا ایک لا متناہی سلسلہ بنا دینا چاہتا ہے —

اجل کی دراز دستیاں عام ہیں اور ہر جگہ اس کا ہاتھ یکساں پڑتا ہے - اس لئے ہم بھول جاتے ہیں ورنہ کسی کا مرجانا کیا کوئی معمولی بات تھی - آج اسی بنیاد پر مذہب و فلسفہ کی شاندار عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں - مگر کیا انہوں نے یہ مسئلہ حل کردیا ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ کے حسن اعتقاد کی داد ملنی چاہئے اور اگر نفی میں ہے تو چکبست کے اس بند سے اپنے جذبات و خیالات کا تطابق کیجئے اور بتائیے کہ وہ انسان کی نفسیات کا کس حد تک آئینہ دار ہے -

کیا وہ ناداں ہیں جو کہتے ہیں زروے اعتبار
مصلحت رہتی ہے رنج و درد میں بھی آشکار
ہے فسانہ یہ حدیث صبر و تسکین و قرار
خواب ہستی کی نہیں تعبیر ایسی زینہار
میں نظام دہر میں کچھ مصلحت پاتا نہیں
اس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہیں

یہ سچے شکوک ہیں اور ان کی طفلانہ معصومیت حقیقتاً اس عاجزی و بیچارگی کا احساس ہے جو راز ہستی کی جستجو کا ملتہا ہے - اپنی نظم " ماتم یاس " میں کہتے ہیں —

تیری ہستی تھی اگر دیباچۂ اندوہ و غم
عالم فانی میں تو نے کس لیے رکھا قدم
ان پہ حسرت ہے جو یوں دیتے ہیں غمگینوں کو دم
خواب ہے دنیا یہاں کیسی خوشی کیسا الم

انتظام دہر میں آخر ہے یہ تدبیر کیا
خواب ہے دنیا تو ہے اس خواب کی تعبیر کیا

مگر چکبست روح کو ان مایوس خیالات کی تاریکی میں چھوڑ دینا نہیں پسند کرتے - وہ تہ میں ڈوب جاتے ہیں اور جب تہاہ نہیں ملتی تو اُبھر بھی آتے ہیں - وہ اعتراف شکست نہیں کرتے - گوہر مقصود نہیں ملتا نہ سہی اس کی آرزو تو ہمیشہ دل میں رہے گی - یہی تسکین کیا کم ہے ' خواہ اسے انسانی کوششوں کی ٹریجڈی کہیے یا کمڈی —

چشم ظاہر بیں کو اب دیدار تیرا ہے محال
ہے مگر آراستہ تجھ سے مری بزم خیال
یہ وہ عالم ہے جسے مانا ہے سب نے لازوال
ہو محل یاں اپنی صحبت میں فلک کی کیا مجال
ہاں فنا کردوں گا میں نیرنگیء تقدیر کو
آئینہ میں دل کے رکھوں گا تری تصویر کو

چکبست بحیثیت غزل گو

ان کی غزلیات کی زبان و طرز بیان کا رنگ وہی ہے جو ان کے کلام کا بحیثیت مجموعی ہے - ان کی غزلیات میں کوئی ربط خیال نہیں ہے - یوں بھی سوائے غزل مسلسل کے جس کی مثالیں نسبتاً بہت کم ہیں ہماری غزلیات کا ہر شعر مختلف کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے - ایک شعر میں ہجر کی تکلیفیں بیان کی جاتی ہیں اور دوسرے میں وصل کی لذتیں - اور سمجھ میں نہیں آتا کہ دو مختلف و متضاد کیفیات کا احساس و ادراک شاعر کو بیک وقت کیسے ہوجاتا ہے - مگر یہ تنوع چکبست کے یہاں اور بڑھ جاتا ہے - ان کے یہاں نہ صرف مختلف کیفیات بیان کی جاتی ہیں بلکہ ہر شعر کا موضوع جداگانہ ہوتا ہے - ایک ہی غزل

میں وہ آزادی کا راگ گاتے ہیں ، موجودہ نظام حکومت پر تعریضیں کرتے ہیں ، حب وطن کی تلقین کرتے ہیں، نوجوانوں کو درس عمل دیتے ہیں، مغربی تہذیب پر چوٹیں کرتے ہیں ، فلسفہ زندگی بتاتے ہیں ، اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہیں ، تصوف کے نکات سمجھاتے ہیں، شہدائے قوم کی تعریفیں کرتے ہیں، ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کرتے ہیں- غرض کہ ان کی غزل اشعار متفرق کا ایک مجموعہ ہے جو آپس میں کوئی ربط خیال نہیں رکھتے اور جو صرف قافیہ و ردیف کی شیرازہ بندی سے باہمدگر پیوستہ ہیں —

ان کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں تسلسل بیان ، ربط فکر ، اور خیالات کی مرکزیت پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ترتیب و تشکیل بھی غزل ہی کے اصول پر ہوئی ہے - مگر چونکہ موضوع تغزل سے قطعی نا آشنا ہے اس لیے ان کو غزل یا غزل مسلسل نہیں کہا جا سکتا - ایسی نظموں کے انداز بیان میں بے شک تغزل پایا جاتا ہے ، مگر وہ صرف ایک پردہ ہے جس کی آڑ میں چکبست اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں - ان نظموں میں ان کا مطمح نظر کوئی خاص سیاسی واقعہ یا سوسائٹی کی کوئی خاص حالت ہے - مثلاً وہ نظم جو مسز بسنٹ کی رہائی پر لکھی گئی ہے یا وہ جو پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ پر لکھی گئی ہے یا وہ قطعہ جو ہندوستان کی اس وقت کی حالت پر روشنی ڈالتا ہے ع کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی - اور پھر وہ جو ہندو مسلم نا اتفاقی پر لکھی گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے

اذاں سے نعرہ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

چونکہ غزل کا دائرہ موجودہ زمانے میں بہت وسیع کر لیا گیا ہے

کیونکہ یہی صنف سخن اب تک مقبول عام اور پسندیدۂ انام ہے اور شعرا عموماً اسی میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور اپنے تمام خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس لیے چکبست کی بقیہ غزلیات کو غزل قرار دینا مجبوری ہے۔ بحیثیت مجموعی چکبست کے یہاں صحیح تغزل کا عنصر بہت کم ہے اور جہاں کہیں ہے بہت مشتبہ حالت میں، کیونکہ اکثر وہ اس کے پردے میں نظام حکومت پر تعریضیں کرتے ہیں —

آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمان وفا کیجئے ظلم مگر وہ بھی گوری یاد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دنیا میں کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کردیں مگر یقین تیرے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

فغان درد دل پر بھی گماں ہے بد زبانی کا
ستمگر سن نہیں سکتا ہے شائد داستاں اپنی
کہیں تو کیا کہیں یا چپ رہیں مظلوم حیراں میں
بیان کرتے ہیں وہ اپنی زباں سے خوبیاں اپنی

ڈر گیا نالۂ شبگیر سے میرے صیاد شام کو قید کیا صبح کو آزاد کیا

فکر مینا کیوں ہے ساقی کیوں تلاش جام ہے
تو لگا دے منہ سے خم پینا ہمارا کام ہے

چکبست کے یہاں گو تغزل بہت کم ہے مگر پھر بھی ان کی غزلیات کے اکثر اشعار اپنے رنگ میں بہت خوب ہوتے ہیں۔ جذبہ نگاری جوش بیان حسن تخیل اور محاکات کی اچھی اچھی مثالیں ان کے کلام میں ملتی ہیں —

انسانی زندگی شیرازہ ہے ان ارمانوں کا جن کی پرورش نہیں معلوم کن کن امیدوں سے گہوارۂ دل میں کی جاتی ہے۔ پھر ایک نا کام آرزو کا دم توڑنا جو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ (بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے) کتنا حسرت ناک منظر ہے۔ نزع کی ہچکیوں کے پیہم جھٹکوں کے ساتھہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح ان ارمانوں سے دامن چھڑانا چاہتی ہے اور کامیاب نہیں ہوتی —

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

ولولوں کے وفور و جوش کا وہ وقت جب کہ وہ ملتہاے عروج پر پہنچ کر مائل بہ زوال ہوتے ہیں کتنا درد ناک ہوتا ہے۔ اس خیال سے کہ اب یہ ہیجان و تلاطم ایک بھیانک سناٹے میں مبدل ہو جاے گا' وہ سناٹا جو سمندر پر طوفان کے گذر جانے کے بعد طاری ہوتا ہے —

نظر کے سامنے ہے شام نا کامی کا سناٹا
جوانی ولولوں کی ڈھل رہی ہے دوپہر ہوکر

جوانی کی امنگیں رداے خواب میں ملفوف مست و بے خبر ہیں' صرف حسن کا فرشتہ انھیں جگا سکتا ہے اور جگاتا ہے

فرشتہ حسن کا بیدار کرنے ان کو آیا ہے
جوانی کی امنگیں سو رہی تھیں بے خبر ہوکر

ایک نو گرفتار کیا جانے کہ آشیاں سے دور پابند قفس ہوکر ایک سوگوار سکون حاصل کرلینا بھی غنیمت ہے کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب شکستہ پری قفس کی آڑ ڈھونڈھتی ہے اور نا کام رہتی ہے۔ اسے تو ایک بے بال و پر ہی خوب سمجھہ سکتا ہے کہ بے بسی کی انتہا تو وہاں ہوتی ہے جہاں

آشیاں کا سوال ھی نہیں پیدا ھوتا اور قفس سے جدا ھو جانا بھی محرومیٔ قسمت کی دلیل بن جاتا ھے —

قفس کی آڑ سے محروم ھیں ھم آشیاں کیسا
پڑے ھیں دور صحن باغ سے بے بال و پر ھوکر

کسی کو اپنی دکھ بھری داستاں سنانی ھے ۔ امیدیں' آرزوئیں' شکوے' شکایت سب بیک وقت ھجوم کرتے ھیں مگر چونکہ سننے والے کو پہلے ھی سے اپنا جواب معلوم ھے جو نفی میں ھے اور ایک لفظ میں' اس لیے تفصیل کی اجازت نہیں ھے ۔ ادھر وفور شوق تاب گویائی چھین لیتا ھے' تمام جذبات کھینچ کر آنکھوں میں مجتمع ھو جاتے ھیں اور ایک نگاہ یاس ساری داستان مختصر کر جاتی ھے اور پھر وہ سب کچھ کہہ جاتی ھے جو زبان سے کبھی نہیں ھو سکتا —

تفسیر حال زار ھے بس ایک نگاہ یاس ھو داستان درد کا اور اختصار کیا

چند اور مثالیں ملاحظہ ھوں —
حسن تخیل —

کیا کونپلیں دکھاتی ھیں عالم ابھار کا آنچل سرک گیا ھے عروس بہار کا
رخ ھے ساقی کی طرف ھاتھ میں پیمانہ ھے رھنما آج مری لغزش مستانہ ھے
عالم یاس میں کہتا ھے یہ دریا سے حباب غیر سیراب ھیں خالی مرا پیمانہ ھے
صبح کو شبنم کے موتی باغ میں چوری گئے پھول کرنوں سے یہ کہتے ھیں تمھارا کام ھے
اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار سبزہ و گل صحن زنداں میں نمایاں ھوگئے

حسن کی دولت سے تھے گلہائے نورس بیخبر
دیکھ کر رنگ چمن کا لٹنے نگہباں ھو گئے

جوش بیان جو بقول ملٹن شاعری کی تین صنعتوں میں سے ایک ھے ۔

جام تک خم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشاں ہو گئے
مے کے قطرے کیا تھے جب تک خم میں تھے ساغر میں تھے
میرے ہونٹوں تک پہنچنا تھا کہ طوفاں ہو گئے
جن کی شورش کے لیے آغوش دنیا تنگ تھا
اشک کے قطرے وہ ان آنکھوں میں پنہاں ہو گئے

معاکات - تخیلی اور بہاریہ —

شجر سکتے میں ہیں خاموش بلبل ہیں نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں
پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوے
شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا
آے ہیں پھول باغ میں ساغر لیے ہوے
برسے شراب ہے یہ اشارہ بہار کا
منظور ہے کہ آمد گل کا پیام دیں
کلیاں بلا رہی ہیں نسیم بہار کو
اترے ہیں صحن باغ میں پھولوں کے قافلے
نذریں دکھا رہے ہیں عروس بہار کو
عکس مہ قطرہ شبنم میں ہے شبنم گل پر
پردۂ شب میں چمک اٹھی ہے تقدیر بہار

جذبہ نگاری —

ہواے تازہ دل کو خود بخود بیچین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

صحن چمن سے دور اسے باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں
ہجوم بےکسی ہے شام تنہائی ہے اور میں ہوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کردے یہ سماں میرا
چمن کو چھوڑ دوں یہ بدنصیبی کا اشارہ ہے
وہی مرجھا گئی جس شاخ پر تھا آشیاں میرا

چکبست کا پیغام

چکبست کا پیغام آزادی تھا ۔ وہ ہر جگہ آزادی کا راگ گاتے رہے - ان کے نغمات کے موضوع مختلف ہیں مگر لے سب کی یکساں ہے - یہ لے آزادی کی تھی - حب وطن، سادۂ قومی ، اتحاد باہمی، ارتقاے علمی ، تعلیم نسوان، تربیت اطفال غرضکہ وہ تمام تعلیمات جن کی تبلیغ انھوں نے اپنے مختصر سے کلام میں کی ہے ایک مرکز پر مجتمع ہوتی ہیں - یہ مرکز آزادی کا تھا - ان کے خیالات کا منتہا ، ان کی تمناؤں کا مرکز ، ان کی امیدوں کا مرجع آزادی تھی اور اسی کا حصول ان کی تعلیمات کا لب لباب ہے - جس ملک کی آب و گل سے ان کا خمیر بنا اس کی نجات اسی میں تھی ، جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی اسی کا مقتضی تھا، جس قوم کے وہ رہبر بنے اسی کی جویا تھی -

چکبست کا کلام ان کے ماحول سے اتنا متاثر ہے کہ ان کو اردو شاعری کا ٹنی سن (Tennyson) کہنا بے جا نہ ہوگا - ان کی کچھ نظمیں کسی خاص سیاسی واقعہ کے تحت میں وقتی جذبات کے زیر اثر لکھی گئی ہیں جو کسی روز نامہ کے سر ورق کو تو زینت دے سکتی ہیں مگر صفحۂ روزگار پر کوئی ہلکا سا نقش بھی نہیں چھوڑ سکتیں - جس طرح ٹنی سن Tennyson کی ایسی نظمیں گوشۂ گمنامی میں پڑگئی ہیں اسی طرح چکبست کی بھی یہ

نظمیں جو اپنے اندر کوئی غیر فانی عنصر نہیں رکھتیں بقاے دوام سے محروم رہیں گی جب کہ موجودہ زمانے ہی میں ان کی قدر کم ہو چلی ہے اور وہ بے کیف معلوم ہوتی ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخی حیثیت سے اُن کی اہمیت مسلم رہے گی ۔ اِن کا بقیہ کلام البتہ پائدار ہے اور اس کی دنیا دیں استوار —

امتداد زمانہ کے ساتھہ خیالات میں تغیر ہو گا ۔ معیار میں تبدیلی ہو گی ۔ اصول میں ارتقا ہو گا اور وہ سب کچھہ ہو گا جسے انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ایک مستقبل بعید میں جب ہندوستان آزاد ہوچکا ہو گا اور شراب نو کے سرور میں " دیر و حرم کی ناچاقی " مٹ چکی ہوگی ۔ ہندوستانی سب ایک ہوں گے ۔ آپس کا تفرقہ و امتیاز قصۂ ماضی ہو جاے گا ۔ ان کے مرغوبات کچھہ اور ہوں گے ' ان کے معتقدات کچھہ اور ۔ ان کی تہذیب نئی ہوگی اور ان کا نظام تمدن جدید ۔ مگر کیا وہ اس وقت اس شاعر گوشہ نشین کو بالکل فراموش کردیں گے جس نے ان کے عہد غلامی میں ان کو آزادی کا نغمہ سنایا ' جس کے " صور حب قومی " نے ان کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کیا ' جس کی دعوت عمل نے ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا جس نے ان کی مصیبتوں پر اپنا دل دکھایا اور جس نے ان کی بیچارگی پر آنسو بہاے ۔ کون کہہ سکتا ہے —

خطبات گارساں دتاسی

سترھواں خطبہ

مترجمۂ

(جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ

(پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

حضرات !

میرے ہر سال کے خطبے میں بعض باتوں کا اعادہ بار بار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا موضوع بڑی حد تک محدود ہے یعنی ہندوستانی زبان کی دونوں شاخوں (اردو اور ہندی) کی جو ترقی ہو رہی ہے اس کا ذکر۔ سب سے پہلے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس نا قابل تلافی نقصان کے بارے میں کچھ کہوں جو ہندوستانی ادبیات کو میجر اے آر فلر (A. R. Fuller) کی بے وقت موت کی وجہ سے برداشت کرنا پڑا - مرحوم چھٹی پر انگلستان آے ہوئے تھے تا کہ اپنے بچوں کو دیکھ لیں اور واپسی پر اپنی بیوی کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں - ان کا پیرس آنے کا بھی مصمم ارادہ تھا۔ اس شہر سے انہیں دلی اُنس تھا - آپ ابھی ہندوستان واپس ہی پہنچے تھے کہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں ۲۰ اگست کو دیہات میں جانا پڑا - آپ ایک نوجوان افسر کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں جا رہے تھے - راستے میں شہر راولپنڈی کے نزدیک ایک نالہ پڑا جو برسات کے موسم میں خوب بھر جاتا ہے اور اس میں پانی نہایت تیزی کے ساتھ

بہتا ہے - جب گاڑی بیچ نالے میں پہنچی تو اس کے پہیے چٹانوں میں اڑ گئے - میجر فلر اور ان کے ساتھی دونوں گاڑی پر سے اتر پڑے تاکہ پہیوں کو ہٹانے میں مدد دیں - پانی اس زور کا تھا کہ وہ دونوں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے - پانی دونوں کو دور بہا لے گیا - چند گھنٹوں کے بعد ان دونوں کی نعشیں دور کسی مقام پر ملیں —

اس حادثے کے وقت میجر فلر کی عمر اڑتیس سال کی تھی - پچھلے سال اسی قسم کا ایک حادثہ کلکتہ کے ایک پادری کو پیش آیا جس کا انجام وہی ہوا جو میجر فلر کا ہوا - ان پادری صاحب کی تبدیلی کلکتے کے متوفی پادری کی خدمت پر ہوئی تھی - کلکتہ پہنچ کر وہ ایک کشتی پر سوار ہو رہے تھے کہ پاؤں پھسلا اور وہ دریا میں گر کر ڈوب گئے —

اسی زمانے میں جب کہ میجر فلر کا انتقال ہوا مسٹر ای آی ہاورڈ نے داعی اجل کو لبیک کہا - آپ صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات تھے - انتقال کے وقت آپ کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی - آپ ریل پر چڑھتے وقت گرے اور گرنے سے جو صدمہ پہنچا اس سے جانبر نہ ہوسکے —

میجر فلر نے پنجاب میں صیغۂ تعلیم کی تنظیم کی - آپ نے جو سالانہ رپورٹیں لکھی ہیں اور ان کے علاوہ جو جو رسائل انگریزی اور اردو میں خود شائع کیے یا دوسروں سے لکھوائے ، ان سے میں نے اپنے پچھلے خطبوں میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور تعلیمی مسائل پر معلومات حاصل کی ہیں —

اس سال میرے مستشرق دوستوں میں جارج سیسل رینوارڈ (George Cecil Renouard) کا بھی انتقال ہوگیا - آپ کی عمر چھیانوے سال کی تھی - آپ کا تعلق بہت عرصے تک قسطنطنیہ کے انگریزی سفارت خانے سے رہا ،

پھر پینتالیس سال تک کینٹ میں Swascombe کے مہتمم رہے ۔ آپ کو مشرقی السنہ میں ترکی سے خاص مناسبت تھی - آپ بہت بڑے ہمدرد انسان تھے - جو لوگ آپ سے ملتے انہیں آپ سے اُنس پیدا ہو جاتا تھا —

" پیرس والی مناجات " کے یہ الفاظ سچ ہیں کہ " موت بر حق ہے ۔ ہر چند کہ اس سے انسان کے دل کو ملال ہوتا ہے لیکن مستقبل کی ابدی زندگی کا خیال ' جس کا وعدہ کیا گیا ہے ہمارے لیے باعث تسکین ہوتا ہے - ... جب ہم مرتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زندگی ختم ہوگئی بلکہ وہ اپنا روپ بدل کر پھر ظہور پذیر ہوتی ہے - جب اس خاکدان تیرہ کی عمارت گر پڑتی ہے تو اس کے ساتھ آسمانوں پر ہم اپنے لیے ابدی مکان تعمیر کر لیتے ہیں " —

میجر فلر اور دوسرے احباب نے مجھے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں اور انگریزی اور ہندوستانی اخبارات سے میں نے جو مسالا جمع کیا ہے اسے میں اپنے اس خطبے میں آپ صاحبوں کے رو برو پیش کروں گا ۔ اس سے آپ کو اُس ادبی اور معاشری تحریک کے متعلق معلومات حاصل ہوں گی جو آج کل ہندوستان میں جاری ہے —

مسٹر ایف ایچ جیون (F.H.Jeune) نے اپنی کتاب میں جس کا نام " ہندوستان میں اسلامی اقتدار " ہے سچ کہا ہے کہ " ہندوؤں کی معاشری ساخت ایسی ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کو ہندوستان میں جلد کامیابی حاصل ہوجاتی ہے - لیکن باوجود اپنی شکست کے وہ اپنے اداروں کو قایم رکھنے کی سعی کرتے ہیں ۔ ان کے یہ ادارے حضرت مسیح کی بعثت سے پہلے سے قایم ہیں اور انہیں دوسری اقوام عالم سے ممتاز کرتے ہیں ۔ ان

اداروں کی بدولت وہ دوسروں میں ضم ہونے سے بچ گئے " - ہمیں پوری امید ہے کہ ہندوؤں کو اہل یورپ سے جو ملنے کا موقع ملا ہے اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ توہمات جو اب تک ان میں چلے آرہے ہیں مٹ جائیں گے - اہل یورپ کے ساتھ میل جول بڑھنے سے بظاہر اچھے نتائج پیدا ہورہے ہیں —

میں پچھلی کسی صحبت میں ہندوؤں کی اصلاحی تحریکوں کی نسبت ذکر کر چکا ہوں - ایک اصلاحی انجمن " وید سماج " ہے اس کے دو خاص اصول ہیں —

(۱) میں ہمیشہ ایسے پرماتما کو پوجوں گا جو اعلی اور برتر ہے ' خالق ہے ' زندگی کو قایم رکھنے والا ہے اور اس کو برباد کرنے والا بھی ہے - بغیر اس کی مہربانی کے انسان نجات نہیں حاصل کرسکتا - وہ قادر مطلق ہے اور علیم و بصیر ہے - اس کی کوئی صورت نہیں نہ اس کا کوئی مثل ہے - میں اس کے علاوہ اپنا سر نیاز کسی اور کے آگے نہیں جھکاؤں گا —

(۲) میں اس امر کی پوری کوشش کروں گا کہ اپنی عبادت میں بھی وحدانیت کے اصول پر حتی‌الوسع عمل پیرا رہوں - میں اپنی عبادت سے ان توہمات کو خارج کروں گا جو فی‌الوقت ہندو دھرم کا جزو بن گئے ہیں * —

یہ انجمن اسی طرز کی ہے جیسے " برھمو سماج " کی انجمن - اس کے اصول کی تدوین کیشب چندرسین نے لاہور میں کی ہے - تیئیس فروری کو لاہور میں اس انجمن کا جلسہ ہوا جس میں چار سو آدمیوں نے شرکت

* اس کے متعلق تفصیل " Colonial Church Chronicle " میں ملے گی —

کی جن میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شامل تھے - پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بہادر نے بھی شرکت کی - اس جلسہ میں بابو کیشب چندرسین نے ہندوؤں کے مذہبی نشاۃ ثانیہ پر نہایت دلاویز پیرایہ میں تقریر کی - چنانچہ بابو صاحب نے بتایا کہ اس تحریک کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بت پرستی ترک کی جا رہی ہے اور ایک خدا کی پوجا لوگوں میں رواج پکڑ رہی ہے - ایسا خدا جس کے علاوہ کسی اور کی پوجا جائز نہیں —

اس ہندو فلسفی کی تقریر کو لوگوں نے کان دھر کے سنا اور دلچسپی کا اظہار کیا - پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے مقرر کی تعریف و توصیف کی اور یہ توقع ظاہر کی کہ جن اصول کو اس نے پیش کیا ہے وہ مقبول ہوں گے - ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چونکہ مقرر نے اپنی تقریر انگریزی زبان میں کی ہے اس لیے عوام کے لیے بہتر ہوگا اگر اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرا کے تقسیم کیا جائے تاکہ ہر کس و ناکس ان زرین خیالات سے مستفید ہو سکے - (اخبار عالم - میرٹھ - سات مارچ سنہ ۱۸۶۷ ع) —

پنجاب میں ابھی حال میں ایک مذہبی انجمن قایم ہوئی ہے - اس کی کارروائیاں خفیہ ہوا کرتی ہیں - اس میں صرف ہندو اور سکھ موحدین شرکت کرتے ہیں - اس انجمن کے ارکان ان تمام رسوم سے احتراز کرتے ہیں جن میں بت پرستی کا شائبہ پایا جاتا ہے - (انڈین میل - فروری سنہ ۱۸۶۷ ع) —

عیسائی مشنری ان انجمنوں کے مقاصد سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے اصول میں مختلف مذاہب کی تعلیمات کا امتزاج ہوتا ہے - ان انجمنوں کی کامیابی سے خود ان کے خیالات و عقاید کی نشر و اشاعت میں مدد ملے گی - ہم تہ دل سے Rev. M. Kirk کے اس خیال کی تائید کرتے

ھیں ' جس کا اظہار انھوں نے پچھلی جنوری بمبئی کے گرجا میں کیا تھا کہ تعلیم یافتہ ھندوؤں کو چاھئیے کہ وہ اپنی مذھبی اصلاح کے لیے ایک ایسی انجمن قایم کریں جو موحدین پر مشتمل ھو اور اس میں مسلمان بھی شرکت کریں - برھمنوں کو اگر دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل ھو تو اس لیے ھو کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے نیکی میں بڑھے ھوے ھیں - اگر کوئی شودر ذات کا آدمی اچھے اخلاق رکھتا ھو تو اس کو بھی برھمنوں میں شمار کرنا چاھئیے - پارسیوں کا یہ عقیدہ بالکل ٹھیک ھے کہ دنیا میں آدمی دو قسم کے ھوتے ھیں ' اچھے اور برے - اچھوں کو اپنی بھلائی کا اجر ملے گا اور بروں کو اپنی برائی کے نتائج بھگتنا پڑیں گے - موصوف نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا : " قدیم زمانے میں ھندو لوگ زندگی کا کمال حاصل کرنا چاھتے تھے - اب اس زمانے میں بھی آپ اپنے حسن عمل سے کمال حاصل کر سکتے ھیں - لیکن وہ صرف اس وقت ممکن ھوگا جب کہ ھندو اور مسلمان ' یوروپی اور ھندو کے تمام تر امتیازات مٹ جائیں اور لوگ اپنے تئیں بھائی بھائی سمجھنے لگیں - صداقت کی راہ میں اور اپنے عقاید کی خاطر وہ جو مشکلات اس دنیا میں برداشت کریں گے خدا انھیں ان کا اجر دے گا "

(یکم مئی ۱۸۹۷ ع Colonial Church Chronicle) —

ھندوستان میں انگریزی حکومت اصلاحی تحریکوں کی حتی المقدور امداد کرتی ھے اور ان قدیم رسم و رواج کی مخالفت کرتی ھے جن سے لوگوں کو اذیت پہنچے - چنانچہ بڑودے میں یہی ھوا - بعض متعصب مذھبی لوگ چونکہ قانوناً بیوہ عورتوں کو جلا نہیں سکتے تھے اس لیے وہ ان کے سر منڈوانا چاھتے تھے - لیکن حکومت نے انھیں ایسا کرنے سے جبراً باز رکھا - لیکن بعض اوقات حکومت کو ایسے توھمات سے چشم پوشی برتنی پڑتی ھے جو

لوگوں کے لیے باعث زحمت ہوتے ہیں - بعض تعلیم یافتہ ہندوؤں نے جن پر یورپی اثر غالب معلوم ہوتا ہے حکومت سے درخواست کی ہے کہ دریاے گنگا میں نعشیں پھینکنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے - لیکن حکومت نے کٹر طبقے کی دل شکنی گوارا نہیں کی - لیکن بیوہ عورتوں کو جلانے کے متعلق حکومت ہر جگہ دخل اندازی کرتی ہے - اگر کہیں اس قسم کے واقعے کا اندیشہ ہو تو نزدیک کے تھانے میں رپورٹ کردینی چاہئے - پولیس اس کی روک تھام کے لیے موجود رہتی ہے - حکومت کی اس دخل اندازی کو قدیم طرز کے کٹر ہندو بری نظر سے دیکھتے ہیں لیکن روشن خیال ہندوستانی جن کے دل میں مخلوق کا درد ہے وہ حکومت کے ساتھ ہیں - اس قبیح رسم کے متعلق افسوس نے اپنی کتاب " آرائش محفل " میں المناک تصویر کھینچی ہے - اس نے جو قصہ بیان کیا ہے وہ صوبۂ بنگال میں مقام چکدہ سے متعلق ہے —

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اب توہمات بہت کم ہو گئے ہیں - پچھلی مرتبہ ہردوار میں جو میلا منعقد ہوا اس میں ہندوستان کے طول و عرض سے دو لاکھ پچپن ہزار آٹھ سو لوگوں نے شرکت کی - یہ میلا بارہ اپریل کو منعقد ہوا تھا - اکتوبر کے مہینے میں درگا پوجا اور دسہرے کے تیوہار منائے گئے - ان میں بھی بڑی چہل پہل رہی —

ایک ہندوستانی اخبار میں ایک بوڑھے برہمن کا قصہ لکھا ہے جو دکن کی طرف سے جاترا کے لیے متھرا آیا تھا - اس شہر کو ہندو لوگ بہت عزیز رکھتے ہیں - اس لیے کہ وہ کرشن مہاراج کا جنم بھوم ہے جو وشنو کے اوتار تھے - اس برہمن کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی جس کی عمر صرف نو سال کی تھی - اس لڑکی نے ایک رات خواب دیکھا کہ کرشن مہاراج اس کو اپنے

عقد میں لانا چاھتے ھیں - بھلا اس خواب کی صداقت پر کسے شبہ ھو سکتا تھا ؟ چنانچہ دوسرے دن لڑکی کا عقد کرشن مہاراج کے بت کے ساتھہ کردیا گیا - متھرا کے ھندوؤں میں اس موقع پر خوب خوشیاں منائی گئیں - لوگ اس لڑکی کو دیوی خیال کرنے لگے - اب یہ لڑکی متھرا سے لکھنو چلی گئی ھے اور وھاں " گول دروازہ " میں مقیم ھے - ھر روز صبح کے وقت ھزار ھا ھندو اس لڑکی کے ھاں جمع ھوتے ھیں اور اس کی زبان سے " بھگوت گیتا " سنتے ھیں - ھر روز مٹھائیاں اور چاندی کے زیور اور برتن بطور تحفہ پیش کیے جاتے ھیں —

ھندوستان کے اکثر راجا مہاراجا ترقی کی تحریک کا ساتھہ دے رھے ھیں - ان میں مہاراجا جے پور خاص کر قابل ذکر ھیں - موصوف نے اپنے ھاں آٹھہ ارکان کی ایک کونسل قایم کی ھے تاکہ اس کے مشورے سے حکومت کا نظم و نسق انجام دیا جاے - ان مہاراجا کا یہ دعوی ھے کہ وہ رام چندر جی کی اولاد سے ھیں - چند پشت قبل سترھویں صدی کے آواخر میں اس خاندان میں راجا جے سنگھہ گذرے ھیں جنھیں ریاضی اور فلکیات سے بہت دلچسپی تھی - اس وقت مہاراجا جے پور کو ھندوستانی تہذیب و تمدن کے علم برداروں میں شمار کرنا چاھئے - موصوف کی راجدھانی ھندوستان کے اول درجے کے شہروں میں شمار ھونے کی مستحق ھے —

وجاھت علی نے " اخبار عالم " (۸ اگست سنه ۱۸۶۷ ع) میں نواب رام پور کی بڑی بہت تعریف و توصیف لکھی ھے - موصوف کا نام کلب علی خاں ھے - آپ کو علوم و فنون سے خاص دلچسپی ھے - آپ نے متعدد کالج قایم کراے ھیں اور آپ چاھتے ھیں کہ ھندوستان میں مشین کے رواج کو فروغ ھو - آپ اھل علم و فضل کو خطابوں سے نوازتے ھیں -

مہاراجہ میسور بھی ہندوستان کے ھوشمند والیان ملک میں سے ھیں۔ ابھی حال میں آپ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ھے کہ ہندوستانی اور فارسی عربی کتابوں کا ایک کتب خانہ قایم کریں - مہاراجہ کے سکریٹری نے ہندوستان کے طول و عرض میں مختلف کتب فروشوں اور مطابع کو لکھہ دیا ھے کہ وہ اپنے ہاں کی مطبوعات بھیج دیا کریں - ریاست کی طرف سے ان کی کتابوں کی قیمت ادا کردی جاے گی - (اخبار عالم، تین جنوری سنہ ۱۸٦۷ ع)

ہندوستانی اخبارات میں کچھہ عرصے سے یہ خبر شایع ھورھی ھے کہ حال میں مہاراجا بھرت پور انگلستان آنے والے ھیں - سنا ھے کہ آپ کے اعلیٰ عہدہ دار اور آپ کی رانی صاحبہ اس سفر کے خلاف ھیں اور اس کو محض بیکار تصور کرتے ھیں - انھیں در اصل یہ خدشہ ھے کہ کہیں مہاراجا مسیحی مذھب نہ قبول کرلیں - لیکن نوجوان مہاراجا کی تعلیم و تربیت مغربی فضا میں ھوئی ھے - انھیں ان تمام باتوں کی مطلق پروا نہیں ھوگی اور وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کرکے چھوڑیں گے - ان کی غیر موجودگی کے زمانے میں ایک کونسل ریاست کے فرائض حکومت انجام دے گی - (اخبار عالم سات فروری سنہ ۱۸٦۷ ع)

مہاراجہ اندور کا بھی قصد ھے کہ ولایت جائیں - چنانچہ انھوں نے برھمن علما کی ایک مجلس منعقد کی جس نے ان کے سفر کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اگر مہاراجا کھانے پینے میں پورے طور پر مذھبی پابندی کریں تو ان کے یورپ جانے میں کچھہ مضائقہ نہیں ھے - اس کی وجہ سے وہ ذات باھر نہیں ھوں گے - ذاتی طور پر سفر سے انھیں تجربہ اور واقفیت حاصل ھوگی —

انگلستان میں یہ خبر مشہور ھے کہ مرشدآباد کے نواب ناظم وھاں آنے والے ھیں - کلکتہ میں ایک نہایت تعلیم یافتہ یوروپین رھتا ھے جس

کا ارادہ ہے کہ اپنے ساتھہ بعض ان ہندوستانیوں کو یورپ کے سفر کے لیے لائے جو بہت دنوں سے آنا چاہتے ہیں لیکن ساتھی نہ ہونے کے باعث اپنا ارادہ پورا نہیں کر سکے - یہ یوروپین ہندوستانی زبان اچھی طرح بول اور لکھہ سکتا ہے - اس کے ہمراہیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں - اودہ اخبار کے مدیر پنڈت نول کشور نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یورپ کے سفر کے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائیں گے —

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ادبی انجمنیں اپنے اس بور پوری کوشش کر رہی ہیں کہ اپنے علوم و ادب کی نشرو اشاعت کا انتظام کریں اور ساتھہ ہی مغربی علوم و فنون کو بھی اپنے ہاں رواج دیں - ان میں لاہور اور علی گڑھ کی انجمنیں خاص کر مفید کام کررہی ہیں —

لاہور کی انجمن ڈاکٹر لائیٹر (Dr. Leitner) کی سعی و جہد کی مرہون منت ہے - پچھلے دنوں اس انجمن کے کام کی رفتار ذرا سست ہوگئی تھی لیکن اب اس کی حالت سدھر گئی ہے - اپریل کے مہینے میں اس انجمن کا ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں مولوی محمد حسین نے جو اس کے معتمد ہیں ' یہ اعلان کیا کہ آئندہ سے انجمن اس امر کی کوشش کرے گی کہ غربا کی ضروریات پورا کرنے میں بھی تھوڑی بہت مدد کرے - چنانچہ اس کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا گیا ہے جس میں سرکاری اسپتالوں میں مفلسوں کے ساتھہ جو برا برتاؤ کیا جاتا ہے اس کا تدارک کرنا ' افلاس کے باعث جو عورتیں عصمت فروشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں انہیں اس بے حیائی سے بچانا اور غریب غربا کے لیے دوا تقسیم کرنے کا انتظام کرنا ' خاص کر قابل ذکر باتیں ہیں —

پچھلے ستمبر میں اس انجمن کا ایک اور جلسہ منعقد ہوا جس میں

حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں بھی جگہ ملنی چاہئے - اس کے علاوہ ریلوے کے انتظام سے متعلق بعض شکایات حکومت کے گوش گذار کی گئیں - پانچ اکتوبر کے جلسے میں اردو زبان کی صرف و نحو کا رسالہ پیش کیا گیا جس میں عربی' فارسی اور ترکی صرف و نحو سے اردو کے صرف و نحو کا مقابلہ کیا گیا تھا - اس رسالے کے مصنف کا نام محمد مرزا ہے - موصوف نے انجمن سے درخواست کی کہ اس رسالے کی طباعت کا وہی انتظام کرے —

پنجاب یونیورسٹی کا جو کالج قایم کیا گیا ہے وہ ترقی پذیر ہے - اس کالج میں اردو' فارسی اور عربی کی ادبیات کی تعلیم دی جاتی ہے - اس صوبے میں ان زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا بہت ضروری تھا - چنانچہ اب باقاعدہ ان زبانوں کے درس ہوتے ہیں - پنجاب کے ہر حصے سے نیز کابل تک کے طلبہ ان درسوں میں شرکت کرتے ہیں - (اخبار عالم - ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۹۷ ع) —

پچھلے مارچ کے مہینے میں علیگڈھ والی " انجمن اسلامی " کا جلسہ کلکتہ میں ہوا - اس میں تقریباً دو ہزار لوگوں نے شرکت کی - حاضرین میں ہندوستان کے بعض مشہور مسلمان رئیس شامل تھے - ان کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی تھے - وائسرائے گورنر جنرل اور بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے بھی جلسے میں شرکت کی - انجمن کی جانب سے بعض سائنٹفک تجربات دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا جو بہت پسند کیے گئے - علمی موضوعوں پر تقریریں بھی ہوئیں - وائسرائے بہادر نے انجمن کے معتمد مولوی عبد الطیف خان کی سرگرمی اور ان کے جوش عمل کی بہت تعریف کی —

اس موقع پر انجمن کی جانب سے وائسرائے کو ایک عرضداشت پیش

کی گئی جس میں یہ درخواست کی گئی کہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات نیز تعلیم بجائے انگریزی کے هندوستانی یا بنگالی میں کردی جاے ۔ طلبہ کو اس بات کا حق دینا چاهئیے کہ امتحان میں جواب چاهے انگریزی میں دیں یا اپنی ملکی زبان میں ۔ سہولت اس میں هوگی کہ ان طلبہ کے لیے جو ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاهتے هیں علاحدہ انتظام کیا جاے ۔ یہ درخواست بھی کی گئی هے کہ صوبجات شمال و مغربی کے لیے ایک علحدہ یونیورسٹی قایم کی جاے جس میں ذریعۂ تعلیم هندوستانی هو ۔ ڈاکٹر لیٹنر (Dr. Leitner) نے اس قسم کی تحریک پنجاب میں اٹھائی تھی لیکن حکومت نے اس کے ساتھ خاص همدردی نہیں ظاهر کی ۔ (Homeward Mail چودہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ ع) —

کشمیر کے مہاراجا نے حال میں اپنی ریاست کے اهل علم و فضل کو جمع کیا اور انہیں دعوت دی کہ هر پندرهویں روز وہ مبادلۂ خیالات کی غرض سے یکجا هوں اور بحث و مباحثہ میں مذهبی تعصب سے کام نہ لیں ۔ یہ نہایت عمدہ خیال هے اس لیے کہ اس عامی مجلس میں مختلف مذاهب کے لوگ شرکت کریں گے ۔ هندوستانی اخبارات میں حال ہی اس جلسہ کا ذکر کیا گیا هے جس کی صدارت مہاراجا کے وزیر کرپا رام جی نے کی ۔ موصوف هندوستانی کے شاعر اور صاحب دیوان هیں ۔ جلسے میں فلکیات ، اقلیدس ، فلسفۂ ویدانت اور دهرم شاستر کے متعلق گفتگوئیں هوئیں —

هندوستانی اخبارات یک زبان هو کر لکھتے هیں کہ اگر صوبوں کے لفٹنٹ گورنر اور دوسرے والیان ریاست اسی طرح علمی شغف ظاهر کریں تو یقین هے کہ جہالت کی تاریکی چند سال کے اندر دور هو جاے گی ۔

لیکن بدقسمتی سے دوسرے والیان ملک دوسرے انداز کے لوگ ھیں - ان میں بیشتر ایسے ھیں جنھیں بس اپنی خوش وقتی سے سروکار ھے - ان کا زیادہ وقت رقص و سرود کی محفلوں ' چوسر ' پچیسی اور گنجفے کے نذر ھوتا ھے - وہ سنجیدہ مشاغل سے دور بھاگتے ھیں —

میں نے والیان ملک کے جن مشاغل کا ابھی ذکر کیا ھے ان میں ھندوستانی زبان ھی کے ذریعے خیالات ادا کئے جاتے ھیں - معاشری اور ادبی خیالات اسی کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ھیں - انگریز لوگ جب دیسیوں سے گفتگو کرتے ھیں تو انھیں اسی زبان میں خطاب کرتے ھیں - میں آپ کے سامنے اپنے پچھلے خطبوں میں انگریزوں کی تقریروں کا ذکر کر چکا ھوں - پانڈی چری میں اس کے بالکل برعکس ایک ھندوستانی نے جو مسیحی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا لارڈ نیپیر (Napier) کے رو برو لاطینی زبان میں تقریر کی - نہ معلوم یہ عجیب و غریب خیال اس شخص کو کیونکر پیدا ھوا اور اس نے ھندوستانی ' انگریزی اور فرانسیسی پر لاطینی کو ترجیح دی - غالباً وہ یہ بتانا چاھتا تھا کہ وہ لاطینی زبان سے واقفیت رکھتا ھے - یہ زبان ھر اُس طالب علم کے لیے لازمی ھے جو رومی کلیسا میں پادری کے عہدہ پر ممتاز ھونا چاھتا ھے —

حکومت ھند یورپین لوگوں کو ھندوستانی زبان سکھانے کی اھمیت اور ضرورت کو روز بہ روز تسلیم کر رھی ھے - پچھلے جون میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ سول سروس کے ان امیدواروں کو ایک ایک ھزار روپے بطور انعام دیے جائیں گے جو اردو یا ھندی میں امتیاز کے ساتھ امتحان میں کامیاب ھوں گے - جو امیدوار ان زبانوں میں اعزازی ڈگری حاصل کریں گے انھیں دو دو ھزار روپیہ دیا جاے گا - ان انعامات کا مقصد یہ

هے که ان زبانوں کی همت افزائی کی جاے - فوجی لوگوں کو دو سال کی رخصت کا حق دیا گیا هے که وہ جس حصۂ ملک کی زبان سیکھنا چاهیں وهاں جا کر رهیں اور سیکھیں - خاص کر هندوستانی کے لیے یه قاعدہ بنایا گیا هے ' اس لیے که زیادہ تر اسی زبان کو سیکھنے کا شوق ظاهر کیا جاتا هے - چنانچه بائیس جولائی کو کوارٹر جنرل نے شمله سے ایک گشتی جاری کی هے جس میں نوجوان افسروں کو هندوستانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی گئی هے اور بتایا گیا هے که اس زبان کو جاننے کی بدولت وہ مختلف خدمت کے لیے اپنی کار گذاری بڑھا سکتے هیں - (انڈین میل بیس ستمبر سنه ۱۸۶۷ ء)

لندن کے اخبار اورینٹل سرکلر (Oriental Circular) نے هندوستانی کی اهمیت کو محسوس کرتے هوے اس زبان میں اپنے اشتہارات دینا شروع کیے هیں - سید عبدالله هندوستانی میں اشتہارات لکھنے کا کام انجام دیتے هیں - اس اخبار میں اور دوسری مشرقی زبانوں میں بھی اشتہار نکل رهے هیں - *اگر فرانسیسی اهل صنعت بھی اس طرف اپنی توجه* مبذول کریں تو نفع سے خالی نه هوگا —

میں نے اهل هند کی جن ترقیوں کا ذکر کیا هے اس کا یه منشا نهیں که وہ مسیحی مذهب کی طرف بھی راغب هو رهے هیں - هاں یه ممکن هے که جب وہ ترقی یافته هو جائیں گے تو عیسائی مذهب کی طرف خود بخود مائل هوں گے - ان میں جو ترقی رونما هے اس کا ایک لازمی نتیجه یه هوگا که ان میں روا داری پیدا هوجاے گی - چنانچه ابھی حال میں شمله کے راجا کی جانب سے ایک اعلان شائع هوا هے جس میں انجیل کی نشر و اشاعت کی اجازت دی گئی هے اور یه بھی واضح کیا گیا هے که اگر

رعایا میں سے کوئی عیسائیت قبول کرلے تو اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جاے گی —

ریاست ٹراونکور میں اگرچہ ایک ہندو فرماں روا حکومت کرتا ہے لیکن وہاں مذہبی آزادی پورے طور پر موجود ہے - چنانچہ ابھی حال میں جب اس ریاست کے مہاراجا کو " ستارۂ ہند " کا خطاب دیا گیا تو وزیر اعظم نے اپنے اعلان میں اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ مشنری جماعت ان کے ملک کو فائدہ پہنچا رہی ہے (انڈین میل - بیس جون سنہ ۱۸۶۷ ع)

برطانوی حکومت اس باب میں بہت احتیاط برت رہی ہے اور مذہبی معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتی - حکومت نے دینی معاملات کو دنیاوی معاملات سے بالکل علحدہ رکھنے کا تہیہ کرلیا ہے جیسا کہ انجیل مقدس میں مذکور ہے : " آسمانی امور کا تعلق خدا سے ہے - خدا نے دنیاوی معاملات انسانوں کے سپرد کردئے ہیں " (Psalms C.x 111,25)

کلکتہ کے نئے مہا پادری کا نام روبرٹ ملمین (Rev Robert Milman) ہے - ہمیں توقع ہے کہ آپ بھی اہل ہند کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کا ویسا ہی خیال رکھیں گے جس طرح ان کے پیش رو کو تھا - موصوف کے متعلق ہمیں جو حالات معلوم ہوے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نہایت ہمدرد شخص ہیں - آپ کی تعلیم آکسفورڈ میں ہوئی اس کے بعد آپ بکنگھم کے ضلع میں مذہبی خدمت پر مامور کیے گئے - آپ بیرونٹ سرڈ بلو جی ملمین (Baronet Sir W. G. Milman) کے صاحبزادے ہیں اور ایک اعلی خاندان کے چشم و چراغ ہیں - آپ کا تعلق ہائی چرچ (High Church) سے ہے جو اپنے عقاید میں کیتھولک مذہب سے قریب تر ہے - بر خلاف اس کے لو چرچ

(Low Church) کے رسوم و عقاید خالص پروٹسٹنٹ مذهب سے تعلق رکھتے هیں - روبرٹ ملهین صاحب ایک جادو بیان مقرر هیں - آپ اپنی تقاریر بغیر کسی تیاری کے کرتے هیں - آپ کی متعدد تصانیف بھی هیں * —

دو فروری کو کنٹر بری کے آرچ بشپ نے آپ کے منصب نشینی کی رسم ادا کی - اس کے ساتھ دو اور مہا پادری بھی اس رسم میں شریک تھے - اپریل میں باقاعدہ کلکتہ کے کلیسا سینٹ پال میں آپ نے اپنے منصب کی ذمہ داریاں قبول کیں - مئی کے مہینے سے برابر پینٹیس پادری موصوف کے ساتھ مختلف دینی مسائل پر غور کر رهے هیں - ان میں بعض مسائل دلچسپی سے خالی نہیں - مثلاً ایک مسئلہ زیر غور یہ بھی ہے کہ سارے هندوستان کے لیے دعاؤں کا انتخاب شائع کیا جاے - یہ دعائیں ایسی زبان میں لکھی گئی هیں جو نہایت سادہ اور موثر ہے - هندوستانی لوگ ان دعاؤں کو سن کر متاثر هوتے هیں جیسا کہ راجا رام موهن راے نے ان کے متعلق اظہار خیال کیا ہے - راجہ رام موهن راے کے خیالات وهی هیں جن کا اظہار ڈاکٹر واٹز نے اپنے اشعار میں کہا ہے :

" اے خداوند ! ایک جماعت کی جماعت تیرے سامنے سر نیاز جھکائے کھڑی ہے - یہ منظر بھی کیا عجیب و غریب ہے - کبھی وہ گانے لگتے هیں اور کبھی پھر عبادت میں غرق هوجاتے هیں - ان کے کان آسمانی سر گوشیوں کو سنتے هیں اور وہ اپنی راہ عمل پا لیتے هیں " —

* (1) The Love of Atonement.
(2) The Voice of Harvest.
(3) The Convertion of Pomerania.

رابرٹ ملمین نے ہندوستان پہنچنے کے ساتھہ ہی ہندوستانی زبان سیکھنی شروع کردی ہے ۔ مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ اس قدر قلیل عرصے میں موصوف دیسیوں کے سامنے انہیں کی زبان میں وعظ کہتے ہیں ۔ چنانچہ سترہ اکتوبر دہلی میں سینٹ ایٹین (St. Etienne) کلیسا کے افتتاحی جلسہ میں آپ نے اردو اور انگریزی دونوں میں تقریر کی ۔ اس کلیسا کی عمارت نقش و نگار سے آراستہ ہے اور ان کے ذریعہ مذہبی تمثیلات ظاہر کی گئی ہیں ۔ بعض جگہ انجیل مقدس کی عبارتیں کندہ کی گئی ہیں ۔ (دہلی گزٹ ، انڈین میل ، ستائیس نومبر سنہ ۱۸۶۷ ع) —

بالعموم ہندوستانیوں میں جو لوگ عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ جاہل طبقے کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ان میں سے بعض کو کلیسائی عہدے بھی حاصل ہوے ہیں ۔ مدراس کے مہاپادری نے پچھلی مرتبہ اپنے دورے میں پانچ ہزار دو سو باون دیسی لوگوں کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی تصدیق کی ہے ۔ انہیں دیسی لوگوں میں سے نوکو پادری مقرر کیا اور گیارہ کو چھوٹا پادری ۔ ابھی حال میں متھرا میں ایک ہندو نے جو اپنے ایک مدرسہ کو چلا رہا تھا عیسائی مذہب قبول کر لیا ۔ چنانچہ اس کو بمبئی کے مہا پادری نے پادری کے عہدے پر مامور کر دیا ہے —

آگرہ کے کلیسا میں ہر اتوار کو دو مرتبہ ہندوستانی زبان میں عبادت اور مناجات کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں ۔ پچھلے سال اسی گرجے میں آٹھہ ہندوؤں نے مسیحی مذہب قبول کیا جن میں ایک برہمن تھا ۔ اضلاع میں بھی گرجے قایم ہوگئے ہیں جہاں عیسائی لوگ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں ۔ اضلاع میں مسیحی مبلغین کو سخت مخالفت کا سامنا

کرنا پڑتا ھے - ابھی حال میں ھاتھرس میں بعض مبلغین کو بری طرح مار پیٹ کی - اور ان پر پتھر پھینکے —

مسیحی مبلغین کو نسبتاً ان نیم وحشی اقوام میں کامیابی ھورھی ھے جو حکومت ھند کے تحت بعض گوشوں میں زندگی بسر کر رھے ھیں - چنانچہ بنگال کی سرحد اور ناگپور کے علاقے کے درمیان ایک جرمن مشنری نے چودہ ھزار نفوس کو مسیحی حلقے میں داخل کرلیا ھے - یہ لوگ عام طور پر " قلی " یا " ڈانگری " کہلاتے ھیں - یہ خبریں میں نے میرتھہ کے اردو اخبار " اخبار عالم " میں پڑھی ھے (تیئن جنوری) - اس اخبار کے مدیر ایک مسلمان ھیں - اس علاقے کے راجا نے مسیحی مبلغین کی راہ میں بہت کچھہ روڑے اٹکائے اور ان لوگوں کو جنہوں نے مسیحی مذھب قبول کر لیا تھا ھر قسم کی تکالیف پہنچائیں لیکن اس کی ایک نہ چلی —

کرسچین ورنکلر ایجوکیشن سوسائٹی (Christian Vernacular Education Society) کے پیش نظر یہ اصول ھے کہ دیسی لوگوں کو انہیں کی زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کرے - چنانچہ اس انجمن کے چار مدارس، کلکتہ، امرتسر، احمد نگر اور دنڈیگل میں اپنا کام کر رھے ھیں - کچھہ دنوں بعد یہاں مدارس دیسی عیسائیوں کی تعلیم کے سب سے بڑے مرکز بن جائیں گے - اس انجمن کی شاخوں کی تعداد ۷۸ ھے اور ان میں چار ھزار طلبہ تعلیم پاتے ھیں - ان مدارس کے سب اساتذہ انجمن کی جانب سے مقرر کئے جاتے ھیں - انجمن کی طرف سے ایک بڑی تعداد مطبوعات کی شائع ھوچکی ھے - ھمارے خیال میں مسیحی مذھب کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ھندوستان میں اب تک جس قدر مطبوعات شائع ھوئی ھیں ان میں سے ایک تہائی اس انجمن نے طبع اور شایع کرائی ھیں - اس انجمن کا ایک اھم مقصد یہ ھے کہ

بیس کروڑ نفوس جو ہندوستان میں بستے ہیں ان کی تعلیم و تلقین کا انتظام کرے - چنانچہ یہ انجمن اساتذہ کی ایک بڑی جماعت کو تیار کر رہی ہے - اس وقت بھی غیر مسیحی مدارس میں اس انجمن کے تربیت یافتہ اُستاد پڑھانے کا کام انجام دے رہے ہیں - صرف بنگال میں ۵۰ ہزار مدرسے ہیں - اگر اس انجمن کے نمائندے ہر مدرسے میں پہونچ گئے تو یہ اس کی عظیم الشان کامیابی ہو گی —

مسٹر سی ڈبلو ڈبلو الکزنڈر (C. W. W. Alexander) نے جو حلقۂ لاہور کے مہتمم تعلیمات ہیں ' عماد الدین کی اس کتاب کے متعلق مجھے پوری معلومات بہم پہونچائی تھیں جو موخر الذکر نے مسیحی مذہب کی حمایت میں لکھی ہے - عماد الدین نے کُھلم کُھلا عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے - عماد الدین کے بھائی کریم الدین کا رجحان بھی مسیحی مذہب کی طرف ہے لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے عقائد کا بلا کسی جھجک کے اعلان کریں - عماد الدین نے اپنی تصنیف میں ' جس کی نسبت میں پچھلے سال بھی ذکر کر چکا ہوں ' اسلام پر اردو زبان میں اعتراضات پیش کئے ہیں - اس کتاب کا نام تحقیق الایمان رکھا ہے - مجرد اس خیال سے کہ عماد الدین اس قسم کی کتاب تصنیف کر رہے ہیں شہر لاہور میں ہل چل مچ گئی ہے - چنانچہ اردو کے سب مطابع اس کتاب کو چھاپنے سے انکار کر رہے ہیں - کاغذ فروخت کرنے والے تاجر اس کتاب کے لیے کاغذ دینے پر آمادہ نہیں - مسٹر الکزنڈر کے اثر کی وجہ سے ایک ہندو جو مالک مطبع ہے اس کتاب کی طباعت کے لیے تیار ہو گیا ہے لیکن اس کو یہ دشواری پیش آ رہی ہے کہ مسلمان خوش نویس اسے لکھنے سے انکار کر رہے ہیں - ہندوؤں میں خوش نویس ہیں نہیں جن سے لیتھو کی چھپائی کے لیے لکھا یا جائے -

با لآخر یہ کتاب " مطبع آفتاب پنجاب " میں چھپ گئی ھے ۔ اس مطبع کا مالک ایک ھندو شخص ھے ۔ عملی دشواریوں کے باعث اس کی طباعت ٹائپ میں ھوئی ھے ۔ عماد الدین چونکہ با اثر شخص ہے اس لیے اس کے عیسائی ھونے سے مسلمانوں میں ایک طرح کی بے چینی نمودار ھوگئی ھے ۔ اس کی مثال اور اس سے زیادہ اس کی کتاب دوسرے مسلمانوں پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ چنانچہ مسلمانوں میں بعض نے عمادالدین کی دیکھا دیکھی مسیحی مذھب قبول کر لیا ھے ۔ اب اس وقت اپنی کتاب کی طباعت کے بعد عمادالدین اسی قسم کی دوسری کتابوں کی تصنیف میں مشغول ھیں جن میں مذھب اسلام پر اعتراضات کئے جائیں گے اور عیسائیت کی صداقت ثابت کی جائے گی ۔ تحقیق الایمان ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ھے ۔ اس کا ایک نسخہ مجھے مسٹر الکزنڈر نے از راہ کرم بھیج دیا ھے ۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ مصنف نے جن مسائل پر بحث کی ھے ان پر کافی غور بھی کیا ھے ۔ اس کتاب کی تمہید میں یہ بیان کیا گیا کہ بیس سال سے جس حقیقت کی تلاش تھی وہ بالآخر مسیحی مذھب میں ملی ۔ اس کے بعد مصنف نے انجیل مقدس اور قرآن کا مقابلہ کیا ھے اور اول الذکر کی صداقت پر بحث کرتے ھوئے یہ بتایا ھے کہ مسلمان بھی اصولاً اس کی سچائی کو تسلیم کرتے ھیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ھیں کہ یہود و نصاریٰ نے اس کتاب مقدس میں تحریفات کی ھیں ۔ اس کے بعد کے ابواب میں محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) اور حضرت مسیح کے حالات زندگی بیان کئے گئے ھیں ۔ مصنف کا خیال ھے کہ ان دونوں پیغمبروں کی زندگی اور ان کی سیرت میں بہت بڑا فرق ھے ۔ کتاب کے آخری باب میں یہ ثابت کیا ھے کہ ابن اللہ اور اللہ میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رہتی ۔ دونوں اصل میں ایک ھیں —

حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کے لیے جو مغربی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اس کا اثر بھی مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت میں بہت مدد دے رہا ہے —

ملکۂ معظم کی حکومت قابل مبارک باد ہے کہ اس نے سرسٹا فرڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford Northcote) کو وزیر ہند کی خدمت پر مامور کیا ہے - آپ اپنی صلاحیت کار اور نیک دلی کے باعث مشہور ہیں - اس کے ساتھ سروليم میور (مسٹر جان میور کے بھائی) جنھیں " ستارۂ ہند " اور Commander of the Royal Order کا خطاب ملا ہے ' قابل مبارک باد ہیں کہ انھیں علوم مشرقی کی خدمت کے صلے میں یہ اعزاز حاصل ہوئے —

گذشتہ سالوں کی طرح میجر فلر نے پنجاب کی تعلیمی ترقی کے متعلق مجھے اپنی رپورٹ بھیجی ہے - یہ رپورٹ ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے - اس کے پڑھنے سے اس صوبے کی تعلیمی رفتار کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے - ضمنی طور پر مشنری اداروں کی رو داد بھی مل جاتی ہے کہ وہ کیونکر تعلیم کے ذریعہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرنے میں مشغول ہیں - اس کے ساتھ مقامی حالات کی رپورٹیں بھی منسلک ہیں - ان میں سے ایک رپورٹ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شملہ میں اس وقت ایک مدرسہ لڑکوں کا اور ایک لڑکیوں کا رومن مشنری چلا رہے ہیں - ان دونوں مدرسوں کی عام حالت قابل اطمینان ہے —

میجر فلر کی رپورٹ کو یہاں میں پوری تفصیل کے ساتھ نہیں پیش کرسکتا - صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت پنجاب کے تمام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ہندوستانی اور بالخصوص اردو سکھائی جاتی ہے - اس کے ساتھ فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی لازمی ہے -

فارسی اب تک ہندوستان کی علمی زبان تھی اس لیے اس کو اہمیت حاصل ہے - مذہبی حیثیت سے ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی سیکھنا ضروری ہے اس لیے ان دونوں زبانوں کے سکھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے - پشتو جو سرحدی افغانوں کی زبان ہے مخصوص مدارس میں سکھائی جاتی ہے - اس زبان کی ابتدائی کتابیں بھی سرشتۂ تعلیم کی جانب سے تیار کی گئی ہیں —

کلکتہ ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی امیدواروں کی ایک بڑی تعداد کو سندیں دے رہی ہیں - ہندوستان کی یونیورسٹیاں بھی انگلستان اور فرانس کی یونیورسٹیوں کی طرح امتحان کے ذریعہ امیدواروں کی قابلیت کی جانچ کرتی ہیں - ہندوستان میں اس کے جو نتائج پیدا ہورہے ہیں ان پر سخت تنقید کی گئی ہے * - بہر حال یہ اب مسلم ہے کہ مغربی علوم کے لیے جو مدارس اور یونیورسٹیاں ہندوستان میں قایم کی جائیں ان میں ہندی علوم کی طرف سے بے رخی نہیں برتنی چاہئے اور تعلیم کا ہرگز یہ منشا نہ ہونا چاہئے کہ اہل ہند اپنے ماضی کو بھول جائیں اور اپنی قومیت کی بنیادوں کو منہدم کر ڈالیں - اس قسم کی کوشش اگر مغربی علوم کے ذریعہ کی گئی تو وہ ناکام رہے گی - در اصل کوشش اس امر کی ہونی چاہئے کہ جدید علوم وفنون کی بدولت ہندی معاشرت کے مختلف عناصر میں امتزاج پیدا کیا جائے تاکہ انگلستان

---

* میجر ڈبلو نسو لیز (Nassau - Lees) نے اپنی کتاب Short Essays and Reviews on the educational policy of the Govt : of India میں اس موضوع پر نہایت دلچسپ تبصرے کیے ہیں —

کے زیر سایہ پوری قوم جسم واحد کی طرح زندگی بسر کرے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضرور نہیں کہ ہندوستانی اپنے تئیں مغربی رنگ میں رنگ لیں —

لکھنو میں کیننگ کالج روز بروز ترقی کر رہا ہے ۔ اس وقت اس کالج میں تین تعلیمی جماعتیں ہیں —

(۱) ہندوستانی (اردو) کی جماعت

(۲) انگریزی کی جماعت

(۳) اعلیٰ جماعت

ہندوستانی کی جماعت میں انگریزی نہیں پڑھائی جاتی بلکہ ہندوستان کی علمی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس جماعت میں ایک سو پینتالیس طلبہ ہیں ۔ ان میں سات فارسی سیکھتے ہیں ' تیس سنسکرت اور ستر عربی کی تحصیل کرتے ہیں ۔ انگریزی کی جماعت میں انگریزی کے ذریعہ درس دئے جاتے ہیں ۔ لیکن ہندی ' عربی اور سنسکرت پڑھانے کا بھی اس جماعت کے طلبہ کے لیے انتظام کیا جاتا ہے ۔ اعلیٰ جماعت میں کلکتہ یونیورسٹی کے لیے طلبہ تیار کیے جاتے ہیں ۔ اگر چہ اس کالج کے قیام کو تین سال سے زیادہ نہیں گذرے لیکن صوبۂ شمال مغربی یا پنجاب کے بہترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ کالجوں کے ساتھہ اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔ صرف بنارس کالج جو تقریباً نصف صدی سے قایم ہے ' کیننگ کالج سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ کیننگ کالج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انحصار زیادہ تر امرا کی مدد پر ہے ۔ پچھلے سال طبقۂ امرا نے ستر ہزار روپیہ اس کالج کے لیے جمع کیا —

آپ صاحبوں کو سن کر تعجب ہوگا کہ امریکی طریقے کے مطابق سورت' کیرا اور احمدآباد میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھہ تعلیم دینے کے لیے مدارس

قایم کیے گئے ھیں۔ ان مدرسوں میں ھندوؤں اور مسلمانوں کی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتی ھیں - شاید مسلمانوں کا نام سن کر آپ بہت متعجب ھوں گے اس واسطے کہ وہ اپنی عورتوں کو کبھی پردہ سے باھر نہیں لانا چاھتے —

برار کے ناظم تعلیمات ڈاکٹر سنکلیر (Sinclair) نے ابھی حال ھی میں اپنے صوبے میں دو ثانوی مدارس قایم کیے ھیں - اب اس صوبے میں ان مدارس کی تعداد ستاون ھو گئی ھے (اخبار عالم - تیس جنوری سنہ ۱۸۶۷ ع) —

صوبۂ متوسط میں ایک مدرسہ رائے پور میں غریب مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے قایم کیا گیا ھے۔ اب ایک لیتھو پریس قایم کرنے کے متعلق گفت و شنید ھو رھی ھے - تاکہ ھندوستانی اخبار جاری کیا جائے - (ھوم ورڈ میل - بیس ستمبر سنہ ۱۸۶۷ م) —

راجپوتانے میں جو ابتدائی مدارس قایم کیے گئے ھیں ان میں صرف ھندی اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی ھے - ھر گاؤں میں ایک پاٹ شالہ ھوتا ھے جو برھمن کے ماتحت ھوتا ھے - کبھی کبھی حکومت بھی اسے امداد دیتی ھے — اعلی تعلیم کا انتظام صرف بڑے بڑے شہروں میں ھے جہاں حکومت براہ راست انتظام کرتی ھے - ان پاٹ شالوں میں برھمن لوگ سنسکرت پڑھاتے ھیں ' کایستھ فارسی اور اردو کی تعلیم دیتے ھیں - کایستھ لوگ فارسی اردو پر اسی طرح قدرت رکھتے ھیں جیسے مسلمان - نوجوان راجپوت جب گھر سے باھر قدم رکھنے کے قابل ھو جاتا ھے تو سب سے پہلے اس کو تلسی داس کی رامائن اور مہابھارت کا ھندی ترجمہ پڑھایا جاتا ھے - ان نظموں سے اس کو اپنی قوم کے بہادری کے کارنامے

معلوم ہوتے ہیں —

مجھے اب تک نظام کی ریاست کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں - بیرن چارل دوپین (Baron Charles Dupin) نے جو کیتھولک مذہب کے مبلغ ہیں' حیدرآباد میں سنہ ۱۸۶۶ع میں ایک فرانسیسی وضع کا مدرسہ قایم کیا ہے - اس مدرسے میں ہندوستانی (اردو) ' فارسی ' اور علوم کے مبادیات سکھائے جاتے ہیں * —

حکومت کے مدارس کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں خانگی مدرسے برابر قایم ہو رہے ہیں - لیکن چونکہ ان مدارس کو حکومت کے مدارس کے ساتھہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کی تعداد میں روز بروز کمی واقع ہو رہی ہے - صوبجات شمال مغربی میں خانگی مدارس بڑی تعداد میں موجود ہیں جہاں ہندوستانی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے - اس علاقے میں دستور ہے کہ جب لڑکا پانچ سال کا ہوتا ہے تو پہلے اس کے والدین نہلا دھلا کر اسے صاف کپڑے پہناتے ہیں اور پھر مدرس کے پاس لے جاتے ہیں - اس موقع پر اعزا اور دوست احباب مدعو کیے جاتے ہیں اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے - اگر بچے کے والدین مسلمان ہیں تو استاد سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے اور اگر والدین ہندو ہیں تو اسی قسم کی ایک مذہبی دعا پڑھی جاتی ہے - استاد بچے کو سب سے پہلے حروف

---

* مجھے پوری توقع ہے کہ سر رچرڈ ٹمپل جن کا کچھہ عرصہ ہوا حیدر آباد میں ریزیڈنٹ کی خدمت پر تقرر ہوا ہے مجھے اس ریاست کے متعلق پوری معلومات مہیا کر دیں گے تا کہ اس امر کا پتہ چلے کہ اس ریاست کی تعلیمی ترقی کی کیا حالت ہے اور دکن میں ہندوستانی زبان کی کیا خدمت ہو رہی ہے —

تہجی سے آشنا کرتا ہے - پھر بعد میں سادہ الفاظ پڑھاتا ہے - جیسا کہ فرانس میں کیا جاتا ہے - سات سال کی عمر میں بچے کو لکھنا سکھایا جاتا ہے - استاد لکڑی کی تختی پر کھریا سے حروف اور الفاظ لکھتا ہے اور بچہ ان کی نیچے نقل کرتا ہے - چند ماہ بعد بچے کو خالق باری حفظ کرائی جاتی ہے - خالق باری سے فارسی الفاظ کے اردو معنے بچے کو یاد ہو جاتے ہیں - اس کے چند ماہ بعد کریما' اور پند نامے کی باری آتی ہے - پھر آٹھہ سال کی عمر سے استاد بچے کو صبح میں گلستاں اور شام میں بوستاں پڑھانا شروع کرتا ہے - سعدی کی یہ دونوں کتابیں ایران' ترکی اور ہندوستان میں بطور کلاسک پڑھی جاتی ہیں- اگر ضرورت ہوتی ہے تو استاد کبھی کبھی گوشمالی بھی کرتا ہے - اس کی اجازت خود والدین دیتے ہیں - چنانچہ مشہور ہے کہ عام طور پر والدین جب اپنے بچے کو کسی استاد کے حوالے کرتے ہیں تو کہدیتے ہیں کہ بچے کا " چمڑا تمہارا ' ہڈی ہماری " - بارہ سال کی عمر میں نظامی کا سکندر نامہ پڑھایا جاتا ہے اور اس کے ساتھہ انشا کی مشق کرائی جاتی ہے - اس عمر میں عربی بھی شروع کردی جاتی ہے - لیکن اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریروں میں جو عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کے معنی سے واقفیت حاصل ہو —

جمعہ کا روز مسلمانوں میں متبرک مانا جاتا ہے - اسلامی مدارس میں اسی روز چھٹی دی جاتی ہے - بعض مدارس میں جمعرات کے دن نصف روز کی چھٹی رہتی ہے - تہوار کے موقع پر استاد بچوں کو کچھہ اشعار لکھہ کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے والدین کو جا کردیں - والدین استاد کو تحفے بھیجتے ہیں جو خوشی سے قبول کیے جاتے ہیں - استاد ویسے بچوں

سے بارہ آنہ ماہوار سے زیادہ فیس نہیں لیتا - بچہ جب اپنی تعلیم ختم کرکے مدرسہ سے نکلتا ہے تو اس کو فارسی ادب سے کافی واقفیت حاصل ہوجاتی ہے - اسے چند اشعار اور کہاوتیں یاد ہوتی ہیں اور تھوڑی بہت ریاضی بھی آجاتی ہے - لیکن جغرافیہ اور تاریخ میں وہ بالکل کورا ہوتا ہے - فلسفہ یا سائنس کے متعلق وہ ایک حرف نہیں جانتا - ہندو پاٹ شالوں کی بھی بالکل یہی حالت ہے - ان میں فارسی کی جگہ سنسکرت کی تعلیم ہوتی ہے —

میں نے ابھی جو حالات آپ کے سامنے بیان کیے ہیں ان سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ حکومت ہندوستانی زبان کی کتابوں کی اشاعت میں سعی بلیغ کر رہی ہے اور ہر علم کے متعلق کتابیں لکھوا رہی ہے - مسلمان علاقوں میں اردو میں اور ہندوؤں کے علاقوں میں ہندی میں یہ کتابیں شائع کی جاتی ہیں —

اس سال تعلیم نسواں کی طرف بھی ہندوستان میں کافی توجہ کی گئی ہے - چنانچہ " مدراس ٹائمز " میں اس کے متعلق ایک ہندوستانی کا خط چھپا ہے جو نہایت معقول ہے - اس خط کا مضمون یہ ہے : ہندوستانیوں کا ہوشمند طبقہ اس بات کا خواہش مند ہے کہ ان کی مستورات تعلیم حاصل کریں لیکن وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہو - یہ بات انھیں عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا خیال پیش کیا جاے - جن معاملات کے متعلق ہندوستانی عورتوں کو واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے انھیں وہ اپنی زبان ہی میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں - بعض یورپین لوگوں کا یہ خیال قابل قبول نہیں ہے کہ اچھی تعلیم انگریزی ہی میں ہوسکتی ہے -

یہ محض ان لوگوں کا خیال خام ہے۔ اگر عورتوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی کوشش کی جائے گی تو خود تعلیم کا مسئلہ بہت مشکل ہوجائے گا۔ اگر عورتوں کو مغربی تعلیم دی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی لوگوں کی خاندانی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کا ایک علحدہ ہی طبقہ قایم ہو جائے گا۔

پچھلے سال پنجاب میں تین سو تینتیس لڑکیوں کے مدارس تھے۔ یہ سب مدارس حکومت کی امداد سے چل رہے ہیں اور اس وقت ان میں چھ ہزار آٹھ سو چونتیس لڑکیاں تعلیم پارہی ہیں۔ لڑکوں کے مدارس کی تعداد چھ سو چھیانوے ہے۔ ان میں سے بعض مشنری لوگوں کے ہیں اور بعض ذاتی طور پر قایم کیے گئے ہیں اور مقامی کمیٹیاں انہیں چلاتی ہیں۔ ان سب مدارس میں بارہ ہزار سات سو ستائیس طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان مدارس میں سے ایک دہلی میں ہے جس کو خاندان مغلیہ کے افراد نے قایم کیا ہے۔ اس خاندان کے افراد کی تعداد اچھی خاصی اب تک موجود ہے۔ اس مدرسے میں گلستاں کا اردو ترجمہ کرایا جاتا ہے اور ہندوستان کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے * —

اودھ کے چیف کمشنر نے صوبجات شمال و مغربی کے ناظم تعلیمات

---

* میں کسی پچھلی صحبت میں ذکر کر چکا ہوں کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے خاص کتابیں تیار کی جارہی ہیں۔ مجھے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں تین کتابوں کا اور ذکر ہے —

(۱) استری سکش۔

(۲) گیان دیپک

(۳) استری اپدیس۔

کے خیال کے مطابق حکومت ہند سے درخواست کی ہے کہ لکھنؤ میں شریف خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا جائے ۔ اس مدرسے کے اخراجات نصف مقامی روسا کے چندے سے پورے کیے جائیں گے اور نصف حکومت ہند دے گی —

ایک تجویز یہ ہے کہ دھلی میں عورتوں کی تعلیم کے لیے میڈیکل کالج قایم کیا جاے ۔ چونکہ مرد ڈاکٹر زنانے میں نہیں جاسکتے اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ خود عورتوں کو طب کی تعلیم دی جاے تاکہ وہ زنانے میں علاج کرسکیں ۔ یہ عورتیں انگریز عورتوں کے ماتحت ہر قسم کا کام اس کالج میں سیکھیں گی ۔ جس ہندوستانی اخبار سے ہم کو یہ خبر ملی ہے اس کے مدیر نے اس تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوے خواہش ظاہر کی ہے کہ کیا اچھا ہو اگر اس کالج میں یونانی طب کی تعلیم کا انتظام کیا جاے ۔ یونانی طب کو مسلمان اپنا مخصوص طریقۂ طب سمجھتے ہیں ۔ عام طور پر ہندوستان میں یہ خیال بھی موجود ہے کہ یونانی طب اہل ہند کی طبائع کے لیے بمقابلہ یورپی طب کے زیادہ موزوں ہے ۔ (اخبار عالم' بیس جنوری سنہ ۱۸۶۷ ع) —

ہندوستانی اخبارات عوام کی تعلیم میں بہت مدد دے رہے ہیں اور جہالت کی تاریکی کو رفع کررہے ہیں ۔ جس قدر ان کی اشاعت بڑھ رہی ہے اسی قدر لوگوں کی معلومات عامہ میں اضافہ ہورہا ہے جو بغیر ان کے کسی اور طرح سے یہ معلومات نہیں حاصل کر سکتے تھے ۔ یورپین لوگوں کے لیے بھی لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہ اخبارات بہت مفید ہیں ۔ جو یورپین ہندوستانی زبانوں کے متعلق تحقیق کرنا چاہتے ہیں انھیں ان اخباروں کے پڑھنے سے بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ چنانچہ اسی خیال کا

اظہار " انڈین میل " * نے بھی کیا ھے - جدید انشا پردازوں کے مضامین " اودھ اخبار " اور " اخبار عالم " میں شایع ھوتے ھیں - ھندوستانی معاشرت کے طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ متوسط کے خیالات ان اخباروں میں پیش کیے جاتے ھیں - " انڈین میل " کے مضمون نگار نے یہ خواھش ظاھر کی ھے کہ سول سروس کے امیدواروں کا امتحان اس جدید زبان میں ھونا چاھئے جو آج کل مروج ھے بجاے اس کے کہ ' اخوان الصفا ' اور سنگھاسن بتیسی کی زبان میں ان کی جانچ کی جاے - میں اب تک یہ پتا نہیں چلا سکا کہ " باغ و بہار " اور " پریم ساگر " کو نصاب میں سے کیوں خارج کر دیا گیا - میں ان دونوں کتابوں کو اوروں پر ترجیح دیتا ھوں - چنانچہ ان دونوں کو میں نے درسوں میں خاص اھمیت دی ھے —

اس سال ھندوستانی کے دس نئے اخبار جاری ھوے ھیں - ممکن ھے ان کے علاوہ بھی کوئی ھوں جن کی نسبت مجھے معلومات نہیں حاصل ھو سکیں - ان اخباروں کے مضامین کی ترتیب بالکل ان اخباروں کی طرح ھے جن کی نسبت میں ذکر کر چکا ھوں - ان میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی ھوتے ھیں - اردو اخباروں کی فہرست یہ ھے :—

(۱) آئینۂ علم - یہ اخبار اسی سال یکم اکتوبر سے آگرہ سے جاری ھوا ھے -

(۲) اردو اخبار - یہ بھی آگرہ سے شائع ھوتا ھے - اس کے مدیر بال گوبند ھیں جو متھرا کے باشندے ھیں —

(۳) اخبار مفید الانام - یہ اکتیس دسمبر سنہ ۱۸۶۱ ء سے جاری ھوا ھے - یہ رسالہ مہینے میں دو مرتبہ فتح گڑہ سے نکلتا ھے —

---

* سات مئی سنہ ۱۸۶۷ ع -

(۴) لطیف الاخبار - اس اخبار کے متعلق میں نے میرٹھه کے "اخبار عالم" میں ذکر پڑھا هے —

(۵) طلسم حکمت - یه ماهوار رساله میرٹھه سے نکلتا هے —

(۶) سهیل پنجاب - اس کا ذکر میں نے اٹھائیس مئی سنه ۱۸۶۷ ع کے ٹائمز میں پڑھا هے —

(۷) بیوپاری سری امرتسر - اس اخبار کا نام هندی میں هے لیکن در اصل یه اردو کا اخبار - اس میں هر قسم کے تجارتی اشتہارات هوتے هیں —

هندی کے جدید اخبارات یه هیں

(۸) برتلت بلاس - یه اخبار جموں سے شائع هوتا هے - یه مقام صوبهٔ لاهور سے شمال میں کوهستانی علاقے میں واقع هے —

(۹) گیان دیپک - یه اخبار ستمبر ۱۸۶۶ ع سے سکندرہ سے نکلنا شروع هوا هے - سکندرہ آگرہ کے مضافات میں هے اور یہاں بادشاہ اکبر کا مقبرہ هے جو مغلوں کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونه سمجھا جاتا هے —

(۱۰) کوئی بچن سدھا - یه ماهانه رساله هے - اس میں غیر مطبوعه هندی نظمیں شائع هوا کرتی هیں - اس رسالے کے ابھی صرف دو نمبر شائع هوے هیں - پچھلا نمبر اگست میں نکلا تھا - میرے پیش نظر دونوں اشاعتیں هیں - ان میں ایک نظم " اشت جام " کے عنوان سے شائع هوئی هے - یه نظم سری دیودت کی لکھی هوئی هے - اس کے علاوہ اور دو نظمیں هیں —

سنه ۱۸۶۷ ع کی ابتدا سے کلکته سے ایک با تصویر رساله شائع هونا شروع هوا هے جس کا نام " انڈین سوسائیٹی " هے - اس میں نظم و نثر

کے مضامین ان انگریزوں کے شائع ہوں گے جو ہندوستان میں رہتے ہیں -
(انڈین میل ' بارہ فروری سنہ ۱۸۶۷ ع)

میں پابندی سے میرٹھہ کا " اخبار عالم ' پڑھتا ہوں - اس اخبار کے لایق مدیر مرزا محمد وجاہت علی صاحب از راہ عنایت مجھے اپنا اخبار بھیج کر ممنون احسان کرتے ہیں - اس اخبار میں بھی کبھی کبھی اردو نظمیں شائع ہوتی ہیں - ابھی حال میں اس میں مہر کا ایک مخمس نکلا تھا - موصوف آج کل کے اعلی پایہ کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں' اس مخمس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر بند کا آخری مصرع غالب کے ایک فارسي قصیدے سے مستعار لیا گیا ہے اور باقی چاروں مصرع اردو میں ہیں - اس اخبار کے بعض مضامین بھی دلچسپی سے خالی نہیں - ایک مضمون ' تھرمامیٹر ' پر ہے - اس کے ساتھہ اعداد بھی دیے ہیں تاکہ وضاحت ہو جاے - ایک مضمون " حرارت پیما " پر ہے - ایک ہوا پر ہے - اس کے ساتھہ ایک " ہوائی مشین " (*) کی تصویر بھی دی ہے - ایک دلچسپ مضمون آگرہ کی نمایش پر ہے جو گزشتہ فروری میں منعقد ہوئی تھی - اس نمایش کو آپ ہندوستان کے لیے بس ویسا ہی سمجھئے جیسے کہ ہماری پیرس کی نمایش یورپ کے لیے ہے —

اردو کے سب اخباروں میں " اودھ اخبار " بہترین خیال کیا جاتا ہے - اس کی ہر اشاعت چوبیس صفحوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں - کانپور سے اس کا ضمیمہ شایع ہوتا ہے جس کا نام " کانپور گزٹ " ہے - لیکن جب سے لکھنؤ اور کانپور کے درمیان ریل بن گئی ہے اس وقت سے " کانپور گزٹ " کی اشاعت موقوف کردی گئی - اس لیے کہ اب

* Pneumatic machine

خود " اودھ اخبار " بآسانی اور جلد کانپور پہنچ جاتا ھے —

اس سال مجھے اس رسالہ کا صرف ۲۹ جنوری کا نمبر پڑھنے کو ملا۔ اس کے مضامین بہت دلچسپ تھے۔ مجھے افسوس ھے کہ میں اس کے سب پرچے نہیں منگا سکا۔ اس نمبر میں ایک دکھنی زبان کی نظم ھے جو مدراس کے کسی شخص نے لکھی ھے۔ اس کے علاوہ اور مضامین اعلی پایہ کے ھیں جن کا مقابلہ ھمارے اخباروں کے مضامین سے کیا جا سکتا ھے۔ ایک مضمون سید اولاد علی نے ملکہ وکٹوریہ کی توصیف میں لکھا ھے۔ یہ مضمون مشرقی خطابت اور بلاغت کا اعلی نمونہ ھے۔ اس پورے مضمون کو " اخبار عالم " نے بھی نقل کیا ھے۔ اس میں جو تشبیہات اور استعارے استعمال کئے گئے ھیں ان کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ نا ممکن ھے اور اگر بفرض محال ترجمہ کر بھی لیا جائے تو وہ ھمارے مذاق پر گراں گذرے گا —

اس سال ھندوستانی زبان کی جو کتابیں طبع ھوئی ھیں ان کی مکمل فہرست پیش کرنا آپ صاحبوں کے لئے دلچسپی کا باعث نہ ھوگا اور خود میرے لیے موجب زحمت ھوگا۔ ان میں سے بہت ساری کتابیں ایسی ھیں جن کے صرف نام مجھے معلوم ھیں اور یہ نہیں معلوم کہ ان میں کس خاص موضوع پر بحث کی گئی ھے۔ بہر حال میں چند کتابوں کے نام یہاں آپ صاحبوں کے سامنے پیش کئے دیتا ھوں جو میرے نزدیک اھم ھیں —

مسلمانوں میں اس گئی گذری حالت میں بھی ایسے لوگ بکثرت ملیں گے جنھیں ادب سے خاص لگاؤ ھے*۔ لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال

---

* بقول شخصے ایک زمانہ میں شعرا کی اس قدر کثرت ھوگئی تھی کہ لوگوں کو اندیشہ پیدا ھونے لگا کہ کہیں ان کے لیے علیحدہ پانچویں ذات نہ قایم کرنی پڑے —

کے بعد سے ان میں بہت کم ایسے ملیں گے جن کے خیالات میں اجتہاد اور اپج موجود ہو۔ بالعموم قدیم شعرا کے دیوانوں کے نئے نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ زیادہ تر اس زمانہ کے شاعر قدیم شعرا کے کلام کی نقل کرتے ہیں یا ان کے خیالات کو دوسرے لفظوں میں الٹ پھیر کے بیان کر دیتے ہیں —

ہندی کی بیشتر مطبوعات بنارس (شیو پوری) سے شائع ہوتی ہیں۔ شیو کے پرستار سنسکرت زبان استعمال کرتے ہیں اور زیادہ تر ویشنوی لوگ ہندی زبان میں تحریر و تقریر کو پسند کرتے ہیں۔ اسی شہر میں حال میں "ہنومان بایک" شایع ہوئی ہے جو رامائن کا ایک حصہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ "کتھہ لیلا" "وندیا پتر کا" اور تلسی داس کی "سنگار سنگر ھا" بھی شایع ہوئی ہیں —

یہ دیکھہ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی طرف ہندوستانیوں نے اب تک مطلق توجہ نہیں کی - یہی وجہ ہے کہ یورپین زبانوں سے وہ خود اپنی تاریخ کے متعلق ترجمے شایع کیا کرتے ہیں۔ میں ان ترجموں کا ذکر کسی پچھلی صحبت میں کر چکا ہوں۔ اس سال الفنسٹن کی "تاریخ ہند" کا اُردو ترجمہ علی گڑہ سے شایع ہوا ہے۔ الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں —

اب میں ہندوستانی شاعری کے متعلق کچھہ عرض کروں گا۔ سب سے پہلے میں مسٹر جے رابسن (J. Robson) کے "مجموعۂ خیال" کا تذکرہ کرتا ہوں۔ خیال در اصل ہندوستانی میں ایک خاص قسم کی نظم ہے جو ناٹک سے ملتی جلتی ہے۔ راجپوتانے میں یہ بہت مقبول ہے۔ یہ نظمیں عشقیہ

بھی ھوتی ھیں اور اخلاقی اور مذھبی بھی۔ اس مجموعہ کی زبان مار واڑی ھندی ھے۔ اس میں پانچ علیحدہ علیحدہ نظمیں ھیں۔ لسانیاتی اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے یہ پانچوں نظمیں بہت دلچسپ ھیں۔ نظموں کے ساتھ ترجمہ نہیں ھے بلکہ تمہید میں ان کے عام مطالب بیان کردیے گئے ھیں۔ جہاں کہیں مار واڑی ھندی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے گئے ھیں ان کے معنی بعد میں درج ھیں۔ ان نظموں میں دو سیاسی رنگ لیے ھوے ھیں اور انگریزی حکومت کی ان میں مخالفت کی گئی ھے۔ ایک نظم میں ھیر اور رانجھا کا قصہ بیان کیا گیا ھے۔ یہ قصہ راجپوتانے میں عام طور پر گیتوں کا موضوع ھوتا ھے —

حال میں مجھے ھندوستانی (اُردو) گیتوں کا مجموعہ ملا ھے جو کلکتہ میں طبع ھوا ھے۔ اس کے ساتھ انگریزی ترجمہ ھے۔ یہ ترجمہ ڈبلو ھولنگز (W. Hollings) نے کیا ھے جو ھندوستانی زبان کے ماھر سمجھے جاتے ھیں۔

غزل کے دیوان اردو داں طبقے میں بہت مقبول ھیں۔ غزلیات میں بالعموم تصوف کے موضوع پر اشارے ملتے ھیں اور ان کا مطلب حافظ کی پیروی کی وجہ سے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ سودا کو اس پر ناز تھا کہ وہ حافظ کے اشعار سمجھ سکتا ھے۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک غزل میں کہا ھے —

کھلے ھیں مجھ پہ جو راز نہفتۂ حافظ
کہ سن کے اوتوں ھوں شعر شگفتۂ حافظ *

مجھے تسلیم کا بھی دیوان ملا۔ یہ موجودہ شعرا میں چوٹی کے لوگوں

---

* یہ شعر ایڈورڈ ایچ پامر نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان " حافظ " ہے نقل کیا ھے۔ (The Eagle, No. 27, Vol. V., Dec. 1866)

میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے مثنویاں لکھی ہیں اور پہیلیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا ہے —

مسٹر بیمز (Beames) نے مجھے "نوشدارو" کا ایک نسخہ از راہ کرم ارسال فرمایا ہے۔ اس کی طباعت میرٹھ میں ہوئی ہے۔ اخبار عالم (مورخہ ۳ - اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ ع) نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔ اس کتاب میں نثر اور نظم ملی جلی ہیں۔ اس میں کہاوتیں، مقولے اور نصائح درج ہیں۔ اس کے مصنف کا تخلص نامی ہے۔ اس کے علاوہ "عجائب غرائب" کا نسخہ میری نظر سے گذرا۔ اس کی وجاہت علی نے بہت تعریف لکھی ہے *۔ اس کتاب کے متعلق لاہور کی انجمن میں خوب بحث رہی۔ ایک جماعت کا خیال تھا کہ یہ کتاب اس لائق نہیں ہے کہ اس کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جاے —

اُردو کی کتابوں کو ہندی (دیو ناگری) رسم خط میں شائع کیا جا رہا ہے۔ حال میں حاتم طائی کا قصہ ہندی میں شائع ہوا ہے۔ اسی طرح ہندی کی کتابوں کو اُردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال 'پریم ساگر' اور 'مہا بھارت' کے قصے کو اُردو میں آگرہ سے شائع کیا گیا ہے —

اخبار عالم میں جدید مطبوعات پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ قرآن کا بین السطر فارسی اور اردو ترجمہ میرٹھ سے شائع ہوا ہے۔ ہر صفحے پر دس عربی کی سطریں ہیں۔ اس کا حجم ۶۹۳ صفحات ہے †۔ تفسیر مقبول کے

---

* نیر راجستان - ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۶۵ ع -

† اخبار عالم - ۷ مارچ سنہ ۱۷۶۷ ع -

نام سے ایک اور دوسرا قرآن کا اردو ترجمہ کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔
امیر حمزہ کا ایک نیا ایڈیشن نکلا ہے جو ۳۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔
اور دوسری کتابوں کی تفصیل یہ ہے :—

(۱) دیوان شاہ تراب- یہ ۳۴۹ صفحات پر مشتمل ہے—

(۲) گلستان سخن - یہ ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس میں اردو شاعری کا بہترین انتخاب درج ہے—

(۳) زاد السبیل—

(۴) زبدۃ الحکمۃ - اس میں صفائی کے متعلق ہدایتیں ہیں—

'اخبار عالم' میں اعلان کیا گیا ہے کہ یکم جنوری کو صوبجات شمال مغربی کے لئے جو قوانین بنائے جا رہے ہیں' ان کی تفصیل سرکاری طور پر رسالوں کی صورت میں شائع کی جائے گی۔ اس قوانین کے مجموعہ کا نام "گنجینۂ احکام" رکھا گیا ہے۔ اس میں تمام سرکاری احکام و قوانین کی نوعیت بتلائی جائے گی تاکہ ان کے متعلق عام پبلک کو واقفیت حاصل ہو—

ہندوستانی مطبوعات کی جو فہرستیں شائع ہورہی ہیں ان میں جیمس لانگ (James Long) کی "تفصیلی فہرست کتب" * سب سے زیادہ جامع ہے۔ موصوف کا تعلق مشن سے ہے اور آپ کو اہل ہند کے ساتھ خاص شغف ہے۔ اس فہرست میں ۶۵۰ کتابوں کی کیفیت درج ہے جن میں سے زیادہ تر 'پیرس' کی "عالم گیر نمایش" میں موجود ہیں۔ ان میں ہندی اور اُردو کے علاوہ بنگالی کی کتابوں کا بھی ذکر ہے۔

---

* Descriptive Catalogue.

بنگال کو هندوستان کے مسلمان "جنت البلاد" کہتے هیں - اس فہرست کی بیشتر کتابیں وہ هیں جو کلکتہ میں یا صوبجات شمال و مغربی کے مختلف شہروں میں طبع هوئی هیں - مسٹر لانگ نے اس امر کا اعتراف کیا هے کہ هندوستانی مطابع کی مطبوعات کی مکمل فہرست وہ نہیں تیار کر سکے —

مسٹر بیمز (Beames) نے از راہ عنایت مطبع نول کشور کی مطبوعات کی فہرست بھیجی هے - اس مطبع کے مالک "اودہ اخبار" کے مدیر هیں - اس فہرست میں چھہ سو کتابوں کے قریب مذکور هیں - سر الکزنڈر گرانت نے ' جو آج کل صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات هیں ' ایک فہرست بھیجی هے جس میں صوبۂ بمبئی کی جملہ مطبوعات درج هیں - اس فہرست سے مجھے معلوم هوا کہ مرزا لطف اللہ نے ابھی حال میں دو کتابیں اور تصنیف کی هیں - ایک عام طب پر اور دوسری هیضے پر - موصوف اپنی "آپ بیتی" کے باعث یورپ میں پہلے سے مشہور هیں اور ان کی نسبت پہلے متعدد مرتبہ ذکر آچکا هے —

میں معمولاً مسیحی ' اسلامی اور هندو مذهب کی مطبوعات اور ابتدائی مدارس کی نصابی کتب کا تذکرہ کیا کرتا تھا لیکن اس سال میں اس موضوع کو نظر انداز کرتا هوں صرف بر سبیل تذکرہ اتنا یہاں کہے دیتا هوں کہ میڈم لیو پولت (Leopolt) نے هندی میں اندهوں کی تعلیم کے لیے ایک ابتدائی کتاب لکھی هے - اس میں دیوناگری حروف کاغذ کی سطح پر اُبھرے هوے هیں - یہ کتاب هماری پیرس کی نمایش میں موجود هے —

هندوستان میں اس سال بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ هندوستانی

دونوں شاخوں یعنی ہندی اور اردو میں کس کو ترجیح حاصل ہے اور یہ کہ آیا عربی اور فارسی الفاظ کو باقی رکھنے کی ضرورت ہے یا نہیں*۔ میرے خیال میں یہ بحث ہی سرے سے بیکار ہے اس لیے کہ زبانوں میں بالارادہ تبدیلیاں نہیں پیدا کی جاسکتیں۔ اگر ہندو فضلا یہ چاہیں کہ اردو کی اہمیت کو کم کریں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ اردو نے ہندوستان میں جو حیثیت قایم کر لی ہے وہ باقی رہے گی۔ وہ اگر چاہیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انہیں کامیابی نہیں ہوسکتی اس واسطے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں صدیوں سے جو الفاظ عام زبان پر چڑہ گئے ہیں وہ آسانی سے ترک نہیں کئے جاسکتے†۔ ان کی

---

* کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اجلاس میں اس پر بحث ہوچکی ہے کہ آیا سائنس کی یوروپین اصطلاحات کو رہنے دیا جاے یا یہ کہ عربی اور سنسکرت کی قدیم اصطلاحات کو رائج کیا جاے اور نئے ترجمے کئے جائیں۔ جی کمبل (G. Cambell) کی یہ راے تھی کہ جہاں تک ممکن ہے مشرقی اصطلاحات کو باقی رہنے دینا چاہئے اور مغربی اصطلاحیں صرف اس وقت استعمال کرنی چاہئیں جب کہ بغیر اس کے کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ میں بھی موصوف کی اس راے کے ساتھہ متفق ہوں۔ لیکن راجہ بابو رجیندر لال متر نے اس خیال کی مخالفت کی۔ یہ پوری بحث سنہ ۱۸۶۶ع کی ایشیٹک سوسائٹی کی روداد میں مفصل طور پر شایع ہوچکی ہے۔

† ۷-مئی سنہ ۱۸۶۷ع کے کلکتہ ریویو میں میری ناچیز راے سے موافقت

[بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ]

کوشش بالکل ایسی ہوگی جیسے انگریز فضلا یہ فیصلہ کریں کہ ان کی قوم ان فرانسیسی الفاظ کا استعمال ترک کردے جو انگریزی زبان میں نارمن فتوحات کے بعد گھل مل گئے ہیں۔

ہندو عوام خود بجائے اس کے کہ ہندی کو اردو پر ترجیح دیں اپنی زبان کو اردو سے قریب تر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ صوبجاتی السنہ میں بھی اردو کے لا تعداد الفاظ رائج ہوچکے ہیں۔ بنگال میں تو ایک مخصوص بولی نکلی ہے جسے "اردو بنگالی" کہتے ہیں۔ میں اس کی نسبت پہلے کسی صحبت میں ذکر کرچکا ہوں۔ یہ بولی بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبول ہورہی ہے §۔

میں اور مسٹر بیمز اردو کے حمایت میں تنہا نہیں ہیں جو دہلی کے ٹکسالی زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جس میں عربی اور فارسی

[باقی حاشیہ از صفحہ گذشتہ]

کا اظہار کیا گیا ہے جو میں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اس جلسہ کے متعلق ظاہر کی تھی جس میں اس پر بحث ہوئی تھی کہ آیا اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا ہندی کو۔ اس ریویو نے لکھا ہے کہ "موسیو گارساں دتاسی نے اردو کی حمایت میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ہمیں ٹھیک معلوم ہوتا ہے" ۴ - جولائی سنہ ۱۸۶۷ ع کے "بمبئی پولا" میں بھی میرے خیالات کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے —

§ Rev. J. Long نے چند سال ہوے اس بولی کی ۹۵ مختلف کتابوں کا اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے جو طبع ہوچکی ہیں —

کے الفاظ کی آمیزش ہے - ہم نہ اس کے قایل ہیں کہ عربی فارسی الفاظ اردو میں سے خارج کردئے جائیں اور نہ ہم ہندی کو بے وجہ اردو پر فوقیت دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ " دھلی گزت " میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ آگرہ کے دربار میں' جس کی نسبت میرٹھہ کے " اخبار عالم" میں تفصیل نکل چکی ہے' انگریزی سے جو ترجمے کئے گئے یا براہ راست اردو میں جو تقاریر ہوئیں وہ بہت سادہ زبان میں ہوئیں - اردو میں اس وقت تک لطف نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں - یہی زبان ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو بھاتی ہے - " دھلی گزت " کے نامہ نگار کا خیال ہے کہ دربار وغیرہ کے موقعوں کے لئے اردو سے بہتر زبان نہیں ہوسکتی - لیکن اگر دیدہ و دانستہ عربی اور فارسی الفاظ اس میں سے خارج کردئے جائیں جو اهل ہند اسلامی ممالک سے مستعار لیتے رہتے ہیں تو اردو بے کیف رہ جائے گی -

سر جان لارنس کو ویسرائے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوے اب تین سال ہوگئے - آگرہ کے دربار کے موقع پر آپ پہلی مرتبہ پبلک کے سامنے شان و تجمل کے ساتھہ جلوہ فرما ہوے - دوسال قبل لاہور میں جو دربار منعقد ہوا تھا اس کی حیثیت مقامی تھی - اس میں صرف پنجاب والے شریک ہوے تھے - لیکن آگرہ کے دربار کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی - در اصل ہندوستان میں آگرہ سے زیادہ موزوں ملک کا دارالسلطنت بننے کے لئے کوئی دوسرا شہر نہیں ہے - جغرافی حیثیت سے بھی یہ شہر اس کے لئے موزوں ترین ہے - اگرچہ یورپ والوں کے لئے ہندوستان کا دارالسلطنت سمندر کے قریب رکھنا ہی زیادہ مناسب ہے —

وایسرائے کے شاندار خیمہ کے بیچوں بیچ ایک تخت رکھا گیا تھا

جس پر سنہرے کام کا تخت پوش بچھا تھا۔ اس تخت کے دائیں بائیں جانب ہندو اور مسلمان امرا زرق برق ملبوسات اور جواہرات پہنے ہوے تھے، جلسے میں جو یورپین تھے ان کے دلوں میں گولکنڈہ کی ہیرے کی کانوں اور کوہ نور کی یاد تازہ ہوگئی۔ بندیلکھنڈ کے رجواڑے اس جلسہ میں خاص طور پر نمایاں تھے۔ ان کی تلواروں کے دستوں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوے تھے، ڈھالوں کی سطح پر چاندی کا ابھرا ہوا کام تھا اور ان کے ہاتھوں میں نہایت خوشنما چھڑیاں تھیں۔ اس دربار میں ہندوستانی خواتین بھی اِکا دکا نظر آتی تھیں جو اس ملک کے لئے بالکل نئی بات ہے۔ وائسرائے جب تخت پر بیٹھنے کے لئے تشریف فرما ہوے تو توپوں کی سلامی دی گئی۔ اس کے بعد ولیم میور (W. Muir) نے شاہی فرمان کا ترجمہ پڑھا جس کی بنا پر خطابات تقسیم کئے گئے اور خود وائسرائے بہادر نے ہندوستانی میں حاضرین کے روبرو تقریر کی*۔ جن کو خطابات عطا ہوے ان میں مہاراجہ جے پور اور دوسرے رجواڑے شامل تھے۔ اس دربار میں شری رادھا کنت دیب نے بھی شرکت کی تھی۔ موصوف سنسکرت کے بڑے فاضل سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے سنسکرت زبان کی ایک ضخیم لغت تیار کی ہے۔ آپ نہایت کٹر قدامت پسند ہندو ہیں اور ہر قسم کی معاشرتی ترقی کودھرم کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیو نارائن سنگھہ تھے جو نہایت آزاد خیال ہیں اور انگریزی تعلیم پا چکے ہیں۔

---

* وائسرائے کی پوری تقریر ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کے Indian Mail اور Times میں شایع ہوچکی ہے۔ طویل ہونے کے باعث میں اس موقع پر اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے نقل کروں —

آپ برہمنوں کی اعلیٰ ذاتوں میں تعدد ازدواج کی رسم کے خلاف ہیں۔ دربار میں پروسنو کمار ٹگور بھی موجود تھے جنھوں نے ہندو دھرم شاستر پر ایک نہایت اہم کتاب کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کا نام دودا چنتامنی ہے۔ یہ کتاب کلکتہ میں سنہ ۱۸۶۳ ع میں طبع ہوئی ہے اور تین سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے —

رجواڑے اپنے ہاتھیوں پر سوار دربار میں آتے اور وائسرائے کے ہاتھ سے خلعت پاتے تھے۔ اور اس کے بدلے میں نذرانے دیتے تھے۔ اس موقع پر فرق مراتب کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ ان کے بعد وہ لوگ جنھوں نے پبلک کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کی ہے وائسرائے کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ جن میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں۔ بابو خان سنگھ بیدی جنھوں نے پنجاب میں تعلیم نسواں کے رواج میں سعی بلیغ کی۔ شیو پرشاد جو بنارس کے مشہور مصنف ہیں جنھوں نے اہل ہند کو مغربی تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے کی غرض سے متعدد کتابیں شائع کرائی ہیں۔ سر سید احمد خاں جنھوں نے انجیل مقدس کی تفسیر اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کی ہے۔ اور جو "انجمن اسلامی" کے بانی ہیں۔ موصوف مذہبی معاملات میں "انتخابیت" کے قائل ہیں یعنی ہر مذہب کی اچھی باتوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں * —

* انجیل مقدس کی تفسیر کی دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ پہلی جلد کے متعلق سنہ ۱۸۶۳ ع کے خطبے میں میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ دوسری جلد بھی یورپ پہنچ چکی ہے لیکن اب تک مجھے موصول نہیں ہوئی۔ اس میں باب 'پیدائش' کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اصل عبرانی کے مطابق ہے —

خطابات تقسیم کرنے کی رسم کے بعد ہندوستانی طریقے کے مطابق پان اور عطر تقسیم کیا گیا - پھر مختلف قسم کی تفریحات رهیں - رات میں چراغاں کیا - تاج محل کی بجلی کی روشنی کا عکس جمنا کے پانی پر پڑتا تھا جس کی وجہ سے عجب منظر پیدا هوگیا تھا —

اب میں اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا هوں جس کے سلسلے میں یہ باتیں میں نے آپ صاحبوں کے سامنے بیان کیں —

هندی کے حمایتیوں میں مسٹر ایف ایس گروس (F.S. Growse) کا اور اضافہ هوا هے * - معلوم هوتا هے وہ ان تعصبات پر یقین رکھتے هیں جو اردو کے مخالفوں نے اس زبان کے متعلق ملک میں پھیلائے هیں - اس کے ساتھہ موصوف یہ بھی کہتے هیں کہ تیس چالیس سال قبل جو اردو رائج تھی اس کو باقی رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں هے † - لیکن شاید موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں اردو کے خاص خاص شاعر زندہ تھے - حاتم اور ولی کا عہد یہی هے - اس زمانہ کی شاعری عربی اور فارسی الفاظ سے پر هے - چنانچہ شیکسپیر کی ڈکشنری ان سب

---

* بقول مسٹر بیمز (Beames) هندی کے حدود متعین کرنا بہت دشوار هے - دیکھو موصوف کی کتاب " هندوستانی لسانیات کا خاکہ " - پنجاب میں هندی پنجابی سے ملی جلی هے اور سندھ میں سندھی سے - اندور میں گجراتی کے الفاظ اس میں شامل هیں اور بنگال کی سرحد کے قریب بنگالی نے اس کی حدود میں راہ پالی هے - اسی طرح وسط هند میں مرهٹی اس سے جدا نہیں کی جا سکتی -

† دیکھو موصوف کا مضمون " (هندوستانی کے طرز انشا پر بعض اعتراضات " (جرنل آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال - نمبر ۱۲۴ صفحہ ۱۷۲) -

الفاظ پر حاوی نہیں - اگر آپ اس وقت کی اردو کے سب الفاظ تلاش کرنا چاہتے ہیں تو جانسن کی لغت فارسی اور فریتاگ یا گولیس کی لغت عربی کی طرف ہاتھ اٹھانا پڑے گا - مسٹر گروز جس ادبیات کو مصنوعی کہتے ہیں وہ فی الحقیقت اس کی مستحق ہے کہ لوگ اسے جانیں * - ہاں، میں بھی مسٹر گروز کی طرح اس بات پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے خواہ مخواہ کی جو ایک خلیج اردو اور ہندی کے درمیان پیدا کردی ہے وہ غیر ضروری ہے - یہ در اصل بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں تصور کیا جائے —

پنڈت یمنہیا گورہ جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا ہے، اپنے ایک خط میں، جو انھوں نے مسٹر کاول † حال پروفیسر سنسکرت، کیمبرج یونیورسٹی کو لکھا ہے، اپنے تئیں ہندی کے حامیوں کے زمرہ میں شریک کرتے ہیں - ان کے نزدیک ہندی کو اردو پر ہر طرح ترجیح حاصل ہے - ہم موصوف کے اعتراضات کا بھی اسی طرح جواب دے سکتے ہیں جس طرح

---

* مجھے تعجب ہے کہ مسٹر گروز نے اردو کے لیے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ " اس زبان کی نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ اس کا کوئی ادب ہے " -

† سنسکرت کی پروفیسری کے لیے مسٹر کاول (Cowell) سے زیادہ موزوں شخص ملنا دشوار ہے - موصوف اپنے علم و فضل کی بدولت عام شہرت رکھتے ہیں - سنسکرت کے علاوہ آپ ہندوستانی سے بھی واقف ہیں - اس کے ساتھ یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ آپ نے ہندوستان کے دوران قیام میں تعلیم کو عام کرنے میں سعی بلیغ کی اور اس طرح اہل ہند کی بڑی خدمت کی —

دوسروں کے مقابلے میں ہم نے کیا ہے - دراصل ہندو لوگ اس معاملے میں مشکل ہی سے غیر جانبداری کے ساتھہ غور کر سکتے ہیں - ان کے قومی غرور کو اردو کے عربی اور فارسی الفاظ کی موجودگی سے صدمہ پہنچتا ہے - وہ چاہتے ہیں کہ اردو میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ کلیتاً خارج کردیے جائیں - وہ خالص ہندی یا برج بھاشا کو رواج دینے کے حوصلے رکھتے ہیں - لیکن دراصل اب اس قسم کی کوششیں بے سود ہیں - اردو ابتدا سے مختلف زبانوں کی پوٹ رہی ہے اور رہے گی -

لیکن پنڈت صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ٹکسالی ہندی (High Hindi) اور سنسکرت دونوں مردہ زبانیں ہیں - خود ہندوؤں میں ان کا رواج بہت کم ہو گیا ہے - انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اردو ہندوستان کے طول و عرض میں سمجھی جاتی ہے - پھر پنڈت صاحب میری طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی دونوں کی بنیاد ایک ہے - آپ چاہیں تو دونوں کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کریں - جب اسی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ داخل کردیے جاتے ہیں تو اس کو اردو کہتے ہیں اور جب خالص ہندی محاورے استعمال ہوں تو اسے ہندی کہتے ہیں - ہم بھی موصوف کے ساتھہ متفق ہیں کہ ہندی اور اردو کی بنیاد ایک ہی ہے - ہم بار بار اس بات کو اس واسطے دہراتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو جاے - پنڈت صاحب سنسکرت کے غیر مروجہ الفاظ کے استعمال کے خلاف ہیں اور اس کو اصولی حیثیت سے برا بتاتے ہیں —

اب ہندوستانی کی صورت حال یہ ہے کہ اس کو دو بولیوں میں تقسیم کیا گیا ہے - ہندی میں اسلامی تہذیب کے الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے - اس کے پیش نظر از منۂ متوسط کے ہندو مصنفین کی نقل ہے - ہندی

ہندوستان کے کانوؤں میں اپنی اصلی شکل میں ملتی ہے ۔ اردو میں ' جسے هم مسلمانوں کی ہندوستانی کہہ سکتے ہیں ' عربی اور فارسی کے بیشمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اردو شہروں میں عام طور پر بولی جاتی ہے اس لیے تعلیم ' اخبارات اور تصنیف کے لیے یہی زبان موزوں ہے ۔ چنانچہ مسیحی مبلغین مذہب اس زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور نشر و اشاعت کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ آخر میں ' میر امن نے باغ و بہار کے دیباچہ میں اردو زبان کی جو حقیقت بیان کی ہے اس کو میں یہاں نقل کرتا ہوں :-

" حقیقت اردو کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے ۔ انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے ۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا ۔ سلطان محمود غزنوی آیا ' پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے ۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی ۔ آخر امیر تیمور نے ہندوستان کو لیا ۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا ' اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا .... امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تلک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی ۔ ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی " —

ابسن اور اُس کی تصانیف

(۴)

از

(جناب عبدالشکور صاحب ' ایم - اے ' بی - ٹی)

ابسن کی زندگی کا دوسرا دور ختم ہوتا ھے ' گرجا اور کلیسا کی تعمیر ختم کرنے کے بعد اس نے عوام‌الناس کے لیے تعمیری کام شروع کیا ' جب وہ بھی ختم ہوچکا تو زندگی کے آخری دور میں وہ ہوائی قلعہ تعمیر کرنا شروع کرتا ھے ' یہ اس کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے ' مگر یہ تجویز عرصے سے اس کے دماغ میں موجود تھی ' اولین نظم کے شائع ہونے پر اس کے دل میں جو جذبات اور خواہشات پیدا ہوئی تھیں ان کو اس نے اپنی ایک مختصر سی غزل میں اس طرح ادا کیا ھے —

" میں اپنے لیے بادل میں قلعہ بناؤں گا ' اس کے دو بازو نمایاں ہوں گے

" ایک بڑا ' دوسرا چھوٹا ' وہ شمال میں چمکے گا

" بڑا بازو ایک غیر فانی گانے والے کو پناہ دے گا

" چھوٹا ایک خاتون کے لیے دروازہ کھولے گا " -

ابسن زندگی کے آخری ایام میں ایسے قلعے بنانا شروع کرتا ھے ' ان

کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بنیادیں بھی ہوا میں قائم کی جاتی ہیں ' اور ان کے باشندے صورت سے تو انسان ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن عادات اور خصائل کے لحاظ سے انسانوں سے مختلف ہیں ' اس کی وجہ یہ ہے کہ ابسن پردے پردے میں بات کہنا چاہتا ہے ' ابسن مجاز کی نقاب اپنے چہرہ پر ڈال کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے ' اور اپنے اشخاص ڈراما کو بھی اسی انداز سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے '۔ " جنگلی بط " ابسن کا اولین مجازی ڈراما ہے ' اس کے بعد اس نے جتنے ڈرامے لکھے ان میں یہ رنگ گہرا ہوتا گیا - مگر اس کے ابناے وطن بالخصوص ناروے کی نئی پود ابسن کے کلام کے اس نئے طرز کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتی تھی - بارہ مارچ سنہ ۱۸۹۱ ع کو میونک میں نوجوان مصنفین نے ایک بڑی دعوت دی جس میں ابسن اعزازی مہمان تھا - اس موقعہ پر ایک نو عمر شاعر مارٹن گریف نے تقریر کرتے ہوے یہ کہا کہ ہم تلمیحات اور استعاروں میں اپٹے ہوے کرداروں سے مانوس نہیں ہو سکتے ' " The Lady " " Hedda Gabler," " From the Sea " سب تاریک ' بعید از قیاس اور ادق ہیں ' کسی دوسری شے کو کسی شے کا نمایندہ کیوں بنایا جاے ' اگر آرٹ صداقت پرستی کا دوسرا نام ہے تو پھر یہ کیوں جائز رکھا جاتا ہے —

اس امر سے قطع نظر کیجئے کہ یہ نکتہ چینی کہاں تک درست ہے'مگر ابسن کو یہ پتا چل گیا کہ نئی پود اس کے مقابل میں آچکی ہے ' برگد کا وسیع اور بلند درخت ارد گرد کے پودوں کو مشکل سے سر سبز ہونے دیتا ہے ' اسی طرح ایک بلند پایہ شاعر بعض اوقات مبتدیوں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہو جاتا ہے - ابسن ان اطراف میں عرصۂ دراز سے بلا شرکت غیرے میدان علم و ادب کا تنہا بادشاہ تھا اور گوشے گوشے میں اسی کی عظمت کے گیت گاے جاتے

تھے - مگر اب ابسن نے دوسرا رنگ بدلا ' زمین سے بلند ہو کر ہوا میں اڑنے لگا - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ نئی پود نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا - ابسن ایک فہیم اور دور اندیش ادیب تھا ' اس نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ ہوا کا رخ تبدیل ہو رہا ہے - چنانچہ وہ خود اپنی رام کہانی کہنا شروع کرتا ہے ' یہ ممکن ہے کہ اس ڈرامے میں فن کے اعتبار سے نقائص موجود ہوں ' لیکن ابسن کی سوانح عمری اور اس کی روح کی نگارش لطیف دلچسپ ضرور ہے —

اس ڈرامہ کا نام " The Master Builder " ہے ' یہ سنہ ۱۸۹۲ ع میں تصنیف ہوا تھا - یہ تصنیف ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ہم بڑی وضاحت سے ابسن ' اس کی بیوی اور ابسن کے گھریلو زندگی کا عکس دیکھتے ہیں - سولنس (Solness) کے لباس میں ابسن موجود ہے اور الین (Aline) ابسن کی بیوی کی ہم شکل ہے ' ابسن پوری تصویر پیش کرنے کا عادی نہیں ' وہ کردار کی صرت وہ جھلک نمایاں کرکے صفحات پر پیش کرتا ہے جو اس کی روئداد کے لیے معاون ہوتی ہے - مثلاً اپنی اہلیہ کی محض ایک خفیف سی خصوصیت اس نے اس قدر گہرے رنگ میں پیش کی ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ ان دونوں میں ایک مستقل شکر رنجی مدت سے چلی آرہی ہے - اس خفیف اور لطیف شکر رنجی کی صرت یہ وجہ تھی کہ " گڑیا کا گھر " شائع ہوتے ہی جرمنی کے اطراف و جوانب کے نوجوان شوہروں سے بد ظن اور روحانیت پرست عورتیں ابسن کو اپنا امام اور ہادی سمجھنے لگی تھیں ' اور اکثر اُسے گھیرے رہتی تھیں ' ابسن ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کرتا ' اور ان کی فطرت ' رجحانات ' میلان طبع اور نفسیات کا ایک مبصر کی طرح مطالعہ کرتا

رهتا تها، گو ابسن کی بیوی همیشه یهی کهتی رهتی " ابسن ! تم ان عورتوں کے چهرمت سے دور هی دور رهو "- ابسن کهتا " نهیں نهیں انهیں آنے دو میں ان کی سیرت کا مطالعه ذرا غور سے کرنا چاهتا هوں " —

چنانچه نورا، هلدا، هدا، لونا، مرتها، سب کی تخلیق اسی مطالعه کے ذریعه سے هوئی —

سولنس اپنے شہر کا ایک نہایت نامور اور دولت مند معمار هے، برووک اس کے هاں ملازم هے جو خود کسی زمانے میں نہایت کامیاب معمار تها، اس کا بیٹا ریگنر اور اس کی بهتیجی کے آ (Kaia) دونوں سولنس کے عملے میں موجود هیں، اول‌الذکر نقشه نویس هے، آخرالذکر محاسب - برووک دفتر میں موجود هے لیکن اس قدر علیل هے که وهاں زیادہ دیر تک بیٹهه نهیں سکتا، کے آ اسے مشورہ دیتی هے که جاؤ گهر چلے جاؤ، وهاں جاکر آرام کرو - لیکن وہ جانے سے انکار کرتا هے اور کهتا هے که جب تک سولنس نه آئے گا میں نه جاؤں گا - وہ کهتا هے که میں آج سولنس سے آخری فیصله کرنا چاهتا هوں - اس کا بیٹا کهتا هے که ابهی اور انتظار کرو - اسی دوران میں سولنس آ موجود هوتا هے ؛ اور کے آ سے کچهه راز و نیاز کی باتیں کرنا چاهتا هے که وہ اسے نرمی سے خاموش کر دیتی هے - اسے معلوم هوتا هے که ایک شادی شدہ شخص اور ان کی بیوی اپنے مجوزہ مکان کے نقشه کے لیے مضطرب هیں لیکن وہ یه کهه کر بات ٹال دیتا هے که هر شخص اپنے مکان کے نقشے کے لیے ایسا هی مضطرب هوتا هے، اور اگر وہ کسی اور معمار سے رجوع کرنا چاهے تو میں کمیشن بهی واپس کرنے کو تیار هوں - اس کے بعد برووک اور سولنس میں خفیه باتیں شروع هوتی هیں، برووک کی یه خواهش هے که اس کا لڑکا ریگنر علحدہ اپنا کام کهولے، مگر سولنس کهتا

ہے کہ وہ نقشہ کشی کے سوا اور کچھہ نہیں جانتا - یہ سن کر برووک بہت دل گیر ہوتا ہے اور دردناک آواز میں کہتا ہے کہ تم اس کی اب اتنی مدد ضرور کرو کہ یہ کوئی کام آزادانہ طور سے کر گذرے تاکہ مرنے سے قبل میں اس کے ہاتھہ کا کوئی نمایاں کام دیکھہ سکوں - سولنس کہتا ہے کہ کیا میں اس کے لیے آسمان پر سے کوشش لاؤں ، جس کا وہ یہ جواب دیتا ہے کہ اسی وقت اسے ایک بڑا کام مل سکتا ہے - اُس کا اشارہ اس کام کی طرف ہے جس کا ذکر سولنس نے اس گفتگو کے شروع میں بے اعتنائی سے کیا تھا - اب وہ گفتگو کا طرز بدل کر کہتا ہے کہ وہ مکان تو میں خود بنانے والا ہوں -(واقعہ یہ ہے کہ اس کا مجوزہ مکان کا نقشہ اور تخمینہ ریگلر نے ہی تیار کیا تھا جو بہت ہی پسند کیا گیا تھا کیونکہ اس نقشہ میں جدت تھی ، - یہ سن کر سولنس بگڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمھارے لڑکے کو ہرگز یہ کام نہ دوں گا - برووک کی آواز غصے سے بھرانے لگتی ہے اور وہ پوچھتا ہے کہ کیا میں دنیا سے اسی طرح ناشاد و نا مراد چلا جاؤں گا - لیکن سولنس کے دل پر اس گفتگو کا مطلق اثر نہیں ہوتا - برووک کی حالت خراب ہونے لگتی ہے ' اور وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ چلا جاتا ہے —

سولنس اور کے آ میں عشق و محبت کے شکوے شکایات کا دفتر شروع ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کے آ کی منگنی ریگلر سے عرصہ ہوا ہو چکی تھی ' اب شادی بھی ہونے والی ہے ' لیکن کے آ اپنے آقا کی محبت کا دم بھرتی ہے اور کہتی ہے کہ " آپ خوب جانتے ہیں کہ صرف ایک ہی شخص ہے جسے میں چاہتی ہوں اور ساری دنیا میں وہی ایک شخص ہے جس کی میں پروا کرتی ہوں اور کسی کی مجھے مطلق پروا نہیں "—

جس کا سولنس یہ جواب دیتا ہے کہ چاہے تم ریگنر سے دس دفعہ شادی کرو لیکن اُسے یہ ملازمت ترک کرنے نہ دو ' کیونکہ ایسی حالت میں میں تمہیں بھی یہاں رکھہ سکتا ہوں - اس وقت کسی کے پاؤں کے چاپ سنائی دیتی ہے اور کے آ جلد اپنے میز پر جاکر کام میں مصروف ہونے کی کوشش کرتی ہے - مسز سولنس آتی ہے - کچھہ مشکوک نگاہیں کے آ پر ڈالتی ہے اور اپنے شوہر کو اطلاع دیتی ہے کہ ڈاکٹر ہالورڈ دوسرے کمرے میں موجود ہے ' یہ کہہ کر وہ چلی جاتی ہے ' اور دروازہ بند کردیتی ہے ' کے آ کا عشق پھر اُبھرنے لگتا ہے اور وہ سولنس سے کہتی ہے کہ میں اپنی منگنی توڑنے کے لیے تیار ہوں - کیونکہ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ تم سے جدا ہوکر رہوں - جانے سے قبل وہ ریگنر کے نقشے سولنس کو دے جاتی ہے - کمرے میں مسز سولنس اور ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں ' میاں بیوی میں شک آمیز نوک جھوک ہوتی ہے جس کا موضوع کے آ ہے - ڈاکٹر اور سولنس میں بات چیت ہونے لگتی ہے ' وہ کہتا ہے کہ مسز سولنس کے آ سے سخت برگشتہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ تم دونوں میں رات دن کا ربط ضبط ہے ' اور یہ امر مسز موصوف کی صحت کے لیے سخت مضر ہے - مگر سولنس صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ اس کے بغیر میرا کام چل ہی نہیں سکتا - پھر وہ ساری رام کہانی سنانی شروع کرتا ہے - بروک اور ریگنر کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہے ' کے آ کا آنا ' اس کا اور ریگنر کا پیار ' پھر خود اس کی اور کے آ کی ملاقاتیں ' اور کے آ کا سولنس پر عاشق ہوکر اپنی خوشی سے ریگنر سے قطع محبت وغیرہ - بہ خیال خود وہ گویا اپنی بیوی الین سے انتقام لے رہا ہے - بیوی اسے دیوانہ تصور کرتی ہے - اس قصے کے دوران میں الین کے قدیم آبائی مکان کے جلنے کا قصہ نکل آتا ہے جس کے

صدمے نے اس کی صحت ہمیشہ کے لیے خراب کردی تھی جس میں اس کے دو بچے جل کر مرے اور جس کے بعد وہ پھر کبھی ماں نہ بن سکی ' مگر اسی مکان کے کھنڈر پر سولنس کی دنیوی ترقی کی عالی شان عمارت تیار ہوئی تھی - قسمت سولنس کے ساتھ ہے اور وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کررہا ہے مگر اب وہ بے حد پریشان ہے ' اُسے ڈر ہے کہ قسمت برگشتہ نہ ہو جاے - ڈاکٹر پوچھتا ہے :

" حماقت ! قسمت کون برگشتہ کر دے گا ؟ "

" نئی نسل - "

نئي نسل ! کیا خوب ! تمھاري حالت پہلے سے بدر جہا زیادہ مستحکم ہے "

" قسمت ضرور پلٹا کھاے گی - میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ دن آرہا ہے - کوئی اور شخص اپنے دماغ میں یہ خیال پاکر مجھ سے کہے گا " مجھے موقع دو " - اس کے پیچھے سب شور مچاتے ہوے آئیں گے ' اور مجھے سخت سست کہہ کر دھمکائیں گے - کوئي دن جاتا ہے کہ نئی نسل میرا دروازہ پیٹ رہي ہوگی " -

ڈاکٹر کہتا ہے ' فرض کرو کہ ایسا ہوا بھی ' مگر اس کا کیا نتیجہ ہو گا ؟ - جس کا سولنس یہ جواب دیتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو میرا خاتمہ ہو جاے گا - اس کے بعد ہی کوئی دروازہ پر دستک دیتا ہے ' ہلدا داخل ہوتی ہے - اس کا قد میانہ ہے ' اس کا جسم نازک ہے ' جلد تمازت آفتاب سے قدرے متاثر معلوم ہوتی ہے ' اس کا لباس سفری ہے ' اس کا سایہ اونچا ہے تاکہ چلنے پھرنے میں آسانی ہو ' بحری مسافر کی طرح اس کا کالر کھلا ہوا ہے ' سر پر ایک چھوٹی سی بحری ٹوپی ہے ' سامان سفر ایک تھیلے میں

پشت پر موجود ہے - اس انداز سے وہ اسٹیج پر آتی ہے ' آنکھوں میں خوشی کی سرخی دوڑ رہی ہے - وہ سولنس کو سلام کرتی ہے ' سولنس کچھ تعجب کے بعد اُسے پہچان جاتا ہے' اس کے وطن میں سولنس نے ایک قدیم گرجا کا مینارہ بنایا تھا ' اس وقت ہلدا بارہ تیرہ برس کی لڑکی تھی- ہلدا مسز سولنس سے بھی واقف ہے ' اس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ ایک صحت گاہ میں کچھ دن رہ چکی تھی - اب وہ اس کے مکان پر رات کی رات بطور مہمان کے رہنا چاہتی ہے' سولنس اپنی بیوی کو اطلاع کرنے جاتا ہے - ڈاکٹر ایک مریض کو دیکھنے کی اجازت چاہتا ہے - مسز سولنس اپنے مہمان کا خیر مقدم کرتی ہے - سولنس کے مکان میں تین بچہ خانے (Nurseries) ہیں لیکن بچہ کوئی نہیں ' چہل قدمی کرتی ہوئی ہلدا دفتر کی میز پر جا پہنچتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ یہاں کون کام کرتا ہے - سولنس جواب دیتا ہے - ہلدا بہکی بہکی باتیں کرتی رہتی ہے ' اس کے پاس نہ کوئی اور لباس ہے ' نہ ٹرنک ہے ' نہ روپیہ ' وہ خود یہ نہیں جانتی کہ وہ وہاں کب تک قیام کرے گی- اس کے بعد سولنس اور ہلدا میں کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے ' وہ سولنس کے مینارہ تیار کرنے ' اس پر پھولوں کا ہار لٹکانے اور اس بلندی پر چڑھنے کے قصے کو دہراتی ہے - مینار تیار کر کے سولنس خود اس بلندی پر پھولوں کا ایک ہار آویزاں کرنے گیا تھا ' ہلدا اسکول کی لڑکیوں کی قطار میں موجود تھی اور اپنا رومال ہلاتی جاتی تھی ' یہ ضرور ہے کہ اس بلندی پر جا کر سولنس کا سر چکرانے لگا تھا ؛ لیکن وہ ایک باہمت اور کامیاب آرٹسٹ کی طرح اس مہم میں ثابت قدم نکلا ' اس کے بعد سولنس ہلدا کے یہاں کھانے پر مدعو تھا - ہلدا سفید لباس پہنے ہوے شاہزادی معلوم ہوتی تھی .جس کو دیکھ کر سولنس یہ کہہ گذرا تھا :

" تم بڑی ہو کر میری شہزادی بنوگی ' اور میں تمھیں ایک قلعہ اور ایک سلطنت دوں گا " * —

ہلدا کہتی ہے کہ میرے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میں تمھاری بنائی ہوئی عمارتیں دیکھوں ۔ سولنس کہتا ہے کہ پہلے میں گرجاؤں کے مینارے بناتا تھا ' مگر ادھر میں نے انسانوں کے رہنے بسنے کے لیے مکان بنائے ہیں ' ہلدا کہتی ہے :

"کیا تم ان مکانوں پر ایک چھوٹا سا مینارہ نہیں بنا سکتے ؟ " —

تعجب ہے کہ سولنس خود اسی تجویز پر اس دوران میں غور کر رہا تھا ۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے خود اپنے لیے ایک مکان تیار کیا تھا ۔ جس پر ایک بڑا اونچا مینارہ تھا ۔ ہلدا کہتی ہے میں کل صبح تڑکے اسے دیکھنے جاؤں گی ۔ گفتگو جاری رہتی ہے ۔ سولنس کہتا ہے کہ میں تمھارے آجانے سے بیحد مطمئن ہوں ' میں خود نئی نسل سے خائف ہو چلا ہوں ' اسی لیے مکان میں تنہا پڑا رہتا ہوں ' میں خوب جانتا ہوں کہ ایک روز یہ نئی نسل میرے دروازہ پر آکر میرے دروازے توڑنا شروع کرے گی ۔ ہلدا جواب

---

* سولنس ہلدا کے معصومانہ حسن سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اُس نے اُسے اپنی شاہزادی بنانے ' اس کے لیے قلعہ اور سلطنت حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ اس کے بعد اُس نے اس کے بوسے لیے تھے ' اس وقت سولنس بوسہ لینے سے انکار کر رہا ہے ۔ سلطنت کا نام اس عاشقانہ اور مشتاقانہ گفتگو میں ' Orangia " تجویز ہوا تھا ۔ یہ واقعہ انیس ستمبر کا تھا ' اتفاقاً یا قصداً اس روز بھی انیس ستمبر تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہلدا پورے دس سال بعد سولنس کی تلاش میں نکلی تھی ۔ اس عرصۂ دراز تک وہ سولنس کا روزانہ انتظار کرتی رہی ' لیکن وہ نہ آیا ' اس لیے اسے خود گھر سے باہر نکلنا پڑا ' وہ کہتی ہے کہ انتظار ختم ہو چکا ' مجھے میری سلطنت دو —

دیتی هے تم خود دروازہ کھول کر اس نسل سے دوستانه تعلقات کیوں نہیں قایم کر لیتے - اس کے بعد یه لوگ کھانے کو جاتے هیں اور ایکٹ ختم هو جاتا هے —

دوسرا ایکٹ کے آ اور سولنس کی گفتگو سے شروع هوتا هے - بروک صاحب فراش هے - مسز سولنس پیشین گوئی کرتی هے که بروک عنقریب مرنے والا هے - سولنس بات ٹالنے کی غرض سے اپنی بیوی کو یاد دلاتا هے که نیا مکان تقریباً تیار هے اور وهاں هماری زندگی زیادہ پر لطف هوگی مگر مسز سولنس بڑی درد ناک لہجه میں یہی کہتی هے :

تم جتنے چاهو مکانات بناتے جاؤ ' لیکن تم میرے لیے حقیقی مکان نه بنا سکوگے —

مکان کی بات چیت شروع هوتے هی - مسز سولنس کے دماغ میں هزاروں خیالات پیدا هونے لگتے هیں - جس قدر وہ اس درد ناک موضوع کو دور رکھنا چاهتی هے اسی قدر یه خیالات بار بار اس کے دماغ پر طاری هوتے رهتے هیں ' آخر کار وہ کہتی هے :

" بے شک ' دونوں جانب میرے فرائض تھے ' تمهاری طرف بھی اور ننھے بچوں کی طرف بھی - مجھے اپنا دل پتھر کی طرح سخت کر لینا چاهئے تھا - مجھے دهشت کو اتنا موقع نہیں دینا چاهئے تھا که وہ میرے اوپر مسلط هو جاتی - نه مجھے اپنے مکان کے جل جانے کا اتنا ملال کرنا چاهئے تھا (کف افسوس ملتے هوے) ' هالورڈ ! کاش مجھه میں برداشت کرنے کی قوت هوتی " —

اس کے بعد سولنس اپنی بیوی کو یقین دلاتا هے که وہ نه علاوہ

ہے نہ دیوانہ' بلکہ ایک بوجھہ ہے جو اس کی روح کو پارہ پارہ کر رہا ہے' وہ بیوی کے احسان کا بوجھہ ہے' مگر اس کی بیوی یہ پہیلی سمجھنے سے قاصر ہے۔ قبل اس کے کہ سولنس کچھہ توضیح کرسکے ہلدا داخل ہوتی ہے' وہ کہتی ہے: میں سوئی، تو خوب آرام سے لیکن میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا۔ وہ یہ کہ میں اونچے پہاڑ سے نیچے غار میں گر رہی ہوں - مسز سولنس کہتی ہے' میں ذرا بازار جا کر ہلدا کے لیے کچھہ ضروری چیزیں خرید لاؤں' ہلدا اس کی مہربانی کا گرمجوشی سے شکریہ ادا کرتی ہے مگر مسز سولنس اس یہی جواب دیتی کہ اس میں شکریہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے' میں جو کچھہ کر رہی ہوں یہ میرا فرض ہے - یہ کہہ کر وہ بازار کو روانہ ہو جاتی ہے۔ سولنس اپنی بیوی کی مدح سرائی شروع کرتا ہے' مگر ہلدا اس سے متفق نہیں ہے' اس کے خیال میں کسی ذی ہوش بھلے مانس کو " فرض " کا خوفناک لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئیے' کیونکہ اس کے خیال میں یہ لفظ نہایت ہی افسردہ کن' زہر آلود' اور کرخت ہے۔ اس کے بعد کتابوں کی الماری سے گذرتی ہوئی وہ نقشے دیکھنے لگتی ہے جو ریگنر نے طیار کیے تھے' وہ یہ بات پسند نہیں کرتی کہ سولنس نے یہ کام کسی اور کو کیوں سکھایا؟ وہ یہ چاہتی ہے کہ ملک میں سولنس اس فن کا تنہا اُستاد ہو۔ اس گفتگو سے ہلدا نے سولنس کی دکھتی ہوئی رگ میں جنبش پیدا کردی - سولنس ہلدا کو کھڑکی تک لے جاتا ہے اور اُسے وہ مکان دکھاتا ہے جو قریب قریب مکمل ہو چکا تھا' اور جس پر ایک بہت بلند مینارہ زیر تعمیر تھا۔ یہ اس کا وہ نیا مکان تھا جس میں اب وہ منتقل ہونے والے تھے۔ اس میں بھی تین بچہ خانے ہیں۔ ان کے بچہ ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔ سولنس کے دو بچے تھے لیکن وہ نذر آتش ہو چکے تھے۔ وہ

ہلڈا سے کہتا ہے میں خوش ہوں کہ تم آ گئیں ' میں اب کسی سے بات چیت تو کر سکتا ہوں - سولنس کے جذبات شراروں کی طرح ابھرنے لگتے ہیں اور وہ قدیم داستان درد سنانے لگتا ہے - وہ اس آراضی کی جانب اشارہ کرتا ہے جہاں اس کی بیوی کا آبائی مکان تھا ' جو جل کر خاک ہوگیا تھا - آگ کا ہولناک منظر ' خوف ' دہشت ' رات کی سرد ہواؤں کے جھونکے ' بے سرو سامانی اور فراری ' ان امور نے میری بیوی کو علیل کر دیا ' یہاں تک کہ اس کا دودہ زہر آلود ہو گیا - مگر اس کا یہ اصرار تھا کہ بچوں کو دودہ خود ہی پلائے گی - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بچے چل بسے - مجھہ سے زیادہ میری بیوی کو اس کا صدمہ ہوا مگر اس حادثے کا دوسرا پہلو بھی ہے ' اس فن میں میری کامیابی کی یہ پہلی سیڑھی تھی ' میں نے کہیں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی بلکہ میں نے جو کچھہ سیکھا خود ہی سیکھا - ہلڈا یہ گفتگو نہایت دلچسپی سے سنتی ہے اور کہتی ہے ' سولنس تمہیں خوش ہونا چاہئیے - تم نے بنی نوع انسان کے لیے ایسے خوبصورت ' آرام دہ ' خوشنما مکانات تعمیر کیے - لیکن سولنس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ جو قیمت میں نے ادا کی ہے اس کا زخم دل پر سے آج تک مندمل نہیں ہوا - لوگ مجھے خوش نصیب تصور کرتے ہیں ' لیکن میں خود جانتا ہوں کہ میں نے اس ظاہری خوش نصیبی کی کیا قیمت ادا کی ہے ' بہ الفاظ دیگر میں اپنے فن میں اپنی بیوی کے فن کے کمالات قربان کر کے کامیاب ہوا - ہلڈا کہتی ہے ' مگر اس میں تمہارا کیا قصور ہے ؟ مگر سولنس کو اس کا یقین نہیں کہ وہ بے گناہ ہے - وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ ریگنر داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے ' میرا باپ بستر مرگ پر ہے ' اگر آپ نے نقشے دیکھہ لیے ہوں تو ان پر سفارشی کلمات لکھہ دیجیے تاکہ میرا باپ مرنے سے قبل وہ الفاظ

دیکھ لے۔ سولنس کہتا ہے : ریگنر! تم میرے ہاں ہی رہو' جو تم چاہو گے ہو جائے گا ' اس کے بعد تم کے آ سے شادی کرسکتے ہو' اور آرام سے زندگی بسر کرسکتے ہو' مگر فی الحال عمارت کا کام خود تم شروع نہ کرو' تم مجھ سے ایسی درخواست نہ کرو جس کا پورا کرنا میری قوت سے باہر ہے۔ ریگنر چلا جاتا ہے - ہلدا سولنس کے طرز کلام سے سخت برافروختہ ہوتی ہے۔ سولنس ایک اور داستان شروع کرتا ہے ' وہ کہتا ہے ' ہمارے آتش دان کی چمنی میں ایک شگاف تھا ' میں نے کئی مرتبہ اس کو درست کرنے کا خیال کیا لیکن کوئی طاقت مجھے ہمیشہ روکتی رہی ' مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں اس شگاف کے ذریعہ سے شاید کامیابی کی بلندی تک پرواز کرسکوں۔ گفتگو جاری رہتی ہے :

سولنس: کیا تمہارا یہ خیال نہیں کہ دنیا میں ایسی برگزیدہ ' منتخب ہستیاں موجود ہیں جن میں خواہش کرنے ' آرزو کرنے ' اور کسی شے کو چاہنے کا ایسا مادہ ودیعت کیا گیا ہے کہ آخر کار ان کی مسلسل ' پیہم اور اٹل آرزو کرنے سے وہ بات ضرور رونما ہوجاتی ہے۔

ہلدا (شک کے ساتھ) : اگر ایسا ہے تو ہم دیکھ لیں گے کہ میں بھی ان منتخب لوگوں میں ہوں یا نہیں —

سولنس : یہ صرف کسی کی شخصیت ہی نہیں جو اتنا بڑا کام کر گذرے ' اجی نہیں ' مدد کرنے والے اور خدمت کرنے والے - ان کو بھی اپنا کام کرنا چاہئے - اگر کسی فائدے کی توقع ہے ' لیکن وہ خود بخود کبھی نہیں آتے ' ان کو بار بار بلانا پڑتا ہے ' دل سے ' — تم سمجھیں ؟

ہلدا : یہ مدد کرنے والے اور خدمت کرنے والے کون ہوے ؟

سولنس : اس کے متعلق هم پهر کبهی بات چیت کریں گے ، فی‌الحال همیں صرف آتش زنی کے قصے هی تک رهنا چاهئیے —

هلدا : کیا تمهارا یہ خیال نہیں کہ تمهارے نہ چاهنے کے باوجود بهی آگ ضرور لگتی —

سولنس : اگر یہ مکان کلنت برووک کا هوتا تو آگ اسے اتنی جلد کبهی نہ ختم کر سکتی ، مجهے اس کا یقین ہے ، کیونکہ اسے یہ معلوم هی نہیں کہ مدد کرنے والوں کو کس طرح بلایا جاتا ہے ، اور نہ وہ خدمت کرنے والوں کو بلانا جانتا ہے (اضطراب میں اُٹهہ کر) هلدا ، تو تم نے دیکها ، آخر کار ، یہ میرا هی قصور ہے کہ ان دو بچوں کی جانیں قربان کی گئیں ، اور کیا اس میں بهی میرا هی قصور نہیں کہ الین پهر کبهی ویسی عورت نہ هو سکی جیسے وہ هوتی ، یا جو وہ هونا چاهتی تهی —

هلدا : بیشک ، اگر یہ سب مدد کرنے والوں کا هی کام ہے تو —

سولنس : مدد کرنے والوں کو کس نے بلایا ؟ میں تها ، وہ آئے انهوں نے میرے حکم کی تعمیل کی (بڑهتے هوے جوش میں) ، یہ وہ شے ہے جسے لوگ کہتے هیں کہ قسمت تمهاری معاون ہے ، لیکن میں تمهیں یہ بتانا چاهتا هوں کہ اس قسمت کو میں کیسا محسوس کرتا هوں ، وہ میرے سینے پر ایک زخم ہے ، اور مدد کرنے والے دوسرے لوگوں کی کهال اُتار کر بار بار میرے زخم کو پوشیدہ کرنا چاهتے هیں ، لیکن پهر بهی زخم مندمل نہیں هوتا ، کبهی نہیں ، کبهی نہیں ، کاش تم یہ جان سکتیں کہ بعض وقت اس میں کیسی ٹیس هوتی ہے —

ہلدا کہتی ہے کہ تمہارا ضمیر کمزور معلوم ہوتا ہے - سولنس کہتا ہے کہ تمہارا ضمیر بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتا ورنہ تم اپنے باپ کو تنہا نہ چھوڑتیں - ہلدا جواب دیتی ہے ' کہ یہ ضمیر نہیں ہے بلکہ میرے دل میں کوئی ایسی تحریک پیدا ہوئی جسے میں دبا نہ سکی اور مجھے گھر سے باہر نکلنا پڑا - یہ سن کر سولنس کہتا ہے کہ تمہارے جسم میں بھی وہ آسیب موجود ہے جو تمہارے خیال کے مطابق میری روح سے وابستہ ہے —

" ہلدا ' دنیا میں لا تعداد آسیب موجود ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے "-

ہلدا : آسیب ؟

سولنس : (رک کر) اچھے آسیب اور برے آسیب ' سفید بالوں والے آسیب اور سیاہ بالوں والے آسیب ' اگر تم یہ بتا سکتیں کہ جس آسیب نے تم پر قبضہ کیا ہے وہ سفید ہے یا سیاہ تو بہت آسانی ہو جاتی -

ہلدا : (اپنی نظروں سے اسے دیکھتے ہوے) ' یا اگر ہمارے پاس مضبوط ' چمکدار اور تندرست ضمیر ہو ' تاکہ پھر ہم جو چاہیں کر گذریں -

سولنس . اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس معاملے میں میری طرح اور ہزار ہا افراد بھی کم مایہ اور بے حقیقت ہیں —

سولنس اسی لے میں باتیں کرتا رہتا ہے ' وکنگس (Vikings) کی داستان چھیڑتا ہے جو قتل و غارت گری کرتے اور پھر اپنے وطن میں آکر شرابیں پیتے اور جشن مناتے تھے - وہ ہلدا کو ایک شکار کرنے والی چڑیا تصور کرتا ہے ' ہلدا اس لقب کو پسند کرتی ہے ' اور کہتی ہے کہ آخر میں خود کیوں نہ شکار کرنے کو جاؤں - پھر وہ ریگنر کے نقشے اُٹھا لاتی

ہے اور سولنس سے کہتی ہے کہ تمھیں ان پر سفارشی کلمات لکھنا ہوں گے۔ سولنس غصے ہوئے اگتا ہے۔ لیکن ہلدا ضبط سے کام لیتی ہے۔ سولنس کہتا ہے کہ میں نے خود اس کے باپ کو تباہ کیا، اگر اسے بڑھنے کا موقعہ دیا گیا تو یہ سب سے پہلے مجھہ پر ہاتھہ صاف کرے گا۔ قسمت کی گردش ضرور رنگ لاے گی، گناہوں کا کفارہ دینا ہو گا۔ ہلدا اپنے کانوں پر ہاتھہ رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ ایسی فال منہ سے نہ نکالنا، میں تمھیں ہاتھہ میں پھولوں کا ہار لیے پھر مینار کی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہوں —

اس اثنا میں مسز سولنس بازار سے واپس آتی ہے، وہ کئی چیزیں ہلدا کے لیے خرید کر لائی۔ ہلدا اس کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ الین پھر وہی کہتی ہے کہ اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے؛ میں نے جو کچھہ کیا وہ میرا فرض تھا۔ اس کے بعد ہلدا اصرار کرکے سولنس سے ریگنر کے نقشوں پر تحسینی کلمات لکھوا لیتی ہے اور Kaia کو ہدایت کرتی ہے کہ اسے جلد بروروک تک پہنچا دے۔ سولنس اس کے بعد ہی ریگنر اور کے آ کو ملازمت سے برطرف کردیتا ہے۔ کے آ چلی جاتی ہے۔ سولنس اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ اب جس قدر جلد ہو سکے نئے مکان میں منتقل ہو جانا چاہیئے۔ آج شام کو میں خود اس کے بلند مینارے کی بلند ترین چوٹی پر ہار آویزاں کروں گا۔ یہ سن کر مسز سولنس سراسیمہ ہو جاتی ہے، اُس کے خیال میں یہ خطرناک تھا کہ سولنس اس بلندی پر چڑھے، وہ اپنی روح کی پوری طاقت سے اپنے شوہر کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ہلدا بار بار سولنس سے یہ سوال کرتی ہے، کیا تم میں اس بلندی پر جانے کی ہمت باقی نہیں، کیا وہ اس بلندی تک پر پرواز نہیں کر سکتا جو وہ خود تعمیر کرتا ہے —

وہ بہت جلد نئے مکان میں منتقل ہوجاتے ہیں - مگر مسز سولنس کچھ خوش نہیں معلوم ہوتی ' اس کے آبائی مکان کی آراضی کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے نئے مکانات بنا دئیے گئے تھے جن میں اب اجنبی آباد تھے - الین کو یہ بات پسند نہ تھی ' وہ کبھی اس پائین باغ میں نہ جاتی جو مکان سے ملحق تھا - سولنس کے حکم سے مجبور ہوکر اس مکان میں آگئی تھی اس لیے کہ شوہر کی تابعداری عورت پر فرض ہے - بچوں کی موت کو وہ حکم خداوندی تصور کرتی ہے جس کی رضا پر راضی رہنا ہر شخص کا فرض ہے - وہ آبائی جواہرات ' گوٹے ٹھپے ' ریشمی ملبوسات اور اپنی نو گڑیوں کو یاد کرتی ہے جو نذر آتش ہو چکی تھیں - ڈاکٹر آتا ہے اس کے بعد سولنس آتا ہے - مسز سولنس ہلدا سے بار بار کہتی ہے کہ مینارے پر چڑھنے کے خیال کو ان کے دماغ سے نکالنے کی سعی بلیغ کرو - سولنس کے داخل ہونے سے قبل الین ڈاکٹر کو لے کر اندر چلی جاتی ہے - ہلدا کہتی ہے کہ میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھیر سکتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس قیام کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا - سولنس کہتا ہے کہ تمھاری عدم موجودگی میں میں کس کے لیے زندہ رہوں گا - وہ کہتی ہے الین کے لیے - سولنس جواب دیتا ہے :

" بے شک ' ان آسیبوں نے ' میرے اہرمن نے اس کا خون چوس لیا (نا امیدی سے ہنستا ہے) ہاں ! ہاں ! انھوں نے یہ میری خوشی کے لیے کیا تھا ' (غمگین لہجہ میں) اب وہ میرے لیے مردہ ہے ' اور میں زندہ ہوکر ایک مردہ عورت سے باندھ دیا گیا ہوں - (مضطربانہ) میں - میں - جو زندگی میں لذت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا '

بات کاٹ کر هلڈا پوچھتی هے ' اس کے بعد کیا تعمیر کروگے - سولنس جواب دیتا هے ' گمان غالب یہ هے کہ میں اب زیادہ عمارتیں اور نہ بناؤں گا ' مجھے اس کی توقع نہیں کہ یہ مکانات جو میں نے والدین اور بچوں کے لیے بنائے هیں وہ آئندہ نسلوں کے لیے زیادہ مفید نہ هوں گے - هلڈا اس جواب سے مطمئن نہیں هوتی ' وہ کہتی هے سلطنت کے ساتھہ قلعہ کا هونا ضروری هے اس لیے اب تمهیں میرے قلعے کے عمارت کی بنا ڈالنا چاهئے - هلڈا کے خیال کے موافق یہ قلعہ ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر بنانا چاهئے تاکہ دور تک کی فضا آسانی سے نظر آسکے ' اس پر ایک بہت اونچا مینار هونا چاهئے جس پر پہونچ کر یہ دونوں هوائی قلعہ تعمیر کر سکیں ' هلڈا کہتی هے کہ ان سے زیادہ حسین شے دنیا میں اور کوئی نہیں ' ان کا بنانا اور ان میں پناہ لینا دونوں نہایت هی آسان هے —

ریگنر داخل هوتا هے ' اس کے هاتھہ میں ایک شاداب گجرا هے جس میں ریشم کے پرزے آویزان هیں ' اس کو دیکھہ کر هلڈا اُچھلنے لگتی هے - هلڈا کو معلوم هوتا هے کہ سولنس کی تحریر برروک کے بیہوش هو جانے کے بعد پہونچی ' اس لیے وہ موت سے قبل اطمینان اور مسرت کی سانس نہ لے سکا - هلڈا کہتی هے کہ پھر بھی تمهیں سولنس کا شکریہ ادا کرنا چاهئے - ریگنر کہتا هے کہ میں اس شخص کا کس دل سے شکریہ ادا کروں جس نے برسوں تک مجھے پامال کیا ' مجھے ابھرنے کی مہلت تک نہ دی ' میرے باپ کو مجھہ سے بد ظن کیا - محض اس لیے کہ کےآ کو وہ اپنے دفتر میں رکھہ سکے - اس کا نتیجہ یہ هوا کہ اب کےآ کے دل و دماغ پر سولنس هی کا اثر موجود هے اور وہ اس دفتر سے جانا نہیں چاهتی - هلڈا اس کا یہ جواب دیتی هے کہ اس نے کےآ پر اس لیے تسلط حاصل کیا

کہ تمھیں یہاں سے چلے جانے کا خیال تک نہ آے ' جس کے معنے یہ ھیں
کہ سولنس ریگنر کی قابلیت سے خائف تھا ' وہ اس قدر بزدل ہے کہ
خود اپنے شاگرد سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ' وہ بروک اور ریگنر
کی خوشیوں کو پامال کرنے کے لیے تیار ہے لیکن خود اپنے بنائے ہوے
مینارے پر چڑھنے کی ھمت نہیں رکھتا - اس کے جواب میں ھلدا سولنس
کا قدیم کار نامہ دھراتی ہے لیکن ریگنر مطمئن نہیں ھوتا - وہ کہتا ہے
کہ یہ قصۂ ماضی ہے ' اب اس میں اتنی ھمت نہیں کہ وہ مینارے کی
بلندی پر جا سکے ' نئی نسل اس کے کارنامے پر ایمان لانے کے لیے تیار
نہیں - ھلدا کہتی ہے کہ آج پھر وہ مینارے پر چڑھے گا اور دنیا پھر
اس کی بلندی کا اندازہ کر لے گی - لیکن ریگنر کو اس کا یقین نہیں
آتا - اسی دوران میں مسز سولنس داخل ھوتی ہے ' وہ یہ سن کر گھبرا جاتی ہے
کہ وہ گجرا لے کر باھر گیا ہے ' وہ ریگنر کی منت کرتی ہے کہ اسے اس
خیال سے باز رکھے اور اسے واپس بلا لائے ' وہ سولنس کو بلانے جاتا ہے '
ڈاکٹر ھرڈال داخل ھوتا ہے ' وہ مسز سولنس سے کہتا ہے کہ تم خود
جاکر اسے بلا لاؤ ورنہ وہ واپس نہ آئے گا - اس اثنا میں چند خواتین آتی
ھیں اور یہ رسم دیکھنا چاھتی ھیں - مسز سولنس کہتی ہے یہ میرا فرض
ہے کہ میں ان خواتین کے پاس جاؤں ' چنانچہ وہ چلی جاتی ہے ' اس کی
پریشانی بڑھتی جاتی ہے ' اس کے بعد ھی سولنس آتا ہے ' ھلدا اس سے
دریافت کرتی ہے کیا تم اس بلندی پر چڑھنے سے ڈرتے ھو ' وہ کہتا ہے
کہ میں خائف ضرور ھوں - لیکن اس سے نہیں بلکہ مکافات عمل سے ڈرتا
ھوں - یہ معمہ ھلدا کی سمجھ میں نہیں آتا ؛ سولنس اس کی وضاحت
کرتا ہے - وہ کہتا ہے تم جانتی ھو کہ میں نے گرجے بنانے سے ابتدا کی

تھی ' میں ایک مذہبی خاندان کا لڑکا تھا ' میں نے گرجوں کی عمارتوں
کو بڑے خضوع و خشوع سے بنایا ' مجھے خیال تھا کہ گرجوں کا مالک مجھہ
سے خوش ہو گا ' لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھہ سے خوش نہیں ' اسی
لیے میرا قدیم مکان جل کر خاک ہوگیا - شاید مدعا یہ تھا کہ میں علائق
دنیوی سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن گرجوں کا معمار بن جاوں - میں تمھارے
وطن کے گرجا کے مینارے پر چڑھا ؛ وہاں میں نے اس سے کہا کہ اپنی
مملکت میں تو آزاد ہے ' میں بھی اپنے پیشے میں آج سے آزاد ہوتا ہوں :
میں آج سے گرجے نہ بناؤں گا بلکہ انسانوں کے لیے مکانات تعمیر کروں گا.
مگر اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ انسانوں کے لیے مکان بنانا سراسر نادانی
اور حماقت ہے - انسانوں کو ایسے مکانات کی ذرا بھی ضرورت نہیں - خود
میرے پاس اگر ایسا مکان ہوتا تو مجھے اس سے ذرا بھی فائدہ نہ ہوتا
اس لیے میں نے جو کچھہ بنایا وہ سب ہیکا ثابت ہوا - ہلدا کہتی ہے '
کیا اب کبھی کچھہ تعمیر نہ کروگے - اس کا و- یہ جواب دیتا ہے کہ میں
ہوائی قلعہ بناؤں گا - ہلدا کہتی ہے کہ ان قلعوں کے بلندی تک پہنچتے
پہنچتے تمھارا سر چکرانے لگے گا - وہ کہتا ہے کہ اگر میں تمھارے ہاتھہ
میں ہاتھہ ڈال کر چلا تو کوئی خطرہ نہیں - ہلدا چاہتی ہے کہ سولنس
پھر مینارے پر چڑھے ' سولنس جھجھکتا ہے ' مگر ہلدا شدت سے اصرار کرتی
ہے ' سولنس کہتا ہے کہ اگر میں اس بلندی پر چڑھا تو میں خدا سے یہی
کہوں گا کہ میں نے یہ جسارت اپنی شہزادی کی ہمت افزائی کی وجہ سے
کی ' جس کے لیے میں ہوائی قلعہ تعمیر کروں گا ' جس سے میں محبت
کروں گا اور جس کو میں اس بلندی سے اُتر کر خوب پیار کروں گا - یہ تقریر
سن کر ہلدا وجد کرنے لگتی ہے - سولنس اپنے ہاتھہ میں گجرا لے کر چلا

جاتا ھے۔ نو جوان طبقے کا ایک کثیر گروہ موجود ھے، ان کے خیال میں سولنس اس سہم سے خائف ھے، یہ اُن لوگوں کا گروہ ھے جن کو سولنس اُبھر نے نہ دیتا تھا۔ مسز سولنس کا تردد دم بدم بڑھتا جاتا ھے، سولنس مینارہ پر چڑھنے لگتا ھے، ھوا میں موسیقی کی لہریں پیدا ھوتی ھیں جو ھلدا ھی سن سکتی ھے، لوگ بڑی دھشت کی حالت میں سولنس پر نگاھیں جمائے ھوئے ھیں، وہ چڑھتا چلا جاتا ھے، یہاں تک کہ مینارے کی چوٹی پر پہنچ جاتا ھے، لوگوں کی سراسیمگی اور ھلدا کی خوشی درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ھے، مگر سولنس زیادہ دیر تک چوٹی پر نہ ٹھہر سکا۔ وہ گرتا ھے اور اس کا سر چکنا چور ھو جاتا ھے —

ذرا غور کرنے سے پتہ چلتا ھے کہ یہ قصہ خود ابسن کی آپ بیتی ھے، بڑھاپے میں وہ اپنی زندگی پر ایک غائر نگاہ ڈالتا ھے اور اس کی واردات کو سولنس کی حیات کے واقعات سے جا ملاتا ھے۔ ناقدین کے خیال میں اس ڈرامے کا یہ پہلو بے حد دلچسپ ھے کیونکہ ابسن اپنے گھر کی حالت غیروں سے، اور اپنے دل و دماغ کی حالت اپنے احباب اور خاندان کے افراد سے ھمیشہ پوشیدہ رکھتا تھا، اس کے خطوط کا انبار جو شائع ھو چکا ھے اس کے خیالات کی غمازی کرتے ھیں، لیکن اس کی گھریلو زندگی، اور اس کے جذبات کا تموج اس ڈرامے کے ذریعہ سے بے نقاب ھوسکتا ھے۔ اس لیے ابسن کے اس ادبی کار نامہ کو اس کی سوانح عمری کا لب لباب تصور کیا جاتا ھے —

اب ابسن کی لائف پر نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ وہ کہاں تک سولنس سے مشابہت رکھتا ھے، ناظرین کو یاد ھوگا کہ ابسن نے کیسی کیسی سختیاں جھیلی تھیں، اس کے والد کا سارا اثاثہ برباد ھو چکا تھا، اس لیے اس کی

نہ معقول تربیت ہوسکی، اور نہ وہ تعلیم حاصل کرسکا اور وہ گھر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہوا - ایک دوا خانے میں جاکر ملازم ہوتا ہے؛ اور زندگی کی مشکل ترین منازل طے کرنے لگتا ہے، ایک بار یونیورسٹی میں داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن نا کام رہا، اور مجبور ہو کر اُسے پھر روزی کمانے کی جانب متوجہ ہونا پڑا - اس کی بہن بہت مذہبی عورت تھی، اس کے خاندان کے اکثر افراد مذہب کے پکے پیرو تھے، صرف ابسن ہی آزاد خیال اور معقول پسند پیدا ہوا تھا جس کی وجہ سے خاندان والوں سے اس کے تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئے تھے - تعلیم اور تربیت کے بغیر وہ ڈراما نویسی شروع کرتا ہے، اور سنہ ۱۸۶۵ ع سے (جس سال "بریلڈ" شائع ہوا) برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ نہ صرف امریکہ بلکہ یورپ کے اکثر ممالک پر چھا جاتا ہے - اس کی شادی ہوتی ہے - نا روے ڈنمارک کی اعانت سے گریز کرتا ہے، ڈنمارک پر دشمن کی افواج جوق در جوق اُمڈتی چلی آتی ہے، ابسن کا غصہ بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ اپنے کلام کے ذریعہ سے اپنے وطن کے عیاری، خود غرضی اور بے راہ روی پر لعنت بھیجتا ہوا نا روے کو خیر باد کہہ کر یورپ کے دیگر ممالک میں جا بستا ہے - یہ حقیقتاً وہ آگ تھی جس نے سولنس کے آبائی مکان کو خاک سیاہ کردیا تھا، اس کے بعد وہ مدت تک در بدر پھرتا ہے، کبھی میونک میں قیام کرتا ہے، کبھی ڈریسڈن کو اپنا وطن بناتا ہے، کبھی روم کی خاک چھانتا ہے، مگر ابسن اور اس کی بیوی دونوں وطن کی فضا کو ترستے ہیں - جس طرح سولنس اور الین آبائی مکان سے نکل کر کبھی چین سے نہ رہ سکے وہ ڈراما لکھنا شروع کرتا ہے، پہلے اخلاقی، مذہبی اور اصلاحی تصانیف کا ڈھیر لگا دیتا ہے، "تیسری سلطنت" کی بنا ڈالتا ہے، یہ

دراصل سولنس کے گرجوں کے عمارتیں ہیں' "برینڈ" کے شایع ہوتے ہی وہ دولت مند بھی ہو جاتا ہے اور مشہور بھی ' اس کے بعد اس کی تصانیف اقصائے عالم میں پھیلنے لگتی ہیں ' وہ اپنے فن کا اُستاد کامل (Master Builder) تسلیم کر لیا جاتا ہے ' دور دور سے مداحین اس کی خدمت میں آکر اُسے مبارک باد دیتے ہیں ' مختلف زبانوں میں اس کی تصانیف کے تراجم ہوتے ہیں ' بڑے بڑے شہروں کے علمی حلقوں میں اس کے خیالات پر تبصرے کیے جاتے ہیں —

اس کے بعد وہ انداز کلام تبدیل کرتا ہے ' یعنی سوشل ڈرامے لکھنے لگتا ہے۔ گھریلو زندگی کو سنوارنا شروع کرتا ہے ' نورا کو عالم وجود میں لاتا ہے ' "بھوت پریت" سے ہمیں آگاہ کرتا ہے یہ دراصل سولنس کے تیار کردہ وہ مکانات ہیں جو اُس نے عوام الناس کے لیے بنائے تھے ' چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے مکانات ' خوشنما ' صاف ' مستحکم۔ لیکن لوگوں نے ان مکانات کی قدر نہ کی اور مجبور ہوکر اُسے اپنے فن کو دوسری جانب متوجہ کرنا پڑا۔ اس دوران میں وہ وطن سے دور رہتا ہے ' کُل یورپ کو اپنا وطن بنا لیتا ہے ' آبائی مکان جل کر مٹی کا تودہ ہوگیا تھا اس لیے دوسرے مکانوں میں رہتا ہے۔ اُس کے خیال میں ناروے سے ایک ایسا شدید گناہ سرزد ہوا تھا کہ وہ اس کو سالہا سال معاف نہ کرسکا۔ وہ خود اور اس کی بیوی دونوں پردیس سے اُکتا چکے ہیں ' لیکن ان جذبات کے اثرات اب تک اس کے دل پر ثبت ہیں جن سے متاثر ہو کر اس نے سنہ ۱۸۶۳ ع میں " A Brother in Distress " نظم لکھی تھی ' جب ناروے نے اپنے عہد و پیمان فراموش کرکے اپنے بھائی ڈنمارک کی اعانت سے پہلو تہی کی تھی۔ ہم اس نظم کا ترجمہ پہلی قسط میں درج کرچکے ہیں - وہ خود

کہتا ہے کہ میری اپیل میرے ہم وطنوں پر کارگر نہ ہوئی۔اس لیے مجھے جلا وطن ہونا پڑا - مسز ابسن ایک نہایت زیرک اور فہیم خاتون تھی - ماں کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی تھی- بچوں کی تربیت، ان کی نگہداشت اور ان کی غور و پرداخت کرنے میں ید طولیٰ رکھتی تھی، گویا الین کی طرح وہ خود بھی چابک دست معمار ہوسکتی تھی، لیکن ان کی زیادہ اولاد نہ ہوئی' اس لیے مسز ابسن کی یہ قابلیت رائگاں گئی —

"معمار کامل" (Master Builder) سنہ ۱۸۹۲ ع میں لکھا گیا، اس وقت ابسن پورے ۶۴ (چوسٹھہ) سال کا تھا، زندگی کی خزاں تھی، قواے ذہنی اور جسمانی مضمحل ہونے لگے تھے، جیسا کہ خود اس ڈرامے اور اس کے بعد کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے، دماغ کو خیالات پر گرفت نہ رہی تھی، جذبات اور خیالات دونوں نے دل و دماغ کو اپنا تابع کرلیا تھا- ورنہ سولنس ایسی بے تکی باتیں نہ کرتا اور نہ ہلڈا یوں بے دھڑک اپنے باپ کو چھوڑ کر چھوڑے دم اپنی سلطنت اور اپنا قلعہ سولنس سے طلب کرنے آتی- سولنس کی نیم دیوانگی، اور ہلڈا کا ۲۳ برس کی عمر میں یہ عہد طفلی جو ہمارے پیش نظر ہے، یہ دونوں اُمور خود ابسن کی ضعیف العمری پر دال ہیں- ابسن سنہ ۱۸۶۵ سے تیس سال تک اپنے فن کا کامل اُستاد تسلیم کیا جاتا تھا، مگر جب وہ خود یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے بت پرانے ہوچلے ہیں، ان کا رنگ و روغن پھیکا پڑنے لگا ہے، نئے مصنفین، نئے نقاد، نئے ڈراما نویس، نئے فلسفی اُبھر رہے ہیں، پرانے خیالات اور قدیم اسلوب بیان پر اس نئی اُمت نے حملہ کرنا شروع کردیا ہے- ابسن آخر کب تک اپنے پرانے قلعہ کی خیر مناتا؛ اُس

نے فوراً تاڑ لیا کہ یورش سخت ہے ؛ نئی نسل کے علمبردار صف در صف بڑھتے چلے آتے ہیں؛ اس لیے ان کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کرنا چاہئے۔ مگر کمال کا غرور اس کی اجازت نہیں دیتا، سوانس ریگنر کی قابلیت کا معترف ہے، خود ڈاکٹر سے اس کا ذکر کرتا ہے، لیکن اس کا دل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کی ہمت افزائی کرے۔ چنانچہ نئی اُمت یلغار کرتی ہوئی اُمڈی آتی ہے؛ اب یہاں صرف یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ اس ہالڈا کے لباس میں کونسا محبوب پوشیدہ ہے۔ ابسن کے ہاں مافوق العادت بہ الفاظ دیگر نیم دیوانی خواتین کی بڑی آو بھگت ہوتی تھی؛ اس کی اغلباً تین وجہ تھیں، اول تو خود ابسن حسن کی طلعت ریزیوں سے مسحور تھا۔ دوم وہ ان کی مختلف خصوصیات کو ایک جگہ مجتمع کر کے ایک نیا کردار تیار کرتا تھا، سوم وہ انسانی فطرت کے مطالعہ کا نہایت ہی شایق تھا۔ عام زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ لڑکی جتنی سرپھری اور دیوانی زیادہ ہوتی اسی قدر ابسن اُسے زیادہ چاہتا تھا۔ یہاں علم النفس کا ایک نکتہ مضمر ہے، جس کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، گو یہ تشبیہ غیر مکمل اور ایک حد تک دھوکا دینے والی ہے پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ اس کی مدد سے نکتہ کی وضاحت ہو جائے گی، مشین کے دو تین پرزے علحدہ کرنے کے بعد ماہر فن اس کی نوعیت اور اس کے اصول عمل کو جلد اور آسانی سے سمجھ جاتا ہے، چنانچہ ماہرین علم النفس دیوانوں، سر پھروں اور پاگلوں کے مطالعہ سے جو جو علمی نکتے اخذ کر لیتے ہیں وہ اچھے ہوشمند اور دانا افراد سے اخذ نہیں کرسکتے، اس لیے سر پھرا فرد جس قدر دلچسپ ہوتا ہے اُس قدر ہوشمند نہیں ہوتا۔ بہرحال ظن غالب یہ ہے کہ یہ ہلڈا ابسن کی دلی دوست Emilie Bardach ہے، جس نے اس ڈرامے کے

شائع ہونے سے قبل اپنی ڈائری میں یہ لکھا تھا ' کہ ابسن مجھہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے —

یہ Gossen Sass کے قیام میں ابسن سے ملی تھی ' اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی ' اس کی شوخی اور طراری ' اور اس کا حسن و جمال دیکھہ کر ابسن مہینوں دیوانہ بنا رہا ' اس کی شخصیت کا ہلکا سا عکس ہلدا میں بھی موجود ہے۔ ابسن کی عمر اس وقت باسٹھہ سال کی تھی ' لیکن ابسن کی سنجیدگی ' بردباری ' متانت ' وضعداری امیلی نے ایک ہی وار میں برباد کر دی تھی ' شاید اس وقت ابسن کو نئی نسل کی توانائی اور اپنی کم مائگی کا احساس ہوا ہو ' اس کے علاوہ ایک نوجوان مصنف Knut Hamsun نے بھی ابسن پر نکتہ چینی کی تھی ' اس کا خیال تھا کہ لٹریچر انسان اور فطرت سے وابستہ ہونا چاہئے ' وہ لٹریچر مفید نہیں جس میں ہوائی قلعے تعمیر کیے جائیں - اس میں شک نہیں کہ خیالی قلعے جس طرح بے بنیاد ہوتے ہیں اسی طرح ابسن کے یہ ڈرامے ایک حد تک مہمل اور دور از قیاس ہیں۔ حیات انسانی کے کسی دور میں نہ ہلدا ملتی ہے نہ سولنس نظر آتا ہے ' اس لیے ان کے جو پہلو ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں وہ فہم و ادراک سے بالا تر ہیں ' اس ڈرامے کو محض ابسن کی آپ بیتی سمجھہ کر اہمیت دی جا سکتی ہے —

اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سولنس کے کردار کی تشریح ناظرین کی خدمت میں پیش کریں تاکہ تصنیف کی پوری خوبی کا پتا چل جائے۔ سولنس کی زندگی مذہبی افراد کے لیے آئینۂ عبرت بن سکتی ہے وہ ایک گرجے کے مینارے پر چڑھ کر رب ذوالجلال کو چیلینج دیتا ہے ' اپنی آزادی کا اعلان کرتا ہے ' خود مختار بنتا ہے اور ایک دوسرے مینارے کی

بلندی سے کچھہ مدت بعد دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فطرت نے اس کو بغاوت کرنے کے لیے منتخب کیا ہو ' اس کو سرسبز ہونے کی کافی مہلت دی ' پھر اس کے منہ سے بغاوت کے کلمات بر آمد ہوے اور اس کا سر پاش پاش کر دیا گیا - یہ قرین قیاس اس لیے ہے کہ گو سولنس دوران سر کا مریض ہے لیکن پہلے موقعہ پر جب وہ مینارے پر چڑھتا ہے اس وقت اس کی حالت دگر گوں نہیں ہوتی ' بغاوت کرنے کے بعد جب وہ پھر یہ جسارت کرتا ہے اس وقت فطرت اپنا پورا انتقام لیتی ہے - پہلی کامیابی ایک دھوکے سے زیادہ نہ تھی ' یہ ایک جال تھا جس میں نادان باغی گرفتار ہو کر فنا ہو جاتا ہے ' بغاوت کے باوجود سولنس کو دولت اور وقار کثرت سے حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے فن کا استاد شمار کیا جاتا ہے ' یہ فطرت کا عطیہ ہے ' مگر فطرت اسے بیماری کا شکار بنا دیتی ہے ' اور اِس بہانے سے اس کی دوسری کوشش میں اُسے پیوند خاک کر دیتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابسن حقائق سے اکتا گیا ہے ' معمولی قسم کے افراد سے جو ہمیں آے دن ملتے رہتے ہیں ابسن کا دل سیر ہو چکا ہے ' اب وہ منطق ' فطرت انسانی ' نفسیات اور عمرانیات سے بلند اُڑنا چاہتا ہے ؛ وہ ایسی فضا کا خواہشمند ہے جہاں معمولی قوانین اور ضوابط عمل پیرا نہیں ہوتے ؛ وہ تیز روشنی کے بہ نسبت دھندلی روشنی کو پسند کرتا ہے ' جہاں نظام حیات کا تار و پود زیادہ اُستوار نہیں ہوتا ' اس لیے اُس نے اس ڈرامے میں دو ایسے کیریکٹر پیدا کیے ہیں جو ایسے خیالات اور جذبات کے مالک ہیں جو اس دنیا میں نہیں پاے جاتے -

سولنس یقیناً نیم دیوانہ ہے ' اس کی دیوانگی ہی اس ڈرامے کی بنیاد ہے ' مگر وہ Passive ہے ' ہلڈا کا عمل اور اس کے جارحانہ حملے اس

روئداد کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں - جس روز ہلدا آنے والی ہے اس روز سولنس کے دماغ کی حالت بیحد دگرگوں تھی - الین اور خاندانی ڈاکٹر کا یہ پختہ خیال ہے کہ سولنس کا دماغ ماؤف ہو رہا ہے' اس کی بھنک سولنس کے کان میں بھی پہنچ چکی ہے - اُسے اور کوئی نہیں ملتا تو وہ ڈاکٹر ہالورڈ ہی سے اپنے گذشتہ اعمال کا اقرار کرنے لگتا ہے' اس سے زیادہ اس کی دیوانگی کی روشن دلیل اور کون سی ہوگی - وہ ایک غور کرنے والا شخص ہے جس کا کمزور دماغ واقعات کو اوہام باطلہ کی بنیاد پر ایک دوسرے سے منسلک کرنے لگتا ہے - ایسے لوگ قصداً عمل سے گریز کرتے ہیں' اور اس سکوت کے بعد اُنہیں واقعات کی غیر فطری تاویلیں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا ان کے سکوت کی وجہ سے ہوتا ہے - بہر حال سولنس کی گردن پر گناہوں کا انبار تھا' بیوی کا دائمی مرض اور بچوں کی موت کا اس کے خیال میں وہی باعث ہوا' اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ یہ مکان تباہ ہو جائے چنانچہ ایسا ہوا' گویا رب ذوالجلال نے اپنے باغی سے انتقام لیا ہے' اس کی دیوانگی کی یہ پہلی اور کافی نمایاں مثال ہے' اس کا خیال یہ تھا کہ خداوند کریم کا مدعا یہ ہے - " میں تمام عمر گرجے ہی بناتا رہوں اس لیے میرے دنیوی علائق منقطع کر دیے گئے " - مگر سولنس اس کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ خدا کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی کی طرح اس کی مرضی کے مطابق رقص کرتا رہے' چنانچہ وہ چیلینج دیتا ہے اور دس سال تک گرجا بنانے کا نام تک نہیں لیتا' اس دوران میں نہایت سرسبز ہوتا ہے مگر ایک خلش پیہم رفتہ رفتہ اسے دل برداشتہ کر دیتی ہے - اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ میری سرسبزی ہی کہیں میری تباہی کا موجب نہ ہو' اس کا ملال روز افزوں ہے -

وہ اپنے آپ کو بھوتوں کا آقا تصور کرتا ہے ' لیکن ایک چھوٹا سا ضعیف بھوت کے آ کی صورت میں آتا ہے اور اس پر قبضہ کر لیتا ہے ' وہ ھالدا کی آمد سے مسرور ہے لیکن خود ھلدا نئی نسل کی علم بردار ہے جس سے وہ اس قدر خائف ہے ' وہ سولنس پر ایک حاکم کی طرح چھا جاتی ہے اور اسے ریگنر کے نقشوں پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کردیتی ہے - یہاں یہ ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اپنے نئے مکان پر سولنس نے ایک مینارہ کیوں تعمیر کیا - بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ مینارہ اس کے چیلینج کا مادی پیکر ہے مگر بعض اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اس کی شکست کا اعتراف ہے ' وہ رب ذوالجلال کے غصے کی تاب نہ لا سکا ' وہ منفعل اور پشیمان ہے ' اس مکان کے بعد اگر وہ کوئی عمارت بناتا اور فطرت اسے ذرا اور مہلت دیتی تو وہ ہوائی قلعوں کی تعمیر میں مصروف ہوتا ۔ کیوں کہ وہ ان مذھبی عمارتوں اور انسانوں کے لیے مکانوں سے بے حد بد دل معلوم ہوتا ہے —

اس کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ھلدا کی شخصیت کا مطالعہ کریں ' اس تراسے کی روح و رواں ھلدا ہے ' وہ حقیقت ہے اور سولنس اس حقیقت کا عکس ' وہ سر گرم عمل ہے ' وہ ذی حیات ہے ' اس کے ہاتھ میں سولنس پتلی کی طرح رقص کرتا ہے جس طرح الین اپنے شوھر کے ابرو کے اشارے پر رقص کرتی ہے - ڈل تراسہ ایک معمہ ہے ' مگر اس کو معمہ بنانے والی ھالدا ہے نہ کہ سولنس - سولنس کی شخصیت ' خیالات ' اور جذبات کا صحیح اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ' لیکن ھلدا کے پیدا کردہ نقوش آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتے - وہ اپنے دل کی کھڑکیوں کو ہمیشہ بند رکھتی ہے ' جو وہ کہتی ہے ' وہ از سر تاپا

عقدۂ لاینحل ہوتا ہے۔ اس کے عمل اور گفتگو میں اس بلا کی آمد ہے کہ ان میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ' وہ بے دھڑک اپنے خیالات بیان کرتی جاتی ہے ' اور ان خیالات پر بے خوف ہوکر عمل پیرا ہوتی ہے ؛ اس کی بات چیت میں یقین کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ ہم جو کچھہ سنتے ہیں اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ وہ بے تکلف اپنے باپ کے گھر سے چل کھڑی ہوتی ہے ' اور سولنس سے اس طرح مطالبہ کرتی ہے ' جس طرح ایک مہاجن اپنے گاہک کے مکان پر دستک دے کر اصل اور سود دونوں تحکم کے ساتھہ طلب کرتا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس برس تک اسی کا انتظار کرتی رہی ' اور مدت گذرنے پر مطالبے لیے ہوے اپنے گاہک کے ہاں آموجود ہوئی ' اس کے مطالبے یہ ہیں —

(۱) تم مجھے اپنی شاہزادی بناؤ

(۲) اپنی شاہزادی کے لیے ایک سلطنت دو

(۳) اپنی شاہزادی کے لیے ایک ہوائی قلعہ تعمیر کرو

یہ مطالبے سن کر سولنس پریشان ہو جاتا ہے ' اسے ہلدا سے دس برس پہلے ملنا تو یاد ہے ' لیکن اسے یہ مطلق یاد نہیں کہ اس نے ہلدا سے یہ تین وعدے کیے تھے ' سولنس لاکھہ کوشش کرتا ہے اپنے حافظے پر بار بار زور دیتا ہے ؛ سر کھجاتا ہے ' پیشانی پر بل ڈالتا ہے لیکن اسے ایک وعدہ بھی یاد نہیں آتا ' مگر ہلدا کے تقین کا امنڈتا ہوا سیلاب سولنس کی شبہات کو بہالے جاتا ہے ' اور اسے طوعاً و کرہاً اعتراف کرنا ہوتا ہے ' سولنس ایک ذہین اور کامیاب انسان ہے ' مگر اس کی کیا وجہ کہ اسے اپنے وعدے یاد نہیں آتے ' ہم یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ سولنس اپنے وعدے بھول گیا ' نہ ہم یہ خیال کرسکتے ہیں کہ وہ ہلدا

کو دھوکا دے رہا ہے ' وہ ھلدا کے آنے سے خوش ہے ' پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس کو دھوکا دینا جائز رکھے ' ممکن ہے کہ Lysanger کی کامیابی سے سرشار ' اور ھلدا کے معصومانہ حسن اور قاتلانہ انداز سے متاثر ہوکر سولنس نے یہ کہا ہو کہ جب تم بڑی ہوجاؤگی تو میں تمھارے لیے قلعے بناؤں گا ' ایک سلطنت کی بنا ڈالوں گا ' اور پھر تمھیں اپنی ملکہ بناؤں گا۔ اس قسم کی باتیں بچوں سے اکثر کی جاتی ہیں ' بچوں کو بادشاہوں ' شہزادیوں ' قلعوں ' سلطنتوں ' اور جنات وغیرہ کی کہانیوں میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے ' اس وقت ھالدا کی عمر بھی تیرہ برس کی تھی ' اس نے سولنس کو مینارے پر چڑھتے اور گجرا آویزاں کرتے دیکھا تھا ' اس کے خیال میں Lysanger کا مینارہ دنیا میں سب سے بلند اور سولنس دنیا کا سب سے بہتر معمار تھا ' وہ اسے اپنا ہیرو سمجھتی تھی ' دن رات اسی کا کلمہ پڑھتی تھی۔ مینارے کی مہم سر کرنے کے بعد وہ ھالدا کے مکان پر بطور مہمان کے جاتا ہے ' ھالدا کو وہ گود میں لیتا ہے ' اس سے ایسی باتیں کرتا ہے جیسی عام طور سے بچوں سے باتیں کی جاتی ہیں ' ھالدا کے خیالات اس وقت مشتعل تھے ' سولنس جو کچھ کہتا جاتا ہے وہ ھلدا کے صفحۂ دل پر ثبت ہوجاتا ہے ' چنانچہ جب ہم دس برس بعد ھالدا سے ملتے ہیں تو اس کے نا قرس دل سے وہی صدائیں آتی ہیں ' جن کو سن کر ایک طرف تو سولنس مبہوت ہوتا ہے ' اور دوسری طرف ناظرین انگشت بہ دنداں رہ جاتے ہیں —

اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی ممکن ہے ' سولنس کے کارنامے نے جس کا اس نے خود مشاہدہ کیا تھا اسے ھالدا کا ہیرو بنادیا تھا ' وہ اسے دنیا کا سب سے بہتر ' سب سے طاقتور ' اور سب سے چابکدست انسان تصور کرتی تھی ' ممکن ہے کہ

اس نے خود عالم خیال میں یہ آرزو کی ہو کہ میں اس کی شہزادی بنوں گی، اُس کی سلطنت پر میری حکمرانی ہوگی، اور اس کا قلعہ میرے حسن کی تابش سے جگمگاے گا۔ استداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خیال پختہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اُس نے یقین کی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ دس سال بعد جو ہلڈا نظر آتی ہے تو یقین کامل کا پیکر بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ بہرحال چاہے ہم پہلی صورت کو بہتر سمجھیں یا دوسری کو مگر اُس میں شک نہیں کہ ہلڈا کے انداز میں غضب کا بچپن موجود ہے، وہ اب تیئیس سال کی عورت ہے لیکن اب بھی وہ اپنے ذہنی ارتقا کے لحاظ سے تیرہ سال کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ باتیں کرتی جاتی ہے اُسی قدر اس کی یہ خصوصیت اور نمایاں ہوتی جاتی ہے، اب تک اُس کے ذہن میں بچپن کے افسانے پیوست ہیں جن پر اس کا اب بھی اتنا ہی اعتماد ہے جتنا کہ بچوں کا ہوتا ہے اور اب تک دیوؤں اور شہزادوں کی پرانی کہانیاں اُسے ازبر ہیں —

اس کے علاوہ جب سولنس بھوتوں کا قصہ چھیڑتا ہے ہم اس کی دلچسپی میں ایک نمایاں اضافہ دیکھتے ہیں۔ مزید برآں، ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ سولنس نے دس سال ہوے اسے پیار کیا، اس کے بوسہ لیے، اسے اپنی شہزادی بنانے کا وعدہ کیا، اس کے لیے ایک سلطنت اور ایک قلعہ تیار کرنے کا عہد کیا۔ پھر بھی کیا ایک تیئیس سالہ عورت سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک ایسا مطالبہ حاصل کرنے کے لیے یوں چل کھڑی ہوگی۔ ہلڈا ذی ہوش ہے، وہ حسین ہے، ذہین ہے، بے حد معصوم ہے، لیکن ہر پہلو سے وہ اب تک بچہ ہے۔ اس کی عمر ضرور بڑھتی گئی، لیکن اس کے صنفی احساسات کا نشو و نما

ایک نقطہ پر پہنچ کر بند ہوگیا' وہ واقعہ جس نے تیرہ سال کی عمر میں ہلدا کے خرمن ہوش و حواس پر بجلی گرائی تھی وہ اب تک اس کے جذبات کا بلند ترین مرکز بنا ہوا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ Lysanger کا تجربہ ہلدا کے لیے ایک نہایت ہی اہم اور حواس برہم کُن تجربہ تھا جس کی وجہ سے اس کے جذبات کا نشو و نما ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا' اس کا ہوش' اس کی عقل اور اس کے حواس اُس کی قوت ارادی کے تابع ہیں' وہ اغلباً یہ جانتی ہے کہ Lysanger کے مینارے سے دنیا میں ہزاروں مینارے بلند تر ہوں گے؛ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ دنیا میں سیکڑوں معمار سولنس سے بڑھ بڑھ کر ہوں گے' لیکن اس کے علم کے یہ اجزا اس کے دل کی دنیا سے دور ہیں' وہ اپنے خوابوں میں مگن ہے' وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مسرور ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کی یہ دنیا درہم برہم ہوجائے' وہ اس لیے آئی ہے کہ سولنس کا کوئی اور کارنامہ دیکھے' تاکہ اس کا اعتقاد مستحکم ہوجائے' اور وہ پھر بے غل و غش اپنے خیالات کی دنیا میں آسودۂ راحت ہو —

ایک اور وجہ ہے جو ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ ہلدا کی صنفی زندگی اب تک نارسیدہ ہے۔ Lysanger کے تجربے کے وقت وہ تیرہ سال کی تھی' وہ اس وقت تک گو صنفی تحریکات سے باخبر ہو چلی تھی؛ لیکن ان تحریکات نے اس وقت تک پختگی حاصل نہ کی تھی' اس زمانے میں وہ بچپن سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ جس زمانے میں ان صنفی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس حالت میں لڑکی بالعموم جوش و خروش کو پسند کرتی ہے جن کی تکلیف میں بھی ایک خاص قسم کی لذت پنہاں ہوتی ہے۔ اس عمر کی لڑکیاں اور لڑکے ایسے افسانے بڑی رغبت

سے پڑھتی ھیں جن میں سنسنی پیدا کرنے والے واقعات موجود ہوتے ھیں۔ یہی حالت هلدا کی تھی۔ گو اس کی عمر بڑھتی جاتی ھے لیکن وہ بچہ ھی رھتی ھے، ایسا بچہ جس کے صنفی احساسات کی صرف اولین تحریک پیدا ھو چلی ھو، یہ عام قاعدہ ھے کہ جس زمانے میں یہ تحریکات پہلی مرتبہ پیدا ھوتی ھیں اس وقت لڑکی قتل و غارتگری، ظلم و تعدی، اور قطع و برید کے مظاھروں سے خاص لذت حاصل کرتی ھے، هلدا میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ھے، وہ قدم قدم پر ایسے مظاھروں کی جویاں نظر آتی ھے؛ جب سولنس اپنے مکان میں آگ لگنے کا قصہ بیان کرتا ھے اس وقت هلدا غیر مطمئن ھوکر بار بار یہ پوچھتی ھے "ھاں کہو کیا ھوا؟ کوئی جل کر مرا تو نہیں؟"

وہ جانتی ھے کہ سولنس دوران سر کا مریض ھے، مسز سولنس بار بار اس کی منتیں کرتی ھے کہ سولنس کو مینارے پر چڑھنے سے باز رکھا جاے، لیکن وہ ان تحریکات کی مطلق پروا نہیں کرتی، وہ ھر موقعہ پر سولنس کو مینارے پر چڑھنے کی پرزور ترغیب دیتی ھے، شاید وہ یہ بھی جانتی ھے کہ سولنس اس کی تاب نہ لا سکے گا، مگر وہ جوش و خروش کی عاشق ھے، اس لیے وہ سولنس کے جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔

یہاں ایک اور دلچسپ سوال پیدا ھوتا ھے، جس کا جواب دینا ضروری ھے، وہ یہ ھے کہ آخر هلدا کی تشریف آوری کس غرض سے ھوئی؟ اس کا مدعا کیا ھے؟ وہ کیا چاھتی ھے؟ اور وہ دس سال کی مدت کے بعد کیوں یکایک آ موجود ھوئی؟ بادی النظر میں اس کا جواب یہ ھے کہ وہ اپنی سلطنت کی آرزو مند ھے، وہ اپنی مملکت اور اپنے قلعے کی متلاشی ھے۔ مگر آخر یہ سلطنت کونسی سلطنت ھے؟ یہ قلعہ کونسا قلعہ ھے؟ اور وہ کس عنوان سے شہزادی بننا چاھتی ھے؟ اس کا جواب دینا اس لیے اور زیادہ مشکل ھو گیا ھے

کہ ھلڈا کی باتیں بالعموم بے جوڑ اور مبہم ہوتی ہیں ، وہ کوئی بات بر ملا نہیں کہتی ہے ' یہ ظاہر ہے کہ سلطنتیں بازار میں فروخت نہیں ہوتیں اور نہ ہر جگہہ قلعے تعمیر کئے جاسکتے ہیں ' علاوہ ازیں وہ ایسے قلعے کی آرزو مند ہے جو خود اس کی سلطنت میں واقع ہو ' اس کی یہ دلی آرزو ہے کہ سولنس میںارے پر چڑھے ' اس کے وجود کا ریشہ ریشہ اسی آرزو کی لرزش سے متحرک ہے - سولنس بلندی پر جا پہنچتا ہے ' ھلڈا کی روح وجد کرنے لگتی ہے ' اس کے بعد وہ گر کر پاش پاش ہو جاتا ہے ' مگر ھلڈا کی تیوری پر بل تک نہیں پڑتا - اس کے وجد کی کیفیت نے شاید اس کے سارے احساسات فنا کر دیے تھے - لوگ تو سولنس کی موت کا ماتم کرتے ہیں ' اور اس کے دشمن اس کی نا کامی پر خندہ زن ہوتے ہیں ' لیکن ھلڈا کے دل سے یہی صدا آتی ہے

"وہ سیدھا میںارے کی چوٹی پر چڑھ گیا اور میرے کانوں میں سرود و بربط کی آوازیں آ رہی تھیں جو ہوا میں بج رہی تھیں" پھر وہ اپنی شال ہوا میں گھماتی ہے اور ایک وحشیانہ وجد میں چلا کر کہتی ہے " میرا ' میرا میر معمار " —

تو کیا ھلڈا محض یہ نظارہ دیکھنے آئی تھی ؟ کیا یہی اس کی سلطنت ہے ؟ کیا یہی اس کا قلعہ ہے ؟ مگر ہمیں یہ فراموش کردینا نہیں چاہئے کہ اس کا ارادہ سولنس کے ہاں قیام کرنے کا تھا ' وہ کہتی ہے کہ گو میرے پاس نہ کپڑے ہیں ' نہ ٹرنک ہے اور نہ روپیہ لیکن میں قیام کرنے کی غرض سے آئی ہوں - اگر محض اس تماشے کا مشاہدہ مقصود ہوتا تو پھر قیام کرنے کی وجہ سمجھہ میں نہیں آتی - ھلڈا سولنس کی عاشق ہے ' الین کے رویہ اور فرض شناسی سے وہ دل برداشتہ ہے ' اس لیے ہمیں

هلدا کے دلی مقصد کو کہیں اور تلاش کرنا چاهییے۔ کمرے میں داخل هونے کے چلد هی منٹ بعد وہ کہتی هے کہ اب کے آ کی ملازمت ختم هونے آئی لیکن جوں هی سولنس اسے ٹک کیپر بننے کا اشارہ کرتا هے وہ نفرت کے ساتھہ اس تجویز کو ٹھکرا دیتی هے' اور کہتی هے :

"یہاں اور بہت سے کام کرنے کے قابل هیں"

سولنس خاموش هو جاتا هے' اس کے بعد گفتگو جاری رهتی هے' جس کے دوران میں وہ کہتا هے' اچھا هوا تم آ گئیں' میں تم سے باتیں کر کے اپنا بوجھہ کم کرسکوں گا' مگر اس کا بھی وہ یہی جواب دیتی هے :

"جب تم نے یہ کہا تھا کہ تمھیں میری ضرورت هے تو کیا اس سے تمھارا صرف یہی مقصد تھا" —

صاف معلوم هوتا هے کہ هلدا کی آرزو کی پرواز بلند تر هے' وہ چھوٹی موٹی باتوں سے مطمئن نہیں هوتی' وہ زمین پر رینگنے والے کیڑے کی زندگی کو ناپسند کرتی هے' وہ هوا کے کُرے سے بلند هوکر ایتھر کی فضا میں پرواز کرنا چاهتی هے' وہ اگر محض سولنس سے قربت چاهتی تو کے آکی جگھہ کام کرنے کے لیے تیار هو جاتی' لیکن نہ وہ صرف قربت چاهتی هے اور نہ محض محبت سے سیر هو سکتی هے' وہ سولنس کی شخصیت کے هر پہلو کو اپنے قبضۂ قدرت میں لانا چاهتی هے' وہ اس کے لیے الہام کا سر چشمہ بننا چاهتی هے' وہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنے حسن کی طلعت ریزی پیوست کرنا چاهتی هے' وہ یہ چاهتی هے کہ وہ دیوی بنے اور سولنس اس کا پجاری هو۔ اور اسی کا کلمہ پڑھے۔ یہ اس کی سلطنت هے اور سولنس کا دل اس کا قلعہ۔ جس پر وہ جلد سے جلد تصرف حاصل کرنا چاهتی هے' دس سال تک اس نے سولنس

کی پوجا کی، اب اس کا غرور نسوانی اس کا متقاضی ہے کہ اس کی پوجا کی جاے - وہ دیوانی بن چکی، اب سولنس کو وہ اپنا دیوانہ بنانا چاہتی ہے - ہلدا کے جارحانہ حملے اس لحاظ سے سرا سر نسوانی ہیں، وہ حملہ کرتی ہے، غریب سولنس تھوڑے سے مقابلے کے بعد ہتیار ڈال دیتا ہے، غرور نسوانی کے لیے یہ امر باعث صد مسرت ہے —

مذکورۂ بالا ڈرامے کے بعد ہم ابسن کی آخری تصنیف کی جانب متوجہ ہوتے ہیں - اس کی ہر تصنیف پر تنقید کرنا مشکل ہے - تصانیف کا سلسلہ طولانی ہے، اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ صرف ممتاز ڈراموں کو اس تذکرہ میں شامل کیا جاے - ہم نے ابسن کو دو حیثیتوں میں پیش کیا ہے، ایک فلسفی کی حیثیت سے اور ایک آرٹسٹ (حسن کار) کی حیثیت سے، آرٹ کی خوبی ڈراموں کی ساخت سے وابستہ ہے، اور اس کا فلسفہ اس کے خیالات کی جان ہے جو اس کی تصانیف میں کثرت سے موجود ہیں —

ابسن کا نیا ڈراما عموماً دو سال بعد شایع ہوتا تھا، صرف ایک صورت میں یہ قاعدہ ٹوٹا، (Ghosts) پر جو ہر طرف سے سخت لے دے ہوئی تھی اس سے متاثر ہو کر ابسن نے (An Enemy of the People) صرف ایک ہی سال میں تیار کیا تھا، ورنہ (Pillars of Society) سے لے کر (Borkman) تک اس قاعدے کی پابندی ہوئی - ابسن آخری ڈرامے پر بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس کے اعزہ اور اس کے احباب اس کی محنت شاقہ دیکھ کر اس کی ضعیف العمری کا خیال کرتے ہوے متردد ہو چلے تھے، ابسن نے اس ڈرامے کا نام (Epilogue) رکھا - ہمیں یقین ہے کہ ابسن جانتا تھا کہ اب اس کے چل چلاؤ کا وقت ہے، اور یہ اُس کی آخری تصنیف ہے - اس لیے وہ جان توڑ کوشش کر کے اپنے دماغ کی ساری

قوتیں اس پر صرف کرتا ہے۔ اس کا حوصلہ اب تک بلند ہے ' وہ اس ڈرامے کے خاتمے پر کہتا ہے:

" اس کے بعد اگر مجھے پھر میدان میں آنے کا موقعہ ملا "
" تو میں نئے زرہ بکتر اور نئے ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں آؤں گا"۔
لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی —

یہ ڈراما در اصل ابسن کی جام شراب کا تلچھٹ ہے ' اس لیے باوجود اس کے کہ اس میں جا بجا آرٹ کی خامیاں ' اور واقعات کا عدم تسلسل موجود ہے پھر بھی اس میں مئے دو آتشہ کا مزہ پایا جاتا ہے ' ابسن کی روح کا یہ آخری پر تو اور اس کے فلسفے کی یہ آخری جھلک ہے۔ اس ڈرامے میں اس نے اپنی زندگی پر ایک نہایت دلچسپ ریویو کیا ہے ' جس میں ضمناً اس کے خیالات پر بھی بحث آجاتی ہے —

ڈرامے کا ہیرو پروفیسر روبک ہے ' وہ ایک سن رسیدہ سنگ تراش ہے ' اس حیثیت سے وہ دور دور مشہور ہو چکا ہے - ناموری کے ساتھ ساتھ اس نے غیر معمولی دولت بھی حاصل کی ہے ' اپنی بیوی Maia کے ساتھ وہ ایک ہوٹل میں مقیم ہے ' اس وقت دونوں میاں بیوی ہوٹل کے باغ میں فوارے کے قریب کرسیوں پر بیٹھے سے نوشی سے شغل کررہے ہیں۔ بیوی ایک خوبصورت سفری لباس پہنے ہوے ہے ' اور فضا کی خاموشی سے پریشان معلوم ہوتی ہے ' وہ کہتی ہے کہ یہاں کا شور و غل بھی مردہ اور بے حس ہے - پروفیسر بھی کچھ زیادہ بشاش نہیں ہے —

Maia شوہر سے جلد چل دینے پر اصرار کرتی ہے ' حالانکہ بیوی ہی کے اصرار پر اس نے شمال کا سفر کیا تھا - بیوی اس کا اقرار کرتی ہے اور کہتی ہے ' مجھے کیا خبر تھی کہ اس قلیل مدت میں ہمارے وطن کی

هر شے اس قدر تبدیل هوجاے گی - پروفیسر اپنے گور کی وسعت اور دل کشی کی تعریف کرتے هوے کهتا هے که تم اب زیادہ بهتر سوسائٹی میں نقل و حرکت کرسکتی تهیں ' پهر بهی تم متردد معلوم هوتی هو ' اس کا خیال هے که Maia کی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا هو چکا هے گو وہ اس کا بهی اقرار کرتا هے که وطن کے لوگ بهی تبدیل هوگئے هیں ' وہ اپنے وطن کے فضا کی سرد مہری اور استیشنوں کی تاریکی اور بے حسی کی جانب اپنی بیوی کی توجه مبذول کراتا هوا کهتا هے ' کل بندرگاہ میں جہاز آجائے گا ' اس میں سوار هوکر هم ساحل کے سفر کے لیے روانه هو جائیں گے اور قطب شمالی کے سمندر تک جائیں گے - Maia کهتی هے که تم اپنے وطن کے لوگوں کو نه دیکهه سکوگے حالانکه تم نے اسی خیال سے یه سفر کیا تها ' پروفیسر اس کا یه جواب دیتا هے : " میں انهیں بہت کچهه دیکهه چکا هوں " —

اس کے بعد پروفیسر کو یه بتایا جاتا هے که وہ ایک مدت کے آرام کے بغیر باد پیمائی کرتا رهتا هے ' اُسے کهیں سکون نهیں ملتا ' نه وطن میں ملتا هے نه پردیس میں ' وہ بنی نوع انسان سے متنفر هوگیا هے ' اسے اپنے کام میں بهی دلچسپی باقی نه رهی ' وہ شب و روز سخت محنت کرنے کا عادی تها ' یه عادت بهی جاتی رهی ' مگر اس کے شاهکار کی تکمیل کے بعد اس میں یه تغیر پیدا هوا ' جس نے اُسے نه صرف بین اقوامی شہرت دی بلکه بے شمار دولت بهی عنایت کی - پروفیسر کهتا هے بے شک وہ میرا شاهکار تها ' Maia کهتی هے ' بے شک دنیا یه تسلیم کرتی هے : جس کے جواب میں روبک یه معنی خیز الفاظ کهتا هے : " دنیا کچهه نهیں جانتی اور نه کچهه سمجهتی هے " - اور استدلال کرتا هے : " دنیا کے لیے جان کهپانے کا

یہ نتیجہ ہے " —

Maia گفتگو کا پہلو بدلتے ہوے کہتی ہے : کیا تمہارے لیے یہ زیبا ہے کہ تم کبھی کبھار ایک نیم قد تصویر بنا کر خاموش ہو جایا کرو - پروفیسر جواب دیتا ہے کہ میں صرف اسی قسم کی تصویریں ہی نہیں بناتا بلکہ ان تصویروں کی تہ میں وہ اسرار ہیں جنھیں لوگ نہیں سمجھہ سکتے - وہ صرف شباہت دیکھہ کر خوش اور حیران ہو جاتے ہیں لیکن تہ کے اسرار تک ان کی رسائی نہیں —

چنانچہ ان دو رخی مجسموں سے امرا از حد مانوس ہیں ' اور ان کو خریدنے کے لیے بے شمار زر و جواہر خرچ کرتے ہیں - بیوی اپنے شوہر کو شراب پیش کرتے ہوے شاداں و فرحاں ہونے کی ترغیب دیتی ہے ' اور اس کے بعد پروفیسر کو اس کا ایک قدیم وعدہ یاد دلاتی ہے - " تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ایک بلند پہاڑ پر لے جاؤگے اور مجھے دنیا کی عظمت و شان کا نظارہ کراؤگے اور وہ عظمت و شان پھر میری ہو جاے گی " —

پروفیسر کہتا ہے کہ یہ تو ایک قسم کی تشبیہ تھی - اس کے علاوہ تم در اصل پہاڑوں پر چڑھنے کے قابل نہیں ہو —

اس کے بعد باتھہ کا انسپکٹر آ موجود ہوتا ہے - معمولی علیک سلیک کے بعد وہ پروفیسر اور Maia کے مزاج کی کیفیت دریافت کرتا ہے ' پروفیسر اس سے کہتا ہے کہ رات کی تاریکی میں کوئی شخص پارک میں چہل قدمی کرنے کا عادی ہے - یہ سن کر انسپکٹر حیرت زدہ ہو جاتا ہے - اسی دوران میں ایک لاغر اندام خاتون سفید ریشمی لباس میں ایک خیراتی راہبہ کے ساتھہ آتی ہے پروفیسر کا خیال ہے کہ اس نے اسی خاتون کو شب کی تاریکی میں دیکھا تھا ' وہ کسی اور ملک کی باشندہ ہے ' لیکن وہ ناروے

کی زبان بے تکلفی سے بولتی ہے ' اس کا لہجہ شمالی ہے' اس کے بعد ہی انسپکٹر چلے جانے کی اجازت طلب کرتا ہے' اور جانا ہی چاہتا تھا کہ الفہیم فاسق شکاری کی آواز کی گرج اس کے کان میں پہنچتی ہے' انسپکٹر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے - الفہیم شکاری لباس میں ہے اور اس کا ملازم دو شکاری کتے لیے ہوے ہے۔ اس کا قد بلند ہے ' اس کی آواز میں گرج ہے ' انسپکٹر کو ڈانٹنے کے بعد وہ نیم وحشیانہ لہجے میں اپنے نوکر کو کتوں کی خوراک کے متعلق ہدایات کرتے ہوے چلے کا جانے حکم دیتا ہے - نوکر چلا جاتا ہے - اس کے بعد وہ اپنے کھانے کے متعلق انسپکٹر کو ہدایت کرتا ہے - انسپکٹر چلا جاتا ہے - پروفیسر روبک اور الفہیم ایک دوسرے سے واقف تھے مگر بہت مدت کے بعد ملے ہیں ' دونوں میں باتیں شروع ہو جاتی ہوں ' Maia اس سے باتیں کرنے لگتی ہے اور پوچھتی ہے کہ تم ریچھ کے شکار کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو —

الفہیم اس کا نہایت معقول جواب دیتا ہے ' کہ میں اور تمہارا شوہر دونوں سخت مادوں سے جد و جہد کرتے ہیں - وہ سنگ مر مر کے کُندوں سے اور میں ریچھوں کی قوت سے - ہم دونوں اپنے حریفوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور جب تک غالب نہیں آ جاتے اپنی جد و جہد ترک نہیں کرتے —

الفہیم کہتا ہے کہ میں اب بلند پہاڑوں کے جنگلوں میں پھر شکار کے لیے جارہا ہوں ' وہ پروفیسر اور اس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہے' شکاری کی نظر خیراتی راہبہ پر پڑتی ہے' وہ علیل اور ناتواں لوگوں کا مذاق اڑانے لگتا ہے ' وہ اپنے دوستوں (کتوں) کو ان کے علیل ہوتے ہی گولی سے مار دیتا ہے ' راہبہ ایک قاب میں روٹی اور دودھ لاتی ہے اور سامنے والی میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے ' شکاری اس غذا کا مذاق اڑاتے ہوے اپنے کتوں کی خوراک کا ذکر کرتا ہے ' اور Maia کو ان کے کھانے

کا نظارہ دکھانے اپنے ساتھہ لے جاتا ہے - ایک خاتون باہر آتی ہے' اور دودھ پینا چاہتی ہے کہ اس کی نظر روبک پر پڑتی ہے' روبک اس کی جانب بڑھتا ہے - دونوں ایک دوسرے کو پہچان جاتے ہیں - خاتون اس بات سے متعجب ہے کہ روبک اب تک زندہ ہے' وہ اس کی بیوی کے متعلق سوال کرتے ہوے کہتی ہے کہ ہمارا بچہ نہایت خوش حال ہے' بہت ناموری حاصل کر چکا ہے' اس کی ہردلعزیزی نے اس کے باپ کو بھی مشہور کر دیا ہے - روبک کہتا ہے کہ میں تمہارا بہت ممنون احسان ہوں - Irene (اس خاتون کا نام) کہتی ہے' کاش میں تم سے جدا ہوتے وقت اس بچہ کو مار ڈالتی' اسے خاک میں ملادیتی ! روبک اس کے قریب جاتا ہے اور نرم آواز میں دریافت کرتا ہے کہ اس قدر مدت کے بعد اب تو بتاؤ کہ تم مجھہ سے کیوں جدا ہوگئیں' تم کیوں یکایک غائب ہوگئیں کیا کوئی اور شخص تھا جو تمہارے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا - Irene کہتی ہے' ایک ہی شخص دنیا میں ایسا تھا جسے نہ میری زندگی عزیز تھی نہ میری محبت -

روبک : مگر تم کہاں رہیں ؟ میں نے بہت تلاش کی' تمہارا کہیں پتا نہ لگا -

ارین : میں تاریکی میں روپوش ہوگئی تھی —

روبک : کیا تم نے دنیا میں بہت سفر کیا ؟

ارین : ہاں' میں بہت سے ملکوں میں پھری -

روبک : تم نے کیا کیا -

ارین : ایک منٹ ٹھیرو' دیکھو' اب میں بیان کرتی ہوں' میں نے تماشوں میں حصہ لیا' میں زندہ تصویروں میں برہنہ مجسمے کے لیے بیٹھی - بے شمار دولت حاصل کی' تمہارے ساتھہ رہ کر میں اتنا نہ کر سکتی تھی' اس کے بعد میں نے ہر قسم کے انسانوں کو فریفتہ اور

مفتوں کیا ' تمہارے ساتھہ رہ کر یہ کہاں ہو سکتا تھا —

روبک : کیا اس کے بعد تم نے شادی کر لی ؟

ارین : ہاں ' میں نے اُن میں سے ایک کے ساتھہ شادی کرلی ۔

روبک : تمہارا شوہر کون ہے ؟

ارین : وہ جنوبی امریکہ کا باشندہ تھا ۔ ایک ممتاز سفیر ' میں نے اسے بھی دیوانہ بنایا ' بالکل دیوانہ ۔ وہ بڑا پر لطف کام تھا ۔ میں دل ہی دل میں خوب ہنستی رہتی تھی ۔ کاش میرے پاس دل ہوتا —

روبک : اب وہ کہاں ہے ؟

ارین : کسی نہ کسی قبرستان میں ' اس پر ایک اچھی یادگار نصب کی ہے ' اب بھی اس کی کھوپری میں ایک گولی ٹکرا رہی ہوگی —

روبک : کیا اس نے خود کشی کی ؟

ارین : ہاں وہ اتنا اچھا تھا کہ اس نے میرے ہاتھوں کو تکلیف نہ دی ۔

روبک : کیا تم اس کی موت کا ماتم کرتی ہو ۔

ارین : ماتم ؟ ' موت ؟

روبک : کیوں ' مسٹر فان سیٹو کی موت !

ارین : اس کا نام سیٹو (Satow) نہیں تھا ۔

روبک : کیا یہ نام نہ تھا ؟

ارین : میرے دوسرے شوہر کا نام سیٹو ہے ' وہ روسی ہے ۔

روبک : اور وہ کہاں ہے ؟

ارین : دور ' بہت دور ۔ یورال پہاڑوں میں ' اپنی سونے کی کانوں میں ۔

روبک : تو وہ وہاں مقیم ہے ۔

ارین : مقیم ؟ مقیم ؟ میں نے اسے کبھی کا مار بھی ڈالا ۔

روبک : مار ڈالا ؟

ارین : میں نے ایک نفیس آبدار خنجر سے اس کا کام تمام کر ڈالا ۔ یہ خنجر میں ہمیشہ اپنے بستر میں رکھتی ہوں ۔

روبک : مجھے تمہاری باتوں کا یقین نہیں ۔

ارین : تمہیں یقین کرنا چاہیے ۔

روبک : کیا تمہارے کبھی کوئی بچہ نہیں ہوا ؟

ارین : میرے بہت سے بچے ہوے ۔

روبک : اب تمہارے بچے کہاں ہیں ؟

ارین : میں نے اُنہیں بھی مار ڈالا ۔

روبک : تم جو کچھہ کہتی ہو اس میں کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے —

ارین : میں اس کا کیا علاج کروں ، میں جو کچھہ کہتی ہوں وہ میں نہیں کہتی ۔ مجھہ سے کہلوایا جاتا ہے —

روبک : مجھے یقین ہے کہ میں ہی تنہا ایسا شخص ہوں جو تمہارے معنے سمجھہ سکتا ہوں —

ارین : بیشک تم ہی ایک ایسے ہو —

روبک : تمہاری فطرت کے بعض سلسلے شکستہ معلوم ہوتے ہیں —

پروفیسر اُسے یقین دلاتا ہے کہ وہ مردہ نہیں ہے بلکہ زندہ ہے ، وہ بھی محسوس کرتی ہے کہ موت کے خواب سے بیدار ہورہی ہے ، وہ اپنی موت کا روبک کو ملزم قرار دیتی ہے ، دونوں گذشتہ واقعات کے متعلق باتیں کرنا شروع کردیتے ہیں ، ارین روبک کے ساتھہ دنیا کے کنارے تک جانے کے لیے تیار ہے ، وہ روبک کے آرٹ کا نمونہ (Model) بڑی خوشی سے بنی ؛ اُس

نے اپنی روح شباب کی پوری قوت کے ساتھہ روبک کی خدمت کی' هفتوں ارین کا بے نقاب شباب روبک کے پیش نظر رہا' لیکن اُس نے اس کے جسم کو کبھی هاتھہ نہ لگایا' کیوں کہ وہ آرٹسٹ تھا' وہ اپنی زندگی کے کارنامے کی تکمیل کے لیے بیتاب تھا' اس شاهکار کا نام روز حشر رکھا گیا' جس میں ایک نوجوان عورت موت کے خواب سے بیدار ہوتی ہوئی دکھائی دیتی هے - یہ ان دونوں کا اکلوتا بچہ تھا —

روبک ارین کو ایک متبرک شے تصور کرتا تھا' گو وہ خود بھی اس زمانے میں جوان تھا' لیکن اس کا یہ یقین تھا کہ اگر اُس نے ارین کو مس کیا یا خواهشات کی بو اس کے وجود شعری سے مس هوئی تو خود روبک کی روح گندی هو جاے گی' اور وہ اپنے کام کو انجام نہ دے سکے گا جس کی تکمیل سب سے مقدم هے —

اس مجسمے کی تکمیل کے بعد روبک نے کوئی اور شاهکار نہ بنایا' ارین اس کی بیوی کا حال دریافت کرتی هے' وہ خاموش رہنے کا اشارہ کرتا هے —

ارین اُسے پہاڑوں کی بلندی پر لے جانے اور اپنے ساتھہ رہنے کا مشورہ دیتی هے - اسی دوران میں Maia داخل هوتی هے' اور اپنے شوهر سے کہتی هے کہ میں تمہارے ساتھہ ساحلی سفر پر نہیں جاسکتی' میں پہاڑوں اور جنگلوں میں جانے کی آرزومند هوں - شکاری کی باتوں نے Maia پر جادو کا کام کیا' اس کے قصے کسی قدر بھدے' نفرت انگیز اور جھوٹ تھے' لیکن ان کی دلکشی میں کسی کو کلام نہ تھا' روبک خود پہاڑوں پر جانے کا ارادہ کرچکا تھا' اس کی بیوی یہ سن کر خوش هوجاتی هے' Maia یہ خوش خبری شکاری کے پاس لے جاتی هے' روبک اور ارین بھی پہاڑوں پر جانے کا تہیہ

کرتے ہیں، ارین کہتی ہے کہ جب سے میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اپنی جوان اور زندہ روح تمہاری نذر کرکے خود بے روح ہوگئی تب سے میں تمہاری متلاشی تھی، راہبہ دروازہ کھولتی ہے اور پہلا ایکٹ ختم ہوجاتا ہے —

دوسرے ایکٹ میں ابسن کے فلسفے کی جھلک بہت نمایاں ہے، اور چونکہ یہ اس کی آخری تصنیف ہے اس لیے ہمیں اس کے خیالات کی پوری تشریح کرنا ضروری ہے، روبک اور اس کی بیوی ایک پہاڑی مقام میں مقیم ہیں، دور تک پہاڑی علاقہ چلا گیا ہے؛ جھیل کے پیچھے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں، بائیں جانب پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ ہے۔ میاں بیوی میں باتیں ہورہی ہیں، روبک کرسی پر بیٹھا ہے، Maia قریب گھاس پر لیٹی ہے؛ وہ شکاری کے ساتھ دوسرے دن بھیڑیوں کے شکار کو جانے والی ہے، بچوں کی چیخ پکار کی آوازیں آرہی ہیں جن کو سن کر Maia پریشان ہو جاتی ہے، ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے روبک یہ کہتا ہے کہ اس میں بھی کبھی کبھی موسیقی کا لطف پیدا ہوجاتا ہے، روبک ہمہ تن آرٹسٹ ہے لیکن بقول اس کی بیوی کے وہ بھی اب بیدا ہوچلا ہے، اس کی آنکھوں میں ماندگی اور تھکن کی جھلک نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے خلاف کوئی سازش کررہا ہے۔ روبک کہتا ہے، اچھا بتاؤ میرا اس پہاڑی علاقے میں آنے کا مدعا کیا ہے، Maia زرد رو لیڈی (اُرین) کی طرف اشارہ کرتی ہے، روبک کہتا ہے کہ عرصہ ہوا میں نے اُسے فراموش کر دیا تھا، دونوں خانگی شکر رنجی کا ذکر کرتے ہیں، Maia کہتی ہے —

" تم سوسائٹی پسند انسان نہیں ہو، تم اپنے ہی تک محدود رہنا چاہتے ہو، تم اپنے ہی خیالات پر غور و فکر کرنا چاہتے ہو،

بیشک میں تمھارے معاملات کے متعلق تم سے اچھی طرح گفتگو نہیں کرسکتی ' میں آرٹ سے بالکل واقف نہیں ہوں ' نہ اس قسم کی اور باتوں سے اور نہ میں ان کی کچھہ پروا کرتی ہوں '' -

روبک کہتا ہے کہ " اسی وجہ سے ہم لوگ آتش دان کے پاس بیٹھہ کر فضول باتوں میں وقت صرف کرتے ہیں - میری بے چینی کا یہی سبب ہے- میں اب اس فضول زندگی کا متحمل نہیں ہوسکتا " —

Maia اس قسم کی باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے ' وہ کہتی ہے کہ اگر تمھارا مدعا یہ ہے کہ میں چلی جاؤں تو میں اس کے لیے بھی بالکل آمادہ ہوں ' مگر روبک کہتا ہے کہ گو ہم دونوں ساتھہ نہیں رہ سکتے پھر بھی اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہم جدا ہو جائیں ' وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا حقیقی ساتھی ہو ' جو اس کی کم زوریوں کو دور کرسکے ' اور جو اس کی کوششوں میں اس کا ہاتھہ بٹائے —

روبک یہ خوب جانتا ہے کہ (Maia) یہ خدمت انجام نہیں دے سکتی- (Maia) کے خیال میں روبک " زرہ رو خاتون " کے فکر میں غلطاں ہے ' وہ پھر اپنی داستان یوں سنانا شروع کرتا ہے ' " روز حشر " کے شایع ہوتے ہی مجھے وافر دولت اور شہرت حاصل ہوگئی- آخر کار میں تعریف و توصیف سے اس قدر گھبرا گیا کہ میں نے جنگل میں فرار ہو جانے کا ارادہ کر لیا تھا ؛ اس کے بعد میں نے نیم مجسمے بنانا شروع کئے ' مگر یہ بات ہمیشہ میرے دماغ میں موجود رہی کہ آرٹسٹ کے مشن کے متعلق جو جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ کھوکھلی ' بے معنی اور لغو ہیں- آرٹ سے بدرجہا زیادہ اہم شے حیات انسانی ہے • روبک پھر اپنی زندگی کی کیفیت کے متعلق بحث شروع کرتے

ہوے کہتا ہے کہ میں سست قدم ' خاموش زندگی سے حظ حاصل نہیں کرسکتا۔ آرٹسٹ چند ہی سال میں ساری عمر کا لطف صرف کردیتا ہے - روبک کی شخصیت چونکہ ایک ہیجان میں سے گذر کر نئی بیداری پیدا کر رہی تھی اس لیے وہ کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہتے رہتے بالکل بیزار ہو گیا ہوں ۔ مگر اس میں تمہارا قصور نہیں —

(Maia) جدا ہونے کے لیے رضا مند ہے لیکن روبک ایک راز افشا کرتا ہے ' وہ اپنے سینے کی جانب اشارہ کر کے کہتا ہے کہ اس میں ایک مقفل ڈبا موجود ہے جس میں میرے آرٹ کے سارے تصورات محفوظ ہیں ' اس زرد رو خاتون کے پاس اس کی کنجی ہے ' ڈبے کے اندر جو سامان ہے وہ میں اب تک بروئے کار نہ لاسکا ' سال گذرتے چلے جاتے ہیں ' اس خزانے کو کھولنے کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں - (Maia) کہتی ہے کہ خاتون یہاں موجود ہے اس سے کنجی لے کر ڈبا کھول لو - وہ اس خاتون کو اپنے گھر میں رکھنے کے لیے تیار ہے ' شکر رنجی کی صورت میں وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کے لیے بھی آمادہ ہے - اس اثنا میں ارین دور سے نظر آتی ہے ' اس کو دیکھتے ہی بچے آ کر گھیر لیتے ہیں وہ ان کو ہوٹل میں بھیج دیتی ہے ' اور خود چشمے کے کنارے کھڑی ہوجاتی ہے ' Maia چل کھڑی ہوتی ہے اور ارین سے کہہ جاتی ہے کہ روبک اس کا منتظر ہے ' روبک بھی آ جاتا ہے ' وہ چشمہ کے ایک کنارے پر ہے ' ارین دوسرے کنارے پر - ارین کہتی ہے کہ وہ ایک طویل خواب میں محو تھی جس کا اثر اب تک اس کی آنکھوں میں موجود ہے ' روبک کا خیال ہے کہ دن کی روشنی نمودار ہو گی اور ان کی تاریکی دور کردے گی ۔ اس کے بعد روبک اور ارین میں ایک طویل مکالمہ شروع ہوتا ہے ' جس

کے شروع میں وہ روبک پر تحقیر اور غصے کی نگاہیں ڈالتی ہوئی کہتی
ہے کہ میں آرٹسٹ سے سخت نفرت کرتی ہوں —

بات چیت جاری رہتی ہے ' اس مجسمے کو ارین بار بار اپنا بچہ کہتی ہے۔
روبک کہتا ہے کہ میں نے اس میں ذرا-سی تبدیلی کردی ہے ' اس مجسمے
کے ارد گرد مجھے دنیا کا وہ حصہ شامل کرنا پڑا جو مجھے نظر آتا تھا۔
جس کی وجہ سے مجسمہ کی چوکی وسیع کرنی پڑی۔ اس پر زمین کا ایک
قطعہ نصب کیا گیا جس پر مردوں اور عورتوں کی دھندلی صورتیں نظر
آتی ہیں۔ مجسمے کی آنکھوں کی مسرت کو بھی ذرا ہلکا کردیا گیا '
خود مجسمے کو ذرا پیچھے ہٹا دیا گیا تاکہ پس منظر کا کام دے۔ وہ کہتا ہے
کہ انسانوں کے اس گروہ میں میں خود موجود ہوں ' ایک ایسے مجرم
انسان کی صورت میں جو اپنے آپ کو دنیا سے آزاد نہیں کرسکتا یہ شخص
بیٹھا ہوا بہتے ہوے چشمے میں اپنی انگلیاں ڈبوتا ہے تاکہ ان کو آلائش
سے پاک کرلے ' لیکن یہ یقین اس کا دل پارہ پارہ کرتا رہتا ہے کہ
ایسا کبھی نہ ہوگا ' ابد تک وہ آزادی حاصل نہ کرسکے گا ' ہمیشہ وہ اپنی
دوزخ میں مقید رہے گا۔ یہ سن کر ارین کہتی ہے کہ تمہارا رویہ شاعرانہ
ہے ' کیونکہ تم کاہل اور کمزور طبع ہو ' خیال اور عمل میں تم سے جو
گناہ سر زد ہوتے ہیں انہیں معاف کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہو ' تم نے
میری روح کو ذبح کیا ' اس لیے تم نے اپنی پشیمانی ' خود الزام دہی اور
ریاضت کا مجسمہ بنایا ' اور (ہنستے ہوے) اب یہ خیال کرتے ہو کہ
تمہارا حساب بے باق ہوگیا ' اس کا جواب روبک یہ دیتا ہے

" ارین ' میں ایک آرٹسٹ ہوں ' وہ کمزوریاں جو مجھ میں
موجود ہیں اُن سے میں ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ

میں پیدائشی آرٹسٹ ہوں، میں کچھ ہی کروں اس کے خلاف
نہیں ہو سکتا "۔

ارین : آرنلڈ! تم شاعر ہو، تم ایک پیارے، بڑے متوسط عمر کے بچے ہو۔
کیا تم اسے سمجھتے،

روبک : تم مجھے بار بار شاعر کیوں کہتی ہو؟

ارین : میرے دوست! اس لفظ میں کچھ معذرت آمیز بہانہ مخفی ہے،
کوئی ایسی شے ہے جو گناہوں کی معافی کی جانب اشارہ کرتی ہے،
اور کمزوریوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ (یکایک لہجہ بدلتے ہوئے) مگر
میں تو اس زمانے میں ذی حیات انسان تھی، مجھے بھی ایک زندگی
بسر کرنی اور ایک انسانی قسمت کی تکمیل کرنی تھی، دیکھو، میں
نے یہ سب کچھ تج دیا کہ تمھاری غلام بن سکوں (دھیمی آواز میں)
اس گناہ کا کفارہ میں کبھی ادا نہ کرسکوں گی۔

... ...

ارین : (ظاہری ضبط کے ساتھ) مجھے دنیا میں بچے پیدا کرنے چاہئیے تھے، بہت
سے بچے، اصلی بچے، ایسے بچے نہیں جو قبروں کی چھتوں میں پوشیدہ
رکھے جاتے ہیں، مجھے تمہاری (شاعر کی) کبھی اطاعت گذاری نہیں
کرنی چاہیے تھی۔

اس کے بعد ارین گلاب کے پھول کی پنکھڑیاں توڑ کر چشمے میں ڈال
دیتی ہے؛ اور اُنھیں سمندری پرندوں سے تشبیہ دیتی ہے۔ روبک کو پرانے
واقعات یاد آجاتے ہیں جب وہ مجسمہ تیار کر رہا تھا اور تعطیل کے دن
یہ دونوں چشمے کی روانی کا لطف اُٹھاتے تھے۔ اس زمانے میں ارین کنول
کے پھول کی پنکھڑیاں چشمے میں ڈالتی تھی، اور ان کو ہنس سے تشبیہ
دے کر مزے لیتی تھی۔ گفتگو جاری رہتی ہے، ارین وہ زمانہ یاد کرتی

ھے جب وہ ٹانٹز کی جھیل کے کنارہ پر رھتے تھے —

ارین : ٹانٹز کی جھیل پر زندگی حسین ' بہت حسین تھی —

روبک مگر ارین پھر بھی —

ارین پھر بھی ھم دونوں نے زندگی اور اس کے حسن کو ھاتھہ سے کھو دیا —

روبک اُسے اپنے گھر میں آ کر قیام کرنے کی دعوت دیتے ھوے التجا کرتا ھے کہ میرے دل کے خزانے کا قفل کھول دو کہ میں پھر اپنی زندگی سے وھی لطف حاصل کرسکوں مگر ارین یہی کہتی ھے کہ یہ خالی خولی خواب ھے کیونکہ جو زندگی ھم تم بسر کر چکے ھیں وہ اب پھر نہیں آ سکتی۔

اس کے بعد الفہیم اور Maia شکاری لباس میں نظر آتے ھیں ' ان کے پیچھے نوکر کتے لیے ھوے ھے ' یہ لوگ شکار کو جا رھے ھیں ' Maia اپنے شوھر کو سلام کرتی ھے ' وہ اپنی آزادی کا اعلان کرتی ھوئی شکاری کے ھمراہ چلی جاتی ھے ۔ ارین پہاڑی کے نیچے جانے کا قصد کرتی ھے ۔ روبک کے کانوں میں Maia کے گیت کی آواز آتی رھتی ھے ' الفہیم اور Maia پہاڑوں کے جنگلوں میں گشت لگاتے ھیں ' اسی اثنا میں پہاڑوں کی بلندی پر طوفان کے کالے کالے بادل نمودار ھونے لگتے ھیں ' منظر بہت بھیانک اور خطرناک ھوتا جاتا ھے ' شکاری روبک کی بیوی Maia کو اپنی پناہ میں لے کر چلتا ھوتا ھے ' روبک اور ارین تنہا رہ جاتے ھیں ' ارین پر خوف طاری ھوتا ھے —

روبک اس کی ھمت بڑھاتا ھوا اس کی پاسبانی کا وعدہ کرتا ھے ' ارین کہتی ھے کہ خود میرے پاس ایک خنجر موجود ھے جس کو میں کبھی جدا نہیں کرتی ' بلکہ جب گذشتہ باب میں روبک نے ارین کے

افسانۂ محبت کو محض ایک قصہ تصور کیا تھا۔ اس وقت خود مہ پارہ ارین اس کا سرتن سے جدا کرنے والی تھی، لیکن پھر رک گئی۔ اس کے بعد ان دونوں میں آخری مکالمہ شروع ہوتا ہے جس کا ترجمہ ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں :—

روبک : تم نے پھر اپنا ہاتھ کیوں روک لیا، (قتل کرنے سے)۔

ارین : مجھے معاً یہ خیال آگیا کہ تم تو پہلے ہی عرصہ ہوا مرچکے ہو۔

روبک : مرچکا ہوں ؟

ارین : مردہ، بالکل ایسے ہی مردہ جیسی میں ہوں، ٹانٹز کی جھیل پر ہم دونوں سرد مٹی کے پتلوں کی طرح بیٹھتے تھے، اور ایک دوسرے سے کھیلتے تھے۔

روبک : میں اسے موت نہیں سمجھتا، لیکن تم مجھے نہ سمجھوگی۔

ارین : تب وہ جھلسا دینے والی خواہش کہاں ہے جس کے خلاف تم اس قدر جنگ کرتے تھے جب میں تمہارے سامنے مردوں میں سے بیدار شدہ عورت کی طرح آزادی کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔

روبک : یقیناً ہماری محبت مردہ نہیں ہوئی ہے۔

ارین : وہ محبت جو اس زمین کی زندگی سے وابستہ ہے، حسین اعجاز نما حیات، ناقابل فہم حیات، جو ہم دونوں میں مردہ ہوچکی ہے۔

روبک : کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہی محبت آج کل میرے خاک شدہ دل کو پامال کر رہی ہے۔

ارین : اور میں، تمہیں معلوم ہے کہ میں اب کیا ہوں ؟

روبک : تم کچھ بھی ہو، مجھے اس کی پروا نہیں، میرے لیے تم وہ عورت ہو جس کے میں خواب دیکھتا ہوں۔

ارین : تمھارے بعد بارہا گھومنے والی میز پر کھڑے ہوکر سینکڑوں آدمیوں کو اپنی برھنگی کا نظارہ دکھا چکی ہوں -

روبک : یہ میں تھا ' جس نے تمھیں اس طرف ہانکا - میں اس وقت اندھا تھا - میں جو مردہ مٹی کے پتلے کو مسرت حیات سے زیادہ وقیع تصور کرتا تھا - مسرت محبت سے بھی زیادہ -

ارین : اب وقت نکل گیا - وقت نکل گیا -

روبک : اس دوران میں جو کچھ بھی رو نما ہوا اُس نے بال برابر بھی تمھیں میری نگاہ میں کم نہیں کیا -

ارین : نہ خود میری نگاہ میں -

روبک : پھر کیا ہے ! تو ہم آزاد ہیں ' اور اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنی زندگی پھر باہم بسر کرسکیں -

ارین : آرنلڈ ' مجھہ میں زندگی کی آرزو مردہ ہوچکی ' اب میں اُٹھہ چکی ہوں ' میں تمھاری متلاشی ہوں ' میں نے تمھیں پالیا ' میں دیکھتی ہوں کہ تم اور زندگی دونوں مردہ پڑے ہو ' جیسے میں پڑی تھی -

روبک : تم سراسر غلط ہو ' ہم دونوں میں اور ہمارے ارد گرد زندگی کا چشمہ اُبل رہا ہے -

ارین : تمھارے " روز حشر " کی نوجوان دوشیزۂ حیات کو اپنے تابوت پر پڑا ہوا دیکھہ سکتی ہے -

روبک : تب دو مردوں ' یعنی ہم دونوں کو پھر حیات کے انتہائی نقطے تک جانے دو ' قبل اس کے کہ ہم اپنی اپنی قبروں میں جائیں -

ارین : (چیخ مار کر) آرنلڈ !

روبک : اس تاریکی میں نہیں ! اس جگہ نہیں - جہاں ایسی بدنما تاریکی

کی چادر پھیلی ہوئی ہے -

ارین : نہیں ' نہیں ' روشنی میں ' نہایت درخشاں فضا میں " قلۂ کامیابی" کی بلندی پر -

روبک : میری محبوب ارین ' وہاں ہماری شادی کی دعوت ہوگی —

ارین : آرنلڈ - سورج ہمیں آزادی سے دیکھ سکتا ہے -

روبک : روشنی کی ساری قوت ہمیں آزادی سے دیکھ سکتی ہے اور تاریکی کی ساری قوتیں بھی - میری دلہن کیا تم میرے ہمراہ چلو گی ؟

ارین : میرے آقا ' میرے مالک ' میں تمہارے ساتھ آزادی سے اور خوشی سے چلتی ہوں —

روبک : پہلے ہمیں اس گھر سے نکل جانا چاہیے —

ارین : ہاں ! گھر سے نکل چلنا چاہیے ' پھر اس مینارے کی بلندی پر پہنچنا چاہیے جو ضیاے سحر میں درخشاں ہوتا ہے - روبک اور ارین دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے برفانی میدان کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں - مگر نیچے جھکے ہوئے بادلوں میں جلد غائب ہوجاتے ہیں ' ہوا کے سخت جھونکے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے ہیں - راہبہ نمودار ہوتی ہے اور اِدھر اُدھر متلاشی نگاہیں ڈالتی ہے ' دور Maia کے گانے کی آواز کان میں آتی ہے - یکایک بلندی پر گرج کی آواز بلند ہوتی ہے ' روبک اور ارین برف کے تودوں میں دفن ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ' راہبہ چیخ مار کر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ارین کو آواز دیتی ہے اور خاموش کھڑی رہ جاتی ہے- (Maia) کا فتح مندانہ گیت اب تک سنائی دے رہا ہے-

ابسن نے اس ڈرامے میں آرٹ اور حیات انسانی کے تعلق پر

گہری روشنی ڈالی ہے، دراصل یہی موضوع اس (Epilogue) کی کنجی ہے، شاعر اسی مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنی کتاب حیات کے ابواب کھول کر دنیا کے سامنے پیش کر کے عبرت کا سبق دیتا ہے۔ وہ خود آرٹ کا ایک پجاری ہے، اُس نے اپنی ساری عمر آرٹ کی سیوا میں بسر کی، اب وہ خود اپنی زندگی کی ختم ہونے والی کتاب کے ابواب کھولتا ہے، اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کہاں تک کامیاب ہوا۔ وہ آرٹ کی اہمیت کو تولتا ہے، اس کے بعد وہ زندگی کی گرانباری کا اندازہ کرتا ہے، اور پھر یہ پتا لگاتا ہے کہ ان دونو میں کون زیادہ وزنی ہے۔ دنیا کا یہ نہایت اہم ترین مسئلہ ہے۔ بہت سے حکما اور فلسفیوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض حضرات آرٹ کی پرستش کو دنیاوی علائق سے بلند تر خیال کرتے ہیں، ایک آرٹسٹ اپنے دوست کے مکان کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ کر وجد میں آ جاتا ہے، جب آگ کی لپٹیں چھت کو گراتی اور دیواروں کو منہدم کر کے آسمان کی جانب بلند ہوتی ہیں اس وقت آرٹسٹ دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا دوست بے گھر ہو جاتا ہے، لیکن جب شاعری کا جذبہ انسان میں قوی ہوتا ہے اس وقت وہ اس دنیا میں ہوتا ہی نہیں کہ اس کے علائق کا اُسے احساس ہو۔ شاعر اپنی دھن میں محو ہے، اس کے عزیز کی موت کے بعد تجہیز و تکفین ہو جاتی ہے لیکن اسے اصلا خبر نہیں ہوتی۔ یہ تو آرٹ کی یا شاعری کی پوجا ہے، اس کے ساتھ ساتھ زندگی ہے، دنیاوی تعلقات ہیں، سورج کی روشنی ہے، چاند کی چاندنی ہے، جھلملاتے ہوئے تارے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کی پرستش بہتر ہے یا زندگی کی پوجا۔ ابسن آرٹ کی پوجا میں ساری عمر گنوانے کے بعد

اپنے دل سے یہ سوال کرتا ہے " ساری زندگی آرٹ کے نذر کر دینا کہاں تک درست ہے "۔

ارین اس کا جواب دیتی ہے :

جب ہم مردہ بیدار ہوتے ہیں تو اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ تلافی اور اصلاح ممکن نہیں اس وقت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کبھی زندہ تھے ہی نہیں —

ابسن دنیا کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میری زندگی ناکام تھی' میں نے عمر بھر شاعری کی ' مگر وہ خود زندگی سے دور رہا ؛ اب موت کے منہ میں پہنچتے وقت بیدار ہوتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھا - اس کی مثال برینڈ ہے وہ اپنے اصول پر قائم رہتا ہے' اپنے خیالات پر اڑا رہتاہے' نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے متعلقین تباہ ہو جاتے ہیں - برینڈ فلسفے کا بندہ ہے' سماجی زندگی کے اصول سے ناواقف ہے اس لیے تباہ ہوجاتا ہے ' روبک یا خود ابسن آرٹ کا بندہ ہے لیکن زندگی سے دور ہے' اس لیے وہ ناکام رہتا ہے —

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اس نکتے کی تشریح کردی جاے - دنیا میں سب سے اہم شے حیات انسانی ہے ' سارے آرٹ' سارے فنون' سائنس کی ساری شاخیں' فلسفے کے سارے نظریے' اور علم کے سارے شعبے اہمیت میں حیات انسانی سے کمتر ہیں' علم و حکمت اور علم و فن کی ساری کوششیں اسی نقطے پر متحد ہوتی ہیں ' ان کا منشا صرف ایک ہے ' وہ یہ کہ حیات انسانی کو خوش تر بنایا جاے - سب سے بہتر تصویر وہ ہے جو انسان کو سب سے زیادہ مسرت پہنچاے اور اس کے احساسات کا مکمل نشو و نما کر سکے ؛ سب سے بہتر عمارت وہ ہے جو انسان کو بھلی معلوم ہو اور جو اسے سب سے زیادہ آرام پہنچا سکے' سب سے اچھا راگ وہ

ہے جو ہمارے سب سے اچھے جذبات کو مرتعش کر سکے - اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو آرٹ حیات انسانی کی مفاد کو نظر میں نہیں رکھتا وہ بہت کمتر درجے کا آرٹ ہے ' ابسن ان لوگوں میں تھا جو فطرتاً شاعر یا آرٹسٹ ہیں ' موت کے قریب پہنچ کر وہ یہ غور کرتا ہے کہ میری زندگی ناکام ہوئی ' مگر یہ اس کی خام خیالی ہے ' وہ بالطبع اسی زندگی کا اہل ہو سکتا تھا ' وہ ایک مشن لے کر اس دنیا میں داخل ہوا اور اس نے اپنا پیام اپنے ڈراموں کے ذریعے سے عوام‌الناس تک پہنچایا —

ابسن کی زندگی گذر چکی ہے ' بہتر سے بہتر ڈرامے اس کے قلم سے نکلے اور دنیا میں شہرت دوامی حاصل کر چکے ہیں ' وہ جانتا ہے کہ وہ قبر کے کنارے تک آچکا ہے ' اب وہ اپنے کارناموں پر نظر ڈالتا ہے ' مگر اس کی روح بہت دلگیر ہے ' اس کا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے ' اور وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے مٹی کی مورتوں پر زندگی کی خوشی اور محبت کو قربان کر دیا - Irene اپنے شباب جمیل کے ساری دلکش رعنائیوں کے باوجود ہفتوں برہنہ ہو کر اس کے سامنے کھڑی رہی مگر روبک اس کے عشق کو ٹھکراتا رہا ' اس کے جمال جہاں آرا پر محض آرٹسٹ کی سی نگاہیں ڈالتا رہا جن میں عشق کی گرمی کے بجائے آرٹ کی سرد مہری موجود تھی ' اس کا یہ خیال تھا کہ اگر اس محبت میں نفسانیت کا شائبہ بھی ہوا تو اس کا مجسمہ خراب ہو جائے گا —

جب ہم ارین کی گفتگو سنتے ہیں تو ہم یقیناً روبک کے رویہ کو سخت ناپسند کرتے ہیں - وہ ایک بے حس ' مردہ دل ' بے کیف آرٹسٹ ہے ' ارین کا چکا چوند کرنے والا حسن اس پر کارگر نہیں ہوتا ' اس کا جادو روبک کے دل پر مطلق نہیں چلتا - یہ ضرور ہے کہ روبک اپنی اور ارین

کی محبت اور " مسرت حیات " کو برباد کر دیتا ہے ؛ مگر وہ ایک ایسا شاہکار بنا جاتا ہے جو صدیوں تک آنے والی نسلوں کی زندگی کو مسرور اور پر کیف بنا دیتا ہے - ہم نے یہ مانا کہ خود روبک کی زندگی رائگاں گئی اور اس کے جذبات کی دنیا ہمیشہ تاریک رہی ' لیکن اگر اِس قربانی کے بعد اتنا بڑا کام عوام‌الناس کے مستقل مفاد کے لیے کیا جا سکے تو کیا یہ قربانی جائز نہیں ۔ جو شخص ایسے ایسے اور بے نظیر مفید ڈرامے لکھہ جاے اُسے اپنی زندگی کو ناکام نہیں کہنا چاہیے - مگر یہ یاد رہے کہ سب سے زیادہ نقصان Irene کو پہنچا ہے ' روبک نے شہرت و دولت حاصل کی ' اور اپنا پیام بنی نوع انسان تک پہنچا کر خلعت دوام پائی ' دنیا والے خوش ہیں کہ ان کو ایک شاہ کار ہاتھہ آیا ' انؐ تک خدا کا پیغام پہنچا - مگر ارین کو کیا ملا ' اس کی مثال بانسری کے سی ہے ' گانے والا دنیا میں مشہور ہو کر تان سین کا ہمسر ہو جاتا ہے ' جو اس کی موسیقی سنتا ہے ' سر دھنتا ہے ' مگر غریب نے کو کیا حاصل ہوا ؟ یہی حالت ارین کی ہے —

ابسن کی موت قریب ہے ' وہ اپنی تصانیف پر ایک گہری ناقدانہ نظر ڈالتا ہوا ان کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرتا ہے ' اُسے نا اُمیدی اور مایوسی گھیرے ہوے ہے ' وہ فوارے کے قریب بیٹھا ہے ' اس کا سر پشیمانی کی وجہ سے جھکا ہوا ہے ' اس کے بشرے پر رنج و الم کے گہرے آثار پاے جاتے ہیں ' وہ چشمے میں اپنی انگلیاں دھوتا ہے - وہ انگلیاں جن سے اُس نے یہ ڈرامے لکھے۔ انگلیوں پر دھبے پڑے ہوے ہیں ' وہ ان دھبوں کو دھو ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کی کوشش ناکام ہوتی ہے ' اس کی نگاہوں کے سامنے گہری تاریکی مستولی ہو جاتی ہے ' وہ اپنی زندگی کی ناکامی پر غور

کرتے کرتے دیوانہ ہو جاتا ہے - اس کی ناکامی کے تین پہلو ہیں ' اولاً وہ کہتا ہے کہ اس کا ضمیر علیل ہے اور گناہ کا بوجھ اسے دبائے ڈالتا ہے ' اس کے بعد اس نے تخئیل کو چھوڑ کر حقیقت کی جانب پیش قدمی کی - اس کے خیال میں آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ کجروی تھی - یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس پیش قدمی کو کجروی کیوں کہا جاتا ہے ' حقیقت نگاری بذات خود مصوری اور شاعری دونوں میں انتہا درجے کا کمال ہے ' یہ ضرور ہے کہ تخیل کی دنیا حقیقت کی دنیا سے زیادہ رنگین ' زیادہ شاداب ' زیادہ سر سبز' اور زیادہ شاداں ہوتی ہے - مگر اصل مصوری حقیقت نگاری کا دوسرا نام ہے - علاوہ ازیں ابسن آئیڈیل کی وہ بلندی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس پر وہ خود نہیں پہنچ سکتا ' وہ ہمیں مداہنت سے جنگ کرنا سکھاتا ہے لیکن خود اس کمزوری کا شکار ہوتا ہے ' پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابسن تخئیلی آرٹ کو حقیقت نگاری پر کیوں ترجیح دیتا ہے - اگر تصانیف کی ہر دلعزیزی اور ان کا مفید ہونا ان کی خوبصورتی کا کوئی معیار ہو سکتا ہے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ " برینڈ " " گڑیا کا گھر " کے مقابلے میں نہایت ہی بے حقیقت شے ہے - گو ہم یہ جانتے ہیں کہ کتاب کا ہر دلعزیز اور مفید ہونا اس کے آرٹ کے حسن کی دلیل نہیں ہو سکتی - اس کے علاوہ ابسن اپنی زندگی کے رویہ سے سخت دل برداشتہ ہے ' وہ سوچتا ہے کہ اگر میں اپنی قوتیں بجائے آرٹ کی سیوا میں صرف کرنے کے " لطف زندگی " میں صرف کرتا تو بدرجہا بہتر ہوتا - ہمیں ابسن کے اس خیال سے بھی اختلاف ہے - آخر الذکر صورت میں وہ خود خوش اور مسرور ہو سکتا تھا ' لیکن دنیا پر اس کی ذات کا کیا اثر ہوتا - دنیا اسی طرح گمراہ رہتی - فطرت کا پیام بنی نوع انسان

تک نه پہنچتا - ابسن قربانی کرتا هے اور اس کا فیض دنیا کے اکثر ملکوں میں جاری و ساری هو جاتا هے ' کیا اس کامیابی کا احساس ابسن کو مسرور بنانے کے لیے کافی نہیں ؟ —

روبک نے ارین کو یه لالچ دے کر اپنی طرف کھینچا تھا که میں تمھیں پہاڑوں کی بلندی پر لے جاؤں گا جہاں پہنچ کر تم دنیا کی ساری شان و شوکت دیکھ سکو گی - ارین اس سے شکایت کرتی هے که نه تم مجھے پہاڑوں کی بلندی پر لے گئے ' اور نه وہ شان و شوکت مجھے ملی جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا - روبک اس کا جواب دیتا هے که میری یه گفتگو ایک قسم کا استعارہ تھا جو میں بچپن میں لڑکوں کو لبھانے کے لیے استعمال کرتا تھا - اس سے صاف ظاهر هوتا هے که اس کے آئیڈیل کی سعی میں بھی دو پہلو موجود هیں ' یعنے اس کا نصب العین اُسے بھی دھوکا دے سکتا هے ' اور دنیا کو بھی ؛ وہ خود یه محسوس کر رها هے که وہ تمام عمر ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا رها - مطالعۂ نفس نے اُسے یه ایک نہایت اندوهناک سبق دیا جس کی ابتدائی صورت یه تھی که یه جو کچھ میں نے کیا سب هیچ و پوچ هے —

ابسن نے اپنی زندگی میں تین پہلو بدلے - پہلے آئیڈیل کی تلاش برینڈ اور پیورگنٹ سے کی ' جو ارین کے مجسمے کی صورت میں موجود هے ' پھر اس نے معمولی انسانوں کے اخلاق و عادات ' ان کے خوف ' ان کی امیدوں سے معاشرتی ڈرامے لکھے ! ان انسانوں کی صورتیں مجسمے کے ارد گرد موجود هیں ؛ آخر میں اُس نے خود اپنے نفس کی تحلیل کی ' اس لیے مجسمے کے قریب وہ خود سرنگوں موجود هے - اب آخر عمر میں ان کوششوں کا نتیجه یه هوا که اس کے خیالات میں انتشار اور پراگندگی پیدا هونے لگی ؛

خود اس کا فلسفہ اُسے اس لیے ناقص نظر آنے لگا کہ وہ اس کو کسی مرتب صورت میں پیش نہ کر سکتا تھا ۔ ایک طرف آئیڈیل کی تلاش ہے؛ دوسری طرف سوشل خرابیوں کو دور کرنے کا عزم ہے، تیسری طرف خود اپنے نفس کو بے نقاب کرنا مقصود ہے، اس خلط مبحث میں ترتیب کا رشتہ ابسن کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ۔ چونکہ دماغ کمزور اور قویٰ ضعیف ہو چکے تھے اس لیے وہ اس فلسفے کو مرتب نہ کر سکا، اگر دو چار سال اور ابسن کی صحت قائم رہتی تو بہت ممکن ہے کہ اُس کے فلسفہ کے اجزائے پریشان کسی مرتب صورت میں نظر آنے لگتے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم ابسن کے پیام کو تلاش کرنا بھی چاہیں تب بھی ہمیں ناکامی ہوگی، ابسن کے دل و دماغ پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو وہ من و عن اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دیتا ہے، اس کے دماغ پر جو جو پرتو پڑتے گئے، اس کے دماغ پر جو جو حالتیں طاری ہوئیں وہ بجنسہ اس کی تصانیف میں موجود ہیں، اس لیے اس کے خیالات میں تسلسل کی توقع کرنا فضول ہے ۔ وہ خود اپنی اس کمزوری سے واقف ہے، لیکن وہ اس کمزوری کو حقیقت نگاری کا جز واعظم تصور کرتا ہے ۔ انسانی دماغ کا نشو و نما برابر جاری رہتا ہے، ہم آے دن اپنے زاویۂ نگاہ بدلتے رہتے ہیں، جو شے ہمیں آج اچھی معلوم ہوتی ہے کل ہم اس پر نفرین کرتے ہیں، آج جس شے سے دل برداشتہ ہیں کل اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں ۔ اس نظریہ کو ذہن میں رکھئے تو ابسن کا تضاد آپ کی سمجھہ میں آ جاے گا، بلند پایہ مصنفین کا قاعدہ ہے کہ کتاب ختم یا شائع ہوتے ہی خواہ وہ کتنا ہی اچھی کیوں نہ ہو کچھہ بے ربط، کچھہ بے محاورہ، اور کچھہ غلط معلوم ہونے لگتی ہے ۔ ابسن نہایت ہی ذکی الحس ہے، ذہنی ارتقا کے منازل جلد

جلد طے کرتا ہے ' آج ایک منزل پر ہے تو کل دوسری منزل پر نظر آتا ہے -

اس سلسلے میں دو باتیں کہنا ضروری ہیں ' میں اس جگہہ ان کا صرف حوالہ دوں گا ' ان پر بحث کرنا غیر ضروری ہے - ایک تو یہ ہے کہ روبک کی صورت میں خود ابسن جلوہ گر ہے ' گو ابسن کی زندگی میں نہ Maia تھی اور نہ Irene - گو ابسن نے اپنے فن سے روپیہ کبھی نہ کمایا نہ اس کے شاہکار شائع ہونے کے بعد اس کی تصانیف ختم ہو گئیں ' پھر بھی روبک ابسن سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ (Epilogue) خود ابسن کی کتاب حیات کا آخری باب معلوم ہوتا ہے - دوسری بات یہ ہے کہ واقعات اور ان کے بیان کرنے میں بڑی غلط فہمی معلوم ہوتی ہے ' روبک ایک جگہہ Maia سے کہتا ہے کہ میرے مکان میں تمہیں بہت اچھے لوگوں کی صحبت حاصل ہوتی ہے ' دوسری جگہہ کہتا ہے کہ ہم دونوں تنہا ہیں ... اس قسم کی چند خامیاں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابسن کا دماغ کمزور ہو چلا تھا ' اور اس کی ذہنی قوت زائل ہو رہی تھی - ابسن نے اپنے گذشتہ ڈراموں میں جب کبھی گذشتہ واقعات پر کوئی مکالمہ لکھا تو یقیناً اس مقام پر اپنا کمال دکھا دیا مگر یہ ڈراما مکالمے کی چمک دمک سے عاری ہے - اس کے بعد ہم (Irene) کے کردار پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر اس قصے کو ختم کرتے ہیں —

Maia اور Rubek دونوں کے خاکے دھندلے ہیں ' Maia ایک مستقل بچہ معلوم ہوتی ہے Rubek ایک نیم دیوانہ ' ختم شدہ ' بوڑھا آرٹسٹ ہے ' جس کے نہ صرف تصورات اور تخیلات کا خزانہ بلکہ جس کی ساری شخصیت ارین کے قبضۂ قدرت میں ایک کھلونا معلوم ہوتی ہے - ارین کی تصویر کے نقش و نگار اُبھرے ہیں ' اس کی آنکھوں میں ارادے کی چمک ہے ' اس

کی پیشانی پر تلخ کامی کی شکن ہے، اس کے اعضا میں جان ہے اور اس کی متوالی آنکھیں اب تک عشق اور الفت کے رس سے مخمور معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بر خلاف Maia ایک لاغر اندام، پست قامت، سادی، کم فہم لڑکی معلوم ہوتی ہے جس کو روبک کی "تشبیہہ" نے دام محبت میں گرفتار کردیا، اور جو الفہیم کے ساتھہ جا کر اپنی طفلانہ تحریکات سے کھیلنا چاہتی ہے۔ اس کے بر خلاف آہنی عزم رکھنے والی، بلند و بالا، زمانے کا سرد و گرم دیکھے ہوے ارین ہے جو گو چہل سالہ ہے مگر اب تک شان دلبری میں یکتاے روز گار معلوم ہوتی ہے۔ مجسمہ تیار ہو جانے کے بعد وہ دیوانہ وار چل کھڑی ہوتی ہے، رفتہ رفتہ اس کی دیوانگی زائل ہوتی جاتی ہے، مگر اس کے جذبات کی دنیا اب تک تاریک ہے۔ وہ روبک پر ہزار جان سے عاشق ہے، لیکن آرٹسٹ روبک سے وہ سخت متنفر ہے، اس کے علاوہ اس کو ماں بننے کی شدید آرزو ہے، وہ مجسمہ بنوانے کے لیے اس لیے اور دلدی تیار ہو جاتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ وہ مجسمہ ان دونوں کا مشترکہ بچہ ہوگا، وہ اس کے قدموں پر گری، اس نے اس کی پوجا کی، اس نے کس طرح اپنی روح کی نذر روبک کو پیش کی، اور کس طرح وہ ہلاک ہو گئی۔ روبک اُسے واپس بلاتا ہے، اور چاہتا ہے کہ وہ پھر واپس آ کر اس کے ساتھہ رہے اور اس کے آرٹ کو اُکسائے، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ وہ کہتی ہے، تم بھی مر چکے تمہارا آرٹ بھی مردہ ہوگیا۔

ابسن کو اپنے زمانے سے اُسی قدر نفرت تھی جس قدر کہ خود زمانے کو اُس سے، وہ دل کھول کر زمانے کو صلواتیں سناتا تھا، اسی طرح زمانے والے دل کھول کر اس کی تذلیل کرتے اور اس پر پھبتیاں کستے تھے۔ اُنیسویں صدی میں کسی شاعر پر اتنی بوچھاڑ نہیں ہوئی جس قدر

کہ ابسن پر ہوئی - اس کے سوشل ڈراموں کو دنیا نے بد مذاقی کا مظاہرہ سمجھا اور خود اسے ایک اوسط درجہ کا ڈرامہ نویس قرار دیا جو اپنے زعم باطل میں اخلاقی تلبیس کرنے پر آمادہ ہے - یورپ کے ہر تنقیدی مرکز سے ان ڈراموں کے خلاف ایک شدید صدائے احتجاج بلند ہوئی' حکومت کے ایوانوں' مذہب کے گرجاؤں' اور علم کے مندروں کے میناروں سے گالیوں کی ایسی شدید بارش ہوئی کہ ابسن کو مدت تک کہیں پناہ نہ مل سکی -

سقراط کے فلسفے پر جو اعتراض تھا وہی ابسن پر تھا کہ وہ نوجوانوں کے طبقے کو گمراہ کرتا ہے' لیکن رائے عامہ ایک شدید غلطی پر تھی' اُسی سقراط کے مردود فلسفے کو بڑے بڑے علما آنکھوں سے لگاتے ہیں' اسی طرح ابسن کے متعلق بھی دنیا کی رائے تبدیل ہوئی' اور ہمیں ماننا پڑا کہ وہ نیکو کاری کی قوت' اپنے فن کا اُستاد اور انسانی سیرت کا بڑا مصور ہے —

ابسن کے ڈراموں کی خصوصیات پر بحث کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی روئداد' اس کا آرٹ' اور اس کے اصول سب خود اُسی کے ایجاد کردہ ہیں - وہ یونان کے قدیم اصولوں پر کار بند نہیں ہوتا جو ارسطو نے ڈرامے کے لیے مقرر کیے تھے' نہ وہ خود اپنے زمانے کے اصولوں کی پروا کرتا ہے جو ارسطو کے اصولوں سے بہت کم مختلف تھے - وہ ڈرامے کی اقلیم میں ایک نئی راہ اور ایک نئے مذہب کا بانی ہے - سب سے پہلے وہ انسان کی شخصیت سے بحث کرتا ہے' فردیت اس کے خیالات کی کنجی ہے' وہ اخلاقی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے مگر ایک حد تک قسمت پرست معلوم ہوتا ہے' ساتھ ہی وہ انسان کو خود

مختار تصور کرتا ہے جو قوت ارادی سے متصف ہے۔ وہ اُس اختلاف کو اپنے ڈراموں کا مرکز بناتا ہے جو خواہش انسانی اور انسانی اوصاف میں اکثر رونما ہوتا ہے اور بنی نوع انسان کی بیشتر مسرتوں اور ناکامیوں کا موجب ہوتا ہے۔ اخلاقی ذمہ داری کو بعض اوقات نظر انداز کردیا جاتا ہے جس کے نتائج ابسن نے " Ghosts " میں قلم بند کئے ہیں، اسی ڈرامے میں والدین کے گناہوں سے بحث کی ہے، اور توارث کی چاشنی کے ذریعہ سے ڈرامہ کو سائنٹیفک بنا دیا ہے۔ بسا اوقات ابسن کی حقیقت نگاری دھوکے میں ڈال دیتی ہے کیونکہ اس کا اصلی مدعا مجاز کے نقاب میں جلوہ گر ہوتا ہے، اس کے ڈراموں کا موضوع وہی ہے جو بڑی سے بڑی ٹریجڈی میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کے بیان کرنے کا طریقہ انوکھا ہے۔ وہ اچھے، برے، پرانے، نئے اصولوں کو لیتا ہے، اور ایک ایک پر دیوانہ وار حملہ کرتا ہے، مگر کوئی حل پیش نہیں کرتا۔ اس کے ہیرو اکثر ذلیل و خوار، رسوا اور پامال ہوتے ہیں، پڑھنے والا اس قتل و غارتگری کو دیکھکر عش عش کرنے لگتا ہے، اصول کے چراغ گل کرتا چلا جاتا ہے، دنیا اندھیرے میں بد حواس ہو کر اُسے گالیاں دینے لگتی ہے —

وہ ایک سخت دل جراح ہے۔ وہ اوسط طبقے کے لوگوں کو لیتا ہے اور ان کی روح کے ریشے ریشے پر عمل جراحی شروع کرتا ہے، وہ لسانی یا بڑی بڑی تقریروں سے کام نہیں لیتا بلکہ باتوں ہی باتوں میں وہ روحوں کی قطع و برید شروع کردیتا ہے۔ وہ ایک بازی گر ہے، اس کے تھیلے میں بہت سی روحیں موجود ہیں، وہ آپ کو سامنے بٹھا کر ان پر نشتر کے وار کرنا شروع کرتا ہے۔ یہ حواس برهم کن تماشہ دیکھ کر آپ بے تاب ہوجاتے ہیں بالخصوص اس وجہ سے کہ یہ روحیں آپ ہی کی ہیں۔ جب Aristophanes

اپنے شکار کی کھال اُتارنا شروع کرتا ہے تو ساتھ ھی وہ ایک خوش آئند گیت گانے لگتا ھے، شکسپیر کے ڈرامے میں اچھے برے دونوں ہوتے ھیں، اور ان کے علاوہ وہ آسمانی موسیقی سے ھمیں مسرور کرتا رھتا ھے، مگر ابسن کے عمل جراحی کے دوران میں نہ مسرت کی چاشنی ھے، نہ راگ کی موسیقی ھے، اور نہ کوئی اور دل خوش کن مظاھرہ ھے، وہ اس پر تلا ھوا ھے کہ وہ ھماری کوتاہ خیالی، ناتواں بیمی اور ھماری فطری کمینہ پن کی حقیقت کو بے نقاب کرے۔ وہ ما بعد الطبیعات کا شیدائی نہیں نہ اس کے کردار خیالی ہوتے ھیں، وہ زندہ ذی حس انسانوں سے سروکار رکھتا ھے، اُس کے ڈرامے اُنھیں پسند نہیں آسکتے جو محض جذبات کی فراوانی، یا مسخرے پن کو پسند کرتے ھیں۔ وہ محض حقیقت نگار ھے، وہ ایک ایسا آئینہ خانہ آپ کے سامنے پیش کرتا ھے جس میں آپ اپنے خط و خال خوب دیکھہ سکتے ھیں، اس کا یہ کمال بنی نوع انسان پر ایک بڑا احسان ھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی طنز کا مالک ھے، وہ دنیا کو کھیل نہیں سمجھتا، وہ سنجیدگی، اخلاقیت، اور سرگرمیٔ عمل کا پرستار ھے، وہ ھر آئیڈیل کو صاف کرکے ھمارے سامنے پیش کرتا ھے، اور قدم قدم پر اپنے آرٹ کے کمال کو دکھاتا جاتا ھے —

اس کے ڈرامے رنگ و روغن، تکلف و تصنع، آرائش و زیبائش سے خالی ھیں۔ اس کے ڈراموں میں المناک پہلو بہت زیادہ نمایاں ہوتا ھے، انداز بیان صاف ہوتا ھے، عورتیں اور مرد اکثر بھدے، غیر مہذب اور دنیا سے جدا معلوم ہوتے ھیں، اس کے نئے نئے خیالات دقیانوسی روایات پرست انسانوں کے لیے پریشان کن ہوتے ھیں، قصے کا انجام اکثر غم آگین ہوتا ھے، اور روئداد کے ھر پہلو میں عورتیں ضرورت سے زیادہ اُبھرتی

ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ڈرامے کا ہر صفحہ خیالات سے لبریز ہوتا ہے، تھیٹر گاہ میں جانے کا مقصد نہ سوچنا ہوتا ہے اور نہ غور کرنا۔ بلکہ ہم اس لیے وہاں جاتے ہیں کہ تھوڑی بہت مسرت اور لطف حاصل ہو۔ مگر ابسن کے ڈرامے میں غور و فکر کرنا اشد ضروری ہے، وہاں نہ موسیقی کی لہریں ہیں اور نہ حسن کی فرحت بخش جلوہ طرازی، اس کی بجاے وہ تیزاب کے چند قطرے ہمارے دلوں اور ہمارے دماغ پر ڈالتا رہتا ہے، اور ہماری روحوں کی عریانی کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ابسن بناوٹ کا دشمن ہے، وہ مذہبی، سیاسی اور سوشل ہر قسم کے دھوکے سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اتنا گہرا حقیقت نگار نہیں جس قدر کہ وہ اشارے اور کنایہ سے کام لیتا ہے۔ اس کے اخلاق کا لب لباب یہ ہے کہ آدمی کو آزادی حاصل کرنے کے لیے خود آزاد ہونا چاہیے؛ چونکہ وہ دنیا سے نفرت کرتا ہے اس لیے اس کی تصانیف میں طنز کا پہلو بہت نمایاں ہے، جو بہت چبھتا ہوا اور بعض وقت بہت دلدوز ہوتا ہے۔ ابسن کے ڈرامے اس جگہ سے شروع ہوتے ہیں جہاں اوروں کے ڈراموں کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی سے محض ایک اہم واقعہ اخذ کرلیتا ہے اور اس کے بعد مباحثے کو طول دے کر پرانے خیالات کو پرکھتا ہے۔ ڈرامے میں مباحثہ کی ابتدا ابسن نے کی۔ جب نورا ہلمر سے کہتی ہے کہ آؤ ہم ذرا پہلی مرتبہ سنجیدگی سے باتیں کریں تب گویا یورپ کے لٹریچر میں سائنٹیفک ڈرامے کی بنیاد پڑی، وہ پرانی ادبی روایات پر عمل پیرا نہیں ہوتا، جس طریقے سے ناول نویسی میں فطرت نگاری کی تحریک پیدا ہوچکی ہے اسی طریقے سے ابسن نے ڈرامے کے نمونے دنیا کے سامنے پیش کر کے اس فن کو سائنس سے جا ملایا —

وہ علم النفس کا ماہر ہے، آرٹسٹ ہے اور شاعر ہے، اگر وہ آرٹسٹ نہ ہوتا تو ٹوالسٹائے کی طرح پند و نصائح کر تے کرتے فنا ہو جاتا۔ اس میں وہ ضبط موجود ہے جو آرٹسٹ کے لیے ناگزیر ہے (جس سے ٹوالسٹائے متصف نہ تھا)۔ وہ اچھی طرح غور کرتا ہے، پھر اپنے خیالات کو شاعری کا جامہ پہناتا ہے، وہ ناامید نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ ہم اس کے معاشرتی ڈراموں کے بعض افراد کی بداخلاقی دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں لیکن اس کے آخری آخری الفاظ یہ ہیں " Pax Vobiscum "۔ ابسن حساس بہت تھا، بہت جلد مشتعل ہو جاتا تھا۔ اگر کسی اخبار نے اس پر حملہ کیا تو وہ خیال کرنے لگتا تھا کہ میں بالکل برباد ہوگیا۔ ایک کتب فروش اس کی ایک تصنیف پر ڈاکہ مارنا چاہتا ہے یہ سنتے ہی وہ ناروے کی کل آبادی، حکومت، کلیسا، سیاست، ہر شے سے سخت ناراض ہو جاتا ہے اور اپنے وطن سے دائمی قطع تعلق کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ تو اس کی ذاتی کمزوری تھی، مگر اس کے باوجود وہ اس صحیح نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ آزادی کی جنگ میں سب سے اہم شے جنگ کا دائمی حوصلہ ہے۔ دوسرا اہم سبق جو اسے حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ اقلیت ہمیشہ راستی پر ہوتی ہے کیونکہ عوام‌الناس اعلیٰ ترین اور جدید ترین خیالات تک یکایک نہیں پہنچ سکتے، اس لیے سب سے کامیاب شخص وہ ہے جو مستقبل سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ خود انسان کی ذاتی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ ہم خود اپنی ذات سے اچھی طرح واقف ہو کر صداقت کو حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ صداقت خود ہم میں موجود ہے، وہ ایسی صداقت کا متلاشی نہیں جو تجریدی ہو بلکہ وہ ایسی صداقت کا جویاں ہے جو کار آمد اور مفید ہو اور جس کی مدد سے وہ اپنی حیات کا مقصد

پورا کرسکے ' اس مقصد پر بحیثیت آرٹسٹ وہ ہمیشہ عامل رہا ۔ وہ صداقت کے مشاہدے میں کامیاب ہے اور اس کے حصول کو محض قوت ارادی سے متعلق تصور کرتا ہے ۔ وہ تنگ نظر ہے مگر شدت سے اس امر کا قائل ہے ۔ اسی لیے وہ آرٹ کے اخلاقی پہلو کو سب سے زیادہ ضروری ' مفید ' اور کار آمد تصور کرتا ہے ۔ اس کے خیال میں "Brand" سراسر ایک حسن کا رانہ تصنیف ہے ' اس نے اگر کچھ خیالی قلعے منہدم کیے یا تعمیر کیے ابسن کو اس کی پروا نہیں ' وہ عالم وجود میں اس لیے آیا کہ ان حالات کو آرٹ کی ایک صورت میں نمایاں کرے " کیونکہ میری روح ان سے سیر ہو چکی تھی اور وہ میرے لیے بار تھے ۔ اس کے بعد وہ تصنیف میرے لیے بیکار ہوگئی "۔ ابسن کہتا ہے کہ میں درس دینا نہیں چاہتا ۔ میری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں انسانی کردار اور انسانی قسمتوں کے چربے اُتار جاوں ۔ اس کا اور نیتشے کا مدعا ایک ہی معلوم ہوتا ہے یعنی تکمیل شخصیت ؛ مگر دونوں میں اختلاف ہے ' ابسن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جب تک یہ تکمیل نہ ہوگی تب تک ہم بہترین کام دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے ' ابسن انسان کی شخصیت کو محبت ' قوت ارادی اور ذہن کا مرکب تصور کرتا ہے ۔ ذہن صداقت کی تلاش کر کے اسے اپنی گرفت میں لیتا ہے ' محبت اس صداقت کی اہمیت ' اور اس کے تعلقات کی جستجو کرتی ہے ' اور قوت ارادی اس کو عملی جامہ پہناتی ہے ۔ انسان کی مکمل شخصیت کے یہ تین ناگزیر اجزا ہیں ۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے برینڈ اور جولین پر نظر ڈالنا چاہیے ' برینڈ قوت ارادی کا مالک ہے ' لیکن وہ اس لیے ناکام ہوتا ہے کہ اس میں محبت کا عنصر بالکل نہیں ۔ جولین کی یہ کوشش ہے کہ وہ روح سے مراجعت کر کے مادہ پرست

بن جاے- یہ دونوں ابسن کے لیے نا کامی کے علم بردار ھیں کیونکہ ایک میں صرف پہلا جز ھے' دوسرے میں صرف دوسرا ؛ مگر ابسن محبت کی بنیادوں پر تیسری عمارت تعمیر کرنا چاھتا ھے —

ابسن اُس فرض پر بہت زیادہ زور دیتا ھے جو اس کی ذات سے متعلق ھے - خود اس کی زندگی اس کا سب سے اھم فرض تھا' وہ ایک آرٹسٹ تھا' چنانچہ اس کی تکمیل کو وہ جان سے زیادہ عزیز تصور کرتا ھے' اس لیے اس فرض کے ادا کرنے میں وہ ھمہ تن ھمیشہ مشغول رھا' اس نے اپنی ذات کو ھر غیر متعلق شے سے دور رکھا - چنانچہ اس نے اپنی خودی کی ھمیشہ سیوا کی' اور صرف اس شے سے تعلق رکھا جو اس کی ذات پر اثر انداز ھوسکتی تھی - اس کے باوجود وہ سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کا آرزو مند ھے' اور یہ بھی جانتا ھے کہ یہ ذمہ داری کس قدر گراں ھے - لیکن نیٹشے کی طرح وہ اس بوجھ کو اپنے سر سے اتار نہ سکا' وہ اتنا باھمت نہیں ھے جس قدر کہ نیٹشے' مگر اس کے دلائل و براھین اسی قدر استوار ھیں جس قدر کہ نیٹشے کے - اس نے خرد و دانائی سے حصۂ وافر پایا تھا اور شاید اسی لیے وہ اپنی تعلیم میں کامیاب نہ ھو سکا' وہ خود کہتا ھے کہ ھر ڈرامے یا نظم میں میں نے خود اپنی روحانی آزادی حاصل کرنے کی سعی کی ھے' کیونکہ میں خود ان گناھوں اور جرموں کا ذمہ دار ھوں جو سوسائٹی میں رائج ھیں - وہ اپنی ذات کو سوسائٹی سے جدا تصور نہیں کرتا' بلکہ اس کے جز کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری محسوس کرتا اور آزادی کا ساعی ھوتا ھے - وہ ایک جگہ کہتا ھے کہ دنیا میں سب سے زبردست انسان وہ ھے جو تنہا ھے ؛ مگر وہ خود تنہا نہیں - یہاں یہ بات ذھن میں رکھنا چاھئے کہ تنہائی سے مراد اس کی سیاسی فرقہ

بلاد ی کی اصلاح ہے' لوگ اس نکتے کو اس کی موت کے تیس برس بعد سمجھی ہیں۔ ابسن ماحول کے اثر سے بے خبر نہیں ہے' وہ کہتا ہے کہ خورده بیلی روح کو تنگ اور نیم مردہ کر دیتی ہے' شاید اسی لیے وہ ناروے سے بھاگ کر میونک' روم' تریستن میں ہمیشہ چکر لگاتا رہا۔ اب ابسن کے اس خیال سے گذشتہ خیال کی مطابقت کیجئے' اور دیکھئے کہ اس کی تلملائی کہاں تک کام آتی ہے' وہ روم میں زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے' وہاں کی فضا ابسن کی روح کی مقفل کھڑکیاں کھول دیتی ہے' مگر وہ وہاں زیادہ مدت تک قیام نہ کر سکا کیوں کہ روم کی فضا ناروے سے بہت بعید ہے' وہ میونک میں آکر دم لیتا ہے' جہاں وہ نسبتاً ناروے سے قریب ہوجاتا ہے' وہ بار بار اس امر پر زور دیتا ہے کہ ماحول کا تخیل پر بڑا اثر پڑتا ہے —

وہ کہتا ہے کہ "Peer Gynt" میں وطن سے دور رہ کر ہی لکھ سکتا تھا' کیوں کہ مجھے لکھتے وقت نتائج سے خائف نہیں ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ کتاب تصنیف نہ ہو سکتی تھی۔ اگر ذرا ہم اور غور کریں تو یہ بات روشن ہوجاے گی کہ ماحول نہ صرف اس کے دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ خود اس کی تصانیف کے نفس کو تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر وہ ناروے سے باہر قدم نہ نکالتا تو عمر بھر غزلیں لکھتا رہتا' اگر وہ جرمنی میں رہ کر وہاں کی جدید ترین تہذیب اور طرز معاشرت سے آشنا نہ ہوتا اُس کے سوشل ڈراموں سے دنیا ہمیشہ کے لیے محروم رہ جاتی' اور آخر عمر میں اگر وہ ناروے واپس نہ جاتا' اور وہاں کے تغیر پذیر حالات اور اُبھرتے ہوے نو جوانوں سے نہ ملتا تو اس کے آخری تین چار ڈرامے کبھی نہ لکھے جاتے —

ابسن کے ڈراموں سے جو خیالات اخذ کئے جاتے ہیں وہ اکثر متضاد ہوتے ہیں، اس سے ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ابسن مہمل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابسن کم و بیش پچاس سال تک برابر تصنیف کے شغل میں مصروف رہا، اس دوران میں ضرور ہے کہ اس کے خیالات بدلتے رہے ہوں گے چنانچہ یہی تبدیلی ہم اس کے کلام میں پاتے ہیں۔ وہ نہایت سچائی سے ہر حالت کو جو اس پر طاری ہوتی ہے ہمارے سامنے من و عن پیش کردیتا ہے۔ "گڑیا کا گھر" میں وہ جس امر کی تلقین کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی مخالفت وہ "بھوت پریت" میں کرتا ہے۔ "دشمن خلق" میں ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر فرد بجائے خود تنہا سب سے بہتر شے ہے، حالانکہ "بھوت پریت" میں یہ بات دکھائی ہے کہ آزادی کی حد ہونا چاہیے، جو آزادی حدود سے متجاوز کرجاتی ہے وہ مہلک ہوجاتی ہے۔ "جنگلی بط" میں ایک آئیڈیل پرست نو جوان اپنی خطرناک زبان سے ایک پوشیدہ صداقت کو بے نقاب کرتا ہے، اور ایک اچھے خاصے گھر کو برباد کرکے چھوڑتا ہے۔ " Romersholm میں پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھرنے کے خطرے کو واضح کیا ہے، " The Lady from the Sea " میں آزادیٔ عمل کو سراہا ہے حالانکہ Rebekka اسی آزادی کا شکار ہوکر فنا کا جام پیتی ہے۔ ہلدا بااختیار بننا چاہتی ہے، مگر یہی خبط ہلدا کی بدولت ایک خوش حال خاندان کی تباہی کا موجب ہوتا ہے، Borkman محبت کو روپے پیسے پر قربان کردیتا ہے، اور اپنی تباہ شدہ زندگی کے اختتام پر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس سے ایک ناقابل عفو گناہ سرزد ہوا کہ اس نے سیم و زر کی خاطر اپنی محبوبہ کی پاک محبت تباہ کی۔ آخری ڈرامے میں ابسن پھر پہاڑوں پر جاتا ہے جو

اس کے لیے آزادی کا نشان ہیں اور وہاں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ آرٹ سے زیادہ اہم محبت ہے' اور یہ کہ جس شے سے زندگی مقصود ہوتی ہے وہ صرف محبت ہی ہے۔ ابسن کے خیالات اور تعلیم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہم نے بیان کردیا۔ ابسن نے اپنی زندگی کا ہر پہلو اور ہر منزل ہمارے سامنے پیش کردی ہے' اُس نے تسلسل یا ربط پیدا کرنے کے لیے کوئی بات چھپائی نہیں' اس کے دماغ میں جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ بر ملا بیان کر جاتا ہے' اس کے عقائد میں جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ ہماری نظر کے سامنے موجود ہے' اس کے دماغ کا نشو و نما خود اس کی تصانیف سے ہویدا ہے' وہ حقیقت نگار ہے' جو حالت اس پر طاری ہوتی ہے یا جو نتائج وہ مرتب کرتا ہے وہ بلا کم و کاست ہمارے سامنے لے آتا ہے' جوں جوں ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے اور نئے تجربے ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں اسی قدر ہم خود تبدیل ہوتے جاتے ہیں' اس ناگزیر تبدیلی کی سب سے بہتر رام کہانی ابسن کے ڈراموں سے مرتب کی جا سکتی ہے —

ابسن نے محض اس خیال سے کہ کوئی اچھا موضوع ہاتھ آ گیا کبھی قلم نہیں اُٹھایا' اس نے جو کچھ لکھا وہ یا تو اس کے غور و فکر کا نتیجہ تھا یا ان تجربوں سے متعلق تھا جو خود اسے پیش آئے۔ اس کا ہمیشہ یہ مقصد رہا کہ وہ کردار کو آزادی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے چھوڑ دے' خود تماشائی بن جائے' اور جو کچھ دیکھے وہ بیان کر دے' فیصلہ اور رائے زنی آپ پر چھوڑ دے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ پڑھنے یا دیکھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا کرے کہ وہ درحقیقت اصلی زندگی کے ایک وقوع پذیر ہونے والے پہلو سے

روشناس ہو رہا ہے، پھر زندگی کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے، مگر وہ وہاں پہنچکر دم نہیں لیتا اور آگے بڑھتا ہے یہاں تک کہ اندھیرے میں جا پہنچتا ہے، مگر وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہتی ہے، کیونکہ آگے بڑھنا، حرکت کرنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ تنگ نظر، معدلت پسند، اور بے حد جوشیلا آرٹسٹ تھا جس نے برینڈ کی طرح خود اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنے احباب اور اپنے ملک کو آرٹ کی خاطر قربان کردیا، اور ان مذہبی آدمیوں میں جا ملا جن کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا وہ خود خاکہ اڑایا کرتا تھا۔ ابسن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ سوسائٹی کو آزاد کیا جائے، اس مقصد نے زندگی کی چپقلشوں کی صورت اختیار کی، اور یہ چپقلشیں ہمیشہ ڈرامے کی صورت میں رونما ہوئیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی تصانیف میں شستگی پیدا ہوتی جاتی ہے، تحریکات کا گورکھ دھندا گنجلک ہوتا جاتا ہے، خیالات میں گہرائی اور فراوانی بڑھتی جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ سطحی زندگی کے غیر اہم واقعات بلند تر ہوتے ہوے روح کی گہرائیوں کا پتہ دیتے ہیں، اور ڈرامے کے میدان میں ابسن کی تصانیف ایک نئی دنیا کا منظر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ ہر ڈرامے میں اختصار اور انتخاب اس کمال پر جا پہنچتا ہے کہ ہر فقرہ اور ہر سین تصنیف کی جان ہوجاتا ہے، ہر ڈراما اپنی جدا فضا رکھتا ہے، پھر بھی سب ایک ہی لڑی کے موتی معلوم ہوتے ہیں، اور آرٹ کی حسین لا فانی بنیاد پر قائم ہیں —

ابسن ذرا بھی خوشامدی نہیں، پہلے ڈراما نویس کو نین کی گولی پر شکر لپیٹ دیتے تھے مگر ابسن جب حملہ کرنا شروع کرتا ہے تو پے در پے

وار کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم ابسن کا ڈرامہ دیکھنے تماشہ گاہ میں جاتے ہیں تو ہماری حالت ایک خونی مجرم کی ہوتی ہے جو عدالت میں پیش کیا جا رہا ہو' ہم ہال میں داخل ہوتے ہیں اور ہمارے جرم کی رام کہانی ہمارے سامنے پیش کردی جاتی ہے' ہم اپنی رسوائی کا منظر دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں —

ابسن کے پاس کچھ نئے خیالات' نئی تحریکات' نئی باتیں ہیں جو وہ بیان کرنا چاہتا ہے' وہ ایک نئی آنے والی دنیا کی آہٹ پاتا ہے' اس کے استقبال کے لیے دنیا والوں کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر باب پر تنقید کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی خامیوں کا اسے علم ہوسکے' وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک مشن لے کر اس دنیا میں داخل ہوا ہے چنانچہ اس کی تبلیغ میں ساری عمر اور ساری قوتیں صرف کردیتا ہے۔ عرصے تک وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اپنا پیام کس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کرے۔ وہ تجربے پر تجربہ کرتا ہے' اور کسی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ شاعری زیادہ عرصے تک اس کا ساتھ نہیں دیتی اور اسے اپنے مقصد کے لیے کافی نہیں سمجھتا۔ ابسن میں آرٹ اور سائنس کا ایک مرکب موجود ہے' وہ دراصل سب سے زیادہ سائنٹیفک آرٹسٹ ہے' وہ شاعری کو خیر باد کہہ کر نثر پر اُتر آتا ہے' یہ طرز نگارش اس جیسے سائنس پرست کے لیے بے حد موزوں تھی۔ اُسے عرصۂ دراز کے بعد علم ہوا کہ اس کی زبان نظم نہیں ہو سکتی' وہ اپنی ذات' اپنی روح' اپنے دل کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے اور اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ نظم کی پابندیاں اس کے مدعا کی وضاحت میں رکاوٹ پیدا کریں گی —

ابسن اپنے ڈراموں میں طنز و ہجو سے بہت کام لیتا ہے۔ بریاند اور

پھر میں جا بجا یہ نظر آتا ہے - لیگ آف یوتھ میں بھی مصوری اور
ھجو کا مرکب موجود ہے ' سوسائٹی کے ستون میں حقیقت نگاری کا رنگ
نمایاں ہوتا جاتا ہے ' مگر اس ڈرامے کی طنز بہت معنی خیز ہے ' ملک
کا حامی اپنے کام میں مصروف ہے ' اور سوسائٹی کے خلاف ایک اور اتہام
پیش کرتا ہے ' وہ ایک فریب کو بے نقاب کرتا ہے ' سائنس کا پرستار
کہتا ہے ' دیکھو تمہاری سوسائٹی کے یہ ستون ہیں ' یہ ہتھیار ہیں جن سے
سوسائٹی تیار ہوتی ہے ' یہ تمہاری شادی ہے جسے تم کامیاب کہتے ہو
جس کا نتیجہ محض گڑیا کا گھر ہے ' یہ تمہارا واجب التعظیم خاندان ہے اور
یہ تمہارا اصول حیات ہے ' " اپنے ماں باپ کا ادب کرو " اور توارث کی
خفیف سی بھنک تمہارے کان میں یہ کہہ جاتی ہے - " بھوت پریت " یہ
فریب ہے ' فریب جو ادب و احترام کے پیچھے چھپا ہوا ہے ' فریب جو
شادی کے پیچھے پوشیدہ ہے ' وہ فریب جو دنیا کی جڑیں کھوکھلی کئے
ڈالتا ہے ' صداقت اس کا تعاقب ان خفیہ مقامات تک کرتی ہے جہاں وہ
پوشیدہ ہے - گناہوں کے خلاف کوئی وعظ نہیں کرتا ' وہ صرف ایک سائنٹیفک
اصول کو پیش کرتا ہے اور پھر نظریہ کے اثرات کا مطالعہ کرتا ہے ؛
چونکہ یہ نظریہ اسی قدر صحیح ہے جس قدر کہ خوفناک ہے ' اور اس کے
طریق عمل کی منطق بے عیب ہوتی ہے اس لیے ہم پر ایسی حالت طاری
ہوجاتی ہے جو موجودہ زمانے کا آرٹ آسانی سے پیدا نہیں کرسکتا -
ابسن کے تین درمیانی ڈرامے اس کے کمال کا بہترین نمونہ ہیں ' وہ اپنے
مناسب مصوری ' کردار ' مکالمے کی دلکشی اور خوبی کے اعتبار سے اپنی
آپ نظیر ہیں - لٹریچر میں اس سے اچھا سائنٹیفک کام کبھی نہیں ہوا -
ہر لفظ بجائے خود اپنے اندر مفہوم کا ایک دریا پنہاں رکھتا ہے ' اور

ڈرامے میں قطع برید کر کے روح کو یا بہ الفاظ دیگر حضرت انسان کی ذات کو برہنہ کردیا گیا ہے ۔ ڈرامے کے ظاہری آرٹ میں Sophocles کے بعد ابسن ہی کا رتبہ ہے —

ابسن کے کردار اس کے ڈراموں کی طرح تین قسم کے ہیں ' ایک تو اس کے پہلے ڈراموں میں پائے جاتے ہیں جو بیسویں صدی کی متمدن دنیا میں نہیں پائے جاتے ' مثلاً Emperor And Galilean کی فضا اور اس کے کردار اس زمانے میں نہیں مل سکتے ۔ دوسری قسم کے کردار ابسن کے سوشل ڈراموں میں پائے جاتے ہیں جو اس صدی کی دنیا کے ہر گوشہ میں آپ کو ملیں گے ' نورا ' ہلمر ' مسز الونگ ' کروسچیلنہ ' سے ہم آئے دن ملتے رہتے ہیں ' اور ہماری فضا ان کے اثرات سے سرشار ہے ۔ تیسری قسم کے کردار ابسن کے آخری ڈراموں میں پائے جاتے ہیں جیسے مسٹر سولنس ' مسز سولنس ' ہلڈا ' اربن ' روبک ' یہ اس دنیا کے افراد نہیں اس لیے انہیں یہاں تلاش کرنا بے سود ہوگا ۔ ان کا مسکن ہوائی قلعے ہیں اور وہیں ان کی جستجو کرنی چاہئے ' پھر بھی ابسن کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ اس نے ایسے کرداروں کا ایک نہایت دلکش مرقع تیار کیا ہے جن کو ہم پہچان سکتے ہیں اور جن سے ہم مانوس ہوکر ان کے جذبات اور خواہشات میں شریک ہوسکتے ہیں ' ان کی ذہنیت ' ان کے عادات و خصائل اور ان کی خصوصیات سے بہت جلد آشنا ہوکر ہم انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کرسکتے ہیں ۔ اس کی سب سے کامیاب مثال نورا ' ہلڈا ' مسز الونگ اور ہلمر ہیں ' " گڑیا کا گھر " کے آپ دو صفحے پڑھ لیجئے ' نورا کی ہیئت کذائی کا صحیح ترین نقشہ آپ کے دل میں جم جائے گا ' اس کے علاوہ ابسن کے کردار زمانۂ حال کے مطابق ہوتے ہیں ' وہ سراسر فطری ہیں اور ان سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوتی جو

ہماری نگاہ کے سامنے موجود نہ ہو، مگر اس کے ساتھ یہ باور کرنا ضروری ہے کہ ابسن کے ڈرامے ایسے عظیم‌الشان کردار سے عاری ہیں، جیسے سیزر، میکبتھ، لیر وغیرہ - کوئی ابسن کا انوکھے سے انوکھا کردار بہت زیادہ انوکھا نہیں ہوتا، اس کے سوشل ڈراموں میں ایک بڑی کیرکٹر ایسا موجود نہیں جو ہمارے ادراک پر بار ہو، یا جس سے ہم آئے دن نہ ملتے رہتے ہوں، اس کی ایک خاص وجہ ہے، شکسپیر اور یونانی ڈرامہ نویس بالعموم اپنی ہمہ گیری میں عالمگیر پائے جاتے ہیں، وہ شاہی خاندان، متوسط طبقہ، غربا کے جھونپڑوں، جہلا کے اکھاڑوں، علما کی خانقاہوں میں یکساں داخل ہوتے ہیں اور اپنے لیے ہر گوشے سے سواد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ڈراموں میں ایسے کردار درج کرتے ہیں جو سوسائٹی کے ہر طبقے کے حالات کی غمازی کرسکیں - ابسن اس کے خلاف دنیا کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے، ایک مختصر سے حلقے کو اپنی جولان گاہ بناتا ہے، اور اس کا گوشہ گوشہ چھان مارتا ہے؛ یہ حلقہ عرف عام میں سوسائٹی کے نام سے نامزد ہے - اس حلقے میں نہ تو بادشاہوں کا ذکر ہے، نہ ان میں علما کے علم و فضل کی ضیاباری ہے، اور نہ ان میں غربا اور جہلا کے غربت و جہالت کا پر تو نظر آتا ہے - ابسن کی خوردبین آنکھیں محض سوسائٹی کے حلقے میں حیرت انگیز جستجو کے ساتھ حرکت کرتی ہیں اور اس کا جائزہ لے کر اپنے مشاہدات دنیا کے سامنے پیش کردیتی ہیں - یہ مختصر، محدود موضوع سائنٹیفک مطالعہ کے لیے موزوں ہے، مگر اس میں شاعری اور تخیل کی بلند پروازی کا موقع نہیں - ابسن سوسائٹی کا کچا چٹھا دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، حسن کی نیرنگی، آنکھوں کا متوالاپن، زلفوں کی عنبر

باری ، جذبات کی فراوانی ، محبت کے ولولے ، رشک کی رنگ آمیزیاں ابسن کی نظر سے اوجھل ہیں - وہ ایک جراح کی حیثیت سے سوسائٹی کی رگ رگ کو چیرنا چاہتا ہے ، اس کے ڈرامے سراسر سوشل ہیں اس لیے ان کی فضا اور اس کا پس منظر دونوں ناقص ہوتے ہیں ؛ اگر اس کے ڈراموں سے ڈرامیٹک عنصر نکالدیا جاے تو وہ چند اہم موضوعات پر اچھے خاصے سوشل مقالے بن سکتے ہیں —

شاعری کا زیرو بم ترنم ریز ہوتا ہے ، ابسن کے ڈراموں میں بھی ایک خاص قسم کا مکمل زیرو بم موجود ہے مگر یہ زیرو بم مادی ہے ؛ اس لیے اس کا تعلق براہ راست نثر سے ہے ، شکسپیر کے ڈراموں کا زیرو بم موسیقی کا جادو بن کر خون میں حرکت پیدا کرتا ہے شکسپیر کے ڈرامے جب ہم دیکھتے یا پڑھتے ہیں تو ہم پر وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے ہمارا خون رگوں میں تیزی کے ساتھہ دوڑنے لگتا ہے ، اس کی زبان ، اس کی روئداد ، اس کے کردار ، اس کے حالات میں شاعری کی لہر موجزن ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی شکسپیر اب تک ہر دلعزیز ہے - یہ ضرور ہے کہ اس نے جو تحلیل نفسی اور خصائل انسانی کی تشریح ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ بذات خود دلکش ہے لیکن اس سے بدرجہا زیادہ دلکش شاعری کی وہ لہر ہے جو شکسپیر کے ڈراموں میں بدرجۂ اتم موجود ہے - ابسن کے ڈرامے اس کے بر خلاف ایک اقلیدس کا معمہ ایک عقدۂ لا ینحل ہوتا ہے ، جس کی وضاحت کے لیے ہمارے دماغ کو بہت تیزی کے ساتھہ کام کرنا پڑتا ہے - ان ڈراموں میں شاعری کے بجاے منطق ؛ جذبات کے بجاے دلائل ، اور تخیل کے بجاے براہین موجود ہوتے ہیں -ان کا تعلق سراسر دماغ سے ہے ، وہ جذبات میں بڑی ارتعاش پیدا کرتے ہیں لیکن یہ ارتعاش بہت جلد

اس معمے سے ٹکرا کر فنا ہو جاتا ہے جو ابسن کا ہر ڈراما ہمارے دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ واردات (Situation) کے تخلیق کرنے میں ابسن کے کوئی ہمسر نہیں، ابسن نے جو کردار اسٹیج پر پیش کئے ہیں ان سے زیادہ ذی حیات افراد پیدا کرنا محال معلوم ہوتا ہے۔ ابسن کی خواتین پیکار حیات میں مصروف جنگ ہیں اور آنے والی نسل کی خواتین بنا رہی ہیں، اس کی خواتین نے دنیا بدل دی، انھوں نے نہ صرف اپنی صنف کی اصلاح کی بلکہ دوسری صنف (یعنی ہلمرون) کو سمجھنے، سوچنے، غور کرنے اور محسوس کرنے کا درس دے کر انھیں ملک اور بنی نوع انسان کے لیے مفید بنایا ۔

ابسن کے لکھنے کی میز پر ایک گلاس میں ایک بچھو، ایک تھالی میں چند کھلونے رکھے رہتے تھے، ان کے بغیر ابسن اپنی تصانیف میں مشغول نہ ہوتا تھا، ممکن ہے کہ یہ کھلونے اس کے کردار کی صورت اختیار کر لیتے ہوں، بذاتہ خود یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے مگر اس سے ایک امر ضرور روشنی میں آ جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ابسن واردات سے زیادہ کردار کو اہم تصور کرتا ہے، وہ کیریکٹر کے خصائل اور خصوصیات کا پہلے اندازہ کرتا تھا، اس کے بعد وہ واردات کی جانب متوجہ ہوتا تھا جو ان مخصوص اشخاص کے لئے لابدی اور ناگزیر ہوتی تھی۔ بالعموم روئداد، اور واردات پہلے تیار کی جاتی ہے، اور بعدہ یہ لباس چند کٹ پتلیوں کو پہنا کر ڈراما مکمل کر دیا جاتا ہے۔ ابسن اپنے مسودے پر مہینوں کام کرتا رہتا تھا اور غیر معمولی محنت، غور و فکر، کاٹ چھانٹ کے بعد اسے تکمیل کو پہنچاتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ نفسی تحریکات کو عمیق بناتا، پوشیدہ اوصاف اور خصوصیات دریافت کرتا اور اس کے بعد وہ اپنے فرد ڈراما کو ایک

مستقل صورت دیتا۔ ابسن کی نفسیاتی نظر بہت اعلیٰ ہے، اس کا تیر نظر ان وادی میں ہمارے دلوں کی اور روحوں کی گہرائیوں میں پیوست ہوجاتا ہے، اور اس پردے کو چاک کر دیتا ہے جو ہمارے رازوں کے اظہار پر پڑا ہے —

ابسن ایک انقلاب کے لیے کوشاں ہے، مگر یہ انقلاب سیاسی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سلطنتیں، دول، مذاہب سب فنا ہو جائیں گے، انسان باقی رہ جائے گا۔ وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ سلطنت، دولت، مذہب، سیاست، علم و فن سے انسان اور اس کی زندگی کو بہتر بنانا چاہیے، ہاؤس آف پارلیمنٹ کی شان و شوکت، شاہ وقت کا محل بڑے بڑے تاریخی کلیسے اور کتب خانے یہ سب بیکار ہیں اگر یہ انسان کی حیات کو بہتر بنانے میں کام نہیں آسکتے۔ ابسن سلطنت سے ذرا بھی مانوس نہ تھا بلکہ ایک حد تک وہ اس کا مخالف نظر آتا ہے۔ وہ یہودیوں کی مثال دیتا ہے، جو دولت، علم و فضل، قومی بیداری، فیاضی میں اس قدر نیک نام ہیں گو وہ کہیں حکمراں نہیں۔ وہ ایک موقعہ پر کہتا ہے کہ " اب تک ہم محض روٹی کے ان ریزوں پر زندگی بسر کرتے رہے جو گذشتہ صدی کے انقلاب کے دستر خوان سے گرتے تھے، ان ریزوں میں سے غذائیت فنا ہو چکی تھی، پرانے الفاظ میں اب نئے معنی منتقل کرنے کی ضرورت ہے ... یہ وہ بات ہے جو سیاسی مدبر نہیں سمجھ سکتے اس لیے میں ان سے متنفر ہوں، وہ اپنے مخصوص ظاہری، سیاسی انقلاب کے آرزو مند ہیں، مگر یہ سب بے حقیقت ہے۔ سب سے زیادہ اہم انسان کی روح کا انقلاب ہے "۔ (Maximus) کی طرح ابسن تیسری سلطنت کا خواب دیکھتا تھا۔ وہ اپنے ملک کے لیے آزادی کا خواہش مند ہے لیکن وہ لبرل پارٹی کے پروگرام میں

شریک عمل ہونے کے لیے تیار نہیں، اس کی وجہ اس نے اپنے ایک خط میں بیان کی ہے۔ "لبرل لوگ آزادی کے سب سے بڑے دشمن ہیں، روح اور خیال کی آزادی "مطلق العنانی" کے دور دورے میں سب سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے، یہ فرانس میں واضح ہوا، اس کے بعد جرمنی میں اور اب ہم یہ بات روس میں دیکھہ رہے ہیں"۔ ابسن سیاسی فرقہ بندی کا سخت دشمن ہے، یہ خیالات اُس نے اپنے ڈراموں میں جا بجا درج کئے ہیں مثلاً ڈاکٹر استا کوین کی تنہائی اور صداقت کا ہم اندازہ کرچکے، اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کے بقول ابسن اکثریت کبھی صحیح رائے پر قائم نہیں رہتی، وہ امارت کی پرستار ہے، لیکن امارت نہ خاندان چاہتی ہے اور نہ دولت بلکہ قوت ارادی، اور کیریکٹر کی خواہاں ہے —

ہم شکسپیر، والٹیر، ڈکنس، تھیکرے، ڈوما، وکٹر ہیوگو کی تصانیف شروع سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں لیکن ہمیں ذرا بھی پریشانی پیدا نہیں ہوتی، ان مصنفوں کے کارنامے گو بہت پرانے ہو چلے ہیں مگر اب بھی ان میں بڑی دلچسپی موجود ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں فطرت انسانی کے اصلی مرقعے موجود ہیں جو ہر صدی میں بنی نوع انسان کے تفنن کا موجب ہوسکتے ہیں، اس لیے ان کی دلچسپی نہ وقتی ہے اور نہ مقامی، ہر زمانے میں یہ کتابیں ہماری دلچسپی اور مسرت کا موجب ہوسکتی ہیں۔ مگر اس کے برخلاف تولستائے ہے، اس کے قصے اور اس کا ہر ناول ہمیں بے حد پریشان اور از خود رفتہ کرنے کے لیے کافی ہے، "وار اینڈ پیس" اس کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس کا مطالعہ ہمارے اخلاق کی بنیادیں متزلزل کردیتا ہے، ہمارے قدیم روایات اور خیالات کی دنیا کو زیر و زبر کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے، اور اس عقائد

کے برباد کرنے کے لیے آمادہ ہے جن کی صحت پر ہم روایتاً ایمان رکھتے ہیں - ابسن کی تصانیف کا بھی یہی رنگ ہے ' ان کو پڑھتے ہی ہمارے اخلاق کی بنیادیں زیر و زبر ہوجاتی ہیں - " گڑیا کا گھر " " بھوت پریت ' اور " جنگلی بط '' کو پڑھتے ہی ہم اپنی دنیا کو بھول جاتے ہیں - ہمیں اپنے اخلاقی معیار نادرست معلوم ہونے لگتے ہیں ' ہم اپنے روایات اور عقائد کو دھوکا تصور کرنے لگتے ہیں - شکسپیرنے Ekdal سے زیادہ مہمل کوئی کردار پیدا نہیں کیا ' مگر فرق یہ ہے کہ Ekdal کی حماقت آرائی ہمارے دل میں درد پیدا کرتی ہے اور Falstaff ہمیں ہنساتے ہنساتے بے خود کردیتا ہے - مگر ابسن ہر انسان کو ایک بڑی قربانی تصور کرتا ہے ' اس کا خیال ہے کہ نظام عالم غلط اصول پر کاربند ہے - اس لیے اس کی نظر میں حیات انسانی ایک بہت بڑی قربانی ہے ' اسی لیے Ekdal کا چربہ کھینچنے میں بھی ابسن کے انداز بیان میں رنج و الم کا عنصر موجود ہے —

انشا کی طرح بہت سے حضرات ایسے ہیں جو قہقہہ کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں ' جو تفنن و تفریح کے شیدائی ہیں ' جو اپنے ماحول کو رنگین بنا کر " عیش با فراغت " کے مزے حاصل کرتے رہنا چاہتے ہیں - یہ دراصل خوف اور بزدلی کا دوسرا نام ہے ' ان لوگوں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ یہ دنیا کے تلخ واقعات کا مقابلہ کرسکیں —

ہم نے رفتہ رفتہ نیکی ' بھلائی ' اور شرافت کے چند نصب العین بنا لئے ہیں اور ہم امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے پجاری ہوگئے ہیں ' چنانچہ اب ہماری سوسائٹی میں کھوٹے کھرے کی تمیز انہیں معیاروں کے ذریعہ سے ہوتی ہے ' ابسن ان نصب العینوں کو مسمار کرنا چاہتا ہے ' ان کو پاش پاش کرنے پر تلا ہوا ہے ' وہ ہمیں بت پرست سمجھتا ہے ' اور کہتا

ہے کہ ہم ان پتھر کی مورتیوں کو ابدی نجات کا ذریعہ تصور کرتے ہیں' وہ ایک بت شکن کی طرح ہاتھہ میں گرز لےکر ایک ایک مورتی کو چکنا چور کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ زمانہ بہت آگے نکل آیا' نئے حالات پیدا ہو چکے' فضا بالکل تبدیل ہوچکی' اب پرانے نصب العین اس زمانے میں کام نہیں آسکتے' ان کا تتبع کرنا سم قاتل ہے' زمانے کی رو دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے' جو ادارے زمانے کے ساتھہ نہیں چلتے انھیں زمانے کی رو بہالے جاے گی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت' دنیا کی قدیم سے قدیم تہذیب' دنیا کے بہتر سے بہتر آرٹ' دنیا کے مکمل سے مکمل مذاہب' غرض یہ کہ دنیا کے ہر انسٹیٹوشن کو حالات زمانہ کے مطابق تبدیل کرتے رہنا ہوگا ورنہ اس کی حیات معرض خطر میں ہے۔ اس خیال کے ذریعہ سے ہم ڈارون کے ارتقا تک پہنچتے ہیں جو دنیا کے ہر شعبے میں کارفرما نظر آتا ہے' چنانچہ ابسن کہتا ہے کہ ارتقا کا امکان رواداری کا بنیادی پتھر ہے۔ ابسن کے نزدیک کوئی اخلاق ایسا مکمل نہیں جس کے بقا کے لیے ہر امکانی کوشش روا رکھی جا سکے' حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ ارتقا نے خیالات اور جذبات کی وسیع دنیا پر جس قدر ہمہ گیر اثر ڈالا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان کام نہیں ــــ

ــــ : ✱ : ــــ

تبصرے

تبصرے

ادب

مجموعۂ نغز

(تالیف میر قدرت اللہ قاسم مرتبۂ پروفیسر محمود شیرانی - شایع کردۂ پنجاب یونیورسٹی - موتی لال بنارسی داس تاجر کتب لاہور سے مل سکتا ہے) —

یہ تذکرہ پروفیسر محمود شیرانی نے بڑی احتیاط و اہتمام اور محنت اور صحت سے مرتب کیا ہے - جس پر فاضل مرتب اور ان کے طفیل میں پنجاب یونیورسٹی قابل مبارک باد ہے —

اس میں چھ سو ترانوے شعرا کے حالات درج ہیں اور کتاب کی ضخامت (جو بڑی تقطیع پر ہے) علاوہ دیباچہ مرتب کے آٹھ سو صفحے سے زائد ہے - اس تذکرے کے چھپ جانے سے اردو مطبوعات میں اور خاص

کو اردو شعرا کے تذکروں میں جو اس سے قبل شایع ہوچکے ہیں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے - یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جو کسی قدر کرم خوردہ اور بہت خستہ حالت میں تھا - دوسرا نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانہ کا تھا جس کی حالت اُس سے بھی بد تر تھی - اس سے قابل مرتب کی محنت اور کاوش کا اندازہ ہوسکتا ہے —

اس تذکرے کا سنہ تالیف سنہ ۱۲۲۱ ھ ہے - اس سے قبل متعدد تذکرے تصنیف ہوچکے تھے جن کا ذکر شیرانی صاحب نے اپنے دیباچے میں فرما دیا ہے لیکن بعض تذکروں کے سنین تالیف کے متعلق کسی قدر غلطی واقع ہوگئی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کی تصحیح کردی جاے —

تذکرۂ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ ھ بتایا گیا ہے ، لیکن خود گردیزی اپنی تالیف کے آخر میں اسے سنہ ۱۱۶۶ ھ کی تالیف بتاتے ہیں * - تذکرۂ میر حسن کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ سنہ ۱۱۸۸ و سنہ ۱۱۹۲ کے مابین کی تالیف ہے - لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ میر حسن نے سودا کے ذکر میں نواب شجاع الدولہ (متوفی سنہ ۱۱۸۸) کو بقید حیات لکھا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ تذکرے کی تالیف سنہ ۱۱۸۸ سے قبل شروع ہو گئی تھی اور غالباً سنہ ۱۱۹۲ کے بعد تک جاری رہی کیونکہ فصیح کے حال میں لکھا ہے کہ " در سال یک ہزار و یک صد و نود و دو برحمت حق پیوست " - اسی طرح عمدۂ منتخبہ کا

* ختم اللہ بالحسنی فی خامس محرم الحرام المنتظم فی سلک شہور سنہ ست و ستین و مائۃ بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ النبویۃ —

سنہ تالیف ۱۲۱۶ ھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ خود صاحب تذکرہ قاسم کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت سنہ ۱۲۱۹ ھ ہے —

ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ بیان صحیح ہے کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے (عمدۂ منتخبہ) پر مبنی ہے ۔ اس کی شہادت خود سرور کے تذکرے میں موجود ہے ۔ وہ قاسم کے حال میں لکھتے ہیں —

" درینولا کہ سنہ ۱۲۱۹ ہجریست بہ سبب مطالعۂ این مجموعہ خود ہم ذوق تالیف نمودن تذکرۂ پیدا کردہ ' چنانچہ از مولف مسودہ واگرفتہ انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است " —

اس کا ثبوت ان دونوں تذکروں کے مطالعے سے بھی ملتا ہے ۔ متعدد شعرا کے حالات خفیف لفظی تغیر کے ساتھ بالکل وہی ہیں جو سرور کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں اور منتخب اشعار بھی اکثر وہی ہیں ۔ خود قاسم نے بھی تذکرہ سرور کا دو ایک جگہ حوالہ دیا ہے * ۔ علاوہ اس کے وہ تذکرۂ میر ' تذکرۂ مصحفی اور تذکرۂ ذکا کا بھی حوالہ دیتا ہے ۔ لیکن قائم ' میر حسن ' قدرت اللہ شوق کے تذکروں کا کہیں نام نہیں لیا اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد میر فتح علی الحسینی الگردیزی کے تذکرے کا مطلق ذکر نہیں کرتا ' حالانکہ وہ اپنی دوسری تصانیف میں ان کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کرتا ہے —

فاضل مرتب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ " یہ تذکرہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آبحیات کا ایک اہم ماخذ ہے " ۔ اور اس لیے اس زمانے میں جو بعض غلطیاں یا غلط بیانیاں آزاد مرحوم سے منسوب کی

* صفحہ ۲۰۱ و ۲۹۵ (جلد اول)

گئی ہیں۔ دراصل ان کا ملزم قاسم ہے۔ منجملہ ان کے میر صاحب کی بد دماغی اور تنک مزاجی کے متعلق آزاد نے نمک مرچ لگا کر ایک طوما ر لکھہ ما را ہے جو مبالغہ اور غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے اصل فقرے قاسم کی عبارت کے لفظ بلفظ ترجمے ہیں۔ خصوصاً ولی کی نسبت یہ فقرہ کہ "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" جو سراسر میر صاحب پر اتہام ہے، اِسی تذکرے سے نقل کیا گیا ہے۔ میر خان کمترین کا یہ مصرع "ولی پر جو سخن لاٰے اُسے شیطان کہتے ہیں" کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ قاسم خود اس امر کے مقر ہیں کہ یہ (کمترین) ہر شخص کی نسبت کچھہ نہ کچھہ لکھہ ڈالتا تھا اور ایک عامی وضع شخص تھا۔ بات یہ ہے کہ بعض اشخاص جو اپنے زعم میں اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتے تھے اور میر صاحب سے داد کے طالب ہوتے تھے وہ انہیں منہ نہیں لگاتے تھے۔ یہ اپنے دل کا بخار اس طرح نکالتے تھے۔ غالباً قاسم کا شمار بھی اسی قسم کے شعرا میں تھا۔ چنانچہ اس کے ضخیم کلیات سے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ مشاق شاعر ہے مگر کلام لطف سے خالی ہے۔ میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا انجمن ترقیء اُردو نے مدت ہوی شایع کردیا ہے۔ وہ قلمی نسخہ جس پر مطبوعہ نسخہ مبنی ہے اب تک میرے پاس موجود ہے۔ یہ سید عبد الولی عزلت کا نسخہ ہے جو میر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نسخہ بہت صاف اور خوش خط لکھا ہوا ہے اور عزلت نے اپنے لیے نقل کروایا تھا۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۷۲ ھ (یعنے تالیف تذکرہ کے سات سال بعد) ہے۔ اس میں ولی کی نسبت صاف لکھا ہے "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" *۔ ایسا

---

* نکات الشعرا صفحہ ۹۴ —

معلوم ہوتا ہے کہ کسی بد طینت مخالف نے "مشہور تر از شیطان" کی اُرادی، چلتا ہوا فقرہ تھا، عام و خاص میں مشہور ہو گیا —

بعض حضرات نے جو یہ قیاس قائم کیا ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے ہو اور بعد میں یہ فقرہ خارج کردیا گیا ہو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ میر صاحب اس مزاج کے آدمی نہ تھے کہ وہ کسی کے کہنے سننے یا مخالفت سے اپنی راے بدل دیتے یا اپنے تذکرے میں سے کوئی عبارت خارج کردیتے۔ ایک شہادت اور میں اپنی تائید میں پیش کرتا ہوں۔ شفیق نے اپنے تذکرۂ چمنستان شعرا میں میر صاحب کے حق میں بہت زہر اُگلا ہے اور دل کھول کر ان کی مذمت کی ہے اور نکات الشعرا میں جہاں کوئی ذراسی بھی بات مل گئی ہے تو اس نے اس بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے۔ میر صاحب کا تذکرہ اس کے پیش نظر تھا، جا بجا اس کا ذکر ہے۔ اگر اس میں ولی کی نسبت یہ فقرہ ہوتا تو وہ کبھی در گزر نہ کرتا، در گزر کرنا، کیا معنی ایک آفت برپا کردیتا۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ میر صاحب پر اتہام ہے اور اس کا الزام قاسم کے سر ہے۔

پروفیسر شیرانی تحریر فرماتے ہیں "حکیم صاحب میر صاحب (میر تقی میر) سے بھی خفا ہیں۔ خفگی کے اسباب سے ہم تاریکی میں ہیں"۔ ناراضی کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے پیر و مرشد سید فتح علی گردیزی میر صاحب سے کسی وجہ سے ناراض تھے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کے متعلق میں اپنی راے تذکرۂ گردیزی کے دیباچے میں لکھ چکا ہوں یہ خفگی اُن کے تذکرے سے صاف ظاہر ہے۔ میر صاحب کے ذکر میں صرف ایک سطر ہے اور انتخاب کلام میں صرف ایک شعر۔ حالانکہ معمولی معمولی شعرا کے کلام سے کئی کئی شعر اور بعض بعض کے کلام سے کئی کئی صفحے نقل کیے ہیں۔ مرشد کی ناراضی سے مرید بھی ناراض ہے۔ اور

جو کام مرشد سے نہ ہو سکا وہ مرید نے کر ڈالا ۔

دوسرا بہتان قاسم نے میر صاحب پر یہ باندھا ہے کہ باوجودیکہ خان آرزو کے شاگرد ہیں مگر بوجہ نخوت و غرور اس سے بالکل منکر ہیں ۔ اول تو میر صاحب کو خان آرزو سے تلمذ نہیں، ذکر میر میں اپنی تعلیم اور شعر گوئی کے متعلق صاف صاف لکھ دیا ہے ۔ دوسرے نکات الشعرا میں جتنی تعریف خان آرزو کی کی ہے شاید کسی دوسرے کی کی ہو۔ ان کے علم و فضل و کمال کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں "حاصل کمالات اوشاں از حیزۂ بیان بیرونست ۔ ہمہ اوستادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوارند"۔ یہ باتیں آزاد کے کام کی تھیں، انہوں نے اپنے دلکش انداز میں اس طرح لکھا کہ عام طور پر مشہور ہوگئیں ۔

بہر حال یہ تذکرہ بہت قابل قدر ہے، اس میں اکثر ایسے شعرا کا ذکر آتا ہے جن سے مولف بذات خود واقف تھا اور ان کے حالات جہاں تک اُس کو معلوم ہو سکے بے کم و کاست لکھ دیے ہیں، اسی ضمن میں بعض پر لطف لطیفے اور حکایتیں بھی آگئی ہیں جو اُس زمانے کی معاشرت، شعر گوئی، مشاعروں اور دوسرے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں ۔ سوائے دو چار کے ہر ایک کے حالات قلم بند کرنے میں انصاف اور راست بازی سے کام لیا ہے ۔ ہر ایک کے کلام کی تعریف میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں ۔ اگرچہ اس عام تعریف سے اُن کے ذوق سخن کی طرف سے تھوڑی سی بدگمانی پیدا ہوتی ہے لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے ۔ وہاں پتے کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اور معقولیت کے ساتھ تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشاق صاحب فن ہونے کے علاوہ صاحب ذوق بھی تھے ۔

فاضل مرتب نے علاوہ دیباچے کے جس میں قلمی نسخوں کی کیفیت

مولف کے حالات ' تذکرے کی تنقید وغیرہ ہے ' کتاب کے آخر میں دو فہرستیں بھی شامل کردی ہیں - ایک اسمائے اشخاص کی اور دوسری کتب و مقامات و دیگر اُمور کی۔ اسی کے ساتھ علحدہ اُن اغلاط کی بھی تصحیح کردی ہے جو مولف تذکرہ سے اتفاقیہ سرزد ہوگئی ہیں - دیباچے کے شروع میں ایسے الفاظ کی فہرست بھی (بقید صفحہ) دیدی ہے جو مولف کے زمانے میں مختلف طریقے پر لکھے جاتے تھے —

غرض کہ قابل مرتب کی محنت و کاوش اور حسن ترتیب ہر لحاظ سے قابل داد ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تذکرے کی اشاعت سے اردو زبان کی تحقیق و تاریخ میں جس کا شوق اس زمانے میں پیدا ہو چلا ہے بیش بہا مدد ملے گی —

پھول کماری

(مصنفۂ جناب پنڈت پیارے موہن دتاتریہ۔
۲۴ (C) نسبت روڈ لاہور - قیمت بارہ آنے)

اردو میں اچھے ڈراموں کی جیسی کچھہ کمی ہے وہ ظاہر ہے۔ اگرچہ اردو ادبیات کی ہر صنف میں کچھہ نہ کچھہ ترقی ہو رہی ہے لیکن ڈرامے کی حالت ابھی تک نہیں ابھری - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر ڈراما نویس تھیٹروں کے مالکوں کے ملازم تھے یا نہیں تو ایسی چیزوں کے لکھنے پر مجبور تھے جو اُن کی نظروں میں مقبول ہوں۔ اُن کو

فن ادب سے کچھ تعلق نہ تھا وہ اپنی آمدنی کو دیکھتے تھے۔ انہیں وہی ڈرامے پسند تھے جو بقول ایک تھیٹر کے مالک کے چوتھے درجے کے ٹکٹ والوں کو بھاتے تھے۔ ان میں جو لغویتیں، غیر واقعی باتیں، پست مذاقی ہوتی تھی اس کی تشریح کی ضرورت نہیں - ہمیں پھول کماری پڑھ کر خوشی ہوئی کہ پنڈت پیارے موہن صاحب نے ہماری موجودہ معاشرت کے بعض پہلوؤں کو واقعی حالت میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ غریبوں کی بے بسی اور دولتمندوں کی بے پروائی اور سنگدلی کا نقشہ کھینچا ہے۔ پھول کماری ایک غریب دھوبن کی بیٹی ہے، غریب ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اُسے تعلیم دلائی ہے۔ اگرچہ اس نے افلاس اور تنگدستی میں پرورش پائی ہے لیکن جب اس کی ماں بیمار ہوتی ہے اور مہینوں گھلنے کے بعد حالت بہت خراب ہونے لگتی ہے تو اُس کی آنکھیں کھلتی ہیں - وہ اپنے ججمانوں کے پاس جاتی ہے رحمدل ڈاکٹروں کے ہاتھ جوڑتی ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ غریب مزدور کی کیا حیثیت ہے اور سرمایہ دار کس قسم کے لوگ ہیں۔ وہ فلم کمپنی میں شریک ہوکر شہرت حاصل کرتی ہے اور سرمایہ داروں کی مخالف جماعت کی رکن اور سرکردہ ہوکر انتقام لیتی ہے —

گو یہ ڈراما اردو ادب میں ممتاز جگہ پانے کا مستحق نہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے صحیح رستے کی رہنمائی کی ہے۔ پنڈت پیارے موہن صاحب کی اردو میں یہ پہلی تصنیف ہے اور سعادت مند فرزند نے اپنے فاضل باپ حضرت کیفی (پنڈت برجموہن دتا تریہ) کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے - ہمیں امید ہے کہ اردو میں اُن کی یہ پہلی تصنیف آخری تصنیف نہو گی —

خام ایکٹرس نرغے میں

(مصنفۂ سید ابو تمیم صاحب فرید آبادی۔ مصنف سے یا قریشی بک ڈپو'

کلاں محل' دھلی سے مل سکتی ہے۔ مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے)

پر لطف قصہ ہے سراغ رسانی اور عشق و محبت کی داستان ہے۔ لیکن کہیں کوئی بات خلاف تہذیب اور فحش نہیں۔ کہیں کہیں ظرافت کا چٹخارا موجود ہے۔ دل بہلانے کے لیے اچھی کتاب ہے —

بارہ پھلجھڑیاں

(مصنفۂ سید ابو تمیم صاحب فرید آبادی)

یہ بارھوں قصے اسم با مسمیٰ ہیں۔ سید صاحب میں ظرافت کوٹ کوٹ کے بھری ہے اگرچہ بعض بعض جگہ ظرافت بھدی ہوگئی ہے لیکن سب قصے بہت ہی دلچسپ ہیں۔ روزمرہ کی باتیں ہیں مگر بڑے لطف سے کی گئی ہیں —

نغمۂ حیات

(مصنفۂ ایم۔ اسلم صاحب۔ پنجاب بک ڈپو

لاہور۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ ایم۔ اسلم صاحب کی تازہ تصنیف ہے۔ یہ چند خیالات کا مجموعہ

ہے جس میں شاعری بھی ہے اور فلسفہ بھی اور بیان بھی دلاویز ہے۔
ظاہری صورت یعنی لکھائی، چھپائی، کاغذ سب نفیس ہے —

اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام

نوشتہ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ، درمیانی تقطیع، کتابت کاغذ وغیرہ عمدہ صفحات ۹۷، قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اردو زبان کی ابتدائی ترقی میں صوفیاے کرام نے بڑا بنیادی کام کیا ہے۔ انھوں نے اس کو علم و اخلاق کے سکھانے، آئین و اصول دین کے سمجھانے اور اپنی ہدایت و تعلیم کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ انھی کا طفیل تھا کہ ایک بازاری اور عوام کی انگھڑ بولی کو یہ رتبہ ملا کہ علم و اخلاق اور تعلیم و ہدایت کے اظہار کا آلہ بن گئی۔ یہ صوفیاے کرام کی جرأت تھی کہ انھوں نے اُردو سے وہی کام لیا جو عربی اور فارسی جیسی وسیع اور ترقی یافتہ زبانوں سے لیا جاتا تھا۔ فاضل مصنف نے نہایت تحقیق و تلاش سے مواد جمع کیا اور اس کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ابتدائی مسلمان درویشوں کی آمد سے لے کر گیارھویں صدی ھجری تک کے ان مشاھیر صوفیا و اولیا کا تذکرہ کیا ہے جن سے اُردو کی ترقی و توسیع میں بڑی بنیادی اور تعمیری مدد ملی ہے —

اس کتاب سے اُردو زبان کی قدیم تاریخ جو بڑی حد تک تاریکی میں

تھی روشنی میں آگئی ہے۔ اور زبان کی ابتدائی اور تدریجی ترقی و توسیع کا واضح نقشہ پیش نظر ہوگیا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اُردو زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس موضوع پر اس قدر مرتب، مفصل، صحیح، مستند اور متعلق معلومات کہیں نہیں ملیں گے۔ اس کے سوا پوری کتاب زبان کی صفائی و پاکیزگی اور بیان کی سلاست و پختگی کے اعتبار سے ہمارے ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ کتاب یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں داخل ہونے کے قابل ہے —

(چ)

مرحوم دہلی کالج

نوشتۂ مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ۔ تقطیع رسالہ اُردو کی۔ صفحات ۱۷۱۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

دہلی کالج ایسا نام ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یہ وہ کالج ہے جو آج سے کچھ اوپر سوا سو سال قبل قایم ہوا تھا اور اَسی (۸۰) برس جاری رہا۔ اس کی اہمیت ہندوستان کی تاریخ تعلیم اور تاریخ زبان میں اس لیے ہے کہ اس کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ یہ ان صحیح بنیادوں پر قایم ہوا تھا جن کے سمجھنے کی آج بھی اکثر تعلیم یافتہ دماغوں میں صلاحیت نہیں —

اس کتاب میں فاضل مصنف نے کالج کی تاریخ، اس کے نصاب،

تدریجی ترقی، انقلابات، اس کے اساتذہ اور مشہور طلبہ، اس کی اُردو تالیفات و تراجم وغیرہ پر نہایت تفصیلی بحث کی ہے اور اس کالج کے کارناموں کو نہایت قابلیت و محنت سے رو شناس کرایا ہے۔ ہمارے ذہن میں اس کا نام تک نہ تھا، ہم اسے بالکل بھولے ہوے تھے۔ فاضل مصنف کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایک بھولی بسری داستان کے منتشر اجزا کو نہایت تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو سے جمع کرکے پیش کیا ہے۔ اب ہم اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور تفاخر کے مزے لیتے ہیں۔ یہ کتاب ان لوگوں کو ضرور مطالعہ کرنی چاہئیے جو ہندوستانی زبان اور ہندوستانی تعلیمات سے دلچسپی رکھتے ہیں —

(چ)

تذکرۂ ریختہ گویاں

مولفۂ سید فتح علی حسینی گردیزی، مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ - درمیانی تقطیع، طباعت کاغذ وغیرہ عمدہ صفحات ۱۹۸، قیمت مجلد سوا روپیہ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

جو لوگ اُردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ گردیزی کے نام سے ضرور آشنا ہیں۔ گردیزی سید عوض خاں (امیر عہد محمد شاہی) کے فرزند اور اپنے وقت کے صوفی اور اہل دل تھے۔ انھوں نے میر صاحب کے تذکرہ کے ایک سال بعد ۱۱۶۶ھ میں یہ تذکرہ لکھا ہے۔ اس میں ۹۸ ریختہ گو شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے ہیں، جن میں بعض

قدیم اور اکثر مولف کے معاصرین ہیں —

اس کی تالیف کی غرض یہ ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے اکثر نازک خیال رنگین نگار شعرا کو اپنے تذکروں میں جگہ نہیں دی اور حالات و اخبار کے لکھنے میں ستم ظریفیاں کی ہیں ' اس لیے یہ کتاب لکھی ہے کہ صحیح حالات درج ہوں اور بے لاگ تنقید کی جاے ۔ یہ در اصل میر صاحب کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا ہے ۔ میر صاحب کے اکثر خیالات اور آرا سے مولف نے اختلاف کیا ہے لیکن میر صاحب کے تذکرہ کا حوالہ نہیں دیا ۔ ان دونوں تذکروں کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔ دونوں کے اختلافات سے بڑے پر لطف تنقیدی سوالات پیدا ہوتے ہیں —

یہ تذکرہ اب تک چھپا نہیں تھا ' فاضل مرتب نے اسے مختلف تین نسخوں سے ترتیب دیا ہے اور شروع میں سترہ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں گردیزی کی حیات ' تصانیف اور تذکرہ کی حیثیت وغیرہ پر تفصیلی بحث کی ہے ۔ گردیزی کے حالات اب تک بالکل تاریکی میں تھے فاضل مرتب نے نہایت تحقیق سے اس کے معتبر اور صحیح سوانح لکھے ہیں کہ مزید جستجو کی احتیاج نہیں رہی —

انجمن ترقی اردو نے یہ بڑا کام کیا کہ تذکروں کو شایع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے ۔ انجمن اب تک نکات الشعرا مولفۂ میر ' تذکرۂ میر حسن ' مخزن نکات مولفۂ قایم ' چمنستان شعرا مولفۂ شفیق شایع کر چکی ہے ۔ گردیزی کے تذکرہ کے ساتھ مصحفی کے تینوں تذکرے بھی چھاپ دیے ہیں جو عنقریب شایع ہوں گے ۔ اس کے علاوہ مخزن شعرا (تذکرۂ شعراے گجرات) بھی شایع کردیا ہے ۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ

قدیم اساتذۂ اردو کے دواوین کو بھی جلد شایع کیا جائے تاکہ ہمارے قدیم مستند ادب کا معتبر ذخیرہ روشنی میں آجائے اور تلف و ضایع ہونے سے بچ جائے ۔ اس کے لیے انجمن خاص کوشش اور تگ و دو سے قلمی ذخائر جمع کر رہی ہے - قدیم ادب کی طرف انجمن کی یہ توجہ اور دلچسپی ہر طرح قابل مبارک باد ہے - اس کے بعد انجمن کو فوراً جدید علوم و فنون اور دوسرے مفید و ضروری موضوعات کی طرف توجہ کرنی چاہئے تاکہ موجودہ ضروریات اور حالات کا ہم ساتھہ دے سکیں —

(چ)

مخزن شعرا

مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہ ' درمیانی تقطیع ' لکھائی چھپائی نہایت پاکیزہ کاغذ دبیز اور عمدہ صفحات ایک سو بیس مطبوعۂ جامعہ ملیہ - قیمت مجلد سوا روپیہ ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

یہ گجرات کے ایک سو گیارہ اردو شاعروں کا تذکرہ ہے ' جس کو بھروچ (گجرات) کے مشہور فاضل قاضی نورالدین حسین فائق نے ۱۲۶۸ ھ میں تالیف کیا تھا - یہ وہی تذکرہ ہے جس کا حوالہ آزاد نے

آب حیات میں دیا ہے —

اس میں گجرات کے قدیم و جدید شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے درج ہیں - اس کا ماخذ ایک اور تذکرہ ہے جس کو سورت کے ایک فاضل مولانا شیخ احمد نے لکھا تھا اور جس میں بلا تخصیص مکان و زماں تمام ہندوستان کے تقریباً بارہ سو اردو گو شعرا کے حالات ہیں - یہ تذکرہ مولانا شیخ احمد سورتی کی کتاب ہندوستان کا ایک باب ہے اس سے حضرت فائق مرحوم نے گجراتی کے اردو گو شعرا کا تذکرہ الگ کردیا ہے اور اپنی معلومات کی حد تک اس میں کچھہ اضافہ کیا ہے - اس تذکرہ سے اردو زبان کی اس ترقی و توسیع کا حال معلوم ہوگا جو گجرات میں ہوئی ہے - تاریخ زبان میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے —

مولف نے یہ التزام کیا ہے کہ قدیم گجراتی اردو کے اشعار اس میں داخل نہ ہوسکیں اس لیے کہ اُنکے دور میں ان کا سمجھنا آسان نہیں ' اسی لیے انہوں نے قدیم شاعروں کے کلام کا ایسا انتخاب کیا ہے کہ جدید زبان کے مطابق ہو اور غالباً اسی التزام کی بناء پر بعض مشہور اور مستند بلند پایہ قدیم ترین گجراتی شعرا کا ذکر نہیں کیا - اس کی تلافی فاضل مرتب نے اپنے مقدمہ میں کردی ہے - گجرات میں مسلمانوں کی تاریخ اور قدیم ترین گجراتی مصنفین و شعرا کا حال مختصراً اس میں لکھہ دیا ہے - اس کے علاوہ مولف تذکرہ کے سوانح بھی لکھہ دیے ہیں - اب یہ کتاب گجراتی اردو کا بہترین تذکرہ ہوگئی ہے —

مولف تذکرہ حضرت فائق سے ہمیں بعض امور میں اختلاف ہے - انہوں نے ولی اورنگ آبادی کو گجراتی مان لیا ہے - اس خیال کے ثبوت میں جو باتیں لکھی ہیں وہ قابل قبول نہیں - اس کے علاوہ فاضل مولف نے عزیزالدہ ہمرنگ کو

گجراتی شاعر سمجھ لیا ہے۔ اس کی نسبت لکھا ہے کہ اس کا مزار بمبئی میں ہے۔ تعلق مدفن کی بنا پر ہمرنگ کو گجراتی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ اورنگ آبادی شاعر تھا، اس کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے دو تفسیر چراغ ابدی اور مثنوی دودہ دلیا ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان میں اس نے صاف طور سے اپنے آپ کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ لایق مولف مرزا غالب سے متعارف تھے۔ ان سے خط کتابت تھی۔ مرزا نے اس تذکرہ پر نظر ثانی کی ہے اور ایک خط بھی اُردو میں لکھ دیا ہے جو تذکرہ کے آخر میں درج ہے۔

(ج)

ترانۂ مغرب

(مصنفہ جناب سید راحت حسین صاحب
فلسفی بی۔ اے۔ چھوٹی تقطیع صفحات ۸۰ قیمت
چھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دارالتالیف چھپرہ)

تھرہ نظموں کا یہ مختصر سا مجموعہ بڑے طمطراق اور ادعا کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ حضرت فلسفی نے لکھا ہے کہ ہماری فرسودہ اُردو شاعری از کار رفتہ ہوگئی ہے اور "اب اس کام کی نہیں رہی کہ اس سے کوئی اثر پیدا ہو یا بچوں کو تعلیم دی جاے ...... مدارس میں ہمارے بچوں کے لیے نظم کی کوئی ایسی کتاب یا ذخیرہ جو اک سبق آموز باثر نصاب کا کام دے سکے موجود نہیں ہے۔ ایک مسدس حالی ہے اس کو کوئی کہاں تک پڑھے؟ اس اہم ضرورت کو محسوس کرکے یہ کتاب جس میں چھوٹی

چھوٹی دل آویز نظموں کا ایک گراں بہا ذخیرہ ہے ... تیار کی ہے" اس اہم ضرورت کے علاوہ اس تصانیف کی ایک اور غرض ہے "دوسری غرض اُردو شاعری کی ترقی اور اصلاح ہے" -

لایق مصنف نے جن مقاصد کو اپنے پیش نظر رکھا ہے وہ بہت بلند ہیں اور جس جرأت سے ان کا اظہار کیا ہے وہ بھی لایق صد آفریں ہے - اوپر کے اقتباس سے معلاً یہ بھی پایا جاتا ہے کہ حضرت فلسفی ترانہ مغرب کو مسدس حالی کا نعم البدل سمجھتے ہیں —

ان دعاوی کو پیش نظر رکھ کر جب ہم ان نظموں کو دیکھتے ہیں تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے - یہ نظمیں (جن میں تین طبع زاد اور بقیہ مترجم ہیں) چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہیں جن میں بچوں کو نصیحتیں کی گئی ہیں - یہ وہی کہانیاں ہیں جن کو طالب علم اکثر درسی کتابوں میں پڑھتے ہیں - ان کا صرف قالب بدل دیا ہے - اس میں بھی کوئی خاص جدت اور ندرت نہیں بلکہ بعض الفاظ اور محاورات بچوں کی فہم سے باہر ہیں —

اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے عمدہ نظمیں ترجمہ کی ہیں اور ان کو خوبی سے اُردو کا جامہ بھی پہنایا ہے ' بحریں بھی مترنم اور رواں ہیں - لیکن کہیں کہیں ترجمے میں انگریزی طرز خیال اور اسلوب بیان کی جھلک نظر آجاتی ہے —

بعض الفاظ اپنے استعمال کی وجہ سے کچھ موزوں اور معنی خیز نہیں - مثال کے لیے دو لفظ جذب مرکزی اور انفعال نظر کو لیجیے —

چھ بار گرتی آئی اس طرح جب فضا میں
اور جذب مرکزی سے حیراں ہوئی ہوا میں

———

نور کیا ہے؟ جس سے کہتے ہو کہ روشن ہے جہاں
کیا ہیں افضال نظر اور کیا ہیں اس کی خوبیاں؟

یہ مجموعہ ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے مرتب ہوا ہے —

(چ)

تاریخ و سیر

تاریخ صقلیہ (تاریخ سسلی)

(جلد اول مولفۂ سید ریاست علی ندوی - مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڈھ - قیمت پانچ روپے)

یہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کا قابل قدر علمی کارنامہ ہے جس کے لیے سید ریاست علی صاحب واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں - انھوں نے کئی سالوں کی محنت سے اس ضروری کام کو سرانجام دیا ہے اور فی الحال پہلی جلد طبع ہوئی ہے جو قریب ۵۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دارالمصنفین کی دیگر مطبوعات کی طرح عمدہ کاغذ پر مع چار رنگین ضروری جغرافی نقشوں کے طبع ہوئی ہے - اس میں خصوصیت سے صقلیہ کے جغرافی حالات' جزیرۂ صقلیہ' اٹلی و جزائر صقلیہ پر اسلامی حملوں کی ابتدا اور یہاں اسلامی حکومت کا قیام' اسلامی

حکومت کے ہر عہد کے عروج اور پھر اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب اور جلا وطنی کا تفصیلی مرقع خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ دور اسلامیۂ صقلیہ، دولت اغالبہ سنہ ۱۸۴ ھ سے لے کر دولت کلبیۂ صقلیہ و طوائف الملوکی سنہ ۴۴۴ھ تک کی سیاسی تاریخ ہے۔ یہ دراصل رزمیہ سرگذشت ہے اور دوسری جلد میں سسلی کی تمدنی معاشرتی اور ذہنی ترقیوں کا مرقع پیش ہوگا جو زیر طبع ہے۔ کتاب کی تیاری میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر ممکن ماخذ سے کام لیا جائے۔ علاوہ یورپی، عربی مصنفین کی تالیفات کے مولوی مرتضی صاحب کے اُردو مضامین (رسالہ معارف علی گڈھ سنہ ۱۸۹۹ع اور مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کے مضمون "صقلیہ میں اسلام" سے بھی جو ابن اثیر سے ماخوذ ہے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی طباعت سے پیشتر ہم سسلی میں اسلامی سلطنت کی سرگرمیوں کا حال بعض مختلف اور منتشر تحریروں کے ذریعہ سے پڑھتے رہے مگر اب پورے طور پر ایک جگہ دو ضخیم جلدوں میں اسلامی جد و جہد کو قلم بند کردیا گیا ہے۔ جسے پڑھ کر ڈاکٹر سر اقبال کے مرثیۂ سسلی کے یہ شعر یاد آجاتے ہیں —

تھا یہاں ہنگامہ اون صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

یہاں ہم بعض فرو گذاشتوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں تاکہ دوسری جلد کے اختتام پر اس جلد کو پھر پڑھ کر ان کو دور کیا جائے —

صفحہ ۹ ابن اثیر کے نقل کردہ الفاظ میں "یثھون" کی بجائے "یطیعون" چاہئے ورنہ معنی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں —

صفحہ ۱۱ "عرب جغرافیہ نویسوں نے ...... صقلیہ کی شکل کو مثلث قرار دے کر دو متساوی ساقین اور تین زاویوں میں تقسیم کیا ہے الخ۔
دراصل یہ الفاظ یاقوت حموی سے لیے گئے ہیں مگر اس کو اگر یوں کہا جاتا کہ "صقلیہ کی شکل مثلث مساوی الساقین ہے" تو مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا یاقوت کا اصل مطلب بھی یہی ہے —

صفحہ، ۱۳ "صقلیہ کا ساحل سطح سے بالعموم ہر مقام پر کم و بیش ۵۰۰ میل بلند ہے۔ یہاں غالباً ۵۰۰ فٹ مراد ہے —

اسی طرح بعض اور مقام بھی ملیں گے۔ کتاب کے آخر میں غلط نامہ دیا ہے مگر ان امور کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ اہم کام جو نہایت ضروری تھا دارالمصنفین نے بہ طریق احسن سرانجام دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے جس کے لیے یہ ادارہ تحسین کا مستحق ہے ۔ پھر انشاءاللہ دوسری جلد کے شائع ہونے پر تبصرہ کیا جائے گا، کیوں کہ اسلامی کلچر کا پہلو دوسری جلد سے وابستہ ہے —

(ع)

مورخین ہند

(مولفہٗ حکیم سید شمس اللہ قادری۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالۂ تاریخ ۔ حیدرآباد دکن ۔ قیمت دو روپیہ ۔ بڑا سائز صفحہ ۱۳۲) —

حکیم سید شمس اللہ قادری کی شخصیت تاریخی ذوق کے رکھنے والوں

کے لیے کوئی محتاج تعارف نہیں۔ ان کی اس تالیف پر نواب سر احمد حسین امین جنگ بہادر کا ایک تعارف نامہ "پیش لفظ" کے عنوان سے ہے۔ چنانچہ انھیں کے الفاظ "تاریخ آئینۂ گذشتہ و درس حال است فال مستقبل" اس کے متعلق ٹھیک صادق آتے ہیں۔ یعنی یہ تالیف ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی معتبر و مستند کتب تاریخ پر تبصروں اور ان کے مصنفین کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب یوں قائم کی ہے۔ ہندوستان کی عام تاریخیں، ہندوستان کی جغرافیائی تاریخیں، سلاطین دہلی کی تاریخیں، لودھی اور سوری خاندان کی تاریخیں، سلاطین تیموریہ کی تاریخیں (بابر سے لےکر جانشینان اورنگ زیب تک)، سندھ، کشمیر، گجرات، بہمنیہ، عادل شاہیہ، قطب شاہیہ، آصفیہ، مرہٹہ، افاغنہ، بنگالہ، کرناٹک، میسور، غرضیکہ نہایت مفید فہرست کتب ابواب میں تقسیم کی ہے جن پر ایلیٹ وغیرہ نے اپنی کتب تاریخ کو مبنی کیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مفید کتابوں کا اندراج نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر مرات العالم از بختاور خاں، مرات واردات از محمد شفیع نگینوی، آداب عالم گیری، تاریخ ہفت کرسی زمانہ عالم گیر، تاریخ دلکشا از بھیم سین وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ اس قسم کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو ضروری ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اُن کو بھی شامل کرلیا جائے گا۔ بہرحال اُردو میں یہ نئی کوشش ہے جس کے لیے حکیم صاحب شکریہ کے مستحق ہیں —

(ع)

———

جیبی اٹلس

(مولفۂ سید شرف الدین قادری صاحب ایم ٬ اے ٬ بی ٬ ٹی چھوٹی تقطیع ٬ کتابت طباعت اوسط درجے کی ٬ کاغذ اچھا ٬ صفحات علاوہ تصاویر وغیرہ ۹۸ ٬ قیمت ایک روپیہ پانچ آنے کلدار ٬ ایک روپیہ نو آنے عثمانیہ۔ ملنے کا پتہ ــ مکتبۂ ابراہیمیہ چادر گھاٹ حیدرآباد دکن)۔

یہ تاریخ و جغرافیہ کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ تمام دنیا کا جغرافیائی اٹلس ہے ٬ ایک علحدہ باب میں ہندوستان کی تاریخ کو صد سالہ ادوار کے التزام سے مختصراً درج کیا ہے۔ چار رنگی ۴۲ اور سادہ ۷۴ نقشے اور تصویریں ہیں جن کی مدد سے تمام تر جغرافی اور کمتر تاریخی و سیاسی مضامین سمجھائے گئے ہیں۔ یہ اٹلس بہت مفید ہے۔ مولف نے محنت اور امکانی صحت کے ساتھ اس کو مرتب کیا ہے۔ کئی انگریزی مستند اٹلسوں اور کتابوں سے مدد لی ہے اور موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے کار آمد بنانے کی کوشش ہے۔ مروج و متداول اٹلسوں میں یہ بہت اچھا ہے۔ طلبہ اس سے استفادہ کرسکتے ہیں ـــ

(چ)

سائنس

مفتاح الفنون

(پرائمر اور حصہ دوم)

(مرتبۂ انجمن صنایع و فنون۔ چھوٹی تقطیع صفحات اور

قیمت علی الترتیب ۹۶ - ۲۴۰ - پانچ آنے - ایک روپیہ -
ملنے کا پتہ :- رام نراین تاجر کتب کٹرہ روڈ الہ آباد)

ان رسالوں کا یہ مقصد ہے کہ سائنس کی ابتدائی اور ضروری معلومات وسطانی جماعت کے طالب علم اور عام اُردو داں حاصل کریں - یہ رسالے ۵ اصل ہندی میں لکھے گئے تھے - ان کے ترجمے اُردو میں شایع کئے گئے ہیں -

سائنس پر اُردو میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن زیادہ ترفنی نقطۂ نظر سے ' جن کو صرف سائنس داں سمجھہ سکتے ہیں عام لوگ ان سے استفادہ کرنے سے قاصر ہیں - عام فہم صاف سلیس اور غیر اصطلاحی زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں - مفتاح الفنون بے شبہ طلبہ اور عام لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے اور ان کے قارئین کے افادہ اور سہولت کو مد نظر رکھہ کر اس کو سوال جواب کے طور پر لکھا گیا ہے - لیکن اصطلاحی عنصر اندر ہی اندر کام کر رہا ہے خصوصاً حصۂ دوم میں - اس میں سائنس کے ابتدائی اور اولین مسائل اور مضامین کو وضاحت اور عمدگی سے سمجھانے کی بجاے اصطلاحات کے معانی و مفہوم ذہن نشین کراے گئے ہیں ' طلبہ اور سہولت پسند قارئین اکثر تعریفات اور اصطلاحات سے گھبرا جاتے ہیں اور جو محنتی ہیں وہ اس الجھیڑے میں پھنس کر اصل مضمون کو بہت دیر میں اور غیر واضح طور پر سمجھتے ہیں —

یہ رسالے موجودہ حالت میں طلبہ کے لیے مفید ہیں اگر آئندہ اشاعت کے لیے ان کو زیادہ سلیس زبان اور واضح اسلوب میں لکھا گیا تو عام اُردو داں بھی استفادہ کر سکیں گے —

(چ)

اصول حفظان صحت

(مولفۂ سید شرف الدین قادری صاحب - چھوٹی تقطیع ،
کتابت طباعت اور کاغذ معمولی - صفحات ۳۲ - قیمت چار آنے -
ملنے کا پتہ - مکتبۂ ابراہیمیہ چادر گھاٹ حیدرآباد دکن)

یہ چھوٹی سی کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے - اس میں وہ ضروری اور ابتدائی باتیں درج ہیں جن کا جاننا صحت برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے - یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ کس جماعت کے لیے لکھی گئی ہے - چھوٹی جماعت کے بچوں کی استعداد کے لحاظ سے اس کی زبان بڑی حد تک بسیرالفہم نہیں - بڑی جماعتوں کے لیے یہ کتابچہ ہر طرح ناکافی ہے - مطالب اور مضامین سمجھانے کے لیے چند تصویریں اور نقشے بھی شریک کردیے ہیں —

(چ)

متفرقات

مجموعۂ تاریخ

(معروف بہ تاریخ آئینہ جمال - تصنیف سید محمد
ہاشم صاحب مرحوم جونپوری قیمت بارہ آنے)

تاریخ بھی ہمارے ادب میں منجملہ صنائع کے ہے اور ایک دلچسپ

کو تاریخ گوئی میں

اور اچھی صنعت ہے۔ سید محمد ہاشم صاحب مرحوم کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ یہ مجموعہ ان کی تاریخوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے کہیں اور اب ان کے فرزند سید مجتبیٰ حسین صاحب نے یک جا جمع کرکے شایع کی ہیں۔ بعض تاریخیں بہت اچھی اور بے تکلف کہی ہیں۔

تجدید عمل

(مذہب کی ایک نئی تھیوری۔ از مرزا عسکری علی خاں صاحب مجازی۔ اردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور۔ قیمت آٹھ آنے)

یہ دوسری کتاب ہے، پہلی کتاب (تجدید عمل) پر اس سے قبل اس رسالے میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ ہندوستانی ریشنلسٹ سوسائٹی (لاہور) کی طرف سے شایع ہوی ہے۔ اس سوسائٹی کے بانی بھی کتاب کے مصنف مرزا عسکر علی خاں صاحب مجازی ہیں۔ وہ کسی مذہب یا کتاب کو آسمانی نہیں مانتے بلکہ مذاہب کو ملک و قوم اور زمانے کی ضروریات کی پیداوار خیال کرتے ہیں۔ اور تمام توہمات کو لغو اور مضر خیال کرتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ان امور پر بحث کی ہے کہ حقیقی مذہب قومیت ہے۔ مذہب قومیت سے زیادہ دیر پا نہیں۔ قومیت اور جنگ، تمدن اور گناہ، مذہب مساوات، قومیت جغرافی حدود کی پابندی کا نام نہیں، وجدانات ذہنی اور ہندوستانی یونیورسٹیاں، حقوق نسواں کی پابندی، ادبیات اور مفاد قومی —

مباحث دلچسپ ہیں اور پڑھنے کے قابل۔ کسی کو مرزا صاحب کے

خیالات سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ عقیدے میں صادق ہیں اور اس میں شبہہ نہیں کہ ہمارے ملک کو جو سرتاپا توہمات میں مبتلا ہے خاص طور پر ریشنلزم (عقلیت) کی ضرورت ہے —

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی مختصر تاریخ

(مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب زبیری)

یہ مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ ہے جس میں قابل مرتب مولوی محمد امین صاحب نے ابتدا سے لے کر اب تک کے تمام حالات و واقعات ، یونیورسٹی کی تمام تحریکات ، اندرونی انتظامات ، عمارات اور تمام ضروری معلومات کو بخوبی بیان کیا ہے - اس کے بعد بعض نامور اور ممتاز اصحاب کی آرا کا انتخاب دیا ہے اور سب سے آخر میں اُن عطیات کی فہرست ہے جو سنہ ۱۹۲۱ ع سے سنہ ۱۹۳۳ ع کی پہلی ششماہی تک یونیورسٹی کو اُمرا و روسا اور بہی خواہان قوم نے عطا کی ہیں —

تہذیب عمل

(مولفۂ ملک محمد باقر نسیم رضوانی متعلم ایم - اے جامعۂ پنجاب - درمیانی تقطیع - کاغذ اچھا لیکن لکھائی چھپائی معمولی - صفحات ۷۹ ، قیمت چھ آنے - دفتر تذکرۂ گجرات پرنٹنگ پریس گجرات (پنجاب) سے مل سکتی ہے)

یہ کتاب عملی زندگی کی اصلاح اور آراستگی کے لیے لکھی گئی ہے

اس میں ان جسمانی اور عقلی و ذہنی قوتوں اور جذبات و خواہشات کا حال ہے جن سے اگر صحیح طریقے سے کام لیا جائے تو انسان زندگی کی مہم کامیابی کے ساتھہ سر کرسکتا ہے۔ اس میں ان عادات و افعال اور وظایف و اطوار کا بھی ذکر ہے جو انسانی قوای کو معطل و بیکار کردیتے ہیں۔ ان کے ازالہ کی تدابیر بھی مولف نے پیش کی ہیں اس میں کوئی نئی بات نہیں اور نہ کوئی ایسا نکتہ ہے جسے عام سمجھہ بوجھہ کا آدمی نہ جانتا ہو۔ بظاہر اس خامہ فرسائی کی زحمت گوارا کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھہ میں نہیں آتی۔ مولف نے لکھا ہے " یہ مختصر مقالات کسی فرد واحد کے بھی قواے ذہنی کی اصلاح کرسکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری مساعی مشکور ہوگئیں۔ انسانی ذہن کی طاقتیں غیر محدود ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ انسان نے اب تک کن طاقتوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور کون سی تا ہنوز بیکار یا معطل پڑی ہیں " —

خدا کرے کہ اس کتاب کی اشاعت سے مولف کے حسب توقع کوئی انسانی خوابیدہ قوت جاگ جاے —

(چ)

رہنمائے شکار

(مولفہ صاحبزادہ محمد عبدالرحمن خان صاحب سابق کرنل افواج ریاست ٹونک (راجپوتانہ) صفحات ۲۷۸ قیمت تین روپے کلدار ملنے کا پتہ نظم منزل۔ ٹونک (راجپوتانہ)

مولف موصوف نے صید افگنی کے طور طریق اور نشانہ بازی کے نکات کو

ذاتی معلومات اور تجربات کی بنا پر جس بے تکلفی اور صفائی سے بیان کیا ہے اس کو ان کے شوق شکار کی تفسیر کہا جائے تو بیجا نہیں اس کتاب میں شکار کے متعلق جملہ امور کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ ایسے سادہ اور سہل الفہم طرز میں لکھا ہے کہ استاد کی مدد بغیر صرف پڑھنے سے ہر بات ذہن نشین اور مشق سے بخوبی حاصل ہوسکتی ہے۔ شکار کے سلسلے میں چند مفید علاج معالجے بھی لکھ دیے ہیں جن کا ایسے مواقع پر معلوم رکھنا ضروری ہے - مائل بہ سیر شکار طبیعتوں اور شوقین مزاجوں کو شکار کے گر جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ سود مند اور باعث دلچسپی ہوگا - اردو میں اس قسم کی کتابوں کی بہت کمی ہے اس لیے مولف کی کوشش اور بھی قابل قدر ہے —

(ظ)

اُردُو کے جدید رسالے

روح تعلیم

(اڈیٹر مرزا سجاد علی خاں اختر بی - اے ' بی ٹی (علیگ) -
کاشی ناتھ ملک لین ' کلکتہ - سالانہ چندہ پانچ روپے)

یہ جدید رسالہ مہینے میں دوبار شایع ہوتا ہے ۔ اس کا مقصد

اس کے نام سے ظاہر ہے - ۱۴۰ صفحے اردو کے اور پانچ چھ صفحے انگریزی مضامین کے ہیں - رسالہ مختصر ہے مگر کار آمد - اس قسم کے رسالوں کی شدید ضرورت ہے بشرطیکہ وہ صحیح اصول پر چلائے جائیں - اس رسالے کے قابل اڈیٹر سے یہ توقع ہے کہ وہ اسے حقیقی طور پر اسم بامسمیٰ بنانے کی کوشش کریں گے —

شاہجہاں

(اڈیٹر سید ولایت حسین صاحب دہلوی کٹرہ بریاں دہلی - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ رسالہ بڑی مہینے میں دوبارہ شایع ہوتا ہے اور ادبی علمی و تنقیدی رسالہ ہے - اس کے پہلے نمبر سے جو ہمارے سامنے ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہونہار پرچہ ہے اور آگے چل کر زبان و ادب کی اچھی خدمت کرے گا - سب سے پہلا مضمون شمس العلما حضرت آزاد مرحوم پر حضرت کیفی (پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب) کا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے - فسانے اور نظم کی چاشنی بھی موجود ہے —

حیات نو

اڈیٹر شیخ محمد بدر الاسلام فضلی صاحب بی - اے ' بی - ٹی (علیگ) ہیڈ ماسٹر حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت - سالانہ چندہ دو روپے)

یہ سہ ماہی رسالہ حالی مسلم ہائی اسکول سے مولانا خواجہ حالی

مرحوم کی یادگار میں شایع ہوا ہے - رسالے کے مضامین اور ترتیب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی - اگرچہ یہ رسالہ ایک اسکول کی طرف سے شایع ہوتا ہے لیکن بعض کالجوں کے رسالوں سے بھی بہتر ہے افتتاحیہ کے بعد " یاد حالی " کے عنوان سے ایک نظم درج ہے جو ابوالاثر حفیظ صاحب نے سر سید راس مسعود کی تشریف آوری اور معائنۂ مدرسہ کے وقت عام جلسے میں پڑھی تھی - بہت اچھی نظم ہے - اس کے بعد " ہماری درسگاہ " کے تحت میں حالی مسلم ہائی اسکول کے اغراض و مقاصد ' مختلف شعبوں اساتذہ و طلبہ ' عمارات ' نصاب تعلیم ' فیس ' کتب خانے ' انجمنوں وغیرہ کا تفصیلی اور دلچسپ ذکر ہے - مولانا حالی کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ بھی درج ہے - مولانا حالی کے خطوط سے ان کے بعض حکیمانہ مقولے انتخاب کرکے لکھے ہیں جو پڑھنے اور عمل کرنے کے قابل ہیں - ان کے علاوہ " فن سیرت پر ایک نظر " اور " جاپان پر ہندوستان کے احسانات " کے عنوان سے بہت مفید مضمون ہیں - کئی دلچسپ اور اخلاقی فسانے بھی ہیں - آخر میں طالب علموں کے لیے چھوٹے چھوٹے مضمون اور کام کی باتیں ہیں جو اچھی زبان اور اچھے پیرائے میں لکھی ہوں - اسی حصے میں دو تین مضمون مدرسے کے طالب علموں کے بھی ہیں - اس کے بعد " رونق محفل " کے عنوان کے تحت میں لطیفے ' کھیل اور معمے ہیں جو طلبہ کے لیے خاص طور پر دلچسپ ہیں - سب سے آخر میں تعلیمی اور دوسری خبریں ہیں —

رسالہ خاص طور پر طلبہ کے لیے نیز عام شائقین کے لیے نہایت موزوں ہے اور مضامین وغیرہ کی جو ترتیب رکھی گئی ہے اور خصوصاً جس قسم کے مضامین فراہم کیے گئے ہیں وہ بہت قابل تعریف ہیں - اگر

رسالہ اسی احتیاط اور اہتمام سے جاری رہا تو یقین ہے کہ مدارس نیز مدارس سے باہر بڑے شوق سے پڑھا جائے گا —

القاضی

(اڈیٹر ابوالقمر محمد جمیل الدین احمد شہدا بلگرامی
قاضی مقبول احمد اینڈ کمپنی دروازہ شہرانوالہ ' لاہور
سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ ماہانہ رسالہ لاہور سے نکلا ہے - نام تو قاضی ہے لیکن در حقیقت نیم طبی نیم شرعی رسالہ ہے اور رسالے کا زیادہ تر حصہ طرح طرح کی عجیب و غریب دواؤں سے بھرا ہوا ہے —

ہمدرد صحت

(اڈیٹر حکیم حاجی عبدالحمید صاحب - ہمدرد منزل '
لال کنواں دہلی - سالانہ قیمت ایک روپیہ)

یہ دہلی کا ایک ماہانہ طبی رسالہ ہے - طبی مضامین ' ادویہ کے خواص و اثرات ' مختلف بیماریوں کے علاج اور حکما کے حالات پر

پڑھنے کے قابل مضامین درج ہیں - ایک افسانہ بھی ہے جو غالباً پروفیسر محمد مجیب صاحب نے حکیموں کی ہدایت و عبرت کے لیے لکھا ہے - رسالے میں حفظان صحت اور علاجوں کے متعلق بہت کار آمد اور مفید معلومات پائی جاتی ہیں - طبی رسالوں میں بہت غنیمت ہے اور اڈیٹر صاحب اپنے فرائض کو خوبی اور لیاقت کے ساتھہ انجام دیتے ہیں -

---

خاص نمبر
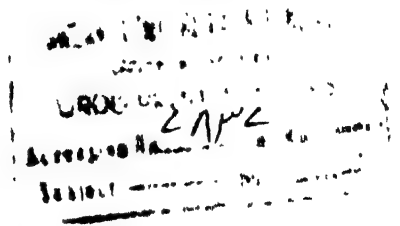
سالنامۂ مجلۂ کابل

(انجمن ادبی کابل ' افغانستان)

یوں تو بعض رسالے خاص اہتمام اور محنت اور صرف سے سالنامے نکالتے ہیں اور ان میں بہت اچھے بھی ہوتے ہیں - لیکن " کابل " کا سالنامہ بعض خصوصیتوں کی وجہ سے سب پر سبقت لے گیا ہے - اس غیر معمولی محنت اور صرف کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس میں مختلف تصویریں اور فوٹو ۲۹۹ کی تعداد میں ہیں - حجم بھی غیر معمولی ہے یعنی سب ملا کر تخمیناً ۴۳۵ صفحے ہیں - بڑا کام اس میں یہ کیا ہے کہ افغانستان کے تمام حالات ' تاریخی ' جغرافی ' سیاسی ' حکومت کے مختلف شعبے ' انتظام کے تمام صیغے وغیرہ سب اس میں آگئے ہیں گویا افغانستان کا گزیٹیر ہے - اس کے علاوہ دنیا اختراعات قدیم و جدید '

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی
اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور
پہلوؤں پر بحث ہوگی - حجم کم از کم ایک سو صفحے ہوگا —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریزی
(مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی - اے ' آنریری سکریٹری
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

(باہتمام محمد صدیق حسن مینیجر انجمن ترقی اردو پریس ' اُردو باغ
اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی - حجم کم از کم ایک سو صفحے ہوگا —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی - اے ' آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن ترقی اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

تیرھویں جلد — سنہ ۱۹۳۳ء

فہرست مضامین

مقالے

تبصرے

اں

مذہب و اخلاق

تاریخ و جغرافیہ

متفرق

سائنس

ردو کے جدید رسالے

و جرمن رسالے

رسالوں کے خاص نمبر

ردو

جولائی سنہ ۱۹۳۳ ع

فہرستِ مضامین

مرحوم دهلی کالج

(۳)

(از اڈیٹر)

تالیف و ترجمہ - دهلی ورنیکلر سوسائٹی

ایجوکیشنل کمیٹی

مغربی علوم کو دیسی زبان کے ذریعے سے پڑھانے میں بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ کتابیں نہیں تھیں - اور درس تدریس کے لیے کتابیں ایسی هی هیں جیسے کاریگر کے لیے اوزار - جو لوگ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے مخالف تھے ان کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا اور یہ کوئی معمولی اعتراض نہ تھا - دیسی زبان کے حامیوں کو بڑی دقت کا سامنا تھا - اس لیے انھوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی - سرکاری تعلیمی کمیٹی (ایجوکیشنل کمیٹی) سنہ ۱۸۳۵ ع میں قائم هوئی - لیکن اس سے بہت قبل اسکول بک سوسائٹی نے بہت سی مفید کتابیں دیسی زبان میں مدارس کے لیے تیار کیں اور هزاروں کی تعداد میں شایع هوئیں - لیکن یہ محض ابتدائی کتابیں تھیں —

قدیم ایجوکیشنل کمیٹی کے پیش نظر بھی دیسی زبان میں تعلیمی کتابوں کی ترتیب کا مسئلہ تھا لیکن اس کی سرگرمی زیادہ تر سنسکرت اور عربی کی جانب رهی —

ایجوکیشن کمیٹی کا وجود سنه ۱۸۳۵ ع میں ظہور میں آیا - یه وہ زمانه تھا جب که بعض حالات کی وجه سے انگریزی کی فوقیت اور عظمت تسلیم کرلی گئی تھی اور حکومت نے فیصله کردیا تھا که تمام مضامین کی تعلیم انگریزی کے ذریعے سے دی جائے اور دیسی زبان کے حامی اور خیر طلب ناکامی اور بے بسی کی حالت میں تھے - اس وجه سے ترجمے کا کام بھی رک گیا - اس میں شک نہیں که اصولاً اس کا اعتراف کیا جاتا تھا که دیسی زبانوں میں مغربی علوم کا ترجمه ہونا چاہئے لیکن عمل کا رخ دوسری طرف تھا - ایجوکیشن کمیٹی نے اپنی سالانه رپوٹ بابت سنه ۱۸۳۵ ء میں صاف طور سے اس امر کا اعلان کیا که دیسی علم ادب کا بنانا اس کمیٹی کا قطعی مقصد رہے گا اور اس کی مساعی اسی جانب رہنی چاہئیں - لیکن پانچ سال تک نه اس مجلس نے کچھه کیا اور نه اسکول بک سوسائٹی نے کروٹ لی —

جب لارڈ آکلنڈ نے تعلیمی کتابوں کے ترجمے کی طرف توجه دلائی اور ابتدائی کتابوں کے تیار کرنے کی طرف خاص دلچسپی ظاہر کی تو ایجوکیشنل کمیٹی یکایک سوتے سے جاگی اور سنه ۱۸۴۱ ع میں ایک ذیلی مجلس قائم کی گئی جس میں سرایڈورڈ ریاں (Ryian) ' مسٹر پرنسپ ' مسٹر ملٹ اور مسٹر سدر لینڈ بھی شریک تھے - اس کا مقصد یه تھا که یه کمیٹی تمام معلومات بہم پہنچاے اور کام کا خاکه تیار کرے - گورنر جنرل نیز کورٹ آف ڈائرکٹرز کی یه راے تھی که اس معاملے میں تینوں احاطوں کو اتفاق سے کام کرنا چاہیے ' چنانچه اس بنا پر اسی کمیٹی نے مدراس اور بمبئی کے بورڈز آف ایجوکیشن سے مراسلت شروع کی —

ذیلی کمیٹی نے بعد ازاں اپنی رپوٹ پیش کی جس میں یه امور

تجویز کئے —

۱ - صرف و نحو پر کتابیں تیار ہونی چاهئیں —

۲ - اس کام کے لیے ایسے اشخاص انتخاب کئے جائیں جو اس کے اهل هوں اور جو ذیلی کمیٹی کی نگرانی میں بلا معاوضہ یا تنخواہ پر کام کرنے کے لیے آمادہ هوں —

۳ - اس کے بعد تدریجی کتابوں کا ایک سلسلہ علم کی هر شاخ پر تیار کردیا جائے جو لوگوں کی اخلاقی اور ذهنی ضرورتوں کو پورا کرسکے —
اسی قسم کے چند اور مشوروں کے بعد ذیلی کمیٹی نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا :

" مذکورہ بالا تجویز پر اس قدر اخراجات عائد هونگے کہ گورمنٹ ان کے دینے کے لیے تیار نہ هوگی - علاوہ اس کے فوراً ایسے اشخاص کا دستیاب هونا جو سائنس اور ادبیات کی مختلف شاخوں کے ترجمہ و تالیف کے اهل اور اس کے سر انجام دینے کے لیے بخوشی آمادہ هوں ' مشکل هوگا - ایک کم جامع لیکن زیادہ کار آمد مشورہ یہ هے کہ هر ممکن ذریعے سے اهل اشخاص کو آمادہ کیا جائے کہ وہ دیسی فضلا کی اعانت سے مطلوبہ کتب کی تالیف اور تیاری کا کام اپنے ذمے لیں - کام کا تعین کمیٹی کرے گی - اور جو کتاب بعد پسندیدگی شایع کی جائے گی مولف کو اس کا صلہ دیا جائے گا - "

صلے کے متعلق کمیٹی نے یہ طے کیا کہ سائنس کی معمولی ضخامت کی کتاب یا رسالے کے لیے ایک هزار روپیہ کافی هوگا - اس صلے کے علاوہ جب کتاب ان کے نام سے شایع هوگی تو ان کی خاصی شہرت بھی هوگی -

اس طریقے سے ہمت افزائی کا ایک موقع نکل آے گا - اور ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی لوگ اس طرف توجہ کرنے لگیں گے اور کام میں ترقی کی امید ہوجاے گی —

اس اسکیم کے عمل میں لانے کے لیے کمیٹی کو ایک مبصر کی بھی ضرورت ہوگی تاکہ جو کتابیں پیش ہوں ان کی جانچ کرسکے - اگر کمیٹی کے ارکان میں ایسے اہل اور قابل شخص ہوں جنھیں فرصت ہو اور خوشی سے اس کام کو انجام دے سکیں تو پھر کسی شخص کی ضرورت باقی نہ رہے گی —

ایک اصول جس پر سب نے اتفاق کیا یہ تھا کہ درسی کتابیں پہلے انگریزی میں لکھوائی جائیں ، اور پھر ان کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کیا جاے - اس سے آسانی کے علاوہ تعلیمی نظام میں یکسانی بھی پیدا ہوجاےگی —

احاطۂ بمبئی کے بورڈ آف ایجوکیشن نے اس سے اتفاق کیا - اور یہ مشورہ دیا کہ دیسی زبان کی کتابیں اور انگریزی مدارس کی نصابی کتابیں ایک ہونی چاہئیں —

یہ بھی طے ہوا کہ کمیٹی کی آخری منظوری سے قبل ان تالیفات کو مدراس اور بمبئی کے بورڈ آف ایجوکیشن جانچ لیا کریں —

تعویق پیدا کرنے ، کام کو ٹالنے اور ترقی روکنے کے لیے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہوسکتی تھی —

خاص طور پر جن کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی وہ یہ تھیں - دیسی زبان کی ریڈریں ، ہندوستان کے بعض اضلاع کے حالات ، تاریخ بنگالہ ،

ھندوستان کی عام تاریخ ' اخلاقی تعلیم پر ایک رسالہ ' ان کے علاوہ چند اور کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ھے جو کوئی خصوصیت نہیں رکھتیں ۔ آخر میں یہ مشورہ دیا گیا کہ " سلطنتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ اقوامی نقطۂ نظر سے " تالیف کی جاے ۔ یہ ایسی عظیم‌الشان تالیف تھی کہ ھندوستان کے کسی یورپین کو اس کی تالیف کا وقت نہیں مل سکتا تھا —

کتابوں کی فہرستوں کا بنالینا اور تالیف کے اچھے اچھے نام تجویز کرلینا ایک بات ھے اور ان کا مرتب کرنا دوسری بات ۔ سب سے پہلی کتاب یعنی ریڈر ڈاکٹر ییٹس (Dr. Yates) نے تیار کی اور مدارس میں جاری بھی کردی گئی ۔ باقی تالیفات کے نام ھی نام رہ گئے ۔ پہلے سے کچھہ کتابیں اردو اور بنگالی میں ترجمہ کی ھوی موجود تھیں وہ کام میں آئیں مثلاً مارشمین کی تاریخ ھند —

البتہ ایک کتاب جو قابل لحاظ ھے اس زمانے میں تالیف ھوی وہ بنگالی انسائیکلوپیڈیا تھی جو ریورنڈ کے ۔ ایم بنرجی کی نگرانی میں لکھی گئی تھی ۔ یہ اصل میں مختلف مضامین پر الگ الگ رسالے ھیں ۔ اکثر ان میں سے ایسے ھیں جو پہلے سے لکھے ھوے تھے اور انھیں بغیر کسی تغیر و تبدل کے ویسے ھی نقل کردیا ھے اور بعض ایسے ھیں جن میں ھندوستان کے حالات کے رو سے مناسب تغیر و تبدل کرلیا گیا ھے ۔ ان انتخابات اور تغیر و تبدل پر کونسل آف ایجوکیشن کی نگرانی تھی —

دیسی زبان کی کتابوں کی مانگ ' خواہ وہ ایجوکیشنل کمیٹی نے لکھوائیں یا دوسری انجمنوں نے ' مدارس تک محدود تھی ۔ مدرسے کی چار دیواری کے باھر ان کی بہت کم مانگ تھی ۔ خیر درسی کتابیں تو ظاھر ھے کہ مدرسوں ھی کے کام آئیں گی ' اور ان کی اشاعت وھیں تک

معدود رہے گی ' لیکن یہ خیال ضرور دل میں آتا تھا کہ اگر تاریخ
ہندوستان یا نیچرل فلاسفی پر کتابیں لکھوائی جائیں یا کوئی ہندوستان
کا گزیٹیر یا کوئی اور ایسی ہی کتاب تالیف کردی جائے تو وہ
ضرور ہندوستانیوں میں مقبول ہوگی - لیکن دیسی زبانوں میں اس
قسم کی کتابوں کا شایع کرنا جوکھم سے خالی نہیں تھا - کتاب
وہی چلتی ہے جس کی مانگ مدرسوں میں ہوتی ہے - ایک دوسری بات یہ
تھی کہ مدارس سے باہر مانگ اس لیے بھی کم تھی کہ کتابوں کی قیمت
زیادہ تھی - تین چار یا پانچ روپے فی کتاب ایسی قیمت ہے جو ہندوستانی
آسانی سے ادا نہیں کرسکتے - اور ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے انگلستان
میں بھی سواے بعض اعلیٰ درجے کی کتابوں کے ' اتنی قیمت کوئی بھی
خوشی سے نہ دے گا —

یہ مختصر خاکہ ہے ایجوکیشنل کمیٹی ' اس کے قیام اور
اس کی کارگزاری کا - اس سے دیسی زبانوں میں ترجمے کی ابتدائی کیفیت
معلوم ہوتی ہے —

انجمن اشاعت علوم بذریعۂ السنۂ ملکی یا دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

لیکن اس کے بعد ہی ایک اور تحریک
اسی غرض سے علم کے بعض سچے شائقین اور
دیسی زبانوں کے ہمدردوں کی سعی اور توجہ
سے عمل میں آئی اور "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی"
(Society for the Promotion of Knowledge in India Through the Medium of
Vernacular Languages) قائم کی گئی - اس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے -
اس کی غرض یہ تھی کہ اُن مشکلات کو رفع کرے جن کا ذکر اوپر کیا گیا
ہے اور ترجمے یا جدید کتب کی تالیف کے ذریعے سے ہندوستان کی زبانوں

کی ترقی میں کوشش کی جاے - اس مقصد کے حصول کے لیے جو تدابیر اس انجمن نے اختیار کیں ' ان کا خلاصہ یہ ھے —

۱ - انجمن کا یہ منشا ھے کہ انگریزی ' سنسکرت ' عربی ' فارسی کی اعلی درجے کی کتابیں اردو ' بنگالی ' ھندی میں ترجمہ کی جائیں اور سب سے اول دیسی زبان کی درسی کتابیں تیار کی جائیں —

۲ - اگرچہ امید نہیں کہ ابتدائی ترجمے اعلی درجے کے ھوں لیکن یہ توقع کی جاتی ھے کہ اگر ان کے استعمال اور سر پرستی کی مسلسل اور با قاعدہ کوشش کی گئی تو دیسی زبانوں میں بہت کچھہ ترقی ھو جاے گی —

۳ - ترجمہ اگر اس درجے کا بھی نہ ھوا جیسا کہ ھونا چاھیے مگر سمجھہ میں آسکتا ھے اور صحیح بھی ھے تو انجمن اپنی بساط کے موافق اس کی سر پرستی کرے گی - ابتدا میں چوں کہ قلیل تعداد میں اس کے نسخے چھپوائے جائیں گے اس لیےآیندہ طبع کے موقعوں پر اس میں اصلاح ھوتی رھے گی - لیکن اگر اس اثنا میں اس کتاب کا کوئی بہتر ترجمہ ھوگیا تو پھر پہلے ترجمے کا چھپوانا موقوف کردیا جاے گا —

۴ - دیسی زبانوں کی مفید جدید تالیفات اور انگریزی ' سنسکرت ' عربی کی اعلی کتابوں کے ترجموں کے مسودے بہ شرح ۶ آنے تا یک روپیہ فی صفحہ (حسب حیثیت تالیف یا ترجمہ) خریدے جائیں گے - فارسی کتاب یا کسی دیسی زبان کا ترجمہ (دوسری دیسی زبان میں) اس سے نصف شرح پر خریدا جاے گا * —

---

* نظر ثانی کے لیے یہ شرح بعد میں تجویز ھوئی : ابتدائی ' تاریخی اور ادبی کتابوں کے لیے فی صفحہ چھہ آنے - سائنس ' قانون یا فلسفے کے لیے فی صفحہ دس آنے —

۵ - قاعدۂ بالا کے رو سے جو ترجمہ انجمن خریدے گی اس کا حق تالیف (بشرطیکہ کوئی اور معاہدہ نہ کیا گیا ہو) انجمن ہی کا ہوگا —

۶ - قاعدۂ بالا کا اطلاق ملکی السنہ کی جدید تالیفات یا جدید اعلیٰ کتاب کے ترجمہ پر (جو اصل کتاب کے طبع سے تین سال کے اندر کیا گیا ہو) نہ ہوگا —

۷ - ترجموں کے مفید ہونے نہ ہونے کا فیصلہ انجمن کی مجلس انتظامی کرے گی اور سب سے اول وہ اپنا سرمایہ اُن کتابوں کی طبع پر صرف کرے گی جو نہایت ضروری ہیں —

۸ - انجمن طبع کے لیے ابتدا میں عموماً ایسی کتابیں خریدے گی جن کا حجم چار سو پانسو صفحات سے زیادہ نہ ہوگا —

۹ - انجمن اپنی کتابیں جہاں تک ممکن ہوگا سستی بیچے گی اور طبع کے اخراجات کا ایک حصہ اور بعض صورتوں میں تمام اخراجات انجمن اپنے سرمائے سے ادا کرے گی † —

اس انجمن کے بانیوں اور معاونوں میں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے - چندہ دینے والوں کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معطیوں کی کل تعداد ۱۱۶ تھی جس میں ۵۲ انگریز تھے - اور چندے میں بھی تقریباً برابر شریک تھے - شاہ اودھ ، اُن کے صاحبزادوں اور ان کے وزرا و امرا نے بھی عطیے دئیے - اسی طرح حیدرآباد دکن سے امیر کبیر ، سر سالار جنگ ، سراج الملک بہادر ، راجہ رام بخش وغیرہ نے چندے عطا کیے - مجلس انتظامی کے ارکان یہ تھے :

ٹی - ٹی میٹکاف -

---

† روئداد ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی مرتبۂ سکرٹری بقروس مطبوعہ سنہ ۱۸۴۵ع

سی - گرانٹ -

ای - سی - ریونشا -

ڈبلیو - سیٹن کونٹن -

دوارکا ناتھہ ٹیگور -

اور سکرٹری مسٹر بٹروس پرنسپل دھلی کالج تھے —

انجمن نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کے لیے چند قواعد بھی وضع کیے تھے جن کا یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ھوگا —

۱ - جب سائنس کا کوئی ایسا لفظ آئے جس کا مترادف اردو نہیں مثلاً سو ڈیم ' پوٹے سیم ' کلورین وغیرہ تو ایسے لفظ کو بجنسہ اردو میں لے لینے میں کوئی ھرج نہیں - یہی قاعدہ ایسے خطابات والقاب کے بارے میں بھی مد نظر رکھا جاے جن کے مساوی خطابات و القاب ھندوستان کی تاریخ میں نہیں پاے جاتے - مثلاً بشپ ' ڈیوک ' ارل ' کلکٹر وغیرہ —

۲ - اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ھے جس کا مترادف اردو میں پایا جاتا ھے تو اردو لفظ ھی استعمال کرنا چاھئے - جیسے آئرن کے لیے لوھا ؛ سلفر کے لیے گندھک ؛ منسٹر کے لیے وزیر : سمنز کے لیے طلب نامہ —

۳ اگر لفظ مرکب ھے اور ھر دو لفظ انگریزی ھیں اور دونوں میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہ اردو میں منتقل کرلیا جاے - جیسے ھائڈرو کلورک - کیوں کہ ھائڈروجن اور کلورائن میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو بجنسہ اردو میں لے لیا جاے بلکہ اُسے اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جاے - مثلاً جسٹس آف دی پیس کو اردو میں جسٹس پیس کی اور ملٹری آرڈر آف دی باتھہ کو لشکری جماعت باتھہ کی اور

ملٹری اینڈ ریلیجس آرڈر آف مالٹا کو لشکری و مذہبی جماعت مالٹا
کی ترجمہ کیا جاے —

۴ - اگر لفظ مرکب ہے اور اردو میں اُس کا کوئی مترادف نہیں ' مگر الگ
الگ لفظ کے مترادف اردو میں موجود ہیں تو یا تو اِن دونوں لفظ
کو ملا کر یا کسی دوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کرلیا جاے -
مثلاً کرانولوجی Chronology کا ترجمہ علم زماں - ہاؤس آف لارڈز کا
کچہری امیروں کی - ہاؤس آف کامنز کا کچہری و کلاے رعایا کی یا
صرف کچہری و کلا کی —

۵ - جب یہ قاعدہ یا قاعدۂ ذیل اسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر
زبان کا لفظ اردو میں لے لیا جائے - جیسے ہائیڈروجن ' نائٹروجن —

۶ - اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہے جن میں سے ایک کا مترادف
اردو میں موجود ہے مگر دوسرے کا مترادف نہیں تو ایک انگریزی اور
دوسرے اردو سے مرکب بنا لیا جاے - جیسے کورٹ آف ڈائرکٹر کا
ترجمہ کچہری ڈائرکٹروں کی - آرچ بشپ کا ' بشپ اعلیٰ کرلیا جاے —

۷ - بعض لفظ ایسے ہیں جیسے آرڈر (Order) ' کلاس ' جینس (Genus)
اسپیشیز (Species) جن کے مترادف اگر چہ کسی نہ کسی صورت میں
اردو میں پاے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل
کر لیے جائیں تو مناسب ہوگا - کیونکہ اردو میں اس قسم کے الفاظ
ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں اور اس سے ایک دوسرے کے مفہوم
کے سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ ان الفاظ کے معانی
کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت اہم ہے —

۸ - درختوں کے انواع (خاندانوں) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز

فرد کے نام پر رکھے جاتے هیں یا اس نوع کی مشترک خاصیتوں کی بنا پر نام رکھہ لیا جاتا ھے - اس قاعدے کی پابندی اردو میں بھی کی جاے - اگر یہ زیادہ آسان اور مفید ثابت ھو کہ ھر نوع (خاندان) کے الگ الگ نام صرف اس کے خاص اور ممتاز افراد پر رکھے جائیں تو پھر یہی کیا جاے —

اوپر کے قواعد میں اردو مترادف سے مطلب ایسا لفظ ھے جو ملک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقے میں معروف ھے - اگر ھماری مشرقی زبانوں کی ڈکشنریوں میں کوئی مترادف لفظ نہ ملے اور پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے تو یہ بہتر ھے کہ انگریزی لفظ ھی اختیار کر لیا جاے - سائنس کا ترجمہ انگریزی ھی سے کیا جاے کا اس ایسے انگریزی الفاظ سے زبان کو بچانا تقریباً نا ممکن ھے —

ساتھہ ھی یہ بھی هدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ھو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جاے - جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاھتا ھے تو اُسے چاھئے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اس سے قبل لکھی جاچکی هیں انھیں مہیا کرے اورجب تک کوئی خاص وجہ نہ ھو انھیں الفاظ کے استعمال کرنے کی کوشش کرے جو ان کتابوں میں استعمال کیے گئے هیں - جب کسی انگریزی جملے میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ھو جس سے اهل هند واقف نہ ھوں تو مترجم کو چاھیے کہ حاشیے میں یا مناسب ھو تو متن میں اس کی مختصر طور پر تشریح کردے —

مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کی کبھی کوشش نہ کرنی چاھیے - ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنے جملے کے معنے اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ھے - خواہ اس کی ساخت یا طرز ادا کیسی ھی مختلف کیوں نہ ھو -

کیمسٹری کی اصطلاحات کے متعلق یہ راے دی گئی تھی کہ تمام اصطلاحی الفاظ کو بجنسہ اردو میں لے لینا مناسب ہوگا - البتہ کیمیاوی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے دیے جائیں ' لیکن مرکبات میں انگریزی نام ہی رہیں ' جیسے هائڈرو سلفرک وغیرہ - چوں کہ اصطلاحی الفاظ کے مادے تعداد میں بہت زیادہ نہیں اس لیے اُن کی تفہیم میں کوئی زیادہ مشکل نہ ہوگی -

نباتیات کا ترجمہ بہت کٹھن ہے - یورپین مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہوجاے گا - البتہ جو دوسرا طریقہ درختوں کے خاندانوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہے وہ زیادہ بہتر ہے اور عام طور پر مستعمل ہے ' خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ یورپ کے کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد ہمیشہ وہی نہیں ہوتے جو ہندوستان میں ہیں - بہرحال یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی صاحب جو نباتیات کا عام علم رکھتے ہوں اور اردو بھی خوب جانتے ہوں اس کام کو انجام دیں -

اگرچہ یہ انجمن انگریزی ' عربی ' سنسکرت اور فارسی زبانوں سے اعلیٰ درجے کی کتابیں اردو ' بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی لیکن سواے اردو کے بنگالی اور ہندی میں کوئی ترجمہ نہیں ہوا - سکریٹری نے اپنی رپوٹ میں اس کی کئی وجوہ بتائی ہیں - ایک تو یہ کہ انجمن کا سرمایہ محدود ہے اور فی الحال ہمیں اپنی کوششیں صرف ایک زبان تک محدود رکھنی چاہئیں - دوسرے ' علاوہ اس امر کے کہ بنگال سے صرف ایک ہی صاحب نے چندہ عطا کیا ہے ' بنگالی زبان بہ نسبت ہندوستانی کے زیادہ ترقی یافتہ ہے - تیسرے ' اُردو ترجموں کے لیے دہلی کالج سب سے موزوں جگہہ ہے ' ہندی اور بنگالی ترجموں کے لیے اس قدر موزوں نہیں - چوتھے ' ہندوستانی زبان کمپنی کے علاقوں (بہار اور بالائی صوبوں) کی رعایا

کے لیے هندی کے مقابلے میں زیادہ اهمیت رکھتی هے - اور اغلب هے کہ رفتہ رفتہ یہی زبان ان علاقوں کے گورنمنٹ مدارس اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم هوجاے گی - فی الحال بڑی رکاوٹ اس میں یہ هے کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں هیں اور اس لیے جہاں تک ممکن هو همیں کوشش کرنی چاهئے کہ هم هندوستانی زبان کی کامل " اسکول بک لائبریری " تیار کردیں اور اس کے بعد احاطۂ بنگال کی باقی خاص زبانوں کی طرف توجہ کریں -

رپورٹ کے آخر میں لکھتے هیں کہ " مجلس انتظامی نے یہ تہیہ کرلیا هے کہ بنگالی اور هندی میں ترجموں کے تیار کرنے اور طبع کرنے کے قبل اردو کی ایک چھوٹی لائبریری کا مکمل کرلینا نہایت ضروری هے خصوصاً مدارس کی کتاب کا - ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے ان دو زبانوں میں کوئی کام نہیں کیا - لیکن هندوستان میں وہ پیچھے نہیں رهی - علاوہ اس کے اردو بہار اور صوبجات مغربی میں سرکاری زبان هے اور اس لیے هندی سے زیادہ اس کی اهمیت هے " -

اصل بات یہ هے کہ اگرچہ انجمن کے مقاصد وسیع تھے اور وہ تینوں زبانوں کے لیے کام کرنا چاهتی تھی لیکن کام کرنے والا صرف ایک هی شخص تھا یعنے دهلی کالج کے پرنسپل مسٹر بتروس - انھوں نے هی اس سے پہلے یہ کام چھوٹے پیمانے پر اپنے کالج میں شروع کر رکھا تھا - جب یہ انجمن قائم هوی تو اس کا کام بھی کالج والے هی کرتے تھے اور جیسا کہ ان کے هاں پہلے سے هوتا آیا تھا سب کتابیں اور ترجمے اردو هی میں مرتب هوے اور شروع هی سے یہ انجمن اور اس کا سارا کام دلی کالج کے هاتھہ میں آگیا - اور یہ انجمن " دهلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی " کہلانے لگی - ورنیکلر سوسائٹی ، ٹرانسلیشن سوسائٹی ، اردو سوسائٹی ، لائبریری آف یوسفل

نالج وغیرہ سب اسی کے نام ہیں —

دهلی کالج میں یہ کام پہلے هی سے هو رها تها - جب کالج کی جدید تنظیم هوئی اور مغربی علوم کی تعلیم بهی لازم قرار پائی تو پهر وهی پرانی مشکل پیش آئی که کتابیں کہاں سے آئیں اور بغیر کتابوں کے تعلیم کا هونا معلوم - قدیم السنه یعنی عربی ' سنسکرت یا فارسی میں جدید علوم اور تاریخ پر کوئی کتاب نه تهی اور مولوی اور پنڈت ان مضامین کی تعلیم دے نهیں سکتے تهے' لهذا ایک صورت یه نکالی گئی که تین طالب علم جن میں (ماسٹر) رام چندر سب سے پیش پیش تهے کالج کے کام کے بعد فلسفه و ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحه اردو میں ترجمه کرتے اور پرنسپل بٹروس ترجمه پڑھ کر اصلاح دیتے - اس طرح جب کتاب ختم هوجاتی تو چهاپنے کو دے دی جاتی اور نیچے کی جماعتوں کے نصاب تعلیم میں شریک کردی جاتی —

مسٹر بٹروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر سنہ ۱۸۴۱ ع میں هوا اور اسی وقت سے انگریزی زبان کی کتابوں کا ترجمه تهوڑا تهوڑا کر کے اردو میں هونا شروع هوا - سنہ ۱۸۴۳ ع میں " انجمن اشاعت علوم بذریعۂ السنه ملکی " قائم هوئی اور سرمایے کے بہم پهنچنے سے یه کام کالج میں با قاعدہ هونا شروع هوگیا اور کتابیں " دهلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی " کی نگرانی میں طبع هونے لگیں - پرنسپل بٹروس نے اپنے ایک نوٹ میں بیان کیا هے که کس طریقے سے دهلی کالج میں ترجمے کیسے جاتے تهے - اس نوٹ کا ترجمه یہاں درج کیا جاتا هے —

" پرنسپل کی تحریک پر یا اُس کے مشورے سے هندوستانی مدرس اور شعبۂ انگریزی کی اعلیٰ جماعت کے طالب علم کسی

انگریزی (مطبوعہ یا قلمی) کتاب کو اردو ترجمے کے لیے انتخاب کرتے تھے - انھیں یہ پہلے ھی بتادیا گیا تھا کہ اگر اُن کے ترجمے اچھے ھوے تو جہاں تک جلد ممکن ھوگا اُن کے یہ ترجمے طبع کرا دیے جائیں گے اور اُنھیں (ترجمے کی خوبی اور کام کی دشواری کا لحاظ کر کے) فی صفحہ چھہ آنے سے بارہ آنے تک کی شرح سے معاوضہ دیا جاے گا - طبع سے پہلے ترجمہ کی نظر ثانی مترجم کے مواجہ میں صدر مدرس یا پرنسپل کرتے تھے یا کوئی قابل اور اھل ھندوستانی مدرس اپنی فرصت کے اوقات میں اُسے دیکھہ لیتے تھے - جب نظرثانی ختم ھو جاتی تو ترجمہ چھپنے کے لیے دے دیا جاتا اور کوئی موزوں شخص (اور عام طور پر خود مترجم) اُس کے پروف دیکھتا —

مشرقی زبانوں کے ترجموں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا - صرف اتنا فرق تھا کہ یہ ترجمے نظرثانی کے لیے صدرمدرس یا پرنسپل کی خدمت میں پیش نہیں کیے جاتے تھے - بلکہ یہ کام جیسا موقع ھوتا کسی مولوی یا پنڈت کے تفویض کر دیا جاتا تھا —

مدارس کی درسی کتابیں جو اب تک دھلی کالج یا دوسری درس گاھوں کے استعمال کے لیے طبع ھوئی تھیں، اُن کے صرف ایک ایک سو نسخے طبع کیے گئے تھے - اُن میں سے بہت سی کتابیں ختم ھو چکی ھیں اور بعض " مدرسہ " (یعنی دھلی کالج کے مشرقی شعبے) میں جاری ھیں ۔ ان کتابوں کے متعلق یہ قرار دیا گیا تھا کہ مدرسین پڑھاتے وقت تمام غلطیوں اور مبہم

جملوں وغیرہ پر جو ان کی رائے میں قابل اصلاح ہیں ' نظر رکھیں اور قلمبند کرلیں - بعد ازاں یہ مجوزہ اصلاحیں صدر مدرس یا پرنسپل کو دکھائیں اور اس کی پسندیدگی اور مشورے کے بعد دوسرے اڈیشن میں درج کردی جائیں - چونکہ ہر بعد کے اڈیشن میں یہی طریقہ عمل میں لایا جاتا ہے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ ہر ترجمہ گو شروع میں کیسا ہی ناقص ہو آخر میں تمام غلطیوں سے پاک صاف ہو جا تا ہے --

جب کسی انگریزی درسی کتاب کا اردو میں اچھا ترجمہ ہو جاتا اور چھپ جاتا ہے تو وہ " مدرسہ " میں بالکل اسی طرح کام آتی ہے جیسے کالج کے انگریزی شعبے میں اصل انگریزی کتاب - بعض اوقات کسی مولوی کو ایک ایسے نصاب تعلیم کی بھی نگرانی کرنی پڑتی تھی جس میں ایک ایسی کتاب بھی داخل ہے جو انگریزی کا ترجمہ ہے اور ایک ایسے فن سے متعلق ہے جس سے مولوی صاحب نا واقف ہیں تو ایسی حالت میں وہ خود بھی اُس کتاب کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی پڑھاتے تھے - اگر کسی انگریزی ماسٹر کو جو اردو اچھی طرح بول سکتا ہے ایک اچھی نصاب کی کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں دے دی جاے تو وہ اردو میں ایسی ہی آسانی اور خوبی سے تعلیم دے سکتا ہے جیسے انگریزی میں - اس کے لیے اُسے یہ کرنا ہوگا کہ وہ اردو ترجمہ اپنے طالب علموں کو پڑھ کر سناے یا جماعت کے کسی طالب علم سے پڑھواے - چونکہ اس کے ہاتھہ میں انگریزی کتاب ہوگی وہ آسانی سے ترجمہ سمجھہ لے گا اور

تهوڑی سی مشق کے بعد بغیر زیادہ دقت کے زبانی کتاب کے مطالب سمجھانے پر قادر هو جاے گا " —

سنہ ۱۸۴۵ ع میں جب مسٹر بٹروس بوجہ علالت اپنی خدمت سے علحدہ هوکر یورپ چلے گئے تو ان کی جگہ ڈاکٹر اسپرنگر کا تقرر هوا - ڈاکٹر صاحب موصوف نے بهی ترجمہ و تالیف کے کام کو اُسی شوق اور سرگرمی سے جاری رکھا جیسا کہ اُن سے پہلے هو رها تها -

سنہ ۱۸۴۵ ع میں کالج کی جو رپوٹ مجلس تعلیمی کی طرف سے سرکار میں پیش کی گئی تهی اس میں اس سوسائٹی کاذکر ان الفاظ میں کیا گیا هے -

" مسٹر بٹروس کے جانشین مسٹر اسپر نگر اس کام کو اسی جوش سے انجام دے رهے هیں جیسے وہ شروع کیا گیا تها - اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان ترجموں کے تیار کرانے اور چهپوانے کے اخرجات ایک پرائویٹ سوسائٹی ادا کرتی هے لیکن گورنمنٹ بهی اس کی امداد اس طرح کرتی هے کہ اس کے مطبوعات کے کچهہ نسخے خرید کر کالجوں اور مدارس کو تقسیم کر دیتی هے - یہ بہتر هوتا اگر ٹرانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) کی مساعی زیادہ با ضابطہ اور منظم هوتیں اور پہلے سے مکمل فہرست ایسی کتابوں کی تیار کر لی جاتی جو هر مضمون کے متعلق مسلسل معلومات بہم پہنچانے کے لیے زیادہ مناسب خیال کی جاتیں - پهر یہ فہرست شائع کردی جاتی اور مترجموں کو دعوت دی جاتی کہ وہ کتب مندرجۂ فہرست میں سے کسی کتاب کا ترجمہ کریں - اس قسم کی تجویز کلکتہ کی کونسل آف ایجوکیشن نے بهی سوچی تهی لیکن وہ عمل میں نہ آئی - جو کتابیں

دهلی کالج میں تیار هوئی هیں وہ انفرادی طور پر نہایت
مفید هیں اور جس جوش اور مستعدی سے یہ کام یہاں سر انجام
هورها هے وہ کسی دوسری جگہ مشکل سے هو سکتا تھا تاهم
اس میں شبہ نہیں کہ ان کتابوں کی اصلاح اور ان کو عام
فہم اور مقبول کرنے کی بہت کچھہ ضرورت هے - یہ بہت
عجلت میں تیار هوی هیں اور کالج میں ایسے لوگوں نے لکھی
هیں جو مشاق مترجم نہیں هیں- یوں سمجھنا چاهئے کہ یہ
ابتدای کام هے اور ان سے بہتر اور اعلی کتابوں کے لیے راستہ
تیار کیا گیا هے " —

یہ اعتراض صحیح نہیں هے کہ سوسائٹی کے کام میں کوئی ضابطہ
یا اصول نہیں تھا - مسٹر بتروس نے سوسائٹی کی رپوٹ ۱۸۴۳ و ۱۸۴۴ ع
میں کتابوں کی نوعیت اور ترجمے کے طریقہ وغیرہ پر مفصل بحث کی
هے - بات یہ هے کہ کالج کو پہلے درسی کتابوں کی ضرورت تھی اور ابتدا میں
ویسی هی کتابیں ترجمہ بھی کی گئیں ' بعد ازاں ساتھہ ساتھہ دوسری کتابوں
کے ترجمے اور تالیف کا بھی انتظام کیا گیا جیسا کہ فہرست مطبوعات
سے ظاهر هوگا —

سنہ ۱۸۴۶ - ۴۷ کی رپورٹ میں سوسائٹی کا ذکر ان الفاظ میں آیا هے :

" سوسائٹی کی رپوٹ سنہ ۱۸۴۶ ع سے معلوم هوتا هے کہ سوسائٹی
کی طرف سے جو کتابیں شایع هوی هیں پبلک میں ان کی
مانگ بڑھتی جاتی هے کیونکہ اس سال کتابوں کی فروخت
سے جو رقم وصول هوی هے وہ تقریباً اُس رقم کے مساوی
هے جو گورنمنٹ سے کتابوں کی قیمت کی بابت وصول هوئی

ھے - تا ھم کتابوں کا بہت سا ذخیرہ بھرا پڑا ھے جس کا
نتیجہ یہ ھوا ھے کہ سوسائٹی کا سرمایہ پانچ ھزار آٹھ سو
چودہ روپے پندرہ آنے پانچ پائی سے کم ھوکر تین ھزار دو روپے
دو آنے ایک پائی رہ گیا ھے - اس لیے یہ اندیشہ ھے کہ اگر
کوئی مناسب اور مفید تغیر نہ کیا گیا تو سرمایہ بہت جلد
ختم ھو جاے گا —

رپوٹ میں اس امر پر بھی بحث کی گئی ھے کہ جب بمبئی اور
دوسرے مقامات کے علاوہ لکھنٔو میں بارہ اور دھلی میں سات
سنگی مطبع ھیں اور وہ ایسی مقبول کتابیں شایع کرتے ھیں
جو لوگ پسند کرتے ھیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ دھلی سوسائٹی
اس قسم کی کتابیں طبع کر کے اُن سے مقابلہ کرے —

مگر تجربہ سے یہ ثابت ھوا ھے کہ یورپ میں بھی سائنس کی
کتابیں بغیر قومی سرپرستی کے کوئی مطبع نہیں چھاپ سکتا ورنہ
اُسے خسارہ اُٹھانا پڑے - لہذا توقع کی جاتی ھے کہ جن
حضرات نے انگریزی سائنسوں کو دیسی زبان کے ذریعہ سے ھندوستان
میں شایع کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا وہ پھر سوسائٹی کی اعانت
فرمائیں گے تا کہ وہ اپنا کام جاری رکھہ سکے " —

اس سے قبل بیان ھوچکا ھے کہ یہ سوسائٹی غیر سرکاری اصحاب کی
اعانت سے چلتی تھی تا ھم گورنمنٹ اس کی مدد کرتی رھتی تھی اور جو
نئی کتاب شایع ھوتی تھی اس کے متعدد نسخے خرید کر کالجوں اور
مدرسوں میں تقسیم کرتی تھی - علاوہ اس کے اکثر ارکان سرکاری عہدہ دار
تھے - اور ابتدا میں خود لفٹننٹ گورنر The Hon. J. Thomason.

سوسائٹی کے سر پرست تھے-سرکاری امداد کا اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ پرنسپل صاحب نے یہ تجویز کی کہ ریاضیات ' طبیعی جغرافیہ ' تحلیلی ہندسہ (Analytical Geometry) اور مخلوط ریاضی پر کتابیں شایع کی جائیں تا کہ مشرقی طلبہ کو ان مضامین کے مطالعہ کا موقع ملے - کتب مندرجۂ حاشیہ * ترجمہ کے لیے تجویز ہوئیں اور گورمنٹ سے امداد کی درخواست کی گئی - گورمنٹ کی خواہش پر لوکل کمیٹی تعلیم دھلی نے ان کتابوں کے اردو ترجموں کے چالیس نسخوں کے طبع کا تخمینہ بھیجا اور یہ تجویز کیا کہ ان کا ترجمہ بالکلیہ ماسٹر رام چندر مدرس یورپین سائنس کے تفویض کیا جاے جو کمیٹی کی راے میں ریاضیات اور نیچرل فلاسفی کا بخوبی علم رکھتے ہیں اور فوائد الناظرین اور محب ہند کے اڈیٹر کی حیثیت سے بہت اچھا کام کررہے ہیں - کمیٹی نے اس امر کا اطمینان دلایا کہ ماسٹر صاحب ان کتابوں کا ترجمہ بہت اچھی طرح کریں گے-ان میں سے ہر کتاب کے چالیس نسخوں کے طبع کا خرچ آتھہ سو ستر روپے کیا گیا - لفتنٹ گورنر نے اس تجویز کو منظور کیا اور لوکل کمیٹی کے اطمینان

---

* 1. Wand's Analytical Geometry.
2. Young's Dynamics and Statics.
3. Webster's Hydrostatics
4. Phelp's Optics.
5. L. U. K.'s Heat.
6. L. U. K.'s Hydraulics.
7. L. U. K's Double Refraction & Polarization of Light.
8. Trail's Physical Geography.
9. Rogett's Electricity.
10 Rogett's Galvanism

دلانے پر کہ مترجم اس کام کا اہل ہے اس رقم کے خرچ کرنے کا اختیار کمیٹی کو دیا —

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدہ کے ساتھہ عمل میں آئی ۔ اب میں ان کتابوں کی فہرست دیتا ہوں جو اس سوسائٹی نے لکھوائیں یا طبع کرائیں ، اس سے اُس کے قابل قدر کام کا صحیح اندازہ ہوگا —

سوسائٹی کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست

۱ ۔ تحریر اقلیدس مقالہ ۱ تا ۶ و ۱۱ و ۱۲

۲ ۔ اصول قانون

۳ ۔ تاریخ ہند (زمانۂ قدیم سے تا زمانۂ حال)

۴ ۔ اصول حکومت

۵ ۔ اصول قوانین مالگزاری

۶ ۔ اصول قوانین اقوام

۷ ۔ تاریخ انگلستان (خلاصہ تاریخ گولڈ سمتھہ کا ترجمہ)

۸ ۔ الجبرا (ترجمہ برجز)

۹ ۔ علم مثلث و تراشہاے مخروطی

۱۰ ۔ عملی علم ہندسہ (پریکٹکل جیومیٹری)

۱۱ ۔ اصول علم ہیئت (ترجمہ علم ہیئت ہرشل ابتدائی آٹھہ باب ۔ علم ہیئت بونی کیسل بارھواں باب ۔ تتمہ از انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا)

۱۲ ۔ تاریخ اسلام

۱۳ - تاریخ یونان

۱۴ - تاریخ روما

۱۵ - رسالۂ کیمسٹری (ترجمۂ پارکر)

۱۶ - استعمال آلات ریاضی

۱۷ - اٹلس (جغرافیہ)

۱۸ - قواعد اردو

۱۹ - انتخاب شعراے اردو

۲۰ - انتخاب الف لیلہ

۲۱ - شمسیہ (منطق میں)

۲۲ - سراجیہ (اسلامی قانون وراثت پر)

۲۳ - ترجمۂ گلستاں

۲۴ - قانون محمدی فوجداری (ترجمۂ کتاب میکناٹن)

۲۵ - اردو لغات (یہ کتاب تیار ہوئی مگر چھپنے نہ پائی)

۲۶ - قانون مال (ترجمہ مارشمین)

۲۷ - لیلاوتی (حساب)

۲۸ - راماین

۲۹ - مہا بھارت (انتخاب)

۳۰ - نل دمن

۳۱ - دیوان سودا

۳۲ - دیوان درد

۳۳ - دیوان میر تقی

۳۴ - دیوان جرات

۳۵ - نیچرل فلاسفی
۳۶ - پولیٹیکل اکانومی (معاشیات - ترجمۂ ویلنڈ)
۳۷ - تحلیلی علم ھندسہ (Analytical Geometry)
۳۸ - خلاصۂ شاھنامہ (اردو میں)
۳۹ - مبادیات تفرقی احصا و تکمیلی احصا (Elements of the Differential and Integral Calculus)
۴۰ - تاریخ ایران
۴۱ - میکانیات (لارڈنر)
۴۲ - نیچرل تھیا اوجی (پیلے)
۴۳ - تاریخ اکتشافات بری و بحری
۴۴ - محاورات اردو
۴۵ - تزک تیموری
۴۶ - ترجمہ Smith's Moral Sentiments
۴۷ - یوسف خاں کی سیاحت یورپ
۴۸ - جغرافیۂ قدیم کے نقشے
۴۹ - اصول جبر و مقابلہ
۵۰ - مختصر خاکۂ تاریخ عالم (بریف سروے آف ھسٹری از مارشمین) دو جلد
۵۱ - انتخاب پلوٹارکس لائوز (مشاھیر یونان و روما)
۵۲ - دھرم شاستر
۵۳ - شرع اسلامی
۵۴ - سکپ و تھد کا خلاصۂ قانون فوجداری

۵۵ - پرنسپل کا خلاصۂ قانون دیوانی
۵۶ - مارشمین کا سول گائڈ مع خلاصہ شرع اسلامی و دھرم شاستر
۵۷ - ضابطۂ مالگزاری (مارشمین)
۵۸ - زلیخا
۵۹ - بدر منیر
۶۰ - لیلی مجنوں
۶۱ - حدائقہ البلاغہ
۶۲ - شکنتلا
۶۳ - سنسکرت اور انگریزی ڈرامے
۶۴ - رگھوونش (کالیداس کا ڈراما)
۶۵ - تعلیم نامہ
۶۶ - جامع الحکایات
۶۷ - تاج الملوک و بکاؤلی
۶۸ - اسسٹنٹ میجسٹریٹ گائڈ
۶۹ - تاریخ خاندان مغلیہ (تیمور کے زمانے سے شاہ عالم تک)
۷۰ - فلسفہ (Abercrombie's Mental Philosophy) (زیر ترجمہ)
۷۱ - نگارستان (زیر ترجمہ)
۷۲ - تاریخ چارلس دوازدہم (زیر ترجمہ)
۷۳ - جغرافیۂ طبعی (ترجمۂ ترپل)
۷۴ - علم و عمل طب (عربی سے) (زیر ترجمہ)
۷۵ - طبعی نباتیات (زیر ترجمہ)
۷۶ - حفظان صحت (زیر ترجمہ)

۷۷ - عضویات (علم افعال عضویات) (زیر ترجمہ)

۷۸ - علم معدنیات   (")

۷۹ - تذکرۂ حکما

۸۰ - مساحت (ترجمہ تہیو تو لک)

۸۱ - چشمۂ فیض (مختصر قواعد اردو)

۸۲ - طبیعیات (ترجمہ ارنات)

۸۳ - صرف و نحو انگریزی (اردو میں)

۸۴ - عملی ساحت زمین

۸۵ - Sextant

۸۹ - هندوستان کے پیداواری ذرائع (ترجمۂ رائل)

۹۰ - سوانح عمری رنجیت سنگھ

۹۱ - رسالۂ طب

۹۲ - ترجمہ الوالفدا (تین جلدوں میں)

۹۳ - تاریخ کشمیر

۹۴ - جغرافیۂ هند

۹۵ - فرایدالدھر (تاریخ شعراے عرب)

۹۶ - تاریخ بنگال

۹۷ - رسالۂ مقناطیس (لائبریری آف یوسفل نالج کے رسالے کا ترجمہ)

۹۸ - تذکرۂ هندو شعرا

۹۹ - رسالہ جراحی (سرجری)

۱۰۰ - حرکیات و سکونیات   (Young's Dynamics & Statics)

۱۰۱ - Webster's Hydrastatics

۱۰۲ - علم الناظر (ترجمهٔ فلپ ' Phelp)

۱۰۳ - حرارت (لائبریری آف یوسفل نالج کے رسالے کا ترجمه)

۱۰۴ - Hydraulics (")

۱۰۵ - Double refraction & Polarization of Light (,,)

۱۰۶ - رسالهٔ علم برق (ترجمهٔ راجت)

۱۰۷ - گالون ازم (")

۱۰۸ - حکماے یونان

۱۰۹ - حالات هندوستان ماخوذ از انسائیکلوپیڈ یا آف جیوگریفی مرتبهٔ مرے

۱۱۰ - هدایت المهتدی

۱۱۱ - مزید الاموال یا سلاح الاحوال (علم زراعت)

۱۱۲ - رسالهٔ اصول حساب (ترجمه ڈی مورگن)

۱۱۳ - ترجمهٔ تاریخ الحکما ' ترجمهٔ تذکرةالمفسرین (جلال الدین سیوطی)
تذکرة الفقها خلاصهٔ و فیات اعیان ترجمه تاریخ ابن خلکان

۱۱۴ - تذکرهٔ شعراے هند

۱۱۵ - رسالهٔ طب (انگریزی سے)

۱۱۶ - تذکرة الکاملین

۱۱۷ - سنن ترمذی (اردو ترجمه)

خطبات گارساں دتاسي

سولھواں خطبہ - ۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ ع

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ،

پروفیسر جامعۂ عثمانیہ - ڈی لٹ (پیرس))

حضرات !

اس سال ہندوستانی زبان کے اخبارات کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا ہے - میں ان میں سے چھبیس کے نام ابھی گناتا ہوں - ان سب اخباروں کے طرز تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ استعارے کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں اور عبارت مرصع ہوتی ہے - اہل مشرق شاید ہی کبھی اپنے خیال کو سادہ زبان میں ادا کرتے ہیں - مثال کے طور پر میں لاہور کے اخبار کوہ نور سے ایک اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں * —

میں پہلے صوبۂ شمالی مغربی کو لیتا ہوں - سنہ ۱۸۶۵ ع میں اس صوبے میں اٹھارہ ہندوستانی اخبار شائع ہوتے تھے - اس سال " اخبار عالم " نیا جاری ہوا ہے - اس اخبار کے خریداروں کی تعداد اور اخبارات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے - اس کی ۵۳۷۰ کاپیاں چھپتی ہیں - اس کے مدیر

* یہاں چند جملوں کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

کا نام مرزا وجاہت علی خاں ہے - یہ اخبار ہفتہ وار پنجشنبہ کے روز نکلتا ہے - یہ سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر صفحے پر دو خانے ہوتے ہیں - اکثر اوقات " میرٹھ گزٹ " بطور ضمیمہ اس کے ساتھ شائع ہوتا ہے - اس اخبار کے مدیر موصوف نے مجھے اس کا ایک نمونہ بھیجا ہے - اس کے پڑھنے سے مجھے بعض نئی کتابوں کے شائع ہونے کا علم ہوا اور اس کے علاوہ دوسرے ادبی مشاغل کی نسبت معلومات حاصل ہوئیں - اس اخبار کے مضامین کا معیار اچھا خاصا بلند ہے - مثلاً پچھلے نمبر میں سفر کے فوائد اور علم طبابت کی خوبیوں پر دلچسپ مضامین تھے - آخرالذکر مضمون میں رسول اکرم (صلی‌اللہ علیہ و سلم) کی حدیث نقل کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ علم دنیا میں دو ہیں - ایک وہ علم جس سے جسم کے امراض کا علاج معلوم ہوتا ہے اور دوسرا علم دین - اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں : " العلم علمان : علم‌الابدان و علم‌الادیان —

میں اب دوسرے اخباروں کا ذکر کرتا ہوں —

(۱) نجم‌الاخبار - یہ اخبار میرٹھ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے - اس نام کا ایک اخبار سورت سے بڑی پہلے سے نکلتا ہے —

(۲) کانپور گزٹ - یہ اخبار کانپور سے نکلتا ہے - منشی نول کشور اس کے مدیر ہیں - موصوف لکھنؤ کے مشہور مطبع کے مالک ہیں جہاں سے " اودھ اخبار " آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے —

گزشتہ سال میں نے کانپور کے ایک اور اخبار کا ذکر کیا تھا جس کا ایک نمبر مسٹر جے پلاٹس نے مجھے از راہ کرم بھیجا ہے - اِس اخبار کا نام " شعلۂ طور " ہے - گزشتہ مرتبہ میں یقین کے ساتھ اس اخبار کے متعلق آپ کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکا تھا - اب مجھے اس کی نسبت ضروری معلومات

حاصل ہوگئي ہیں - یہ ہر ہفتہ سہ شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے - اس میں سولہ صفحے ہوتے ہیں اور ہر صفحے میں دو خانے ہوتے ہیں - پورا اخبار اردو میں ہوتا ہے - اس کے مدیر جملا پرشاد ہیں - شیخ عبدالله جو پہلے کبھی " شملہ اخبار " کے مدیر رہ چکے ہیں اس اخبار میں مضامین لکھتے ہیں —

(۳) مجمع البحرین - یہ اخبار لدھیانہ سے شائع ہوتا ہے - اس کے مدیر محمد ناصر خاں اور محمد شاہ ہیں —

(۴) آب حیات ہند - یہ آگرہ سے شائع ہوتا ہے - اس کے مدیر کا نام بنسی دھر ہے جو آگرہ کے نارمل اسکول میں مدرس ہیں - موصوف چھوتے بڑے پچاس رسالوں کے مصنف ہیں - اس اخبار کے ہر صفحے پر ایک خانہ میں اردو کے مضامین ہوتے ہیں اور اس کے برابر دوسرے خانے میں وہی مضامین ہندو رسم خط میں ہوتے ہیں - ہندي کے حصے کا نام " بھارت کھنڈ امرت " ہے - میں نے اس اخبار کی نسبت اپنے سنہ ۱۸۶۴ ع کے خطبے میں تھوڑا سا ذکر کرکے چھوڑ دیا تھا - یہ اخبار ماہوار ہے اور حجم سولہ صفحے کا ہے - مطبع نورالعلم میں طبع ہوتا ہے - اس اخبار کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں کي مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی جائے - چنانچہ اس کے مدیر بنسی دھر " انجمن حق " کے صدر بھی ہیں جس نے اس اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے —

(۵) کارنامۂ ہند - یہ خواجہ محمد ہاشم کے زیر ادارت سوہنہ ضلع گوڑ گاؤں سے شائع ہوتا ہے - اس کی پہلی اشاعت پچھلے ستمبر میں نکلی تھی - " اخبار عالم " کے مدیر وجاہت علی نے اس اخبار کے طرز تحریر اور اس کے تنوع کی بہت تعریف کی ہے - ان کا اس پر

بس ایک یہ اعتراض ہے کہ نام کوئی اور دوسرا رکھنا چاہئے تھا اس لیے کہ اس نام کا ایک اخبار لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے —

لکھنؤ کے نام پر مجھے اس وقت " اودھ اخبار " یاد آگیا - یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے - چنانچہ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے - اس کی تقطیع اور صفحات کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے - یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ہر چہار شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے - شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر ' پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے - پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہوگئی ہے - میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے - اس سے آپ کو اس امر کا اندازہ ہوگا کہ اخبار بینی کا شوق ہندوستانیوں میں کس قدر بڑھ رہا ہے - اخبار اب تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ضروریات زندگی میں شامل ہوگیا ہے —

۱۲ دسمبر کی گزشتہ اشاعت میں بے صبر سہارنپوری کی ایک غزل تھی اور ایک اور دوسرے شاعر رعنا کا ایک خط تھا جس میں بھوتان کے متعلق حالات تھے - آخر میں ایک نوجوان شاعر عیش کا لکھا ہوا سہرا نقل کردیا تھا —

پنجاب کے جدید اخبارات کی تفصیل یہ ہے —

(۶) پنجابی - اس اخبار کے مدیر اور مالک محمد عظیم ہیں - یہ اردو اخبار لاہور سے شائع ہوتا ہے —

(۷) گیان پر دینی پتر کا - یہ ماہوار رسالہ لاہور سے شائع ہوتا ہے -

اس کے مضامین علمی نوعیت کے ہوتے ہیں - پنڈت مکند رام کشمیری اس کے مدیر ہیں - ہر صفحے پر دو خانے ہوتے ہیں - ایک خانے میں ہندی اور دوسرے خانے میں اردو ہوتی ہے - اس رسالے کے علمی مضامین بہت دلچسپ ہوتے ہیں - کبھی کبھی مضامین کے ساتھہ تصویریں بھی ہوتی ہیں تا کہ مطالب کی وضاحت ہو سکے - اس کے علاوہ دوسرے مضامین تاریخ ' جغرافیہ اور ادب پر ہوتے ہیں -

(۸) لاہور سے ایک اور ہندوستانی اخبار بہت عرصہ سے شائع ہو رہا ہے جس کے متعلق مجھے ابھی حال ہی میں ڈاکٹر لیٹنر (Dr. Leitner) کے توسط سے معلومات حاصل ہوئی ہیں - موصوف نے از راہ عنایت اپنے نوجوان دوست (Lepel Griffin) کی وساطت سے مجھے یہ اخبار بھیجا جو انجمن لاہور کے نائب صدر اور " تاریخ امرائے پنجاب " کے مصنف ہیں * - اس اخبار کا نام " بحر حکمت " ہے یہ ماہوار رسالہ طب یونانی سے متعلق مضامین شائع کرتا ہے - اسکے مدیر منشی گوری شنکر ہیں -

۹) دسمبر سنه ۱۸۶۵ ع سے سیالکوٹ سے ایک اور جدید ہندوستانی رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کا نام " دیر حواء پنجاب " ہے - اس اخبار کے متعلق لاہور کے کوہ نور اور میرٹھہ کے " اخبار عالم " میں جو تقریظیں نکلی ہیں وہ میری نظر سے گذریں - اس اخبار کے مدیر منشی دیوان چند ہیں جو سنه ۵۷ ع کی شورش عظیم سے قبل تین اخبار شائع کرتے تھے - میری مراد " چشمۂ فیض " " خورشید عالم "

* History of the principal chiefs and native gentry of the Punjab.

اور " اخبار پنجاب " سے ہے - اب جو انھوں نے اخبار نکالا ہے وہ مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے - مدیر نے اپنے اس اخبار کو استعارۃً " چشمہ فیض " سے تعبیر کیا ہے جو ان کے پرانے پرچہ کا نام تھا -

" کوہ نور " اور " سرکاری اخبار " لاہور سے بدستور شائع ہورہے ہیں - ہندوستانی صحافت میں ان دونوں اخباروں نے جو حیثیت حاصل کرلی ہے وہ بدستور قائم ہے - کوہ نور میں جدید کتب کے متعلق تفصیلی تنقیدیں ہوتی ہیں - یہ تنقیدیں صرف اردو زبان کی کتابوں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ عربی فارسی اور سنسکرت کتابوں پر بھی ہوتی ہیں - اس کے علاوہ انجمن لاہور کے جلسوں کی کارروائی اور اس کے قواعد وغیرہ بھی اس اخبار میں درج ہوتے ہیں - اس انجمن کا مقصد ، جیسا کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہے ، اشاعت علم ہے - اس اخبار میں بعض مضامین تعلیم نسوان کے متعلق بھی میری نظر سے گذرے - اس میں نوجوان شعرا کا کلام بھی ہوتا ہے جنھوں نے ابھی حال ہی میں ادبی دنیا میں قدم رکھا ہے —

" سرکاری اخبار " کی پچھلی اشاعت میں ایک مضمون میری نظر سے گذرا جس میں خط شکستہ کی اصلاح پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے - اس مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اردو صاف اور سنبھال کر لکھنی چاہئیے - بالعموم اہل ہند بہت بے پروائی سے لکھنے کے عادی ہیں - اس کے علاوہ دوسرے مضامین تیل کی جگہ گیس کے استعمال ، ہندوستانی روی کی خوبیاں ، پنجاب کی تجارتی حالت ، اور علم فلکیات کے فوائد پر ہیں —

(۱۰) نیر راجستان - یہ اخبار راجپوتانہ میں شہر جے پور سے ہفتہ وار شائع

ہوتا ہے ۔ میرے نوجوان دوست ای ایچ پامر کی عنایت سے اس کے چند نمبر مجھے حاصل ہو گئے ۔ اس اخبار کی تاریخ ان دو اشعار سے نکلتی ہے * —

(۱۱) مدراس سے ایک نیا اخبار شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کا نام " اخبار کرتان (Akhbar - i - Kartan) ہے ۔ یہ اخبار مہینے میں تین مرتبہ نکلتا ہے ۔ اس کا پہلا نمبر پچھلے سال سنہ ۱۸۶۵ ع میں شائع ہوا تھا ۔ یہ چھوٹی تقطیع پر ہوتا ہے ۔یہ اخبار پہلے بھی (کسی اور نام سے) نکلتا ہوگا اس واسطے کہ اس کے سر ورق پر سنہ ۱۲۷۸ ہجری (۱۸۶۰ ع) کا سن لکھا رہتا ہے ۔ پہلے نمبر کے سر ورق پر اس اخبار کی تعریف میں ایک مدحیہ غزل درج ہے † —

(۱۲) مدراس سے ایک دوسرا اخبار شمس الاخبار جاری ہے ۔ یہ اخبار بھی ہر دسویں دن شائع ہوتا ہے ۔ چھوٹی تقطیع پر بارہ صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ ہر صفحے پر ۲۱ سطریں ہوتی ہیں ۔ اور ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں —

(۱۳) تحفۃ الاخبار ۔ اس نام کا ایک اخبار پیشتر سے دہلی سے نکلتا ہے ۔ لیکن یہ اخبار مدراس میں بہت عرصہ سے جاری ہے ۔ یہ بھی مہینے میں تین بار نکلتا ہے ۔ کبھی کبھی تصاویر بھی ہوتی ہیں —

(۱۴) مظہر الاخبار ۔ یہ خبار مدراس سے ہر دسویں دن نکلتا ہے ۔ اس کے مدیر عبرت ہیں جو اپنی شاعری کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں ۔ یہ اخبار بہت عرصے سے جاری ہے اور بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اندر

---

* اس جگہ ان اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

† یہاں غزل کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

اوقات ہر اشاعت کے ساتھہ ایک ضمیمہ بھی ہوتا ہے —

پچھلے سال میں نے آپ صاحبوں کے سامنے مدراس کے ایک اخبار " صبح صادق " کا ذکر کیا تھا - اس وقت میرے پیش نظر اواخر سنہ ۱۸۶۵ ع کی چند اشاعتیں ہیں جو مجھے پانڈی چری کے مددگار کمشنر موسیوای سیسے (E. Sice) نے بھجوائی ہیں - یہ اخبار مہینے میں تین بار شائع ہوتا ہے اور بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے - کبھی کبھی اسکے ساتھہ ایک ضمیمہ بھی ہوتا ہے جس میں ادبی مضامین ہوتے ہیں - اس کی چھپائی عمدہ قسم کی ہوتی ہے - سرورق پر جہاں اخبار کا نام ہوتا ہے اس کے چاروں طرف سرخ رنگ کے بیل بوتے بنے ہوتے ہیں - ان گل بوتوں کے اندر چار اشعار لکھے ہوتے ہیں جن میں اس اخبار کی نوعیت اور مقصد کو بتایا گیا ہے - ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے * -

(۱۵) ریاض الاخبار - یہ اخبار مدراس سے نکلتا ہے - اس نام کا اخبار بمبئی سے بھی شائع ہوتا ہے - اس کے سرورق پر لکھا رہتا ہے : " ریاض الاخبار میمنت اساس " - یہ اخبار ہفتہ وار ہے - چھوٹی تقطیع پر سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے - ہر صفحے پر اٹھارہ سطریں ہوتی ہیں اور صفحہ دو کالموں (خانوں) میں تقسیم ہوتا ہے - اس کے مدیر کا نام سید حسین ہے —

(۱۶) میں نے بمبئی کے جن اخباروں کا آپ کے سامنے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ ایک اور اخبار نکلتا ہے جس کا نام " برق خاطف " ہے - اس اخبار کے ایڈیٹر مظفر حسین ہیں —

* یہاں اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

(۱۷) بمبئی سے ایک اور اخبار " سیتا دیپک " بھی جاری ہے - مجھے اس کا پوری طرح یقین نہیں کہ ہندی میں ہے یا اردو میں —

' میرٹھ کے اخبار عالم ' اور دوسرے اخبارون سے مجھے جن اخباروں کے نام معلوم ہوے ہیں اور جو اب تک میری نظر سے نہیں گذرے ' ان کی فہرست یہاں پیش کرتا ہوں —

(۱۸) محسن الاخبار

(۱۹) کارنامہ . لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے —

(۲۰) سوم پرکاش —

(۲۱) قاسم الاخبار - بنگلور سے شائع ہوتا ہے —

(۲۲) مجمع البحرین - حیدرآباد سے نکلتا ہے —

(۲۳) اخبار انجمن ہند لکھنؤ —

(۲۴) اخبار سہیل پنجاب —

(۲۵) لاہور سے ایک ماہوار اخبار " گنج شائگان " کے نام سے نکلتا ہے - اس میں حکومت کے احکام و قوانین اردو میں درج ہوتے ہیں - اس کے ساتھہ اصل انگریزی بھی ہوتی ہے - اس کے مدیر پنڈت سورج بھان ہیں - جو ایک انگریزی صرف و نحو کی کتاب کے مصنف ہیں - موصوف نے انگریزی زبان سے متعدد ترجمے ہندوستانی میں کیے ہیں —

(۲۶) رسالہ انجمن اشاعت مطالب - یہ ہر سہ ماہی پر شائع ہوتا ہے - میرے پیش نظر تین اشاعتیں ہیں جو بڑی تقطیع پر شائع ہوئی ہیں - یہ رسالہ لاہور میں چھپتا ہے —

میں اس وقت صرف ہندوستانی زبان کے اخبار و رسائل کی نسبت آپ کے سامنے ذکر کررہا ہوں . برسبیل تذکرہ ایک انگریزی اخبار کے

متعلق یہاں اشارہ کیے دیتا ہوں جس کا نام Southern Cross ہے - یہ اخبار انگریزی میں الہ آباد سے پچھلے جون کے مہینے سے نکلنا شروع ہوا ہے - یہ انگلی کن (Anglican) کلیسا کی طرف سے شائع ہوتا ہے - اس میں مذہب و لسانیات کے متعلق دلچسپ معلومات درج ہوتی ہیں - اس کی ادارت تمام تر یورپین لوگوں کے ہاتھ میں ہے —

میرے محترم دوست میجر فلّر نے پنجاب ایجوکیشنل میگزین کے پچھلے نمبر بھیجے ہیں - سنہ ۱۸۶۶ ع میں اُس کا کوئی نمبر نہیں نکلا - ڈاکٹر لیٹنر جو اس کے مدیر تھے اب دوسرے مشاغل میں اس قدر منہمک ہیں کہ اس کی طرف توجہ کرنے کی انہیں فرصت نہ ملے گی - ایک اشاعت میں انگریزی تعلیم کے متعلق ایک مضمون میری نظر سے گذرا جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ انگریزی زبان کی ترقی سے سوائے سرکاری نوکری کرنے والوں کے عام طور پر ہندوستانی لوگوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا بلکہ ان کی زندگی کو اس سے الٹا نقصان پہنچا —

اس میگزین کے ساتویں نمبر میں دوسرے مضامین کے علاوہ رند دہلوی کی ایک غزل بھی ہے - رند ہم عصر شعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں - ان کی غزلیات کا مجموعہ دو دیوانوں میں شائع ہو چکا ہے - ان دیوانوں کا نام " گلدستۂ عشق " ہے - یہ غزل بہت چھوٹی سی ہے اس لیے میں اس کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں * —

پچھلی دفعہ جب میں نے ہندوستانی ادب پر آپ کے رو برو تبصرہ کیا اس کے بعد سے اس وقت تک بہت ساری کتابیں شائع ہو چکی ہیں -

* اس جگہ غزل کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

صرف شمالی مغربی صوبے میں سنہ ۱۸۶۵ ع میں ۳۴۹ کتب شائع ہوئی ہیں۔ یہ تعداد اُن کتب کے علاوہ ہے جو اس صوبے کے ناظم تعلیمات کے حکم سے شائع کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت دو لاکھہ ۶۸ ہزار پانچ سو کی تعداد میں ہوئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان تصانیف میں بیشتر ترجمے ہیں یا بعض کتب دوسری بار طبع ہوئی ہیں۔ ان تصانیف میں ۷۸ ہندو مذہب پر ہیں۔ اور ۳۶ اسلام پر۔ میں حسب معمول ان میں سے اہم تصانیف کے متعلق ذکر کروں گا۔ پہلے میں ہندی تصانیف کا ذکرکروں گا اس لیے کہ ان کی تعداد کم ہے۔ آئندہ کبھی میں بتاؤں گا کہ ہندی تصانیف کی تعداد اردو کے مقابلے میں کم کیوں ہے —

سنسکرت ویا کرن ۔ اس کے مصنف نوبن چند ہیں ۔ اس میں سنسکرت کی صرف و نحو پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب لاہور میں چھپی ہے ۔ بہ نسبت اور دوسری تصانیف کے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں یہ کتاب نہایت صاف اور سلجھی ہوئی زبان میں ہے ۔ میرے دوست میجر فلّر کا بیان ہے کہ پنجاب میں اس کتاب کی بہت قدر ہو رہی ہے —

چتر چندرک ۔ اس کے مصنف مہاراجہ بلونت سنگھہ ہیں ۔ یہ کتاب فن شاعری پر ہے۔ موصوف خود بڑے شاعر ہیں اور آپ کا ایک دیوان چھپ چکا ہے ۔ آگرہ میں آپ کے ہاں شعر و سخن کی بزم ہمیشہ منعقد ہوا کرتی تھی —

آنند پیوس ہارا ۔ شنکرا چاری نے "تتوانو سندھن" کا یہ ہندی ترجمہ کیا ہے اور فارسی اور ناگری رسوم خط میں اسے شائع کیا ہے ۔ یہ کتاب "ویدانت شاستر" کا خلاصہ ہے ۔ بلند شہر میں طبع ہوئی ہے * ۔

* کوہ نور ۶ فروری سنہ ۱۸۶۶ ع

برت مہاتم - بال گوبند مہتر نے یہ کتاب ہندی نظم میں لکھی ہے - بقول مدیر "کوہ نور" عام طور پر ہندوستانیوں کے لیے مفید بنانے کے لیے اس کتاب کو فارسی رسم خط میں بھی شائع کیا ہے - اس کا موضوع ہندو دیو مالا کے قصے ہیں جن کے پڑھنے یا سننے سے ثواب حاصل ہوتا ہے - ان قصوں کے ماخذ سنسکرت کی کتابیں ہیں - مصنف نے ان قصوں کو عام طور پر ہندوؤں میں رائج کرنے کے لیے بہت اچھا کیا کہ ہندی نظم میں پیش کر دیا —

میرٹھ کے "اخبار عالم" مورخہ ۲۳ اگست سے معلوم ہوا کہ جائسی کی پدماوت فارسی رسم خط میں طبع ہوگئی ہے —

مہاراجہ ہلکر کے اتالیق امید سنگھ نے بھگوت گیتا کا اصل بین السطور ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے - حواشی میں صرف و نحو کے مسائل کی تشریح ہے - اس کے ساتھ ہندی اور اردو دونوں میں بھگوت گیتا کی تفسیر ہے - بقول مدیر "اخبار عالم" کے تمہید اور تشریح کو پڑھنے سے متن کی ساری دشواریاں پانی ہوجاتی ہیں - اس سے ہندوؤں کو اس کے مطالب سمجھنے میں سہولت ہوگی اور مسلمانوں میں سنسکرت زبان کا شوق پیدا ہوگا جو اب تک ان میں بہت کم پایا جاتا ہے - میں نے ابھی "گیان پردیپنی پتر کا" کا ذکر کیا تھا - غالباً وہ یہی ترجمہ ہے جو دوسرے نام سے لاہور کے مجلۂ علمیہ میں شائع ہوچکا ہے —

ہندی کا شکنتلا ناٹک دیوناگری رسم خط میں پہلی دفعہ بنارس میں چھپا ہے - میرے پاس اس کے اصل کا مخطوطہ ہے جو John Romer نے مجھے دیا ہے - کالیداس کے اس مشہور ناٹک کا اردو ترجمہ کاظم علی جوان نے کیا ہے —

خیرا شاہ کا بارہ ماسا پھر دوبارہ آگرہ میں طبع ہوا ہے - یہ کتاب اچھی خاصی مشہور ہے - اس کا ایک قلمی نسخہ میرے شاگرد Ch. d' Ochoa ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے - اس وقت یہ نسخہ شاہی کتب خانہ میں موجود ہے —

سنہ ۱۸۶۵ع میں ہندی کتابیں جو شائع ہوئی ہیں ان میں " ونایترا " قابل ذکر ہے - یہ کتاب متھرا میں چھپی ہے - مع تصاویر کل بیس صفحات پر مشتمل ہے - جہاں تک میرے علم میں ہے اس شہر کی چھپی ہوئی کتاب اس سے قبل میں نے نہیں دیکھی - متھرا ہندوؤں کا بڑا متبرک شہر ہے - آج کل اس شہر کی حیثیت ایک معمولی قریہ سے زیادہ نہیں - مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہاں بھی مطبع موجود ہے —

ہندی کی ایک نہایت ضخیم کتاب ابھی حال میں بمبئی میں چھپی ہے - میری مراد یوگ وسشت سے ہے - ہیراچند نے اسے سنہ ۱۸۶۵ع میں طبع کیا - موصوف ہندی کے مشہور مصنفوں میں ہیں - انھوں نے " کویا سنگرھا " اور " پنگرادرش " دونوں کتابوں کو شائع کیا ہے - اول الذکر برج بھاشا کی نظموں کا مجموعہ ہے اور ثانی الذکر میں علم عروض کے اصول و قواعد بیان کیے گئے ہیں - ہر دو کتابیں بمبئی میں سنہ ۱۸۶۵ ع میں طبع ہوئی ہیں —

یوگ وسشت ایک فلسفیانہ نظم ہے - والمکی کی طرف یہ سنسکرت کتاب منسوب کی جاتی ہے - والمکی وہی ہیں جنھوں نے راماین تصنیف کی تھی - میں نے ابھی اوپر جس یوگ وسشت کا ذکر کیا ہے وہ سنسکرت کا ہندی ترجمہ ہے - یہ ترجمہ ۵۲۶ صفحات پر مشتمل ہے - کتاب باتصویر ہے - یوگ وسشت میں یوگ کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے - یوگ کا موضوع

تصوف ہے جسے مسلمان لوگ معرفت بھی کہتے ہیں - اس فلسفیانہ نظم میں رام وسشت اور وسوامترا کے ساتھہ انسانی وجود، نیکی، توبہ، بھگتی، اور شانتی کے متعلق بحث کرتے دکھائے گئے ہیں - کتاب چھہ حصوں میں منقسم ہے - ہر حصے کا عنوان موضوع زیر بحث کی مناسبت سے رکھا گیا ہے *۔

میں ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ اردو کی نئی کتابوں کی تعداد ہندی کے مقابلے میں زیادہ ہے - آپ صاحبوں کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ Rollin کی تاریخ قدیم (l' Histoire Ancienne) کا اردو ترجمہ تین حصوں میں علیحدہ سے شائع ہوچکا ہے - Rollin اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک مشہور فرانسیسی مورخ گذرا ہے - اس کا ادبی ذوق اعلی قسم کا تھا - اس کے ہاں الفاظ کی صحت کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا - اس مصنف کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مذہب اور قدیم فرانسیسی روایات کا بڑا حامی تھا ۔

اس کتاب کے علاوہ سنہ ۱۸۶۴ع میں الہ آباد میں " جواہر منظوم " کے نام سے ایک مجموعہ نظم شائع ہوا ہے - اس مجموعہ میں بعض انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ درج ہے - ترجمہ بھی نظم میں ہے - حواشی میں عروض کے مسائل کے متعلق اشارات ہیں تاکہ شمال مغربی صوبجات کے طلبہ بھی اس مجموعہ سے مستفید ہوسکیں - ان حواشی میں جو مختلف بحریں لکھی گئی ہیں وہ طلبہ کے مشق کے لیے ہیں - اردو ترجمہ کے مقابل اصل انگریزی بھی ہے تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ اردو اور انگریزی دونوں میں ترقی کر سکیں —

(*) اس کتاب کے اور دوسرے ہندی ترجمے بھی موجود ہیں - ان میں سے ایک کا ذکر Mackenzies' Collection میں ملتا ہے - یہ ۳۶ ابواب پر مشتمل ہے - دیکھو جلد ۲ - صفحہ ۱۰۹ —

انگریزی کی بعض نظمیں ایسی ھیں جن کا اردو میں خاطر خواہ ترجمہ کرنا بہت دشوار ھے لیکن مترجم نے نہایت سلیقہ اور خوبی کے ساتھہ اس کام کو انجام دیا ھے - انگریزی اور اردو کی نظمیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ھوتی ھیں خیالات اور محاورے ایک دوسرے کے ساتھہ کوئی مناسبت نہیں رکھتے - مترجم میں جب تک خاص طور پر ایسی صلاحیت نہ ھو کہ اصل کو اپنے الفاظ کے ذریعہ ظاھر کردے اس وقت تک اس کام کو سلیقہ کے ساتھہ پورا کرنا بہت مشکل ھے - مترجم کو ایک طرف تو اصل مطلب کو ھاتھہ سے نہیں جانے دینا چاھئے اور دوسری طرف اس مطلب کو ایسے الفاظ میں پیش کرنا چاھئے کہ اس کے اھل وطن سمجھہ سکیں * - میرے خیال میں ترجمہ کے لیے اگر ایسی نظمیں چنی جاتیں جن میں انگریزیت کم ھوتی تو زیادہ اچھا ھوتا - انگریزی زبان میں ایسی نظمیں موجود ھیں جن کے موضوع میں عالمگیر دلچسپی کے عناصر موجود ھیں —

۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ ع کے اودھ اخبار میں ایک کتاب کا اشتہار میری نظر سے گذرا جس کی طباعت اس اخبار کے مطبع میں شروع ھوئی تھی - میری مراد تماشائے قدرت سے ھے - مصنف کا تخلص قدرت ھے - مدیر اودھ اخبار اس کو فردوسی زماں کے لقب سے یاد کرتے ھیں - فردوسی نے اپنا شاہ نامہ لکھنے میں ۳۰ سال صرف کیے تھے ؛ حالانکہ قدرت نے دو سال کی قلیل مدت میں مہابھارت جیسی کتاب ختم کرلی - اس کتاب میں

---

* صوبجات شمال مغربی کے ناظم تعلیمات مسٹر کمپسن نے اس کتاب پر تبصرہ لکھا ھے اور یہ بتایا ھے کہ ترجمہ میں صحت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ھے - موصوف نے از راہ کرم اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیا ھے —

غالباً سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے حالات ہیں —

اودھ اخبار کی اس اشاعت میں " تاریخ روم " پر بھی تبصرہ میری نظر سے گذرا - میاں قدرت نے عربی سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے - قدرت کی چھہ نظموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے جس کا ذکر اس اخبار کی اشاعت میں ہے - اس اخبار کے مدیر کے قول کے مطابق قدرت کی نظم و نثر کی گیارہ تصانیف شائع ہو چکی ہیں - قدرت کے ذاتی مطابع بنارس ' بھوپال اور آگرہ میں کام کررہے ہیں —

اودھ اخبار کی ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۶۵ ع کی اشاعت میں ایک اور کتاب کا ذکر ہے جس کا نام " حدائق‌انظار " ہے - یہ علم و ادب کی ایک قاموس ہے جس میں فلسفہ ' تاریخ اور فلکیات کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں * - اخبار کوہ نور میں بھی اس کی تعریف کی گئی ہے - اس کتاب کی تصنیف کی تاریخ اس کے نام سے نکلتی ہے - اس قسم کی ایک کتاب فارسی زبان میں پندرہ جلدوں میں ہے - ہندوستان میں اس قاموس کی بہت شہرت ہے - اردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے - امان نے اپنی قاموس کی دو جلدیں اردو میں دہلی سے شائع کی ہیں - اب وہ تیسری جلد کی تیاری میں مشغول ہیں —

فارسی سے اردو میں جو حال میں ترجمے ہوئے ہیں ان میں سعدی کی بوستاں کا ترجمہ قابل ذکر ہے - ترجمہ کا نام " بہارستان کرہ تان " رکھا ہے - کہا جاتا ہے کہ ترجمہ صحیح اور شگفتہ ہے - بنگلور میں سنہ ۱۸۶۵ ع میں اس کی طباعت ہوئی ہے - ترجمہ محمد قاسم نے کیا ہے - غالباً

---

* یہ بوستان خیال کا ترجمہ ہے جو خواجہ امان نے اردو میں کیا تھا (انیٹر)

ترجمہ کا نام " بہارستان کرہ تان " اس لیے رکھا ہے کہ اس کا تعلق اخبار " کرہ تان " سے ہے جس کی پہلی اشاعت میں اس پر تبصرہ شائع ہوا ہے —

لکھنؤ سے رامائن کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے - اس میں کئی سو تصاویر ہیں (*) —

تاریخ راجستان یا " علی نامہ جات " کو انگریزی سے اردو میں لالہ جوالا سہاے نے منتقل کیا ہے - اس میں راجپوتانے کے راجاوں اور انگریزوں کے تعلقات بیان کیے گئے ہیں - یہ کتاب دو جلدوں میں ہے - پہلی جلد میں ریاست اودے پور اور دوسری جلد میں باقی دیگر ریاستوں کے حالات درج ہیں —

اس سال میں آپ کے سامنے ایک کتاب کا ذکر کرتا ہوں جو تاریخی تحقیق کے مطابق لکھی گئی ہے - میری مراد " تاریخ رشیدالدین خانی " سے ہے - اس کتاب کے نام سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ مشہور ایرانی مورخ رشیدالدین کی تاریخ مغل کا ترجمہ ہے - میرے دوست ای کاتر میر نے آخر الذکر کا متن مع ترجمے کے شائع کر دیا ہے - " تاریخ رشیدالدین خانی " دکن کی تاریخ ہے - اس کے مصنف کا نام ہجر حیدرآبادی ہے - کتاب کا نام نظام حیدرآباد کے وزیر کے نام پر رکھا گیا ہے - ہجر نثر و نظم کے مشہور لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں - یہ کتاب سنہ ۱۸۵۴ ع میں نظام حیدرآباد کے ایما پر تصنیف کی گئی ہے - حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں ایک مطبع ہے جس کا نام

(*) مسٹر جیمس ہچنسن نے رامائن اور ایلیڈ کی مشابہت کی طرف توجہ دلائی ہے - یہ مشابہت ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ دعوی کرنا کہ ہومر ہندو تھا حقیقت کے بالکل خلاف ہے —

" مطبع تیغ جنگ " ہے، وہاں یہ کتاب طبع ہوئی ہے - اس کتاب کی زبان دھلی کی زبان کی طرح فصیح ہے - اس میں آپ کو دکنی زبان کے محاورے نہیں ملیں گے - مصنف نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں قدیم تاریخی کتب سے استفادہ کیا ہے - قدیم تاریخ کے متعلق جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ پہلے سے مشہور ہیں لیکن موجودہ عہد کی تحقیق میں بعض ایسے ماخذوں کو استعمال کیا گیا ہے جن کے مطالعہ سے فرانسیسیوں اور انگریزوں کے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں - یہ کتاب ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک جلد میں طبع ہوئی ہے - ریورنڈ جی سمال (Rev. G. Small) نے از راہ نوازش اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے - میری رائے میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ کسی یورپین زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے (*) —

میرٹھ کے اخبار " اخبار عالم " میں ناظر کا کلام میری نظر سے گذرا - ناظر موجودہ زمانہ کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے ہیں - اس اخبار میں مشکواۃ کے اردو ترجمہ کا بھی ذکر ہے جس کا نام " مظاہرالحق " ہے (†) مشکواۃ حدیث کی ان کتب میں سے ہے جنھیں قرآن کے علاوہ مذہبی تقدس حاصل ہے -

---

(*) نظام حیدرآباد کو مغل بادشاہوں کے اور دوسرے صوبہ داروں کی طرح نواب کا خطاب حاصل تھا - ہم اس موقع پر اس کا ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں کہ جب نظام سے کہا گیا کہ وہ بھی نواب اودہ کی طرح آزادی کا اعلان کردیں تو انہوں نے اس پر جو جواب دیا ہے اس سے ان کی عالی ظرفی کا پتہ چلتا ہے - انہوں نے کہا : میں جس حال میں ہوں خوش ہوں - بادشاہ دھلی کے پاس اب سوائے نام کے اور باقی ہی کیا رہا ہے کہ اسے اس سے بھی محروم کیا جائے - ہمارا فرض ہے کہ کم سے کم اس کے نام کو بحال رہنے دیں " - دیکھو رسل کی کتاب " Letters on Indian Affairs " لندن سنہ ۱۸۴ ع - صفحہ ۲۱ —

(†) سولہ سترہ سال ہوتے ہیں کہ مشکواۃ کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا لیکن اب وہ نایاب ہے -

قرآن کے اردو اور فارسی میں متعدد ترجمے ہوچکے ہیں لیکن ترکی زبان میں اب تک نہیں ہوا۔ عثمانی ترک سنی ہیں اور انہیں اس پر اعتراض ہے کہ قرآن جیسی مقدس کتاب کا مروجہ زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ ابھی حال میں سلطان کے حکم سے قرآن کا ترکی ترجمہ کرایا گیا ہے تاکہ مسلمان رعایا نیز عیسائی قرآن کو اپنی زبان میں پڑھ سکیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ مسلمان لوگ اپنے دین کے بنیادی عقاید کو خود سمجھ سکیں گے۔ اور چونکہ عیسائی اپنی مقدس کتب کے ترکی ترجمے شائع کرتے ہیں اس لیے ضرور ہے کہ قرآن کا ترکی ترجمہ بھی ہو تاکہ اہل اسلام اس کو پڑھ کر اپنے عقاید پر قایم رہیں (*) —

پنجاب ایجوکیشنل میگزین میں مولوی عبیداللہ کی لکھی ہوئی عربی صرف و نحو کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ موصوف نے عربی صرف و نحو کا پہلا حصہ اردو میں شائع کیا ہے۔ آپ ہگلی کالج میں پروفیسر ہیں اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں شہرت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ترکیب نحوی پر بحث ہوگی۔ اس کے علاوہ منشی حسین نے "قواعد حسینی" کے نام سے فارسی زبان کی صرف و نحو پر اردو میں کتاب لکھی ہے۔ موصوف نے انگریزی زبان سے متعدد ترجمے بھی اردو کیے ہیں —

میرٹھ کے "اخبار عالم" میں حکیم احسان علی کی ایک کتاب کا ذکر ہے جو انہوں نے علم طب پر لکھی ہے۔ ان کی ایک اور دوسری کتاب علم ریاضی کے مبادیات پر ہے۔ جس کا لاہور کے اخبار "کوہ نور" میں ذکر ہے —

(*) Trubner's Literary Record, Dec. 1865.

شیخ ہدایت نے ایک نہایت مبسوط مضمون سنہ ۵۷ ع کی شورش عظیم کے متعلق لکھا ہے جس کا کپتان تی رتری نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے - اخبار انڈین میل کے کئی صفحوں میں یہ مضمون شائع ہوچکا ہے (*) - مضمون نگار کا بیان ہے کہ سنہ ۵۷ ع سے سولہ سال قبل سے شورش کا مواد برابر پک رہا تھا - موصوف نے سپاہیوں کی شورش کے اسباب پر مندرجہ ذیل عنوانوں کے تحت بحث کی ہے - (۱) سپاہیوں پر یہ پابندی عاید کرنا کہ بلا تفریق ذات پات کے وہ ساتھ کھانا کھائیں- (۲) مسیحی مبلغوں کی مساعی- (۳) سلطنت اودھ کا الحاق - (۴) رنگروٹوں سے قسم لینا کہ حکومت جہاں چاہے انہیں بھیج سکتی ہے- (۵) ایسے کارتوسوں کا استعمال جن پر چربی لگی ہوتی ہے اور جنہیں منہ سے بندوق کے اندر رکھنا پڑتا ہے - مضموں نگار نے بادشاہ دہلی کو بری‌الذمہ قرار دیا ہے اس واسطے کہ وہ علائق دنیوی سے الگ تھلگ زندگی کے دن پورے کر رہا تھا اور سوائے اہل ادب کی صحبت کے وہ کسی سے ملتا تک نہ تھا - انقلابی شورش کی آگ جب بھڑک اٹھی اس وقت کہیں جاکر اسے خبر ہوئی - مضمون نگار کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر حسب سابق انگریز لوگ دیسی سپاہیوں اور ان کی عورتوں سے کبھی کبھی ملتے رہتے تو انہیں ان کی شکایتیں معلوم ہوتی رہتیں- لیکن چوں کہ ایسا نہیں کیا گیا اس لیے سازش کی انہیں پہلے سے مطلق خبر نہ ہوئی- وہ لکھتے ہیں کہ حکومت ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے سب کچھ کر رہی تھی لیکن ابھی ہندوستانیوں میں تعصب باقی ہے اس لیے وہ ہر نئی بات کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں —

(*) ۶ اور ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ ع —

مسیحی مبلغین اس وقت ہندوستان میں جو ادب شائع کر رہے ہیں اس کی نسبت تفصیل سے ذکر کرنا بے سود ہوگا۔ میں اس وقت صرف چند کتابوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ متی اور مرقس کی انجیل کا اردو میں جو ترجمہ شائع ہوا ہے ابھی اس کے پہلے حصہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ غالباً دوسرا حصہ بھی بعد میں شائع ہوگا - یہ ترجمہ "امریکی تبلیغی انجمن" کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ تفسیر کے لیے زیادہ تر ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے جو انگلستان میں شہرت رکھتی ہیں جیسے Barne اور Jacobus کی کتابیں - اس جلد میں بعض تصاویر بھی ہیں - بد قسمتی سے رسم خط لاطینی استعمال کیا گیا ہے۔ اس جلد کی تمہید میں ریو رنڈ جے - ایف - اسکاٹ (Rev. J. F. Scott) نے جو ہندوستان میں ۲۷ سال سے مقیم ہیں یہ اعلان کیا ہے کہ اگر اس ایڈیشن کو قبول عام حاصل ہوا تو فارسی رسم خط میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا جائے گا۔ موصوف نے یہ تمہید ہندوستانی زبان میں لکھی ہے - یہ ترجمہ ہندوستانی عیسائیوں کے لیے شائع کیا گیا ہے۔ ہندو مسلمان بھی اس سے سعادت حاصل کر سکتے ہیں - Rev J. F. Scott نے اپنی تمہید میں ہندوستانی زبان میں ایک دعا لکھی ہے جس میں انگریزی عروض کے مطابق تین تین اور چار چار اجزا استعمال کیے گئے ہیں - اس دعا کو ہندوستانی زبان کے اس نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو انگریزیت کے رنگ سے متاثر ہوئی ہے * —

* اس دعا کے شروع کے اشعار یہ ہیں:

تیرا کلام ہے پاک اور راہ
اے مہربان
ہے سچ اور حق بے کم و کاہ
عزیز اور بے بہا —

میں نے سنہ ۱۸۶۱ ع کے خطبہ میں بھی اس قسم کی ایک مثال آپ صاحبوں کے سامنے پیش کی تھی —

ہندوستانی کا لفظ ہندی اور اردو دونوں پر حاوی ہے - میں جن کتابوں کا ذکر کرتا ہوں ان کا تعلق ہندی اور اردو دونوں سے ہوتا ہے - زبان کے مسئلے پر ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی بحثیں ہورہی ہیں - اول الذکر اپنی قدیم زبان کی حمایت میں سر گرم ہیں اور ثانی الذکر اردو کو سراہتے ہیں جو ان کے نزدیک ہندوستانی کی جدید ترین شکل ہے —

ہندی اور اردو کی بحث نے اس قدر طول پکڑا ہے کہ تعلیم میں بھی اب یہ تفریق تسلیم کی جاتی ہے - چنانچہ لندن کے یونیورسٹی کالج میں میرے دوست سید عبداللہ کی جگہ جو اپنی خدمت سے مستعفی ہو چکے ہیں ریورنڈ جے - ایف - اُلمین (Rev .J. F. Ullman) کو اردو اور ہندی کی پروفیسری پر مقرر کیا گیا ہے - موصوف کا تعلق شمالی ہند کے امریکی پرسبائیٹرین مشن سے ہے - آپ نے انجیل مقدس کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے اور اردو میں گیت بھی بنائے ہیں جو ایک جلد میں چھپ چکے ہیں —

پچھلے سال بھی میں نے ہندی اردو کے قضئے کی طرف اشارہ کیا تھا - اس وقت میرے پیش نظر سہ زبانی لغت (انگریزی ' اردو ' ہندی) ہے جو ابھی حال میں بنارس میں شائع ہوئی ہے - اُس کے مولف بابو متھرا پرشاد نے بابو نوبن چندہ کی طرح ہندی کی طرفداری کی ہے - اب یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اردو کی جگہہ ہندی کو رواج دینا بہت دشوار ہے اس واسطے کہ ہندی کی بہت ساری بولیاں ہیں جن میں ایک بھی کلاسک نہیں کہی جاسکتی * - حالانکہ شمالی ہند کی اردو کلاسک حیثیت رکھتی ہے

* بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ میں سترہ بولیاں گنائی گئی ہیں - دیکھو اشاعت سنہ ۱۸۶۶ ع —

اور ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب کہ اردو کی بدولت ہندوستان کی بیس کروڑ مخلوق میں رشتۂ اتحاد استوار ہوگا - میرے اس خیال کی تائید سید ہادی حسین خاں نے انجمن لاہور کے جلسے میں کی ہے جو ابھی حال ہی میں منعقد ہوا تھا - موصوف نے اس پر زور دیا کہ اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ اردو زبان کو رواج دینے کے لیے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں - اس انجمن کے ایک دوسرے جلسے میں بابو نوین چند نے جو اردو کے مقابلے میں ہندی کی برتری کے قائل ہیں ہادی حسین خاں کے جواب میں چھ صفحوں کا مضمون پڑھا - اس پر مالوہ اخبار کے مدیر نے اردو کی حمایت میں ایک مضمون لکھا ہے کہ " قدیم ہند کی زبان سنسکرت تھی - ویدوں کی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہمیں پرانوں اور شاستروں میں ملتی ہے - اس کے ہزار سال بعد گتھا (Gtha) اور پراکرت وجود میں آئیں جو اسلامی عہد حکومت میں بدلتی رہیں - اس عہد میں جو زبان وجود میں آئی اسے ہندی کہنے لگے - اسی دوران میں اردو نے جنم لیا جس میں سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی شامل ہوگئے " —

نوین چند کا یہ دعویٰ ہے کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے اہل ہند کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا اس واسطے کہ یہ زبان خاص مسلمانوں کی ہے - مسلمان فاتحوں نے اپنی اصلی زبانوں کے لاتعداد الفاظ اس میں داخل کردئے ہیں - نظم و نسق کی ضروریات کے لیے بھی اردو موزوں نہیں ہے - اس کی بجائے ہندو لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی قومی زبان زبان ہندی کی ترقی کے لیے کوشاں ہوں - بابو صاحب ہندی زبان کا مستقل ادب پیدا کرنا چاہتے ہیں - میرے خیال میں ہندی اور اردو کو دو بالکل مختلف زبانیں تصور کرنا صحیح نہیں ہے - اس قسم کے دعوے کو عقل سلیم نہیں تسلیم کرتی -

در حقیقت هندی اور اردو ایک هی زبان کی دو شاخیں هیں - وہ دونوں پہلو به پہلو زندگی بسر کرسکتی هیں - اگر دونوں میں کسی کو فضیلت حاصل هے تو وہ اردو کو هے اس واسطے که اردو میں غیر هندی عناصر بهی پائے جاتے هیں گویا که اردو اسلام اور هندو دهرم کے درمیان ایک طرح کا رشتۂ اتحاد قایم کیے هوئے هے —

بابو صاحب اردو پر یه الزام عاید کرتے هیں که اس زبان میں عشق و عاشقی کے مضامین کے علاوہ اور کسی مضمون کو ادا کرنے کی قابلیت هی نہیں هے - همارے خیال میں یه قصور زبان کا نہیں هے بلکه اهل زبان کا هے - کیا هم بابو صاحب سے یه دریافت کرسکتے هیں که هندی میں بهی سوائے همه اوستی فلسفه کی خیال آرائیوں کے اور کیا رکها هے ؟ - کیا اس بنا پر ثانی‌الذکر کو اول‌الذکر پر فوقیت حاصل هوسکتی هے ؟ - بابو صاحب نے کبیر داس اور نانک کے کلام کا ذکر کیا هے لیکن ان کے هاں بهی وهی رسمی فلسفه کے متعلق اظہار خیال هے - کہیں ذرا دلچسپ هے اور کہیں خشک اور بے مزہ - سالوہ اخبار کے مدیر نے اس امر کی جانب توجه مبذول کرائی هے که هندی میں بهی عشق و عاشقی کے مضامین کی بهر مار هے - انصاف کا تقاضا یه هے که اگر آپ بدر منیر اور دریائے عشق کو مخرب اخلاق خیال کرتے هیں تو پریم ساگر اور مدہ ملت کے متعلق بهی یهی حکم لگائیے —

بابو صاحب ایک کٹر هندو کی حیثیت سے فارسی رسم خط کو برا بتاتے هیں - وہ کہتے هیں که اس رسم خط کی وجه سے اردو کے هندی خط و خال مٹ گئے اور فارسی عربی کو موقع ملا که اردو میں اپنے الفاظ کو رواج دیں - اگر هندی رسم خط اختیار کیا جاتا تو آهسته آهسته اردو میں سے اجنبی الفاظ ایک ایک کرکے غائب هوجاتے ' بالکل اسی طرح جیسے بنگالی

میں فارسی الفاظ جو ایک زمانہ میں مستعمل تھے ، اب متروک ہوگئے —

میرے خیال میں ہندی اردو کا جھگڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۔ خواہ مخواہ اس کو اتنا بڑھا چڑھا کر اس وقت پیش کیا جارہا ہے ۔ ہندی اور اردو دونوں ایک ہی زبان کی دو شاخیں ہیں ۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس مسئلہ پر جب بحث کی جاتی ہے تو محض نحو پر گفتگو نہیں ہوتی بلکہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندی ہندو دھرم کی نمائندہ ہے ۔ وہ ہندو دھرم جس میں بت پرستی اور اس کے لوازمات بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس کے برعکس اردو اسلامی تہذیب و تمدن کی علم بردار ہے ۔ اور چونکہ اسلام میں سامی عنصر شامل ہے اور توحید اس کا اصل عقیدہ ہے اس لیے اسلامی تہذیب میں یورپین یا مسیحی تہذیب کی خصوصیات پائی جاتی ہیں —

میرے خیال میں اردو کے مقابلے میں ہندی کی جانب توجہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی جدید یونانی کے بجائے قدیم یونانی کی طرف توجہ کی جائے ۔ تعجب اس پر ہے کہ اردو کی تصانیف بھی دیوناگری رسم خط میں چھاپی جارہی ہیں ۔ چنانچہ ابھی حال میں دیوان نظیر ' اور میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اور دوسری تصانیف جن کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان ہے دیوناگری کے رسم خط میں طبع کی جارہی ہیں —

ہندوؤں پر یہ الزام لانا درست نہیں کہ وہ اپنی زبان کو ' جو دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور جس کو دیوناگری ہی کہتے ہیں ' اسلامی عناصر سے پاک کررہے ہیں ۔ چنانچہ جہاں تک ممکن ہے عربی فارسی کے الفاظ ترک کیے جارہے ہیں ۔ بعض ہندو اس بات کی بھی کوشش کررہے ہیں کہ سرکاری طور پر جو اردو رائج ہے اس میں بھی اس اصول پر عمل کیا جائے ۔

انگریزوں میں بھی ایک طبقه ایسا موجود هے جو اس خیال کی حمایت کررها هے ۔ اگر اس قسم کا کوئی تصرت کیا گیا تو اردو کی جس کا نام پہلے سے ریختہ هے ، بالکل مٹی پلید هوجائیگی ۔ مسٹر جے بیمز نے کلکته کی ایشیاٹک سوسائٹی میں جو مضمون لکھا هے اس میں اس امر کی جانب توجه مبذول کرائی هے *—

موصوف نے لکھا هے که آج کل عام طور پر اردو کے خلاف خیالات پھیلائے جارهے هیں اس لیے که یه زبان عدالتوں اور دفتروں میں رائج هے ۔ کہا جاتا هے که اردو جن عناصر سے مرکب هے وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ میل نہیں کھاتے ۔ موصوف اپنے سات سال کے تجربے کی بنا پر کہتے هیں که اردو هندوستانی کی مہذب ترین شکل هے ۔ اس میں ایجاز اور فصاحت درجه اتم موجود هے اور اظہار خیال کے لیے اس زبان میں بہت بڑی صلاحیت موجود هے ۱ ۔ موصوف نے اس امر کی طرت بھی اشارہ کیا هے که دوآب گنگا کے رهنے والوں کی گنتی میں یه زبان شامل هے ۔ انھیں اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا ۔ اردو سے عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنا ایسا هے جیسے آپ انگریزی زبان سے لاطینی الفاظ نکالنے کی کوشش کریں اور چاهیں که

* Outlines of a plea for the Arabic element in official Hiudustani Journal, As. Soc. Bengal No 1, 1866

۱ اردو میں عربی فارسی کے الفاظ کے استعمال کے متعلق دو مخالفت هو رهی هے اس میں ایک مسلمان بھی هیں جن کا نام سید هادی حسین خاں هے ۔ انھوں نے انجمن لاهور کے جلسے میں ایک مضمون پڑھا هے جس کا موضوع یه هے که اگر اردو زبان سے عربی فارسی الفاظ خارج کر دئے جائیں تو زبان سہل هو جائیگی —

اس میں صرف سکسن اصل کے لفظ باقی رهیں - زبانیں اس طرح ارادہ کرنے سے نہیں بنائی جاتیں - زندگی کی ضروریات سے ان کی ساخت میں تغیر و تبدل هوسکتا هے - سیاسی فتوحات ' تجارتی تعلقات ' ادبی اور علمی ضرورت سے زبان میں تبدیلی پیدا هوتی هے اور اس میں الفاظ داخل هوتے هیں - قابل مضمون نگار نے بڑی خوبی سے یہ بات بتائی هے کہ جس طرح انگریزی میں المانی اور لاطینی عناصر موجود هیں اسی طرح اردو میں بھی سنسکرت یا آریائی اور سامی یا اسلامی عناصر کی آمیزش هے - انگریزی سے اردو کی مشابہت پہلی مرتبہ اس مضمون میں نہیں بیان کی گئی - ڈاکٹر گلکرسٹ نے بہت زمانہ هوا اس طرف توجہ مبذول کرائی تھی - ایم - بیمز (M. Beames) کا خیال هے کہ اردو میں عربی فارسی سے جو الفاظ مستعار لیے گئے هیں وہ مطالب کو بہ نسبت دیسی الفاظ کے زیادہ اچھی طرح واضح کرتے هیں - سنسکرت کے الفاظ اردو میں اگر داخل کیے جائیں تو یہ مقصد حاصل نہیں هوتا - اردو کی در اصل یہ ایک طرح سے خوبی کہی جا سکتی هے کہ وہ تمدنی ضروریات کے مطابق دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر اپنا کام نکال سکتی هے - اگر دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لے کر کام نکل سکتا هے تو لمبے لمبے غیر مانوس الفاظ تراشنے سے کیا فائدہ ؟ بنگالی میں الفاظ تراشنے کا کام هو رها هے لیکن اس سے اس زبان کو کوئی خاص ترقی نہیں حاصل هوئی - هندوستانی هر جگہ بنگالی کے مقابلے میں کامیاب نظر آتی هے - اس کے علاوہ اردو میں عربی فارسی کے الفاظ کو رائج رکھنے کی تائید میں اور اسباب بھی هیں - M. Beames نے یہ خیال بھی ظاهر کیا هے کہ هندی (هندوی) اصل میں سنسکرت سے پہلے موجود تھی - وہ تورانی الاصل هے - آریاؤں نے اسے ایسا مٹا دیا کہ اس کے رهے سہے جو الفاظ باقی رہ گئے تھے انہیں

سنسکرت سے منسوب کیا جانے لگا * —

مغل فاتحوں کی زبان عربی آمیز فارسی تھی - انھوں نے ہندوستان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ اہل ہند کی ایک بڑی تعداد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئی - مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے اس لیے عربی الفاظ نے اہل ہند کی زبان میں راہ پائی - کابل اور ایران کی اصطلاحیں ہندوستان میں رائج ہوئیں - غرض کہ مذہب ' حکومت ' جنگ ' اور فنون و صنعت کے متعلق سیکڑوں عربی فارسی الفاظ ہندوستان میں عام طور پر بولے جانے لگے - ہندی زبان میں جب یہ الفاظ شامل ہوئے تو اس کو اردو کہنے لگے - عربی فارسی کے جو الفاظ اردو میں رائج ہیں ان کے بجائے دوسرے الفاظ نہیں ملتے - ایم - بیمز (M. Beames) کا یہ دعوی ہے کہ عربی کے جو الفاظ اردو میں مستعمل ہیں ان کے بجائے خود ہندوؤں کو یہ گوارا نہیں کہ دوسرے دیسی الفاظ استعمال کریں - موصوف نے اس ضمن میں جو تفصیلات دی ہیں وہ حد درجہ دلچسپ ہیں - وہ لوگ جو ہندوستانی کے اسلامی عنصر کو بری نظر سے دیکھتے ہیں ان کے لیے یہ تفصیلات سبق آموز ہیں —

انجمن لاہور نے بھی اپنے ایک جلسہ میں M. Beames کی راے کے ساتھ موافقت ظاہر کی ہے - ابھی حال میں انجمن میں ایک اردو کی کتاب پیش کی گئی تھی جس میں عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں استعمال کیا گیا ہے - مصنف نے اس کتاب کو بطور نمونہ پیش کیا تھا تاکہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اس طرز تحریر کی پیروی کی جاے - ایسٹ انڈیا

* Max Muller کی بھی یہی راے ہے - ملاحظہ ہو تیسرا خطبہ سنہ ۱۸۶۵ ع

کمپنی کی یہ حکمت عملی رہی تھی کہ اردو کو ہندی سے علاحدہ تصور کیا جاے۔ چنانچہ اردو کا جو جدید ادب اُس زمانے میں پیدا ہوا اُس میں عربی فارسی کے الفاظ برابر استعمال کیے جاتے تھے بلکہ ان الفاظ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ لاہور کی جامعۂ مشرقیہ (اور ینٹل یو نیورسٹی) میں اردو کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے —

باوجود ان تمام باتوں کے اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہر جگہ ہندوستان میں زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ صوبجاتی مدارس اور کالجوں میں اسی کی وساطت سے تعلیم دی جارہی ہے حالانکہ اُنہیں صوبوں میں ہندی بھی اس کے دوش بدوش موجود ہے —

کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں برابر ترقی کر رہی ہیں۔ لاہور میں جو جامعہ مشرقیہ (اور ینٹل یونیورسٹی) ابھی حال ہی میں خود ہندوستانیوں نے قایم کی ہے وہ بھی خوب ترقی کررہی ہے۔ در اصل اس جامعہ کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر Leitner نے پیش کیا تھا۔ موصوف نے ہندوستانی ادب کو فروغ دینے کے لیے نہایت قابل تعریف کوشش کی۔ آپ نے صرف یہی نہیں کہ لاہور کی اکادمی قایم کی بلکہ اس کے علاوہ بالخصوص پنجاب اور سارے ہندوستان کے لیے ایک عظیم الشان جامعہ کی بنا ڈالی۔ اس جامعہ کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی علوم و السنہ کی تحقیق کی جاے۔ سرکاری تینوں یونیورسٹیوں میں محض مغربی علوم کی تعلیم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر Leitner کی اپیل پر دیسی روساء نے لبیک کہا اور اعانت کے لیے پیش قدمی کی۔ اب یہ جامعہ مشرقیہ قایم ہوگئی ہے۔ میرے پیش نظر اس کے متعلق بعض تجاویز ہیں۔ یہ تجاویز اردو میں ہیں۔ ان تجاویز کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کی ایک انتظامی کونسل ہوگی اور اس کے علاوہ متعدد کمیٹیاں ہوں گی۔ ایک کمیٹی کے سپرد

یہ کام ہوگا کہ اردو کی ترقی کے وسائل بہم پہنچائے اور ایک دوسری کمیٹی مشرقی علوم کو ہندوستانیوں میں رائج کرنے کے متعلق تجاویز پیش کرےگی (*). ان تجاویز کے ساتھ وہ خط بھی ہے جو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر O. F. M. Leod نے بانیان جامعہ کو خطاب کرتے ہوے لکھا ہے - موصوف یونیورسٹی کے حقیقی سر پرست ہیں اور اکادمی کے بڑی خواہ ہیں - آپ کے اس خط سے وسعت نظر اور شرافت کا پتہ چلتا ہے —

اس جامعہ کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی علوم کی ترقی میں کو شاں ہو اور اردو کا جدید ادب پیدا کرے - اس کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں یورپین لوگ نہیں بستے ہیں اور جنہیں تعلیم دینا مقصود ہے وہ بھی یورپین لوگ نہیں بلکہ ہندوستانی ہیں - سب سے پہلے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہندوستانیوں کے ادب سے ہم واقفیت پیدا کریں - پھر اس کے بعد انہیں اس کا موقع دیں کہ وہ اپنا ذاتی ادب پیدا کریں - اس ادب میں مغربی اثر موجود رہے گا اس واسطے کہ اس سے مفر نہیں - لاہور کے جامعہ کے جتنے بانی ہیں ان کے ذہن میں یہ خیالات پہلے سے موجود ہیں - ایک طرف تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اپنے قدیم ادب کا ذوق پیدا ہو اور دوسری طرف مغربی علوم و ادب کی روشنی ہندوستان میں پھیلے - ایسے مغربی خیالات جو آسانی

(*) یورپ کی جامعوں کی طرح ہندوستان کی جامعوں میں بھی اعزازی ارکان ہوتے ہیں - ڈاکٹر لیٹنر نے مجھے لکھا ہے کہ مجھے لاہور کی جامعہ میں یہ عزت بخشی گئی ہے - میں اس جامعہ کے ارباب حل و عقد کا اور بالخصوص ڈاکٹر لیٹنر کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا -

سے ہندوستانی ادب میں سموئے جا سکتے ہیں انہیں سمولیا جاے —

پنجاب کے لیے کلاسک کتب کے انتخاب کے واسطے جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اور جس کا تذکرہ میں گذشتہ سال کر چکا ہوں، اس کی صدارت پنجاب کے لفٹنٹ گورنر بہادر فرمارھے ہیں - Ch. Trevelyan نے مجھے اس کمیشن کے مقصد سے آگاہ کیا ۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ کمیشن ایسی کتابوں کا انتخاب کرنا چاھتا ھے جن کا ہندوستانی میں ترجمہ ہو جاے تاکہ عوام الناس میں ادبی ذوق کو ترقی ہو ۔ یہ ترجمے ایسے ہوں گے کہ شہر یا دیہات کا ہر پڑھا لکھا ان سے استفادہ کرسکے گا ۔ اس کمیشن نے ایک رپورٹ پیش کی ھے اور اس میں ان کتابوں کے نام بتاے ہیں جن کا ہندوستانی میں ترجمہ کرنا ضروری ھے ۔ یہ رپورٹ اس وقت اوکل حکومتوں کے زیر غور ھے ۔ کمیشن کی رپورٹ در اصل کام کی ابتدا ھے ۔ ہم اس کے عملی نتائج کا انتظار کریں گے —

لاہور کی مشرقی جامعہ کے ماتحت دو کالج ہوں گے ۔ ایک لاہور کا اور دوسرا امرتسر کا (یا دہلی کا) ۔ ہر کالج میں ایک پرنسپل ہوگا، چھ پروفیسر ہوں گے اور ایک سکریٹری ہوگا ۔ دو پروفیسر خاص اردو اور ہندی کی تعلیم کے لیے ہوں گے ۔ دوسرے پروفیسر فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم دیں گے اس لیے کہ ان زبانوں کا جاننا اردو اور ہندی کے لیے ضروری ھے ۔ ہرسال وقت معینہ پر عربی، فارسی، سنسکرت اردو اور ہندی کا امتحان ہوا کرے گا ۔ ممتحن یونیورسٹی کے قابل افراد میں سے چنے جایا کریں گے ۔ جو طلبہ امتحان میں کامیاب ہوں گے انہیں بطور انعام رقم دی جاے گی اور ان کی قابلیت کے لحاظ سے سند دی جاے گی ۔ امتحان کے کامیاب طلبہ قابلیت کے اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم ہوں گے ۔ امتحان چھ مضامین میں ہوا کرے گا (۱) صرف و نحو (۲) ادب (۳) خطوط نویسی (۴) املا (۵) خوش نویسی (۶) تلفظ ۔ ابھی

ابتدا ہے۔ کچھ دنوں بعد امتحانوں کا معیار زیادہ بلند ہو جاے گا۔ ہندوستانی میں جو جدید ادب پیدا ہو رہا ہے اُسے اس تعلیمی تحریک سے بہت مدد ملے گی۔ ہمارے خیال میں سواے دہلی کی ورنکلر سوسائٹی کے اِس سے قبل اس قسم کی کوئی اور کوشش نہیں کی گئی جس کا منشا دیسی ادب کو فروغ دینا ہو —

سنہ ۱۸۵۴ع سے سارے ہندوستان کے لیے یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ایک عام نصاب تعلیم بنایا جاے - تا کہ اس کے ذریعہ سے مغربی علوم کو رائج کیا جاے - ہر صوبے میں لفٹنٹ گورنر کے ماتحت ایک محکمہ تعلیم کا قایم کیا گیا ہے - چنانچہ کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں لندن یونیورسٹی کے طرز کی یونیورسٹیاں قایم ہو گئی ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کے ساتھ اور کالج بھی ملحق ہیں۔ ان کالجوں میں بعض مشرقی تعلیم پر زور دیتے ہیں اور بعض مغربی پر۔ ان یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں انجیل مقدس کا نسخہ بھی نظر آتا ہے - اس سے یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ہنری واٹر فیلڈ (Henry Waterfield) نے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے ہندوستانی صوبوں کی تعلیم پر جو رپورٹ تیار کی ہے اس میں نہایت تفصیل سے معلومات ملتی ہیں۔ یہ رپورٹ East Indian Progress کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کو شرع شریف کی اور ہندوؤں کو شاستروں کو تعلیم دی جاتی ہے —

ہر سال سرکاری اور مشن کے مدرسوں اور کالجوں میں طلبہ کی تعداد بڑھ رہی ہے - خاص کر بنگال میں یونیورسٹی کی ڈگری کے اعزاز کو بہت اہمیت دی جارہی ہے۔ کلکتہ کے ڈاکخانے کی نئی عمارت امتحان

کی غرض کے لیے استعمال کی جارھی ھے - اس سال پندرہ سو نوجوان ھندوستانی جو سولہ سال یا کچھہ زیادہ عمر کے تھے اور ۴۴۷ دوسرے طلبہ امتحان کے لیے جمع ھوے - یہ بات فراموش نہیں کرنی چاھئیے کہ یہ طلبہ سب ھندو تھے - ان میں مسلمان نام کو نہیں - یونیورسٹی کی سند مسلمانوں کے لیے ابھی اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی ھے * —

اس سال کے شروع میں بعض نوجوان یورپین کلکتہ میں زباندانی کے امتحان میں نہایت سرخروئی کے ساتھہ کامیاب ھوے - ان میں ایک سول سروس کے تھے جنھیں ان کی قابلیت کی وجہ سے سونے کا تمغہ بطور انعام دیا گیا —

بنگال میں اس وقت ان مدرسوں اور کالجوں کی تعداد جنھیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی ھے ' دو ھزار دو سو سینتیس ھے اور طلبہ کی تعداد ایک لاکھہ تین ھزار ۶۶ ھے - ایسے مدارس جنھیں حکومت کی امداد نہیں ملتی ۱۵۷ ھے اور ان میں پانچ ھزار سات سو ستر طلبہ تعلیم حاصل کررھے ھیں † —

کلکتہ کے مشن کالج بھی خوب ترقی کررھے ھیں - مشہور کالجوں کے نام یہ ھیں پریزیڈنسی کالج ' دوٹن کالج ' فری چرچ انسٹیٹیوشن ' بشپز کالج ' کالج مارتی نیر - آخرالذکر کے نام کا کالج ایک لکھنؤ میں بھی ھے - یہ کالج فرانسیسی جنرل مارتی نیر کے نام پر ھے جسنے اس کو قایم کیا تھا - ان کے علاوہ دو یسوعیوں کے مدرسے بھی کلکتہ میں ھیں - سینٹ پال اسکول اور زیویر اسکول —

* Indian Mail, Feb, 7, 1866.

† Indian Mail, April 6, 1866.

سنہ ۱۸۶۵ ع کے آخر میں صوبۂ مدراس کے مدرسوں کی تعداد ۹۸۳ تھی۔ ان میں ۳۹ ہزار ایک سو طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ اس تعداد میں سے ۲۸ ہزار طلبہ ایسے مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جنھیں ریاست کی طرف سے کوئی مدد نہیں دی جاتی —

اس وقت میرے پیش نظر بمبئی کے صوبے کے اعداد و شمار نہیں ہیں۔ ۲ اپریل کو یونیورسٹی کے عام جلسے میں جو رپورٹ پڑھی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۸۲ طلبہ نے امتحان میں شرکت کی۔ ان میں ایک سو گیارہ کامیاب ہوئے۔ کامیاب طلبہ میں ۹۰ ہندو ۱۸ پارسی دو مسلمان اور ایک یہودی ہیں۔ پچھلے سال میں نے ایک دولت مند ہندو شنکر سیٹھ کے انتقال کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کی تجہیز و تکفین کس عجیب طور پر ہوئی۔ اس کے بیٹے نے بمبئی یونیورسٹی کو ۳۰ ہزار روپے کی رقم دی۔ اس رقم سے طلبہ کو سنسکرت کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظائف دئے جائیں گے —

لاہور کے سرکاری اخبار میں صوبہ جات شمال مغربی کی تعلیمی حالت کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہاں سرکاری مدارس کی تعداد ۳۷۹ ہے۔ ان میں اس وقت بارہ لاکھ ۲۰ ہزار ۵۴ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں* - اس تعداد میں ۹ ہزار ایک سو ۳۵ لڑکیاں ہیں۔ مدارس کی تعداد جو بتائی گئی اس میں میرٹھ کا عربی مدرسہ شامل نہیں ہے - اس مدرسے میں مسلمانوں کے لیے فقہ اور خطابت کی خاص تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے -

* اس میں غالباً چھاپے کی غلطی ہے۔ (مترجم)

پنجاب کی تعلیم کے متعلق میجر فلر کی رپورٹ (۱۸۶۴-۶۵) میں تفصیلی معلومات ملتی ہیں - ۱۹۰ صفحوں میں موصوف نے از حد دل چسپ معلومات جمع کردی ہیں - اس رپورٹ سے نیز امرتسر میں تقسیم انعامات کے جلسہ میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ماہ فروری میں پنجاب میں مدارس کی تعداد ۲ ہزار چھہ سو ۸۴ تھی - ان میں ۹۲ ہزار گیارہ طلبہ تعلیم حاصل کررہے تھے - تعلیم نسوان کی ترقی میں تقریباً وہی تناسب پایا جاتا ہے جو مردوں کی تعلیم میں - چنانچہ سنہ ۱۸۶۰ ع میں لڑکیوں کے صرف چھہ مدرسے تھے اور ان میں سو لڑکیاں تعیم حاصل کر رہی تھیں - اب اس وقت مدارس کی تعداد تقریباً سات سو تک پہنچ گئی ہے جن میں ۱۵ ہزار ۲ سو پچاس طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں - لاہور میں خاص نارمل اسکول ہے جہاں لڑکیوں کے اساتذہ کی ٹریننگ ہوتی ہے -

انگریزی حکومت تقسیم انعامات کے جلسوں کو خوب دھوم دھام کے ساتھہ منعقد کرتی ہے اور دیسی روسا کو شرکت کی دعوت دیتی ہے تاکہ موجودہ تعلیم کے متعلق والدین کو واقفیت حاصل ہو اور وہ اس کی خوبیوں کو سمجھیں - ان موقعوں پر دیسی زبانوں میں تقریریں بھی کرائی جاتی ہیں - چنانچہ شملہ میں ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۶۵ ع کو ایک دربار منعقد ہوا جس کی صدارت ڈپٹی کمشنر نے کی - موصوف نے اپنی تقریر کے دوران میں سعدی کے پند نامہ کے اشعار بھی پڑھے * - انبالہ کے انسپکٹر نے اسکول کی تعلیم کے متعلق حالات بیان کیے اور کہا کہ جب سے M. O' Connor پرنسپل ہوے ہیں مدرسہ کی حالت بہت بہتر ہوگئی ہے - اس کے علاوہ اس دکان کا ذکر

* اس جگہ ان اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے -

کیا جو بیچ بازار میں بچوں کی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے قایم کی گئی ہے - اس موقع پر موصوف نے لالہ سولھچند کے جوش کی تعریف کی جو بچوں کی تعلیم کے لیے ظاہر کر رہے ہیں ۔ لالہ صاحب وہی ہیں جنھوں نے شاہنامہ کا ہندوستانی میں ترجمہ کیا ہے - غریب طلبہ کی امداد کے لیے اس موقع پر ۱۰۸ روپے چندہ ہوا —

پچھلے نومبر کے مہینے میں ۶ تاریخ کو اس قسم کا ایک جلسہ ملتان میں بھی ہوا جس میں ضلع کے طلبہ کو انعامات تقسیم کیے گئے - اس جلسہ میں تعلیم کی طرف سے جو عام بد شوقی پائی جاتی ہے اس کا اظہار بھی ہوا - متعدد مقررین نے ہندوستانی میں تقریریں کیں —

۲۵ نومبر کو روہتک (صوبہ دہلی) میں وہاں کے تحصیلدار کی زیر صدارت ایک دربار منعقد ہوا تھا جس میں موصوف نے علم کے فوائد ظاہر کیے اور بتایا کہ مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو بھی حصول علم کے لیے کوشاں ہونا چاہیے - اس لیے کہ خدا نے جو قابلیت مردوں کو دی ہے وہی عورتوں کو بھی ودیعت کی ہے - (یہ لحاظ رہے کہ مقرر ایک مسلمان ہیں) - موصوف نے کہا کہ نہ صرف یہ کہ غریب طالبعلموں کو مفت بلا کسی فیس کے مدرسہ میں داخل کیا جائے گا بلکہ انھیں مفت کتابیں بھی دی جایا کریں گی - جو طلبہ فیس دینے کی استطاعت رکھتے ہیں ان سے فیس لی جائے گی - اس کے علاوہ چندے سے جس قدر گنجائش ہوگی غریب طلبہ کی مدد کی جاے گی —

صوبۂ پنجاب میں مدارس کے طلبہ کو انعامات تقسیم کرنے کی غرض سے سیالکوٹ میں ۵ مارچ کو ایک دربار منعقد ہوا - ہندوستانی کے مختلف اخبارات میں اس دربار کے حالات ملتے ہیں - لاہور کے سرکاری

اخبار " اور سیالکوٹ کے " پنجابی " میں اس کے متعلق تفصیل ملتی ہے -
اس قسم کا ایک جلسہ ۲۷ فروری کو امرتسر میں منعقد ہوا تھا -
امرتسر سکھوں کا دارالحکومت رہ چکا ہے - ان درباروں میں جو تقریریں
ہوئیں وہ ہندوستانی میں تھیں - اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ امرتسر
کے جلسہ میں لاہور ، گُرداسپور اور پنجاب کے مختلف حصوں سے طلبہ شرکت
کے لیے آئے تھے - شرکاے جلسہ کے لیے پہلے سے شامیانے لگا دیے گئے تھے
۲۷ مارچ کو شرکا پہنچ گئے - حکومت نے ان کے سفر کے اخراجات اپنے
پاس سے دیے - اور کھانے پینے کا انتظام بھی حکومت کی جانب سے کیا
گیا - طلبہ ہاتوں میں رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لیے ہوے تھے اور
موسیقی کے ساتھ ساتھ جلسہ گاہ کی طرف جاتے دکھائی دیتے تھے - جب
سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو لاہور کے ناظر مدارس نے اپنی
رپورٹ پڑھی - اس رپورٹ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کو عام کرنے
کے لیے حکومت کو کن کن دشواریوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے - سب سے
بڑی دشواری یہ ہے کہ موجودہ تعلیم کا طریقہ قدیم طریقوں سے بالکل
مختلف ہے - یورپین ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ قدیم طریقۂ تعلیم ذہنی
نشو و نما کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے - ان کے نزدیک یورپین طریقۂ
تعلیم سے بچے کی ذہنی ترقی جلد عمل میں آتی ہے - رپورٹ سے معلوم
ہوتا ہے کہ لاہور کالج خوب ترقی کر رہا ہے - ڈاکٹر لیٹنر جیسے فاضل
اور علم دوست شخص کے ہاتھ میں جب اس کا انتظام ہوگا تو ظاہر ہے
کہ اس کا ترقی کرنا موجب تعجب نہیں - دہلی کالج کا انتظام ایم - ولمٹ
(M. Wilmot) کر رہے ہیں اور امرتسر کالج میں ایم - لنڈ سے (M. Lindsay)
ہیں - پنجاب کے تمام مدارس میں ہندوستانی کی باقاعدہ تعلیم دی جا رہی ہے

اور اس کے ساتھ انگریزی کا بھی سب جگه انتظام کیا گیا ہے - بعض خاص خاص مدارس میں ہندی ' فارسی عربی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے - اب تک سنسکرت پڑھانے کا کسی اسکول میں انتظام نہیں ہوا - اس کے بعد ناظر مدارس نے ان لوگوں کو مبارک باد دی جنھوں نے لاہور کی اکاڈمی (انجمن) اور مشرقی جامعه قایم کی ہے - ان دونوں اداروں سے توقع ہے که عام مذاق کو ستھرا بنانے میں بہت مدد ملے گی اور ان کی بدولت اہل ہند کی ذہنی نشو و نما ہوگی - موصوف نے یه بھی کہا که ہر شخص کا فرض ہے که وہ اپنے بچوں اور مستورات کی تعلیم کو بطور مثال دوسروں کے لیے پیش کرے - عورتوں میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے - ان کی قبل از وقت شادی کی وجه سے ' خاص کر ہندوؤں میں ' تعلیم کو سخت نقصان پہنچتا ہے —

موصوف نے بعد میں طلبه کو چند نصیحتیں کی ہیں - جو طلبه اپنے امتحان میں ناکام رہے انھیں چاہئے که ہمت نه ہاریں - انھیں چاہئے که دوسری مرتبه پھر کوشش کریں اور اپنی کوتاہی کو پورا کریں - طلبه کو اپنی ناکامی ممتحن کی جا نبداری پر کبھی نه منسوب کرنا چاہئے جیسا که عام طور پر اہل مشرق کا دستور ہے - جو طلبه کامیاب ہوگئے ہیں انھیں اس پر مغرور نه ہونا چاہئے - انھیں یه خیال کبھی دل میں نه لانا چاہئے که وہ ہمه دان ہوگئے اور ان کی تعلیم مکمل ہوگئی - انھیں یه سمجھنا چاہئے که وہ اپنی کامیابی سے علم کے دروازے تک پہنچے ہیں - اس دروازہ میں داخل ہونے کے لیے ابھی بہت کچھ سعی وجہد درکار ہے - اگر وہ اس طرح خیال کریں گے تو اس میں خود انھیں کا فائدہ ہے —

اس کے بعد صاحب کمشنر نے اپنی تقریر کی - آپ نے فرمایا که ہندوستان

میں قدیم زمانے میں بڑے بڑے فاضل گزرے ہیں جنھوں نے اعلی پایه کی کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے نام قابل فخر ہیں - نوجوان تعلیم یافته لوگوں کا فرض ہے که ان قدما کی تقلید کریں اور علم کو محض نوکری حاصل کرنے کا ذریعه نه خیال کریں بلکه علم کو علم کی خاطر حاصل کریں —

حضرات ! آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا که عورتوں کی تعلیم میں بھی ہندوستان میں ترقی ہورہی ہے - چنانچه طالبات کی تعداد اور ان کے مدارس کی تعداد میں بہت کافی اضافه ہو گیا ہے ۔ شروع شروع میں بعض امیر خاندانوں کو اس پر اعتراض تھا که ان کی بچیوں کے مدارس میں انگریز عورتوں کو جانے کی اجازت کیوں دی جاتی ہے لیکن اب یه تعصب کم ہو رہا ہے - میجر فلر نے اپنے ایک خط میں جو لاہور سے آیا ہے مجھے یه لکھا ہے که لاہور کے دو با اثر مسلمان یه اجازت دے چکے ہیں که ان کی لڑکیوں کے مدارس میں انگریز خواتین کو اندر جانے کی روک ٹوک نه کی جاے ۔ متعدد یورپین خواتین جنھوں نے ان طالبات کی تعلیمی حالت کا خود مشاہدہ کیا ہے کہتی ہیں که ان کی ترقی قابل اطمینان ہے * - عورتوں کے لیے علحدہ کتابیں لکھوائی گئی ہیں - میجر فلر نے ان میں سے بعض میرے پاس بھیجی ہیں —

نواب بلرام پور (اودھ) نے تعلیم نسواں پر متعدد کتابیں لکھوائی ہیں اور انھیں عام طور پر تقسیم کرایا ہے - نواب صاحب کے علاقے میں

* ۱۵ فروری کے اخبار عالم میں ایک بنگالی خاتون کا ذکر ہے جنھوں نے انگریزی زبان میں حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے - یه کتاب کلکته میں طبع ہوئی ہے —

بہت سی عورتوں نے حال میں لکھنے پڑھنے کی طرف توجه کی هے - اس سے قبل کبھی یہاں عورتوں کی تعلیم کی طرف مطلق توجه نہیں کی گئی تھی - نواب بلرام پور کی دیکھا دیکھی نواب رام پور نے بھی اپنی مسند نشینی کے بعد فوراً تعلیم نسوان کی جانب توجه مبذول فرمائی هے - موصوف نے اپنے زمانه میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قابل معلمات مقرر کی هیں اور ایک لڑکیوں کا مدرسه بھی قایم کیا هے - اخبار عالم کے مدیر نے ان واقعات پر تبصرہ کرتے هوے لکھا هے که اگر دوسرے والیان ریاست بھی تعلیم نسوان پر زور دیں تو هندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مذاهب کی بڑی خدمت هوگی- تعلیم سے نقصان تو کوئی هو نہیں سکتا —

بمبئی میں تعلیم نسوان کے لیے ایک انجمن قایم کی گئی هے جس کے صدر مشہور هندو فاضل بھو داجی هیں - اس انجمن کا مقصد یه هے که عورتوں میں ادبی اور علمی مشاغل کو بڑھانے کی کوشش کی جاے —

لاهور کی اکاڈمی (انجمن اشاعت علوم) اپنا کام سرگرمی سے کر رهی هے- پنجاب کے هندوستانی اخبارات کبھی کبھی انجمن کے لکچروں کو درج کرتے هیں - مجھے اس انجمن کی سنه ۱۸۶۵ کے آخری مہینوں کی کار روائیاں موصول هوئی هیں - ان سے معلوم هوا که میجر فلر، ناظم تعلیمات پنجاب، نے انجمن کی توجه خاص کر هندوستانی ادب کی طرف مبذول کرائی هے - موصوف اس کو اس زمانے کی سب سے بڑی ضرورت تصور کرتے هیں - یه بات یقیناً قابل افسوس هوگی اگر هندوستانی ادب کو یوروپین اثر سے بالکل بدل دیا جاے- مجھے پوری توقع هے که یوروپین اثر کو هندوستانی اس سلیقه کے ساتھ قبول کرے گی که اس کی مشرقیت بدستور باقی رهے گی اور اس کے مخصوص خط وخال قایم رهیں گے —

پنجاب ایجوکیشنل میگزین کے بارھویں نمبر میں ان انگریزی کتابوں کی فہرست دی ہے جو ان ہندوستانیوں کو پڑھنا چاہئیں جنھیں انگریزی زبان سیکھنے کا شوق ہے۔ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ہندوستانیوں کے خیالات پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ اس قسم کا انتخاب مغربی زبانوں کی ان کتابوں کا بھی ہونا ضروری ہے جن کا دیسی زبانوں میں ترجمہ کیا جا سکے۔ دیسی مدارس کے نصاب میں اگر اس قسم کی کتابیں رکھی جائیں تو اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ ان میں ایسی کوئی بات نہ ہو جو ہندوستانیوں کے رسوم و عادات کے خلاف ہو —

انجمن پنجاب نے پچھلے جون کے مہینے میں اپنی رپورٹ شائع کی ہے جس میں اس انجمن کے قیام کے پہلے سال میں (۱۸۶۵) جو کچھ ہوا ہے اس پر عام تبصرہ ہے۔ اس رپورٹ سے معلوم ہوا کہ انجمن کی طرف سے پبلک کے لیے ایک کتب خانہ کھولا گیا ہے۔ اس کتب خانے کے اخراجات چندے سے پورے کیے جاتے ہیں۔ اس کتب خانے میں سنہ ۱۸۶۵ ع کے آخر تک ایک ہزار چار سو تیس کتابیں اردو، ہندی اور انگریزی کی موجود تھیں۔ ۲۶ اخبارات آتے تھے جن میں ۲۴ ہندوستانی کے، ایک فارسی کا اور ایک انگریزی کا تھا۔ اس انجمن کی ایک تعلیمی کمیٹی ہے جس کا کام یہ ہے کہ ہندوستانی اور دوسری مشرقی زبانوں کی کتابیں شائع کرائے اور ان زبانوں کی ترویج کے لیے مختلف مقامات پر مدارس قایم کرائے۔ چنانچہ اس کمیٹی نے انتظام کیا ہے کہ ہفتے میں دو تقریریں ادبی یا علمی مضامین پر کرائی جائیں تا کہ انجمن کے مشاغل اور مقاصد سے لوگوں کو واقفیت حاصل ہو۔ ایک کمیٹی اس کام کی تحقیق کے لیے ہے کہ مشرقی اور مغربی اصول طب کا مقابلہ کرے اور اس کے نتائج سے اہل وطن کو مستفید ہونے کا موقع دے۔ اس کمیٹی

کی جانب سے انجمن کے مجلے میں قواعد حفظان صحت کے متعلق اردو میں مضامین شایع ہوتے ہیں - پیشتر اس کے کہ علم طب پر اعلیٰ پایہ کی تصانیف اردو میں شایع ہوں اس کمیٹی نے علم الاعضاء کے متعلق عام فہم رسالہ شایع کرایا ہے —

اس وقت انجمن کے ارکان کی تعداد دو سو چوالیس ہے - امید ہے کہ ان کی تعداد میں عنقریب اور اضافہ ہوگا —

گذشتہ سال اس انجمن کے سالانہ جلسے میں بابو چندرناتھ متر نے ایک مضمون پڑھا تھا جس کا موضوع یہ تھا کہ " عربوں اور ہندوستانیوں کی از منہ قدیم میں سائنس کی ترقی "- موصوف نے اپنے مضمون میں اہل مشرق کے علمی انحطاط کے اسباب و علل سے مفصل بحث کی اور اُن کے رفع کرنے کی تدابیر بتائیں - مولوی محمد حسین نے ایک مضمون " اسلامی اور انگریزی حکومت کے مقابلہ " پر پڑھا - پنڈت من پھول نے کثرت ازدواج کی خرابیاں اپنے مضمون میں بیان کیں اور بتایا کہ یہ رسم کھتری لوگوں میں موجود ہے - منشی گوپال داس نے اپنے مضمون میں اس رسم قبیحہ کے متعلق بحث کی کہ ہندوؤں میں اگر کوئی کسی کی لڑکی اپنے لڑکے کے لیے مانگے تو لڑکی کے والدین کو نقد رقم دینی ہوتی ہے - یہ تو بس ایسا ہی ہے جیسے معمولی خرید فروخت ہوتی ہے - مولوی محمد حسین خاں نے علاوہ ان علمی مضامین کے جو انھوں نے انجمن کے جلسوں میں پڑھے ' اردو کے متعدد شعراء کے متعلق تقریریں بھی کیں —

اسی قسم کی تین اور انجمنیں پنجاب میں قایم ہوئی ہیں - ایک سیالکوٹ میں ' ایک حصار میں اور ایک دھلی میں - غالباً دھلی والی انجمن کے بانیوں میں ایچ گولڈ اسٹریم (H. Goldstream) بھی ہیں - اس

انجمن کا مقصد لاہور کی انجمن کی طرح یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی عام فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ علمی ترقی کی طرف قدم اٹھایا جائے - بغیر اس کے ان میں کوئی اصلاح ممکن نہیں ہے - سرکاری اخبار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے بیشتر امرا اس انجمن میں شریک ہیں اور عملی طور پر دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں - انجمن کا مقصد سائنس کو ترقی دینا بھی ہے تاکہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کی ترقی ہو اور وہ اس باب میں یورپ کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے - سرکاری اخبار کے مدیر نے لکھا ہے کہ راجاؤں مہاراجاؤں اور امرا اور اعلیٰ عہدہ داروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل میں حتی الوسع کوشاں ہوں تاکہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے چہرے پر کی نقاب ہٹائی جاسکے اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ علم کی روشنی سے منور ہوسکیں - اگر وہ خواب غفلت سے چونک اٹھے تو وہ فلاح دنیوی سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں جس سے اب تک وہ محروم ہیں —

۲۸ نومبر سنہ ۶۵ ع کے اودھ اخبار میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے - نادر کی دو غزلیں بھی دی ہیں جو مدیر کے خیال میں مشاعرے کی ساری غزلوں میں بہترین ہیں - نادر مشہور شاعر ہیں - نظم و نثر کی متعدد کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں - ان میں اردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ بھی ہے —

آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ بنگال میں مسلمانوں نے اپنی ایک علحدہ " سائنٹفک سوسائٹی " قایم کی ہے جس کے ماہانہ جلسے کبھی کلکتہ میں اور کبھی علی گڑھ * میں منعقد ہوا کرتے ہیں - چنانچہ اس انجمن کو

---

* ۱۲ اپریل کے " اخبار عالم " میں اس انجمن کی مطبوعات کا ذکر ہے جن میں ایک " تاریخ مصر " ہے —

کلکتہ اور علی گڑھ دونوں مقامات سے منسوب کیا جاتا ھے * ۔ انجمن کے صدر سید احمد خاں ھیں جو علی گڑھ میں رھتے ھیں - یہ سمجھنا بڑی غلطی ھے کہ مسلمان سائنس کے دشمن ھیں - محمد (صلعم) کی طرف یہ حدیث منسوب کی جاتی ھے کہ " عالموں کے لکھنے کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بڑی زیادہ قدر و قیمت رکھتی ھے " - میں نے ابھی جس انجمن کا ذکر کیا وہ خوب ترقی کر رھی ھے " - اس نے لندن کے ایست انڈیا ایسوسیشن(East India Association) سے خط و کتابت کا سلسلہ قایم کرلیا ھے - ایست انڈیا ایسوسیشن ھندوستانیوں کے فلاح و بہبود کے لیے قایم کی گئی ھے اور پارلیمنٹ کے بعض سر برآوردہ رکن اس میں شریک ھیں - بنگال اور صوبہ شمال مغربی کے مسلمان اس اسلامی انجمن میں شرکت کرتے ھیں اگرچہ وہ براہ راست اس کے جلسوں میں حصہ نہیں لے سکتے - پچھلے سال ستمبر میں اس انجمن کے ارکان کی تعداد ۳۸۷ تھی † ۔ اب امید ھے کہ تعداد میں اور اضافہ ھوگیا ھوگا - میرٹھ کے " اخبار عالم ' نے اس انجمن کے معتمد عبدالطیف خاں کے مساعی کی بہت تعریف کی ھے - (۲۹ مارچ سنہ ۱۸۶۶ ع)

کلکتہ کے فارسی اخبار " دوربین " کے حوالے سے میرٹھ کے ' اخبار عالم ' نے لکھا ھے کہ " سائنٹفک سوسائٹی " کا سالانہ اجلاس ۱۸ شوال مطابق ۷ مئی کو منعقد ھوا تھا - اس میں وائسرائے ' لفٹنٹ گورنر بنگال ' وائسرائے کی

---

* مصنف نے دو جدا جدا انجمنوں کو ایک کردیا ھے - سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں تھی جس کے سکریٹری سید احمد خاں تھے - کلکتہ کی انجمن کا نام غالباً " مذاکرۂ علمیہ " تھا (اڈیٹر) —

† امسال اس انجمن کے سر برآوردہ رکن مرزا بذل الرحمن سے پیرس میں ملاقات ھوئی - میرے دوست مسٹر پامر نے ان سے میرا تعارف کرایا - مجھے ان سے اردو میں گفتگو کرنے کا موقع ملا —

مجلس عاملہ اور صوبۂ بنگال کی مجلس عاملہ کے ارکان ، حکومت ہند اور حکومت بنگال کے معتمدین ، ولیعہد اودھ * ، شہزادۂ میسور اور کلکتہ میں جو دوسرے ہندو اور مسلمان امیر کبیر موجود تھے انھوں نے شرکت کی ۔ انگریز بھی مدعو تھے ۔ حاضرین کی کل تعداد تقریباً دو ہزار تھی —

سائنٹفک سوسائٹی نے اپنے قواعد اور دستور کو شائع کردیا ہے لیکن مجھے اب تک اس کی نقل نہیں پہنچی ۔ دستور بناتے وقت ایک جلسہ میں انگلستان کے دستور اساسی پر ایک رکن نے تبصرہ کیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے ارکان انگریزی زبان سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں —

آپ صاحبوں کو یاد ہوگا کہ سر چارلس ٹریولین (Charles Trevelyan) نے پانچ سو روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا جو اس مضمون نگار کو دیا جائے گا جو اردو زبان میں اس موضوع پر بہترین مضمون لکھے : " عربوں کی سائنس اور موجودہ یورپین سائنس کا باہمی تعلق " ۔ معیاد مقررہ کے اندر صرف دو مضمون وصول ہوئے ۔ ایک بمبئی سے آیا اور دوسرا کلکتہ کے مولوی عبیداللہ نے لکھا تھا ۔مولوی عبیداللہ وہی ہیں جن کی " عربی صرف و نحو " کا میں پہلے کہیں ذکر کر چکا ہوں ۔ مسٹر (Cowel) کی غیر موجودگی کے باعث ولیم میور (W Miur) مولوی محمد وجیہ اور عبداللطیف خاں سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی کو مضمونوں کی

* ولیعہد سے نواب واجد علی شاہ کے فرزند مراد ہیں ۔ اس لیے کہ نواب اقبال الدولہ اس وقت جب یہ جلسہ منعقد ہوا پیرس میں تشریف رکھتے تھے ۔ موصوف نے لندن سے مجھے دو خطوط اردو میں لکھے ۔ پہلے خط میں اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ پیرس میں مشرقی السنہ کے سیکھنے کا شوق ہے اور اس کا اظہار وہاں کے اورینٹل اسکول سے ہوتا ہے ۔ جس میں قابل ترین علما درس دیتے ہیں —

جانچ کے لیے مقرر کیا گیا۔ انعام دونوں مضمون نگاروں میں نصف نصف تقسیم کردیا گیا - در اصل بمبئی کے مضمون نگار کا مضمون مقابلتاً بہتر تھا لیکن مضمون نگار نے مقابلے کی سب شرائط کماحقہ پوری نہیں کی تھیں - ثالثوں کی رپورٹ سر چارلس ٹریویلین کے پاس بھیجی گئی- موصوف نے پوری رپورٹ سا ئنٹفک سو سا ئٹی کو بھیجدی ہے جو عنقریب شا ئع ھو جاے گی —

ھندوستان میں اس وقت مذھبی آزادی بدرجہ اتم موجود ھے - ھر شخص کو اختیار ھے کہ جو مذھب چاھے قبول کرے - باھمی نفرت و تعصب کو دور کرنے کا یہی ایک ذریعہ ھے - یہ تو نا ممکن ھے کہ مختلف عقاید میں کوئی مفاھمت کی صورت پیدا کی جا ے - ھاں یہ ھوسکتا ھے کہ ایک دوسرے کے ساتھہ روا داری برتی جاے - تعصب کو کم کرنے کی اس کے سوا اور کو ئی صورت نظر نہیں آتی - مختلف مذاھب کے ماننے والے جہالت کے باعث ایک دوسرے کے دشمن ھو جاتے ھیں - ھندوؤں کا نہایت شد و مد کے ساتھہ یہ دعوی ھے کہ دوسرے مذاھب والے ان کے مذ ھب کو جس طرح پیش کرتے ھیں وہ صحیح نہیں ھے - ھندوؤں میں ایک طبقہ ایسا موجود ھے جو اپنے ھم مذھبوں کے بعض غیر اخلاقی اعمال کو بری نظر سے دیکھتا ھے - چنانچہ بعض سر بر آوردہ ھندوؤں نے حکومت سے درخواست کی ھے کہ ستی ' چرخ پوجا (Charakh Puja) اور جگن ناتھہ کے ان جلوسوں کو جن میں انسانوں کی قربانی کی جاتی ھے غیر قانونی قرار دیا جاے * - ایک طرف ھندو حکومت

* راجہ کوٹہ نے ابھی حا ل میں ایک مہاجن کی بیوہ کو جو ستی ھو نا چا ھتی تھی فر ما ن کے ذ ریعے ستی ھو نے سے ر و ک د یا - وائسرائے بہادر نے راجہ صا حب کے اس فرمان کی تا ئید کی اور یہ توقع ظاھر کی کہ آئندہ اس واقعہ کو بطور مثال پیش نظر رکھا جا ے گا اور لوگ ستی جیسی بے رحما نہ رسم کو قطعاً ترک کردیں گے —

سے درخواست کر رہے ہیں کہ تعدد ازدواج خلاف قانون قرار دیا جاے اور دوسری جانب مسلمان حکومت سے اس امر کی درخواست کر رہے ہیں کہ مخلث بنانے کے رواج کو خلاف قانون قرار دیا جاے —

میں اس سے قبل بھی آپ صاحبوں کو بتا چکا ہوں کہ راجہ رام موہن راے کے انتقال کے بعد برھمو سماج کی ترقی میں کمی نہیں ہوی - کلکتہ میں بابو کیشب چندر سین برھمو سماج کے پر جوش رکن ہیں - اس سماج کے اصول مسیحیت سے بہت کچھہ ملتے جلتے ہیں - بابو کیشب چندر سین نے ابھی حال میں ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کی - مقامی اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر میں خطابت کی شان تھی اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا * —

انگریزی حکومت نے لاھور کی جامع مسجد ' جو عالمگیر کے عہد میں بنائی گئی تھی ' مسلمانوں کو دیدی ہے - چنانچہ پچھلی عید کے موقع پر امام نے اپنے خطبہ میں ملکۂ وکٹوریہ کے لیے جو اگر چہ مسلمانوں کے نزدیک کافر ہیں' ان الفاظ میں دعا کی :

" اے خدا! تو اس پر اپنی حفاظت کا سایہ رکھیو جس نے ہمیں یہ خوبصورت اور عالیشان مسجد واپس دیدی - ملکہ وکٹوریہ ہمیشہ سلامت رہیں جن کی حکومت مشرق سے لے کر مغرب تک قایم ہے اور عرب و بربر نے جن کی فرمانروائی کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے - اے خدا! تو ملکہ وکٹوریہ کے سایہ میں ان کی رعایا کو مستفید ہونے کا موقع عطا کر - آمین - توھی بنی نوع انسان کا محفوظ رکھنے والا ہے " —

* Colonial Church Chronicle سقمبر سنہ ۱۸۶۶ع - بہ حوالہ The Indian Mirror

اگر چہ اس وقت مذہب اسلام کی پشت پناہی پر فاتح قوم کا تعصب کام نہیں کر رہا ہے لیکن بایں ہمہ اسلام بمقابلہ ہندو دھرم کے زیادہ اشاعت حاصل کر رہا ہے - ۱۱ اکتوبر کے " اخبار عالم " میں میری نظر سے یہ خبر گذری کہ ایک شخص نے جس کا نام حاجی محمد ہے پنجاب میں دو لاکھ ہندوؤں کو زمرۂ اسلام میں شامل کر لیا ہے * —

ایک وہابی تاجر اور ان کے چند شاگرد کوکن میں اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں - وہابیوں کو مسلمانوں کا پروتسٹنٹ سمجھنا چاہئے - مسیحی پروتستنتوں کی طرح وہابی لوگ بھی، روز مرہ کی اردو میں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام کرتے ہیں - وہابیوں کی ایک بڑی جماعت پونا اور احمدنگر میں بھی ہے اور حیدر آباد (دکن) میں ان کا ایک بڑا گروہ موجود ہے - نظام حیدر آباد کی خدمت میں جو عرب ہیں وہ بھی وہابی اصول کی اشاعت میں کوشاں ہیں —

ہندوستانی لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسیحی مذہب قبول کر سکتی ہے اگر انگلی کن (Anglican) اور رومن (Roman) کلیسا ایک دوسرے کے اندر ضم ہو جائیں اور متحد ہو کر کام کریں - بد قسمتی سے یہ اتحاد بہت دشوار معلوم ہوتا ہے - اس لیے کہ انگریزی اور یونانی کلیسا اور ہالینڈ کے جان سینسٹ (Janseniste) باہم مطلق روا داری برتنے کو تیار نہیں ہیں - باوجود مسیحی کلیساؤں کے اختلاف کے کوئی نہ کوئی مشہور ہندوستانی مسیحی مذہب قبول کرتا رہتا ہے - بعض ایسے مسلمانوں نے بھی مسیحی مذہب قبول کیا ہے جو اپنی تعلیمی یا معاشری حیثیت سے ملک میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں - چنانچہ مولوی کریم الدین جو ہندوستانی زبان کے مشہور انشا پردازوں

* اس تعداد میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے - مترجم

میں ھیں اور ان کے بھائی مولوی عمادالدین جو خود فاضل آدمی ہیں لیکن جن کو شہرت حاصل نہیں، یورپین لوگوں کے میل جول سے مسیحی مذہب کی طرف رجحان رکھتے ھیں - ان دونوں بھائیوں نے عیسائی مذہب کی خوبیاں اور اسلام کی کوتاھیاں چن چن کر لوگوں میں بیان کرنا شروع کی ھیں - ان میں عمادالدین کا با قاعدہ بپتسما ھو چکا ھے اور کریم الدین بھی عنقریب باقاعدہ مسیحی زمرہ میں شامل ھوجائیں گے - اب دونوں مل کر ایک کتاب لکھ رھے ھیں جس میں اسلامی اصول پر اعتراضات ھوں گے —

'' حضرت مسیح بنی نوع انسان کے نجات دھندہ ھیں اور ان کا پیغام دنیا کی ساری اقوام کو ایک خاندان بناتا ھے - ان کی حکومت دلوں پر ھے - جو ان کی تعلیم کے خلاف ھوتے ھیں وہ بھی بالآخر رام ھو جاتے ھیں اور ان کی شہنشاھی کو تسلیم کرلیتے ھیں '' * —

اس سال ھندوستان سے دلچسپی رکھنے والے جن احباب نے داعیء اجل کو لبیک کہا ان کا ذکر سخت باعث ملال ھے - ان میں سب سے پہلے میں اپنے دو شاگردوں کا ذکر کرتا ھوں - این بلان (N. Bland) کا انتقال امبور لے بین (Hambourg - les - Bains) میں ھوا جہاں وہ عزلت گزینی کی زندگی گزار رھے تھے - ابتدا میں انھوں نے ڈنکن فوربز (Duncan Forbes) کی شاگردی کی اور فارسی اور اُردو کی تحصیل کی - اس کے بعد وہ میرے درسوں میں شریک رھے اور پھر کچھ دنوں کے لیے لندن چلے گئے تھے - ان کا بہت دنوں سے یہ ارادہ تھا کہ ادب فارسی کی ایک تاریخ لکھیں لیکن

---

* یہ ایک لاطینی دعا کا ترجمہ ھے —

موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس خیال کو عمل میں لاسکتے۔ انھوں نے فارسی شعرا کے تذکرے "آتش کدہ" پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ میں نے اُنھیں سودا کے قلمی نسخے کے بدلے میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ نظامی کے "مخزن الاسرار" کا ایڈیشن انھیں کی مساعی کا رہین منت ہے۔ آپ نے ہندوستانی کے سب سے قدیم شاعر مسعود بن سعد کے کلام پر بھی تبصرہ لکھا ہے۔ میرے دوسرے شاگرد پیزا (Pisa) کے ابے باردلی (Abbe Bardelli) ہیں جنھوں نے اس سال داغ مفارقت دیا۔ موسیو مول (M. Mohl) نے پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک جلسہ میں ان علمی کارناموں کا مفصل ذکر کیا ہے جو میرے اس شاگرد کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ موصوف مسیحی علم دین کے جید فاضل تھے اور نہایت وسیع ہمدردی کے شخص تھے۔ آپ سنہ ۱۸۴۳ ع اور سنہ ۱۸۴۴ ع میں میرے درسوں میں برابر شریک رہے اور گرم جوشی سے انہماک ظاہر کرتے رہے۔ آپ کو ایشیائی علوم و ادب سے خاص شغف تھا اور آپ کی تحقیق فلسفیانہ اور لسانیاتی مباحث پر بھی حاوی تھی —

گزشتہ اپریل کی ۲۴ تاریخ کو ڈاکٹر انستاز ہرتمان (Anstase Hartman) کا بعارضۂ ہیضہ انتقال ہوا۔ موصوف سوئٹزرلینڈ کے باشندے تھے۔ ابتدائی عمر میں دینیات کے پروفیسر رہے پھر سنہ ۱۸۴۳ ع میں مسیحی مذہب کے مبلغ کی حیثیت سے ہندوستان چلے آئے۔ سنہ ۱۸۴۵ ع میں پٹنے کے پادری مقرر ہوے اور سنہ ۱۸۵۸ ع میں بمبئی آئے اور سنہ ۱۸۶۱ ع میں پھر پٹنے میں مقرر ہوے۔ ہندوستانی زبان پر موصوف کو پوری دست گاہ حاصل تھی اور آپ نے اس زبان میں متعدد سوال جواب نامے (Catechism)

بھی لکھے جن کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں * - آپ کی مشہور کتاب انجیل مقدس کا ترجمہ ہے جو میں نے خود اب تک نہیں دیکھا - یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں انجیل کے قدیم لاطینی نسخے (Vulgate) کو پیش نظر رکھا گیا ہے † - ویسے اردو اور ہندی میں متعدد ترجمے ہیں جو یونانی زبان سے کیے گئے ہیں - موصوف کا ترجمہ رومن کیتھولک عیسائیوں کے لیے خاص کر کارآمد ہے - ہم اس نیک نیت کی جاں فشانی کا جس قدر بھی

* میں نے ۵ مئی سنہ ۱۸۵۹ ع کے خطبے میں سوال جواب نامے کے پہلے ایڈیشن کا ذکر کیا تھا - یہ کتابی شکل میں بمبئی میں سنہ ۱۸۵۱ ع اور پھر سنہ ۱۸۵۲ ع میں شائع ہو چکے ہیں - یہ تین رسوم خط میں شائع کیے گئے ہیں (۱) دیوناگری رسم خط میں (۲) فارسی رسم خط میں (۳) رومن رسم خط میں - رومن خط والے ایڈیشن میں ہندوستانی صرف و نحو اور ایک چھوٹی سی ہندوستانی الفاظ کی لغت بھی ہے - دوسرا ایڈیشن پٹنہ میں چھپا ہے - میرے قدیم شاگرد موسیو ای سیسے (M . E . Sice) جو پانڈی چری کے رہنے والے ہیں ان کی بدولت مجھے یہ ایڈیشن حاصل ہوا —

† پاپائے روم صرف انھیں تراجم انجیل کو درست قرار دیتا ہے جو قدیم لاطینی نسخے کے مطابق ہوں - چنانچہ یونانی کلیسا کے لوگوں کے لیے بھی انجیل کی یونانی اصل کے علاوہ لاطینی سے علحدہ ترجمہ کیا گیا ہے - یہ دعوی کہ انجیل مقدس کے ترجمے کو رومن کیتھولک لوگ نہیں پڑھ سکتے بے بنیاد ہے اس واسطے کہ پاپا بنیوا چہاردہم (Benoit) کے زمانہ میں لاطینی کے ماسوا دوسری مقامی زبانوں میں ترجموں کی اجازت مل چکی ہے - لیکن یہ شرط رکھی گئی ہے کہ ترجمے کو پاپا پسند کرلے - چنانچہ مشرقی زبانوں میں بھی انجیل مقدس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں - برطانیہ کی انجمن انجیل نے عربی کا ترجمہ شائع کیا اور انجمن اشاعت و تبلیغ نے بھی ترجمے شائع کیے ہیں —

شکریہ ادا کریں کم ہے —

آخر میں ڈاکٹر جارج ایڈورڈ لینچ کاٹن (Dr. George Edward Lynch Cotton) کی دردناک موت کا حال بیان کرتا ہوں - آپ ۶ اکتوبر کو دریائے گنگا میں ڈوب کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے - آپ آسام کی طرف سے اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں واپس آرہے تھے اور کشتیا (Kuschtia) دریا کے راستہ سے دخانی کشتی میں بیٹھ کر جارہے تھے تاکہ وہاں مسیحی قبرستان کے متعلق بعض امور کی تحقیق کریں - آپ ایک نہایت فاضل شخص تھے اور حاجت مندوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے تھے - آپ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ دیسی لوگوں کو مسیحی زمرہ میں شامل کریں بلکہ اس کے ساتھ آپ کی دلی تمنا تھی کہ دیسی لوگوں میں علم و ادب کا شوق پیدا ہو - آپ اپنے ایک پیشرو رینلڈ ہیبر (Reginald Heber) کی طرح دیس لوگوں کے دل و دماغ کے تعصب اور جہالت کی تاریکی کو دور کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ بآسانی مسیحی مذہب کی خوبیوں کو سمجھ سکیں - موصوف بھی ڈاکٹر ہرٹمان (Dr. Hartman) کی طرح ہندوستانی زبان میں پوری مہارت رکھتے تھے - گذشتہ سال میں آپ کی ان تقاریر کا ذکر کرچکا ہوں جو آپ نے ہندوستانی زبان میں کیں - آپ کلکتے کے چھٹے اسقف تھے - کلکتہ کا مذہبی نظم و نسق کا علاقہ (Diocese) بہت وسیع ہے - بنگال کے صوبے کے علاوہ صوبۂ شمال مغربی اودھ پنجاب آسام اراخان تناسرم اور (Strait Settlement) بھی اس شامل ہیں * —

---

* ملاحظہ ہو انڈین میل مورخہ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ ع اور انڈین میل مورخہ ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۶ ع - Strait Settlement میں پنانگ ، ملا کا اور سنگاپور شامل ہیں —

ہماری دلی دعا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہستیاں جن کے دل میں ایک دوسرے کی عزت جاگزین تھی جنت میں ایک دوسرے سے ملیں جہاں انصاف کے آفتاب کی روشنی ہے۔ اس روشنی میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔ جو وہاں داخل ہوتے ہیں پھر کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور جو مدتوں ایک دوسرے سے جدا رہے ہوں وہ ایسے ملتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں بچھڑتے * —

---

* The Psalmist, New Collection of Hymns, Boston, 1854, P. 687.

روسی ناول

پہلا دور

اوان سرگئے یوچ تورگینف

(۱۸۱۸ - ۱۸۸۳)

از

جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

تور گینف روس کے ایک بہت مشہور رئیس خاندان سے تھا - اس کے باپ نے آبائی جائداد گنوادی تھی، مگر اُس کے ماں کے پاس اس قدر سرمایہ تھا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکے اور تور گینف نے زندگی خاصی آسودگی سے بسر کی - ۱۸۳۴ میں تورگینف ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا، وہاں تعلیم ختم کرنے کے بعد خوش حال روسی طالب علموں کی رسم کے مطابق جرمنی گیا اور تین سال تک برلن کے دارالعلوم میں لکچر سنتا رہا - جرمنی سے واپسی پر وہ ریاست میں ملازم ہوگیا - مگر طبیعت کی نامناسبت نے اسے ملازمت ترک کرنے پر مجبور کیا، اور ۱۸۴۳ میں اس نے استعفا دے دیا - اس کے بعد سے اس نے اپنی زندگی انشاپردازی کے لیے وقف کردی - اسے شاعری کا شوق تھا، طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس نے بائرن اور دوسرے یورپی شاعروں کے ترجمے کیے تھے جو کسی قدر مقبول ہوے - ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک نظم "پراشا"

لکھی جس کی مشہور نقاد بے لن سکی نے بہت تعریف کی۔ مگر اس فن میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اور اس نے شاعری تقریباً چھوڑ دی۔ ۱۸۴۵ میں اس کی پہلی نثر کی تصنیف "شکاری کے مشاہدات" شائع ہوئی جس نے اس کی ساری خوبیاں روس کی ادبی دنیا پر روشن کر دیں۔ مگر "شکاری کے مشاہدات" کی کامیابی بھی تور گینف کو روسی ماحول سے رضامند نہ رکھ سکی اور ۱۸۴۷ ع میں وہ وطن کو خیر باد کہہ کر فرانس چلا گیا اور پیرس میں رہنے لگا۔ ۱۸۵۲ میں وہ تھوڑے عرصہ کے لیے گوگول کی تعزیت کے سلسلے میں روس واپس ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے چند روز جیل خانے میں گذارنے پڑے۔ جیل خانے سے رہائی پر وہ پھر یورپ چلا گیا، سیر و سیاحت کرتا رہا، اور مدام وی آردوت گارسیا، ایک مشہور گانے والی کی نیاز مندانہ خدمات میں مصروف رہا۔ ۱۸۷۸ میں اسے ایک مرض ہوگیا جس کی نوعیت پہلے پہل ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور جو آخر وقت میں معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا سرطان ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور تورگینف کی عمر کے آخری دوسال پلنگ پر پڑے پڑے گذرے —

"شکاری کے مشاہدات" کے بعد تورگینف لمبے اور مختصر افسانے لکھتا رہا، جن میں "گوشۂ عافیت" "خطوط" "یاکوت پاس کوت" اور "آسیا" سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ۱۸۵۵ میں اس کا پہلا ناول "رودن" شائع ہوا، اور ناول نویسی کی حیثیت سے بھی تور گینف کو بہت اعلی رتبہ حاصل ہو گیا۔ "رئیسوں کا آشیانہ" (۱۸۵۸) اور "صبح امید" (۱۸۵۹) نے تور گینف کی شہرت اور ہر دل عزیزی کو عروج پر پہنچا دیا، مگر "باپ بیٹے" (۱۸۶۱) نے اس کے اور اس کے شیدائوں میں غلط فہمی پیدا کر دی جسے رفع کرنے کے لیے اس نے اس موضوع پر ایک لمبا ناول لکھنے کا ارادہ کیا، مگر پورا نہ کرسکا۔ "دھواں" (۱۸۶۷)

باوجود اپنے بے شمار اوصاف کے غلط فہمی کو اور بڑھانے کا باعث ہوا ' اور جب تورگینف نے " اچھوتی زمین " (۱۸۷۶) لکھا تو وہ روس کے حالات سے اس قدر گہری واقفیت نہیں رکھتا تھا کہ ناول کو مفاہمت کا ذریعہ بناسکے - " اچھوتی زمین " تورگینف کا آخری ناول تھا - اس کے بعد اس نے صرف چند انوکھے خیالی قصے لکھے اور عین علالت کے دور ان میں " نثر میں نظمیں " یا " بڑھاپے کے تصورات " -

تورگینف کی تصانیف اور اس کے خیالات کا سلسلہ روس کے معاصر حالات سے بہت وابستہ ہے - اور اس کا اپنا قول بھی ہے کہ اس کی تصانیف پوری طرح سمجھنے کے لیے انھیں سلسلہ وار پڑھنا اور اس تاریخی اور معاشرتی ماحول کو جس کی فضا اور تاثیر ان میں دکھائی گئی ہے ہمیشہ پس منظر کے پر طور رکھنا چاہئے - تورگینف نے اپنے پہلے افسانوں میں اس زمانے کا عکس اتارا جب زمیندار خداوندی کے نشے میں چور تھے ' اور کاشتکار غلامی کے مرض میں مبتلا لیکن روسی ذہنیت میں تغیر ہو رہا تھا - تعلیم ' اور تعلیم سے زیادہ انشا پردازوں نے خوش حال اور پڑھے لکھے روسیوں کے ضمیر کو بتدریج اس قدر ذی حس اور بیدار کردیا کہ کسانوں کی غلامی اور ذہنی پستی سے ان کے دل دکھنے لگے ' اور کسانوں کو آزاد کرنا ہر روشن خیال روسی کی آرزو ہوگئی - کسانوں کو آزاد کرنے کے ساتھ یہ لازمی تھا کہ زمیندار اپنا طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات بدلیں * ' دوسروں کی محنت پر بسر کرنے کے بجائے اپنے ذریعۂ معاش کی خود فکر

---

* زمینداروں کو (۱۸۶۱) سے پہلے اپنے کاشتکاروں سے بلا اجرت ہر قسم کا کام لینے کا پورا حق تھا - کاشتکاروں کی آزادی کے بعد انہیں لگان تو ملتا رہا ' مگر چونکہ سیو پر کام کرانے کی اجرت دینا پڑتا تھا اس لیے ان کی آمدنی میں بہت کمی ہوگئی -

کریں - ان لوگوں کے لیے جو ہمیشہ سے بیکاری کے عادی تھے اس نئی زندگی کا بیڑا اُٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا - اور لوگوں کی ہمت اور حوصلوں کا چڑھاؤ اتار ' ان کی امیدیں ' اندیشے ' ناکامیاں خود بخود انشا پردازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں - ۱۸۶۰ تک زیادہ تر یہی کیفیتیں تورگینف کا موضوع رہیں - اس کی اپنی طبیعت حزن و یاس کی طرف مائل تھی - اور اس کی تصانیف کا رنگ بھی ایسا ہی ہے - مگر اس کی مایوسی بیجا نہیں تھی اور اگر اس کی تصانیف سے یہ ظاہر ہوا کہ خوش حال روسی اس نئی زندگی کی رسمیں ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اس میں حقیقت کے خلاف کوئی بات نہ تھی واقعات نے دکھا دیا کہ وہ نسل جس نے کسانوں کو آزاد کرایا آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی ' کیونکہ اس کی ذہنیت اور اس فضا نے جس میں اس نے تربیت پائی تھی اسے قومی زندگی کی تعمیر کے لیے بالکل ناموزوں بنا دیا تھا - تعمیر کا حوصلہ اس کے بعد کی نسل میں نظر آتا ہے اور '' باپ بیٹے'' میں تورگینف نے نئی نسل کے ایک مثالی نمونے کا پچھلی نسل کے لوگوں سے مقابلہ کیا ہے - نئی نسل کا نمایندہ منکر * تھا اور تورگینف نے اس کے چال چلن اور خیالات میں '' منکریت '' کی ایک تصویر کھینچی - اس کی نقاشی میں کوئی کسر نہیں تھی ' اس کی نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی ' دل میں کھوٹ نہیں تھا ' اپنے '' منکر '' ہیرو سے اس کو نہ کوئی عداوت تھی اور نہ ناول میں عداوت ظاہر ہوتی ہے ' لیکن عام طور سے ناظرین اور نقادوں کو بدگمانی

---

* Nihilist یعنی وہ جو پرانی معاشرت ' مذہب ' فلسفۂ حیات سب کی درستی سے انکار کرتا ہو اور سب کو مٹا دینا چاہتا ہو -

ہوگئی کہ وہ نئی اور پرانی نسلوں کا مضحکہ اڑا رہا ہے اور اس بد گمانی نے تورگینف کے نام میں بٹہ لگادیا - قومی حوصلوں سے وہ ہمدردی ' قومی سیرت سے گہری واقفیت رکھنے کا وہ اعتبار جو اس کی پچھلی تصانیف نے قائم کیا تھا بالکل جاتا رہا - اور تورگینف کے دل کو ایسی سخت چوٹ لگی جس کے درد سے اسے تمام عمر تکلیف رہی —

" باپ بیٹے ،، کے بعد چھہ سال تک تورگینف بالکل خاموش رہا ' اور پھر " دھویں ،، میں قومی مسائل اور مشکلوں کا پس منظر ایسے رنگ میں دکھایا جس سے مایوسی ٹپکتی ہے - " دھویں ،، کے بعد پھر نو سال تک تورگینف نے کوئی ناول نہیں لکھا - اچھوتی زمین (۱۸۷۶) کی تصنیف کے وقت تک اس نے قوم کی نا قدر دانی اور کج فہمی معاف کردی تھی ' اور اس کے علاوہ قوم میں بلند حوصلگی اور اثیار کی ایسی علامتیں نظر آنے لگی تھیں کہ اس کی ڈھارس بندھ گئی اور وہ پھر تعمیر کے خواب دیکھنے لگا - ترقی کی علامتیں تھیں " ملکروں ،، کی تحریک کا پھیلنا ' مضبوط ہونا ' اور اپنی قربانیوں سے قوم میں عزت اور وقار حاصل کرنا ؛ اس کے ساتھہ ہی ایک اور تحریک کا آغاز جسے اچھوت سیوا سمجھنا چاہئیے ' جس کے پیرو دنیا اور دنیاوی حوصلے چھوڑ کر قوم کے سب سے نچلے اور پست طبقوں میں جا ملے تھے اور ان کی خدمت اور تعلیم کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں - سب سے زیادہ محبت افزا بات یہ تھی کہ ان دونوں تحریکوں میں عورتیں اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں شریک تھیں - اور دنیا کی تاریخ میں شاید ہی عورتوں کی کسی جماعت کی ایسی مثال ملے گی جو ان لڑکیوں اور عورتوں کی صداقت ' خلوص ' جانفشانی اور اعلیٰ اخلاق کا مقابلہ کرسکے - تورگینف ایک مدت سے روس نہیں گیا تھا ' اسے سب کچھہ اپنی آنکھہ سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے "اچھوتی

زمین" کو سرسبز کرنے والوں کی داستان اپنے وجدانی علم پر بھروسہ کرکے لکھی۔ اس کی تصنیف نے ان خاص لوگوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا جن کی زندگی اور جد و جہد اس کا موضوع تھی' پھر بھی اگر ہم ناول پڑھ کر اصلی تاریخی حالات اور واقعات پر غور کریں تو تورگینف کی حقیقت بینی اور نکتہ رسی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا —

وہ زمانہ جس کے ظاہر اور باطن سے تورگینف واقف تھا نظر سے اوجھل اور یاد سے محو ہوگیا تھا۔ وہ لوگ جن کی سیرت اور مزاج اور فلسفۂ حیات کو وہ جانتا اور سمجھتا تھا مرچکے تھے' اور نئی نسل کے مستقبل کی نسبت پیشین گوئیاں کرنا ' نئی زندگی کی پہیلیاں بوجھنا اس کی قدرت سے باہر تھا۔ تورگینف کے اس دور کے افسانے اس کی پہلی کہانیوں سے بہت مختلف ہیں۔ گوگول کی طرح اس پر بھی بڑھاپے میں ایک مذہبی کیفیت طاری ہوگئی جس نے اس کے حقیقت کے معیار کو بالکل پلٹ دیا ' اور اس کے افسانوں میں مافوق‌الفطری قوتوں کو بہت دخل ہونے لگا۔ لیکن ان افسانوں سے بہت زیادہ اہم اور گراں قدر اس کی " نثر میں نظمیں " ہیں۔ ان میں دو چار افسانے بھی ہیں' ایک دو جگہ سیاسی اور دیگر مسائل پر رائے ظاہر کی گئی ہے ' مگر ان میں زیادہ تر بڑھاپے کے تصورات ہیں ایک ایسے شخص کے جو روسی کہاوت کے مطابق " اپنی زندگی بھر جی چکا تھا " اور دنیا سے رخصت ہونے کو تیار بیٹھا تھا —

" شکاری کے مشاہدات " میں تورگینف نے قوم کو کسانوں کی اصلی حالت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا۔ اس موضوع پر بہت سے ناول اور افسانے لکھے جا چکے تھے' اور روسی کسانوں کی زندگی کا کوئی پہلو

نہیں تھا جو انشا پردازوں کی نظر سے چھپا رہا ' مگر تورگینف کا اپنا الگ انداز ھے جس کا کوئی جواب نہیں ملتا ' اس کا نقطۂ نظر کسانوں کے ھمدرد یا حامی کا نہیں۔ زمینداروں کی زیادتیاں بھی بظاھر اس کے دل کو نہیں دکھاتی ھیں ' اسے حق اور انصاف اور راست بازی کے اعلی معیار سے بھی کوئی سروکار نہیں معلوم ھوتا ' پھر بھی جتنا اثر روشن خیال لوگوں پر اس کے " شکاری کے مشاھدات " کا ھوا اس کا مقابلہ کوئی اور تصنیف نہیں کر سکتی - " مشاھدات " کی کامیابی کا راز یہ ھے کہ تورگینف کی طرح کیرکٹر کا خاکہ اتارنا اور زندگی کی کیفیتیں بیان کرنا کسی کو نصیب نہیں ھوا - اپنے کیرکٹروں سے ظاھری بے تعلقی دکھا کر وہ اپنے بیان میں ایک خاص تاثیر پیدا کردیتا ھے اور اس کا نشتر دل میں اور زیادہ چبھتا ھے —

اس کے ساتھ ھی تورگینف مناظر قدرت کا شیدائی تھا ' روسی سر زمین اور آب و ھوا ' پرند اور جانور ' جھاڑ جنگل اور پھول پتیاں اسے اس قدر عزیز تھیں کہ وہ ان کے ھر رنگ اور کیفیت کو سمجھتا تھا ' اور اس کی شدید محبت نے اس کے قلم میں ھر چیز اور ھر حالت کا نقش اتارنے کی صلاحیت پیدا کردی - انسان اور انسانی قانون کا جور و ستم غلاموں اور غلامی کے دردناک مظہر " مشاھدات " کے ناظرین کو اس وجہ سے اور بھی زیادہ نفرت انگیز معلوم ھوئے کہ ان کا پس منظر بہت ھی دلکش تھا ' انسانی زندگی کی کہانی فطرت کی کتاب میں لکھی گئی تھی ' مگر وہ ایک خوش نما حاشیے میں ایک بھدی عبارت تھی —

یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ناظرین کے سامنے روسی کسانوں ' اور ان بیچاروں کی زیادہ مثالیں پیش کی جائیں جو آقا کے کھیت جوتنے کے بجائے اس کے گھر کا کام کرتے تھے - تورگینف نے کسان اور خانگی غلاموں

کے بہت سے خاکے اتارے ہیں اور ان میں سے ہر ایک یکساں عبرت انگیز
اور سبق آموز ہے - وہ کسان جس کی ہستی قانوناً تسلیم نہیں کی جا سکتی
اس وجہ سے کہ پچھلی مردم شماری میں اس کا نام لکھنا رہ گیا تھا ' یا
وہ جسے دنیا میں ایک کُتے کے سوا کسی زندہ چیز سے محبت نہیں ' اور جس سے
محبت کرنے والا بھی اس کتے کے سوا کوئی نہیں ' تورگینف کی مصوری
کے ایسے نمونے ہیں جہاں اس نے قلم کی زرا سی جنبش سے پورے پورے نقشے
بنا دیے ' اور چاند الفاظ میں ایک درد ناک داستان سنادی جس کا اختصار اس
کے اثر کو دو گونہ کردیتا ہے - کسانوں کی پستی کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو
جہاں یہی ایجاز پھر اپنا کرشمہ دکھاتا ہے —

" ستیپ کے بادشاہ لی سر " میں ایک میجسٹریٹ کسانوں کو باضابطہ اطلاع
دیتا ہے کہ ان کا مالک بدل گیا ہے ' اور محض رسماً پوچھتا ہے :

" تم میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں کرنا ہے ؟ "

موت کی سی خاموشی -

" کیوں شیطان کے بچو ' کیا تم جواب نہیں دو گے ؟ "

آخر کار ایک بڈھا جو سپاہی رہ چکا تھا آگے بڑھ کر بولا :

" جی نہیں حضور ' ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے ! "

اس کے ساتھیوں نے حیرت سے بڈھے کی طرف دیکھا ' ایک حیرت جس
میں میجسٹریٹ بھی شامل تھے ' اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہنے لگے:

" دیکھو بہادر آدمی ایسے ہوتے ہیں ! "

" شکاری کے مشاہدات " کے بعد بھی تورگینف اکثر دیہاتی زندگی اور
خانگی غلاموں کی داستانیں سناتا رہا - اس سلسلے میں " پونن اور بابورن "
کا افسانہ جو اس نے ۱۸۷۴ میں " اچھوتی زمین " کے قبل ہی لکھا خاص طور

سے قابل توجہ ھے - گو وہ کسانوں کے قانوناً آزاد ہونے کے تیرہ سال بعد تصنیف ھوا ' اس کا قصہ غلامی کے زمانے سے شروع ھوتا ھے ' اس کا ھیرو و باہورن ' ایک غریب آدمی ھے جس کا نوکری چاکری کے سوا اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں ' لیکن اس ذلیل پیشے کے باوجود وہ ھمیشہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر عمل کرتا ھے جو اسے اس کے دل نے سکھائے ھیں یا ان اخلاقی تصانیف نے جن کا وہ مطالعہ کرتا رہا ھے - چونکہ اس کے اصول غلامی اور آقائی کے ماحول میں نہیں کھپ سکتے ' اس کا کہیں گذر نہیں ھوتا اور اسے ھر قسم کی مصیبتیں اٹھانا پڑتی ھیں - لیکن وہ اپنے ارادے میں ایسا اٹل ھے کہ اپنی ساری تکلیفوں کو برداشت کرتا ھے - اور اس کی ھمت اور انسانی ھمدردی دوسروں کا سہارا بن جاتی ھے اس بنا پر کہ ایک غریب آدمی کا فرض ھے کہ دوسرے غریب آدمی کی مدد کرے - وہ اپنے دوست پونن کی پرورش اپنے ذمہ لیتا ھے ' اور پونن مرتے دم تک اسی کے بھروسہ پر بسر کرتا ھے - اسی طرح باہورن کی ایک لڑکی موزا کو جو کسی زمیندار کی نا جائز اولاد ھے ' اپنی حمایت میں لے لیتا ھے ' اسے کھلاتا پلاتا ھے ' اور باوجودیکہ وہ ایک نوجوان زمیندار کے ساتھ فرار ھو جاتی ھے اور ایک عرصہ تک اس کی غیر منکوحہ بیوی بن کر رہتی ھے ' باہورن اس کی خطا معاف کردیتا ھے ' اور جب نوجوان رئیس اسے نکال باھر کرتا ھے تو خود اس سے شادی کرلیتا ھے - آخر میں باہورن کسی سازش کے سلسلے میں گرفتار ھوکر سائبیریا کے ایک دور افتادہ مقام پر بھیج دیا جاتا ھے ' وھاں وہ ایک اسکول قائم کرکے بچوں کی تعلیم میں مشغول ھوجاتا ھے اور اس کام میں موزا بھی بڑے انہماک سے شریک ھوجاتی ھے - (۱۸۶۱) میں کسانوں کے قانوناً آزاد کردئے جانے کی خوشی میں وہ ننگے سر بارش

میں دوستوں کو خبر سنانے کے لیے شہر بھر میں گھومتا پھرتا ہے ' اس بے احتیاطی کی وجہ سے اسے زکام اور بخار ہوجاتا ہے اور اسی میں اس کی جان جاتی ہے - موزا اس کے کام کو جاری رکھنا اپنا عین فرض سمجھتی ہے اور بڑے استقلال سے اس میں لگی رہتی ہے —

باہورن دراصل غلام نہیں ہے ' مگر وہ رئیسوں اور زمینداروں کے طبقے کا بھی نہیں ' اور اس کا قوم کی بہبود اور اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کا شیدائی ہونا روس کی ذہنی بیداری کی ایک روشن دلیل ہے ' تورگینف نے اس افسانے میں قوم کے اس طبقے کی خیر خواہی کا آخری حق ادا کردیا جس کی حمایت میں اس نے پہلے پہل قلم اٹھایا تھا - یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ تورگینف تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے بہت مایوس تھا ؛ اس کے وہ تمام ہیرو جوتعلیم یافتہ خوش حال ہیں آخر میں ناکامیاب ہوتے ہیں اور سب کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہیں ' مگر باہورن کامیاب رہا ' موزا جیسی لڑکی کو جو اس سے شروع میں نفرت کرتی تھی اپنی شخصیت کا قائل اور اپنے اصولوں کا معتقد بنا لیا ' اور جہاں گیا وہاں خود بخود اپنے خاص حلقے کا رہبر اور رہنما بن گیا - تورگینف نے اپنا کمال انھی کیرکٹروں کا خاکہ اتارنے میں دکھایا ہے جو مایوسی میں ڈوبے ہوے ہیں ' اگر کوئی استثنا ہے تو باہورن - اس کا کیرکٹر تورگینف کے کارناموں میں سے ہے - اور اس کی شخصیت روسی سیرت کا ایک اعلیٰ نمونہ —

" مشاہدات " کے بعد دس سال تک تورگینف پر مایوسی کا غلبہ رہا - یہ زمانہ وہ تھا جب زارنکولاس کا جبر انتہا کو پہنچ گیا تھا ' تقریر اور تحریر کی آزادی اس قدر محدود ہوگئی تھی کہ سارا ملک ایک قیدخانہ سا بن گیا تھا ' اور آزاد خیال لوگوں کے لیے چین سے زندگی بسر کرنا محال

ہو گیا تھا - اس پستی کا الزام بڑی حد تک ریاست پر رکھا جا سکتا تھا ' لیکن تورگینف کے مشاہدے نے اسے یہ بھی بتادیا کہ خود روسی قوم اور خصوصاً تعلیم یافتہ اور خوش حال روسی بھی اس افسوس ناک حالت کے ذمہ دار ہیں - " گوشۂ عافیت "، " خطوط یا کوت پاسن کوت " " آسیا " اور ان کے علاوہ متعدد مختصر افسانے تورگینف کے اس خیال کو نہایت شاعرانہ طریقے سے ظاہر کرتے ہیں - بعض افسانوں میں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن پر خداوندی کا زعم بھوت بن کر سوار ہوگیا تھا ؛ اور وہ کسی ظلم یا بد اخلاقی کو اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے - یہ منتوت کے ہیرو پچوان کی طرح اپنی اور دوسروں کی زندگی سے بیزار ہیں ' اور اپنی اور دوسروں کی زندگی بگاڑنے کے سوا انہیں اور کوئی شغل اپنے شایان شان نہیں معلوم ہوتا ؛ لیکن زیادہ تر تورگینف کا موضوع روس کے " فضول " لوگ ہیں ' جو من چلے ہیں اور بلند آرزوئیں رکھتے ہیں ' مگر دل کے کمزور ہیں اور ہمت کے پست - ان کا ایک مثالی نمونہ " فضول آدمی کے روز نامچے " میں پیش کیا گیا ہے - اس شخص کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی مصرف کا نہیں پاتا ' اسے اپنی زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا اور دوسرے اسے اس لائق ہی نہیں سمجھتے کہ اس سے کوئی توقع رکھیں - یوں اس کی عمر اپنے آپ سے یہی پوچھتے گزر جاتی ہے کہ میں آخر پیدا کیوں ہوا - " فضول آدمی کے روز نامچے " کا مصنف تو ایک غیر معمولی قسم کا بیکار اور حقیر وجود ہے ' تورگینف کے بہت سے کیرکٹر ہیں جو کم و بیش اسی کے سے روحانی مرض میں مبتلا ہیں ' اگرچہ وہ اسے محسوس نہیں کرتے اور اپنا دکھڑا نہیں روتے پھرتے ہیں - تورگینف کا " فضول " آدمی محض ایک اشارہ ہے ان بےشمار لوگوں کی طرف جو کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھتے کہ

ہم دنیا میں آخر کیا کررھے ھیں اور اپنے وجود سے کسی کو فائدہ پہنچا رھے ھیں یا نہیں - ان کا ضمیر بیدار کرنے کے لیے کوئی صدمہ بھی کافی نہیں - کوئی حوصلہ کوئی تمنا ان کے دلوں میں نہیں پیدا ھوتی جو ان کے نباتات کے سے سکون میں خلل ڈال سکے - تورگینف کو ایسے لوگ روس میں بڑی کثرت سے نظر آئے ' لیکن روس کے باھر بھی ' وہ اسی افراط سے ملیں گے ' اور دیکھنے والا انھیں ھر جگہ دیکھہ سکتا ھے - " فضول " آدمیوں سے بہت ملتے جلتے تورگینف کے من چلے کیرکٹر ھیں ' اور ان کے ایک خالص نمونے کا بھی اس نے ایک افسانے میں عکس اتارا ھے جس کا عنوان " من چلا " ھے - " فضول " اور " من چلے " آدمی میں سب سے بڑا فرق یہ ھے کہ " من چلے " میں سکون نہیں ' اور چین سے رھنا اس کے لیے فطرتاً ناممکن ھے - وہ نہ جم کر کوئی کام کرسکتا ھے نہ کوئی خدمت انجام دے سکتا ھے : اور اس میں اپنی اھمیت یا وقعت کا اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ اپنی بھلائی کی فکر کرے ' اپنی حرکتوں کے انجام پر غور کرے ' یا اپنے کسی نقصان پر افسوس کرے - " فضول " آدمی کے قویٰ کو فضول اور بے مصرف ھونے کا خیال زائل کردیتا ھے ' " من چلے " کو یہی خیال دیوانہ کردیتا ھے اور اسے کسی چیز کی پروا نہیں رھتی سب سے کم اپنی ذاتی بھلائی کی —

" من چلے " کا چچا اس سے کہتا ھے - " تیری یہ سب باتیں اور تیری مایوسی بھی بیکاری کا نتیجہ ھے " من چلا جواب دیتا ھے مگر چچا جان مجھہ میں کچھہ کرنے کی ' کسی کام میں لگ جانے کی صلاحیت نہیں ! کہیے تو اپنی جان جواری کی طرح ایک پتے پر لگادوں ! ... یہ تو مجھہ سے ھوسکتا ھے ! آپ مجھے بتائیے کہ کیا کروں - کس مقصد کے لیے اپنی جان

جو کچھ میں ڈال دوں - میں اسی وقت تیار ہوجاؤں گا !...

" مگر تم سلامتی سے کیوں نہیں رہ سکتے ؟ ... جان جو کھم میں ڈالنے کی ضرورت کیا ہے ؟ "

" یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا ! آپ فرماتے ہیں تم سمجھ سے کام نہیں لیتے ... مگر میں اور کیا کروں کیا ؟ ... سوچنا شروع کروں تو خدا کی پناہ ! کیا کیا خیالات دماغ میں نہیں پہنچ جاتے ! سوچنا تو صرف جرمنوں کے بس کی بات ہے " —

من چلے میں ہمت ' نیکی ' فیاضی ' انسانی ہمدردی کی کوئی کمی نہیں ' لیکن اس میں استقلال مطلق نہیں ' عقل سلیم سے وہ بالکل محروم ہے ' اعلے حوصلے رکھنے کا وہ اپنے کو اہل نہیں سمجھتا ' اور یہ کمزوریاں اس کی تمام خوبیوں کومٹی میں ملا دیتی ہیں - جو ذرا سا سدھرنے کا امکان ہو بھی وہ شراب خواری کی لت باقی نہیں چھوڑتی ' اور من چلا دوسروں کی توجہ اور امداد کے باوجود آپ اپنے ہاتوں تباہ ہوتا ہے —

" فضول " اور " من چلے " آدمی روس کی مستقل خصوصیات ہیں' اور انہیں دریافت کرنا تو رگینف کی حقیقت بینی کی ایک بڑی دلیل ہے' مگر شروع میں تورگینف کی توجہ روسیوں کے ایک اور گروہ کی طرف تھی جس کی اہمیت فضول اور من چلے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے - یہ وہ لوگ تھے جن کا اخلاقی معیار بلند تھا ' آرزوئیں گرم تھیں ' مگر جو ہمت اور عملی استعداد سے بالکل محروم تھے - ۱۸۴۵ سے ۱۸۵۵ تک ' جب ریاست کا جبر انتہا کو پہنچ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی خانہ سازی کا بہت غوغا تھا ' اس قسم کے لوگوں کی خوبیاں اور خامیاں بہت صاف اور شوخ رنگوں میں نظر آنے لگیں ' تورگینف کا ان سے بہت سابقہ پڑتا تھا ' کیونکہ یہ لوگ عموماً اس کی طرح

خوش حال ، تعلیم یافتہ ، جہاں دیدہ ہوا کرتے تھے ، یورپ کے حالات سے بخوبی واقف ، یوروپی ذہنی تحریکوں سے آشنا تھے ، اور خوب جانتے تھے کہ یورپ میں کون سے طریقے قومی اصلاح کے لیے اختیار کیے گئے۔ لیکن اس تمام ساز و سامان کے باوجود ان میں ہمت کی اتنی کمی تھی ، اور جمود یا مجہولیت کی طرف اتنا قوی میلان کہ وہ کوشش اور محنت کو فضول قرار دے کر اپنی کامیابی کی جڑ خود ہی کاٹ دیتے تھے۔ تورگینف نے اس طبیعت اور ذہنیت کے نمونے ہر جگہ دیکھے ، روس کے دور افتادہ گانووں میں ، ماسکو اور پیٹربرگ میں ، یورپ کے بڑے اور مشہور شہروں میں ، اور ہر جگہ اسے وہ ایک ہی بیماری میں مبتلا نظر آئے ، اور ایک ہی انجام ان کی قسمت میں لکھا ہوا معلوم ہوا۔ " آسیا " جرمنی کے شہر ہائی ڈل برگ کا ایک عشق کا قصہ ہے جس میں ہر دل لبھانے والی صفت تھی ، ایک زندگی کا جسے سنوار نے کے لیے ہر سامان موجود تھا ، اور ایک لڑکی کا جو زندگی سنوار نے اور اسے فائدہ مند اور کامیاب بنانے کی اہل تھی ، لیکن یہ امکانات ایک سراب بن کر رہ گئے ، ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو گئے ، اس لیے کہ وہ ذرا سی ہمت اور کوشش جو انہیں اصلیت کا رنگ روپ دینے کے لیے درکار تھی میسر نہ ہوسکی۔ " خطوط " روس کی ان لڑکیوں کا گلا ہے جنہیں آسیا کے ہیرو جیسے نوجوان امیدوں کے نشے سے مست کر دیتے تھے اور پھر مایوسی کے زہر سے اس نشے کو اتارتے تھے۔ معصوم اور نا تجربہ کار لڑکی اس کی منتظر رہتی کہ وہ شخص جس کے لیے اس کی روح تڑپ رہی تھی نظر آئے ، آخرکار وہ نمودار ہوتا ہے ... لڑکی کے دل میں مسرت ، محبت ، خیالات کے چشمے بہنے لگتے ہیں ، اس کی بیچینی جاتی رہتی ہے ، شک دور ہو جاتے ہیں : اسے اپنے دوست کی ہر بات

حق کی گفتار معلوم ہوتی ہے' وہ اپنے دوست کی پرستش کرتی ہے' اپنی خوشی کو حد سے گذرتے دیکھ کر اسے شرم آتی ہے' وہ دوست سے ہر بات سیکھتی ہے' دوست کی ہر بات سے اسے محبت ہو جاتی ہے ... اگر اس کا دوست واقعی ہمت اور حوصلے والا ہو تو وہ اس میں بے انتہا جوش پیدا کر سکتا ہے' اسے ایثار کی راہ رسم سے واقف کر سکتا ہے' اور پھر کوئی ایثار نہ ہوگا جو اس لڑکی پر گراں گذرے! لیکن آج کل ہمت اور حوصلے والے جوانمرد ہوتے ہی نہیں' وہ راگ جس کا آتھان اس شان سے ہوتا ہے بہت بے میل سروں پر ختم ہوتا ہے۔ اس خط کی مصنفہ آگے چل کر بیان کرتی ہے" میں نے اپنے تجربے سے سیکھا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اغراض اور ذلیل سے ذلیل سلامت روی کے اصول انتہائی جوش کے پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ یوں ان دوستوں کی جدائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور خوش قسمت ہے وہ لڑکی جو محسوس کر لے کہ داستان یہاں پر ختم ہوگئی ہے' اور جو دل کو بہلانے کے لیے بھی اس کے جاری رکھنے کی امید نہ رکھے!"۔ "رودن" میں تور گینف نے شکایت کا یہی سلسلہ جاری رکھا ہے' مگر بڑے پیمانے پر اور دوسرے انداز میں۔ دمیتری نکولائچ رودن ایک نہایت وسیع معلومات کا' ذہین اور حوصلہ مند آدمی ہے۔ اس کے اخلاق اور آداب اتنے خوشگوار ہیں' گفتگو اور بحث کے فن میں وہ ایسا ماہر اور مشاق ہے کہ اس کی ہر گھرانے میں بہت خوشی اور شوق سے آؤ بھگت کی جاتی ہے' وہ سوسائٹی کا ایک لات لا بیٹا بن جاتا ہے اور بغیر اسے محسوس کیے کہ اس کی حیثیت کیا ہوگئی ہے وہ نہ اپنی روزی کی فکر کرتا ہے نہ اپنے لیے کوئی مناسب شغل نکالتا ہے' چنانچہ اس کا ایک معترض کہتا ہے " وہ کوئی بڑا عالم نہیں' اپنی پرورش کا بار دوسروں پر ڈالنا' بڑا آدمی بننا اسے خاص طور سے پسند

ہے ... جی ہاں' اس کا دل برف کی طرح سرد ہے' وہ اسے جانتا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے دل میں آگ ہی آگ ہے۔ برائی کی بات یہ ہے کہ وہ ایک خطرناک کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ اس کی ذات کو اس بات سے تو کوئی خطرہ نہیں' یہ تو ظاہر ہے' کیوں کہ وہ کسی داؤں پر اپنی ایک کانی کوڑی یا ٹوٹا بال تک نہیں لگاتا' مگر اور لوگ اس کے کہنے پر اعتبار کر کے اپنی روح تک ایک داؤں پر لگا سکتے ہیں ... ایک اور برائی کی بات یہ ہے کہ وہ کافی دیانت دار بھی نہیں' وہ ذہین آدمی ہے' اسے چاہیے کہ اپنے قول کی اہمیت محسوس کرے' ہر بات یہ سمجھ کر کرے کہ اس کی کچھ قیمت ہے ... نوجوانوں کا جوشیلی تقریریں کرنا معاف کیا جا سکتا ہے' مگر رودن کے سن میں کسی کا آپ اپنی تقریروں کا شور سن کر لطف اٹھانا اور خواہ مخواہ بڑا آدمی بننا تو شرم کی بات ہے" رودن کی یہ تمام کمزوریاں ناول کی مختصر داستان میں واضح ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک رئیس خاتون کے یہاں جاکر مہمان ہوتا ہے' اور اسے خاندان کی صحبت میں پانچ منٹ نہیں گذرتے کہ اس کا رعب سب پر طاری ہو جاتا ہے' اور سب اس کی حاضر جوابی' ذہانت' علم' شخصیت' اور خیالات کے قایل ہوجاتے ہیں' اور جو نہیں ہوتے وہ اسے مجمع پر حاوی دیکھ کر خود ہی کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس مجمع میں صاحب خانہ کی سترہ برس کی لڑکی نتاشا بھی شامل ہے۔ وہ رودن کی شخصیت سے اوروں کی بہ نسبت بہت زیادہ مرعوب ہوتی ہے' رودن اسے کمالات کا مجسمہ معلوم ہوتا ہے' اور وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرلیتی ہے کہ رودن ہی وہ شخص ہے جو دنیا میں اس کی رہبری کرسکتا ہے' اور اس کے قدموں پر اسے اپنی جان نثار کردینا چاہیے۔ رودن خود بھی اتنا مردم شناس ہے کہ نتاشا کا

جوہر فوراً پہچان لیتا ہے ' اور اسے ظاہر کرنے میں مطلق تکلف نہیں کرتا ' گو وہ نتاشا کا کسی طرح گرویدہ نہیں اور دوستی کے سوا اور کوئی تعلق نہ قایم کرنا چاہتا ہے نہ قایم کرنے کی کوشش کرتا ہے ' لیکن نتاشا کے نوجوان دل میں رودن کی محبت عجیب عجیب کیفیتیں اور ہزاروں آرزوئیں پیدا کردیتی ہے ' اور وہ تہیہ کر لیتی ہے کہ اپنے آپ کو دل و جان سے اس کے حوالے کردوں گی - ایک مرتبہ جب دونوں شام کو چھپ کر ملتے ہیں تو نتاشا کی ماں کا ایک اور مہمان انہیں دیکھ لیتا ہے ' اور صاحب خانہ کو سارے معاملات کی خبر ہوجاتی ہے - نتاشا کی ماں ' جو رودن کی بہت ہی معتقد تھی ' یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بالکل مفلس ہے ' اور اسے کسی حال میں یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی لڑکی ایک غریب آدمی سے شادی کرے - یہی اس نے نتاشا کو دوسرے روز بلا کر سمجھا بھی دیا - مگر نتاشا یوں سرتسلیم خم کرنے پر راضی نہیں تھی ' اور اس امید میں کہ رودن اسے خاندان کے پنجے سے رہا کرنے کی کوئی صورت نکالے گا اس نے ایک اور خفیہ ملاقات کے لیے وقت اور جگہ مقرر کی - ملاقات ہوئی تو اس نے رودن کو سارا ماجرا سنا کر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے - رودن جانتا تھا کہ نتاشا کو اس سے بہت گہری محبت ہے ' اسے اس کا بھی اندازہ تھا کہ نتاشا جیسی لڑکیوں کا جذبۂ محبت کس قدر قوی ہوتا ہے - اور اگر کوئی ہمت اور ایثار کا قدر داں مل جائے تو کوئی ایسا کرشمہ نہیں جو یہ جذبہ دکھا نہ سکے گا - رودن کا اپنا دل بھی نتاشا کی طرف بہت مائل تھا ' لیکن وہ اپنی کمزوریوں سے واقف تھا ' انتہائی غربت اسے کئی مرتبہ ڈراؤنی شکل دکھا چکی تھی ' اور اس وقت بھی اس کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا ' سوا ایک حقیر سی جائداد کے جس سے روپئے کے بجائے مقدمے اور مفت کے جھگڑے ملتے تھے - وہ بہر صورت کوئی ایسی

تدبیر نہیں کرسکا جسے نتاشا اور اس کے خاندان اور جان پہچان والے پسند کرسکتے تھے ' اور نتاشا کو مارامارا پھرانا اسے کسی طرح منظور نہ تھا - اس لیے آخری ملاقات کے وقت وہ نتاشا کو بس یہ مشورہ دے سکا کہ اسے اپنی ماں کی اطاعت کرنا چاہئے ' اگرچہ اس کے معنی یہ تھے کہ نتاشا کو ان آرزوؤں کو خیر باد کہنا چاہئے جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھیں - نتاشا نے مجبوراً یہی کیا - رودن بھی دل میں درد لیے ہوئے رخصت ہوگیا اور اس کے بعد کئی سال تک آوارہ گردی کرتا رہا - اسے کہیں قدم جماکر ٹھیرنا ' کسی مفید کام میں مصروف ہوجانا نصیب نہیں ہوا - اگرچہ وہ ہر وقت اسی فکر میں پریشان رہتا تھا - اس کی عمر بالکل بے کار ضائع ہوتی - اگر کچھہ شان تھی تو اس کی موت میں ' کیونکہ ۱۸۴۸ میں جب نپولین سوم نے فرانس میں جمہوریت کے بجائے اپنا ذاتی راج قائم کیا تو رودن اس کے خلاف بغاوت میں شریک ہوا اور سرخ جھنڈا ہاتھہ میں لیے جمہوریت کے فدائیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے پیرس کی ایک سڑک پر مارا گیا - رودن کی سیرت پر مجموعی رائے قائم کرتے ہوئے روسی نقادوں نے اس بات کو بیجا اہمیت دی ہے کہ وہ نتاشا کی محبت کا اہل ثابت نہیں ہوا ' اور اس کے جذبے کو اپنی اور قومی زندگی کی تعمیر کے کام میں نہیں لاسکا - لیکن نتاشا کی محبت ایک شخص کی آخری آزمائش تھی جس کی قسمت کا بہت پہلے فیصلہ ہوچکا تھا ' اور ناول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورگینف رودن کو اس معاملے میں اتنا قابل مذمت نہیں سمجھتا جتنا ناول کے نقاد ' اور آخر میں جب رودن کا سارا بھرم کھل جاتا ہے ' وہ اسی معترض کی زبانی جس کی رائے اوپر دی جاچکی ہے ' رودن کی تعریف میں کہتا ہے : " اس میں جوش اور امنگیں ہیں ' اور میری بات مانئے : میں تو کافی بلغمی آدمی ہوں ' ہمارے زمانے میں

یہ سب سے زیادہ قابل قدر صفت ہے۔ ہماری سب کی معقولیت ' سرد مہری اور سستی اب حد سے گذر گئی ہے - ہم سوتے سوتے سردی کھا گئے ہیں ' اور وہ شخص ہمارا محسن ہے جو ہمیں دم بھر کے لیے بھی جگادے ' ہمارے بدن میں گرمی پیدا کردے ... رودن خود کچھہ نہیں کرتا ہے ' کیونکہ اس میں جان نہیں ہے ' خون نہیں ہے ' لیکن یہ کہنے کا کس کو حق ہے کہ اس نے فائدہ نہیں پہنچایا ہے - اور اس کی تقریروں نے بہت سی بھلائی کے بیج ایسے نوجوانوں کے دلوں میں نہیں بودئے ہیں جنھیں قدرت نے عملی استعداد اور اپنے ارادے پورے کرنے کی قوت سے محروم نہیں رکھا ہے ؟ "

رودن کی تصنیف کے تین سال بعد " رئیسوں کا آشیانہ شائع ہوا ' یہ ناول بالکل اور ہی رنگ کا ہے ۔ اس میں قومی مسائل پر بحث نہیں کی گئی ہے ' اس کے قصے کا وہ پس منظر نہیں رکھا گیا ہے جو " رودن " یا " صبح امید " کا - اس کی دلچسپی کا مرکز اس کی داستان ہے ' اس کے کیرکٹر ' اس کا پر درد انجام فنی اعتبار سے تورگینف کے کل جوہر اس ناول میں نظر آتے ہیں ' اور اگر قومی اور معاشرتی مسائل سے بے تعلق ہونا ایک خامی بھی سمجھی جائے ' تو اس میں بے شمار خوبیاں ہیں جو اس کی تلافی کرسکتی ہیں - اس کا ہیرو ' لات ریتز کی ' ان رئیسوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جن کی تربیت اور تعلیم نے انہیں اس قابل نہیں رکھا تھا کہ کوئی صحیح مسلک اختیار کریں اور اپنی زندگی کو مفید یاکامیاب بنائیں - " لات ریتز کی " کا باپ اسے بچپن میں اسکاٹستان کے پہاڑیوں کا لباس جس میں گھٹنے کھلے رہتے ہیں ' پہنایا کرتا تھا ۔ اس خیال سے کہ بدن مضبوط ہو جائے گا - نوجوانی میں اسے عورتوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنا سکھایا گیا ' کہ آگے چل کر وہ اپنا مردانہ وقار قائم رکھہ سکے - لات ریتز کی بعد

کو یونیورسٹی میں داخل ہوا ' اسے مطالعہ کا شوق تھا ' اور اس نے کتب بینی کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا - مگر سیرت میں جو عیب غلط اور بے اصول تربیت پیدا کردیتی ہے وہ محض کتب بینی اور مطالعہ کا شوق نہیں دور کر سکتا - لات ریتزکی نے شروع ہی میں ایک ایسی حماقت کی جس نے اس کی زندگی چوپٹ کردی اور ہاتھہ ملنے اور افسوس کرنے کے سوا اسے اور کوئی چارہ نہ رہا - باپ کی تعلیم نے اسے عورتوں سے الگ رکھا تھا ' اور یوں اسے وہ تجربہ حاصل نہ ہو سکا جس کے بغیر ازدواجی زندگی کی بنیاد بہت کمزور رہتی ہے ' بلکہ اکثر قائم ہی نہیں ہوسکتی ' کیونکہ بیوی کے انتخاب میں جو غلطی ہوتی ہے اس کی تلافی کے لئے بعد کو کوئی صورت نکالنا محال ہوتا ہے - لات ریتزکی کے ساتھہ یہی پیش آیا - اس نے ماسکو کے تھیٹر میں ایک لڑکی دیکھی ' اس پر عاشق ہوگیا ' اور بغیر اس کی سیرت پر غور کئے جلدی سے اس کے ساتھہ شادی کرلی - اس کی بیوی ' داروراپا نلوفنا ' نہایت اوچھی ' عیار اور فضول خرچ لڑکی تھی ' جس کا دنیا میں بس یہ حوصلہ تھا کہ اپنے گرد بہت سے مرد جمع کرے ' ان کی زبان سے اپنی تعریف سنتی رہے ' اور لباس اور اداؤں کے حسن سے ان کو اپنا گرویدہ بنائے - شادی کے چند سال بعد تک لات ریتزکی پیرس میں رہا ' اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے پیرس کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا ' اُس کی بیوی بھی ساتھہ تھی ' مگر وہ اس کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتا تھا - اتفاق سے اس کو معلوم ہوگیا کہ اس کی بیوی کی ایک فرانسیسی سے آشنائی ہے ' اور یہ آشنائی اتنی گہری ہوگئی ہے کہ اب کسی حسن ظن کی گنجائش بھی نہیں ' اس واقعہ سے لات ریتزکی کے دل پر سخت چوٹ لگی ' وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اطالیہ چلاگیا اور چار سال تک وہاں کسی گاؤں میں پڑا رہا ' اس کے

بعد وہ وطن واپس آیا ' اور اپنے گانو میں ' جو شہراو ... کے قریب تھا ' جانے سے پہلے وہ اپنی ایک دور کی رشتہ دار ماریا ڈمیترفنا سے ' جس کا مکان شہر میں تھا ملنے گیا - یہاں اس کی ماریا ڈمیتر فنا کی بڑی لڑکی ایزرا سے ملاقات ہوئی اور چند روز کے اندر ہی اسے ایزا سے بہت محبت ہو گئی - اسی دوران میں لات ریٹزکی کے پاس ایک اخبار آیا جس میں اس کی بیوی کے مرنے کی خبر تھی - لات ریٹزکی نے اپنے آپ کو آزاد پا کر لیزا کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ کیا اور اس نے اپنے منگیتر کو جو اسے نا پسند نہیں تھا جواب دے دیا ' یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب ایک روز اچانک لات ریٹزکی کی بیوی پہنچ گئی ' اور اس کی ساری امیدیں خاک میں ملا دیں - ایزا سے شادی کرنے کی اب کوئی صورت نہ تھی ' لات ریٹزکی نے بیوی کے رہنے کے لیے ایک گانو میں انتظام کر دیا ' اور خود کچھ دنوں آوارہ گردی کرنے کے بعد زراعت میں مشغول ہو گیا - ایزا سے جدا ہو کر اسے نہ چین کی امید تھی نہ چین ملا ' اسے زندگی بالکل دوبھر ہو گئی ' مگر اب اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہ اپنے دن کسی نہ کسی طرح گزار دے - اس کی بیوی کچھ دن گانو میں رہی ' پھر پیٹربرگ چلی گئی اور آخر میں پیرس جاکر وہیں ڈھیر گئی —

ایک زمانے میں روسی رئیس اپنے آشیانے یوں ہی بنایا کرتے تھے —

ناول کی ہیروئن لیزا ان معمولی ہستیوں میں سے ہے جن میں تورگینف کے قلم نے بغیر کسی مبالغے یا کسی نادر خصوصیت پر بھروسہ کیے ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ' اور اس کی شخصیت بہت ہی پیاری بنا دی ہے - ایزا نہ خوب صورت ہے نہ ذہین نہ شوخ - چند نسوانی صفتوں کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں جو دل یا نظر پر خاص اثر ڈال سکے ' اور یہ صفتیں بھی ایسی نہیں ہیں جو فوراً محسوس ہوں - لیکن ناول

پڑھنے والے کو شروع ہی سے لیزا سے ایک لگاؤ ہو جاتا ہے جو کسی انوکھی یا نمایاں خصوصیت کا اثر نہیں ہوتا ' بلکہ محض ایک جذبہ ہے جو ایک انسان کو دوسرے کی طرف کھینچتا ہے ' ایک دل کو دوسرے سے ملا دیتا ہے ' اور ہم خود نہیں سمجھہ سکتے کیوں - یہ تو روسی حقیقت نگاری کی عام صفت ہے کہ وہ معمولی انسانوں ' معمولی واقعات کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ وہ دلچسپ اور نرالے معلوم ہونے لگتے ہیں ' لیکن تورگینف کے قلم نے جس معجز نگاری سے کیرکٹروں کی تصویر دکھائی ہے ' جس انداز سے وہ رفتہ رفتہ ہمیں ان کی شخصیت اور زندگی کی طرف متوجہ کرکے ہمارے دلوں کو محبت اور ہمدردی سے لبریز کرتا ہے ' وہ کچھہ اور ہی چیز ہے ' اور تورگینف کے کمال کی لیزا سے بڑہ کر کوئی مثال نہیں - لیزا کی داستان بھی بہت درد ناک ہے - اس کے دنیاوی حوصلے بہت کم تھے ' اپنی نسبت اسے کوئی ایسا مغالطہ نہیں تھا جس کی بنا پر وہ تقدیر سے کسی خاص رعایت کا تقاضا کرتی یا دنیا میں کسی خاص قدر دانی یا کامیابی کی امید کرتی - وہ نیک ' خدا ترس اور اطاعت گزار تھی - جیسے روس میں سادہ لوح اور شریف طبیعت کی لڑکیاں عموماً ہوا کرتی تھیں ' پابندی سے گرجا جایا کرتی تھی ' اور ہر مصیبت کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھتی تھی - اسے نہ یہ خواہش تھی نہ اس کی امید کہ اس کا شوہر کوئی غیر معمولی شخص ہوگا ' اس کا یہ عقیدہ تھا کہ عورت کو محبت کیش اور وفادار ہونا چاہئے ' اور اس کی شادی کسی سے بھی ہوتی ' وہ یہ اصول برتنے کو تیار تھی - لات ریتزکی نے اسے یہ سکھایا کہ اس شخص سے شادی کرنا غلط ہے جس سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہو ' اور جس کی محبت سے یہ توقع نہ کی جاسکے کہ وہ زمانے کے ساتھہ بڑھتی اور گہری

ہوتی جاتی گی - لیزا اس اصول کی بالکل قائل تو نہیں ہوئی، لیکن اس تعلیم کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنے منگیتر کو جواب دے دیا - لات ریتزکی سے اس کو محبت پہلے سے تھی، منگیتر کو جواب دینے کے بعد جب لات ریتزکی سے شادی ہونا طے پاگیا تو اس کی محبت اور بڑھ گئی - مگر جب عین وقت پر لات ریتزکی کی بیوی نے آکر ساری تدبیریں الٹ دیں تو لیزا نے اس کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھا، اور دنیا کو خیر باد کہہ کر عورتوں کی ایک خانقاہ میں چلی گئی - قصہ ختم کرتے ہوئے تورگینف لکھتا ہے : " کہتے ہیں ایک بار لات ریتزکی اس دور افتادہ خانقاہ میں بھی گیا جہاں لیزا روپوش ہوئی تھی، اور اسے دیکھا بھی - گرجا میں ایک حصے سے دوسرے کی طرف جاتے ہوئے وہ بالکل اس کے پاس سے گزری، مگر لات ریتزکی کو زیادہ غور سے نہیں دیکھا ... اس وقت ان دونوں کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی ؟ یہ کون معلوم کرسکتا ہے، کون بیان کرسکتا ہے ؟ زندگی میں ایسے لمحے، ایسی کیفیتیں ہوتی ہیں ... ہم ان کی طرف گزرتے ہوئے اشارہ کرسکتے ہیں اور بس " —

صبح امید کی ہیروئن یے لینا لیزا کے مقابلے میں بالکل ہی اور سیرت اور خیالات رکھتی ہے - اس نے اپنے روز نامچے میں ایک موقع پر لکھا ہے : " کاش کہ مجھ سے کوئی یہ کہنے والا ہوتا کہ دیکھ، تجھے یہ کرنا چاہئے ! طبیعت کا اچھا ہونا کوئی خاص خوبی کی بات نہیں، بھلائی کرنا ... ہاں زندگی میں اصل چیز یہی ہے " - جس ماحول میں وہ رہتی ہے اس میں اس کی آرزوئیں پوری ہونے کی مطلق کوئی صورت نہیں - اس کا باپ جو فلسفی کہلاتا ہے، اور فلسفی کہلانا بہت پسند کرتا ہے، اپنی بیوی کی صحبت سے اکتا گیا ہے اور زیادہ تر وقت ایک بد چلن بیوہ کے

یہاں گذارتا ہے جس سے اس کی آشنائی ہے - یےلینا کی ماں ایک نازک مزاج کمزور اعصاب کی اور بے مغز عورت ہے جس کا اپنی تیمارداری کے سوا دنیا میں اور کوئی شغل نہیں - بزرگوں میں ایک حضرت اُوفار اوا نووچ ' یے لینا کے دور کے رشتہ دار بھی ہیں ' جو ہر وقت کرسی پر ڈٹے رہتے ہیں اور ہر شخص سے ڈانٹ کر کہا کرتے ہیں کہ ہمیں مت چھیڑو - یے لینا کے مکان میں ایک نوجوان پادل یا کوت لے وچ شوبن بھی رہتا ہے جو اس کی ماں کا ایک عزیز ہے اور وہی اس کو خرچ دیتی ہے - ایک اور نوجوان ' آندر ئے ئی پترووچ برسنیف' یونیورسٹی کا طالب علم ' جسے بہت گہرا علمی ذوق ہے ' اور جو پروفیسر بننے کی تیاری کر رہا ہے اکثر یے لینا سے ملنے آتا ہے ' ان دونوں کے سوا یے لینا کو اور کوئی صحبت نہیں ملتی ' اور یہ دونوں بھی کچھ ایسے ویسے ہی ہیں - شوبن ہر وقت مسخرے پن کی باتیں کیا کرتا ہے برسنیف کو صرف اپنی کتابوں سے دلچسپی ہے - یہ ماحول یے لینا کے لیے بہت تنگ ہے ' اور وہ ایسے شخص کی امید میں رہتی ہے ' جو اس کی قدر کرے ' جس کے اعلیٰ حوصلے ہوں اور جو انہیں پورا کرنے کے لیے اس کی مدد مانگے - شوبن یے لینا کی نسبت برسنیف سے کہتا ہے " کسی نہ کسی کی وہ منتظر تو ہر صورت سے ہے ... تم سمجھے ان الفاظ کا پورا مطلب : وہ منتظر ہے ! " آخر کار وہ شخص جس کی یے لینا منتظر تھی ' نظر آیا - وہ ایک بلغاری وطن پرست ' دمیتری ان سروت ہے ' جس نے اپنی زندگی اپنی قوم کی خدمت اور اپنے وطن کو ترکوں سے آزاد کرنے کے لیے وقف کردی ہے - چند ملاقاتوں کے بعد ہی ان سروت اور یے لینا میں گہری دوستی ہوگئی - یےلینا نے تہیہ کرلیا کہ ان سروت کی شریک کار ہو کر اس کی خدمت اور مدد کروں گی ' اور ہر مصیبت میں اس کا ساتھ دوں

گی ' اس نیت سے اس نے ان سروف سے شادی کر لی ' اور گھر ' عزیز اقارب اور وطن چھوڑ کر اس کے ساتھہ بلغاریہ کے لیے روانہ ہوگئی - میدان عمل میں قدم رکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ان سروف کو موت نے آ گھیرا مگر یے لینا اپنے ارادے پر قایم رھی - اور اس جنگ میں جو بلغاریوں اور ترکوں میں چھڑ گئی تھی ' بلغاری سپاھیوں کی تیمار داری میں مشغول ھوگئی - ان سروف کا انتقال شہر وے نس میں ہوا تھا ' یہیں سے یے لینا نے اپنے والدین کو اپنے ارادے سے مطلع کیا ' اور بعد کو اس کی نسبت صرف اتنا معلوم ھوسکا کہ وہ زخمی سپاھیوں کی تیمارداری کرتی رھی - پھر بعد کیا ھوا یہ کوئی بتا نہ سکا —

یے لینا کی ھمت اور جوش ایثار ھی وہ مژدہ ھے جس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے تور گینف نے اپنے ناول کا عنوان " صبح امید " رکھا ھے - اس کے سوا ناول کا جو عملی اور تبلیغی رنگ ھے وہ بہت کچا ھے اور جلد اڑ جانے والا - ان سروف کی سیرت اور شخصیت میں نہ اصلیت ھے نہ جان ' اور محض یہ بات کہ وہ روسی نہیں بلغاری ھے اس کی دلیل ھے کہ تور گینف اس کی سیرت کی تصویر کھینچنے میں زیادہ کامیابی کی امید نہیں رکھتا تھا - اور واقعہ بھی یہ ھے کہ ان سروف کا کیرکٹر تور گینف کی اپنی ایجاد نہیں ' بلکہ سلاف دوستی کی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے ایک صاحب کی فرمائش پر تیار کیا گیا - فرمائش کے ساتھہ ھی تورگینف کو وہ اوصاف بھی بتادیے گئے تھے جن سے اس کے خیالی ھیرو کو آراستہ ھونا چاھیے تھا - لیکن بجز اس کے کہ ان سروف کا کیریکٹر مصنوعی ھے اور اپنے ماحول میں بالکل نہیں کھپتا " صبح امید " میں کوئی اور نقص نہیں ؛ اور فنی اعتبار سے وہ ناول نویسی کے کرشموں میں سے ہے - ھر کیریکٹر ' ھر منظر '

ہر گفتگو تورگینف کی نکتہ رسی ، حقیقت بینی اور معجز نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے ' وہ خاص فضا جس کی تنگی اور گرانی تورگینف اس قدر محسوس کرتا تھا ناول میں اپنی کل کیفیتوں کے ساتھہ پیدا کردی گئی ہے ' وہ لوگ جن سے تورگینف کو ایسی محبت اور اتنی شکایتیں تھیں ہو بہو نظر آتے ہیں' اور پڑھنے والے کے سامنے ان کی زندگی کی داستان اس طرح پیش کردی جاتی ہے کہ دیکھے ہوے اور سنے ہوے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے - دیکھیے اوفار اوا نو وچ ' جن کا جمود بے ایذا کی سیہابی کیفیت کا پورا جواب ہے ' خود مع اپنے فلسفۂ حیات اور طرز زندگی کے کس کمال کے ساتھہ چند جملوں میں پیش کردیے گئے ہیں - شوبن نے ان سے ایک بات کہی ہے جو ان کی سمجھہ میں نہیں آئی :

" اوفا اوا نو وچ نے کانکھہ کر کہا " تم سے کہتے ہیں ہم کو مت چھیڑو ... " شوبن نے قہقہہ لگایا اور بھاگ گیا - کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ چلائے " ارے او — وہی ... وودکا کا گلاس " - لڑکا کشتی میں وودکا اور اس کے ساتھہ کھانے کے لیے سوکھی مچھلی لایا - اوفار اوا نو وچ نے آہستہ سے کشتی میں سے گلاس لیا اور دیر تک بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھتے رہے ' گویا ان کی سمجھہ میں نہیں آیا کہ ان کے ہاتھہ میں کیا چیز ہے - پھر انہوں نے لڑکے کی طرف دیکھا ' اور پوچھا " تیرا نام واسکا ہے نہ ؟ " اس کے بعد انھوں نے غمگین صورت بنا کر وودکا پی ' کچھہ مچھلی کھائی اور جیب سے رومال نکالنے کے لیے ہاتھہ بڑھایا - خادم نے کشتی اور وودکا کی صراحی لے جا کر اس کی مقررہ جگہ پر رکھہ دی ' جو مچھلی باقی بچی تھی وہ کھالی اور

اپنے آقا کا لبادہ اوڑھ کر سو بھی گیا ' مگر اوفار اوا نو وچ اسی طرح ھتھیلی پر ناک کے سامنے رومال رکھے بیٹھے رھے ' اور کبھی کھڑکی کے باھر ' کبھی زمین ' کبھی دیواروں کو دیکھتے رھے " -

ناول کے آخر میں تور گینف انھیں بزرگ کے ذریعہ سے اپنی مایوسی اور اپنا درد ظاھر کرتا ھے ' ایسی طرح کہ ھر روشن ضمیر روسی کے دل پر سخت چوٹ لگے —

" شوبن نے کچھھ دن ھوے اوفار اوا نو وچ کو لکھا تھا : " آپ کو یاد ھے میں نے اس وقت * آپ سے پوچھا تھا : " کیا ھم میں بھی کبھی مرد آدمی پیدا ھوں گے " اور آپ نے جواب دیا تھا : " ھاں ھوں گے " ... اور اب میں اس دور کے مقام سے ... پھر پوچھتا ھوں : " بتائیے ' اوفار اوا نو وچ ' ھم میں بھی کبھی مرد آدمی پیدا ھوں گے ؟ "

اوفار اوا نو وچ نے انگلیاں نچائیں اور سامنے آسمان کی طرف دیکھنے لگے -

جن مردوں کی نسبت شوبن نے دریافت کیا اور اوفار اوا نو وچ نے جواب میں انگلیاں نچائیں وہ تو کبھی پیدا نہیں ھوے ' لیکن روسی زندگی میں ایک اور مظھر نمودار ھوا - یہ ایک خاص ذھنیت کے لوگ تھے جن کا وجود انشاپردازوں میں سب سے پہلے تور گینف نے محسوس کیا اور جن کی سیرت اور فلسفۂ حیات کو سب سے پہلے اس نے بیان کیا - یہ لوگ منکر تھے ' اور ان کے عقیدے " منکریت " کے نام سے مشھور ھیں - اپنے ناول " باپ بیٹوں " میں تور گینف نے بازاروف کی شکل میں منکروں کا ایک

* یہ ابتدا کی ان سطروں سے شادی ھوئی تھی —

مثالی نمونہ پیش کیا ' اور اس کی سرگذشت میں ملگریت کے اصولوں کی عملی صورت دکھلائی - بازاروت یونیورسٹی میں طبعیات کی تعلیم حاصل کررہا تھا ' طبعیات کے علاوہ کیمیا 'نباتیات ' حیاتیات ' تشریح اور طب میں بھی اس کی معلومات خاصی تھیں اور طالب علموں کے حلقوں میں علم اور ذہانت کی بنا پر اس کا بہت ادب کیا جاتا تھا - تورگینف اپنی داستان یوں شروع کرتا ہے کہ بازاروت اپنے ایک معتقد اور دوست آرکاوی کرسانوت کے یہاں چھٹیاں گزارنے کو جاتا ہے ' اور وہاں اس کی آرکاوی کے باپ اور چچا سے ملاقات ہوتی ہے - آرکاوی کا باپ تو ایک سیدھا سادا بودا اور کمزور آدمی ' یابقول بازاروت " اللہ میاں کی گائے " ہے اور اپنے بیٹے اور اس کے دوست کے خیالات اور فلسفۂ حیات معلوم کرکے فرض کر لیتا ہے کہ جو وہ دونوں کہتے ہیں ٹھیک ہوگا ' اور گو اس کی عمر چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ ہے ' ان نوجوانوں کا رنگ دیکھہ کر وہ خود ہی اقرار کر لیتا ہے کہ میں بڑھا گیا ہوں ' اور نئے خیالات اور حالات پر راے دینے کے لائق نہیں رہا - لیکن پاول کرسانوت آرکاوی کا چچا 'جو جوانی میں بہت حسین اور رنگیلا آدمی تھا ' فوج میں افسر رہ چکا تھا ؛ اور رئیسانہ آداب اور اخلاق سے صرف واقف نہیں ہے بلکہ ان کے برتنے پر اصرار کرتا ہے ' فوراً آرکاوی اور اس کے استاد بازاروت کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے - تینوں میں بحثیں ہوتی ہیں ' اور ان کے ذریعے سے تورگینف منکروں کی ذہنیت اور ان کا فلسفۂ حیات بیان کرتا ہے - بازاروت کہتا ہے - " پہلے ہم شکایت کرتے تھے کہ ہمارے یہاں ریاست کے ملازم رشوت لیتے ہیں ' ہمارے یہاں سڑکیں نہیں ' تجارت نہیں ' عدالت میں انصاف نہیں کیا جاتا ... اب ہم سمجھہ گئے ہیں کہ محض بکواس کرنا ... فضول ہے " ... ہم نے دیکھہ

لیا کہ وہ لوگ جو لائق اور عقلمند کہلاتے ھیں ... کسی مصرف کے نہیں ' ھم لغویات میں پھنسے ھیں ' ایک چیز جسے آرٹ کہتے ھیں اس پر تعمیر اور تشکیل زندگی کی خلقی امنگوں پر ' پارلیمنٹ اور وکلا کے معاملات اور خدا جانے اور کن کن مسائل پر باتیں کیا کرتے ھیں ' جب اصل دشواری پیٹ پالنا ھے ' جب وحشیانہ اوہام پرستی ھمارے ذھن کا گلا گھونٹے دیتی ھے ' جب ھماری تجارتی کمپنیاں محض اس وجہ سے بیٹھہ جاتی ھیں کہ ایماندار آدمی ڈھونڈھے نہیں ملتے ' جب خود اس آزادی کا جس کے لیے ریاست اتنی کوشش کررھی ھے مفید ھونا اتنا مشتبہ ھے ' کیونکہ ھمارا کسان خوشی سے اپنی جیب کترنے پر تیار ھے کہ مے خانے میں جاکر شراب پیے اور بے ھوش ھوجائے " ۔ اس بنا پر بازاروت ھر چیز پر جو صریحاً فائدہ مند نہیں ھے اعتراض کرنا اپنا فرض سمجھتا ھے ' وہ اپنے آپ کو " منکر " کہتا ھے ؛ اور انکار کے معنی ھیں " کسی بات کو تسلیم نہ کرنا " یا جیسا کہ اس کے مخالف پاول کرسا نوت کا قول ھے " کسی چیز کا احترام نہ کرنا " ؛ عموماً وہ لوگ جو مذھبی عقیدوں کو فضول اور مہمل سمجھتے ھیں ' سائنس سے بہت مرعوب ھوتے ھیں ' لیکن سائنس کے متعلق بھی بازاروت کے خیالات منکریت سے بالکل بری نہیں ' وہ ایک موقع پر کہتا ھے " میں نے عرض کردیا ھے کہ میں کسی چیز کا معتقد نہیں ھوں ؛ اور سائنس ھے کیا چیز ؟ مختلف علوم تو ھیں ' جیسے مختلف پیشے اور معاش کے ذریعے ؛ لیکن سائنس بذات خود کوئی وجود نہیں " ظاھر ھے آرٹ اور ادب اور حسن کو وہ کن نگاھوں سے دیکھتا ھوگا - آرٹ اس کے نزدیک " یا روپیہ کمانے کا طریقہ ھے یا ایک بیماری ھے ؛ اور کچھہ نہیں " مناظر فطرت میں اسے کوئی حسن نظر نہیں آتا ؛ فطرت کوئی دیر یا حرم نہیں بلکہ ' کارخانہ ھے ' اور انسان

اس کارخانے کا ایک مزدور ہے :۔ بازاروف فلسفے کو '' صریحی رومانیت ''
یعنی جذبات پرستی قرار دیتا ہے اور تاریخ کو بالکل بیکار بتاتا ہے ،
کیوں کہ اس کے بغیر بھی آدمی بھوکا ہو تو منہ میں روٹی ڈال سکتا ہے ۔
وہ رسمیں جن کا انسان وحشت اور جاہلیت کے زمانے سے پابند رہا ہے ،
زندگی کے وہ طریقے ، اخلاق کے وہ اصول جو تجربے اور غور و فکر اور
مذہب نے سکھائے ہیں ، بازاروف کے '' انکار '' سے محفوظ نہیں رہتے ۔ جب
اس کا چیلا یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ اس کے باپ کو اس لڑکی سے جسے اس
نے اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے نکاح کرلینا چاہیے تو بازاروف کو بہت حیرت
ہوتی ہے ۔ '' تم بھی نکاح کی رسم کو اہمیت دیتے ہو ! مجھے ۔ یہ توقع نہ تھی
کہ تمھارے خیالات ایسے ہوں گے '' ۔ اپنے ماں باپ کا نہ بازاروف لحاظ کرتا
ہے نہ ادب ، نہ کسی بات سے یہ ظاہر ہونے دیتا ہے کہ اس کو ان سے ذرا بھی
محبت ہے ، کیونکہ وہ خاندان ، اور عزیز داری اور ان جذبات کو جو اسے
قائم رکھتے ہیں یکساں لغو اور فضول سمجھتا ہے ۔ '' گوشت کی بوٹی کیمیاوی
نقطۂ نظر سے بھی روٹی کے ٹکڑے سے بہتر ہے '' ۔ اور اس بنا پر بازاروف
آسائش اور آرام کو نفس کشی پر ترجیح دیتا ہے ، روسی کسانوں کی مظلومیت
اور بے کسی دیکھ کر اُس کا دل درد سے بھر نہیں آتا ، بلکہ وہ ہر موقع
پر کسان کی چالاکی اور عیاری کی شکایت کرتا ہے ، اور اس کے برتاؤ میں
کوئی ہمدردی یا محبت نظر نہیں آتی —

"باپ بیٹے '' کی داستان بازاروف کی سیرت اور اس کے عقیدوں کے
مضبوط اور کمزور ، غلط اور صحیح پہلو دکھاتی ہے ، اور اس کے ساتھ ہی
اس میں پرانا فلسفۂ حیات اور پرانے طرز کے لوگ بھی بڑی خوبی سے بطور
پس منظر کے رکھے گئے ہیں ۔ کرسانوف کے خاندان میں سنکریت کا نشتر

کسی قدر جسمانی اور ذہنی اصلاح کا باعث ہوتا ہے ؛ اگر چہ وہ امراض جو امیری اور بے فکری نے پیدا کیے ہیں آخر کار بازاروف کے اثر پر غالب آجاتے ہیں اور بازاروف کا خاص چیلا آرکاوی کرسانوف بھی اسے بعد کو اس طرح بھولتا ہے کہ یاد دھانی کی ضرورت ہوتی ہے - بازاروف اپنے ماں باپ کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہ اس کے عقیدوں کے اعتبار سے صحیح ہے ' مگر ہمیں بہت ناگوار ہوتا ہے۔ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ وہ نہایت کٹر آدمی ہے' اور اس کی طبیعت اور خیالات میں لوچ بہت کم ہے - سب سے زیادہ دلچسپ بازاروف کا جنسی فلسفہ ہے - وہ عشق کو ڈھکوسلا سمجھتا ہے ' کسی اخلاقی قواعد اور اصول کو صحیح اور قابل تقلید تسلیم نہیں کرتا ' اور جب وہ کسی خوبصورت عورت کو دیکھتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے محل میں لے جاکر اس کی چیر پھاڑ کرے ' لیکن ایسے خیالات اور ایسا مذاق رکھتے ہوے بھی جب وہ آننا الک سے یفنا سے اودن تسوف سے ملتا ہے ' اور اپنے چیلے آرکاوی کے ساتھ جاکر چند روز اس کے یہاں مہمان رہتا ہے تو اس کی وہی کیفیت ہوجاتی ہے جو ایک عاشق زار کی ' اپنے ارادے کی پوری قوت عمل میں لا کر بھی وہ بڑی مشکل سے اپنی طبیعت پر قابو پاتا ہے - اور اس کے عشق کی جو کیفیت تھی وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مرتے وقت اس کی آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ آننا الک سے یفنا کو کسی طرح آخری بار دیکھ لوں —

تور گینف نے اس ناول کی اشاعت کے بعد ایک خط میں لکھا تھا " آرٹ کے سوا ہر مسئلے میں مجھے بازاروف کے خیالات سے اتفاق ہے ' اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اپنے ہیرو کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا ہے اور اس کی سر گذشت بہت ہمدردی کے ساتھ سنائی ہے - پی سارت ' جو اس زمانے میں انتہا پسند گروہ کا رہنما تھا اور روس کا بہترین نقاد ' اپنے ضامین

میں ثابت کرنے کی کوشش کرتارہا کہ بازاروف منکروں اور منکریت کا صحیح نمونہ ہے اور تورگینف نے اسے بہت صحیح اور اچھے طریقے سے پیش کیا ہے - مگر وہ طوفان جو ناول کی اشاعت کے وقت برپا ہوا کسی طرح نہ تھم سکا - قدامت پسند لوگ تورگینف سے اس بات پر خفا ہوئے کہ اس نے بلا وجہ پرانے طرز کے لوگوں اور ان کے خیالات کا مذاق اڑایا ہے ' انتہا پسند نوجوانوں کا فرقہ یہ سمجھہ کر خفا ہوگیا کہ تورگینف نے روسی زندگی کے نئے مظہر ' یعنی منکریت کی توہین کی ہے - اصل میں دونوں غلطی پر تھے ' لیکن تورگینف اپنا مطلب سمجھا نہ سکا اور دونوں گروہوں میں اس کی ساکھہ جاتی رہی —

تورگینف کی مایوسی ' اور ناظرین کی کج فہمی سے اس کے دل پر جو چوٹ لگی تھی وہ اس کے ناول " دھویں " میں بہت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے - " دھواں " ایک عشقیہ داستان ہے ؛ اس میں قومی مسائل کا ذکر آتا ہے تو محض ضمناً ' اور ایسے طنزیہ انداز میں کہ بس بے کار لوگوں کی بک جھک معلوم ہوتا ہے - ناول کا ہیرو لتوی نوف ایک شریف طبیعت کا ' تعلیم یافتہ اور کسی قدر حوصلہ مند آدمی ہے ' روسی زمینداروں کا ایک اچھا نمونہ ' مگر انھیں کی طرح عملی استعداد سے بالکل محروم ' ناول کی ہیروئن ایرنیا پافلوفنا ایک حسین ' ذہین ' جذبیلی ' اور چالاک عورت ہے جس کی روسی طبیعت پر یورپی تہذیب کا اثر کچھہ مفید نہیں ثابت ہوا ہے - ایرینا خاندان کی بہت اچھی مگر مفلس لڑکی تھی ' لتوی نوف اس کی غربت کے زمانے میں اس سے ملا اور اس پر عاشق ہوگیا - ایرینا کے ماں باپ ان کی شادی کرنے پر راضی نہیں ہوئے - اور چند سال کے بعد جب لتوی نوف کی ایرینا سے پھر ملاقات ہوی تو وہ بالکل ہی اور رنگ

میں نظر آئی جس نے اسے غربت کی پابندیوں اور مجبوریوں سے چھڑا دیا تھا ' اور سوسائٹی میں وہ ایسی کامیاب ہوئی تھی کہ جنرل رات میروت نے' جو ایک بڑے عہدے پر معمور تھا ' اس سے شادی بھی کرلی - ازدواجی زندگی اور امیرانہ رہن سہن نے ایرینا کی آزادی میں فرق نہیں ڈالا ' اس کے مکان پر ہر قسم کے لوگ ' امیر اور غریب ' بانکے چھیلے اور پھٹے حال جمع ہوتے تھے ' اور وہ سب سے یکساں بے تکلفی سے پیش آتی - لتوی نوت کے عشق کی ساری کیفیت اسے معلوم تھی ' اور جرمنی کے شہر بادن میں جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایرینا نے لتوی نوت کو اپنے شیدائیوں کے زمرے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی - تھوڑے عرصہ تک تو وہ کامیاب رہی اور لتوی نوت کو خودداری اور عشق کی کشا کش نے بہت حیران کیا - مگر آخر میں اس کی خودداری کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے ایرینا سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ' ایرینا کو بھی لتوی نوت سے محبت تھی ' لیکن دولت کی ہوس اور مردوں کے دل لبھانے کا شوق اس کی طبیعت پر ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وفا شعاری کے لیے گنجائش ہی نہیں رہی - لتوی نوت سے جدا ہونے کے بعد وہ روسی دارالسلطنت کی سوسائٹی پر راج کرتی رہی ' اس کا حسن ہر ایک سے تعریف کا خراج وصول کرتا رہا - مگر سب اس کی تیزی اور تنک مزاجی سے ڈرتے بھی تھے اور جو تھوڑا بہت لگاؤ پیدا ہوتا اسے خوف زائل کردیتا ——

تورگینف کی اپنی عمر کا ایک خاصا حصہ ایک خاتون کی خدمت گذاری میں صرف ہوا جن کی سیرت اور شخصیت ایرینا سے بہت مشابہ تھی ' اور لتوی نوت کی سرگذشت تورگینف کی آپ بیتی سے ملتی جلتی ہے - لیکن " دھویں " کے ہیرو اور ہیروئن روسی سوسائٹی کے کوئی غیر معمولی مظہر نہیں - ایرینا کی سیرت میں جو خود غرضی ' امارت ' عیش پسندی '

اور اعلیٰ اخلاق کی طرف سے بے پروائی ہے امیر روسی عورتوں میں عام طور سے پائی جاتی تھی ' اور عموماً ایرینا کی بہ نسبت زیادہ شوخ اور ناگوار شکلوں میں - تورگینف نے ایرینا کی سیرت میں طبیعت کی آزادی ' مساوات پسندی ' اور جذبیلے پن کی جو آمیزش کی ہے وہ ایرینا کی ہستی کو بہت نرالی اور دل فریب بنا دیتی ہے - وہ ہرگز ان نسوانی کیرکٹروں میں سے نہیں ہے جنہیں تور گینف نے قومی زندگی میں رونق اور وطن پرستوں کے دلوں میں ولولے پیدا کرنے کے لیے خانگی زندگی کے تنگ حلقے سے نکال کر ادبی دنیا میں جلوہ افروز کیا - تور گینف کا کوئی کیرکٹر اس خوبی اور اداشناسی سے نہیں بیان کیاگیا ہے جیسے ایرینا کا - اس سے محبت ہونا مشکل ہے لیکن اس کے حسن اور ذہانت کے رعب کا دل سے نقش مٹانا بھی دشوار ہوجا تا ہے'' اور اگرچہ اسے زندگی میں کوئی ایسے صدمے نہیں پہنچے کہ ہم اس سے ہمدردی کریں ' لیکن اس کی حسرتیں اور آرزوئیں ' اس کے اعلیٰ جذبوں کا ادنیٰ اغراض پر نثار ہو نا دل میں درد ضرور پیدا کرتا ہے —

" دھویں " کی تصنیف کے بعد تور گینف کی توجہ پھر قومی مسائل کی طرف منتقل ہوگئی - رفتہ رفتہ اسی تحریک نے جس کے آغاز کی " باپ بیٹوں " میں قوم کو خبر دی تھی ' اور اسی ذہنیت کے لوگ نے جن کا مثالی نمونہ اس نے بازا روف کی شکل میں پیش کیا تھا روس کی سیاسی زندگی پر حاوی ہو گئے - ان لوگوں کی ہمت اور ان کے ایثار نے جس طرح سے ریاست کے جبر کا منہ چڑھایا ' جس آمادگی سے انہوں نے اپنی سزائیں بھگتیں ' جس استقلال سے اپنے عقیدوں پر قائم اور اپنے کام میں محو رہے اس سے تور گینف بہت مرعوب ہوا ' اور گو ان لوگوں کے طرز عمل سے اسے پورا اتفاق نہیں تھا ' قوم کی بیداری نے اس کے دل میں بڑی امیدیں پیدا کردیں - " اچھوتی زمین " تور گینف کا آخری ناول جو اس تحریک کے اثر میں لکھا گیا ' ایک اعتبار سے

کسی قدر بعد از وقت ہے - جب وہ تصنیف کیا گیا تو یہ تحریک ترقی کر چکی تھی' اور اس نے بالکل دوسری اور بہت زیادہ مکمل صورت اختیار کر لی تھی' مگر تور گینف نے اسے شروع ہوتے ہوے دکھایا ہے - وہ ان شخصیتوں کا خاکہ نہیں اتار سکا جو ناول کی تصنیف کے زمانے میں اس تحریک کی رہبری کر رہی تھیں اور جن کی ذات ہی در اصل ایسی تحریکوں کو حقیقت کا رنگ روپ دے سکتی تھی - اگر یہ فرض کر لیا جاے کہ تور گینف کا مقصد محض ایک خاص تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانا تھا تو" اچھوتی زمین" کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی - مگر تور گینف نے اپنا مقصد محدود نہیں رکھا' روس کے معاصر واقعات صرف ایک محرک تھے جنھوں نے اسے روسی تحریک کے ایک نئے پہلو کی طرف متوجہ کیا' اسے ایک نئے جذبے' ایک نئی امنگ کا پتہ دیا جس کے وجود کا اسے پہلے علم نہ تھا' اور اس بنیاد پر اس نے ایک عمارت بنائی جو اس وقت کے خاص ماحول اور اس زمانے کی سیاسی تحریکوں سے زیادہ پائدار نکلی' اور جس کا مشاہدہ انسان کے بہت ہی گہرے اور موثر جذبات بیدار کرتا ہے —

تور گینف نے ناول کا عنوان " اچھوتی زمین " اس لیے رکھا تھا کہ روس کی نئی سیاسی تحریک نے اور ان لوگوں نے جن کا ناول میں ذکر ہے قوم کے اس طبقے کو اپنا میدان عمل بنایا جس کی اس وقت تک کسی نے پروا نہیں کی تھی' جس کی مخفی قوت اظہار اور استعمال سے نا آشنا تھی' جیسے نئی زمین جس پر کبھی ہل نہ چلا ہو' اس نئی زمین کو زرخیز بنانے کے لیے کئی قسم کے حوصلہ مند نکلتے ہیں' لیکن تور گینف کی نظر خاص طور سے دو پر جمتی ہے' نژدانوت اور سولومن - نژدانوت کو اس کی طبیعت اس نئے اور مشکل کام کا بیڑا اٹھانے پر مجبور کرتی ہے اور اس کی طبیعت ہی اس

کی راہ میں روڑے بھی اٹکاتی ہے ۔ " جمالیات سے شوق رکھنے والے کے لیے عملی زندگی سے واسطہ رکھنا بہت مشکل ہے " نژدنوف شاعرانہ مزاج کا آدمی ہے ، اور گو وہ اپنی شعر کہنے کی استعداد ان حوصلوں پر نثار کرنے کو آمادہ ہے جو اس کے دل کو زیادہ عزیز ہیں ، پھر بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ شعر و شاعری نے اس کے مزاج میں ایک نفاست اور نزاکت پیدا کردی ہے جو اس کے کام میں بہت حارج ہوتی ہے ۔ اس کی آرزو ہے کہ عوام میں گھل مل کر اپنے خیالات کا پرچار کرے ، کسانوں کو آزادی کا شیدائی بنائے اور انہیں آزادی حاصل کرنے کا شوق دلائے ۔ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت میں بہت خوش بیان مانا جاتا ہے ، لیکن کسانوں سے کچھ کہنا ہوتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں ۔ اسے معلوم ہے کہ جو ووڈکا نہیں پیتا اسے عوام میں گھل مل جانے کا حوصلہ نہ کرنا چاہئے ، مگر کوشش کے باوجود بھی وہ ووڈکا نہیں پی سکتا اور پیتا ہے تو فوراً بے ہوش ہوجاتا ہے ۔ عوام میں انقلابی خیالات کے پرچار کرنے کی پہلی کوشش کا حال وہ خود یوں سناتا ہے : " اول تو مجھے اس کا یقین ہوگیا کہ عوام کا سا بھیس بدل کر ان میں شامل ہوجانا بے حد آسان کام ہے : مجھ پر کسی نے ذرا بھی شبہ نہیں کیا ... بس ایک گلاس ووڈکا منگا کر اپنے مخاطب کے سامنے رکھ دو اور جو جی چاہے ، جھوٹ سچ بک ڈالو ... دوم یہ کہ جتنے لوگوں سے میں نے باتیں کیں سب کے سب غیر مطمئین ہیں، لیکن آسودگی حاصل کرنے کے ذریعوں کا ذکر بھی سننے پر راضی نہیں ہیں ! مگر میں تبلیغ کے لیے بہت کمزور نکلا ۔ دو رسالے آنکھ بچا کر ہوٹل کے کمروں میں ڈال آیا ، ایک کسی گاڑی میں چھپا دیا ، چار آدمیوں کے سامنے رسالے پیش کیے ۔ ایک نے پوچھا " کیا یہ مذہبی کتاب ہے " ؟

اور لینے سے انکار کیا ' دوسرے نے کہا کہ ان پڑھ هوں ' مگر اس نے اپنے
بچوں کے واسطے ایک رسالہ لے لیا - کیونکہ اس کے سر ورق پر تصویر تھی '
تیسرا پہلے هاں میں هاں ملاتا رها ... پھر مجھے اچانک گالیاں دینے لگا اور
رسالہ نہیں لیا ' چوتھے نے آخر کار رسالہ لیا اور میرا شکریہ بڑی دیر
تک ادا کرتا رها - لیکن میں نے جو کچھ کہا اس کا ایک حرف بھی معلوم
هوتا هے اس کی سمجھ میں نہیں آیا - اس کے علاوہ ایک کتے نے میرے پیر
میں کاٹ کھایا ' ایک عورت نے جو اپنے جھونپڑے کی چوکھٹ پر کھڑی
تھی مجھے سیخ دکھا کر دھمکایا ... ایک سپاهی میرے پیچھے چلاتا رها " ٹھیرو
جی ٹھیرو ' هم تمہیں بھی جلا وطن کرکے چھوڑیں گے " - اور پھر میرے هی
داموں سے شراب پی کر مست هوگیا ... اب میں بھوکا هوں ' اور وودکا
سے سر چکر کھا رها هے " - طبیعت کی نا موزونیت رفتہ رفتہ نژدنوف
کے عقیدے کو کمزور کردیتی هے ' اور آخر کار وہ خود کشی کر لیتا هے -
اس کے برعکس سولومن ' اچھوتی زمین کا دوسرا کاشتکار ' بہت زیادہ
مضبوط ارادے اور مستقل مزاج کا آدمی هے ' طبیعت کی روشنی اس کے
لیے بلا نہیں هو گئی هے ' وہ کسی خبط میں نہیں مبتلا هوتا اور
صدمے نہیں اٹھاتا - عوام کو بیدار کرنا اور ان کی بیداری کو قومی زندگی
کی تعمیر کا ذریعہ بناتا - اس کے دل میں ایک شاعرانہ امنگ نہیں هے '
وہ روسی عوام کو خوب سمجھتا هے ' اپنے کام کے خطروں اور دشواریوں سے
بخوبی واقف هے اور بہت احتیاط سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا هے - اس
میں صبر اور سلامت روی کا اتنا مادہ هے کہ اسے نہ اپنی امیدیں دھوکا
دے سکتی هیں نہ دوسروں کا جوش ' اور وہ اپنی زندگی اور اپنے قومی
کام کو ویسے هی با ضابطہ کرتا هے جیسے اس کارخانے کا انتظام جس کا وہ

مہتمم اور کار پرداز ہے ۔ روس میں اس قسم کے لوگ ایک بالکل نیا مظہر تھے ' اور تورگینف سولومن کی شخصیت کو اس خوبی اور نکتہ بینی سے نہیں بیان کر سکا جیسے نژدانوف کی سیرت کو ' لیکن روس کی انقلابی تحریکوں کی داستان یہ ضرور ثابت کردیتی ہے کہ تورگینف کے وجدان نے اسے دغا نہیں دی ۔ نژدانوف کی طبیعت اور ذھنیت کے لوگ شروع سے آخر تک ناکامیاب رھے ' کیونکہ ان کے تعمیری حوصلے محض ایک دلفریب مگر ناقابل اعتبار ذھنی جوش اور ھیجان کا نتیجہ تھے ' جس کی شدت نے ان کی عملی استعداد کو بالکل برباد کردیا ۔ سولومن برخلاف اس کے ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جو تورگینف کے وقت تک میدان میں نہیں آئے تھے ' لیکن عرصے سے روس کی انقلابی تحریک کی روح رواں رھے تھے اور ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد سے روسی زندگی کی عمارت اپنے کندھوں پر سنبھالے ھیں —

سولومن کے کیرکٹروں میں جو خامیاں رہ گئی ھیں اور جن کی وجہ سے اس کی شخصیت کی تاثیر بہت کم ھوجاتی ہے " اچھوتی زمین " کی ھیروین ماری آنئنا میں نہیں نظر آتیں ۔ تورگینف نے ماری آننا کو جوش اور جانفشانی اور قوم پرستی کا مجسمہ بناتے ھوئے بھی حقیقت کا اتنا لحاظ رکھا ہے اور نفس انسانی کا ایسا گہرا اور سچا علم دکھایا ہے کہ ماری آننا کی صورت اور سیرت اور سرگذشت پر کہیں ذرا بھی مبالغے یا جذبات پرستی کا گمان نہیں ھوتا ۔ سولومن ایک موقع پر کہتا ہے ' " آپ سب ' آپ روسی عورتیں اس وقت بھی ھم سے زیادہ کام کی ھیں ' ھم سے زیادہ کام کرتی رھی ھیں ' اور آپ کا مرتبہ ھم مردوں سے بہت زیادہ بلند ہے " ۔ اور ناول سے ظاھر ھوجاتا ہے کہ سولومن کی رائے صحیح ہے ۔ ماری آننا نے اپنے ماموں سیپ یاگن کے یہاں پرورش پائی

ہے - وہ بہت رئیس آدمی ہے ' اور اس کی بیوی کوشش کرتی ہے کہ
ماری آننا ایک بہت خوش حال زمیندار سے جو قریب ہی رہتا ہے شادی
کرلے - لیکن ماری آننا کے دل میں سرفروشی کی تمنا ہے ' وہ اس شادی پر
راضی نہیں ہوتی ' اور جب نثرو نوف سوب یاگن کے یہاں بطور استاد کے
ملازم ہوکر آتا ہے اور ماری آننا کو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ کن خیالات اور
کیسے حوصلوں کا آدمی ہے تو وہ بغیر کسی جھجھک یا گھبراہٹ کے ماں
کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لیتی ہے ' اور قوم کی خدمت کے لیے
زندگی وقف کردیتی ہے - وہ صرف دلیر نہیں ہے بلکہ گھر سے یہ اُمید لے کر
نکلی ہے کہ اسے قوم پر اپنی جان نثار کرنے کا فخر حاصل ہوگا ' اور اگر
وہ اس عزت سے محروم بھی رہی تو کم از کم وہ غریبوں میں رہ کر غریبوں
کی زندگی تو ضرور بسر کرسکے گی ' جو کچھ اسے آتا ہے دوسروں کو سکھا سکے گی
اور قوم کی سیوا میں وہ مسرت اور روحانی تسکین حاصل کرے گی جو
اس کے معیار کے مطابق زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے - اسے نثرو نوف
سے محبت ہے ' لیکن نثرو نوف کی ذات سے زیادہ اس کے حوصلوں سے ' اور
جب آخر میں نثرونوف خود کشی کر لیتا ہے تو وہ اس کا ماتم نہیں کرتی '
بلکہ سولومین کے ساتھ شادی کرکے اس کے کام میں مدد دینے لگتی ہے ' کیونکہ
اسے محبت اپنے نصب العین سے اور اپنی قوم سے ہے ' کسی ایک شخص کی
ذات سے نہیں —

تورگینف کا آخری ادبی کارنامہ " نثر میں نظمیں " ہیں - ان میں
اس نے مختلف موضوعوں پر مختصر مضامین لکھے ہیں ' اور زبان اور خیالات
کے رو سے اس کے یہ مضامین دنیا کی بہترین شاعری کا مقابلہ کر سکتے
ہیں ' ایک " نظم " میں اس نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ میں سڑک

پر جارہا تھا ' مجھے ایک فقیر نے روکا اور بھیک کے لیے ھاتھہ بڑھایا ' مگر جیبیں تلاش کرنے پر معلوم ھوا کہ میں اپنے ساتھہ کچھہ نہیں لایا ھوں ' نہ روپے ' نہ گھڑی ' نہ رومال - میں نے محبت سے فقیر کا کانپتا ھوا ھاتھہ اپنے ھاتھوں میں دبایا ' اور معافی مانگی - فقیر نے کہا کوئی پروا نہیں بھائی ' ... یہ سلوک بھی ایک عنایت ہے - " ایک اور " نظم " میں جس کا عنوان " آستان " ھے ' تورگینف نے یہ دکھایا ھے کہ اس وقت کی روسی لڑکیاں کس صدق دل اور ھمت اور بے غرضی سے اپنے آپ کو قوم پر نثار کررھی تھیں " کیسے خوبصورت ' کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول " ایک نظم ھے جس میں اس نے اپنی زندگی کے چند منظر دکھائے ھیں جن کی یاد اس کے دل پر نقش ھوگئی ھے ' اور اب بڑھاپے کے ساتھہ تازہ ھوتی جاتی ھے - نظم کا آخری بند ملاحظہ ھو :

" قندیل کی روشنی دھیمی پڑ گئی ھے ' بجھہ رھی ھے ... یہ کون تھا جو ابھی اس طرح کھانسا جیسے اس کا گلا پڑگیا ھے اور سینے میں دم نہیں ؟ میرے پیروں پر میرا بوڑھا کتا گٹھری بنا پڑا ھے ' سکڑ رھا ھے اور کانپ رھا ھے - اس کے سوا دنیا میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں - مجھے سردی لگ رھی ھے ... ٹھٹھرا جاتا ھوں ... اور وہ سب مرگئے ... مرگئے ... "

" کیسے خوبصورت ' کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول - "

نثر میں نظمیں " قطعی طور پر یہ ظاھر کردیتی ھیں کہ تورگینف سے بہتر روسی زبان نہ کسی نے لکھی ھے نہ کوئی لکھہ سکتا ھے ' اور اس لحاظ سے اس کے ناولوں اور افسانوں کی اھمیت اور شان میں اس وقت

تک کوئی فرق نہیں آسکتا جب تک روسی زبان بولی اور لکھی جاتی ہے - فصاحت اور بلاغت تورگینف کی تمام تصانیف میں یکساں پائی جاتی ہیں اور اسے محل اور موقع کا اس قدر خیال رہتا ہے ' اس میں اس قدر متانت اور ضبط ہے کہ اس پر زبان کی خوبیوں سے موضوع یا تصورات کی خامیاں پوری کرنے کا الزام کبھی نہیں لگایا جاسکتا - اپنی زبان اور الفاظ کی دولت وہ اس سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ کہیں بھی ایک زائد حرف یا جملہ نظر نہیں آتا ' اور محض اختصار اور ایجاز کے نقطۂ نظر سے اس کی تصانیف اسلوب بیان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں - لیکن تورگینف زبان اور مضمون میں اتنی مناسبت اور ہم آہنگی اس وجہ سے پیدا کرسکا کہ وہ اپنے فن میں کامل تھا ' اور قبل اس کے کہ وہ زبان کے زیور سے آراستہ کیے جائیں اس کے پلات اور کیرکٹر ایسی شکل اختیار کر لیتے تھے کہ یہ زیور ان کے عیبوں کے چھپانے کا کام نہ دے بلکہ ان کے حسن کو ابھارنے کا - تورگینف کی زبان کی تو وہی قدر کرسکتے ہیں جو روسی جانتے ہوں ' پلات کی ساخت اور ناول کو شکل و صورت دینے میں تورگینف ہر جگہ استاد مانا جاتا ہے ' اور حقیقت میں تالستائی کے سوا دنیا میں کوئی ناول نویس نہیں گذرا ہے جو اس فن میں اس کے لگ بھگ بھی ہو - اس کے ناول سب مختصر ہیں مگر نہایت مکمل ' اس کے پلات بہت صاف اور سلجھے ہوئے ہیں ' ان میں جزو اور کل کا ایسا تناسب ہے جو یونانی مورتوں اور مغل بادشاہوں کی عمارتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے - یہی کمال تورگینف نے اپنے ناولوں کے کیرکٹر اور سراپے بیان کرنے میں دکھایا ہے - اس کے قلم کی ذرا سی جنبش ہماری نظر

کے سامنے ایک جیتی جاگتی مورت کھڑی کر دیتی ہے اور ہم حیرت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایجاز میں موضوع کو روشن کرنے کی ایک صفت ہے جو وضاحت اور تفصیل کو شرمندہ کرتی ہے —

زبان اور فن کے علاوہ تورگینف میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا موضوع ہمیشہ بلند رہتا ہے اور اس کی تصانیف اشتعال انگیزی اور ہوس پرستی سے بالکل پاک ہیں - انسانی زندگی کا یہ پہلو اس کی حقیقت بین نگاہ سے چھپا نہیں رہتا اور اس کی طبیعت میں وہ جھوٹی پارسائی نہیں جو اس طرف نظر ڈالتے ہوئے ڈرتی ہے - اس کے مختلف افسانوں اور ناولوں میں ایسے لوگ ہیں جن کی بد اخلاقی کی نسبت وہ کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتا لیکن عام اور خصوصاً فرانسیسی ناول نویسوں کی طرح وہ اشتعال انگیزی کو ہر دل عزیزی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتا ، اور اگر اس کی نظر پستی کی طرف رخ بھی کرتی ہے تو صرف اس غرض سے کہ بلندی پر واپس پہنچنے کا شوق دو بالا ہوجائے - اس شوق کی شدت اس کے قومی ناولوں میں خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے -

تورگینف کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس نے حقیقت کو حسن پرست کی نظر سے دیکھا ، حسن اور جمالیات کو اخلاقی امنگوں اور حوصلوں کا محرک بنایا ، اور یوں حقیقت ، جمالیات اور اعلیٰ اخلاقی معیار کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم کر دیا جس سے تینوں انسان کی بصیرت افروزی ، مسرت اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بن سکتے ہیں -

اتنا تو ضرور ہے کہ تورگینف کی مایوسی اس کی امیدوں کے شہ پر

کاٹتی رہتی ہے ؛ اور اس کے روشن سے روشن فضا پر بادل کی طرح چھائی رہتی ہے - لیکن تورگینف یاس مشرب نہیں تھا ؛ اس کی مایوسی کا عقیدے اور فلسفۂ حیات سے کوئی واسطہ نہیں - اس کی تصانیف کو پڑھ کر کوئی مایوس اور روسی قوم یا نوع انسان کی طرف سے نا امید نہیں ہوسکتا —

تبصرے

ادب ۱

تاریخ و سیر

مشرق

جدید رسالے

تبصرے

ادب

اردو لٹریچر

(مولفۂ ڈاکٹر گوبھیم بیلی ' ڈی - لٹ ' پی ڈی ' ایم - اے - ریڈر هندی و اردو ' لندن یونیورسٹی - The Heritage of India Series صفحات ۱۰۷ ' قیمت دو روپے)

ڈاکٹر بیلی زمانۂ حال کے اُن چند انگریزوں میں سے ھیں جنھوں نے اپنے تمام ھندوستان میں علاوہ فرض منصبی کے اپنا وقت ھندوستان کی بعض زبانوں کی تحصیل و تحقیق میں صرف کیا اور اس کے بعد بھی اپنے شوق کی تکمیل کرتے رھتے ھیں - ھندوستان میں کلیسائے اسکاچستان کے تعلق سے ان کا تمام پنجاب میں رھا - پنجابی ' ھندی اور اردو زبان بخوبی جانتے ھیں - اس سے قبل انگریزی پنجابی لغت ' نیز ھمالیہ پہاڑ کی لسانیات اور پنجابی صرف و نحو پر ان کی کتابیں شائع ھوچکی ھیں - یہ کتاب (اردو ادب کی تاریخ) اُن کی آخری تالیف ہے - چونکہ ڈاکٹر صاحب اردو زبان سے خوب واقف ھیں اس لیے زمانۂ حال میں اردو کی تاریخ و تحقیق کے متعلق جو کتابیں اردو زبان

میں لکھی گئی ہیں یا جو مضامین اس تحقیق کے متعلق اردو کے رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں اُن سے انہوں نے اپنی اس تالیف میں حتی‌الامکان پورا استفادہ کیا ہے - اور سو صفحے کے اندر اردو زبان کی پوری تاریخ کا خلاصہ پیش کردیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے ' یہاں تک کہ ابتدائی زمانے کے بعض ایسے مصنفوں کا بھی ذکر کردیا ہے جو غالباً کسی بڑی تاریخ میں بھی قابل ذکر نہ سمجھے جاتے —

ابتدائی اردو کے ابواب کے ماخذ زیادہ تر پنجاب میں اردو ' قدیم اردو ' اردو شہ پارے اور رسالۂ اردو کے وہ مضامین ہیں جو اس رسالے میں ابتدائی اردو کے متعلق وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں ' لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے قابل شاگرد (مولف شہ پارے) کی طرح ' بقول ایک نقاد کے ' رسالۂ اردو کے مضامین کے حوالہ دینے کی " قسم کھا رکھی ہے " - جہاں تک ابتدائی اردو کا تعلق ہے ' ادوار کی تقسیم میں " اردوئے قدیم " کا اتباع کیا ہے - ابتدائی دور پر کتاب کا بڑا حصہ صرف ہوگیا ہے - باقی حصہ اتنا تفصیلی نہیں - پوری کتاب کے مضامین کی تقسیم یہ ہے —

مختصر دیباچے کے بعد جس میں اردو شعر کی بحروں ' شعر کے اقسام اور اعلیٰ اور نامی شعرائے اردو کے اسما * ہیں ' پہلا باب شروع ہوتا ہے - اس میں اردو کی ابتدا ' اردو کے نام اور زبانوں میں اردو کی حیثیت سے بحث کی ہے - دوسرے باب میں ابتدائی اردو کی تاریخ ہے جس میں صوفی اور عالم شعرا ' قطب شاہی اور عادل شاہی زمانوں کے شاعروں ' دکن میں مغلوں کے عہد کے مصنفوں اور آخر میں ولی کے نوجوان ہم عصروں کا ذکر ہے - تیسرے باب میں دہلی کی شاعری کی پہلی صدی کا حال ہے جس میں حاتم ' مظہر ' سودا ' میر ' درد ' میر حسن ' مصحفی ' انشا ' اثر ' نظیر ' نصیر آگئے ہیں - چوتھے باب میں انیسویں صدی کے لکھنوی شاعر ہیں ؛ یعنی خلیق ' ضمیر ' شہیدی ' دیاشنکر نسیم ' آتش ' ناسخ ' شرف ' صبا ' وزیر ' رند ' رشک ' برق ' مہر ' بحر ' خلیل ' آباد ' اختر (واجد علی شاہ) ' قلق ' ذکی ' درخشاں ' اختر ' انیس ' دبیر ' مونس ' شوق ' عشق ' نفیس ' رشید ' عارف - پانچویں باب میں دہلی کے دوسرے عہد اور رام پور کے چار شاعروں کا ذکر ہے - اس

* اس میں کیفی [حیدرآبادی] کا بھی نام ہے لیکن کتاب میں کہیں ان کا ذکر نہیں —

میں ذوق ، غالب ، مومن ، ظفر ، نسیم ، تسکین ، شیفتہ ، آزردہ ، سالک ، درخشاں ، ثاقب ، تاباں ، سائل ، زکی ، ظہیر ، انور ، مجروح اور (رام پور کے چار شاعر) امیر ، داغ ، تسلیم ، جلال ہیں - چھٹا باب اردو نثر پر ہے جس میں چند ابتدائی نثاروں ، فورٹ ولیم کالج کے مترجمین اور انیسویں صدی کے ارباب نثر کا تذکرہ ہے - ساتواں باب عہد جدید کے شعرا پر ہے جس میں حالی ، آزاد ، محمد اسمعیل ، اکبر ، سرور ، نادر ، محسن ، شاد ، عظمت اللہ خاں ہیں - آٹھواں اور آخری باب چار صفحے کا خاتمہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے اردو نظم و نثر پر اپنی راے کا اظہار کیا ہے اور انجمن ترقی اردو ، ہندوستانی اکاڈیمی ، عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالمصنفین کا سرسری ذکر اور اقبال پر مختصر تبصرہ ہے —

اس چھوٹی سی کتاب کو جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں ایسے شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنھیں شاعر کہنا بدذوقی کی دلیل ہے ، زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا - عجیب بات یہ ہے کہ بعض ایسی بے حقیقت کتابوں کا ذکر کردیا ہے جن کے مصنف گمنام و بے نشان ہیں اور بعض ایسے غیر معروف اور ناقابل لحاظ شاعروں کے نام آگئے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی - یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ ہر عہد کے ایسے نامی شعرا کو لیتے جن کا اردو شاعری میں خاص درجہ ہے اور جنھوں نے اردو شاعری اور شعرا پر اپنا اثر قائم کیا تھا اور اس عہد اور پھر اس عہد کی خصوصیات کو کسی قدر زیادہ تفصیل اور بصیرت سے بیان کرتے - اس قسم کی مختصر کتابیں جزوی تذکروں اور لا حاصل اسم شماری کی متحمل نہیں ہوسکتیں - نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ایک ادبی فہرست ہوگئی ہے —

ڈاکٹر صاحب نے چند مباحث کے متعلق ذاتی جدت کا دعوی کیا ہے - مثلاً (۱) اردو کی ابتدائی تاریخ کی ابتدا اور اصل (۲) اردو میں دکنی کی اہمیت اور دکنی شعرا کا ذکر (۳) تحسین کی نو طرز مرصع ، میر امن کی باغ و بہار اور امیر خسرو کی چہار درویش کے متعلق جدید معلومات - لیکن کتاب کے مطالعہ سے اس جدت کی ساری حقیقت معلوم ہوجاتی ہے - نمبر ۱ ، کلیتاً پروفیسر شیرانی کی محققانہ تالیف " پنجاب میں اردو " سے ماخوذ ہے - نمبر ۲ رسالۂ اردو کے مضامین ، اردوے قدیم یا ان دونوں کے خوشہ چینوں سے منقول ہے -

نمبر ۳' راقم کے مقدمۂ باغ و بہار کا رہین منت ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ چیزیں اب تک انگریزی زبان سے روشناس نہیں ہوئی تھیں —

ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے - اس لیے ان سے جگہ جگہ' خصوصاً ابتدائی دور میں جسے وہ اپنا بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں' لغزشیں سرزد ہوئی ہیں - ان لغزشوں کی کئی وجوہ ہیں - ایک تو نقل در نقل ہونے سے' دوسرے ایسے ماخذوں سے استفادہ کرنے سے جو ناقابل اعتبار ہیں' تیسرے ایسے ماخذ جن سے انھوں نے رجوع کیا ہے وہ ہیں تو قابل اعتماد لیکن کاتب کی غلطی سے بعض الفاظ یا نام غلط چھپ گئے ہیں اور ویسے ہی نقل کردیے ہیں اور چونکہ فاضل مولف نے ایسے مقامات پر حوالہ دینے سے احتراز کیا ہے اس لیے وہ سب غلطیاں انھیں پر تھوپ گئی ہیں - ہم یہاں صرف چند موٹی موٹی غلطیوں کا ذکر کرتے ہیں -

۱ - قصۂ ابو شحمہ کا مصنف محمد امین نہیں ہے - میرے پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا - بلکہ ہر نسخے کے آخر میں اس کا نام "اولیا" لکھا ہوا ہے - (صفحہ ۲۶)

۲ - ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ امیر خسرو کی یوسف زلیخا کی پیروی میں لکھی گئی ہے - خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی اور نہ امیر خسرو کی تصنیف سے کوئی مثنوی یوسف زلیخا ہے - (صفحہ ۲۸)

۳ - ہاشمی کی دو تصانیف بتائی ہیں - ایک یوسف زلیخا اور دوسری "احسن القصص"- یہ غلطی بچوں کی سی ہے - یوسف زلیخا کے قصے ہی کو احسن القصص کہا گیا ہے - یہ دو کتابیں نہیں ایک ہی کتاب ہے - اس میں ڈاکٹر صاحب کا قصور نہیں- انھوں نے بلفظہ یہ عبارت "اردو شہ پارے" سے نقل کی ہے - البتہ تعجب مولف "اردو شہ پارے" سے ہے - ہر معمولی پڑھا لکھا مسلمان بلکہ اکثر ان پڑھ مسلمان بھی یہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں یوسف زلیخا کے قصے کو احسن القصص کے نام سے یاد کیا ہے - (صفحہ ۳۰)

۴ - مصنف قصۂ ملکۂ مصر و قصۂ فیروز شاہ کا نام "محمد علی عاجز" غلط ہے- اس نے خود اپنی تصنیف ملکۂ مصر میں اپنا نام محمود بتایا ہے - عاجز

تخلص بھی غلط ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے -

اے محمود اب پیر کا ناؤں لے
ختم کر درازی سو اب چھوڑ دے

یہ غلطی " اردوئے قدیم " سے بے سمجھے نقل کرنے سے ہوئی ہے (صفحہ ۳۰)

۵ - عارف الدین عاجز کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے ہمنام (عاجز) کی ایک تصنیف اس سے منسوب کر دی گئی ہے - یہ غلط ہے - عاجز اورنگ آبادی کی کوئی تصنیف کسی دوسرے دکنی عاجز سے منسوب نہیں کی گئی - مصنف کو مغالطہ ہوا ہے یا کسی کتاب کی عبارت کو غلط سمجھ کر یہ لکھ دیا ہے - (ص ۳۲) -

۶ - شاہ پیراللہ حجری کی تصنیف (منظوم سہ درس) کا نام " گلشن حسن دل " لکھا ہے - اس کا اصل نام " گلشن جشن دل " ہے - راقم نے اس کتاب کا ذکر اپنے ایک مضمون (رسالۂ اردو) میں کیا ہے - کاتب نے غلطی سے " جشن " کی بجائے " حسن " لکھ دیا - مولف شہ پارے نے وہی غلط نام اپنی کتاب میں (بغیر حوالہ) نقل کر دیا اور ڈاکٹر بھی نے نقل در نقل - کتاب استاد شاگرد دونوں نے نہیں دیکھی ' حوالہ دیکھے نہیں ' غلطی معلوم ہو تو کیونکر (ص ۳۲) - یہی کیفیت ہمیں دوسرے شعرا و مصنفین کے حالات میں نظر آتی ہے مثلاً محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر تفصیلی رائے ' اس کے اشعار اور صفحات کی تعداد نہایت وثوق کے ساتھ دی گئی ہے حالانکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے شریک جرم نے قلی قطب شاہ کے کلیات کی صورت تک نہیں دیکھی اور یہ تفصیلات ان دونوں صاحبوں نے لفظ بلفظ رسالۂ اردو کے مضمون نقل کی ہیں لیکن حوالہ دینا ان کے مذہب میں روا نہیں - یہ تحقیق کا نیا گر ہے - یہی حال ہم شمس العشاق ' برہان جانم ' ذوقی وغیرہ کے حالات میں دیکھتے ہیں - اسے تحقیق تو نہیں البتہ الہام کہ سکتے ہیں -

۷ - ابو طالب طالب قصبۂ بلندہ کے باشندے تھے میر حسن اور قائم نے بھی یہی لکھا ہے کہ بلندہ من مضافات اورنگ آباد کے رہنے والے تھے - ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے حیدرآباد لکھ دیا ہے - (ص ۳۲)

۸ - شاہی دو ہیں ایک علی عادل شاہ شاہی اور دوسرے شاہ قلی خان شاہی - دونوں کے مرثیے قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں جن کو غلطی سے ایک

دوسرے سے منسوب کردیا جاتا ہے - شاہ قلی خان بھاگ نگر حیدر آباد کے تھے ؛ بھاؤ نگر غلط ہے - (ص ۲۷) -

۹ - نورس کی زبان دکھنی نہیں ہندی ہے - یہ بھی اردو شہ پارے کی غلط نقل کا نتیجہ ہے - (ص ۲۷) -

۱۰ - وجدی کی تصنیف تحفۂ عاشقین نہیں ' تحفۂ عاشقاں ہے - تعجب ہے کہ اس کی سب سے مشہور و معروف تصنیف " پنچھی باچا " کا ذکر نہیں جو بارہا چھپ چکی ہے - (ص ۳۳) -

۱۱ - فیض عام کے مصنف کا نام سید محمد نہیں بلکہ عبدالصمد ہے چنانچہ وہ خود لکھتا ہے -

کیا ہے جو دکھنی زبان میں کلام رکھا ناؤں اس کا یقین فیض عام
یہ عبدالصمد جو ہے مہدوی ابی مجتبی مہدی مقتدی

(ص ۳۷)

۱۲ - قیاسی کا صحیح نام سیدی عبداللہ ہے سید عبداللہ غلط ہے - (ص ۳۷)

۱۳ - آرزو کی تصنیف " نوادر الغرض " نہیں بلکہ " نوادرالالفاظ ' ہے - ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے " غرائب اللغات " کو بھی آرزو سے منسوب کردیا ہے حالانکہ یہ عبدالواسع ہانسوی کی تصنیف ہے - (ص ۳۹)

۱۴ - جرأت کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے زیادہ نہیں لکھا - حالانکہ اس کا کلام بہت ضخیم ہے جو اب تک شایع نہیں ہوا - (ص ۵۶) -

۱۵ - سوز کے متعلق بھی یہی غلطی کی ہے - اس شاعر کا کلام بھی بہت ضخیم ہے مگر چھپا نہیں - سوز کے متعلق دوسری غلطی یہ کی ہے کہ دہلی سے اُن کا جانا سنہ ۱۷۷۷ ع میں لکھا ہے حالانکہ وہ اس سے بہت قبل جا چکے تھے - سودا کے ساتھہ فرخ آباد میں مہربان خان کے ہاں تھے - سودا نے فرخ آباد سنہ ۱۷۷۵ ع میں چھوڑا - سودا کا قیام سترہ اٹھارہ سال فرخ آباد میں رہا ' اس عرصے میں وہ فرخ آباد ہی میں تھے - اس اعتبار سے سوز ۱۷۵۷ ع کے لگ بھگ دہلی سے فرخ آباد آگئے تھے - (ص ۵۱) -

۱۶ - مصحفی نے ایک نہیں بلکہ تین تذکرے لکھے ہیں - دو ریختہ گو اور ایک فارسی گو شعرا کا - (ص ۵۳) -

۱۷ - سودا کے متعلق لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا -

حالانکہ دہلی ہی میں سنہ ۱۱۶۵ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب مل چکا تھا ' میر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے -

۱۸ - سودا کے غلام " غنچہ " کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں - صرف آزاد نے لکھا ہے - ڈاکٹر صاحب نے عجیب مضحکہ خیز انداز میں اس کا ذکر خیر فرمایا ہے -

۱۹ - قائم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سب سے بڑی کامیابی رباعی گوئی میں ہے - ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں - لکھا ہے کہ اس کا کلام سنہ ۱۹۲۷ ع میں طبع ہوا - یہ بھی صحیح نہیں —

۲۰ - دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کے متعلق لکھا ہے کہ یہ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان سے بہت مشابہ ہے - یہ رائے بہت ہی حیرت انگیز ہے —

نسیم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے الف لیلہ کا اردو میں ترجمہ کیا - یہ صریحاً غلط ہے - اس غلطی کا ارتکاب گارساں دتاسی نے کیا ہے اور اسی کی نقل ڈاکٹر صاحب نے کی ہے —

۲۱ - میر اور سودا کے دور کے دو مشہور شاعروں کا ذکر بالکل ترک کردیا ہے حالانکہ بہت سے غیر معروف اور کم سواد شعرا کا ذکر کیا گیا ہے - ایک سید عبدالولی عزلت ہیں جو صاحب دیوان ہیں اور ان کی تصنیف سے " راگ مالا " ایک مشہور مثنوی ہے - میر صاحب نے اپنے تذکرے میں ان کی بیاض سے بہت مدد لی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی بہت تعریف کی ہے —

دوسرے فقیہ درمند شاگرد مظہر ہیں - ان کا ساقی نامہ بہت مشہور ہے - خود مظہر جان جاناں نے اپنے ایک شعر میں اس کی تعریف کی ہے - اساتذۂ وقت نے ان کے ساقی نامہ کو بے مثل تسلیم کیا ہے —

۲۲ - عبدالحی خاں صارم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آصف جاہ کا پہلا وزیر تھا - ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ شاعر تھا اور جوان فوت ہوا - آصف جاہ کا پہلا وزیر صارم کا باپ عبدالرزاق صمصام الدولہ شاہ نواز خاں مولف مآثرالامرا و بہارستان سخن تھا —

۲۳ - ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد نے بے نظیر کے نام

(یا عنوان) سے چند نظمیں لکھی ھیں - یہ بات نہیں ھے بلکہ سید افتخار عالم مرحوم نے ان کی نظموں کا مجموعہ نظم بے نظیر کے نام سے شایع کیا تھا - اس تبصرے میں ھم نے ان کی بعض رایوں سے بحث نہیں کی جو انھوں نے بعض شعرا کے متعلق ظاھر کی ھیں ' ان میں سے اکثر وہ ھیں جو دوسری جگہ سے منقول اور ماخوذ ھیں اور بعض ان کی ذاتی ھیں ' ورنہ یہ بحث بہت طویل ھوجاتی —

ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو تفصیل سے کیا ھے لیکن دھلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ قابل قدر اور اھم تھا - فورٹ ولیم کالج کا کام زیادہ تر صرف فسانوں اور قصہ کہانیوں تک رھا مگر دھلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا - اس کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں نہایت ضروری تھا —

ایک انگریز اپنے سیاحت نامے میں لکھتا ھے کہ اھل ھند ھمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ھیں اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ امر پیش کیا ھے کہ یہ لوگ ھمیں (انگریزوں کو) طنزاً " گورا " (یعنی گھوڑا) یا گھوڑ منھا کہتے ھیں - یورپی شخص کی زبان سے گھ اور ڑا کا تلفظ ادا نہیں ھوتا اور وہ گورا اور گھوڑا کو ایک ھی طرح بولتا ھے ' اس سے یہ مغالطہ ھوا - یہی حال ان یورپی محققین کے ھاتھوں " کھڑی بولی " کا ھوا - یہ لوگ " کوڑی اور " کوری " میں فرق نہیں کرسکتے نتیجہ یہ ھوا کہ یہ کھڑی کے معنی کھری اور کھڑي بولی کے معنی پاک صاف ' شستہ اور عام مستند زبان سمجھتے رھے - ھمیں اس سے خوشی ھوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مغالطے کو رفع کیا ھے - لیکن اصل غلطی میں یہ بھی مبتلا ھیں - کوڑی اور کھری کا فرق انھوں نے بہت صحیح بتایا ھے لیکن معنی تقریباً وھی رکھے ھیں جو کھری کے ھیں یعنی مروجہ ' عام مستند (Standard) زبان - اور دوسرا غضب کیا ھے کہ " کھڑی بولی " کو ایک خاص زبان قرار دیا ھے اور اس کی دو شاخیں بتائی ھیں ایک ھندی اور دوسری اردو - ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحت سے اسی قدر بعید ھے جس قدر ان کے پیشرو یورپی محققین کا - کھڑی بولي کے معنی ھندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ھیں جسے ھندوستان کا بچہ بچہ جانتا ھے - وہ نہ کوئی خاص زبان ھے اور نہ زبان کی کوئی شاخ —

باوجود ان نقائص اور اختلافات کے ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب انگریزی میں پہلی تالیف ہے جس میں مختصر طور پر اردو ادب کی تاریخ کا خاکہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ابتدا سے اب تک جو جو تغیرات اور ترقی عہد بعہد زبان میں ہوئی ہے اُسے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ زبان کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے - طلبہ اور خاص کر ان لوگوں کے لیے جو انگریزی میں اردو ادب کی اجمالی کیفیت جاننا چاہتے ہیں یہ کتاب ضرور بکار آمد ہے —

بہار گلشن کشمیر

جلد ثانی

(مرتبہ و مولفہ جناب پنڈت برجکشن کول صاحب بیخبر و جناب پنڈت جگموہن ناتھ ریلہ صاحب شوق مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد - صفحات ۹۷۶)

یہ تذکرۂ شعرائے کشمیری پنڈتاں کی دوسری جلد ہے - پہلی جلد پر اس سے قبل اس رسالے میں تبصرہ لکھا جاچکا ہے - یہ جلد بھی اُسی شان اور خوبی سے شایع ہوئی ہے - شوق صاحب نے جس شوق اور کاوش سے شعرا کے حالات اور کلام جمع کیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے - اس تلاش اور جانفشانی کی قدر وہی لوگ خوب کرسکتے ہیں جنھوں نے خود کبھی اس قسم کا کام کیا ہے —

اس جلد میں ع سے ی تک کے شعرا ہیں جن کی تعداد ۱۶۱ ہے اس کے علاوہ دو ضمیمے بھی شامل ہیں - پہلے ضمیمے میں اُن شعرا کے حالات ہیں جن کا تعلق جلد اول سے ہے یہ حالات اس وقت دستیاب نہیں ہوے اب اس جلد میں شریک کیے گئے - دوسرا ضمیمہ جلد ثانی سے متعلق ہے - ان شعرا کے حالات جلد ثانی کے ختم ہونے کے بعد ہاتھ لگے - غرض ان سب شعرا کی تعداد ۱۹۴ ہے —

فاضل مولف نے کلام کا انتخاب بھی کافی دیا ہے اور اکثر شعرا کی تصویریں

بھی شریک کتاب ہیں - ان میں سے بعض تصویریں بہت تلاش اور کوشش سے حاصل کی گئی ہیں —

حضرت شوق کا یہ کام ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے ' انھوں نے ہندوستان کے اردو اور فارسی گو شعرا کے تذکروں کی بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے - کتاب مطالعہ اور سیر کے قابل ہے - اس میں کشمیری پنڈتوں کی طباعی ' تہذیب و شایستگی اور ادبی قابلیت کا عجیب منظر نظر آتا ہے —

گنج معانی

(کلیات منشی تلوک چند محروم - عطر چند کپور
اینڈ سنس- انار کلی - لاہور - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

اس کلام کو پڑھ کر جو گلزار شاعری کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہے کون کہہ سکتا ہے کہ منشی تلوک چند محروم ایک ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جسے اہل پنجاب بھی ایک گوشۂ دور افتادہ سمجھتے ہیں - ان کو زبان پر ایسی قدرت اور بیان میں ایسی صفائی ہے کہ مدعیان زبان میں سے بھی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوسکتی - پنجاب نے اردو زبان کے بہت سے ادیب اور شاعر پیدا کیے ہیں ' ان میں حضرت محروم ممتاز حیثیت رکھتے ہیں —

اس مجموعے میں ان کے کلام کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے - حمد و معرفت ' جذبات فطرت ' مناظر قدرت ' راماین کے سین ' پند و نصائح ؛ سیر گلستان' نکات شیکسپیر ' یاد رفتگان ' طوفان غم ' تقریبات ' تضمینات ' رباعیات و قطعات' ان میں سب کچھ آگیا ہے - لیکن جیسا کہ سر عبدالقادر نے جو شاعر کے رنگ طبیعت سے خوب واقف ہیں اس کتاب کے دیباچے میں فرمایا ہے کہ " ایک چیز جو ان کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے وہ کیفیت غم ہے - بہار ہو یا خزاں ' قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو

جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے درد و گداز طبیعت میں حد سے زیادہ رکھا تھا " ۔
یہ کچھ حضرت محروم ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ اردو کے اکثر شعرا حزن و یاس کے شکار ہیں لیکن محروم پر کچھ ایسی افتادیں پڑیں کہ یہ رنگ ان پر غالب آگیا ۔ لیکن اس میں بھی وہ اپنے وطن کو نہیں بھولے اور جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ یک جہتی اور خلوص و اتحاد کا سبق دیتے ہیں ۔ چنانچہ ایک نظم میں جو ڈاکٹر سر اقبال کے ولایت سے ہندوستان آنے پر لکھی گئی ہے ، فرماتے ہیں ۔

محفل میں رنگ الفت اے شیخ پھر جمادے   لایا فرنگ سے ہے جو مے وہی پلا دے
پھر ہو رہی ہے ان بن کچھ شیخ و برہمن میں   ان کو گلے ملادے روٹھے ہوئے ملادے
ہو برہمن نمازی ، زاہد ہو پائے بت پر   دیر و حرم کو ایسی ترکیب سے ملا دے
کلمہ پڑھیں ترا سب ، ہو کفر دور دل سے   ناقوس پھونک ایسا ، ایسی اذاں سنادے
سوتوں کو ہے جگانا ، مردوں کو ہے جلانا   ہوگا یہ کام تجھسے ، ہمت تجھے خدا دے
منزل کٹھن ہے اپنی اور پر خطر ہیں راہیں   پھر سیلکڑوں دوراہے ، اک راہ پر چلادے
ہل جائے دل زمین کا اور چرخ کانپ اٹھے   اے نوجواں کڑک کر بھولی کوئی گرادے
دی ہے زبان بھی تجھکو دل بھی دیا خدا نے   حب وطن کے دلکش پھر چھیڑ دے ترانے

سیر گلستاں میں شیخ سعدی کی گلستاں کے بعض پند آموز اشعار کا ترجمہ کیا ہے اور نکات شیکسپیر میں شیکسپیر کے بعض نکات کا ۔ یہ ترجمے اگرچہ بہت اعلیٰ درجے کے نہیں اور ظاہر ہے کہ ترجمے میں اصل کی خوبی نہیں آسکتی تاہم اچھی کوشش ہے —

اس مختصر تبصرے میں ہر قسم کے اقتباسات کا دینا ممکن نہیں لیکن ان کا عام رنگ طبیعت دکھانے کے لیے ان کی ایک چھوٹی سی نظم " ابر بہار " نقل کی جاتی ہے —

ابر نیساں ہے سحاب فیض کہلاتا ہے تو   مسمع صہبائے کرم ہے ، جھوم کر آتا ہے تو
خوشنما فرش ہوا پر ہے ترا تخت رواں   اس کی کیا توصیف ہو جس شان سے آتا ہے تو
جب زمین خشک پھیلاتی ہے داماں سوال   رحمت باری کے موتی اس پہ برساتا ہے تو
ہوتی ہیں جب وقف عریانی عروسان چمن   خوب صورت سبز جوڑے ان کو پہناتا ہے تو
بے بسی میں اٹھتے ہیں ہاتھوں کے جب مسعود دعا   دستگیر اُن بے کسوں کا بن کے آجاتا ہے تو
کر ہی دیتا ہے تجھے درد اخوت اشکبار   ساحل دریا کو جب تفسیدہ لب پاتا ہے تو
تازگی پاتے ہیں تیرے نام سے اہل زمیں   آسمانوں سے پیام زندگی لاتا ہے تو

رونق گلزار ہستی کو بڑھانے کے لیے باغ میں پھولوں کے میلے آکے لگواتا ہے تو
گل بداماں ایک چھینٹے سے ہوے دشت و جبل آسماں سے حسن برساتا ہوا آتا ہے تو
آہ مشتاق ترنم کس قدر ہے یہ ترا سبزۂ خوابیدہ چونک اٹھتا ہے جب گاتا ہے تو
جلوۂ رخسار گل کو آتشیں کرتا ہوا آتش الفت دل بلبل میں بھڑکاتا ہے تو
عارض خوباں میں رنگ روے گل بھرتا ہوا تلبل بلبل عاشقوں کے دل کو تڑپاتا ہے تو
یاد آجاتے ہیں وہ دن جو نہ آئیں گے کبھی
نالہ کش محروم ہو جاتا ہے جب آتا ہے تو

سرگذشت ادب ترکی

(مولفۂ مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی - مطبع
معارف ' اعظم گڈہ - قیمت ڈھائی آنے)

یہ چھوٹی تقطیع پر بیس صفحے کا مضمون ہے جس میں قابل مولف نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ ترکی ادب کا تذکرہ کیا ہے - جس سے ترکی ادب کی ابتدائی تاریخ ' ترکی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کی ترقی ' دور اسلامی میں سلاطین عثمانیہ کی سرپرستی ' یورپ کا اثر ' دور حاضر کی شاعری وغیرہ کی سرسری کیفیت معلوم ہو جاتی ہے —

زخم اولیں

(مجموعۂ کلام شیخ محمد اکرم اخگر مرحوم مرتبۂ قاضی محمد
عبدالله منتظر و فدا محمد فدا - دارالمنتظر ' گوجرانواله
(پنجاب) قیمت آٹھ آنے)

یہ ایک جوانمرگ شاعر کا کلام ہے جو اُن کے دو عزیز دوستوں نے زیر اهتمام انجمن ترقیء اردو گوجرانواله شایع کیا ہے - یہ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ پنجاب میں اردو کے کثرت سے اور اچھے اچھے شاعر پیدا ہورہے ہیں اور

کچھ تعجب نہیں کہ ایک عرصے کے بعد پنجاب اردو ادب و شعر کا گہوارہ ہوجائے گا —

اس مختصر مجموعے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اخگر مرحوم جو عین عنفوان شباب میں انتقال کرگئے، کچھ دنوں اور جیتے رہتے تو اردو شعرا میں نام پیدا کرتے ۔ ان کے دوستوں نے حق دوستی ادا کیا ہے کہ جتنا کچھ ان کا کلام دستیاب ہوا اُسے شایع کردیا ۔ چند شعر ان کے کلام کے نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں —

بزم ساقی میں کوئی مجھ سا بھی مدہوش نہ تھا   کون ہوں، کہاں ہوں، کہاں ہوں، مجھے کچھ ہوش نہ تھا
جب میں بیہوش تھا آتا نہ تھا کچھ مجھکو نظر   ہوش آیا تو یہ دیکھا کوئی ذی ہوش نہ تھا

——

ان کے شمع حسن کا کرنے لگا آکر طواف   بجھ گئی ہے شمع جانے کیہ کے پروانے سے کیا
دامن زاہد سے جاکر چوپ گئی توبہ مری   سالہا تکرا دیا پیمانہ پیمانے سے کہا

——

فرصت گئی، شباب گیا، ولولے گئے   اب کون رہا ہے جس پہ کہ اترا رہا ہے دل
بازار عشق سرد ہوا ہے کچھ اس طرح   اک آرزو کے ہاتھ بکا جا رہا ہے دل

——

پہلے چشم مست پر ڈالی نظر پھر جام پر   اس طرح پیتے رہے پیمانے پر پیمانہ ہم
اللہ اللہ یہ تہی دستی شب غم الاماں   سوز دل سے کرتے ہیں روشن چراغ خانہ ہم

——

رازاس میں بھی ہے پنہاں کہ جو خاموش ہوں میں   یہ نہ سمجھو کہ مجھے جرأت فریاد نہیں
موت آجائے تیرے غم میں تو حاصل ہو حیات   جو تیری راہ میں مٹ جائے وہ برباد نہیں

———

حدیث ادب

(مجموعہ کلام حضرت احسان بن دانش ۔ انجمن
تعمیر ادب، ذی شان بک ڈپو، مزنگ، لاہور ۔ قیمت
ایک روپیہ چار آنے، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے)

حضرت احسان کا کلام پڑھ کر خوشی ہوئی ۔ اس میں پختگی، معانی اور

خوبی بیان پائی جاتی ہے - جذبات و خیالات کو تغزل کے رنگ میں خوب ادا کیا ہے —

دیدۂ موسیٰ پہ تڑپی اس طرح کچھ برق طور کوئی سمجھے مضطرب خود جلوۂ جانا نہ تھا
رات کی ہر آہ شمع منزل مقصود تھی صبح کا ہر نالہ خضر کوچۂ جانانہ تھا
محفل انجم میں ساقی رات بھر ڈھونڈا تجھے کہکشاں کے ہاتھ میں جب چاند کا پیمانہ تھا

فضا میں کھول دیے ہیں گھٹاؤں نے گیسو نہیں ہے جام ' اٹھو شیشۂ شراب اٹھا
کہاں کے دیر و حرم ' جستجوے جلوہ کر یہی نقاب ہے آنکھوں سے یہ نقاب اٹھا

نسیم صبح نے آکر وہ راگنی چھیڑی ہر ایک پھول نے کانٹے کو جھک کے پیار کیا

چاندنی رات پپیہے کی تھرتی ہے فضاؤں میں آواز
کس نے جھانکا سواد مشرق سے ذرہ ذرہ ہے مائل پرواز
منتظر ہے دعا کا باب قبول میری خود داریوں کی عمر دراز

ستم ہے وہ زمانے سے ہو پنہاں جسے سارے زمانے کی خبر ہو
جہاں ہو حسن کی نظارہ سوزی نگاہوں کا وہاں پھر کیا گذر ہو

چھیتابھائی

(مولفہ مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی - اردو بک اسٹال ' دارالادب
پنجاب - بیرون لوہاری دروازہ ' لاہور - قیمت آٹھ آنے)

مرزا فہیم بیگ صاحب نے اپنے بچپن کے حالات اور بھائی بہنوں کی سچی کہانی بڑی صاف ستھری زبان میں لکھی ہے - چھیتا بھائی ان کا خالہ زاد بھائی مرزا احتشام مرحوم تھا جو ان کے سامنے جوان ہوگیا - بچوں کے پڑھنے کی بہت اچھی کتاب ہے - زبان بہت اچھی اور بے تکلف ہے اور گھر کی باتیں بڑی صفائی اور مزے سے بیان کی ہیں —

مونا وانا

(مترجمۂ جلیل احمد صاحب قدوائی - ایم - اے - کتابستان '
۱۷ سٹی روڈ ' الہ آباد - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ ڈراما بلجیم کے نامور اور شہرۂ آفاق ڈراما نویس ماٹر لنک کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ جلیل احمد صاحب قدوائی نے کیا ہے - اس میں قربانی اور محبت کی ایک ایسی داستان ہے جو ہر شخص کے پڑھنے کے قابل ہے اور اس کی ہم ضمانت کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس کے مطالعہ سے ضرور روحانی اور اخلاقی حظ حاصل ہوگا - قابل مترجم نے ترجمہ بھی اچھا کیا ہے —

محشرستان

(مختصر فسانوں کا مجموعہ ' از محشر عابدی صاحب بی - اے -
مکتبۂ عہد آفریں - حیدرآباد دکن - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ مجموعہ مختصر فسانوں کا محشر عابدی صاحب کا مرتبہ اور مولفہ ہے - کچھ فسانے تو انگریزی اور دوسری زبانوں سے ماخوذ یا ان کے ترجمے ہیں اور کچھ طبع زاد ہیں - ان میں سے اکثر فسانے اردو کے بعض مشہور رسالوں میں طبع اور شایع ہوچکے ہیں —

عابدی صاحب ایک ہونہار اور قابل انشا پرداز ہیں اور ادب و شعر سے اچھی مناسبت رکھتے ہیں - ان افسانوں سے ان کا ذوق ادب صاف معلوم ہوتا ہے - افسانے جو انہوں نے ترجمے کے انتخاب کے لیے کئے ہیں وہ سب دلچسپ ہیں -

———

طلسم زندگی

(تصنیف جناب میاں بشیر احمد صاحب بی - اے
(آکسن) بیرسٹر ایٹ لا - اڈیٹر ہمایوں لاہور)

کتاب ہاتھ میں لیجئے ہے جی باغ باغ ہو جاتا ہے - جلد ' کاغذ ' چھپائی '

تصویریں نہایت نفیس، پاکیزہ اور دلربا۔ اردو کی بہت کم کتابیں (جو شان کا حکم رکھتی ہیں) ایسی خوشنما اور دلکش صورت میں چھپی ہیں۔ کتاب کو کھولیے اور جگہہ جگہہ سے دیکھیے تو اس کی ہر ادا میں ایک حسن نظر آتا ہے۔ اس سے صاحب کتاب کے ذوق کی نفاست معلوم ہوتی ہے۔ سٹی کی طباعت میں ہندوستان نے جو کمال دکھایا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔

یہ تو کتاب کا ظاہری حسن ہے لیکن اس کا باطنی حسن بھی کچھہ کم نہیں ہے۔ اس میں ان کے دماغ و ذہن کے نتائج نہیں ہیں، شاید وہ انہوں نے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھے ہیں بلکہ ان صفحات میں زیادہ تر ان کے دل اور جذبات کے گہرے نقش نظر آتے ہیں۔ اپنی دلی کیفیات اور جذبات کے بیان کرنے میں مصنف نے کہیں تکلف سے کام نہیں لیا، جو اس وقت دل میں تھا وہ الفاظ میں کھول کے رکھہ دیا۔ " انشا کی پری " سے لیکر " خیالات پریشان " تک ایک رنگ ہے۔ کہیں وہ قدرتی مناظر دیکھہ کر بے تاب ہوجاتے ہیں اور ان سے دل پر جو اثر ہوتا ہے اسے ایک خاص انداز اور دلکشی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان نظاروں کی پر کیف کیفیتوں کا تعلق آخر میں انسانی زندگی سے لا ملاتے ہیں۔ طلوع آفتاب ہو یا شام، تاروں کی دنیا ہو یا صحرا، شیریں ساعتیں ہوں یا طوفانی سمندر ان سب کا خاتمہ اپنی یا انسانی زندگی کے تبصرے پر ہوتا ہے جس میں یا تو حزن و ملال کے آثار پاے جاتے ہیں یا ایسے ارمانوں کے پورا ہونے کی تمنا جو صاحب " طلسم " کے دل میں واویلا مچا رہے ہیں۔ کہیں وہ " صداے روح " پر کان دھرتے ہیں اور دل کی بے چینیوں اور طلسم زندگی پر گلفشانیاں کرتے ہیں۔ کبھی وہ " آئینۂ دل " میں اپنے، اپنے محبوبوں اور عزیزوں کے جذبات محبت اور خیالات کا عکس دیکھتے ہیں اور وہی عکس الفاظ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کہیں " جد و جہد " کا سامان ہے اور میدان عمل میں غازی نظر آتے ہیں۔ کبھی " سرگوشیاں " ہیں، یعنے اونچی آواز سے کہنے کی باتیں نہیں، مگر سننے اور سنانے کے قابل ہیں۔ آخر میں " خیالات پریشان " ہیں، لیکن اس پریشانی میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت اور کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور ہے —

میاں بشیر احمد صاحب نے شاعرانہ طبیعت پائی ہے اور شاعر بھی ہیں۔ ان کی نظموں کے مقابلے میں نثر کے ان ٹکڑوں میں سے جو انہوں نے بڑے

چاؤ پیار سے اس جلد میں جمع کئے ہیں ' زیادہ شاعری نظر آتی ہے - ہمارے ہاں مدتوں نثر میں بھی شاعری ہی کار فرما رہی - مگر یہ وہ شاعری نہیں اس میں مغربی رنگ کی جھلک بھی نظر آتی ہے - ادب لطیف آج کل بہت بد نام ہوچکا ہے لیکن یہ وہ ادب لطیف نہیں - یہاں صرف بے معنے جملے اور بے مغز عبارتیں نہیں ' بلکہ لفظوں میں جان اور جملوں میں معنے بھی ہیں - بعض بعض جگہہ طلسم زندگی کے شیدا ٹیگور کی عملداری میں جا داخل ہوے ہیں اور " مجھے گانا نہیں آتا " اور " تو اپنا ساز اٹھاتا ہے " میں وہی دھن اور لے ہے —

قابل مصنف نے مغربی ادبیات سے پورا استفادہ کیا ہے اور وہ رنگ ضرور ان پر چڑھا ہوا ہے لیکن اس رنگ کو بھی وہ مشرقی رنگ ہی میں ظاہر کرتے ہیں اور یہ بڑی خوبی ہے - البتہ ایک آدہ جگہہ جملے انگریزی نما ہو گئے ہیں مثلاً -

" کتاب ہذا کے باب ' آئینۂ دل ' والی محبت جس میں اصلی حاصل شدہ محبت کے لطف سے منہ پھیر کر پارسا دلگیر اپنے محبوب سے عمداً دور بھاگتا ہے تاکہ اس کی جدائی میں آبدار شعر لکھہ سکے اور عندالملاقات بھی ذرا دور ہي بیٹھتا ہے تاکہ کچھہ محبوب سے شرماکر اور کچھہ اپنے ایثار سے متاثر ہو کر " آئینۂ دل " والے مضمون قلم بند کرتا رہے " —

ایک دوسرا جملہ دیکھئے " عذرا کا چہرہ خوشنما ہے ' خصوصاً اس کی دلفریب آنکھیں ... آنکھیں بڑی بڑی ہیں اور گول گول ' لیکن بڑی آنکھیں تو عباس کے گھوڑے کی بھی ہیں اور زیادہ ہی گول گول اُس الو کی جو اس کی تنہائیوں میں اکثر بولتا رہتا ہے " -

یہاں زیادہ ہی میں " ہی " بالکل بے موقع اور بے محاورہ ہے اور " اس کی " میں ضمیر مبہم ہے - لیکن ایسے جملے گنتي کے دو چار ہی نکلیں گے ورنہ مصنف کو اپنے خیالات کے ادا کرنے پر قدرت حاصل ہے اور مضمون کی مناسبت سے طرز بیان بھی ویسا ہی ہے -

ان تمام خوبیوں کے ساتھہ تقریباً ہر مضمون میں حزن و یاس کا ہلکا سا رنگ ضرور نظر آتا ہے - اس میں مصنف کا قصور نہیں - ہمارے ملک کی آج کل

حالت ھی یہی ہے - زندگی کا ہر شعبہ ابتر اور پریشان ہے اور اس کے اثر سے کسی شاعر یا مصنف کا بچنا محال ہے —

احسن الادب

مولفہ مولوی علی احسن مارہروی' چھوٹی تقطیع صفحات ۲۸۰ لکھائی' چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت درج نہیں- ملنے کا پتہ :- ایجوکیشنل بک ھاؤس - سول لائن - علی گڑہ —

یہ کتاب مسلم یونیورسٹی علی گڈہ کے طلبہ کے لیے مرتب کی گئی ھے اس میں اُردو شاعری کے مشہور اور بلند پایہ اساتذہ میر' غالب اور حالی کے کلام کا انتخاب ہے - آخر میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا مضمون " ۱۲۶۱ھ کا ایک یادگار مشاعرہ '' بھی ہے —

فاضل مولف نے عمدہ اور معیاری کلام انتخاب کیا ہے ' اور حواشی پر جگہ جگہ مشکل لفظوں ' محاوروں اور تلمیحوں کی تشریح و تفصیل بھی کردی ہے- انتخابی غزلوں اور نظموں کے عنوانوں کے ساتھہ ھی ہر غزل اور ہر نظم کا وزن عروضی بھی لکھہ دیا ہے - ایک علحدہ باب میں عروض' بیان اور بدایع کی ابتدائی اور ضروری معلومات بھی درج کردی ھیں- ہر شاعر کے مختصر سوانح اور اس کے کلام کی خصوصیات بھی بیان کی ھیں —

یہ معلوم نہ ھوسکا کہ مولف نے یہ انتخاب کس جماعت کے لئے کیا اور اس میں صرف تین شاعروں کو کیوں لیا ؟ نظم کے اس انتخاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے طویل نثری مضمون کے اضافہ کی کوئی معقول ضرورت سمجھہ میں نہیں آئی - لایق مولف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ " یہی نصاب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں پڑھایا جاتا ہے '' ھمارے علم میں یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کے کسی امتحان میں شامل نہیں —

فاضل مولف نے نہایت قابلیت سے متروک و مشکل الفاظ و محاورات کے معانی و مطالب کو واضح کیا ہے اور طلبہ کے استفادہ کو ہر جگہ مد نظر رکھا ہے لیکن کہیں کہیں ان سے لغزشیں ھوگئی ھیں جن کا ایک کھلا مشق لعیب

شاعر اور استاد سے سرزد ہونا تعجب سے خالی نہیں۔ مثلاً "ندان" کے متعلق فاضل مولف کی تحقیق یہ ہے کہ "ناداں کا مخفف۔ پرانی زبان ہے اب نہیں بولتے" میر کا شعر ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:—

ہستی مری کہ ہیچ تھی' میں منفعل رہا
اس شرم سے ندان زمین میں سما گیا

ندان ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بالآخر' انجام کار کے ہیں' اسی طرح "چسنا" کے متعلق لکھا ہے "چسلنا غالباً چسپاں ہونے سے مراد ہے اب یہ لفظ نہیں بولتے"۔ میر کا شعر ہے:—

چولے ہیں مرزئے' پھٹتی ہے کہنی' چسے ہے چولی' پھنسے ہے سہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا

چسنا بھی ہندی زبان کا فعل ہے جس کے معنی کپڑے کا تنگ اور بوسیدہ ہونے کے سبب پھٹنا اور چاک ہونا وغیرہ ہیں—

(ج)

گلدستۂ محاورات

مولفہ مولوی عابد حسن خاں صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول متھی گنج الہ آباد چھوٹی تقطیع صفحات ۲۲۴۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ— محمد بقا خاں ۲۳۴ رانی منڈی الہ آباد

یہ اُردو زبان کے تقریباً دو ہزار محاوروں کا مجموعہ ہے جس کو لائق مولف نے طلبہ اور نیز عام طالبان زبان کے لئے مرتب کیا ہے۔ فن لغت نویسی ہمارے ہاں ابھی بہت ابتدائی حالت میں ہے۔ اس فن کے اصول و ضوابط سے بہت شاذ لوگ واقف ہیں۔ مروج و متداول لغات کے مشہور مولفین بھی اس کوچے سے نا آشنا ہیں۔ محاورات کے اس مجموعہ میں فنی ناواقفیت کے آثار جا بجا پائے جاتے ہیں—

لائق مولف نے اپنی کتاب کے لئے جو مواد جمع کیا ہے وہ مستند ادب کے راست مطالعہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ مشہور مروجہ لغات سے۔ یہی وجہ

ہے کہ مروجہ لغات میں جو لغزشیں اور فروگذاشتیں ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ پہلے تو محاورات کے معنی و مفہوم کے مختلف پہلو ظاہر کرنے کے لیے اس میں اساتذہ کے کلام کی بہت کم اسناد ہیں یعنی ہر محاورہ کے لیے صرف ایک سند ہے، کسی محاورہ کے ایک سے زیادہ مفہوم ہیں تو اس کی تشریح اس میں نہیں اور نہ کوئی سند ہے۔ محاورہ اور معمولی لفظ اور لغت میں جو فرق ہے وہ بھی مولف کی نظر میں نہیں۔ چنانچہ آب، اجارہ، سادہ، شورہ پشت جیسے مفرد (یا مرکب بمنزلہ مفرد) الفاظ کو بھی وہ محاورے سمجھتے ہیں "محاورہ تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جاتا ہے" محاوروں کے اصلی اور ذیلی و ضمنی الفاظ میں بھی لائق مولف فرق نہیں کرتے۔ وہ ذیلی لفظوں کے تحت اصل محاوروں کو لکھتے ہیں، مثلاً وعدہ پر جینا، آرزو ٹپکنا، آبرو سے ہاتھ اُٹھانا، آبرو سے ہاتھ دھونا وغیرہ، ان میں وعدہ، آرزو اور آبرو خاص الفاظ نہیں کہ جن سے محاورے بنے ہیں، بلکہ جینا، ٹپکنا، ہاتھ اُٹھانا، ہاتھ دھونا اصل الفاظ ہیں۔ ان کے ساتھ مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ کسی لفظ کی تخصیص نہیں۔ اسی لیے ان کے تحت محاورات درج ہونے چاہئیں —

بعض محاورات کے مقررہ الفاظ سے بھی مولف نا واقف معلوم ہوتے ہیں، مثلاً "اشک پینا" کو وہ محاورہ سمجھتے ہیں، حالانکہ صحیح اور زیادہ مستعمل آنسو پینا ہے۔ اسی طرح "ایک حمام کے سب ننگے" میں "کے" کی بجائے "میں" چاہئے جن۔ محاوروں کے لیے مولف سند پیش کرتے ہیں دراصل وہ محاورہ اس میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً ترنگ اُٹھنا ایک محاورہ لکھا ہے اور سند میں مولانا حالی کا شعر پیش کیا ہے جس میں لفظ ترنگ مفرد ہے اور بطور اسم استعمال ہوا ہے:—

زہد و اطاعت پر جوانوں کی نہ جاو
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

اسی طرح "تر دامن ہونا" کی سند ملاحظہ ہو۔ 'درد'

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اگر مولف اساتذہ کے کلام کا راست مطالعہ کرتے تو معقول اور موزوں اسناد

مل جاتیں - اسی طرح اگر نثر کے مستند اور معتبر ذخیرہ کی چھان بین کرتے تو مناسب و بر محل فقرے بھی مل جاتے اور مولف خود تصنیف کرنے کی زحمت سے بچ جاتے - مطالعہ نہ کرنے کے اس قصور اور نقص سے محاورات بھی زیادہ نہ مل سکے - اور اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ محاورات کے مختلف معنی و مفہوم کے مختلف پہلوؤں پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے - کہیں کہیں محاوروں کے معانی و مطالب سمجھانے میں غلطیاں نظر آتی ہیں مثلاً آڑے ہاتھوں لینا کے معنی ذلیل کرنے کے لکھے ہیں حالانکہ اس کے معنی الجھنا ' قائل کرنا ' منوانا اور برا بھلا کہنے کے ہیں - اسی طرح واسطہ دینا کے معنی تعلق دینا کے لکھے ہیں جو بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہیں اس کے صاف اور صریح معنی شفیع گرداننے ' دہائی دینے کے ہیں - " صحبت گرم ہونا " کے معنی " دیر تک بیٹھنا " لکھے ہیں اس کے معنی مل بیٹھنا ' پر خلوص احباب کا جلسہ ہونا وغیرہ ہیں —

بے شبہ مولف نے بڑی محنت کی اور ہر محاورہ کو سمجھانے کے لیے فقرے تصنیف کئے- جگہہ جگہہ محاوروں کا استعمال دکھانے کے لئے شعر بھی کہہ کر درج کئے - اگر یہ محنت وہ اساتذہ کے کلام اور نثری کتابوں کے مطالعہ میں اٹھاتے تو ان کو زیادہ ذخیرہ دستیاب ہو جاتا - محاوروں کے معانی کے مختلف فروق نظر میں آجاتے اور مستند و معتبر اسناد مل جاتیں ' مولف ایسی جملے اور فقرے گھڑنے اور وضع کرنے کی زحمت سے بچ جاتے اور یہ اعتراض بھی اٹھہ جاتا کہ مولف موزوں و مناسب فقرے اور جملے وضع نہ کرسکے - لیکن مولف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ توقف نہیں کرسکتے تھے - وہ جلد سے جلد اس کتاب کو شائقین کے ہاتھوں تک پہنچانے کے لئے بیتاب تھے " الحمدللہ کہ اس ہیچمداں کی حسرت دیرینہ جو شدت ضرورت کی بناء پر ہر وقت دل میں چٹکیاں لیا کرتی تھی آج پوری ہوئی اور یہ چند اوراق کا مجموعہ کتاب کی صورت میں شائقین زبان کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے " —

کتاب شایع ہوچکی ہے مولف کی بے تابی بھی دور ہوگئی ہوگی - اب ہمارا مشورہ ہے کہ آیندہ اس کی دوبارہ طباعت کی نوبت آے تو لایق مولف

زیادہ محنت اور ضبط و تحمل سے کام لیں اور اپنی کتاب کو زیادہ معتبر و مفید بنائیں —

(چ)

ارسی

مصنفہ مولوی نثار حسین خاں 'شید' الہ آبادی
درمیانی تقطیع؛ صفحات ۳۲۰ لکھائی چھپائی
اوسط درجے کی، قیمت مجلد دو روپے ملنے کا پتہ:—
مقبول حسین خان دریا باد۔ الہ آباد —

یہ ریختی کا دیوان ہے اس میں غزلوں کے علاوہ سلام اور "قصیدیاں" (قصائد) بھی ہیں۔ یہ دیوان دراصل ہندوستانی مسلمان عورتوں کی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں عورتوں کے خیالات، عقائد اور جذبات کو عورتوں ہی کی زبان میں ادا کیا گیا ہے۔ اس میں نسوانی زندگی کے ہر پہلو پر اشعار

یہی حال نسوانی لطیف جذبات کا ہے کہ ان کے اظہار میں مہارت کام نہیں دے سکتے۔ شاعر نے نسوانی فطرت کے مختلف پہلو پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس کی گہرائیوں تک رسائی نہ ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ تصنع کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور کہیں کہیں بیان نے عریانی اختیار کرلی ہے۔ شاعر نے سلام اور قصیدے بھی ریختی ہی میں لکھے ہیں، یہ کہنہ مشق ہیں، ان کے کلام میں پختگی ہے۔ زبان اور بیان بھی ناموزوں نہیں —

(چ)

زندگی

(مصنفہ حضرت ملا رموزی ' چھوٹی تقطیع صفحات علاوہ مقدمہ
۳۱۲ قیمت دو روپے - ملنے کا پتہ :- غلام دستگیر تاجر کتب
چار کمان حیدر آباد دکن)

یہ حضرت ملا رموزی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے اس میں مختلف سولہ مضمون ہیں - ملا رموزی ہمارے کسی تعارف کے محتاج نہیں - ملک کے ادنیٰ و اعلیٰ رسایل و جرایدہ میں ان کے مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں - وہ زیادہ تر مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں جن کو رسالوں کے قارئین پڑھتے اور پسند کرتے ہیں - لطیف مزاح اور شگفتہ ظرافت کی ہمارے ادب میں کمی ہے ' خوشی کی بات ہے کہ بعض انشا پرداز اس کی طرف بطور خاص متوجہ ہیں ان میں ملا صاحب زیادہ پیش پیش ہیں -

لطیف ظرافت اور مزاح کے اساسی عناصر تخیل کی پرواز اور زبان و بیان کی شگفتگی پر ہے ' کوئی تحریر ظرافت کی تعریف میں داخل نہیں ہو سکتی جس میں تخیل کی رنگ آمیزیاں نہ ہوں اور خیالات کو شگفتہ زبان و بیان میں ادا نہ کیا گیا ہو ' تخیل کی کرشمہ سازیاں ' زبان کی لطافت و شگفتگی اور اسلوب بیان کی سلاست و پختگی سب بیکار ہیں اگر ان کے پردے میں کوئی خاص بات نہ ہو ' ظرافت کی غرض و غایت یہ ہے کہ کوئی حکیمانہ نکتہ بیان کیا جائے یا کسی عام اخلاقی صداقت پر زور دیا جائے یا کسی اخلاقی ' معاشرتی یا سیاسی خرابی اور عیوب کی پردہ دری کی جائے - اگر ظریفانہ تحریر اس جوہر سے عاری ہے تو وہ انشاپردازانہ ہرزہ سرائی اور بکواس ہے - ظرافت نگار انشا پرداز یا شاعر میں ایک حکیم ' مصلح اور اخلاقی معلم کی شان ہوتی ہے - وہ اپنی تخیل آرائی کی بھول بھلیاں میں قاری کو گم کردیتا ہے اور اپنے زبان و بیان کی لطافت و رنگینی سے بہلاتا ہے اور آخر کار ایک ایسے مقام پر لے جاتا ہے جہاں تلخ نصیحت شیریں ' گوارا اور موثر ہو جاتی ہے ' عیوب کی پردہ دری پر عبرت کی آنکھ پڑتی ہے اور اخلاقی و معاشرتی خرابیوں کا احساس ہوتا ہے ' دل میں ان کی طرف سے نفرت و بیزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں-

جس ظرافت نگار میں یہ جادو نہ ہو وہ نقال اور بھانڈ ہے جو تمسخر و تضحیک سے اوروں کا دل بہلانا چاہتا ہے ' بے فکرے عوام ایسی چیزوں کو شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اپنا وقت کاٹتے ہیں خوش و شایستہ مذاق ان سے بچتے اور پناہ مانگتے ہیں —

حضرت ملا رموزی کی تحریروں کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان کی زبان پاک صاف ہے ' اسلوب بیان مسلسل و مربوط اور سلیس و پختہ ہے - تخیل کی بلند پروازیاں ان کی تحریروں میں ایک حد تک ضرور حاضر ہیں لیکن اس کی تلافی انھوں نے تفصیلات و جزئیات کے بیان سے کی ہے ' اب رہی ظرافت کی غرض و غایت تو اس کے متعلق خود انھوں نے لکھا ہے —

" ملا رموزی نے .... طے کرلیا کہ ان (ہندوستانی) غلامی کے مارے ہوؤں اور غلط تعلیم و تربیت کے ستائے ہوؤں کی اخلاقی اور داخلی اصلاح جب تک نہ ہوگی ان کے فرشتے بھی دنیا میں کامیاب نہ ہوں گے - بس ایسے اب اس نے خطاب و کلام کا وہ طرز اختیار کیا ہے جسے سلیس اور مروجہ اردو کہتے ہیں .... پس اب جو اس طرز تحریر کو اختیار کیا تو ہندوستانیوں کی اخلاقی اجتماعی اور داخلی زندگی کے عجب عجب تجربے اسے حاصل ہوئے " —

یہ مشتبہ ہے کہ جن عظیم‌الشان مقاصد کو انھوں نے اپنی ظرافت نگاری کا موضوع قرار دیا ہے وہ کس حد تک پورے ہوتے ہیں - اس باب میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے - ابھی وقت نہیں آیا کہ زمانہ ان کی ادبی قسمت کا فیصلہ کرے —

(چ)

تاریخ و سیر

تذکرۃ الکرام

(جلد ثانی تاریخ امروھہ - مولفہ جناب محمود احمد عباسی صاحب ضخامت ۴۳۲ صفحے قیمت قسم اول مجلد پانچ روپے ' قسم اول چار روپے ' قسم دوم چار روپے - ملنے کا پتہ سعید احمد عباسی صاحب دیوان منزل - امروھہ)

تحقیق الانساب

(جلد چہارم تاریخ امروھہ - صفحات ۳۱۲ قیمت دو روپے آٹھ آنے)

مولوی محمود احمد عباسی صاحب نے اپنے وطن امروھہ کی مکمل تاریخ چار ضخیم جلدوں میں تالیف کی ہے - پہلی جلد اس سے قبل مدت ہوی شایع ہوچکی ہے - دوسری اور چوتھی جلد حال میں شایع ہوئی ہے اور تیسری جلد بھی مکمل تیار اور غالباً زیر طبع ہے —

اس تاریخ کے لکھنے میں قابل مولف نے صرف مطبوعہ اور قلمی تاریخوں ہی تک اپنی تحقیق کو محدود نہیں رکھا بلکہ قدیم فرامین ' مکتوبات اور اسی قسم کے دوسرے ماخذوں کی بھی نہایت کاوش اور کوشش سے تلاش کی ہے - کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فن تاریخ سے خاص لگاو ہے اور اس میں ان کی نظر بہت وسیع ہے —

انساب کا معاملہ بہت ٹیڑھا ہے اور اس رستے میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے - ہندوستان کے مسلمانوں نے اس معاملے میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور ہر مسلمان اپنے آپ کو عرب و شام ' افغانستان

و ایران، سمرقند بخارا سے منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے - اسلام نے جن بدعات اور توہمات کو مٹایا تھا ان میں نسبی تفاخر بھی تھا - ہندوستان میں ذات پات کے رواج اور سختی نے مسلمانوں میں بھی گھر کر لیا - شرافت نسبی اب ایک علمی اور سائنس کا مسئلہ ہوگیا ہے - یہ بحث بہت طویل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں جسے شرافت نہ ہو تو شرافت نسبی بھی کام نہیں آتی -

فاضل مولف نے نہایت دلیری سے اور بغیر رو رعایت کے امروہہ کی مختلف اقوام اور جماعتوں کے انساب کی تحقیق کی ہے اور جہاں تک موجودہ وسائل اور ذرائع کے رو سے تاریخی تحقیق ممکن تھی، اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - اگرچہ بعض مقامات پر قابل مولف کے قلم سے ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جو بعض افراد یا فرقوں کی دل شکنی کا باعث ہونگے، لیکن انھوں نے کہیں مورخانہ تحقیق کے اصول سے قدم باہر نہیں رکھا - یہی وجہ ہے بعض اصحاب بہت برہم ہوے اور نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی - اگرچہ بظاہر تحقیق الانساب کا تعلق صرف امروہہ سے ہے لیکن فی الحقیقت یہ کتاب ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے متعلق ہے کیوں کہ اکثر یہی اقوام اور فرقے ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی آباد ہیں - گو کہیں کہیں بعض غیر متعلق بحثیں آگئی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے حدود میں تاریخی خزانہ اور تاریخی تحقیق کا نمونہ ہے اور بہت دل چسپ بھی ہے -

دوسری جلد یعنی تذکرۃ الکرام میں امروہہ کے مشائخ و علما اور صوفیا کے حالات درج ہیں - جہاں تک تاریخ اور تحقیق نے یاری کی قابل مولف نے سالہا سال کی جستجو سے ان بزرگوں کے حالات بہم پہنچائے ہیں - اس پر بھی جو بعض بزرگوں کے صحیح حالات دستیاب نہیں ہوے اس میں مولف کا قصور نہیں - اس کتاب کا بھی تعلق اگرچہ امروہہ کے قصبے سے ہے لیکن ان میں بھی بعض بزرگ ایسے ہیں جو اب بھی سارے ہندوستان پر چھائے ہوے ہیں اور ان کا سلسلہ اب تک جاری ہے - حالات کے ضمن میں بعض کارآمد تاریخی باتیں بھی آگئی ہیں -

مولوی محمود احمد عباسی صاحب کا یہ کام بہت قابل قدر اور لائق تحسین ہے -

یوم عزا

(مولفہ مولوی سید راحت حسین صاحب ، بی ۔ ایل ۔ صدرالتالیف
چوہیرہ ۔ قیمت چار آنے)

اس رسالے میں قابل مولف نے نہایت تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ شہادت امام حسین کا دن ہر سال ۱۳ اکتوبر کو پڑتا ہے اور اس بنا پر ان کی یہ تحریک ہے کہ یوم عزا اسی تاریخ کو منایا جاے ۔ قمری حساب سے جو یوم شہادت آج کل قرار دیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ۔ قابل مولف نے اس مسئلے پر محققانہ بحث کی ہے ۔ جن حضرات کو اس مسئلے سے دلچسپی ہو وہ اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں ۔

متفرق

پانصد در نادر (یا بزرگوں کی باتیں)

(مرتبہ جناب مولوی محمد حسین خاں صاحب بی ۔ اے ، سابق
رئوس تدریسیات افغانستان جالندھر)

جیسا کہ خود فاضل مرتب نے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ اس " چھوٹی سی کتاب میں ایسے بڑے بڑے اشخاص کے اقوال درج ہوے ہیں جن کی بزرگی ، ولایت ، علم و فضل اور رہنمائی کا درجہ مسلم ہے " اس میں ذرا شبہہ نہیں اس کتاب کے مطالعے سے بعض ایسے ایسے نکات معلوم ہوتے ہیں جو عمر بھر کے تجربے اور ریاضت کا نتیجہ ہیں ۔ اس کا مطالعہ حسن اخلاق اور معاملات و معاشرت کی سچی رہنمائی کرتا ہے ۔ جو لوگ سچی باتوں کی تلاش میں ہیں اسے ضرور پڑھیں ۔

تجدید عمل

(از مرزا عسکری علی خاں صاحب حجازی اُردو بک
سٹال - بیرون لاہوری دروازہ - لاہور - قیمت آٹھ آنے)

یہ رسالہ " اینٹی ریلجس سوسائٹی " کی جانب سے شایع ہوا ہے اور اس کے مولف مرزا عسکری علی خاں صاحب ہیں - اس سوسائٹی کے مقاصد یہ ہیں۔ ذہن کو توہمات کی تاریکی سے نکال کر روشن دنیا میں لانا - مقلدوں کو محقق بنانا اور ہماری سوشل زندگی میں ہم رنگی پیدا کرنا ۔

مرزا صاحب اپنے کو " ریشنلسٹ " کہتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے تمام مذاہب اور توہمات پر بحث کی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی زندگی زمانے کے ساتھ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اس لیے ہمارا جادۂ عمل (مذہب) جو پرانی زندگیوں کے لیے بنایا گیا تھا' اب قابل عمل نہیں رہا - وہ نہ خدا کے قائل ہیں اور نہ خدا کی کسی کتاب کے۔ اور تمام مذاہب اور ان کی کتابوں کو انسان ہی کا کام سمجھتے ہیں - یہ بانیان مذہب کی شخصیت یا قوت ارادی تھی جس نے عوام پر اثر کیا اور مذہب کے قائم کرنے اور جاری رکھنے میں مدد دی ۔

اُن کا خیال ہے کہ " ضروریات اور امزجہ کے اختلاف کی بنا پر جس طرح ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے ایک ہی قسم کا قانون کارگر نہیں ہوسکتا اُسی طرح ایک ہی مذہب بھی' ہر زمانے یا ہر قوم کے لیے مفاد بخش نہیں ہوسکتا - اور اس میں ہر لحظہ تغیر کی ضرورت ہے " - اس خیال کی بنا پر انہوں نے مذہب کے بعض خاص اجزا پر عقلیت کی روشنی میں تنقید کی ہے اور انہیں توہمات یا رسوم سے تعبیر کیا ہے جو قابل تقلید نہیں ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مذاہب میں رسوم و توہمات اس قدر داخل ہوگئے ہیں کہ انہوں نے اصل کو مسخ کردیا اور عوام انہیں کو اصل مذہب خیال کرتے ہیں اس لیے ضرور ہے کہ سچائی کے ساتھ ان کو جانچا اور پرکھا جائے - تودہیں اور تاویلیں فضول ہیں ۔

مرزا اچھے ادیب اور شاعر ہیں اور صاحب فکر بھی ہیں - انہوں نے ایک مدت کے غور و فکر کے بعد اپنے خیالات کو عام طور پر شایع کیا ہے اور ان

میں ریا و نمود کا شائبہ نہیں پایا جاتا ۔ جس بات کے سچ ہونے پر انہیں یقین ہے اُسے انہوں نے بلا تامل ظاہر کردیا ہے ' اُن کی یہ جرأت قابل تعریف ہے ۔ اور جس نیک نیتی کے ساتھہ انہوں نے مذاہب کی تنقید کی ہے اُن کے خیالات کی تنقید بھی اُسی نہج سے ہونی چاہئے —

مرزا صاحب لکھنؤ کے معزز طبقہ اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں قیام اختیار کرلیا ہے جہاں لوگ علم و ہنر کے ساتھہ نئی تجویزوں اور جدید تحریکات کے بھی بہت شایق ہیں ۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ تحریک بھی ایک جدید مذہب کی صورت اختیار نہ کرلے اور گزشتہ آفات کے ساتھہ ایک اور آفت کا اضافہ نہ ہوجائے —

اُردو کے جدید رسالے

ترجمان

(مدیر غلام ربانی صاحب لودھی

صاحم ' ضلع ہزارہ سالانہ چندہ دو روپے)

یہ ماہانہ رسالہ (علمی ' ادبی و مذہبی) سرائے صالح ' ضلع ہزارہ سے شایع ہوا ہے ۔ اس میں اوسط درجے کے علمی مذہبی اور تاریخی مضامین ہیں ۔ اُن اصلاح کے لیے گنجایش ہے اور کوشش اور محنت سے زیادہ بہتر ہوسکتا ہے —

ترجمان القرآن

(مرتب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ۔

حیدر آباد دکن سالانہ قیمت پانچ روپے)

مولوی ابو محمد صاحب مصلح نے اپنی زندگی کا مقصد تعلیم قرآن کی اشاعت قرار دیا ہے ۔ پہلے یہ رسالہ انہیں کی ادارت میں شایع ہوا تھا ۔ یہ رسالہ

قرآن پاک اور دوسرے اسلامی مسائل کے لیے وقف ہے۔ اب اس رسالے کا بہتر اہتمام ہوگیا ہے —

شمس الحکمت

(اڈیٹر حکیم ڈاکٹر سید محمد اکبر علی صاحب
صادق زیدی لاهور۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ رسالہ شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی مرحوم کی یادگار میں شائع ہوا ہے اور حکیموں اور ڈاکٹروں کی ایک مجلس کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ اس میں علاوہ طبی مضامین کے مجربات وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ اور طب اور حفظان صحت کے متعلق مفید معلومات بھی درج کیے جاتے ہیں —

مشہور جرمن فلسفی شاعر اور حکیم حیات

جان وولف گانگ گوئٹے

کا مشہور ناول ''ورتھر کی داستان غم،، شائع ہوگیا۔ اس میں گوئٹے نے شباب کی رومانی کیفیات کی نفسی تصویر نہایت دلکش پیرایہ میں پیش کی ہے۔ سارا قصہ واردات شباب کی ایک دلچسپ داستان ہے۔ قیمت غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ مجلد دو روپے۔

مترجمہ ریاض الحسن ایم اے

ملنے کا پتہ لٹریری سنڈیکیٹ نمبر ۱ - بیلی روڈ - الہ آباد۔

یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

کتاب	قیمت
دیانت	دو آنے
کیمیا گر	ایک روپیہ
اسلامی عقاید	ایک آنہ چھ پائی
بچوں کا قاعدہ	چار آنے
رہنمائے قاعدہ	تین آنے
سیرت محمد علی	تین روپیہ
صید زبوں	دس آنے
اچھی باتیں	چار آنے
دنیا کے بسنے والے	چھ آنے
سرکار دوعالم	آٹھ آنے
معذرت	چار آنے
بچوں کا انصاف	چار آنے
میلادالنبی پروجکٹ	آٹھ آنے
ہمزاد	چھ آنے
گناہ کی دیوار	آٹھ آنے
مشق خوشخطی	دو آنے
تاریخ سلاطین آل عثمان	ایک روپیہ بارہ آنے

کتاب	قیمت
الخلافۃ	دو روپے چھ آنے

(الناظر بک ایجنسی لکھنؤ)

کتاب	قیمت
شکوہ	دو آنے
جواب شکوہ	چار آنے
مثنوی امید و بیم	چار آنے
مثنوی صبح امید	چار آنے
زود پشیماں	آٹھ آنے
انتخاب نقیب	چھ آنے
اسلامی کتب خانے	چار آنے
تصویر درد	چار آنے
ہوم رول	پانچ آنے
شمع و شاعر	دو آنے
حب وطن	ایک آنہ
اسلامی مدارس	چار آنے
بلال	ایک آنہ
تذکرۂ حزیں	چار آنے
مولانا شبلی	دس آنے
اسلام	دو آنے

ننگ خدمت	ایک آنہ
ترقی زبان	چار آنے
سفر سعادت	ایک روپیہ چار آنے
میکفرن اور لوسی	دو آنے
طالب علم کی زندگی کا کیا مقصد ہونا چاہیے	تین آنے
جہانگیر	دو آنے
زیب النسا بیگم	ایک آنہ
جمیل و بثینہ	تین آنے
گائے کا گوشت	چار آنے
تقریر نواب ذوالقدر جنگ بہادر	دو آنے
قواعد المنتخب	چار آنے

(نظامی پریس بدایوں)

خطوط سر سید	تین روپے
لیتھو گرافی	دو روپے آٹھ آنے
دیوان غالب مع شرح	دو روپے آٹھ آنے
دیوان غالب اردو	ایک روپیہ آٹھ آنے

(ہندوستانی ایکڈیمی یوپی الہ آباد)

عالم حیوانی	چھ روپے آٹھ آنے
معاشیات : مقصد اور منہاج	ایک روپیہ
فلسفۂ نفس	ایک روپیہ

(مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب)

تاریخ امریکہ	دو روپے

منشی رام پرشاد بی ۔ اے

ابتدائی تعلیم کی رام کہانی	ایک روپیہ چار آنے
وہ جاندار جو نظر نہیں آتے	چار آنے
ہنود تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت	نو آنے

پروفیسر منہاج الدین ایم ایس سی پشاور

ریڈیو۔ یعنی بے تار پیام رسانی مجلد — تین روپے بارہ آنے

(دار المصنفین اعظم گڑھ)

افادات مہدی	تین روپے آٹھ آنے
سیرۃ النبی حصہ چہارم	چھ روپے

مطبوعہ اعظم پریس چار مینار حیدرآباد

شرح اردو ریڈر نمبر اول	دو آنے
شرح اردو ریڈر نمبر دوم	تین آنے
شرح اردو ریڈر نمبر سوم	چار آنے
شرح اردو ریڈر نمبر چہارم	پانچ آنے
[illegible]	[illegible]
شرح اردو ریڈر نمبر ششم	دس آنے
شرح اردو ریڈر نمبر ہفتم	بارہ آنے

حفظ صحت و انتظام خانہ داری	آٹھ آنے
سفر نامہ مظہری	دو روپے آٹھ آنے
عقوبت گناہ	چار آنے
ظہیر تاریابی	چار آنے
سوانح احمدی	ایک روپیہ آٹھ آنے

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا -

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی - حجم کم از کم ایک سو صفحے ہوگا -

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) -

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی - اے ' آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے -

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن ترقی اردو پریس ' اُردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولا
اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں ا
پہلوؤں پر بحث ہوگی - حجم کم از کم ایک سو صفحے ہوگا —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریز
(مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ' آنریری سکریٹر
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے -

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن ترقی اردو پریس ' اردو باغ
اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

انجمن ترقی اردو کا ماہی رسالہ

درنگ آباد (دکن)

اردو

جلد ۱۳ — [illegible] — حصہ ۵۱

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

مرحوم دهلی کالج

(۲)

(از ' ادیٹر)

نصاب تعلیم

کالج کی ابتدائی تنظیم سنہ ۱۸۲۵ء میں ہوئی اور جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں شروع شروع میں فارسی عربی کی تعلیم ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ سنسکرت کا شعبہ بھی تھا ' حساب اور مبادیات اقلیدس بھی پڑھا دیتے تھے - اس وقت ان مضامین کی تعلیم معمولی تھی ' رفتہ رفتہ نصاب کی تکمیل اور تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ ہوئی - انگریزی جماعت کا اضافہ سنہ ۱۸۲۸ء میں ہوا اور ۱۸۲۹ء کے سالانہ امتحان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکوں نے انگریزی خواندگی میں معقول ترقی کی ہے ' گریمر سے خوب واقف ہیں اور تاریخ انگلستان میں بھی ان کی قابلیت بہت اچھی ہے —

سنہ ۱۸۳۱ء میں جب لارڈ بنٹنگ نے کالج کا معائنہ کیا اور مسٹر میکناٹن نے امتحان لیا تو عربی فارسی کی تعلیم ناقص ہی نہیں پائی گئی بلکہ کم درجے کی بھی تھی - مسٹر ٹامسن نے بھی جو اورنٹیل کالجوں کے وزیٹر تھے اپنی معائنہ کی رپوٹ سنہ ۱۸۴۱ - ۴۲ء میں یہی

مرحوم دهلی کالج

(۲)

(از ' اڈیٹر)

نصاب تعلیم

کالج کی ابتدائی تنظیم سنہ ۱۸۲۵ ء میں ہوئی اور جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں شروع شروع میں فارسی عربی کی تعلیم ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ سنسکرت کا شعبہ بھی تھا ' حساب اور مبادیات اقلیدس بھی پڑھائے جاتے تھے - اس وقت ان مضامین کی تعلیم معمولی تھی ' رفتہ رفتہ نصاب کی تکمیل اور تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ ہوئی - انگریزی جماعت کا اضافہ سنہ ۱۸۲۸ ء میں ہوا اور ۱۸۲۹ ء کے سالانہ امتحان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکوں نے انگریزی خوانگی میں معقول ترقی کی ہے ' گریمر سے خوب واقف ہیں اور تاریخ انگلستان میں بھی ان کی قابلیت بہت اچھی ہے —

سنہ ۱۸۳۱ ء میں جب لارڈ بنٹنگ نے کالج کا معائنہ کیا اور مسٹر میکناٹن نے امتحان لیا تو عربی فارسی کی تعلیم ناقص ہی نہیں پائی گئی بلکہ کم درجے کی بھی تھی - مسٹر ٹامسن نے بھی جو اورنٹیل کالجوں کے وزیٹر تھے اپنی معائنہ کی رپوٹ سنہ ۴۲ - ۱۸۴۱ ء میں یہی

شکایت کی ھے - اس کے بعد سے نصاب میں مزید اصلاح شروع ھوئی —

سنہ ۱۸۳۹ ع کے شروع میں انگریزی کی اعلی جماعت ملٹن کی Paradise Last اور پریکٹکل ریڈر پڑھتی تھی - اس کے علاوہ گورمنٹ نے سفارش کی کہ رابرٹسن کی تاریخیں بھی پڑھائی جائیں یہ کتابیں طالب علموں کے لئے بہت مناسب ھیں —

چنانچہ اس تحریک کی بنا پر ھیوم کی تاریخ انگلستان اور Gregory's Lectures on Natural Philosophy کا نصاب میں اضافہ کیا گیا - مضمون نویسی اور ترجمے پر بھی زور دیا گیا - اس کے علاوہ وہ Whewell's Mechanical Euclid اور برج کا الجبرا اور علم مثلث مستوی Plane Trignometry بھی پڑھتے تھے -

اس زمانے میں عربی کی اعلی جماعت شمس بازغہ مع حاشیۂ عبدالعلی اور مقامات حریری کا درس لیتی تھی - یہ نصاب گزشتہ سالوں کے مقابلے میں بڑھا ھوا تھا —

سنہ ۱۸۴۳ ع میں جب دونوں شعبوں کو یکجا کرنے کی تجویز ھوئی اور اس غرض سے دونوں کا امتحان لیا گیا تو اس وقت ھر دو شعبوں کا نصاب تعلیم حسب ذیل تھا :—

انگریزی شعبہ

درجہ اول :— حساب ' جیومیٹری (علم ھندسہ) ٹرگنا میٹری (علم مثلث) ' کانک سیکشن (مخروطات) الجبرک جیومیٹری (الجبری علم ھندسہ) ' پرنسپلز آف پولیٹکل اکانمی (اصول معاشیات) ' مارل فلاسفی —

درجہ دوم و سوم :— تاریخ قدیم و تاریخ روما ' حساب ' اقلیدس مقالہ اول ' Introduction to Mechanics (مبادیات مکانیک) ' گریمر ' مضمون نویسی -

جماعت چہارم میں گریمر ' حساب ' جغرافیہ اور تاریخ پڑھائی جاتی تھی -
تاریخ میں Brief Survey of History تھی —

درجہ پنجم کے طالب علم ریڈر نمبر ۴ پڑھتے تھے جغرافیہ اور کرہ کے علم سے واقفیت پیدا کرائی جاتی تھی اور روزانہ دو گھنٹے دیسی زبان کی تحصیل میں صرف کرتے تھے - حساب میں تفریق مرکب تک جانتے تھے اور انگریزی عبارت بلا تکلف پڑھ سکتے تھے —

درجہ ششم میں سائنس کی تعلیم کی ابتدا کی گئی - نیچے کی جماعتوں میں انگریزی اور اردو کی ابتدائی تعلیم هوتی تھی - هندوستانی اسباق میں حساب کے ابتدائی قاعدے ' جغرافیہ کی ابتدائی باتیں اور کرہ کے متعلق بعض مسائل شریک تھے - انگریزی فریق میں انگریزی صرف و نحو ' الفاظ کے معنی اور خوشخوانی هوتی تھی —

مشرقی شعبہ

اس شعبے کا نصاب تعلیم یہ تھا :-

عربی - مولوی مملوک علی کی جماعت (تعداد طلبہ ۱۱) —

مقامات حریری (۲۵ ویں مقام سے آخر تک) ' هدایہ کتاب‌الاقرار سے آخر تک - ریاضی ' اقلیدس کے چار مقالے —

تاریخ تیموری (اردو) تمام - رقعات ابوالفضل ' کتاب حساب کی پہلی اور دوسری فصل - براؤن کی کتاب حساب کل - جغرافیہ ' مرآۃالاقالیم (اردو) —

فریق اول ' مولوی جعفر علی (شیعہ) کی جماعت - (چھ طلبہ) - اس میں بھی نصاب کی وهی کتابیں تھیں جو اوپر کی جماعت میں لکھی گئی

ھیں - البتہ ھدایہ کی جگہ شرعۃ الاسلام کے بعض ابواب تھے —

فریق دوم - نفحۃالیمن ۱۵۲ صفحے - مختصر نفع ۲۵۰ صفحے - اقلیدس پہلا

مقالہ اور دوسرے کی سات شکلیں - براؤن کی حساب کی کتاب (اردو) ‘

جغرافیہ ‘ مرأۃالاقالیم - شرح مُلا ‘ انشاے ابوالفضل جلد اول —

مولوی سید محمد کی جماعت (۸ طلبہ) -

میر قطبی ‘ الف لیلہ ‘ پہلی جلد اکتیسویں شب سے ۲۰۰ ویں شب تک - نفحۃالیمن ‘ دوسرے باب سے آخر تک - اصول شاشی تمام - ھدایۃالحکمۃ تمام - شرح وقایہ کتاب الزکواۃ سے آخر تک (جلد اول) - مقامات حریری ‘ ۱۵ مقامات - اقلیدس ‘ پہلے دو مقالے (اردو) - براؤن کی کتاب حساب کسور عام تک - میبذی شروع سے تعلیقات تک - جغرافیۂ ھندوستان - مرأۃالاقالیم —

مولوی سعید الدین کی جماعت (طلبہ ۱۰)

کافیہ کُل - شرح مُلا - قدوری - الف لیلہ کی پہلی جلد - مرقاۃ - قال اقول - براؤن کی کتاب حساب - شرح وقایہ ‘ کتاب الطلاق تک - نفحۃالیمن مناظرۂ نرجس تک - ابوالفضل باب اول و دوم - جغرافیہ - جیومیٹری (علم ھندسہ) —

فارسی ‘ درجہ اول -

عربی میں شرح مُلا تا معمولات ‘ صرف میر ‘ دستورالمبتدی ‘ نحومیر ‘ مائۃ عامل ‘ شرح مائۃ عامل ‘ ھدایت النحو —

فارسی میں طاھر وحید ‘ مینا بازار ‘ پنج رقعۂ ظھوری —

براؤن کی کتاب حساب تا کسور عام ‘ جیومیٹری میں اقلیدس کا پہلا مقالہ - جغرافیہ —

سنہ ۱۸۴۵ ع سے پرنسپلی کی خدمت پر ڈاکٹر اسپرنگر کا تقرر

ھوا - یہ عربی سے واقف تھے اور انھیں مشرقی نصاب تعلیم کی اصلاح کا خاص خیال تھا - ان کو اس امر کی شکایت تھی کہ مولوی صاحبان پر تکلف اور مسجع اور مقفیٰ طرز تحریر کے دلدادہ ھیں اور متاخرین کے کلام کو پسند کرتے ھیں جس کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا ھے اور یہی وجہ ھے کہ فارسی جماعتوں کی تعلیم ناقص ھے —

عربی کے شعبے میں بھی انھوں نے اصلاح کرنی شروع کی - ھمارے قدیم مدارس میں ادب کی تعلیم بہت کم یا بالکل نہیں ھوتی تھی - ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف توجہ کی - چونکہ ھندوستان میں عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ھوتی تھیں اور لوگ ان سے واقف نہ تھے' اس لئے انھوں نے بعض کتابیں یورپ سے منگائیں - اتنی کتابیں نہ تھیں کہ سب طلبہ کو دی جاسکیں اس لئے کتابیں لکھائی جاتی تھیں - اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کو شعبۂ مشرقی کے نصاب میں شریک کیا اور بہت سی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں - بعض اوقات یہ ھوتا تھا کہ جس قدر حصہ ترجمہ کا چھپ چکا ھے اسی قدر نصاب میں شریک کردیا جاتا تھا —

سنہ ۱۸۴۵ ع اور اس کے بعد کا نصاب تعلیم جو ذیل میں درج کیا جاتا ھے' اُس سے معلوم ھوگا کہ کیا کیا تبدیلیاں عمل میں آئیں —

یہ بھی خیال رھے کہ کالج میں سنی اور شیعوں کی تعلیم کا الگ الگ انتظام تھا - یعنی صرف مذھبی تعلیم میں فرق تھا باقی نصاب ایک ھی تھا - اب مشرقی اور انگریزی شعبوں کا نصاب الگ الگ لکھا جاتا ھے —

نصاب شعبۂ مشرقی

سنہ ۱۸۴۵ ع

عربی - درجۂ اول (سنی)-

دیوان متنبی (بعض حصے) - دُرِ مختار (بعض حصے) -

اصول و حکومت و وضع قوانین The Principles of Government & of Legislation

رهنماے ضابطۂ دیوانی مصنفۂ مارشمین ۴ باب (Marshman's Guide to the Civil Regulations) (4 Chapters)

الجبرا و علم مثلث تحلیلی مستوی (Algebra'Analytical Plane Trignometry)

هرشل کی علم هئیت (ایک حصہ) Hershol 's Astronomy (A portion)

سیرالمتقدمین (Miss Bird's Ancient History)

درجۂ اول (شیعہ) کا نصاب وهی تها جو اوپر لکها گیا هے صرف اتنا فرق تها کہ دُر مختار کی جگہ شیعوں کی دینیات کی کتاب رکهی گئی تهی —

درجۂ دوم (سنی)- تاریخ تیموری - اصول شاشی - سیرالمتقدمین - هدایہ (بعض حصے) - اصول وضع قانون The Principles of Legislation ۲۰۰ صفحے اور ریاضیات حسب نصاب درجۂ اول -

شعبۂ فارسی —

درجۂ اول - مینا بازار ' پنج رقعہ ' سہ نثر ظهوري' حسن و عشق - قصائدعرفی - نصیرا همدانی - دیوان ناصرعلی - نیچرل فلاسفی تا Pneumatics - جغرافیہ - تاریخ بنگالہ - اقلیدس گیارهویں مقالے کے آخر تک - الجبرا تا اختتام مساوات درجۂ چهارم پولیٹکل اکانمی (معاشیات) -

درجۂ دوم - انوار سهیلی باب دوم سے آخر تک - مینا بازار - شاہ نامے کے بعض

حصے۔ زلیخا ۔ انشاے خلیفہ ۔ اقلیدس پانچ مقالے ۔

نصاب سنہ ۱۸۴۷ع شعبۂ عربی

درجۂ اول —

فقہ ۔ درالمختار (کل) ۔

ادب تاریخ یمینی (کل اگر چھپ جاے) ۔ حماسۂ ابوتمام پہلا باب ۔

تاریخ ۔ جامع التواریخ ۔

سائنس ۔ علم المناظر مولفہ فلپ (Phelp) کل ۔ علم هئیت مصنفۂ هرشل ۔

احصائی تفرقات (Differential Ca!culus) کل ۔ مصنفہ رام چندر ۔

اس کے علاوہ سائنس کی وہ سب کتابیں پڑھیں جو ترجمہ هوچکی تھیں ۔

مثلاً انٹروڈکشن تو نیچرل فلاسفی ' طبیعیات مصنفۂ ارنات وغیرہ ۔

مارل سائنس ۔ پیلی (Paley) کی کتاب جہاں تک طبع هوچکی هو ۔ ڈرائنگ (نقشہ کشی) اور پیمائش (اختیاری) ۔

مضمون نویسی هفتے میں دو بار ۔

(ڈاکٹر سپرنگر نے نصاب تعلیم کی خاطر تاریخ یمینی کو ایڈٹ کیا اور جہاں تک طبع هوچکی تھی طلبہ کے مطالعہ میں آئی) ۔

درجۂ دوم : ۔

فقہ ۔ هدایہ (کل) ۔

ادب ۔ متنبی (کل) ۔ تاریخ یمینی (درجۂ اول کے ساتھ پڑھیں) ۔ باقی مضامین وهی هیں جو درجۂ اول کے لئے هیں ۔

فریق اول درجۂ دوم ۔

نحو ۔ شرح ملا (کل) ۔

منطق - شرح تہذیب (کل) -

فقه - قدوری (نصف)

ادب - کلیلہ دمنہ (۱۰۰ صفحے) -

سائنس - الجبرا (کل) - طبیعیات مصلفۂ ارنات (کل) اور مغناطیس
جہاں تک طبع ہو

جیومیٹری (علم ہندسہ) - اقلیدس کے دو مقالے -

تاریخ - Brief Survey of History حصۂ دوم کل -

ترجمه اور مضمون نویسی - ہفتے میں دو بار -

نقشه کشی اور خوشخطی - (اختیاری) -

فریق دوم درجۂ دوم -

نحو - کافیه (کل) -

صرف - سرواح الارواح (کل) -

ادب - کلیله و دمنه (۱۰۰ صفحے) -

تاریخ و جغرافیه - فریق اول کے ساتھ پڑھیں -

شعبۂ فارسی

درجۂ اول ، فریق اول - ادب - پنج رقعه (کل) - مینا بازار (کل) -
شاہنامه ۲۰۰ صفحے -

سائنس - حساب - جیومیٹری (اقلیدس ۲ مقالے) - الجبرا (نصف) -

تاریخ - Brief Survey حصه اول (کل) -

نقشه کشی یا خوش خطی ، ترجمه اور مضمون نویسی -

فریق دوم -

ادب - طاھر وحید (اصطرلاب تک) - نل دمن ۲۰۰ صفحے -

ریاضیات - پریکٹیکل جیومیٹری - باقی مضامین سائنس وھی ھیں جو فریق اول کے ھیں -

درجۂ دوم ' فریق اول

ادب - بہار دانش صفحہ ۱۲۵ سے ۳۰۰ تک سکندر نامہ ۱۰۰ صفحے -

ریاضیات - حساب (نصف آخر) - پریکٹیکل جیومٹری (عملی علم ھندسہ) اقلیدس پہلا اور دوسرا مقالہ -

جغرافیہ - نقشہ کشی اور خوش خطی -

درجۂ دوم ' فریق دوم -

ادب - یوسف زلیخا تہا - بہار دانش ۱۲۵ صفحے -

ریاضی - کتاب حساب نصف آخر -

جغرافیہ - خطاطی -

سنہ ۱۸۴۵ ع کا نصاب قریب قریب وھی تہا جو گذشتہ سال کا ' اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں البتہ سنہ ۱۸۴۹ ع میں عربی کے درجۂ اول میں توضیح' (Dynamics) حرکیات' (Analytical Geometry) علم ھندسہ تحلیلی اور تاریخ انگلستان کا اضافہ ھوا - اور ھرشیل کی کتاب علم ھئیت اور علم المناظر اور جامع التواریخ نصاب سے خارج ھوگئے - سائنس اور ریاضیات کی تعلیم انگریزی کے درجۂ اول کے ساتھ ھونے لگی - اس کے سوا اور کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ھوئی —

فارسی شعبے میں مقدمہ نیچرل فلاسفی ' میکینکس ' تاریخ حکومت مغلیہ اور لوگارتم کا اضافہ ھوا —

سنسکرت کے درجۂ اول میں باغ و بہار، آمدنامہ اور کریما اور تاریخ انگلستان (اردو) داخل نصاب ہوئیں۔ فارسی شعبے میں تاریخ انگلستان اردو اور ناگری حروف دونوں میں تھی —

سنہ ۱۸۵۰ ع کے نصاب عربی میں تاریخ ابوالفدا بھی شریک تھی۔ فارسی میں قصائد خاقانی، توقیعات کسریٰ، مینا بازار، پنج رقعہ، سہ نثر ظہوری، سکندر نامہ، ابوالفضل شریک نصاب تھے اور ہندی کی بیتال پچیسی —

سنہ ۱۸۵۳ ع کا نصاب

شعبۂ عربی

درجۂ اول، فریق اول —

۱ — درمختار ۱۰۰ صفحے —

۲ — دیوان حماسہ ص ۵۳۸ تا ص ۶۸۵۔

۳ — تاریخ یمینی ص ۲۴۲ تا ص ۳۷۶۔

۴ — مطول بحث قلت تک۔

۵ — پریم ساگر۔

درجۂ اول، فریق دوم۔

۱ — ہدایہ از باب الوکالت تا اختتام کتاب الغسل۔

۲ — نورالانوار از ص ۱۰۰ تا آخر۔

۳ — دیوان متنبی تا ردیف لام، ۲۰۰ صفحے۔

۴ — مسلم کل۔

۵ — پریم ساگر از ص ۳۰۰ تا آخر —

درجۂ دوم، فریق اول —

۱ — تاریخ تیموری از ص ۲۰۰ —

۲ - شرح وقایہ از کتاب النکات تا کتاب الوقف ۱۲۴ صفحے -

۳ - فرائض سراجی کل -

۴ - پریم ساگر از ص ۱۰۰ تا ص ۲۰۰ -

عربی کی جماعت دوم کے چار فریق اور تھے اور ان کا نصاب تدریجی تھا - دوسرے فریق میں مقامات حریری کے ۲۰ مقام ' قدوری کتاب الوقف سے آخر تک ' قطبی کے دوسرے باب سے بحث قیاس تک ۷۰ صفحے پڑھائے جاتے تھے - اس کے تیسرے فریق میں کافیہ ' مجرورات سے آخر تک ' شرح ملا بحث فعل سے آخر تک اور مقامات هندی کے پچیس مقامات - چوتھے فریق میں هدایۃالنحو کل ' کافیہ مجرورات تک ' منتخبات عربی کے دو باب تھے - پانچویں فریق میں دستور مبتدی کل ' نحومیر کل اور سرمایہ عامل کل اور منتخبات عربی کے دو باب پڑھائے جاتے تھے —

شعبۂ فارسی

درجۂ اول -

قصائد بدر چاچ کل - نصیرائے همدانی کل - وقائع نعمت خان عالی کل - پریم ساگر از صفحہ ۲۰۰ تا ۳۰۰ -

درجہ دوم -

دیوان ناصر علی کل - جواهرالحروف -

درجہ دوم - فریق اول -

ساقی نامہ ظہوری نصف اول - طاهر وحید تا اصطرلاب - عبدالواسع - پریم ساگر ص ۵۰ تا ص ۱۵۰ -

درجۂ دوم فریق دوم -

گلدستہ - سہ نثر ظهوری - قواعد فارسی - بیتال پچیسی نصف -

درجۂ سوم فریق اول -

سکندر نامۂ تا جنگ دارا - رقعات عالمگیری کل ' بیتال پچیسی ۱۲ قصے -

درجۂ سوم فریق دوم -

زلیخا نصف اول - انشاے خلیفہ نصف اول -

نصاب سائنس کلاس

سائنس کی جماعت الگ قائم ہوگئی تھی جس کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی ' اس کا نصاب بابتہ سنہ ۵۰ درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ سائنس و دیگر علوم کی تعلیم کس درجے تک تھی —

بابت سنہ ۱۸۵۰ ع

جماعت اول ۱ - احصاے تفرقات Differential Calculas

۲ - Hutton's Dynamics کل

۳ - Ward's Alg. Geometry تا Parabola (وارڈ کا الجبری هندسہ تا قطعۂ مکافی) ۱۴۹ صفحے

۴ - پریکٹیکل جیومیٹری

جماعت دوم ۱ - Hutton's Statics (هٹن کی سکونیات)

۲ - الجبرا کل -

۳ - تاریخ انگلستان کل

جماعت سوم : ۱ - Plane Trig. Geometrically& unalytically علم مثلث مستوی و تحلیلی

۲ - الجبرا -

۳ - انٹروڈکشن ٹو دی نیچرل فلاسفی - میکانکس و علم هئیت -

۴ - تاریخ انگلستان -

جماعت چہارم : ۱ - اقلیدس گیارھواں و بارھواں مقالہ -

۲ - انٹروڈکشن ٹو نیچرل فلاسفی - میکانکس و ھیئت

۳ - تاریخ حکومت مغلیہ

۴ - حساب -

جماعت پنجم ۱- اقلیدس مقالہ ۳ ' ۴ و ۶

۲- انٹروڈکشن ٹو نیچرل فلاسفی ' میکانکس و ھیئت .

۳- تاریخ حکومت مغلیہ

۴ حساب

جماعت ششم :۱ - اقلیدس پہلا مقالہ -

۲ - جغرافیۂ ایسیا -

۳ - حساب -

نصاب بابتہ سنہ ۱۸۵۳ ع

جماعت اول: ۱ - برنکلے (Brinklay) کی کتاب علم ھیئت صفحۂ ۱۲۱ تا صفحۂ ۲۵۳

Ward's Algebraical Geometry حصہ دوم -

۲ - وارڈ - ابتدا سے تیسرے باب تک اور باب ۶ اور ۷ صفحہ ۴۸۴ تا آخر باب ھفتم -

۳- تاریخ یونان -

جماعت دوم: ۱ - احصاے تفرقات کل (Differential Calculus)

۲ - وارڈ آٹھویں باب سے دسویں باب تک (بشمول ھر دو باب) -

۳ - میکینکس مصنفۂ ینگ ۳۵ ویں فقرے سے ۷۳ فقرے تک (بشمول ھر دو) -

جماعت سوم ۱ - .Diff. Cal ابتداے Maxima اور Minima تک -

۲ - وارڈ کی کتاب - - Quadratic Eq مساوات درجۂ دوم سے

(ہلیلجی) تک۔ Ellipse

۳ - تاریخ انگلستان (اردو) ۱۰۰ صفحے

۴ - ینگ کی کتاب میکانکس ۵۵ صفحے۔

جماعت چہارم: ۱ - مفتاح الافلاک نصف اول ۔

۲ - علم مثلث (ترگنا میٹری) ۔

۳ - الجبرا، دوسرا باب اور چوتھے باب کے تین حصے

۴ - تاریخ افغانستان ۔

جماعت پنجم: ۱ - اقلیدس کے چھے مقالے اور گیارھویں مقالے کی ۲۱ شکلیں ۔

۲ - رسالۂ مساحت کل ۔

۳ - تاریخ بنگال (اردو) کل ۔

۴ - الجبرا ۔ ۶۴ صفحے ۔

جماعت ششم: ۱ - اقلیدس پہلے چار مقالے

۲ - حساب ۔

جماعت ہفتم: ۱ اقلیدس پہلا مقالہ

۲ حساب تا کسور اعشاریہ

شعبۂ انگریزی

ابتدائی نصاب کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اب اس کے بعد نصاب میں جو تدریجی ترقی ہوئی اس کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ ذیل میں تین سال کا نصاب درج کیا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ انگریزی زبان وغیرہ کی تعلیم کس درجے اور نوعیت کی ہوتی تھی ــــ

COURSE OF STUDIES, 1847

History and Literature

Hume's History of England, the Reign of Charles I and Commonwealth Gibbon's Roman Empire, the Reign of Justinian and the History of Mohamed (P & B) and the Khalifs. Broughm's Political Philosophy Vol. I. Richardson's Selections; To read Hamlet, Midsummer Night's Dreams, Cato, Thompson's Venice Preserved Part of Milton, and to revise Macbeth King Lear; Othello; and Four Books of Milton Wayland's Political Economy; (Larger Work the Whole)

Bacon's Novum Organum the Whole

Law Marshman's Civil Law 3rd and 4th Chapters

Science Peschet's Natural Philosophy Vol II. Whewell's Mechanics (only first divison), Library of Useful Knowledge Physical and Mathematical Geography. Hall's Differential Calculus to the end, and first six chapters of Integral Calculus (only the first divison) to repeat Trigonometry and Analytical Geometry of two dimensions (only the first division) Bridges' Algebra to the end (only the 2nd division); Hutton's Spherical Trigonometry, the whole; Hutton's Analytical Geometry of two divisions Drawing (Optional)

2nd Class

History - Brief Survey of History Part II; Pincock's Goldsmith's History of England, the whole

Literature Richardson's Selections, 100 columns; Goldsmith's Geography to the end

Science Rickett's Natural Philosophy (Mechanics); Euclid, Book III and IV; Bridge's Algebra to Simple Equations; Boonycastle's Arithmetic to the end; Composition and Translation; Drawing (Optional) Nagree (Prem Sagar); Persian (Optional), but all attend,

COURSE OF STUDY DURING THE YEAR 1849

ENGLISH DEPARTMENT :-

(FIRST CLASS, FIRST DIVISOIN)

1. Shakespeare's Tempest and Richard III.
2. Bacon's Essays, the whole.
3. Schlegel's History of Literature - the 7 First Lectures.
4. Reid's Inquiry into the Human Mind the Whole.
5. Stewart's Elements of the Philosophy of the Human Mind to page 276.
6. Hume's History of England Reign of Edward VI and Mary.
7. Gibbon's Roman Empire, 64th. - 65th. Chapters.
8. Tytler's Universal History, 1st. and 2nd. books.
9. Smith's Wealth of Nations, 1st. Book.
10. Trail's Physical Geography - the whole.
11. Hall's Integral Calculus, 1st. sub-Division, 7th. Chapter of 2nd. Ed.
12. Hall's Differential Calculus, 6th. 7th. and 8th. Chapters.
13. Wand's Analytical Geometry, 9th. and 10th. Chapters, 1st. Division, and Chapter 1st. to 6th. inclusive IInd. Division.
14. Rutherford's Course of Hutton's Mathematics, 1st Sub division; Dynamics and 2nd. Sub-Division; Statics.
15. Composition.
16. History of England in Nagree. 5th Chapter.
17. Drawing and Surveying.

FIRST CLASS, SECOND DIVISION.

1. Richardson's Selections; Macbeth; Essay on Criticism; Thompson's Seasons and Castle of Indolence and Spencer's Fairy Queen.
2. Bacon's Essays with the 1st. Division.
3. Reid's Inquiry into the Human Mind with the 1st. Division.

4 Tytler's Universal History with the 1st. Division
5 Mayland's Political Economy from page 224 to the end
6. Trail's Physical Geography with the 1st Division
7 Hydrostatics and Dynamics L. U. K
8. Bridge's Algebra, Chapters 10th and 11th
9 Euclid's Geometry 12th Book.
10 Snowball Trigonometry Spherical from 1st. to 4th Chapters
11 Plane from 1st to 4th to be reviewed
12 Rutherford's Course of Hutton's Math Conic Sections the Parabola and Ellipse
13 Composition.
14. History of England in Nagree 5 chapters
15. Drawing and Surveying

SECOND ENGLISH CLASS

1 Richardson's Selections Hutton's 3rd. and 4th. Book and Hamlet.
2. Graham's English Composition the whole.
3 Abercrombie's Intellectual Powers Part 1st and 2nd and 3 sections of part III
4 Pinnock's History of England - the whole
5 Mayland's Political Economy to page 224
6 Physical and Mathematical Geography. L U K the whole.
7. Mechanics L U K Second Treatise
8. Bridge's Algebra to the end of Quadratic Equations
9. William's Symbolical Euclid 4th 6th. and 11th. Books.
10. Hind's Trigonometry, 3 First Chapters
11. Composition and Translation
12 Stewart's Historical Anecdotes in Nagree the Whole
13 Drawing and Surveying.

THIRD ENGLISH CLASS :-

1. Poetical Reader No. 3 Chapters 2nd. and 3rd.
2. Goldsmith's History of England.
3. Introduction to Natural Philosophy, Mechanics and Astronomy.
4. Woodbridge's Geographyp pp. 16 - 62 and 89 - 172.
5. Bridge's Algebra to the end of Simple Equations.
6. Playfair's Geometry, the four first books.
7. Translation and Dictation.
8. Hindee Tables in Nagree.

COURSE OF STUDY DURING THE YEAR 1851:

FIRST ENGLISH CLASS, 18 PUPILS :-

1. Shakespear's Midsummer Night's Dream.
2. Dryden's Absolam and Achitophal and Pope's Essay on Criticism.
3. Bacon's Advancement of Learning.
4. Warren's Selections from Blackstone as far as 205 pages.
5. Elphinstone's History, 1st. Vol.
6. Keightley's England, from the Accession of James I to the Revolution of 1688.
7. Hymer's Conic Sections, with the exception of General Equations.
8. Wood's Mechanics.
9. Hall's Differential Calculus, three First Chapters.
10. Revision of Algebra, Geometry and Plane Trigonometry.
11. Composition.
12. Drawing.
13. Surveying.

14. Urdu.

SECOND ENGLISH CLALSS EIGHTEEN PUPILS:-

1 Goldsmith's Deserted Village and Traveller

2. Hutton's First Book of Paradise Lost.

3. Goldsmith's Citizen of the World. Cal. Ed. to letter 61 inclusive.

4 Keightley's Rome.

5. Wayland's Political Economy Book I

6 Geometry, Rivision of 1st 2nd. and 3rd. Books and the 4th. 6th. and 11th.

7 Bridge's Algebra, to page 186, with the omission of Unlimited Problems.

8 Composition.

9 Drawing

10. Prem Sagar 152 pp.

11. Translation from English into Urdu.

COURSE OF STUDY DURING 1853.

FIRST ENGLISH CLASS IN LITERATURE

1 Shakespear's Hamlet

2. Milton's Paradise Lost.

3. Bacon's Essays.

4. Mackintosh's Ethical Philosophy

5 Elphinstone's History of India.

6. Soda's Ghazals. (Urdu).

FIRST CLASS - FIRST DIVISION IN MATHS:-

1 Differential and Integral Calculus.

2. Mechanics and Conic Section

3. Webster's Hydrostatics.

FIRST, SECOND DIVISION IN MATHS :-

1. Mechanics
2. Hammer's Conic Section.
3. Webster's Hydrostatics.
4. Surveying.
5. Drawing.

SECOND CLASS, IN LITERATURE AND MATHS :-

1. Addison's Spectator - 100 pages.
2. Pope's Essay on Criticism.
3. Dryden's Absolom and Achitophel.
4. Keightley's History of England Vol. I with corresponding Geography.
5. Anwar -e- Sahaili, in Urdu.
6. Bagh -o- Bahar in Urdu.
7. Plane Trigonometry and the nature and use of Logarithms
8. Algebra as far as the Geometric Progression
9. Euclid 21st. Proposition 11th. Book with revision of Whcle.

THIRD ENGLISH CLASS, IN LITERATURE & MATHS :-

1. Goldsmith's Traveller.
2. Campbell's Pleasure of Hope.
3. Goldsmith's Essays to 61st Letter.
4. Marshman's India - the Whole.
5. Euclid 6 Books, 21st. Prop. of the 11th. Book.
6. Bridge's Algebra as far as Quadratic Equations
7. Natural Philosophy .
8. Gul-e- Bakavali - in Urdu.
9. Mofeed Sibian - in Urdu.

وظائف - فیس - تعداد طلبہ

جس وقت گورمنٹ کالج کے قیام کی تجویز درپیش تھی تو مقامی مجلس نے بہت پر زور سفارش کی تھی کہ مشرقی دستور کے مطابق بعض طلبہ کو وظائف ضرور دیے جائیں تا کہ وہ آسانی سے اپنی تعلیم جاری رکھہ سکیں

جنرل کمیٹی نے اس تجویز کو منظور کیا اور کالج کے هر شعبے یعنی فارسی ' عربی اور سنسکرت کے شعبوں کے لئے چند چند وظائف تجویز کئے - پہلے سال جب کالج کا افتتاح هوا تو وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد ۵۰ تھی ' دوسرے سال ۱۰۰ هوگئی - ان میں سے هر ایک طالب علم کو تین تین روپے ماهوار وظیفہ دیا جاتا تھا ' سنہ ۱۸۲۸ م میں وظائف کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ هوا اور وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد ۲۰۹ هوگئی اور ان کے دس درجے مقرر کئے گئے جن کی مقدار ایک روپیہ سے لے کر چھہ روپے تک تھی یعنی ادنیٰ جماعتوں میں ایک روپیہ وظیفہ دیاجاتا تھا جو بڑھتے بڑھتے اعلیٰ جماعتوں میں چھہ روپے هو جاتا تھا - لیکن اس قدر مختلف مدارج موجب دشواری ثابت هوئے اور آخر دو شرحیں معین کی گئیں ایک دو روپے کی اور دوسری پانچ روپے کی - یعنی داخلے کی تاریخ سے طالب علم کو دو روپے وظیفہ دیا جاتا تھا اور جب وہ پڑھہ لکھہ کر کافی استعداد حاصل کرلیتا تو پانچ روپے کردیا جاتا —

تجربے سے یہ سب طریقے ناقص ثابت هوئے اور ضرورت اس امر کی محسوس هوئی کہ ادنیٰ وظیفوں کی تعداد کم کرکے اعلیٰ وظیفوں میں اضافہ کیا جاے - چنانچہ اس اصول کی بنا پر چند وظیفے آٹھہ ' دس اور سولہ روپے ماهانہ کے مقرر کئے گئے - سنہ ۱۸۳۲ م کی سالانہ رپوٹ میں مذکور هے

کہ جنرل کمیٹی کی رائے پر کسی قدر عملدر آمد ہوا ہے ' یعنے دو نہایت مستعد اور قابل طالب علموں کو سولہ سولہ روپے اور دو کو دس دس روپے ماہانہ کے وظیفے دیے گئے ہیں —

سنہ ۱۸۳۵ ع میں جہاں ہندوستان کے نظام تعلیم میں اور انقلابات ظہور میں آئے تھے ' ان میں ایک یہ بھی تھا کہ " گورنر جنرل باجلاس کونسل طلبہ کو زمانۂ تعلیم میں وظائف دینے کے عمل کو نہایت قابل اعتراض خیال کرتے ہیں ...... اور اس لئے وہ ہدایت کرتے ہیں کہ آیندہ کسی طالب علم کو جو ان درس گاہوں میں داخل ہو کسی قسم کا کوئی وظیفہ نہ دیا جاے "—

لارڈ بنٹنک کے اس رزولیوشن کا اثر دلی کالج پر بھی پڑا - یہاں طالب علم مفت ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ وظیفے بھی پاتے تھے جو نادار طلبہ کا ذریعۂ معاش تھا - نئے حکم کے رو سے وظیفے بند ہوگئے تو طلبہ کی تعداد بھی گھٹ گئی - ذیل میں سنہ ۱۸۳۳ ع سے ۱۸۳۸ تک کا ایک نقشہ دیا جاتا ہے جس سے مشرقی اور انگریزی شعبے کے وظیفہ خوار اور غیر وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد معلوم ہوگی نیز یہ بھی ظاہر ہوگا کہ وظیفوں کی موقوفی سے تعداد طلبہ پر کیا اثر پڑا —

سنہ	شعبۂ مشرقی			شعبۂ انگریزی		
	وظیفہ خوار	غیر وظیفہ خوار	جملہ	وظیفہ خوار	غیر وظیفہ خوار	جملہ
۱۸۳۳	۲۴۳	۳۶	۲۷۹	۱۳۴	۱۸	۱۵۲
۱۸۳۴	۲۳۰	۱۸	۲۴۸	۱۲۹	۱۱	۱۴۰
۱۸۳۵	۲۱۷	۱۰	۲۲۷	۱۲۷	۶۱	۱۸۸
۱۸۳۶	۱۶۴	۳۴	۱۹۸	۱۱۷	۵۰	۱۶۷
۱۸۳۷	۱۲۴	۱۷	۱۴۱	۶۸	۴۰	۱۰۸
۱۸۳۸	۸۹	۳۴	۱۲۳	۴۷	۴۱	۸۸

اس نقشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وظیفہ خوار طلبہ کی کس قدر کثیر تعداد تھی - سنہ ۳۴ ع میں طلبہ کی تعداد ۳۸۸ تھی ان میں وظیفہ خوار ۳۵۹ (اور بعض رپوٹوں کے بموجب ۳۶۵) تھی - دوسری طرف اس نقشے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وظیفوں کے بند ہوجانے سے سنہ ۳۶ ع میں دفعتاً ۵۰ طالب علموں کی کمی ہوگئی اور دوسرے سال ۱۱۶ اور کم ہوگئے اور سنہ ۳۸ ع میں کسی قدر اور کمی ہوی نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو سنہ ۳۳ ع میں ۴۳۱ طالب علم تھے یا سنہ ۳۸ ع میں ۲۱۱ رہ گئے یعنی نصف سے بھی کم - یہ صرف وظیفوں کی موقوفی کی وجہ سے تھا اور اس سے کالج کو بہت نقصان پہنچا —

اس سے یہی نہیں ہوا کہ طالب علموں کی تعداد کم ہوگئی بلکہ دوسری مشکل یہ رو نما ہوی کہ طالب علم زیادہ مدت تک اپنی تعلیم جاری نہیں رکھہ سکتے تھے اور اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے تھے - چھوٹی موٹی تنخواہ کی بھی کوئی نوکری مل جاتی تھی تو تعلیم ترک کرکے اُسے قبول کرلیتے تھے - دهلی میں طالب علموں کا زمانہ بالاوسط چار سال سے زیادہ نہ تھا - اس قلیل عرصے میں ظاہر ہے کہ تعلیم کسی طرح بھی مکمل نہیں ہوسکتی تھی —

دلی والوں نے اس کا بہت برا مانا تھا - تعلیم کے متعلق اس وقت اور اُس وقت کے خیالات میں بہت بڑا فرق ہوگیا ہے اکثر طلبہ نادار تھے اور بغیر امداد کے اپنی تعلیم زیادہ مدت تک جاری نہیں رکھہ سکتے تھے اور سوائے گورمنٹ کی امداد کے دوسرا کوئی سہارا نہ تھا ' چنانچہ مسٹر ٹامسن نے اپنے معائنہ کی یاد داشت میں جو انہوں نے ۱ اپریل سنہ ۱۸۴۱ ع کو جنرل کمیٹی کی خدمت میں پیش کی ' اس کی تصدیق کی ہے - وہ

لکھتے هیں که —

" اهل دهلی اس قسم کی درسگاه کی اعانت میں مالی امداد دینے کے لئے کسی طرح آماده نهیں - وه همیشه سے ان کالجوں کو خیراتی درسگاهیں سمجھتے آئے هیں - مرفه‌الحال لوگ اپنی اولاد کی تعلیم کا انتظام اپنے گهروں پر کرلیتے هیں اور اگر ان میں سے کچھ ایسے کالجوں میں آتے بهی هیں تو وه کالج کے کسی نامور فاضل کی شهرت کی وجه سے' کیونکه ان سے وه کسی اور طرح فیض حاصل نهیں کرسکتے - لیکن مشرقی کالج کبهی ایسے تهے اور نه هیں جیسے اس درجے کے کالج همارے ملک (انگلستان) میں هوتے هیں' جهاں ملک کے هر طبقے کے لوگ تعلیم پاتے هیں اور برابری کے دعوے سے تعلیم میں مقابله کرتے هیں -

لوگوں کے خیالات آسانی سے نهیں بدلا کرتے اور اب سوال یه هے که آیا هماری کار روائیوں نے جو اس درسگاه کے متعلق عمل میں آئی هیں' لوگوں کے خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا کی هے یا نهیں - یه سوله سال سے قائم هے اور اس عرصے میں بیشمار تجویزوں اور تحریکوں کا یکے بعد دیگرے تجربه کیا گیا خاص کر ان تجویزوں کا جن سے طلبه کو اس کالج کی طرف کشش اور رغبت هو - حال میں جو وظائف' خواه رعایتی هوں یا ترغیبی' مسدود کردے گئے تو یه کالج بیٹھ هی گیا " -

تعلیم کے روشن خیال حامیوں نے جن میں لوکل کمیٹی کے ارکان بهی شریک تهے اس خرابی کو محسوس کیا اور جنرل کمیٹی کو ان خرابیوں

کی طرف توجہ دلائی - جنرل کمیٹی نے تعداد طلبہ کی کمی اور جلد تعلیم ترک کردینے پر افسوس ظاہر کیا لیکن یہ لکھا کہ وہ وظائف کے اس طریقے کو پھر جاری کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے جو ایک مدت کے تجربے کے بعد نا کام ثابت ہوا ہے - ان لوگوں نے بہت سر پٹکا مگر کچھہ پیش نہ گئی —

سنہ ۱۸۳۷ ع میں جب لارڈ آکلنڈ نے دہلی کالج کا معائنہ فرمایا تو انہیں اس معاملے سے آگاہی ہوئی کیونکہ دہلی کالج وظیفہ خواری کا بہت بڑا مرکز تھا - لارڈ صاحب نے تعلیمی کمیٹی کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کیا اور ممتاز طلبہ کو وظیفے دینے کی ہدایت کی —

سنہ ۱۸۳۹ ع میں جب تعلیم کا عام مسئلہ گورمنٹ کے سامنے پیش ہوا تو وظیفے کا معاملہ بھی زیر بحث آیا اور تعلیمی کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ جہاں تک جلد ممکن ہو وظائف کی اسکیم کے متعلق رپوٹ پیش کرے - وظائف کے اصول یہ ہونے چاہئیں کہ ان کی تعداد محدود ہو اور محدود زمانے کے لئے ہوں اور صرف انہیں طلبہ کو دیے جائیں جو قابلیت اور محنت کی بنا پر ممتاز ہوں نیز گورنر جنرل بہادر کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر چار طالب علموں کے پیچھے ایک کو ایسا وظیفہ دیا جاے - شرط یہ ہونی چاہئے کہ اگر سالانہ امتحان میں تعلیمی حالت قابل اطمینان نہ پائی گئی تو مسدود کردیا جاے گا —

غرض اس تجویز کے مطابق ترغیبی یعنی قابلیت کے وظیفے جاری ہوگئے - اس کے بعد مقامی مجلس نے پھر جنرل کمیٹی سے درخواست کی کہ رعایتی وظیفے جن سے طلبہ کی پرورش منظور ہے ' دوبارہ جاری کئے جائیں کیونکہ ایک تو یہ ہمارا قدیم دستور ہے دوسرے لوگ اس قدر محتاج اور نادار ہیں کہ ان کے بچوں کے لئے یہ طریقہ بہت مناسب ہوگا - جنرل کمیٹی نے

جواب دیا کہ ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ نادار اور محتاج لوگوں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں بلکہ اس کے مقاصد اس سے بہت اعلی اور ارفع ہیں۔ اس سے ہمارا منشا کفایت شعاری نہیں ہے بلکہ دیگر وجوہ کی بنا پر ہمارا یہ یقین ہے کہ یہ تبدیلی جو کی گئی ہے وہ بہت مناسب ہے۔

اس کے چند مہینے بعد مسٹر ٹامسن نے عارضی طور پر رعایتی وظیفوں کے پھر جاری کرنے کے متعلق تجویز پیش کی۔ انھوں نے لکھا کہ مسلمان ہمیشہ مدارس اور کالجوں کو غریب طالب علموں کے لئے خیراتی ادارے سمجھتے آئے ہیں۔ اس لئے ان کی رائے میں تین روپے ماہانہ کے رعایتی وظیفے امداد کے طور پر کافی ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ تجویز کی کہ ان وظیفوں کے حاصل کرنے کے لئے ایک حد تک استعداد کی شرط بھی لگا دی جائے تاکہ بیکار اور کاہل لڑکے نہ آنے پائیں ــــ

اس تجویز کے مطابق یہ رعایتی وظیفے جو پرورش کے وظیفوں اور ترغیبی وظیفوں کے بین بین تھے، جاری کئے گئے۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ نیچے کی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی۔ جنرل کمیٹی نے بھی اسے محسوس کیا مگر اس نے اس سے دوسرا ہی نتیجہ نکالا۔ اس کی رائے میں یہ صحیح اصول نہیں ہے کہ طالب علموں کو مالی امداد دے کر تعلیم کی ترغیب دی جائے۔ چند ماہ کے تجربے کے بعد یہ وظیفے تو بند ہوگئے اور ترغیبی یعنی لیاقت کے وظیفے قائم رہ گئے ــــ

سنہ ۱۸۴۳ ع کی رپوٹیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کالج میں دو قسم کے وظائف تھے ایک سینیر یعنی اعلی اور دوسرے جونیر یعنی ادنی، جن کی تفصیل یہ ہے ــــ

۱	سینئیر اسکالر شپ		فی ۴۰
۱	"	"	فی ۳۰
۶	جونیر	"	فی ۲۵
۴	"	"	فی ۸
۴	"	"	فی ۶
۱۳	"	"	فی ۴

سینئیر اسکالر شپ کے امتحان کے لئے حسب ذیل مضامین میں تیاری کرنی پڑتی تھی (۱) انگریزی ادب (۲) تاریخ (۳) قانون (بلیکسٹن) (۴ معاشیات (۵) پیلی (Paley) کی نیچرل تھیا لوجی (۶) ریاضی (۷) عربی یا سنسکرت —

اس سال یہ قرار پایا کہ چالیس روپے سے زیادہ اور آٹھ روپے سے کم کوئی وظیفہ نہ دیا جائے۔ اس سے پہلے اعلیٰ طالب علم کو پچاس روپے وظیفہ دیا جاتا تھا اور وظیفے کی رقم کم سے کم آٹھ روپے ھوتی تھی —

سنہ ۱۸۴۵ ع میں انگریزی شعبے میں چھ سینئیر اور چار جونیر وظیفہ خوار تھے۔ مشرقی شعبۂ عربی میں سینئیر اسکالر دس اور جونیر ۱۳ تھے —

ایسا معلوم ھوتا ھے کہ جو تجویز سنہ ۴۳ ء میں سینئیر اور جونیر وظیفوں کی شرح کے متعلق ھوئی اس پر ھمیشہ عمل در آمد نہیں ھوا اور شرح میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ھوتی رھی۔ مثلاً ۱۸۴۶ - ۴۷ ع میں پانچ • اعلیٰ وظیفے دیے گئے جن میں سے دو تیس تیس کے تھے ایک

• رام چندر ۳۰ روپے　　دھرم نراین ۳۰ روپے　　شیونراین ۲۵ روپے
سوتی لال ۱۸ روپے　　امیر خاں ۱۸ روپے —

پچیس کا اور دو اٹھارہ اٹھارہ کے - تیس طلبہ کو ادنیٰ وظیفے ملے جن کی مقدار آٹھ روپے سے چار روپے تک تھی —

اب تک یہ وظیفے دلی والوں ہی کو ملتے تھے لیکن اس سال قرب و جوار کے فارسی طلبہ کو بھی ادنیٰ وظائف کے مقابلے کے لئے دعوت دی گئی - باہر سے ۲۸ طالب علم شریک ہوے جن میں سے سات نے چار چار روپے ماہانہ کا وظیفہ حاصل کیا —

۱۸۴۷ - ۴۸ میں انگریزی شعبے میں اعلیٰ وظیفے پانے والے ۹ اور ادنیٰ وظیفے والے ۲۵ تھے جن میں سے بائیس کو چار چار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا - شعبۂ عربی میں اعلیٰ وظیفہ خوار ۹ اور ادنیٰ ۱۸ تھے - شعبۂ فارسی میں ایک اعلیٰ اور تین ادنیٰ وظیفے والے تھے - جن میں سے ۱۹ کو چار چار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا —

سنہ ۴۸ ع میں ۳۵ بیرونی طلبہ نے فارسی وظیفے حاصل کرنے کی کوشش کی جن میں سے دس کامیاب ہوے —

سنہ ۴۹ ع میں انگریزی شعبے میں ۱۴ نئے طلبہ کو تیس سے پانچ روپے ماہانہ تک کے وظیفے دیے جاتے تھے اور ۲۹ وظیفے چار چار روپے کے تھے —

شعبۂ مشرقی (عربی) میں سال گزشتہ کے وظیفہ خواروں کے علاوہ چار اعلیٰ وظیفہ پانے والے اور آٹھ ادنیٰ وظیفے والے تھے - جن میں ایک طالب علم نذیر احمد بھی تھے (یعنی دلی کے مولوی نذیر احمد) ان کے سوا ۱۷ طلبہ کو چار چار روپے وظیفے دیے جاتے تھے - شعبۂ فارسی میں چار ادنیٰ وظیفے پانے والے تھے جن میں ایک ذکاءاللہ بھی تھے - سنسکرت کے شعبے میں ایک اعلیٰ وظیفہ پاتا تھا اور سات کو چار چار روپے کا وظیفہ ملتا تھا —

اس سال ۶۲ بیرونی طلبہ عربی فارسی کے وظیفے کے مقابلے کے لئے شریک امتحان ہوے - مفتی صدرالدین صاحب نے امتحان لیا ان میں سے ۶ وظیفے کے قابل نکلے —

اس سال کے لئے سرکار نے چھ سو چھیانوے روپے وظائف کے لئے منظور کئے - مشرقی شعبے میں مفصلہ ذیل مضامین اعلیٰ وظیفے کے لئے تجویز کئے گئے —

عربی - مقامات حریری (اول نصف) ' شرح وقایہ نصف - نفحۃالیمن - ترجمہ از اردو - اقلیدس چھ مقالے - الجبرا تا مساوات درجۂ چہارم ' جغرافیہ - تاریخ ہند —

فارسی - سہ نثر ظہوری تمام - دیوان حافظ نصف - ترجمہ از اردو - اقلیدس چار مقالے - الجبرا تا مساوات درجۂ دوم - جغرافیہ - تاریخ ہند —

سنہ ۱۸۵۱ ع میں انگریزی شعبے میں گیارہ اعلیٰ وظیفہ پانے والے اور چھ ادنیٰ وظیفے والے تھے ' عربی شعبے میں ۱۴ اعلیٰ کے اور ۱۲ ادنیٰ کے ' فارسی شعبے میں پانچ اعلیٰ اور نو ادنیٰ ' سنسکرت میں ایک اعلیٰ اور دس ادنیٰ وظیفہ پاتے تھے —

سنہ ۱۸۵۳ ع وظائف کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی - انگریزی شعبے میں اعلیٰ وظائف بارہ تھے جن میں تین پچیس پچیس کے ایک بیس کا ' تین بارہ بارہ کے اور پانچ نو نو کے اور ادنیٰ وظائف ۲۸ تھے جن میں ایک آٹھ کا دو چھ چھ کے ' دس پانچ پانچ کے اور باقی چار چار کے - عربی شعبے میں چودہ اعلیٰ دو بارہ بارہ کے اور باقی نو نو کے اور ۱۰ ادنیٰ ایک چھ کا ایک پانچ کا باقی چار چار کے - فارسی شعبے میں دو اعلیٰ نو نو کے اور انیس ادنیٰ ایک سات کا دو پانچ پانچ کے اور

باقی چار چار کے اور سنسکرت میں ایک اعلی نو روپے کا اور گیارہ ادنی چار چار روپے کے تھے —

غدر کے بعد جب کالج دوبارہ کھلا تو اس کا تعلق ممالک مغربی شمالی کے بجائے پنجاب گورمنٹ سے ہوگیا اور وظائف میں بھی کمی ہوگئی۔ چنانچہ سنه ۱۸۶۵ ع کے دربار میں جو دلی میں ہوا، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے اپنے ایڈریس میں اس امر کا خود اقبال کیا ہے کہ " دلی کالج کے طلبه کو اگرچه اب وظائف کی رقم گزشته زمانے کے مقابلے میں جب وہ حکومت ممالک مغربی شمالی کے تحت میں تھا، نسبتاً چھٹا حصه دی جارہی ہے " - وظائف ہی کم نہیں ہوے تھے بلکه قواعد بھی سخت ہوگئے تھے - جس کا نتیجه یه ہوا که طلبه کی تعداد میں کمی واقع ہونے لگی - پرنسپل صاحب کو اس سے بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے لفٹنٹ گورنر کو رپوٹ کی که اگر یہی لیل و نہار رہے تو پنجاب کے کالج بہت جلد بیٹھ جائیں گے - انہوں نے بطور نظیر یه بھی لکھا که آگرہ اور بریلی میں حکومت ممالک مغربی شمالی وظائف کے معاملے میں بڑی فیاضی سے کام لے رہی ہے —

سنه ۱۸۶۵ ع میں وظائف کی تعداد یه تھی - بی - اے سال سوم میں تین، سال دوم میں چھ، سال اول میں نو - باقی کم درجے کے وظائف اسکول میں دئے جاتے تھے جن کی تعداد ۴۳ تھی —

میں اوپر لکھ چکا ہوں که دلی کالج میں تعلیم مفت ہی نہیں بلکه وظیفے بھی ملتے تھے اور شروع شروع میں تقریباً سب ہی وظیفے خوار تھے اور چند جنہیں وظیفه نہیں ملتا تھا بغیر فیس کے تعلیم پاتے تھے - سنه ۱۸۳۱ ع میں لوکل کمیٹی (مقامی مجلس) دہلی نے یه رپوٹ کی که

ان کے خیال میں دلی کا کوئی باشندہ تعلیم کی اجرت دینے پر آمادہ نہ ہوگا، خواہ وہ انگریزی شعبے میں پڑھتا ہو یا فارسی شعبے میں، بلکہ مفت تعلیم دینے پر بھی چند ہی طالب علم داخل ہونے کے لئے آئیں گے۔

کئی سال تک یہ معاملہ یونہیں رہا اور فیس کے متعلق کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۸۴۴ع میں اس کی ابتدا انگریزی شعبے سے ہوی اور وہ اس طرح کہ کالج میں داخل ہونے کے لئے فیس داخلہ کی شرط لگا دی گئی۔ کمیٹی نے اس بارے میں یہ لکھا ہے کہ اس سال گذشتہ سالوں کے مقابلے میں حاضری باقاعدہ اور اچھی رہی اور یہ فیس داخلہ کا طفیل ہے۔ اگرچہ اس کی مقدار بہت خفیف ہے تاہم طلبہ اور ان کے والدین کی نظروں میں تعلیم کی وقعت بڑھ گئی ہے، جو پہلے نہیں تھی —

دوسرے ہی سال مقامی مجلس نے تجویز کی کہ اس قاعدے کا نفاذ شعبۂ مشرقی پر بھی کیا جاے اور گورمنٹ میں اس کے متعلق تحریک کی گئی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے جواب میں یہ لکھا کہ اگر مجلس کو اپنی تجویز کے قرین مصلحت ہونے پر کامل وثوق ہے تو وہ فیس لگا سکتی ہے لیکن "ہم اُنھیں نوجوانوں کو زیادہ تر اپنی درس گاہ کی روشن خیالی کے اثر میں لانے کے خواهش مند هیں جو آیندہ چل کر اپنے اهل وطن کی نظروں میں اپنی قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل سمجھے جائیں گے۔ اس لئے ان کے داخلے کے لئے همارا دروازہ جہاں تک ممکن هو کھلا رهنا چاهئے" اس کا منشا صاف هے۔ مشرق السنہ و علوم کے علما اور طلبہ دونوں کو مغربی علوم اور گورمنٹ کی نیت کی طرف سے سوء ظن تھا۔ انگریزی شعبے والوں کی طرف سے تو انھیں اطمینان تھا کہ وہ انگریزی زبان اور علوم پڑھ کر رستے پر آجائیں گے لیکن مشرقی خیالات والوں کی طرف سے گورمنٹ بھی اتنی هی بدظن تھی جتنے وہ مغربی خیالات اور

گورمنٹ سے تھے ' اس لئے گورملٹ اُن کو مائل کرنے کے لئے ہر قسم کی رعایت کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کے لئے آمادہ تھی —

چند سال بعد پھر تحریک ہوی کہ مشرقی شعبے سے بھی فیس داخلہ وصول کی جاے - اس مرتبہ گورمنٹ نے منظوری دےدی —

اس کے بعد دوسرا درجہ یہ تھا کہ انگریزی شعبے والوں سے ماہانہ فیس وصول کی جاے - سنہ ۱۸۴۶ ع میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن کچھہ زیادہ کامیابی نہ ہوئی - فیس والدین کی آمدنی کے تناسب سے قائم کی گئی اور جن کی آمدنی ۳۵ روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھی وہ فیس سے مستثنی تھے - اس اصول کے عملدرآمد سے معلوم ہوا کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس کی آمدنی ۳۵ روپے ماہانہ سے زیادہ ہو ' لہذا چند ہی طالب علم ایسے نکلے جن سے فیس وصول ہوي اور جو رقم وصول ہوی وہ بہت ہی حقیر تھی یعنی جملہ تعداد طلبہ ۳۳۴ تھی اس میں سے صرف ۱۶ طالب علم ایسے تھے جو فیس ادا کرتے تھے اور فیس کی کل آمدنی انیس روپے ہوي - اس سے اہل دهلي کی خوش حالی کا اندازہ ہوسکتا ہے - آخر سنہ ۴۸ - ۱۸۴۷ ع میں یہ شرح اختیار کی گئی —

والدین کی آمدنی	فیس تعلیم
سوروپے سے زیادہ	پانچ روپے
ستر اور یا سو سے کم	تین روپے
پینتیس اور ستر سے کم	آٹھہ آنے

آمدنی کے لحاظ سے فیس کی شرح قائم کرنا اگر چہ بہ ظاہر بہت منصفانہ اور معقول طریقہ معلوم ہوتا ہے ' لیکن اس میں بہت سی دشواریاں ہیں - اس کا تجربہ مختلف کالجوں میں کیا گیا اور ہر جگہ ناکامی ہوئی آخر اسے

ترک کرنا پڑا - لیکن دلی کالج میں یہ طریقہ سنہ ۵۲ ع تک برابر جاری رہا —

ماھانہ فیس کا قاعدہ مشرقی شعبے میں بھی جاری کیا گیا لیکن نرمی کے ساتھہ - چنانچہ سنہ ۱۸۵۰ ع میں فارسی شعبے میں ۱۶ ، عربی شعبے میں ۶ اور سنسکرت شعبے میں ۳ طالب علم فیس ادا کرتے تھے -

ذیل کے نقشے سے ہر سال کی تعداد طلبہ اور مقدار فیس معلوم ہوگی -

سنہ	جملہ تعداد طلبہ	تعداد فیس دھندہ	مقدار فیس سالانہ
۱۸۳۵ - ۳۶	۳۶۴	۰	۰
۱۸۳۶ - ۳۷	۲۴۹	۰	۰
۱۸۳۷ - ۳۸	۲۱۱	۰	۰
۱۸۳۸ - ۳۹	۲۲۶	۰	۰
۱۸۳۹ - ۴۰	۱۸۹	۰	۰
۱۸۴۰ - ۴۱	۱۹۶	۰	۰
۱۸۴۱ - ۴۲	۳۲۹	۰	۰
۱۸۴۲ - ۴۳	۲۸۶	۰	۰
۱۸۴۳ - ۴۴	۳۰۵	۰	۰
۱۸۴۴ - ۴۵	۳۹۰	۰	۰
۱۸۴۵ - ۴۶	۳۷۵	۰	۰
۱۸۴۶ - ۴۷	۳۳۴	۱۶	۱۹۲
۱۸۴۷ - ۴۸	۳۵۹	۱۲	۲۲۱
۱۸۴۸ - ۴۹	۳۳۹	۷۷	۶۲۲
۱۸۴۹ - ۵۰	۳۳۹	۱۲۵	۹۵۸
۱۸۵۰ - ۵۱	۳۳۳	۱۸۱	۱۳۵۸

سنہ	جملہ تعداد طلبہ	تعداد فیس دھندہ	مقدار فیس سالانہ
۱۸۵۲ - ۵۳	۳۱۵	۲۳۰	۱۹۱۰
۱۸۵۳ - ۵۴	۴۴۳	۲۳۹	۲۰۸۲
۱۸۵۶ - ۵۷	۳۴۵		۲۴۰۵ - ۱ - ۳

اس نقشے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۸۳۵ اور سنہ ۱۸۴۱ کے درمیان تعداد طلبہ بہت کم ہوگئی تھی - اس کی وجہ یہ تھی کہ طلبہ کے وظیفے بحکم سرکار بند ہوگئے تھے - جب سنہ ۱۸۴۱ میں ادنی رعایتی وظیفوں کی تعداد زیادہ کردی گئی تو ادنی جماعتوں میں فوراً حیرت انگیز اضافہ ہوگیا یعنی یا تو ۱۶۶ طالبہ تھے یا دفعتاً ۳۲۶ یا جیسا کہ سالانہ رپوٹ میں درج ہے ۴۲۶ ہوگئے - کچھہ دنوں بعد جب رعایتی وظائف ترغیبی یا لیاقت کے وظیفوں میں تبدیل ہوگئے تو تعداد پھر گھٹ گئی - اس کے بعد پھر اضافہ ہوا لیکن تعلیمی فیس جاری ہونے پر پھر چھیم ہونے لگی ، اس کے بعد سے تعداد قریب قریب ایک ہی سی رہی - البتہ سنہ ۱۸۵۲ ع میں تعداد میں کسی قدر کمی نظر آتی ہے یہ وہ سال ہے جب ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا اور شہر والوں میں بڑا خلفشار پیدا ہوگیا تھا اور لڑکوں نے اپنے نام کالج سے کٹوا لیے تھے —

ذیل کے نقشے سے طلبہ کی تعداد بہ لحاظ مذہب اور بہ لحاظ تعلیم مختلف السنہ معلوم ہوگی — تعداد متعلمین

سنہ	ہندو	مسلمان	عیسائی	انگریزی	فارسی	عربی	سنسکرت
۱۸۳۵ - ۳۶	۲۰۱	۱۵۸	۵	۱۶۶	۸۱	۶۱	۵۶
۱۸۳۶ - ۳۷	۱۳۴	۱۰۸	۷	۱۰۸	(مشرقی السنہ کے کل طلبہ ۱۴۱)		

سنہ	هندو	مسلمان	عیسائی	تعداد متعلمین انگریزی	فارسی	عربی	سنسکرت
۱۸۳۷ - ۳۸	۱۱۴	۸۹	۸	۸۸	۵۶	۳۵	۳۲
۱۸۳۸ - ۳۹	۱۴۰	۸۰	۶	۱۲۳	۳۹	۳۵	۲۹
۱۸۳۹ - ۴۰	۱۰۵	۷۳	۱۱	۸۵	۳۹	۴۱	۲۴
۱۸۴۰ - ۴۱	۹۳	۷۰	۳	۸۴	۳۴	۲۸	۸۲
۱۸۴۱ - ۴۲	۲۱۴	۱۰۲	۱۰	۱۵۷	۱۴۶	۱۶	۴۶
۱۸۴۲ - ۴۳	۱۴۶	۱۲۸	۱۲	۱۲۴	۷۵	۴۰	۳۶
۱۸۴۳ - ۴۴	۱۷۹	۱۱۱	۱۵	۱۶۲	۵۳	۵۸	۳۲
۱۸۴۴ - ۴۵	۲۹۹	۱۴۶	۱۵	۲۴۵	۱۰۹	۷۵	۳۱
۱۸۴۵ - ۴۶	۲۳۰	۱۳۲	۱۳	۱۹۶	۱۱۵	۶۶	۲۴
۱۸۴۶ - ۴۷	۲۰۹	۱۰۷	۱۸	۱۹۸	۵۸	۶۵	۲۴
۱۸۴۷ - ۴۸	۲۳۴	۱۰۹	۱۶	۲۳۱	۴۳	۷۲	۱۷
۱۸۴۸ - ۴۹	۲۲۲	۱۰۵	۱۲	۲۲۶	۴۷	۵۶	۱۷
۱۸۴۹ - ۵۰	۲۳۱	۹۵	۱۱	۲۲۴	۶۱	۴۳	۱۹
۱۸۵۰ - ۵۱	۲۰۶	۱۰۵	۲۲	۲۲۲	۵۶	۳۹	۱۸
۱۸۵۲ - ۵۳	۲۱۷	۹۳	۱۰	۲۰۹	۵۷	۳۹	۲۵
۱۸۵۳ - ۵۴	۲۰۶	۱۱۲	۱۵	۲۱۱	۵۷	۳۸	۲۷
۱۸۵۴ - ۵۵	۲۴۳	۹۷	۱۰	۲۱۷	۷۷	۳۳	۲۳
۲۸۵۵ - ۵۶	۱۵۸	۸۳	۴				

ان اعداد کے بہم پہنچانے میں بڑی دقت پیش آئی - سرکاری مطبوعہ رپوٹوں میں اعداد کے متعلق بہت بے احتیاطی کی گئی ہے اور اس لئے مختلف کاغذات کو دیکھہ کر ان کی تصحیح کی گئی ہے - اس نقشے کو دیکھہ کر کسی

قدر تعجب ہوگا کہ اردو کا کہیں نام نہیں۔ سرکاری رپوٹوں میں لڑکوں کے اعداد نہیں دیے گئے۔ نصاب تعلیم وغیرہ کے کاغذات دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ تقریباً کالج کے سب کے سب طالب علم اردو پڑھتے تھے، اس کے متعلق نصاب تعلیم میں ذکر ہوچکا ہے —

دو باتیں اور نظر آتی ہیں ایک یہ کہ عیسائیوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی ہے اس کی وجہ بیان ہوچکی ہے کہ اینگلو انڈین لوگوں نے اپنے مدارس الگ کھول لیے تھے۔ دوسرے یہ کہ سنہ ۵۱ – ۱۸۵۰ تک سنسکرت کے طلبہ کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہورہی تھی چنانچہ اس بنا پر یہ خیال تھا کہ سنسکرت نصاب تعلیم سے خارج کردی جائے لیکن گورنمنٹ نے یہ مناسب خیال نہ کیا۔ اس کے بعد تعداد میں اضافہ ہوتا گیا —

غدر کے بعد جب کالج دوبارہ کھلا تو اس کی حالت بہت کچھ بدل گئی تھی، کالج کا تعلق پہلے ہی پنجاب گورنمنٹ سے ہوگیا تھا اور طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں امتحان دیتے تھے اور وہیں کا نصاب تعلیم بھی رائج ہو گیا تھا، اردو کا چرچا کم ہوگیا اور ترجمہ و تالیف کا سلسلہ بھی برائے نام رہ گیا تھا —

سنہ ۶۵ – ۱۸۶۴ ع میں ایف۔ اے کی جماعتیں قائم ہوئیں جن میں ۱۵ طالب علم شریک تھے۔ آٹھ سال دوم میں اور سات سال اول میں۔ ہائی اسکول میں طلبہ کی کل تعداد ۱۵۶ تھی۔ بعد ازاں سی سٹیفن کالج کے طلبہ جو کالج کی جماعتوں میں پڑھتے تھے دلی کالج ہی میں منتقل کر دیے گئے —

سنہ ۶۷ – ۱۸۶۶ – میں بی۔ اے کی جماعت بھی کھل گئی۔ سال سوم میں ۲، سال دوم میں ۱۱، اور سال سوم میں گیارہ طالب علم تھے۔ ہائی اسکول میں طلبہ کی تعداد ۱۳۵ تھی —

سنہ ۷۲ - ۱۸۷۱ ع میں ایم - اے کی جماعت بھی بن گئی - ایم - اے میں ایک ' (بی - اے) سال چهارم میں ۹ ' سال سوم میں ۸ ' (ایف اے) سال دوم میں ۲۴ اور سال اول میں ۱۴ طالب علم شریک تھے —

سنہ ۱۸۷۷ ع میں دلی کالج ٹوٹ گیا اور گور منت کالج لاهور کی قسمت جاگی - کالج کا عملہ بھی وهیں منتقل هو گیا —

مجلس انتظامی

کالج کے انتظام کے لئے ایک مقامی مجلس تھی جو لوکل کمیٹی کہلاتی تھی - اس کا فرض تھا کہ وہ کالج کے تمام معاملات کی نگرانی کرے اور اس کی بہبودی پر نظر رکھے - کالج کی سالانہ رپوٹ جس میں اساتذہ کے عزل و نصب ' نصاب تعلیم ' سالانہ امتحان کے نتائج وغیرہ کے متعلق اطلاع ہوتی تھی ' صدر مجلس تعلیمات عامہ (جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن) کو جو تمام احاطۂ بنگال کی درسگاهوں کی نگران تھی ' باقاعدہ بھیجی جاتی تھی اور سارے کام اس کی صوابدید اور منظوری سے هوتے تھے —

دلی بھی احاطۂ بنگال میں تھی اور دلی کیا یہ تمام صوبہ جو بعد میں ممالک مغربی و شمالی کے نام سے موسوم هوا ' احاطۂ بنگال هی میں شریک تھا ' بنگال ' بہار وغیرہ لور (زیریں) اور ممالک مغربی شمالی وغیرہ اپر (بالائی) پراونسز یا صوبے کہلاتے تھے اور تمام امور خواہ تعلیمی هوں یا انتظامی وهیں کی حکومت کی منظوری سے انجام پاتے تھے —

سنہ ۱۸۴۳ ع میں اُن تمام تعلیمی اداروں کی نگرانی جو احاطۂ بنگال کے صوبۂ مغربی و شمالی میں واقع تھے گورنمنٹ آگرہ کے تفویض کردی گئی - اس تاریخ سے بالائی صوبوں کا نظام تعلیم احاطۂ بنگال کے زیریں صوبوں

کے نظام سے هٹتا هوا نظر آتا هے - پہلے یہ ایسی حکومت سے بندھا هوا تھا جہاں کے مقامی حالات یہاں کے حالات سے بہت کچھہ جدا تھا - بنگال کا رنگ دلی پر نہیں چڑھتا تھا اور چڑھتا بھی تو کھلتا نہ تھا - یہ بہت غنیمت هوا کہ اس سے جلد چھٹکارا هوگیا - اب اُس نے اپنا رنگ روپ نکالنا شروع کیا اور جس ڈھنگ کی تعلیم یہاں کی ضروریات اور طبائع کے مناسب تھی ' اس کا ڈول پڑنے لگا —

سنہ ۴۳ ع سے اس صوبے کی تمام تعلیم گاهوں کی سرپرستی اور نگرانی لفٹننٹ گورنر کے هاتھہ میں چلی گئی - اس وقت ممالک مغربی شمالی کے حاکم مسٹر ٹامسن تھے - ان کی نظر سب سے پہلے اُس چیز پر پڑی جو صحیح تعلیمی اصول اور کامیابی کی جڑ هے ' یعنی ذریعۂ تعلیم - انھوں نے انگریزی کے چھوٹے چھوٹے اسکول سب بند کردیے اور ان کی جگہہ خالص دیسی زبان کی درسگاهیں کھول دیں - اس کی وجہ خود انھوں نے اپنی ایک یاد داشت میں بیان کی هے جس کا ترجمہ یہاں عرض کیا جاتا هے —

" ممالک مغربی شمالی میں انگریزی تعلیم کا اس قدر شوق نہیں پایا جاتا جس قدر بنگال میں هے - یہاں شاذ و نادر هی کوئی متوطن یورپین هوگا - یہاں ایسے یورپین سوداگروں کی کوئی جماعت نہیں جو اپنا کاروبار انگریزی زبان کے ذریعے انجام دیتے هوں - یہاں کوئی سو پریم کورٹ نہیں جہاں مقدمات کی سماعت یا عدالتی کارروائی انگریزی میں هوتی هو - تمام سرکاری کاروبار بجز انگریزی عہدہ داروں کی باهمی مراسلت کے ' دیسی زبان میں هوتی هے - اس لئے انگریزی کا شوق پیدا کرنے کے لئے یہاں بہت هی کم وسائل موجود هیں " —

غرض مسٹر ٹامسن کا خیال یہ تھا کہ اگر ہم ممالک مغربی شمالی کے باشندوں کے دلوں پر کوئی ایسا اثر ڈالنا چاھتے ھیں جو محسوس ھو تو یہ انگریزی کے ذریعے سے نہیں ھوگا اس کا ذریعہ دیسی زبان ھی ھوسکتی ھے - چنانچہ وہ اسی یاد داشت میں لکھتے ھیں —

" انگریزی زبان کی تعلیم آگرہ ' بنارس ' دھلی کے کالجوں تک محدود رکھنی چاھئے اور اس کی تکمیل میں انتہائی درجے تک مدد دینی چاھئے - اس درجے کی تعلیم جو ھم ان لوگوں کو دینا چاھتے ھیں جو کثرت سے دوسرے اسکولوں میں داخل ھوتے ھیں اور جنھیں اس تعلیم کے حاصل کرنے کی فرصت یا شوق ھے تو انھیں زیادہ سستے طریقے سے ' کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر تعلیم صرف دیسی زبان کے ذریعے سے دی جا سکتی ھے " —

چنانچہ اس اصول کی بنا پر ان کالجوں میں انگریزی زبان اور سائنس اور دیگر مضامین کی تعلیم کے لئے ھر طرح کا سامان مہیا کیا گیا - دھلی کالج نے صحیح تعلیم کا سب سے عمدہ نمونہ پیش کیا اور آگرہ ' بنارس ' بریلی کے کالجوں نے اس کی تقلید کی —

اگرچہ مقامی مجلس دھلی کالج کی نگران تھی ' لیکن اس کے اختیارات بہت محدود تھے ' ھر انتظامی اور تعلیمی امر کے لئے گورمنٹ یعنی لفٹنٹ گورنر کی منظوری درکار ھوتی تھی - یہاں تک کہ نصاب تعلیم میں بھی کوئی خفیف سی تبدیلی بغیر منظوری کے نہیں ھوسکتی تھی - لیکن مجلس کی رائے کی کالج کے معاملات میں گورمنٹ وقعت کرتی تھی اور اگرچہ بعض اوقات اس کی رائے سے اختلاف بھی ھوتا تھا لیکن اکثر معاملات میں

اس سے اتفاق کیا جاتا اور اس کی تجویز کے مطابق منظوری دی جاتی ۔ کیونکہ اس کے رکن معزز اور قابل لوگ ہوتے تھے اور دلی' دلی والوں اور دلی کالج سے بہت زیادہ واقف تھے اور سکرٹری تو کالج کا پرنسپل ہی ہوتا تھا —

مقامی مجلس کا میر مجلس کوئی بڑا سرکاری عہدہ دار ہوتا تھا ۔ شروع شروع میں اس کے صدر دہلی کے رزیڈنٹ کمشنر سرٹی مٹکاف تھے اور ارکان مسٹر کالون جائنٹ میجسٹریٹ اور ڈاکٹر راس سول سرجن تھے —

اس کے بعد ان حالات کے تحت میں جن کا ذکر اس سے قبل اعتمادالدولہ وقف کے ضمن میں آچکا ہے' مجلس کے ارکان میں نواب حامد علی‌خاں شریک کئے گئے ۔ مسٹر ٹیلر مجلس کے سکرٹری اور کالج کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے —

سنہ ۱۸۴۲ ع میں علاوہ مذکورہ بالا صاحبوں کے مسٹر سی ۔ گرانٹ' نواب حسام‌الدین (جو دہلی کے امرا میں سے تھے) اور مولوی صدرالدین (صدرامین اعلی بھی مجلس کے ارکان مقرر کیے گئے —

سنہ ۱۸۴۷ ع میں ان اصحاب کا اضافہ ہوا —

مسٹر جے ۔ پی گیبنز سول سرجن —

رائے رام سرن داس دپٹی کلکٹر —

مسٹر ٹیلر جو اب پرنسپل تھے' حسب معمول سکرٹری رہے —

سنہ ۴۸ ع میں مسٹر ایچ ۔ کیپ بھی رکن مجلس بنائے گئے —

سنہ ۱۸۵۳ ع میں کمیٹی کے ارکان یہ تھے —

مسٹر جے ۔ پی ہورٹر میجسٹریٹ و کلکٹر دہلی (سر ٹی ۔ ٹی مٹکاف کا انتقال ۳ نومبر سنہ ۱۸۵۳ ع کو ہوگیا ان کی جگہ یہ صدر تجویز ہوئے)

سرجے ۔ تھیوفلس مٹکاف اسسٹنٹ میجسٹریٹ —

کپتان آر - سی تکلس

مولوی صدرالدین صدر امین اعلی

نواب حامد علی خاں

جے - کار گل (پرنسپل) جونیر ممبر و سکریٹری

سنہ ۵۵ - ۱۸۵۴ ع میں ان ناموں کا اور اضافہ ہوا -

مسٹر سائمن فریزر کمشنر

مسٹر آر - بی مورگن سول سشن جج

مسٹر پی - اے ایجرٹن میجسٹریٹ و کلکٹر -

مقامی مجلس کے ارکان سب کے وهی هوتے جو دهلی کے رهنے والے تھے یا جن کا قیام دلی میں هوتا - زیادہ تر تعداد سرکاری عہدہ داروں کی هوتی تھی اور تبادلے پر ان کے جانشین ان کے قائم مقام هوجاتے - دلی کا خاص باشندہ ایک آدہ هی هوتا ' لیکن خاص خاص معاملات میں مجلس کے ارکان دلی کے معزز اور با اثر اصحاب سے مشورہ کرلیا کرتے -

مجلس نے اکثر حکومت سے اهل دهلی کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کی اور ان کے تعلیمی فوائد کو مدنظر رکھہ کر گورمنٹ سے بسا اوقات کار آمد تجاویز کو منظور کرایا اور علاوہ اس کے تعلیم اور روشن خیالی کی حمایت اور اشاعت میں بھی اس معزز مجلس کے ارکان نے بہت قابل تعریف کام کیا -

جنوری سنہ ۵۷ ع میں جب کالج پنجاب گورمنٹ میں منتقل هوگیا تو اس مجلس کا بھی خاتمہ هوگیا -

تعطیلات

تعطیل مدارس هی کو نہیں بلکہ سب دفتروں کو بھی عزیز هوتی هے - ۱۔

سے طلبہ ہی کو خوشی نہیں ہوتی مدرس بھی خوش ہوتے ہیں (گو زبان سے نہ کہیں) - دلی کالج میں تعطیلیں خوب ہوتی تھیں - مسلمان جمعہ کے دن اور ہندو ہر ماہ کی پہلی ، آٹھویں ، پندرھویں ، بائیسویں کو تعطیل مناتے تھے - انگلش کالج کے ضم ہونے کے بعد سرکار نے حکم دیا کہ صرف انوار کی چھٹی منائی جاے اور جمعہ کے دن نماز کی چھٹی دی جاے - لیکن اس پر بھی اور بہت سی تعطیلیں تھیں - ہندو مسلمان ذرا ذرا سے میلوں تہواروں اور متعدد خرافات پر چھٹی مناتے تھے اور مولوی اور پنڈت طلبہ کی پشت پر ہوتے تھے - اس سے تعلیم کا بڑا ہرج ہوتا تھا - مسٹر کار گل (پرنسپل) نے تجویز کی کہ خاص خاص تہواروں کے سوا باقی تعطیلات یک قلم اُڑا دی جائیں لفٹنٹ گورنر نے اس تجویز کو منظور کیا اور کہا کہ عدالت دیوانی میں جن ایام کی تعطیلات ہوتی ہیں وہی کالج میں دی جائیں اور اس پر بھی اگر کوئی طالب علم غیر حاضر ہوجاے تو اس کے وظیفے میں سے دوچار آنے فی یوم کے حساب سے وضع کرلیے جائیں ، دوسروں پر دو آنے جرمانہ کردیا جاے یا نام خارج کردیا جاے —

کالج کی عمارت

ابتدا میں کالج غازی الدین خاں کے مدرسے میں تھا چنانچہ مسٹر ٹامسن اپنی یاد داشت مورخہ ۸ اپریل سنہ ۱۸۴۱ ع میں لکھتے ہیں کہ " غازی الدین خاں کا مدرسہ جہاں دہلی کالج اس وقت پر ہے ایک شاندار عمارت ہے اور محض دیسی درس گاہ کے لیے نا موزوں نہیں ہے مگر افسوس کہ یورپین کوارٹر دور ہے اور انگریزی انسٹی ٹیوشن کے موزوں بنانے کے لئے صرف کی ضرورت ہوگی " - معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد مشرقی اور انگریزی شعبے ایک جا کردیے

گئے تو کالج کتب خانۂ داراشکوہ میں اُٹھ آیا یہ بھی ایک تاریخی عمارت ہے۔ کبھی کسی زمانے میں داراشکوہ کا کتب خانہ تھا، اس کے بعد (سنه ۱۶۳۷ع) علی مردان خاں مغل حاکم پنجاب کا اقامت خانہ رہا - سنه ۱۸۰۳ ع میں سرڈیوڈ اختر لونی بارٹ کی رزیڈنسی ہوئی - اس کے بعد کالج آیا - کالج کے ٹوٹنے پر ضلع کا مدرسہ اس میں رہا اور اب میونسپل بورڈ اسکول ہے۔ اس کے دروازے کے ستون پر جو تختی لگی ہوئی ہے اس میں کالج کے قیام کی تاریخ سنه ۱۸۰۴ سے سنه ۱۸۷۷ لکھی ہوئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے -

جب غدر ہوا تو کالج اسی عمارت میں تھا۔ جب انگریزوں کی فتح ہوئی تو اس پر فوجی افسروں نے قبضہ کرلیا تھا اور سنه ۱۸۶۷ ع تک وہ اسی میں فروکش رہے۔ کالج یکم مئی سنه ۱۸۶۴ ع کو از سرنو قائم ہوا اور سنه ۱۸۸۷ ع میں اپنی قدیم عمارت میں چلا گیا۔ درمیانی عرصے میں دہلی انسٹیٹیوٹ یا موجودہ ٹاؤن ہال اور میونسپل کمیٹی کے اس حصے میں رہا جو گھنٹہ گھر کے بائیں جانب ہے، جہاں بعد میں ایک مدت تک لائبریری رہی۔

روسی ناول

پہلا دور

تیسرا باب

از

جناب محمد مجیب صاحب بی ۔ اے (آکسن)

گوگول کی تصانیف نے روسی ناول نویسی کو ایک خاص ڈھرے پر لگا دیا، اور گو وہ خود " یورپ دوست " اور " سلاف دوست " فرقہ بندی سے علیحدہ تھا ' اور اسے نہ روسی قوم کا نقاد کہہ سکتے ہیں نہ وکیل ' لیکن اس سے بعد کے ناول نویسوں میں اس بنا پر امتیاز کیا جاسکتا ہے ۔ روسی قوم کے نقاد گریگو رووچ ' پی سم سکی ' گون چروف ' تورگنیف اور سال تی کوف ہیں ' اور اس کے وکیل اکساکوف ' دستہ ئف سکی ' لسکوف اور تالستائی دونوں طرز کے ناول نویس حقیقت نگار اور نکتہ چیں تھے ' لیکن " یورپ دوست " ناول نویس اپنی قوم اور اس کے طرز معاشرت اور خیالات کی خامیاں اور برائیاں دکھا کر رہ جاتے ہیں ' " سلاف دوست " اپنے مشاہدے سے نتیجے نکالتے ہیں ' اپنی قوم کی تمام خامیوں کو تسلیم کرکے ان کی توجیہہ کرتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ ایک فلسفۂ حیات تعمیر کریں ' ایک قومی نصب العین قائم کریں جو روسی فطرت سے مناسبت رکھتا ہو وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں

کہ روسی قوم اپنی زندگی کی تشکیل اور اعلی اصولوں کی پیروی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے —

روسی قوم کے نقاد اس خیال پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ روسیوں نے یورپ کی تقلید صحیح طریقے پر نہیں کی ہے اور ان کی فلاح کی صورت یہی ہے کہ زندگی کے گر یورپ سے سیکھیں۔ روسیوں کے وکیل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ روسی قوم نے یورپ کی تقلید کرکے اپنی عزت اور خودداری کھودی ہے، اور اس کی ساری مصیبتیں اسی جرم کی سزا ہیں۔ وہ راہ راست پر اُسی وقت آئے گی اور اپنی مصیبتوں سے اسی وقت نجات پاسکے گی جب وہ اپنی اصلیت سے آگاہ ہوجاے، اور اپنی قوت اس مقصد عالی کے حاصل کرنے میں صرف کرے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے، دونوں طرز کے ناول نویسوں میں نوک جھونک ہوتی رہی، اور چونکہ ادب کے سوا اور کوئی میدان نہ تھا جس میں مختلف عقائد کے لوگ اپنے دل کا بخار نکال سکیں، اس لئے ناول نویسوں میں نہیں تو ان کے پیرووں میں یہ مخالفت اکثر عداوت کی شکل بھی اختیار کرلیتی تھی۔ لیکن ہمیں کسی فریق کی طرفداری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر خالص ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاے تو یہ نزاع ایسی ہے بھی نہیں جس میں طرفداری کی گنجائش ہو —

دمیتری وسیلیے لوچ گریگوروچ (۱۸۲۲ - ۱۹۰۰) مصور اور انشاپرداز تھا۔ اس نے اور دستدئفسکی نے ایک ہی انجینرنگ کالج میں تعلم پائی۔ یہ پہلا ناول نویس تھا جس نے تعلیم یافتہ روسیوں کو کسانوں کے حالات سے آگاہ کیا، اور اس تحریک کو بہت تقویت پہنچائی جس کا مقصد کسانوں

کو آزاد کرنا تھا* اس کے سب سے پہلے ناول "ارگن والے †" میں پیٹربرگ کے غریبوں کی زندگی کی نہایت پر درد تصویر تھی' اور اس ناول سے گریگوروروچ کی خاصی شہرت ہو گئی - اس کے بعد وہ کچھہ سال دیہات میں رہا اور ۱۸۴۶ سے ۱۸۵۵ تک ہر دوسرے تیسرے سال ایک ناول شائع کرتا رہا۔"گانو" (۱۸۴۶) ایک خاتون کا قصہ ہے جو کسانوں کی شادی کا تماشا دیکھنا چاهتی هیں اور ان خواهش پوری کرنے کے لئے ایک کسان کی لڑکی ایک نوجوان سے بیاہ دی جاتی هے' لڑکی اور لڑکا دونوں شادی پر راضی نہیں تھے - ان کے اپنے ارادے' اپنی آرزوئیں تھیں جنھیں اس جابرانہ حرکت نے خاک میں ملادیا' اور ان بیچاروں کی زندگی برباد ہوگئی "بدنصیب آن تون" (۱۸۴۸) بھی اس قسم کے ظلم و جبر کا قصہ ہے' اور اسی دلگداز طریقے سے بیان کیا گیا ہے " شمیدوت کی وادی" (۱۸۵۰) " ماهی گیر " (۱۸۵۳) اور " نوآباد " میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کا ظلم اور فطرت اور آب و ہوا کی بے دردی' چکی کے پاٹ بن کر بیکس کسانوں اور انھیں جیسے غریب اور مظلوم مزدوروں اور ادنی درجے کے پیشہ وروں کو پیس ڈالتے ہیں - ۱۸۵۵ کے بعد گریگوروروچ نے صرف دو ناولیں اور ایک آپ بیتی لکھی' اور باقی وقت مصوری میں صرف کیا - لیکن ۱۸۵۵ تک کی تصانیف سے اس کا اصلاحی مقصد پورا ہوگیا تھا' اور اس نے روسی قوم کے ضمیر کو اس حد تک بیدار اور زود حس کردیا تھا کہ کسانوں کو آزاد کرنے کی خواهش عام ہوگئی —

---

* ۱۸۶۱ تک کسان زمیندار کی ملکیت تھے' اور زمیندار کو ان پر هر طرح کا اختیار تھا سوائے قتل کے —

† یورپ میں بھیک مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ فقیر ایک بڑا ارگن باجا سڑک پر کھڑے ہوکر بجاتے ہیں اور پھر رهگیروں سے اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں —

کچھہ نقاد ایسے ہیں جو گریگورووچ کو روس کے بہترین ناول نویسوں میں گنتے ہیں اور تالستائی اور تورگنیف کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں ' لیکن اس رائے میں بہت سی سیاسی اور معاشرتی اغراض شامل ہیں ' جنھیں صحیح ذوق ادب سے کوئی واسطہ نہیں گریگورووچ کے ناولوں میں جذبات پرستی بہت ہے ' کسانوں اور مزدوروں کی سیرت کا اس نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ صحیح نہیں اور جو جذبات اور حوصلے اس نے اپنے قصوں کے اشخاص میں دکھائے ہیں وہ دیہاتی زندگی کی اصلیت سے دور ہیں - گریگورووچ کے قصوں کی ترتیب کا طرز بیان بھی کسی خاص تعریف کا مستحق نہیں ' لیکن اس نے ناول نویسی کے ایک خاص میدان میں هراول کی خدمت انجام دی ہے ' اور هراولوں کی فنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنے میں ہمیشہ رعایت سے کام لینا چاہئے۔

گریگورووچ کے بعد عوام کی زندگی ناول نویسی کا ایک مستقل موضوع بن گئی ' اور حقیقت نگاری کی سب سے ہیبت ناک شکل انہیں ناول نویسوں کی تصانیف میں دکھائی دیتی ہے جنھوں نے عوام کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا —

پی سم سکی - پومیالوت‌سکی- رے شت نی کوت اور ایوی کوت -

الک سیئی فے اوفی لاکتووچ پی سم سکی (۱۸۲۰ - ۱۸۸۱) ایک مفلوک الحال شریف خاندان کا آدمی تھا۔ وہ بہت ذہین تھا مگر بالکل بے اصول ' اور انشاپردازی اس نے پیٹ پالنے کے لئے اختیار کی تھی - اس کے پہلے ناول کی اشاعت دفتر احتساب نے نامنظور کی مگر اس کے بعد کا افسانہ " ایک مہمل آدمی " (۱۸۵۵) بہت مقبول ہوا ' ۱۸۵۸ میں اس کا ناول " ہزار روحیں " جو اس کا کارنامہ ہے ' شائع ہوا - اس ناول میں روس کی قصباتی زندگی کا تاریک پہلو دکھایا گیا ہے ' اور اس کا ہیرو ایک شخص ہے جو کامیابی کا پرستار ہے اور اس

پر اپنی اور دوسروں کی عزت آبرو نہایت خوشی سے قربان کردیتا ھے - وہ ایک غریب لڑکی ناسیتا کو جو اس سے محبت کرتی ھے چھوڑ کر صوبے کے گورنر کی مدخولہ سے روپے کے لالچ میں نکاح کرلیتا ھے' اور اس کی ساری زندگی جھوٹ ' فریب اور دغابازی کا نفرت انگیز سلسلہ بن جاتی ھے - آخر میں اس کا ضمیر اسے کچھہ ستاتا ھے اور وہ ناسیتا سے شادی کرکے اپنا حرام کا مال نیک کاموں میں صرف کرنے کا ارادہ کرتا ھے ' لیکن اس کی زندگی اور اس ماحول کو جس میں ایسی زندگی ممکن ھے دیکھہ کر پڑھنے والے کو یقین ھوجاتا ھے کہ روس بھلے مانسوں کے رھنے کی جگہ نہیں - " ھزار روحوں " کے بعد پی سم سکی روسی کسانوں کی زندگی کے متعلق افسانے لکھتا رھا ' اور ان سب میں بھی انسانی فطرت اور خصوصاً روسی سرشت کی طرف سے وھی تعصب ظاھر ھوتا ھے جو ھزار روحوں ' میں اس قدر نمایاں ھے - پی سم سکی کے نزدیک انسان کے عمل کے صرف دو محرک ھیں' لالچ اور شہوت ' اور اس کے افسانے اور ناول سب اسی دعوے کی دلیلیں پیش کرتے ھیں - یہ عقیدہ قابل اعتراض ضرور ھے ' مگر اس کی وجہ سے پی سم سکی کی حقیقت نگاری پر کوی حرف نہیں آتا ' بلکہ یہ ماننا پڑتا ھے کہ اس کے کیرکٹر گریگورووچ کے مقابلے میں اصلیت سے زیادہ قریب ھیں ' اور وہ مصور بھی بہت اعلیٰ درجہ کا ھے - ناولوں اور افسانوں کے علاوہ پی سم سکی نے ایک ڈراما " پھوٹی تقدیر " بھی لکھا ھے جس میں یہ دکھایا گیا ھے کہ محض اس قانون * کی وجہ سے جو ایک انسان کو دوسروں پر نا جائز حقوق دے دیتا ھے اچھے خاصے نیک دل آدمی کیسے بد ھو جاتے ھیں اور ان کے اخلاق کس قدر بگڑ جاتے ھیں —

---

* یعنی وہ قانون جس کے رو سے کسان زمیندار کی ملکیت بنا دیے گئے تھے —

پی سم سکی کے بعد اس رنگ کی حقیقت نگاری کا فرض پومیاں لوت سکی (۱۸۳۵ - ۱۸۶۳) رے شت نی کوت (۱۸۴۱ - ۱۸۷۱) اور لے وی توت (۱۸۴۲ - ۱۸۷۷) نے ادا کیا یہ حقیقت نگاری فرض اس لحاظ سے تھی که روسی زندگی کے واقعی بہت سے تاریک پہلو تھے ' اور روشن خیال روسیوں پر لازم تھا کہ ان سے خود واقفیت حاصل کریں اور دوسروں کو آگاہ کریں پومیاں لوت سکی اور رے شت نی کوت دونوں دیہاتی پادریوں کے لڑکے تھے ' اور ان کی آواز سب سے پہلے اُن تعلیم گاھوں اور مدرسوں کے خلاف بلند ھوئی جن میں پادریوں کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی ' ان تعلیم گاھوں کے مدرس عموماً شرابی اور آوارہ مزاج ہوتے تھے ' ان کی معلومات اس قدر محدود تھی کہ وہ کسی طرح معلمی کے اھل نہیں تھے ' ان کے نزدیک تعلیم کے معنی بس یہ تھے کہ چند کتابیں زبانی یاد کرلی جائیں - طالب علموں پر ھر قسم کی بیجا سختیاں کی جاتی تھیں ' اور ذرا ذرا سی بات پر ان کے کوڑے لگائے جاتے تھے - پادریوں کی تعلیم گاھوں کی ظالمانہ سزائیں برداشت کرنے کے ساتھ ھی ان دونوں ناول نویسوں نے افلاس ' فاقہ کشی اور سردی کی سختیاں بھی بہت جھیلیں ' اور اپنی اور پرائی مصیبتیں ان دونوں کی اکثر تصانیف کا موضوع ھیں - پومیاں لوت سکی کے مشہور ناول دو ھیں ' "دنیاداروں کا سکھ" "اور مولوتوت" جن میں اس نے ان غریبوں کی ذھنیت دکھائی ھے جو معاشرتی نظام کی نا انصافی محسوس کرتے ھیں ' اسے درھم برھم کرنا اپنا فرض سمجھتے ھیں ' مگر ھمت ھار کر یا تو چین سے دن گزارنے کی فکر میں پڑ جاتے ھیں یا ایسے بیزار ھو جاتے ھیں کہ ایزارسانی کے سوا انھیں اور کوئی شغل پسند نہیں آتا - مگر رے شت نی کوت کے کیرکٹر اس احساس سے بھی محروم ھیں - جس

صوبہ میں رے شت نی کوت کی ولادت اور پرورش ہوی وہ یوروپی روس میں شامل تھا، مگر وہاں کے رہنے والے نیم وحشی تھے، اور ہرگز اس لائق نہ تھے کہ انسان کہلائیں - رے شت نی کوت نے " اہل پودلی پووا " کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے جس میں ان لوگوں کی معاشرت اور ذہنیت بیان کی ہے، اور اس ناول کو پڑہ کر واقعی رونا آتا ہے - یہ لوگ تو پھر بھی نیم وحشی تھے۔ " حضرات گلوموت " جس میں کوہ اورال کی کانوں کے مزدوروں کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور بھی زیادہ درد ناک ہے اس میں وہ مصیبتیں جن کا ہر غریب کو جو روٹی کا محتاج ہو سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ظلم جو انسان اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار پا کر دوسروں پر کرتے ہیں، اور بھی زیادہ بھیانک شکل میں نظر آتا ہے —

" اجنبی لوگوں " میں رے شت نی کوت نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے، اور اس کی داستان بھی بے انتہا پر درد ہے - پادریوں کے اسکول میں اس نے ایک ہی دن میں دو دو بار کوڑے کھائے، اسکول چھوڑ کر بھاگ گیا، فاقہ کشی کی، ایسے رہبانوں کی صحبت میں رہا جو رات کو خانقاہ سے چھپ کر نکل جاتے تھے اور آوارہ عورتوں کے یہاں دن بھر کی عبادت کی تلافی کرتے تھے - تعلیم ختم کرنے پر اسے نوکری ملی، مگر اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ پیٹ بھرنے اور تن بدن ڈھکنے کو بھی کافی نہ ہوتی تھی - آخر عمر تک رے شت نی کوت کی حالت یہی رہی شہر کی زندگی بھی اسے دیہات سے کسی طرح بہتر نہ معلوم ہوئی، اور اپنے دو آخری ناولوں میں اس نے شہر کے غریبوں کا حال سنایا ہے - رے شت نی کوت کی " کھری بات " ضرب المثل ہے، اور یہ کھری بات وہ اپنے خاص انداز سے کہتا ہے - اس کے ناولوں میں ہیرو نہیں ہوتے، صرف انسانوں کے گروہ ہوتے ہیں جن میں سب لوگ ایک دوسرے سے بہت

مشابہ ہوتے ہیں ' کسی کو کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں ہوتا اور مختلف افراد کی صورتیں اور سیرتیں بہت مشکل سے اور رفتہ رفتہ پہچانی جاتی ہیں اُسے انسان کی ذات سے زیادہ اس فضا سے سروکار ہے جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے ' اور اس کے ناولوں میں شروع سے آخر تک در اصل یہی فضا جو دلچسپی کا مرکز ہوتی ہے - رے شت نی کوت کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ روس کے دور افتادہ صوبوں ' قصبوں اور شہروں میں یہ فضا لوگوں کی قسمت کس طرح پست کردیتی ہے ' وہ اپنی انسانیت محفوظ رکھنے کے لئے کیوں کر ہاتھ پیر مارتے ہیں اور آخر میں بھوک یا شراب انہیں کیسے تباہ کر دیتی ہے - رے رشت نی کوت کی مصوری کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ آدمیوں کا بھوک سے ایڑیاں رگڑ کر مرنا دکھلاتا ہے یا ان کا شراب خواری کی عادت میں اس طرح مبتلا ہوجانا کہ ان کی قوت ارادہ بالکل معطل ہوجاتی ہے - لے وی توت ' پومیا لوت سکی اور رے شت نی کوت کی طرح پادریوں کے خاندان سے تو نہیں تھا ' لیکن اس نے بھی غربت اور افلاس کی انتہائی مصیبتیں جھیلیں اور اس کی عمر کا زیادہ تر حصہ غریبوں کی صحبت میں گذرا - شہر کے غریبوں کے حالات اس نے اپنے دو آخری ناولوں میں بیان کئے ہیں ' اور اس شہری غاروں کے کیرکٹر ایسے ہیں کہ ناول میں ان کا حال پڑھ کر بھی ' ہیبت طاری ہو جاتی ہے - مگر لے وی توت کا کارخانہ اس کا پہلا ناول ہے ' جس میں اس نے اپنے وطن کے مناظر اور اپنی بچپن کی زندگی کا قصہ سنایا ہے —

حقیقت نگاری کا وہ طرز جو ان تینوں ناول نویسوں نے اختیار کیا ' روشن خیال روسیوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے بہت ضروری تھا ' لیکن سچ پوچھئے تو یہ ایک بند گلی تھی جس میں پہنچ کر باہر نکلنا دشوار ہو گیا' ناول نویسی کا ایک مقصد یہ ضرور ہے کہ انسان کو عام زندگی سے واقف اور

وابستہ رکھے ' کیوں کہ اس کے بغیر تہذیب میں اصلیت اور اخلاقی معیار میں صحت پیدا نہیں ہوتی - مگر وہ ناول نویس جو اپنا مقصد صرف اصلی حالات بیان کر دینے تک محدود رکھے آرٹ کے اعلی معیار پر پورا نہیں اتر سکتا ' اور خواہ وہ انشا پردازی میں کتنا ہی کمال دکھائے اس کی تصانیف کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو ایک سرکاری رپوٹ کی - پومیا لوت سکی ' رے شت نی کوت اور لے وی توت کے ناول انشاپردازی کے بہت اچھے نمونے ہیں ' لیکن ناول نویسی میں ان کا رتبہ بلند نہیں' کیونکہ وہ دکھاتے بہت کچھ ہیں ' سمجھاتے کچھ بھی نہیں ' ضمیر کو بے چین کر دیتے ہیں مگر نہ ذہن کو روشن کرتے ہیں نہ دل میں حوصلے پیدا کرتے ہیں —

عوام کی زندگی ' جو روسی تہذیب کے ماتھے پر کلنک کے ٹیک سے کم نہ تھی ' لے وی توت کی تصانیف کے بعد پھر صدی کے آخر میں میکسم گور کی ناولوں میں نظر آتی ہے' اس درمیان میں لوگوں کی توجہ دوسرے مسائل کی طرف منتقل ہوگئی تھی ' ناول نویسوں نے خوش حال اور تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت ' ان کی کوششوں اور کوششوں کے انجام کو اپنا موضوع بنا لیا تھا —

اوان الک سے یوچ گونچروت (۱۸۱۴ - ۱۸۹۱)

گونچروت دولت مند زمینداروں کے گھرانے میں پیدا ہوا ' اور اس کی ساری زندگی آسائش اور آرام سے گذری - انشاپردازی کا سلسلہ اس نے ۱۸۴۷ میں " ایک روز مرہ کی کہانی سے " شروع کیا - اس کے دوسرے سال ایک ناول اوب لوموت کے پہلے چند باب ایک اخبار میں نکلے ' مگر یہ ناول ختم دس سال کے بعد ہوا - اس عرصے میں گونچروت نے ایک جہاز پر دنیا کا سفر کیا اور اپنے سفر کے حالات جہاز پے لیس کے عنوان سے شائع کیے - اس کی بقیہ عمر کی ادبی کارگزاری کل دو تصانیف ہیں ' ایک ناول " دریا کے اونچے کنارے پر "

اور ایک اس کی " آپ بیتی " —

" روزمرہ کی کہانی " ایک روسی نوجوان کا قصہ ہے - اس کے پیش نظر زندگی کے دو طریقے ہیں جن میں سے ایک اسے انتخاب کرنا ہے - ایک تو یہ کہ وہ ایک غریب مگر نہایت زندہ دل ' محبت کیش اور بلند حوصلہ لڑکی سے شادی کرے اور اس کی محبت اور رفاقت کو اپنی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بنائے - دوسرا یہ کہ وہ ایک امیر مگر نکمی لڑکی کا شوہر بن کر چین سے زندگی گذارے - نوجوان امیر لڑکی کا انتخاب کرتا ہے - اس سے گونچروف کو یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اعلیٰ مقاصد کا ادنیٰ دنیاوی اغراض پر قربان ہونا ' انسانیت کا حیوانی عیش و آرام کے بدلے فروخت ہونا روس میں ایک روز مرہ کی کہانی ہے - " دریا کے اونچے کنارے پر " تالستائی کے ناول " جنگ اور امن " کی طرح روسی زندگی کی تصویر بہت بڑے پیمانے پر کھینچنے کی کوشش ہے ' مگر گونچروف اس کام کے لئے موزوں نہیں تھا اور یہ ناول ناکامیاب رہا - اس کا اصل کارنامہ اوب‌لوموف ہے اور اسی کی بنا پر وہ روس کے سب سے بڑے ناول نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے —

اس ناول میں گونچروف نے اپنے ہیرو اوب لوموف کو ایک پینتیس برس کے خوش حال زمیندار کی شکل میں جمود اور کاہلی کا ایک مجسمہ پیش کیا ہے جو روسی سرشت کیا نوع انسان کا ایک مثالی نمونہ ہے - اوب لوموف نہایت نیک ' سیدھا سادا آدمی ہے جو کسی کی نسبت برے خیال بھی اپنے دل میں نہیں آنے دیتا ' اس کی استعداد بہت اچھی ہے ' موسیقی میں ستھرا مذاق رکھتا ہے ' اسے انشاپردازی کا شوق ہے ' اور جب کبھی مجبور ہوتا ہے تو تقریر بھی بہت اچھی کرلیتا ہے ' اس کی صورت اور طور طریق سے شرافت ٹپکتی ہے ' دوسروں کا غم اسے بے چین کردیتا ہے ' اسے دل سے

یہ آرزو ہے کہ دنیا سے درد اور تکلیف کو مٹادے، اور اپنی انسانی ہمدردی ثابت کرنے کے لئے وہ بہت دنوں سے سوچ رہا ہے کہ اپنے کسانوں کو آزاد کردے لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھہ اس میں ایک عیب ہے جو ان سب پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ عیب اس کی کاہلی ہے جو اس کی طبیعت پر اس قدر حاوی ہے کہ اس کی شخصیت کو کسی طرح ابھرنے نہیں دیتی، اور وہ ذہنی اور اخلاقی سرمایہ جو قومی زندگی کی تعمیر میں کام آسکتا تھا بڑے افسوسناک طریقے پر ضائع ہوتا ہے۔ اوب لوموف کا دل کچھہ بھی کہتا ہو اور کچھہ بھی چاہتا ہو، اس کی کاہلی نے اسے جو منطق سکھائی ہے وہ سب کچھہ رد کردیتی ہے، اور جو مسئلہ درپیش ہو، خواہ پلنگ سے اٹھنا یا کسانوں کو آزاد کرنا اُوب لوموف اس کے ہر پہلو پر غور کرنے میں، اس کی اونچ نیچ سوچنے میں رہ جاتا ہے اور عمل تو ایک طرف ارادہ کرنا بھی اس کے لئے ایک سہم بن جاتا ہے جو کبھی سر نہیں ہوتی۔

ناول کے پہلے حصے میں گونچروت نے اوب لوموف کی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے اور اس کی زندگی کے ایک دن کی سرگذشت سنائی ہے۔ اوب لوموف کی صورت شکل اچھی ہے، مگر کوئی خاص بات نہیں جو قابل ذکر ہو۔ قد لمبا ہے جسم ذرا بھاری، آنکھوں سے نیکی ٹپکتی ہے جو قریب قریب معصومیت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے میں نرمی ہے، اور انتہائی سکون کی ایک کیفیت جو ہر وقت قائم رہتی ہے، کیوں کہ وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتا اور اس لئے نہ تھکتا ہے نہ اس کی طبیعت اکتاتی ہے۔ اس کا "شغل" لیٹے رہنا ہے۔ لیٹے رہنا اوب لوموف کے لئے نہ تو ضروری تھا، جیسے مریض کے لئے، یا اس شخص کے لئے ہوتا ہے جو سونا چاہتا ہے، نہ اتفاق کی بات تھی، جیسے اس شخص کا لیٹنا جو تھک گیا ہو، نہ لطف

حاصل کرنے کا ذریعہ ' جیسے کاہلوں کے لئے ہوتا ہے - اس کی زندگی کا معمول ہی یہ تھا کہ لیٹا رہے - جس دن کا ذکر ہے " وہ بہت سویرے جاگ اٹھا یعنی آٹھ بجے ' یہ اس کی عادت کے خلاف تھا - کسی وجہ سے وہ بہت متفکر تھا ' اس کے چہرے پر وقتاً فوقتاً ایک کیفیت ظاہر ہوتی تھی جو نہ بالکل خوف کی تھی اور نہ بالکل مایوسی یا پریشانی کی ' معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں ایک قسم کی جنگ جاری ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کے لئے عقل ابھی موقع پر پہنچ نہیں پاتی ہے - واقعہ یہ تھا کہ کل اوب لوموف کے پاس اس کے گانو کے مکھیا کا ایک خط آیا تھا جس میں ناگوار خبریں تھیں - مکھیا جو ناگوار خبریں سنا سکتا ہے وہ ظاہر ہیں ' فصل خراب ہوئی ' کسان لگان ادا کرنے میں سستی کررہے ہیں ' آمدنی کم ہوگی - " اس خط کا اوب لوموف پر بہت اثر ہوا ' اور اسے یقین ہو گیا کہ اس مسئلے کا قطعی فیصلہ کرنا ناگزیر ہے - " آنکھ کھلتے ہی اس نے ارادہ کیا کہ فوراً اٹھ بیٹھوں گا ہاتھ منہ دھوکر چائے پینے سے پہلے خوب غور کروں گا ' کوئی تدبیر سوچوں گا ' مکھیا کو خط لکھ بھیجوں گا ' اور اس معاملے میں جیسی چاہئے سر گرمی دکھاؤں گا - مگر وہ آدھ گھنٹے تک پڑا رہا ' اور اپنے اس ارادے کی وجہ سے پریشان ہوتا رہا ' پھر اس نے طے کیا کہ چائے کے بعد بھی اس پر غور کیا جاسکتا ہے ' اور چائے حسب معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے پی جا سکتی ہے ' اور لیٹے لیٹے غور کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں ... ساڑھے نو بج گئے - اوب لوموف چونکا - اس نے پریشان ہوکر زور سے کہا " یہ میں آخر کر کیا رہا ہوں ؟ آخر انسان میں کچھ غیرت بھی تو ہونی چاہئیے - اب کام میں جت جانے کا وقت آگیا ہے ! جہاں طبیعت کو ذرا ڈھیل دی اور بس " ... اس نے اپنے نوکر کو پکارا " زخار ! " جب تک زخار پہنچے پہنچے اوب لوموف پھر خیالات میں ڈوب گیا '

اور زخار کے آنے کی اسے بہت دیر تک خبر ہی نہ ہوئی - زخار اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا - آخر کار وہ کھانسا - اوب لو موت نے پوچھا " کیا ہے " ؟

" آپ ہی نے تو بلایا تھا " —

اوب لوموت نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا

" بلایا تھا ؟ ہاں ' آخر میں نے کس لئے بلایا تھا ؟ کچھہ یاد نہیں ! خیر ابھی تو تم جاؤ ' پھر شائد مجھے یاد آجائے " زخار چلا گیا اور اوب لوموت لیٹا لیٹا اس کمبخت خط کے بارے میں سوچتا رہا ' یوں ہی وقت گزرتا جاتا ہے - اوب لو موت کو وقت کے گذرنے کا احساس ہے ' وہ بار بار چونک اٹھتا ہے ' زخار کو بلاتا ہے ' کبھی خط کے لئے ' کبھی رومال تلاش کرنے کو ' کبھی اس سے کہتا ہے منہ دھونے کا سامان تیار کرو - مگر ہر دفعہ انجام یہی ہوتا ہے کہ اوب لو موت پلنگ پر پھر لمبا لمبا لیٹ جاتا ہے - زخار اس سے کہتا ہے اور اس سے پہلے کئی مرتبہ کہہ چکا ہے کہ مالک مکان نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہے ' اور اس خبر سے اوب لو موت کو بہت پریشانی ہوتی ہے ' مگر یہ محرک بھی اسے حرکت میں لانے کے لئے کافی نہیں - زخار اسے سمجھاتا ہے کہ مالک مکان کو خط لکھہ کر نوٹس واپس لے لینے پر آمادہ کرلے - اوب لو موت لکھنے کا وعدہ کرتا ہے ' مگر اس وقت نہیں پھر کبھی ' اسی گفتگو کے دوران میں دروازے کی گھنٹی بجتی ہے ' وول کوت ' ایک نوجوان جس سے اوب لو موت کی جان پہچان ہے ' اس سے ملنے آیا ہے —

وول کوت ان لوگوں میں سے ہے جو ملنے جلنے اور ناچ گانے کے شوقین ہوتے ہیں ' اور سارا دن ایک کے یہاں سے دوسرے کے یہاں اور وہاں سے تیسرے کے یہاں جانے میں اور گپ شپ کرنے میں صرف کرتے ہیں - وہ اوب لو موت کو اپنے کپڑے دکھاتا ہے ' اپنی خوشگوار مصروفیتوں کو تفصیل سے بیان

کرتا ھے ' اور خوشی سے کہتا ھے کہ مجھے دن بھرمیں دس جگھہ مہمان ھونا پڑتا ھے ۔ اوب لو موف یہ سن کر تعجب سے پوچھتا ھے کہ اس بے فائدہ دوڑ دھوپ سے تمھاری طبعیت کیوں نہیں گھبرا جاتی اور جب وہ چلا جاتا ھے تو اوب لوموف لیٹے لیٹے سوچتا ھے :

" ایک دن میں دس جگہ ۔ کیا بدقسمت آدمی ھے ! اور اسی کا نام ھے زندگی ! ... پھر انسانیت آخر کیا شے ھے ؟ یہ شخص خدا جانے کیوں اپنی ھستی کو پاش پاش کرکے بکھیر رھا ھے ؟ کبھی کبھی تھیٹر میں جھانک لینے ' کسی خوبصورت لیڈیا * پر عاشق ھوجانے میں تو کوئی حرج نہیں ... مگر ایک دن میں دس جگہ جانا ! کیا بد قسمت آدمی ھے ! " اوب لو موف نے یہ کہہ کر کروٹ بدلی ' پیٹھہ کے بل لیٹ گیا اور اس پر خوش ھوا کہ وہ ایسے فضول مشاغل اور خیالات نہیں رکھتا ' دوڑ دھوپ نہیں کرتا ' اطمینان سے لیٹا ھے اور نہ اس نے اپنا انسانی وقار کھویا ھے اور نہ سکون قلب —

وول کوف کے بعد اور لوگ اوب لو موف سے ملنے آتے ھیں اور ھر شخص اسے اپنے اپنے طرز پر زندگی اور زندگی کی جدو جہد سے دلچسپی دلانا چاھتا ھے ۔ اوب لو موف باتیں کرتا رھتا ھے ' جو سننے پر آمادہ ھوا اسے اپنی دونوں مصیبتوں کا حال سناتا ھے ' یعنی مکھیا کے خط کا اور مالک مکان کے نوٹس کا ۔ مگر سب کچھہ لیٹے لیٹے ۔ لوگ آئے اور چلے گئے اور وہ اسی طرح لیٹا ھے ۔ اس وقت تک اس نے منھہ بھی نہیں دھویا ۔ زخار نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اوب لو موف کو کوچ پر سر کے نیچے ھاتھہ رکھے لیٹا پایا۔ اس کے سامنے کتاب رکھی تھی ۔ زخار نے دروازہ کھول دیا ۔ اس نے پوچھا " یہ آپ پھر کیسے لیٹ گئے ؟ "

* اکثر لڑکیوں کا نام ھوتا ھے —

اوب لوموت نے ایک سانس میں جلدی سے کہا " کام میں حرج نہ کرو دیکھتے ہو میں پڑھ رہا ہوں" —

زخار سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا ' اس نے جواب دیا " اب منھ دھونے اور خط لکھنے کا وقت آگیا ہے " اوب لوموت نے کچھ چونکا ہو کر کہا " ہاں ' واقعی وقت آگیا ہے - اچھا ابھی تم ٹھیرو میں ذرا غور کر رہا ہوں " -

زخار کے اصرار کے باوجود اوب‌لوموت نے کتاب کا صفحہ جو پڑے پڑے زرد ہوگیا تھا اس جگہ سے جہاں پچھلے مہینے میں چھوڑا تھا آخر تک پڑھ لیا ' پھر کتاب کو اس کے خاص مقام پر رکھ دیا ' جمائی لی اور اپنی دونوں مصیبتوں کے خیال میں جو اسے بہت تنگ کر رہی تھیں محو ہوگیا ' لیکن اصل معاملے پر غور کرنے کے بجائے وہ اپنی طبیعت کو رنگین اور دل‌ربا خواب دکھا کر بہلانے لگا - یہ خواب کبھی ایک عالیشان مکان اور خوبصورت باغ کے تھے ' کبھی ایسی شاعرانہ دیہاتی زندگی کے جس کی رونق ایک حسین مجسم کیش اور وفادار بیوی کی ذات تھی - پانچ منٹ تک اوندھا لیٹنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ کروٹ لے کر پھر پیٹھ کے بل لیٹ گیا ' اس کا چہرہ ایک نازک دل کش جذبے سے چمک اٹھا ' وہ خوش اور مطمئن تھا مگر گھر کے پاس کسی کے چلانے سے وہ پھر چونک پڑا - اٹھنے ' انگڑائی لینے ' جمائی لینے اور جوتا پہننے کے تمام مرحلے طے کر کے اس نے ناشتہ کیا ' امور خانہ داری حساب کتاب پر زخار سے کچھ بحث کی اور مالک مکان کو خط لکھنے بیٹھا - آدھا لکھ چکا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دو جملوں میں " جو " اور " کہ " دو بار آگیا ہے ' اس پر وہ ایسا شرمندہ اور پریشان ہوا کہ اس نے خط پھاڑ کر پھینک دیا - اتنے میں ڈاکٹر آیا ' اور اس نے اوب لوموت کی شکایتیں سن کر اسے مشورہ دیا کہ فوراً جرمن یا فرانس کی کسی صحت گاہ کو چلے جاؤ ' ورنہ

دل پر چربی چھا جاے گی ۔ اوب لوموت کی مصیبتوں میں ایک اور اضافہ ہوگیا ۔ مگر موت کا خوف بھی اس میں چستی نہ پیدا کر سکا ' بلکہ اس نے چین سے لیٹے رہنے کی آرزو کو اور قوی کردیا ۔ زخار نے صلاح دی کہ سیر کیجئے ' لوگوں سے ملئے جلئے ' تھیٹر میں جائیے ۔ اس پر وہ بہت بگڑا ' اور جب مکان بدلنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوے زخار کی زبان سے نکل گیا کہ " اور سب " بھی ایسا ہی کیا کرتے ہیں تو اوب لوموت آپے سے باہر ہوگیا —

" تومیں " اور سب " کی طرح ٹھیرا ! کیا میں روزی کی تلاش میں پھرتا ہوں ؟ مزدوری کرتا ہوں ؟ کیا میرے پاس کھانے کو کم ہے ؟ کیا میں ایسا دبلا پتلا ہوں کہ ہڈی پسلی کے سوا کچھہ نہ ہو اور جو دیکھے اسے ترس آجاے ؟ کیا میرے پاس کسی چیز کی کمی ہے ؟ میں ہمیشہ تو یہی سمجھتا رہا کہ میرے پاس کام کرنے کو لوگ موجود ہیں ' جو چاہوں وہ لے آئیں گے ' جو کہوں وہ کردیں گے ۔ میں نے خدا کے فضل سے جب سے ہوش سنبھالا اب تک اپنے ہاتھہ سے موزے نہیں پہنے ' میں بھلا کیوں کسی طرح کی تکلیف اٹھاؤں ؟ تمھیں یہ سب معلوم ہے ' تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ' میں کس دلار سے پلا ہوں ' میں نے نہ کبھی یہ جانا کہ سردی کیا بلا ہے نہ یہ کہ بھوک کسے کہتے ہیں ' کوئی حاجت نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو ' آج تک اپنی روزی نہیں کمائی ' کبھی ایسا کام نہیں کیا کہ ہاتھہ پیر میلے ہوں ۔ تو پھر تم میرا اور سب سے کیوں مقابلہ کرتے ہو ؟ کیا میری صحت ایسی ہے

جیسے ان " اور سب " لوگوں کی ہوا کرتی ہے ؟ کیا میں یہ ساری
زحمت برداشت کر سکوں گا ؟ "

پھر اوب اوموت اُس شخص کی طرح جس کی کافی قدر نہ کی گئی ہو ، شکایت آمیز لہجے میں کہتا ہے ، مگر اس کے باوجود میں دن رات فکر میں رہتا ہوں ، محنت کرتا ہوں ، کبھی کبھی سر میں آگ سی جلنے لگتی ہے ، دل معلوم ہوتا ہے بیٹھا جاتا ہے ، رات کو نیند نہیں آتی ، کروٹیں بدلتا رہتا ہوں ، ہر وقت اس فکر میں رہتا ہوں کہ کون سی صورت بہتر ہوگی " اور یہ سب کس کے لئے ؟ اپنے کسانوں کے لئے ، گویا تمہارے لئے ، تم مجھے سر سے کمبل اپیٹے لیٹا دیکھ کر سمجھتے ہوگے کہ میں آرام سے پڑا سورہا ہوں ۔ نہیں اس وقت میں نیند میں نہیں ہوتا ہوں ، بلکہ اس گہری فکر میں ہوتا ہوں کہ اپنے متعلقین کے لئے ہر ضرورت کی چیز کیسے مہیا کروں کہ وہ دوسروں پر حسد نہ کریں ، خدا کی بارگاہ میں میری شکایت نہ کریں ، بلکہ شکر ادا کریں اور میرے لئے بھی دعائیں مانگیں ... مجھے امید ہے کہ تم نے اپنی بد سلوکی محسوس کرلی ہے ، اور اب آئندہ کبھی اپنے آقا کا " اور سبھوں " سے مقابلہ نہ کروگے ۔ اپنی بد سلوکی کا کفارہ تم اس طرح سے دو کہ مالک مکان کو سمجھا بجھا کر راضی کر لو ، اور مجھے مکان بدلنے کی تکلیف سے بچاؤ ۔ تم بھی اپنے آقا کو کیا خوب چین سے رکھتے ہو ! مجھے بالکل بد حواس کردیا ، ممکن ہے کسی نئے مفید خیال کو میرے ذہن میں آنے سے روک دیا ہو اور اس میں نقصان کس کا ہے ؟ تمہارا اپنا ۔ میں نے تمہیں لوگوں کے واسطے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے ۔ تمہارے فائدے کے لئے ملازمت سے دست بردار ہوا ، تمہارے ہی خاطر قید میں پڑا رہتا ہوں ۔ خیر ... دیکھو اب تین بج رہے ہیں ! کھانے کے وقت میں صرف

دو گھنٹے رہ گئے ھیں ' اور دو گھنٹے میں بھلا کیا ھو سکتا ھے ؟ خاک بھی نہیں ' اور کام کا انبار ھے اس لئے میں خط اگلی ڈاک سے بھیجوں گا ' اور گاؤں کے انتظام کی تجویز پر کل غور کروں گا ' اچھا اب میں تھک گیا ھوں ' ذرا دیر لیٹتا ھوں ... ممکن ھے گھڑی بھر سو بھی لوں - تم مجھے ساڑھے چار بجے جگا دینا " اس سرشت اور ذھنیت کا آدمی دنیا میں جو کچھ کرسکتا ھے وہ ظاھر ھے - ممکن ھے اوب لوموت کی ساری عمر اسی طرح کٹ جاتی جیسے یہ دن جس کا حال بیان ھوا ھے - اتفاق سے اس کا بچپن کا دوست شتو لتز اس وقت پیٹر برگ آیا اور اس کی زبردستی سے اوب لوموت نے کچھ دن کے لئے جمود اور کاھلی کی مصروفیتوں کو خیر باد کہہ کر دنیا کو منہ دکھایا - اسی سلسلے میں اوب لوموت کی آخری آزمائش ھوئی ' اور اسے اپنا طرز زندگی اور فلسفۂ حیات بدلنے کا آخری موقع ملا - مگر وہ ھمت ھار گیا اور جمود کے پھندے سے نہ نکل سکا - یہ سرگذشت ناول کے دوسرے حصے میں سنائی گئی ھے —

شتو لتز کے توسط سے اوب لوموت کا تعارف اولگا نامی ایک لڑکی سے ھوگیا ' اولگا شتو لتز کی زبانی اوب لو موت کا سارا حال سن چکی تھی - اس نے ارادہ کیا کہ جس طرح بھی ھو سکے گا اوب لو موت کو راہ راست پر لاؤں گی اور اس کے سوئے ھوئے دل کو جگاؤں گی - وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ھر وقت پرستش کی نہیں تو کم سے کم قدر دانی اور تعریف کی منتظر رھتی ھیں ' وہ سوسائٹی کے اس بیہودہ رواج کی بھی پابند نہ تھی جو ایک طرف تو لڑکیوں کو سکھاتا ھے کہ مردوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں پیش قدمی نہ کریں ' اور دوسری طرف انھیں مجبور کرتا ھے کہ جس صورت سے بھی ھوسکے مردوں کو اپنی طرف متوجہ کریں - سوسائٹی میں اولگا " ناکامیاب " سمجھی جاتی

تھی، اس کی سادگی اور خلوص ، سنجیدگی اور شرافت کی قدر کرنے والے بہت کم
تھے ، اور اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جس کی صحبت اور دوستی میں وہ اپنے
سچے اور کھرے نسوانی جذبات کو ظاہر کرسکے جو نمود اور ظہور کے لئے بے تاب
تھے - اوب لوموت کی طبیعت بھی بناوٹ اور اوچھے پن سے پاک تھی ' اسے ان لغویات
سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جن میں نو جوان لڑکے لڑکیاں اپنا سارا وقت صرف کرتے
ھیں اور سمجھتے ھیں کہ بہت مفید کام کر رہے ھیں - اس کی صاف گوئی
کا یہ حال تھا کہ ملاقات کے پہلے دنوں میں جب شٹولٹز نے اولگا سے کچھہ گانا سنانے
کی فرمائش کی ' اور اولگا نے اوب لو موت سے پوچھا کہ آپ کی کیا خواھش ھے تو
اوب لوموت نے بلا تامل کہدیا کہ میں گانا سنانے کی فرمائش میں شریک نہیں
ھوسکتا ' کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کیسا گاتی ھیں اور میں جھوٹی
تعریف کرنا نہیں چاھتا - لیکن جب اولگا نے گانا سنایا ' اور آخر میں ایک نہایت
پردرد گیت گایا جو اسے خاص طور سے پسند تھا تو اس نے دیکھا کہ اوب لوموت
کی آنکھوں سے آنسو جاری ھیں - اس واقعہ کا اولگا کے دل پر بہت اثر ھوا '
یوں بھی اسے اوب لوموت میں بہت سی ایسی صفات نظر آئیں جو واقعی
قابل قدر تھیں ' اور اس نے نہایت بے تکلفی سے اوب لوموت کو اپنے گھر پر
بلانا ' اسے چھیڑ چھیڑ کر مختلف مسئلوں پر بحث کرنا اور زندگی سے
دلچسپی لینے پر مجبور کرنا شروع کردیا ' رفتہ رفتہ اس نے اوب لوموت
کی جھجھک دور کردی ' اس کی عادتیں کچھہ درست کردیں ' کاهلی کچھہ کم کردی'
دونوں یہ محسوس کرنے لگے کہ ان میں ایسی گہری دوستی قائم ھوگئی ھے جس کے
سامنے اس جذبے کی کوئی حقیقت نہیں جسے عشق کہتے ھیں اور جس کا
دعوی ھر کس و ناکس کیا کرتا ھے - لیکن جب تعلقات اس حد تک پہنچ
گئے اور اوب لوموت نے دیکھا کہ سب کا خیال ھے کہ وہ اولگا سے شادی

کرے گا اور خود اولگا بھی یہی چاہتی ہے تو وہ بہت گھبرایا ۔ چند روز کے لئے اولگا جیسی لڑکی کی خاطر اس نے اپنے فلسفۂ حیات کو معطل کردیا تھا اور طبیعت پر جبر کرکے اپنا پرانا طرز زندگی بدل دیا تھا، لیکن اولگا سے شادی کرنے کے معنی یہ تھے کہ اسے اولگا کی وجہ سے اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لئے انقلاب پیدا کرنا پڑے گا، اور وہ پرانی عادتیں جن میں اس نے پرورش پائی تھی اور جنھیں وہ انسانیت کا جوہر سمجھتا آیا تھا سب ترک کرنی ہوں گی ۔ اولگا کی محبت، اس اعلی زندگی کی تصویر جو اولگا کی شخصیت اور حوصلے اس کا دل لبھانے کے لئے اس کے سامنے پیش کررہے تھے، یعنی وہی محرکات جو کسی دوسرے شخص کو اولگا کی طرف اور زیادہ مائل کرتے، اوب لوموت کو وحشت دلانے لگے ۔ آخر میں اولگا کو بھی یقین ہوگیا کہ اوب لوموت کے جمود اور کاہلی سے لڑنے کی اس میں طاقت نہیں، اور یہ امید کرنا فضول ہے کہ وہ اپنی محبت اور زندہ دلی سے اس خاک کے تودے میں زندگی اور حرکت پیدا کرسکے گی ۔ جس خلوص اور نیک نیتی سے اس نے دوستی کی بنیاد ڈالی تھی، اسی طرح اس نے اسے کھود کر پھینک دیا ۔ اس نے اوب لو موت سے کہدیا کہ "میں سمجھتی تھی تم میں جان ڈال سکوں گی، تمہاری زندگی ویسی ہی ہوگی جیسی میرا دل چاہتا ہے ۔ مگر تم تو زمانہ ہوا مرچکے ۔ میں نے اپنی غلطی پہلے سے نہیں محسوس کی، منتظر رہی ... امید کرتی رہی اور اب دیکھو کیا انجام ہوا" ۔ محبت میں مایوس ہونے، امیدوں کے سرسبز درخت کو مرجھاتے ہوئے دیکھنے سے بڑا سخت صدمہ پہنچتا ہے اس آخری ملاقات کے بعد اوب لوموت اور اولگا دونوں بیمار پڑگئے ۔ بیماری کے بعد اوب لوموت پر اس کا جمود پھر پوری طور سے حاوی ہوگیا، اولگا نے شتولتز سے شادی کرلی، اور اوب لوموت کی دوستی کی یاد ان حسرتوں میں شامل ہوگئی

جو پوری نہ ہونے پر بھی دل کو عزیز رہتی ہیں —

گونچروت نے اوب لوموت کی سیرت میں زیادہ تر اپنی اور روس کے خوش حال زمینداروں کی خصوصیات دکھائی ہیں - اپنی " آپ بیتی " میں اس نے اپنے بچپن کا جو حال سنایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے زمینداروں کے بچوں کی تربیت عموماً ایسی ہوتی تھی کہ بڑے ہوکر سب اوب لوموت کے سے ہوجائیں اور غالباً گونچروت اپنے ہیرو کے جمود کی تصویر کھینچنے میں اس قدر کامیاب اسی سبب سے ہوا کہ وہ اوب لوموت کی اکثر خصوصیات اور رجحانات اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا - روسی آب و ہوا بھی انسان کو جمودی فلسفۂ حیات کی طرف مائل کرتی ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک جمود کا ایک عنصر طبیعت میں شامل نہ ہو انسان کے لئے روس کے سخت جاڑے' جو ہر قسم کی نقل و حرکت مشکل کردیتے ہیں اور مکانوں میں بند رہنے پر مجبور کرتے ہیں' برداشت کرنا ناممکن ہوجائے - جب گونچروت کا ناول شائع ہوا' تو تمام روشن خیال روسیوں نے اس کا اعتراف کیا کہ وہ سب کے سب ایک حد تک اوب لوموت سے مشابہ اور اسی کی طرح جمود کے مرض میں مبتلا ہیں' اوب لوموت روس کی قومی خصوصیات کا مجسمہ قرار دیا جانے لگا' اور لوگوں کو " او بلو موفی رنگ " روسی تاریخ' روسی طرز معاشرت اور روسی فلسفۂ حیات کے ہر پہلو میں نظر آنے لگا - جمود اور کاہلی' آرزوؤں اور امنگوں کی پستی' یہ خوف کہ کہیں جد و جہد' جفاکشی اور دل کے حوصلے پورے کرنے کی فکر میں چین آرام ہاتھ سے نہ جاتا رہے - غرض وہ رنگ جو اوب لوموت کی طبیعت میں اس قدر نمایاں ہے اور " اوبلوموفی " رنگ کہلاتا ہے روس میں واقعی بہت عام ہے - لیکن روس کے باہر بھی اس کی کمی نہیں - دنیا میں کون سا ملک ہے جہاں ایسے لوگ

نہ ملیں جو آرام و اطمینان سے رہنا کامیابی کا صحیح معیار قرار دیتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی آرزوؤں کو خیرباد کہنے پر تیار ہو جاتے ہیں' اگر اس کے بدلے انھیں چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ اُن کے دلوں میں حوصلے ہیں' اُنھیں پورا کرنے کی صلاحیت ہے' اور ان کے پورا ہونے سے قوم اور ملک کو جو فائدہ ہو سکتا ہے اس کا احساس بھی ہے' مگر محض اس خیال سے کہ اس کام کے لئے محنت اور کوشش درکار ہے یہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں' شکایت کرتے ہیں' افسوس کرتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہیں کرتے؟ حوصلہ تو خیر بڑی چیز ہے اور جس قدر گراں مایہ ہے اتنا ہی کمیاب بھی ہے۔ دنیا' اور خصوصاً ہمارے ہندوستان جنت نشان میں لاکھوں ایسے لوگ ملیں گے جو صرف محنت مشقت' فکر اور پریشانی سے بچنے کے لئے انتہائی ذلت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں' اور اپنی پستی میں اس خیال سے تسلی حاصل کرتے ہیں کہ زندگی چاہے جس طرح گذرے' چین سے بیٹھنا تو نصیب ہے اور اُن لوگوں کو حیرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں جن کی نظر سے زندگی کا یہ بھید چھپا رہا' جو سکون اور اطمینان کی قدر نہ کرسکے اور ساری عمر "ہوس" اور کوشش میں سرگرداں رہے۔ جب اوب لوموت سرکاری ملازم تھا اور اسے صبح سے شام تک سرکاری کام میں مصروف رہنا پڑتا تھا' تو وہ اکثر تعجب سے پوچھا کرتا تھا کہ اگر مشاغل کی یہی کثرت رہی تو "سچی زندگی بسر کرنے" کے لئے کس طرح وقت نکل سکے گا' اور اسی "زندگی بسر کرنے" کے اعلی مقصد کی خاطر اس نے بیماری کا بہانہ کرکے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ یہ اعلی مقصد جمود اور کاہلی کا پشت پناہ ہے۔ اوب لوموت کو جب کسی بات کی فکر ہوتی' کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوتا

وہ یہ کہہ کر اپنی طبیعت کو اطمینان دے لیتا تھا کہ "شاڈد، ممکن ہے، کسی نہ کسی طرح" سب کچھہ ٹھیک ہو جائے گا - دوسرے لوگوں کے طریقے اور ہیں، دوسری زبانوں کی اصطلاحات جدا ہیں، لیکن کسی بے سروپا امید پر بھروسا کرکے کوشش اور فکر کو بیکار سمجھنا انسانی سیرت کی ایک صفت ہے جس کے لئے ملک اور نسل کی کوئی قید نہیں —

گونچروت نے اوب لوموت کے مقابلے میں اس کے دوست شٹولٹز کا کیرکٹر رکھا ہے، اس لئے اکثر روسی نقادوں نے یہ فرض کرلیا کہ شٹولٹز اس مکمل اور کامیاب شخصیت کا نمونہ ہے جس کا حاکہ کھینچنے کی کوشش اس دور کے ناول نویس کیا کرتے تھے، اور چونکہ شٹولٹز کی شخصیت ایک معمولی جرمن تاجر کی سی تھی، اس لئے گونچروت کی تصنیف کا یہ پہلو بہت کمزور قرار دیا گیا، لیکن دراصل شٹولٹز ایک پس منظر کا کام دیتا ہے، اور اس کی طبیعت اور طرز زندگی کے تقابل سے اوب لوموت کی خصوصیات زیادہ واضح، اس کی سرگزشت اور زیادہ عبرت انگیز اور درد ناک ہو جاتی ہے - ناول میں شٹولٹز کا اس کے سوا اور کوئی مصرف نہیں، اور اس لحاظ سے اس کا کیرکٹر بہت صفائی اور کامیابی سے دکھایا گیا ہے - البتہ اولگا کی شخصیت اپنا خاص مقصد رکھتی ہے - جو حصہ وہ اوب لوموت کی زندگی میں لیتی ہے اس سے قطع نظر کرکے اس کی اپنی ذات بھی اوب لوموت کی طرح مثالی اہمیت رکھتی ہے - گونچروت نے اسے اس حوصلہ مندی اور بے چینی، جفاطلبی اور جفاکشی کا مجسمہ بنایا ہے جو زندگی کی اصل زینت اور انسانیت کا جوہر ہے - اولگا کی شخصیت میں وہ کشش، اس کی محبت میں وہ جادو ہے جو جوانمردوں کو اعلی اخلاقی مقاصد کا شیدائی بنا دیتا ہے اور انہیں دائمی جستجو میں محو رکھتا

ہے - دنیا میں بہت کم ایسی عورتیں ملتی ہیں جن میں ان صفات کا پر تو بھی ہوتا ہے ' اور گونچروف اگر نمونے کے لئے اولگا سے ملتی جلتی کوئی لڑکی تلاش کرتا تو اسے غالباً ناکامیابی ہوتی ' لیکن اس کے با وجود اولگا کے جسمانی اور روحانی سراپا میں ایک نقش بھی نہیں جس پر تصنع یا مبالغے کا شبہہ ہو - اولگا اور اوب لوموت کا ملنا اور مایوس ہو کر جدا ہو جانا ایک بہت معمولی داستان ہے - لیکن وہ ایک عاشق کی کہانی بھی ہے جو اپنے عشق میں فنا ہونے سے ڈر جاتا ہے ' ایک کم ہمت انسان کی جو انسانیت کے شرف اور عظمت کو انتہائی دلربا شکل میں دیکھ کر بھی اپنے آپ کو اس کی صحبت سے محروم رکھتا ہے ' اور انسانیت کی ذمہداریوں سے گریز کرکے نباتات کے سے جمود میں پناہ لیتا ہے ' اس سے زیادہ پردرد اور کونسی کہانی ہوسکتی ہے - مگر افسوس کہانی بہت عام ہے اور ہماری زندگی میں روز مرہ کی بات ہے —

نواب اعظم اور مشاعرۂ اعظم

تقریباً سو سال پہلے مدراس میں فارسی ادب کا مذاق

۷۵ سال قبل کا ایک سرکاری مشاعرہ

از

(جناب مولوی محمد حسین محوی صدیقی)

۱ - نواب اعظم

والیان کرناٹک میں تقریباً سب کے سب خوش ذوق اور علم و ادب کے قدر داں تھے - اُن کے زمانوں میں فارسی شعر و سخن اور علم و فن کی ایک حد تک گرم بازاری رہی ہے - مگر ان سب میں اس خاندان کے آخری نواب محمد غلام غوث خاں اعظم کی ہستی اپنے ادبی ذوق کے لحاظ سے بہت نمایاں ہستی تھی - یہ علم و فضل میں بھی اپنے پیشرؤں سے بہتر تھے اور سخاوت و فیاضی میں بھی - علم و فضل کی قدر دانی اور شعرا نوازی کے لحاظ سے تو تمام خاندان انوریہ میں ممتاز تھے - آخر اِنھیں پر اِس خاندان کی خصوصیات کا خاتمہ ہو گیا اور امارت کا بھی —

نواب اعظم نسباً فاروقی تھے - ان کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے بتیس واسطوں سے خلیفۂ ثانی سیدنا حضرت عمر رضی‌الله عنه تک اور ماں کی

جانب سے چھبیس واسطوں سے حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے جو نواب ضیاءالدولہ حیدرآبادی کی صاحبزادی اور نواب ضیاءالملک کی پوتی تھیں۔ ریاست کرناٹک کے بانی نواب انورالدین خاں * گوپا مئو اودھ کے مشہور قصبے کے باشندے تھے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر رحمۃاللہ علیہ کے عہد میں نواب آصف جاہ اول کے ہمراہ دہلی سے دکن آئے اور دکن سے ارکات کے ناظم ہوکر یہاں پہنچے۔ سنہ ۱۱۶۴ھ میں بہ مقام آمبور حسین دوست خاں کے معرکے میں یہ شہید ہوے۔ ان کی شہادت کے بعد خاندان انوریہ کے سب سے پہلے با اختیار رکن نواب شہید کے بڑے فرزند نواب والا جاہ اس کے مالک موروثی بن گئے۔ اور سنہ ۱۱۶۵ھ سے لے کر سنہ ۱۲۱۰ھ تک یہ کرناٹک کے مالک تخت و تاج رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب عمدۃالامرا بہادر غفران مآب نے باپ کا موروثی تخت پایا اور چھ سال یعنی سنہ ۱۲۱۶ھ تک یہ حکمراں رہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے کو نہیں بلکہ اُن کے بھتیجے نواب عظیم الدولہ بہادر رحمت مآب کو انگریزی سرداروں نے مسند ریاست پر رونق افروز کیا۔ یہ نواب امیرالامرا مغفرت دستگاہ کے خلف رشید تھے، سنہ ۱۲۳۴ھ میں انھوں نے بھی انتقال کیا۔ ان کے مرنے پر ان کے بیٹے نواب اعظم جاہ بہادر رضوان مآب مسند آبائی پر زیب افزا ہوے۔ اُنھوں نے چھ سال حکومت کر کے سنہ ۱۲۴۰ھ میں، عین عالم شباب میں عالم بقا کو کوچ کیا۔ وابستگان دولت نے اُن کے بیٹے نواب اعظم کو مالک حکومت بنایا، جب کہ ان کی عمر صرف پندرہ مہینے کی تھی۔ اس طرح یہ اقبال مند نواب زادہ گویا پیدا ہوتے ہی صاحب تخت ہوگیا —

ولادت

نواب اعظم ۲۹ ذی حج سنہ ۱۲۳۹ھ کو بدھ کے دن دس بجے کے وقت پیدا ہوے اور ابھی سوا سال ہی کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور یہ

---

* وفات سنہ ۱۱۶۴ھ۔

گرد یتیمی میں آلودہ ہوگئے - باپ کی وفات کے بعد چالیسویں دن ارباب حکومت کی رائے سے یہ وارث ریاست قرار پائے اور امور سرکاری کی انجام دہی کے لئے ان کے حقیقی چچا نواب عظیم جاہ بہادر کو انگریزوں نے ۱۸ سال تک کی عمر کے لئے ان کا نائب اور اتالیق مقرر کیا۔ ان کا پورا نام اور خطاب وغیرہ یہ ہے : " امیرالہند والا جاہ ' عمدۃ الامرا ' مختارالملک ' عظیم الدولہ نواب محمد غوث خاں بہادر شہامت جنگ - " اور ان کے باپ کا پورا نام و خطاب یہ ہے : " امیرالہند اعظم جاہ فخرالامرا ' مدارالملک روشن الدولہ نواب محمد منورخاں بہادر جنگ سپہ سالار صوبہ‌دار ملک کرناٹک " —

تعلیم و تربیت

پانچ سال کی عمر میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا ' نواب مکتب میں بیٹھے - حصول علم پر کمر ہمت باندہ کر اپنی پوری توجہ مبذول کی - حافظ محمد مکی اور ان کے فرزند حافظ عبدالولی کی خدمت میں کلام اللہ شریف ختم کیا - پھر فارسی تعلیم کی جانب متوجہ ہوے اور ابتدائی کتابیں اخلاق محسنی تک مولوی غلام محی الدین خوشنویس اور اُن کے فرزند مولوی جلال الدین حسین خاں کی خدمت میں پڑھیں - ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد اس کا تکملہ حضرت والا * کے حضور میں کیا - یعنے بوستان ' انشائے خلیفہ ' زلیخا ' گلشن سعادت ' رسالۂ عبدالواسع ختم کرلیں - پھر بڑی کتابوں کی طرف توجہ کی - نثر میں : سہ نثر ظہوری ' پنج رقعہ ' مینا بازار ' رسائل طغری مشہدی ' انشائے بیدل ' انشائے نعمت خان عالی ' مثنویات میں : سکندر نامہ اور مثنوی راسخ - علم اخلاق میں اخلاق جلالی - دواوین میں دیوان مظہر ' دیوان غنی دیوان ناصر علی سرہندی ' دیوان جلال اسیر اور مولانا آزاد بلگرامی کے سات عربی دواوین " سبعہ سیارہ " میں سے پہلا عربی دیوان پڑھا - پھر علم عروض کی

* ان کا بیان آگے آئے گا —

کچھہ کتابیں - فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی جانب توجہ کی - شرح مُلا جامی تک ابتدائی کتابیں مولوی جمال احمد کی خدمت میں پڑھیں عقائد ' فقہ ' حدیث کی کتابیں بقدر ضرورت قاضی الملک بہادر ' اور مولانا ارتضا علی خاں گوپاموی سے پڑھ کر حصہ وافی بہم پہنچایا - عربی فارسی خط کی مشق ' خوش نویس موصوف اور عنایت حسین خاں سے کی - غرض کہ ۱۷ سال کی عمر میں کتب فارسیہ کی سند تکمیل سید ابو طیب خاں والا * سے حاصل کرکے مشق سخن کا سلسلہ شروع اور میدان شہرت میں علم افتخار بلند کیا —

ذوق سخن اور تلمذ

نواب کی طبیعت میں ملکۂ شاعری فطرت ہی کی جانب سے ودیعت کیا گیا تھا ' ہوش سنبھالتے ہی یہ ملکہ ابھر آیا - مشق سخن کا سلسلہ جاری ہوگیا - اور دیوان مظہر کے برابر ایک مختصر دیوان مرتب کرلیا - ذوق سخن سے فطری لگاؤ تھا ' والا کی اصلاح اور حوصلہ افزائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا - اس طرح بہت جلد عمدہ شعر کہنے لگے -

استاد سخن

ان کے استاد حضرت والا کا نام سیدابوسعید اور سید ابوطیب‌خاں خطاب تھا ' یہ عاصم خاں بہادر مبارز جنگ امامی کے چچا کی اولاد میں تھے - علمی قابلیت کے علاوہ نہایت قوی ہیکل تھے - جوانی کے عالم میں زور و قوت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے - خوش نصیبی سے رفتہ رفتہ حضرت ظل سبحانی کی استادی کے منصب پر سر فرازی پائی - نواب ان کے بڑے قدردان تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے - ایک بار بندگان عالی نے ان کو ازراہ قدردانی چاندی سے تلوا کر سب چاندی انہیں کو بخشدی - یہ بڑے لحیم و شحیم آدمی تھے - ان کا وزن آٹھہ ہزار روپیہ عالم گیری سے کچھہ اوپر ہوا - فصاحت و بلاغت میں مشہور آفاق تھے ' پیرانہ

---

* صبح وطن حالات اعظم —

سالی کے عالم میں بھی یہ عالم تھا کہ گفتگو لطائف و ظرائف سے بھری ہوتی تھی ۔ آخر عمر میں جب کہ امراض اور پیری کی وجہ سے مزاج میں فتور پیدا ہوگیا تو انھوں نے راقم کو اپنا جانشین بنایا ۔ نواب اعظم بھی راقم سے مشورہ لیا کرتے تھے اور گلزار اعظم کی تیاری و اہتمام میں بھی بہت کچھ راقم * کا ہاتھ ہے ۔ سنہ ۱۲۶۴ ھ میں والا نے انتقال کیا † —

ذہانت و ذکاوت طبع

نواب کو شعر و سخن سے نہایت شیفتگی تھی اور ذکاوت و ذہانت خدا داد پائی تھی ۔ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں ‡ کہ اگرچہ خود ستائی شعراء کی برگزیدہ سنت اور ہر مقام و موقع میں ان کو پسند ہے ، لیکن یہ حق پسند اس کو ایک طرف رکھ کر بحکم آیتہ " و اما بنعمة ربک فحدث " اپنے رب کی نعمت کا ضرور ذکر کرکے خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس کی عنایت سے میرا اشہب خامہ شعر کی تنگ زمین میں کہاں جولانی رکھتا ہے اور طرحی غزل کے میدان کو ایک دو گھنٹے کے عرصے میں طے کرلیتا ہے ۔ بارہا ارباب مشاعرہ کے سامنے یہ صورت پیش آئی ہے اور اس زمزمے کی آواز ان بزرگوں کے کانوں تک پہنچی ہے ۔ میری طبع سلیم غلطی اور صواب میں جہت فرق کرایتی ہے ۔ میر سید شاہ ناصر علی کی تقلید میں شعر کہتا ہوں اور اس فن میں اس کو اپنا پیشوا جانتا ہوں ۔ (صفحہ ۶۶ گلزار اعظم)

معاصرین کی رائے

ان کے معاصرین میں کئی شعرا نے تذکرے لکھے ہیں ۔ مگر اس وقت قدرت اور بینش کے دو تذکرے راقم الحروف کے

* گلزار اعظم صفحہ ۲۱۸ س ۷ و ۸ ۔
† اشارات بینش ۔
‡ گلزار اعظم صفحہ ۱۵ ۔

پیش نظر ہیں - دونوں نے نواب کی ذہانت اور ذکاوت کی تعریف کی ہے - اور نواب کی قدرت کلام ' زود گوئی ' بدیہہ سنجی ' طباعی کا نہایت بلند آہنگی سے اعتراف کیا ہے - بینش * لکھتے ہیں

فصاحت تقریر اور درک سخن کی پوری کوشش کرتے ہیں ' ان کے آبدار اشعار سننے والوں کے کانوں کی سیپیوں کو تابدار موتیوں سے لبریز کردیتے ہیں ' وہ در نثار اشعار جو نواب نے اپنی نو مشقی کے زمانے یعنی ۱۷ سال کی عمر میں کہے ہیں ان کے تذکرۂ صبح وطن اور قدرت کے تذکرۂ نتائج الافکار میں مرقوم ہیں - ان سے نواب کا زور طبیعت معلوم کیا جاسکتا ہے اور اب تو نواب کا پایۂ شعر شیخ ناصرعلی سر ہندی کے تتبع میں اس بلندی پر پہنچ گیا ہے کہ دقائق معانی کے مو شگاف اور لطائف سخن دانی کے رموز داں فرق تحقیق و تقلید میں کوئی راستہ پیدا ہی نہیں کرسکتے - طبیعت کی تیزی اور ذہن کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ ارباب شعرا میں اکثر اوقات طرحی غزل ایک گھنٹے میں بخوبی تحریر فرما لیتے ہیں - اور دوسرے سخن طرازوں سے گوے بلاغت لے گئے ہیں - یہ حال خود فقیر (بینش نے) مجلس مشاعرہ میں بار ہا مشاہدہ کیا ہے —

ابتدا میں سید ابوطیب خاں والا کی خدمت میں مشق سخن فرماتے تھے' مگر اب تو اپنی بلند فطرت اور دقت پسند طبیعت کے اقتضا سے زمانے کے فصحا میں سرآمد اور بلند پایہ بلغاء کے سردفتر ہوگئے ہیں (اشارات صفحہ ۱۵ - ۱۶) -

قدرت گوپاموی جو اصل میں نواب اعظم کے والد مرحوم کے ملازمین

* بینش کا تذکرۂ اشارات بینش سنہ ۱۲۶۵ھ میں ختم اور اسی سال نواب صاحب کے حکم سے چھپ کر شائع ہوا ہے - اس کے متعلق ہم ایک بسیط مضمون مدراس کے سہ ماہی رسالہ السفینہ میں لکھ چکے ہیں —

میں سے تھے اور انھیں کی زمانے میں اودھ سے مدراس آئے اور ایسے آئے کہ یہاں کے امرا کی قدردانیوں سے ھمیشہ کے لئے یہیں کے ھو رھے۔ انھوں نے اپنا تذکرہ نتائج الافکار سنہ ۱۲۵۷ ھ میں تحریر کیا ہے جو نواب اعظم کے حکم سے کشن راج کے مطبع میں ۲۹ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۵۹ ھ ۲۶ جولائی سنہ ۱۸۴۳ ء کو مولوی محمد حسین راقم کے اهتمام اور محمد غوث کاتب سرکار کی کتابت سے چھپکر شائع ھوا ھے۔ اس کے دیباچے کی تحریر کے وقت نواب کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ عنان اختیار ھاتھہ میں لئے صرف ایک سال ھوا تھا اور نواب کی شاعری کا آغاز شباب تھا۔ لیکن اس ھونہار نوجوان نواب نے اُس وقت سے اپنی ذھانت و طباعی اور قدرت کلام کا سکہ شعرا کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔ ارباب فن میں ان کی زود گوئی، مذاق سلیم اور ترقی پذیر تخیل کا چرچا ھوگیا تھا۔ نواب نے اپنے باپ کے عہد کے ارباب کمال کی ھمت افزائی پر پوری توجہ کی۔ چنانچہ قدرت نواب اعظم کے باپ نواب رضوان مآب کی وفات کا جگر خراش سانحہ لکھنے کے بعد تحریر کرتے ھیں: —

" ہمارے اس مولود مسعود ... نے تشفی کا مرھم غمگینوں کے سینوں کے زخموں پر رکھا، اور پریشان دلوں پر اطمینان کے دروازے کھول دیے۔ ارباب حکومت نے اعظم کو مسند آرا کیا، آج اِس قائم شهامت کے موتی، سخاوت کے مواج سمندر، اپنے زمانے کے حاتم اور باذل دھر نے ۱۹ سال کی عمر کے میدان میں قدم رکھا ھے۔ اس کی ذات والا صفات کامرانی اور فیض رسانی کے خزانوں کی کنجی ھے۔ خیاط ازل نے اس کے قد مبارک کو فضل و کمال کی قبا سے آراستہ کیا ہے۔ اور مشاطۂ قضا و

قدر نے حسن لیاقت کے غازے سے اس کے چہرۂ حال کو سنوارا ہے - فہم و فراست میں علم یکتائی بلند کیا ہے - عقل و کیاست میں بے ہمتائی کا نقش مُرتسم دیا ہے - اس کی فکر رسا کا گھوڑا نظم اور نثر کی باریکیوں کی منزلوں کو نہایت سرعت سے اور اس کے دل کشا تخیل کا سیاح معانی کی گہرائیوں کے راستے کو بہت خوبی سے طے کرتا ہے "-

اس کے بعد اُن کے اخلاق اور ان کے عہد کے اطمینان و سکون کو سراہا ہے ممکن ہے کہ ان بیانات میں مبالغہ ہو' لیکن اس میں شک نہیں کہ بار ہا بر سر مشاعرہ نواب نے ایک ایک دو دو گھنٹے میں غزل کہی اور اپنی مشاقی کا ثبوت دیا ہے اور اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں یک بار ان کے مشاعرے میں " رخسار گل " " خار گل " زمین ہوئی - اور طرحی مصرع کی " فرد ا فاعیل " میر مجلس کی جانب سے محفل کے ہر سخن سنج کی خدمت میں پہنچی - حضرت ثاقب کے سامنے جب آئی تو بےساختہ ان کی زبان سے نکلا " دست ہر تماشائی چمن خیال از گل چیدنی این گلبن تازہ بہار کوتاہ می نماید "

نواب نوجوان تھے ' طبیعت میں جوش اور ولولہ تھا - ثاقب کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے " خدا چاہے تو میں اسی زمین میں قصیدہ کہوں گا " -

ثاقب نے عرض کی : حضور والا ! بے ادبی معاف ! ہم ایک غزل کی فکر میں حیران ہیں ' اور حضور قصیدے کا عزم رکھتے ہیں - خدا حافظ -

بس اسی رات ہمت ور نواب قلم ' دوات ' کاغذ لے کر بیٹھ گئے - محرم کا زمانہ تھا ' اسی مناسبت سے ایک حزنیہ قصیدہ ۴۷ شعر کا مظلوم کربلا (حضرت امام حسین) کی شان میں لکھ ڈالا ' اور صبح ہوتے ہی اپنے اس تازہ فکر کو احباب مجلس کی خدمت میں پیش کیا ، سب حیران رہ گئے '

نواب کو ہزاروں دعائیں دیں، بے حد داد دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی اور کمال کا اعتراف کیا * —

یہ تو خود انہیں کا بیان ہے۔ اس واقعے کی نسبت بینش لکھتے ہیں :

" بندگان حضور نے ایک بار عجیب کام کیا کہ اُس مشاعرے میں جو ماہ محرم الحرام میں قرار پایا تھا ایک طولانی قصیدہ حضرت سیدالشہدا (امام حسین) کی تعزیت میں دل چسپ تشبیب کے ساتھہ اس خوبی سے تحریر فرمایا کہ اس کے مضامین عالیہ دیکھہ کر مشاعرے کے تمام سخن وروں کے ہوش اُڑ گئے۔ اور سب کو اپنے عجزو قصور کا اعتراف کرنا پڑا۔ بارک اللہ فی نتائجہ † "

کلام فارسی

نواب اعظم اردو میں بہت کم اور زیادہ فارسی میں کہتے تھے۔ یہاں ہم ان کی نوعمری و نو مشقی کا کچھہ کلام پیش کرتے ہیں جسے دیکھہ کر حقیقت میں حیرت ہوتی ہے کہ اس نوجوان نواب کا کلام اس عمرمیں بھی کیسا پایہ رکھتا ہے، فرماتے ہیں —

کند فرق نداست طبع صاف من زلالی را زند ناخن بدل ہر مصرع شوخم ہلالی را
نخست ازتیغ آزادی بکن قطع امل انگہ مسخر کن سواد اعظم نازک خیالی را

دوسرا مصرعہ مولانا آزاد بلگرامی مرحوم کا ہے۔ اور اعظم نواب کا تخلص ہے، پہلا مصرع لگا کر کس عمدگی سے شعر کو اپنا بنا لیا ہے —

اے شوخ فرو ہشتہ برخ زلف دو تارا نازل بسر من مکن این تیرہ بلا را

گریۂ زار بود سہر بیان حالم نیست اصلا بکسے طاقت تقریر در آب

---

* گلزار اعظم — † صفحہ ۲۹ — اشارات بینش —

پانی میں کوئی شخص بات نہیں کرسکتا' اور شدت گریہ میں بھی بات کرنا دشوار ہے - اس وجہ سے میں کچھہ کہہ ہی نہیں سکتا —

دود آه دلم از سینه پریشان بر خاست تافرو هشت برخ زلف خود آں حور سرشت

دل سے آہ کے پریشان ہوکر نکلنے کا یہ سبب کہ اس حور وش نے اپنی زلفیں رخ زیبا پر بکھیر رکھی ہیں' کیا خوب بیان کیا ہے —

ذیل کا شعر بھی بہت خوب کہا ہے' بندش نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے —

بردی دل محزون مرا دست تو بوسم کشتی تو بیک تیرادا' شست تو بوسم

تیری چٹکی کو چوم لوں کہ ایک تیر ادا سے (کیا خوب) مجھے مارا ہے' اور تیرا ہاتھہ بھی چوم لوں کہ کس انداز سے میرا دل چرا لے گیا ہے —

اے طفل پر آشوب قد پست تو بوسم آموخت زتو پیر فلک فتنه طرازی

چونکه مشهور است اندر سنگ می باشد شرار از چه معشوقاں نمی دار ند سوز باطنی

چشم آفت می برد دل مفت بدنام است وبس میشود بے جرم رسوا در عدالت گاه چرخ

تا سرمه صفت چشم سیه مست تو بوسم واسوختم از آتش جاں سوز فراقت

بقرطاس پر پراوند' سوے شمع تابانے نویسد حال سوز و ماجراے اشک خود اعظم

چونکہ فارسی کا مذاق اب زیادہ نہیں رہا' اس وجہ سے زیادہ اشعار

لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوئی - اور اب ہم نواب کے اردو کلام کا کچھہ حصہ پیش کرتے ہیں - یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں فارسی کے شاعر تھے ' اُن کا اصلی مذاق فارسی کی شاعری تھا اور اس کا قومی سبب مدراس کا ماحول اور عام مذاق تھا - یہاں اب تک عام اہل علم فارسی ہی میں شعر کہتے تھے ' فارسی ہی میں زیادہ تر تصنیف و تالیف کرتے تھے ' اردو میں جو کچھہ کہا جاتا تھا صرف تفنناً کہا جاتا تھا - اس وجہ سے نواب کا اردو کلام بہت کم ہے مگر جو کچھہ ہے بہت خوب ہے ' اس میں بلندی اور پختگی معلوم ہوتی ہے زبان بھی ایک حد تک اچھی ہے - ملاحظہ ہو:

عشق میں یار کے دل اپنا لگا کر دیکھا خوب اس شمع کو میں نےبھی جلا کر دیکھا

آب سے اور بڑھی آتش یاقوت کی طرح آتش دل کو مری * میں جو بجھا کر دیکھا

سلسلہ برق کو پہنچے ا ہے دل سوزاں سے دفتر داغ کو میں نے جو اٹھا کر دیکھا

دشت میں وادی فرقت کے مریضوں کو ترے سانس ٹھنڈی سی بھری برق ‡ جو آکر دیکھا

ایک قطرے کو سرے اشک کے پہنچا نہ کبھی تو نے ' اے ابر کئی سیل بہا کر دیکھا

فائدہ کچھہ بھی ہوا تجھکو بتلا اے اعظم
دل جو تو ' اُس بت ناداں سے لگا کر دیکھا

ناتوانی سے یہ عالم ہے ترے رنجور کا ہر قدم بانگ جرس ہے کاروان سور § کا

تاک نے یکبار گر اُس چشم میگوں کو تو پھر کیا عجب ہے پانی پانی ہو جو دل انگور کا

کیا ادا احساں زباں اس تیر مژ گاں کا کرے مارے ⁑ دم ہے دل نے جس کے عہد میں منصور کا

گر رہے یکساں یہ عالم حسن کا اُس کے تو دل ایک دم میں جمع کر دے گا ٭ ساماں طور کا

* صحیح : میں نے - + اب متروک ہے - پہنچتا ہے صحیح - ‡ برق نے
' تو نے § سور - بوا و مجہول چیلتی اب معروف اور مجہول کا قافیہ متروک اور جائز ہے - ⁑ مارا - چاہئے -

کاکل مشکیں سے اُس کے ذوق ہو اعظم جسے
ہے در تاج سلیماں بیضۂ بیضۂ مور کا

داغ دل چمکا جو عشق سیمبر پیدا ہوا — لو زمیں پر دوسرا رشک قمر پیدا ہوا
ماجرائے چشم کو بتلایا اُڑتا رنگ کا — بعد مدت کے یہ مرغ نامہ بر پیدا ہوا
مشہد بلبل پہ رکھتی ہے صبا لالا کے گل — نالۂ مردوم میں آخر اثر پیدا ہوا

لیوے اگر وہ ہاتھہ میں ساغر شراب کا — ہو جائے پانی شرم سے دل آفتاب کا
وہ سنگدل جدا ' روش کوہ ہے جدا — قاصد تجھے خیال ہے اپنے جواب کا

———

فلک پہ سینۂ سوزاں سے جب بخار اُٹھا — تو مارے ہول کے وہاں رعد بھی پکار اُٹھا

———

آتی ہے خاک قیس سے ہر دم صدائے دل — باتوں پہ دلبروں کے تو ہرگز نہ جائے دل
بس ختم ہوئی* تمہاری تواب دلبری صنم — چٹکی ہی چٹکیوں میں ہمارا † اُڑائے دل
سینہ مرا چمن ہوا گلہائے داغ سے — اُس شمع روکی یاد میں بس داغ کھائے دل
افسوس رحم کچھہ بھی نہ آیا تمھیں صنم — رو رو کے طفل ‡ اشک کہا وائے وائے دل
آئے ہے ۹ کان چشم سے اشک زردی
کس سبز رنگ سے تمھیں ٭ اعظم لگائے دل

---

* اب اس طرح نظم کرنا ناجائز اور متروک ہے۔ † قدیم متروک۔ اڑایا صحیح ہے۔ ‡ نے محذوف ہے۔ ۹ آتا ہے۔ آتے ہیں۔ ٭ تمھیں۔ تم نے یہ مدراس کی عام بول چال میں اب تک رائج ہے —

ہرچند نعرہ کرتے ہیں اس کو خبر نہیں | او اب تمہاری آہ میں کچھ بھی اثر نہیں
جب سیر نظر نہ آئی* ہے وہ چشم نرگسیں | ہیں گرچہ آنکھ† مجکو پہ نور بصر نہیں
دوری سے غنچہ روکے میں ایسا ہوں تنگ دل | یک آہ کو بھی سینے میں میرے گذر نہیں
ہر قطرہ چشم جام سے در نعیف گرا | محفل میں سے کی جب سے کہ وہ موکمر نہیں
کیوں گھر ہمارے آئے نہیں ہے‡ وہ ماہ رو | وہ جائے§ کونسی ہے جو ° تاب قمر نہیں

اعظم گیا ہے جب سے کہ وہ صندلی لباس
بتلائیے کبھی تو †† بھلا درد سر نہیں

بھر الفت میں بہت کچھ آپ مارے ہاتھ پاؤں | شیخ جی آوے ہے کب اس کا تمہارے ہاتھ پاؤں
سرد مہری سے تری جاناں ہوے یکسر مرے | آبلے کی طرح گل کے اب تو سارے ہاتھ پاؤں

ہجر سے تیرے چمن میں زخم دل آلے ہوے | غنچہ نشتر سا لگا رگہاے گل آلے ہوے
کیوں نہ تڑپے دل تباہی آنسوؤں کی دیکھ کر | ایک مدت کے یہ طفل اشک ہیں پالے ہوے
یاد میں اس شمع رو کی رات جورویا کیا | نالہائے دل مرے آتش کے پر کالے ہوے
کیفیت لائی صبا جو نرگس مخمور کی | گل چمن میں کر گریباں ‡‡ چاک متوالے ہوے

خوشۂ انگور اعظم کو دکھے ہے §§ اس طرح
جام کے لب پر تب ہجراں سے تبخالے ہوے

---

* نہیں آئی ہے - † میری آنکھیں ہیں - صحیح -
‡ نہیں آتا ہے ' ص ت - § جگہ - ت - ° جہاں ص ف -
†† - کب ' ص ف ‡‡ چاک کر کے ص ت - §§ دکھنا - دکھائی دینا - یہ مصدر اور اس کے مشتقات جنوبی ہند میں عام طور پر مستعمل ہیں - دکھائی دینا نہیں بولتے - سنٹرل انڈیا تک یہ لفظ ہے -

کہیں جو رزم میں اس کی سنان نکل آئی زبان مرگ سے بھی الاماں نکل آئی
تعطلانہ جو کل اس سے ہاں نکل آئی * شہید ناز یہ تڑپا کہ جاں نکل آئی
تری تلاش میں سوسن[1] نے یاں تلک دوڑا کہ مارے پیاس کے منہ سے زباں نکل آئی

عشوہ و غمزہ کرشمہ ناز اور انداز سے الغرض دل لے گیا ظالم نے[2] سو سو ناز سے
حسن اس گلرو کا بالے سے دوبالا ہوگیا خوش نما تر ہوے جیسے نقش گل پرواز سے

رتبہ زلفوں کو ملا عارض زیبا سے ترے
جیسے دو شب کو فضیلت ہوتی آدینہ سے

تصانیف اعظم[1] نواب مرحوم کی تصانیف میں ۴ کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱- صبح وطن - یہ الکاے (خطۂ) کرناٹک کے شاعروں کا مختصر تذکرہ اور نواب کی پہلی کتاب ہے - دو سنہ ۱۲۵۷ ھ میں تالیف ہوئی ہے - اس میں ۹۱ شعرا کا ذکر ہے - رائق * کے تذکرہ "گلدستہ کرناٹک" کو امعان نظر سے دیکھنے کے بعد اس کی تالیف کا خیال پیدا ہوا - اس کا سبب خود مولف نے یوں بیان کیا ہے کہ

"احوال بعضے سخن سنج را چوں گل کاغذ بے بو یافتم یعنی بپاس قومیت * خلاف واقع بہ تحریر پر داختہ و ذکر برخے

---

* نکل گئی - اس کے منہ سے ہاں نکل گئی - [1] سوسن مونث ہے -
[2] نے علامت فاعل زائد ہے - دوڑی چاہیے - [2] لے گیا ظالم - کافی ہے - نے زاید ہے یا لے لیا ہو تو صحیح ہے - [1] ص - ف : ہو - * رائق - شعر تھی -

از رهگذر ارتباط بطمطراق قلمی ساخته - لهذا حقیقت حال هر یک را بازدیاد (اصل میں با یازدہ) غزل او بے ارتکاب انتخاب بقید قلم در آوردم - و دیوان کسے که هم دست نه شد ' اشعار او را از تذکرۂ مذکور برداشتم - و کسانیکه بعد انتقال رائق قدم برجادۂ فکر گذاشتند اسامی آنهارا نیز با چند غزل داخل ساخته موسوم به " صبح وطن " گردانیدم ......

یہ تذکرہ بدھ کے دن ۹ رجب سنہ ۱۲۵۸ھ (۱۷ اگست سنہ ۱۸۴۲ ع) کو بمقام مدراس مولوی محمد حسین راقم کے اهتمام اور غلام محمد کاتب کی کتابت سے کشن راج کے چھاپے خانے میں طبع هوا هے - ۲۲۵ صفحات کا حجم هے - حالات کی تحریر میں بهت اختصار سے کام لیا هے —

۲ - گلزار اعظم | دوسری تالیف تذکرۂ گلزاراعظم هے - یہ سنہ ۱۲۵۹ھ میں تالیف هوا سبب تالیف خود مؤلف یوں لکھتے هیں کہ یہ خیال دل میں تھا کہ اگر زمانہ فرصت اور موقع دے ' اور تائید خدا یاور هو تو ایک نیا تذکرہ لکھوں جس میں شعرا کا منتخب کلام پیش کیا جاے - اور ان کے حالات تعلیمی ' تحصیل علم اور کسب استعداد و لیاقت کے واقعات ' کچھ ان کی سیر و سیاحت کے حالات ان کی پیدائش کے سنہ ' اور مقام ولادت کا بھی بیان هو - تالیف و تصنیف کا ذکر بھی کیا جاے - نیز ان کے دیگر مناسب مقام حالات ' اور قسم قسم کے فوائد ' جداگانہ لطائف ' نہایت تحقیق کے ساتھ ' عمدہ آئین اور دلکش اسلوب سے لکھے جائیں اور منصف مزاج نکتہ سنجوں کے سامنے جو تنگ دلی سے دور هیں پیش کیا جاے - مگر قلت فرصت سے یہ تمنا پوری نہ هوئی تھی تا آں کہ معدن الجواهر تذکرہ مصنفۂ واصف نظر سے گذرا - اور یہ واضح هوا

کہ واصف اکثر مقامات میں نکات شاعری کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکے
اور اکثر کامل اساتذہ کے کلام پر بیجا اعتراضات سے قلم فرسائی کی ہے۔
طبیعت کا دریا پہر جوش میں آیا اور دل کا سمندر خروش میں کہ تذکرہ
لکھوں اور ان کے مناسب جوابات بھی درج تذکرہ کروں۔ مزاج قلم کا امتحان
لوں۔ مگر ہنوز گوہر مقصود ہاتھہ نہ آیا تھا، اور کشتی مدعا ساحل پر لنگر انداز
نہ ہوئی تھی کہ معاصرین کی ہم طرحی میں سخن سنجی کا شوق دماغ میں
پیدا ہوا۔ اور شوق تغزل کی آگ دل کی انگیٹھی میں شعلے بھڑ کا نے لگی۔
ایک محفل مشاعرہ کی ترتیب میں مشغول ہو گیا اور پریزادان خیال کی
تسخیر میں اپنی ہمت مصروف کیا (مشاعرہ ہفتہ وار ہونے لگا) - ہر شاعر
معنی پناہ اپنی طاقت کے موافق فکر کے گھوڑے کو میدان شاعری میں
دوڑاتا تھا۔ اور دخل و اعتراض کی کمند دوسرے کی خطا و سہو کے نخچیر
پر ڈالتا تھا۔ مشاعرے کے منشی صاحب ہر ایک کو حکمین کی صوابدید کے
موافق تحریر کی قید میں لے لیتے تھے، اور میر مجلس کی راے و حکم کے
موافق ''جریدۂ اشعار'' میں داخل ہوجاتے تھے۔ تھوڑی ہی مدت میں یاران
یک رنگ اور صاحبان دانش و فرہنگ عزیزوں کی برکت صحبت سے بہت سے
نایاب قیمتی فوائد دل کے مخزن میں جمع ہوگئے۔ اب ان سب تابناک موتیوں کو
ایک رشتے میں پرو لینے کے لیے کمر سعی باندھی اور آستین چڑھائی۔ ہر
سخن ور کا احوال مذکورہ التزام کے ساتھہ دریافت و فراہم کیا اور جو کچھہ
تحقیق میں آیا منشیء قلم کے حوالہ کیا۔ ہر سخن سنج کے اشعار بہ قدر
میسور میزان انتخاب میں تولے اور اپنے قلم کے گھوڑے کی باگ اکثر مشاعرے
کے تازہ گویوں کی رد و قدح کے میدان سے طول کلام کے خوف سے پھیرلی۔
دو سال کے عرصے میں شاہد مدعا کو تکمیل کے زیور سے آراستہ کیا۔ اور

اختتام کے کھنے سے پیراستہ کیا - تاریخ کا قطعہ یہ ہے :

چو تیار شد گلشن بے خزاں که افزاید از سیر آن عقل وهوش
شدم درپئے نام و تاریخ او ندا کرد "گلزار اعظم" سروش
۱۲۶۹ ھ

یہ تذکرہ تقریباً پہلے تذکرے کے بارہ سال بعد تالیف ہوا ہے - نواب اعظم نے پہلا تذکرہ اپنی سترہ سال کی عمر میں تالیف کیا تھا ' اور دوسرا (۲۹) سال کی عمر میں ' اس کا حجم ۴۳۵ صفحات ہے - باریک فرنچ کاغذ پر طبع ہوا ہے - لکھائی ' چھپائی عمدہ ہے - سرکاری پریس میں سنہ ۱۲۷۲ ھ میں چھپا ہے - اس کے کاتب عبدالصمد غالباً سرکاری کاتب ہیں - اس میں ۴۳۳ شعرا کا حال مذکور ہے - شروع میں ردیف وار فہرست شامل ہے - عبارت نہایت عمدہ رنگین ہے - عربی کے ضرب الامثال ' مقولے ' آیت وغیرہ بھی کہیں کہیں لاتے ہیں —

۳ - (دیوان) بہارستان اعظم یہ نواب مرحوم کا مختصر مجموعۂ کلام ہے جو مدراس کے مطبع مظہرالعجائب میں سنہ ۱۳۰۰ ھ میں مصنف کی وفات کے ۲۸ سال بعد چھپا ہے - سائز تیمی اور کاغذ حدائی ہے - لکھائی ' چھپائی ادنیٰ درجے کی ہے - فارسی کلام محشی ہے - مشکل الفاظ کا حل حاشیے پر دے دیا گیا ہے - زین الدین احمد صاحب تاجر نے چھپوایا ہے - اور اول میں ایک صفحے کا دیباچہ اور آخر میں ۳ صفحوں کا خاتمہ فارسی میں لکھا ہے - جس میں صاحب دیوان کے مختصر حالات ' اُن کے محامد و صفات اور کلام پر مختصر سا تبصرہ ہے - نواب کا جو کچھ کلام انھیں دستیاب ہوا ہے ' وہ جمع کر کے شائع کر دیا ہے اُن کا یہ احسان نہایت درجہ قابل شکر گزاری ہے - آخر میں اِس کے دوسرے حصے کی اشاعت کا وعدہ اور

اعلان کیا ہے ۔ اس دیوان میں کچھہ اوپر سو غزلیں فارسی ہیں ۔ دو چار نعت اور منقبت میں ' باقی عاشقانہ کلام ہے ' ۴ قصیدے ہیں ۔ پورا دیوان پچاس صفحات میں ختم ہو جاتا ہے ' صفحۂ ۵۱ سے اردو کلام شروع ہوتا ہے ۔ یہ صرف ۶ - ۷ مکمل و نا مکمل غزلیں ہیں ۔ کتب خانۂ عام اہل اسلام میں اس کے ۲ نسخے ہیں ۔ جن کے نمبر ۴۲۳۲ ۔ ۴۲۳۳ ہیں اور اب کمیاب بلکہ نا یاب ہے ۔ ہم نے اس کے اردو کلام کا کل حصہ پیش کر دیا ہے اور فارسی کلام کا انتخاب بھی —

۴ سفینۃالنجات فی احوال الجہازات

یہ چھوٹے سائز کا ۷۸ صفحات کا رسالہ ہے ۔ ہر صفحے میں ۹ سطریں ہیں ' فارسی زبان ہے ۔ اس کا ایک نسخہ سالم و کامل قلمی کتب خانہ مخطوطات مدراس میں محفوظ ہے ' خط صاف اور عمدہ ہے ۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے :

دریا دریا نیایش مرتانگر یراہ ' وجود بشر را از کارخانۂ عنایت لباس حیات پوشایندہ ' وکور سوادان کون ضلالت را شمع ہدایت براہ افراختہ ' ۔ الخ

اس کتاب میں فن جہاز رانی کے قواعد و ضوابط اور اس کی اصطلاحیں وغیرہ تفصیل سے بیان کی ہیں ۔ کتاب کے چار باب ہیں ۔ دریا اور جہاز کی رعایت سے ہر باب کو سیلاب سے تعبیر کیا ہے ۔ اور ہر سیلابہ (باب) میں کئی کئی موجیں (فصلیں) ہیں ۔ سیلابۂ اول در بیان پرچھائے سخن و اشکال آن ونیز نمبر ۔ یہ آتھہ موجوں میں ہے ' دوسرے سیلابے میں تین موجیں ۔ تیسرے اور چوتھے میں پانچ پانچ موجیں ہیں ۔ کتاب کے آخر میں ایک نقشہ ہے جس میں مدراس کے قلعے کا جھنڈا اور دیگر سلطنتوں کے پرچموں کے نشان ' نیز سمندر کی طغیانی ' طوفان وغیرہ کے علامات کے پرچم بنائے گئے ہیں ۔ اس

موضوع پر یہ قابل قدر رسالہ ہے۔ تحریر میں کہیں کہیں کاٹ چھانٹ بھی کی گئی ہے۔ تاریخ کتابت، کاتب کا نام اور سنہ کہیں نہیں ہے —

نواب کی یاد گاریں

نواب صاحب بڑے مخیر، پرلے درجے کے فیاض اور ارباب کمال خصوصاً شعرا کے بڑے قدرداں تھے۔ اور یوں تو ان کے چشمۂ فیض سے ہر قسم کے لوگ سرفراز ہوتے تھے۔ مذہبی کاموں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے۔ مکہ معظمہ میں انہوں نے کئی ایک رباطیں بنوائی تھیں جو اب تک موجود اور مشہور ہیں۔ مدراس میں مدرسۂ اعظم جو اب گورنمنٹ محمڈن کالج کے نام سے معروف اور مسلمانوں کے لئے مخصوص سرکاری کالج ہے، اس کی شاندار عمارت قابل دید ہے۔ اس کے علاوہ کتب خانہ عام اہل اسلام اور لنگرخانہ مدراس ممتاز و مشہور یاد گاریں ہیں —

وفا

۲۴ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۲ ھ = ۱۸۵۷ ع کو عین عالم شباب یعنے ۳۲ سال کی عمر میں دفعتاً انتقال کیا اور اپنے دادا نواب عظیم الدولہ بہادر رحمت مآب (سنہ ۱۲۱۶ ھ تا ۱۲۳۴ ھ) کے مقبرے میں، مسجد والا جاہی ترپل کھیڑی مدراس کے احاطے میں اور اپنی والدہ ماجدہ کے مزار کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔ (سر غیب ۱۲۷۲ ھ) اور (مظلوم مردی ۱۲۷۲ ھ) ان کی رحلت کی مشہور تاریخی مادے ہیں —

نواب کی ازواج و اولاد

نواب اعظم کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی شادی نہایت دھوم دھام اور بڑے تزک و احتشام سے سنہ ۱۲۶۴ ھ میں نواب خیرالنسا بیگم سے ہوی۔ یہ حیدر آباد کے امیر کبیر نواب ضیاءالدولہ

بہادر کی دختر تھیں - ان کی بنوائی ہوئی مسجد اور مدرسہ مدراس کے مشہور جام بازار میں موجود ہے - سنہ ۱۹۰۳ م میں انہوں نے انتقال کیا اور نواب مرحوم کے پائیں دفن ہوئیں - دوسری بیوی، اعظم النساء بیگم تھیں - انہوں نے ۱۴ جمادی الاولی سنہ ۱۳۰۵ ھ میں انتقال کیا —

دونوں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لئے لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کے عہد حکومت میں یہ طے ہوا کہ صلح نامہ سنہ ۱۸۰۱ م ذاتی تھا - اس کے شرائط نواب عظیم الدولہ بہادر کے جانشینوں تک رعایتاً جاری رہے، اب چونکہ کوئی وارث نہیں ہے لہذا کرناٹک کی مسند نشینی کا خاتمہ کیا جائے - اور نواب عظیم جاہ بہادر، نواب مرحوم کے حقیقی چچا اور دوسرے ارکان ریاست کے نام وظیفے مقرر کردیے جائیں - چنانچہ کمپنی نے محل خاص نواب خیرالنساء بیگم کی پنشن چھ ہزار روپے ماہانہ اور محل ثانی کی چار ہزار اور دیگر متعلقین اور ملازمین کی حسب مدارج تنخواہیں مقرر کردیں —

نواب اعظم اپنی فیاضی کی وجہ سے بہت مقروض مرے تھے - لہذا اُن کے قرضے کے تصفیے کے لیے محل کا سارا اسباب ایک معتمد کے سپرد کیا گیا اور نواب کی زمینوں اور عمارتوں کا عام نیلام کیا گیا - آخر گورنمنٹ نے ساڑھے پانچ لاکھ روپے میں ان کو خرید لیا - اور اس طرح ریاست کا خاتمہ کر دیا —

اب ان کے عزیزوں میں پرنس نواب غلام علی خاں موجود ہیں جو 'امیر محل' میں رہتے ہیں - انگریزی حکومت کی جانب سے "پرنس آف آرکاٹ" کے خطاب سے سرفراز ہیں - بارہ ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا ہے - یہاں کے باشندے ان کے ساتھ نواب کی حیثیت سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں —

۲ - مشاعرۂ اعظم

فارسی زبان کا یہ مشاعرہ نواب اعظم نے اپنے "دارالخلافہ" مدراس

میں قائم کیا تھا - ریاست کی عنان اختیار ہاتھ میں آنے کے چند سال بعد ہی سنہ ۱۲۶۲ ھ میں یہ مشاعرہ قائم ہوا - اور عرصے تک اِس کا سلسلہ جاری رہا - اس کے حالات ذرا ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں - یہ مشاعرہ ہفتہ وار نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا - تمام مدعو شعراء کی پر تکلف ضیافت ہوتی تھی - مدارس کے تقریباً تمام فارسی گو شعرا جو ممتاز حیثیت رکھتے اور ریاست کے متوسل تھے، شریک ہوا کرتے تھے - اس کا یہ اثر ہوا کہ "علوم و فنون کے بازار کی رونق دو بالا ہوگئی - خاصکر سخن وری اور معنی گستری کے جواہر کا رواج عام ہوگیا - کیوں کہ "الناس علی دین ملوکہم" خود نواب کی طبیعت میں یہ جوہر ودیعت کیا گیا تھا اور یہ شوق عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ روز افزوں تھا" —

مشاعرے کے مصارف کا بجٹ الگ مقرر تھا - ایک خاص منشی ملازم تھے - جو مشاعرے کی روداد، اعتراضات اور ان کے جوابات لکھتے اور مصارف کا حساب و کتاب رکھتے تھے - ایک میر مجلس اور دو بزرگ مشاعرے کے حکم تھے - اور حکم اعلی خود نواب صاحب تھے - یہ مشاعرہ ہفتہ وار ہوتا تھا؛ ہر ہفتے میں ایک بار اِس فیض آگیں مجلس میں شعرا حاضر ہوکر طرح دی ہوئی زمین میں اپنی غزلیں سناتے اور اپنے اپنے کمال کے جوہر دکھاتے تھے —

اِس مشاعرے کا غلغلہ صرف مدراس تک ہی محدود نہ رہا، بلکہ مدراس کے اطراف و حدود سے گزر کر حیدر آباد تک پہنچ گیا تھا - شعرا کی بیش قرار تنخواہیں مقرر تھیں - مشاعرے میں شرکت ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہ تھی —

میر مجلس مشاعرہ

مشاعرے کے میرمجلس راقم تھے - اِن کا نام مولوی محمد حسین قادری تھا - عربی، فارسی زبان کے فاضل اور فن سخن میں

ماہر تھے ۔ اپنے چچا شائق ، اور نیز والا کے شاگرد تھے۔ نواب اعظم کی ہم درسی اور ہم طرحی کا شرف رکھتے تھے ۔ علوم فارسی میں بہتوں نے ان سے استفادہ کیا ، کئی کتابوں کے مولف ہیں ۔ نواب انہیں بہت مانتے تھے ۔ افضل الشعرا اور شیرین سخن خان بہادر کے خطابات سے ممتاز تھے۔ نواب کے اُستاد ، حضرت والا کے شاگرد خاص اور خلیفہ تھے ۔ آخر عمر میں استاد نے اپنے دوسرے شاگردوں کو بھی اِنھیں کے حوالے کر دیا تھا ۔ تذکرے کی تالیف تک اس خدمت پر مامور رہے۔ خانی اور بہادری کا خطاب بھی پایا —

حکمین مشاعرہ

اس مشاعرے میں شعرا کو ایک دوسرے پر جرح و تنقید کی عام اجازت تھی۔ ایک شاعر آزادانہ اعتراض کرتا اور دوسرا جواب دیتا تھا ۔ لیکن اس کا تصفیہ کیوں کر ہوتا ، اس لئے نواب کے نظر انتخاب نے دو بزرگوں کو انتخاب کیا جو اپنی شاعرانہ قابلیت اور کہنہ مشقی کے لحاظ سے مسلم تھے —

حکم اول

مولوی میراں محی الدین قادری تھے ۔ جو سنہ ۱۲۰۵ ھ میں بمقام اودگیر پیدا ہوے ۔ مدراس میں آکر علماے وقت کی شاگردی کی ۔ فائق کے شاگرد تھے ۔ ملک کے اکثر لوگوں نے اِن سے استفادہ کیا ۔ بردبار ، تواضع اور انکسار کے دلدادہ تھے ۔ بندگان اعظم نے فرط جوہر شناسی سے اِنہیں مشاعرہ کا حکم اول مقرر فرمایا ۔ بزرگ آدمی اور زیادہ تر وظائف و اوراد میں مشغول رہتے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے — (اشارات)

حکم ثانی

مولوی محمد قدرت اللہ خاں گوپاموی تھے۔ نتائج الافکار اِن کا تذکرہ مشہور ہے ۔ خوش اخلاق ، نیک سرشت آدمی ہیں ۔ فن سخن میں مشاق ، اور دو دیوان رکھتے ہیں ۔ کلام سے کچھ درد دل کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ نواب کے والد کے زمانے کے ملازم قدیم ہیں —

منشی مشاعرہ

اِن دو حکموں کے علاوہ ایک منشی بھی مقرر تھے جن کا یہ کام تھا کہ اعتراضات اور جوابات لکھ دیا کریں۔ کلام بھی سب اِن کے پاس رہتا تھا۔ مشاعرے کے متعلق تمام تحریری کام اِن سے متعلق تھا۔ اِن کا نام سید محمد اور 'خاص' تخلص تھا۔ ارد گرد کے شرفا میں سے تھے' مدارس آکر راقم (میر مجلس) کے فیض تعلیم سے اچھی استعداد پیدا کرلی۔ مشاعرے کی "منشی گری" کے علاوہ سرکاری کتب خانے کے داروغہ بھی تھے۔ بہت ذہین اور تیز آدمی تھے اکثر شعرا پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے —

اِن لوگوں کے علاوہ ۲۷ ' ۲۸ شاعر تھے' جو مدارس میں اپنے فن اور لیاقت کے لحاظ سے امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ اکثر سرکاری مشاہرہ یاب اور کسی نہ کسی معزز خدمت پر سرفراز تھے۔ سب کی ایک اجمالی فہرست ذیل میں درج ہے —

۱۔ احمدی : غلام احمد نام اسدالدین خاں کے بیٹے تھے۔ سنہ ۱۲۶۱ ھ میں " بزم مشاعرۂ اعظم " میں داخل ہوے اور دربار کی ملازمت اور سرکاری مشاہرہ سے سرفراز ہوے۔ صاحب دیوان وغیرہ —

۲۔ احسن : سید محمد اسحاق نام' طرزش خاں بہادر خطاب۔ مدارالامراء کے بھانجے اور نواب کے دیوان تھے۔ کم گو و خوشگو۔ تین چار شعر سے زیادہ نہیں کہتے مگر یہ طویل الذیل غزلوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ عربی فارسی کے عالم۔ نیابت میر منشی فارسی اور نیابت بخشی پادشاہی پر فائز ہیں۔

۳۔ اکرم : ذاکر علی نام' مولانا محمد حسن علی ماہُلی کے فرزند ' معتمد خاں بہادر خطاب اور عطاے پالکی سے سرفراز تھے۔ نواب اعظم کے تربیت یافتہ اور شاگرد۔ بیش قرار مشاہرہ یاب میر مجلس دیوانی مال کی خدمت پر مامور —

۴ - بلیغ : شاہ روح اللہ نام ' اس ملک کے مشائخ زادوں میں سے تھے ۔ ان کے باپ خوش نویسی خاصکر خط نستعلیق میں مشغولیات سے تھے ۔ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے ۔ چرب زبان تیز طبع ' مہذب الاخلاق مشاعرہ یاب —

۵ - بینش : سید مرتضی بن میر صادق علی الحسینی ۔ آبائی وطن مشہد ' مشاعرہ یاب شاعر —

۶ - ثاقب : میر مہدی الحسینی ' بینش کے بڑے بھائی ۔ صاحب مدرسہ اور مشہور اساتذۂ فارسی میں تھے ۔ ملا ظہوری کے پیرو ۔ رعایت لفظی کے دلدادہ رنگینی اور لطیفہ گوئی مزاج میں اس قدر کہ ہر شخص دلدادہ ہے عمائد شہر ملاقات کے آرزو مند رہتے اور مشغولیات سے جلتے ہیں ۔ کثرت سے اعتراضات ہوتے ہیں مگر ذرا چین بہ جبیں نہیں ہوتے —

۷ - جوہر : قادر حسین نام ' جوہری زادہ ہیں : علم فارسی کے انتہائی دلدادہ کہ درسیات مکرر سہ کرر مختلف اُستادوں سے پڑھیں اور مستحضر ہیں ۔ جیسے ہی یہ مشاعرۂ اعظم میں داخل ہوے بعض ضروری امور کی وجہ سے نواب نے مشاعرہ ملتوی کردیا ۔ اس سبب سے اِنھیں احباب ' جوہر زردہ قدم ' کہتے تھے ۔ مرزا عبدالباقی وفا کی سعی سے مشاعرے میں بار یاب اور سرکاری مشاعرے سے سرفراز ہوے —

۸ - ذکا : محمد حبیب اللہ نائطی بیجا پور سے ان کے بزرگ کرناٹک پہنچے ۔ بینش کے شاگرد اور انھیں کی کوشش سے ایک بار مشاعرے میں بار یاب ہوے ۔ زبان میں لکنت رکھتے تھے —

۹ - رونق : غلام محی الدین نام عارف الدین خاں خطاب ' حافظ محمد معروف برھانپوری کے بیٹے ۔ سنہ ۱۱۹۲ ھ میں پیدا ہوے ۔ ۲۰ سال کی عمر

میں نواب عمدۃالامرا کے ملازم ہوے - یہ مختلف مقامات میں رہے ' حیدرآباد پہنچے - آخر سنہ ۱۲۶۶ ھ یعنے ۷۴ سال کی عمر میں وطن میں مقیم ہوے - اور مشاعرۂ اعظم میں داخل ملازم سرکار - مگر کبر سنی کی بدولت بعد کو دماغ میں خلل پیدا ہو گیا —

۱۰ - شاعر : غلام محی‌الدین نام ' گزارش خاں خطاب - حکیم سعدالدین کے بیٹے تھے اور نواب کی حضور میں عرض بیگی کی خدمت پر مامور ہیں - اکثر سوال و جواب مشاعرے میں کرتے ہیں - طبیعت میں بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی کی مہارت ہے —

۱۱ - صاحب : منشی الملک خطاب ' مولوی غلام علی نام - دبیرالدولہ اعتماد خاں بہادر عطارد جنگ - فارسی کے عالم عربی میں استعداد معمولی' کبھی کبھی شعر کہتے ہیں - جودت طبع اور تیزی ذہن ' ذکاوت مزاج میں مشہور ہیں - پیشکار میر سامان وغیرہ —

۱۲ - عارف : احمد ابو تراب نام - واقف کے بھانجے' راقم کے شاگرد ' صرف و نحو ' منطق اور علوم دینیہ و کتب متداولۂ فارسی کے عالم تھے —

۱۳ - فرحت : محمد صبغۃالله نائطی - واقف اور والا کے شاگرد فارسی زبان کے محاوروں اور مصطلحات کے بڑے واقف بلکہ حافظ تھے —

۱۴ - قدیر : قادر پادشاہ ٹیپو ولی کی درگاہ کے خادم زادہ اور واقف کے شاگرد تھے —

۱۵ - لائق : غلام دستگیر غیاث خاں - رائق کے بھانجے - طبیب اور فارسی کے عالم تھے —

۱۶ - معاون : معاون خاں خطاب - انگریزی ترجمہ نویسی کی خدمت پر مامور تھے - کم سخن اور مجسم اخلاق ' پختہ کو ' مگر شہرت نہیں رکھتے

خاموش زندگی ہے —

۱۷ - منتظر : سید شاہ عبدالفتاح احمد حسینی - پیر زادہ اور واقف کے شاگرد ہیں۔

۱۸ - مختار : باقر حسین نام ' حسن علی خاں خطاب تھا ۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے —

۱۹ - مخلص : سید درویش ' سید شاہ منصور قادری کے نواسے ' راقم کے شاگرد مشاعرہ یاب —

۲۰ - ندرت : محمد یحیی علی خاں - عربی فارسی کے عالم طبابت میں دستگاہ رکھتے ہیں - خدمت افتا کے ضروری علوم سے فارغ اور قدرت کے شاگرد تھے —

۲۱ - ولا : سید حمیدالدین نام ' مستور خاں خطاب - والا کے فرزند ' فارسی ' عربی کے عالم ' شعرا کی صحبت یافتہ ' خوش تقریر تھے - اکثر اساتذہ کا کلام بر زبان تھا - صرف دو تین بار مشاعرے میں آئے - غزل کہکر لائے - وہاں ان پر اعتراضات کی بو چھار ہوئی - غیور طبع اور خود دار آدمی تھے اس کی تاب نہ لا سکے ' حکم مشاعرہ واقف سے ایک روز سخت ہو پڑی - اُس روز سے پھر کبھی مشاعرے کا رخ نہ کیا —

۲۲ - وفا : میرزا عبدالباقی الشریف الرضوی - سرکار گورنمنٹ ایجنٹ مدراس کے میر منشی تھے - بغداد ان کا مولد ہے - طبیب کامل اور علوم عربیہ اور فنون کثیرہ میں ماہر و کامل - کرناٹک میں ایسا کامل آدمی اہل ولایت سے کم آیا ہوگا - ہفت قلم خوش نویس بھی تھے - اور وزیر زادہ ایران مشہور تھے —

۲۳ - وفا : میر قربان حسین پسر سید منور علی - نتھر نگر میں پیدا ہوے - مولوی راقم کے شاگرد تھے —

۲۴ - راز : حکیم شاہ زین العابدین قادری نام - غلام محمد ماڈل ظریفی کے بیٹے تھے - رضا حسین خاں خطاب ، صاحب تصانیف تھے اور طبیب مشہور —

۲۵ - واصف : مولوی محمد مہدی واصف ، حارث الدین خاں رونق کے بیٹے ، عربی ، فارسی ، انگریزی کے ماہر تھے اور صاحب کمالات تھے - فصحاے اہل عجم کے صحبت یافتہ اور ان سے محاورات سیکھے ہوے - بہت سے تصانیف کے مالک - تذکرۂ معدن الجواہر کے مصنف ، محکمۂ عالیہ کی خدمت مترجمی پر فائز اور نواب کی قدر دانی سے سرفراز مشاعرہ ہیں - ہمیشہ تالیف و تصنیف میں مشغول رہتے تھے - ان پر مشاعرے میں بہت لے دے ہوتی تھی اور یہ بھی بہت اعتراض کرتے تھے ، اپنی قابلیت پر ناز تھا - اپنے تذکرے میں اکثر اساتذۂ قدیم خاص کر ناصر علی سرہندی کے کلام پر بہت اعتراضات کیے ہیں - نواب اعظم نے اپنے تذکرۂ گلزار میں ان سب کا جواب ۱۴ صفحات میں اپنے حالات کے ضمن میں نہایت قابلیت سے دیا ہے اور خوب انتقام لیا ہے -

مشاعرے کے حالات

یہ تو معلوم ہوچکا ہے کہ یہ مشاعرہ سرکاری مشاعرہ تھا ، نواب اعظم جیسے قدر دان سخن اس کے صدر تھے - مشاعرے میں کیا کچھ تکلفات اور انتظامات نہ ہوتے ہوں گے - بینش نے اپنے تذکرے میں اس کی نہایت عمدہ تصویر کھینچی ہے - لکھتے ہیں :

" سبحان اللہ کیا پاکیزہ محفل ہے ، اس کا مقام دل کشا اور اس کی ہوا روح افزا ہے - راحت کے اسباب مہیا ہیں - خوشی اور انبساط کے دروازے دلوں پر کھلے ہوے - دنیا کے غم خس و خاشاک کے طرح سینوں سے پاک - اہل محفل کے چہرے جوش خوشی و سرور سے

موسم بہار کے پھولوں کی طرح کھلے ہوے - رنگین کلاموں سے ان خوش نفسوں کی زبانیں ' گلفروش بنی ہوئی تھیں اور سننے والوں کے کان گویا بہار کو آغوش میں لیے ہوے - حاضرین کے لئے الگ الگ مکان میں نہایت وسیع دسترخوان بچھے ہوے اور اس پر کھانے چنے ہوے - مزیدار کھانے ' خوش گوار شربت ' قسم قسم کے حلوے ' اور طرح طرح کے خشک میوے ' پستے ' بادام وغیرہ کے نقل ' خوشبودار پاکیزہ میوے ' تازہ فرحت بخشنے والے پھل ' رنگ برنگ کے برتنوں ' سنہری روپہلی پیالوں اور رکابیوں میں سلیقے سے لگے ہوے - اور اتنی مقدار میں کہ حریص کی آنکھ بھی سیر ہوجاے - اس کے چٹخارے (لذت مجمل) سے منہ میں پانی چھٹنے لگے - پھر لذت مفصل کا کیا ذکر ہے - تیز چالاک نوکر سفید براق لباس پہنے ' زر تار پگڑیاں سر پر سجے ' ہر طرف نور نگاہ کی طرح ادھر اُدھر چلت پھرت دکھا رہے ہیں - اور فرماں بردار خدمت گار صاف ستھری قبائیں پہنے ' مرصع کمر پٹکے لگاے ' ہرطرف نوجوانوں کے دلوں کی مانند جولانی ناز میں مصروف - کسی کی زبان پر حرف مطلب آیا نہیں کہ اس کے مطلوب دلی کو لاکر پیش کرنے کے لئے دوڑے - اور کسی مہمان کی نگاہ رغبت کسی چیز کی طرف اُٹھی نہیں کہ منظور خاطر چیز سامنے حاضر ہے " -

جس مجلس کا یہ رنگ اور یہ ٹھاٹ ہو ' اس کا کیا کہنا - اور جو زبان اور اس قسم کی اتنی نعمتوں سے لذت اندوز ہوں ' پھر کیا عجب جو ان کے اشعار نمکین ہوں اور زبانوں سے کلام شیریں نکلے -

جب مشاعرہ قائم ہوا ہے تو بینش حیدر آباد میں تھے - اس کا غلغلہ سن کر ' یا نواب کی یاد فرمائی پر فوراً مدراس آئے اور از راہ قدردانی باریاب ہوے - لکھتے ہیں :-

" میں بھی اس ناز و نعمت کے نزہت کدے میں پہنچا ' اُن معنی رس نکتہ سنجوں اور صبح نفس سخن دانوں کے مجمع میں حاضر ہوکر اپنے مزخرفات پیش کرتا رہا - ان نکتہ سنجوں کی توصیف میں حفظ مراتب کے لحاظ سے یہ دو بیتی زبان قلم پر آگئی ہے " - (بینش) -

گفتم غزل ایں بزم سخن را بمثل ہر یک بیتش خوش است بے عیب و خلل

شد مطلع او اعظم و مقطع راقم واقف' قدرت ' دو فرد چیدہ ز غزل

اور بھی کئی شاعر مشاعرۂ اعظم کا شہرہ سن کر دارالخلافہ میں آئے اور کامیاب ہوے —

تہذیب مشاعرہ و آداب مجلس

ان تکلفات شاہانہ کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ مشاعرے میں کوئی شاعر آداب مجلس اور آئین اخلاق کے خلاف کوئی بات نہیں کرسکتا تھا ' حتیٰ کہ شعر میں بھی ' اشارتاً کنایتاً ایسی بات نہیں لاسکتا تھا جو تہذیب کے خلاف' متانت و سنجیدگی سے دور اور اخلاق سے گری ہوی ہو ' معاصرین پر چوٹ یا اُن کی تحقیر ہو - یہاں تک بھی خلاف ادب تھا کہ اپنی تعلی ایسی کی جاے کہ دوسروں کی توہین کا شائبہ پیدا ہوتا ہو - یہ امر نواب

کو نہایت ناگوار تھا ، اور بمصداق " الناس علی دین ملوکہم " درباری شعرا پر بھی اس کا اثر تھا - حالانکہ بدقسمتی سے ایسے زمانے بھی ہمارے اسلاف پر گزر چکے ہیں کہ ایک معاصر دوسرے کی ہجو کہتا ، امرا اور عوام سن کر خوش ہوتے اور تمام شہر میں یہ ہجویں پھیل جاتی تھیں - انشا ، مصحفی ، سودا وغیرہ کی ہجویں اور ان کے قصے دنیائے شاعری کی جبین روشن پر ایک بدنما داغ ہیں - فارسی شعراء میں بھی یہ قابل نفرت سنت جاری رہ چکی ہے - لیکن مہذب ، سنجیدہ ، شریف طبع امرا نے کبھی ایسی باتوں کو پسند نہ کیا اور نہ اپنے دربار میں جائز رکھا - ہجو تو کجا یہ بھی گوارا نہ تھا کہ طنز اور طعن ہو - چنانچہ نواب اعظم کے دربار اور مشاعروں میں اس مذموم رسم کی کہیں جھلک نہیں نظر آتی - ان تنقیدوں اور عالمانہ اعتراضوں کے سوا جو ایک علمی گروہ کے لئے ہمیشہ جائز بلکہ ترقی علم و فن کا سبب مانے گئے ہیں اور قائل کے جوہر ذاتی کا آئینہ ہیں - دربار اور مشاعرے کے باہر بھی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی بلکہ یہ پتہ چلتا ہے کہ شعرائے دربار میں باہم خوش گوار مراسم تھے - اور ہر ایک کو ایک دوسرا بھلائی سے یاد کرتا ہے اور ایسی باتوں کو یہ لوگ خود بھی تہذیب کے خلاف، شرافت کے منافی اور شان علم و ادب کے بالکل غیر شایان سمجھتے تھے - اس لحاظ سے دربار اعظم کو جس قدر سراہا جائے کم ہے اور اس مذاق سلیم کی جتنی داد دی جائے بجا ہے - یہی وہ چیز ہے جس نے بعض دیگر امرائے ہند کے درباروں اور درباری مشاعروں سے اسے ممتاز کردیا ہے —

ایک بار کا واقعہ ہے کہ بیدمشک نے یہ مقطع پڑھا :

پاس ہمطرحاں نمود و فکرخود را پست کرد   زیں غزل کم پایہ تو در دفتر بیدمشک مجو

یعنی اپنے ہم سخنوں کا لحاظ کرکے اپنی فکر کو پست کرنا پڑا۔ بینش کے دیوان میں اس سے زیادہ ھلکی غزل نہیں ملے گی —

بینش نے جب یہ مقطع پڑھا، مشاعرے میں تیوروں پر بل آگئے اور وفا نے مسکرا کر کہا: جناب بینش کے کلام سے "احسنہم اکذبہم (یعنی جتنا زیادہ جھوٹ اتنا ھی زیادہ اچھا)" کی تصدیق ھوتی ھے —

شاعر نے یہ مصرع پڑھا: "کالا کہ بخاوند نماند درزی است" اور کہا: اس قسم کا غلط دعوی آپ کے منہ پر زیب نہیں دیتا —

خالص بولے: اس غزل پر اگرچہ بعض جگہہ اعتراض ھیں لیکن چونکہ خود اس کے کم پایہ ھونے کا اعتراف کیا گیا ھے اس سبب سے ھم نے چشم پوشی کی۔ بینش نے جو احباب کے یہ بگڑے ھوئے تیور دیکھے تو اپنی اس لغو حرکت پر (برکردۂ نا صواب خود) نادم ھوے۔ اور میر مجلس (راقم) کی جانب سے حکم صادر ھوا کہ آیندہ کوئی اس قسم کے خرافات کے پاس تک نہ پھٹکے —

اعظم کی تہذیب پسندی اور ھجو سے نفرت کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ھے۔ اس سے ھمارے مذکورہ بیان کی پوری تصدیق ھو جائے گی۔ یہ دو دو شاھد عادل ھمارے لیے کافی ھیں —

بینش نے اپنے تذکرے میں ذکا نائطی کی نسبت لکھہ دیا ھے کہ "از کمال شوخی طبعش گاہ گاہ بسوے ھجو ھم می پردازد"۔ کبھی کبھی شوخ مزاجی کی وجہ سے ھجو بھی کہہ لیتے ھیں۔ اس پر اعظم لکھتے ھیں: "اگر فی الحقیقت یہ سوء مزاجی اُس کی طبیعت میں متمکن ھے تو بلا ریب مذموم ھے، کیونکہ: "زنہار کسے را نہ کنی عیب کہ عیب است"۔ مگرفکا اور اُن کے بھائی رسا کے بیان سے معلوم ھوا کہ "قول بینش اصلے و حقیقتے

ندارد " - جس نواب کا یہ مذاق طبعیت ہو اس کے درباری لوگوں کے نسبت رائے قائم کرنا کچھہ زیادہ دشوار نہیں ہے —

مشاعرے میں تنقید

اس مشاعرے کی سب سے زیادہ قابل قدر اور لائق ذکر خصوصیت یہ تھی کہ " ہر شخص حضور کی پیش گاہ سے اجازت رکھتا تھا کہ اگر کسی کے کلام میں کوئی سقم نظر آئے تو ضرور ظاہر کر دیا جائے - اور جب تک شاعر اہل زبان مستند اساتذہ کے کلام سے اپنے کلام کی سند نہ لائے ' اس وقت تک درگزر نہ کی جائے اور اگر شعراء میں مناظرہ واقع ہو اور کسی صورت سے رفع اختلاف کی صورت نظر نہ آئے تو واقف اور قدرت کی جانب رجوع کیا جاے ' جو حکمین مشاعرہ تھے - اور اگر حکمین کے درمیان میں بھی اختلاف پیدا ہو جاے تو اُس کا فیصلہ حضور کی رائے رزین اور عقل متین کے سپرد ہوتا تھا - اور حضور کا فیصلہ آخری فیصلہ مانا جاتا تھا " —

غالباً دنیا کا کوئی مشاعرہ اس خصوصیت کو پیش نہیں کرسکتا اور اس جدت کا سہرا خود نواب اعظم ہی کے سر ہے —

اس میں بہت سے فائدے معلوم ہوتے ہیں - استاد کی خدمت اور کتابوں کی ورق گردانی بغیر زبان اور فن کے متعلق بہت سی چیزیں مشاعرے میں معلوم ہو جاتی تھیں - بہت آسانی سے ہر شاعر کی ذہانت اور معلومات کا اندزاہ ہو سکتا ہے - حاضر جوابی کی جرأت ہوتی ہے - علم مستحضر رہتا ہے ' کلام اساتذہ پر نظر رہتی ہے ' مطالعہ اور وسعت علم کا شوق قائم رہتا ہے ' ہر ایک کو کچھہ لکھہ کر لے آنے اور سنا دینے کی جرات نہیں ہوتی بلکہ ٹھونک بجا کر میدان میں آنا پڑتا ہے —

اعظم نے اُن تمام اعتراضات اور جوابات کو اپنے تذکرے میں جگہہ

جگهه مناسب موقع پر درج کر دیا هے۔گو اِس سے اُن کا تذکرہ طویل هو کر ۴۰۰ صفحات تک پهیل گیا هے ' لیکن دل چسپ معلومات کا ایک قابل قدر خزانہ بن گیا هے - اُس دور میں شعراء اور ادباء میں جس قسم کا فن تنقید رائج تها ' اور کس قسم کے لفظی و معنوی نقائص پر اُن کی نظر رهتی تهی ' اِس پر بہت اچهی طرح روشنی پڑتی هے - انگریزی حکومت' یورپ کے علمی و ذهنی تسلط کی بدولت نہ فارسی زبان کا مذاق رها هے اور نہ فارسی شاعری کا اور کو همارے نئے تعلیم یافتہ اور نئے مغربی مذاق سے آشنا اِن بزرگوں کی علمی کاوشوں کو تضیع اوقات سے تعبیر کرتے هیں ' اور ایک حد تک یہ درست بهی هے ' پهر بهی چند نمونے پیش کرنے کو جی چاهتا هے ' ورنہ مشاعرہ اعظم کا بیان ناقص رهے گا - نیز یہ بهی فائدہ هے کہ اس عهد کے مذاق تنقید اور ارباب کمال کی نکتہ آفرینیوں کا ایک اندازہ هوسکے گا - اور یہ خیال دور هوسکے گا کہ همارے اسلاف فن تنقید سے آشنا نہ تهے۔ ناظرین ذرا زحمت گوارا کریں ۔ ملاحظہ هو :

احسن : قیامت گرم رفتار است پیکان نگاہ او
که در زخم دل سوزان من بوی کباب آید

مخلص : پہلے مصرع میں گرم رفتاری کا ذکر هے اور دوسرے میں صرف گرمی کی صفت بیان کی هے ۔ رفتار کا لفظ حشو اور بیکار هے ۔ احسن خاموش رهے - ثاقب اور بینش احسن کی تائید میں کچهه بولے مگر ان کی تاویل مفید مدعا نہ تهی - لائق نے صائب کا یہ شعر احسن کی تائید میں پیش کیا :

زشستت صاف از دل بگذرد گرم آنچنانیں تیرش
که از بوے کباب افتد بفکر زخم نخچیرش

خالص نے کہا یہ شعر تو مخلص کے دعوی کی دلیل ہے - کیونکہ صائب لکھتا ہے کہ معشوق کا تیر نخچیر (عاشق) کے دل سے ایسا گزر گیا کہ اسے بالکل خبر ہی نہیں ہوئی حتی کہ کباب کی بو نے خبر دی - حکمین نے اعتراض کو پسند کیا —

اکرم : درد و غم تو چوں دل پر خون آفتاب

هر بر همن عبث شده مفتون آفتاب

فرحت : دوسرا مصرع یوں ہو تو خوب ہے : بیوجہ بر همن شده مفتون آفتاب۔

اکرم : میرا مصرعہ ایک ایسا لطف رکھتا ہے جو آپ کے مصرع میں نہیں ہے - اور وہ لفظ " هر " کی وجہ سے - هندی اور سنسکرت میں خدا کو کہتے ہیں - برهمن هر کو پوجا کرتا اور " هری هر " کہتا ہے —

اکرم : تا سحر از کوه کوه گریه ام سیلاب شد

چشم را یک قطره اشکم گوهر نایاب شد

ندرت : کوه کوه کی اضافت جو بسیار (بہت کے) معنے میں ہے - درست نہیں —

اکرم نے اس وقت سرخوش کا یہ شعر سند میں پیش کیا :

به گلزار یکه بیند ناز عرض اشکر حسنش

تماشه کن شکست فوج فوج رنگ گلهارا

اکرم : می سزد گر رتبه‌ام باشد بهم طرحان خویش

طبع موزوں حاصل از شاگردی نواب شد

ندرت : صرف موزونی طبع هم‌طرحون میں رتبہ کی بلندی کا سبب نہیں ہوسکتی۔اس کی جگہہ " فکر عالی " ہو تو مناسب ہے - حکمین نے اس تصرف کو پسند کیا —

بیلش : از سر زلفت مگر عکسے به بحر افگنده

می طپد چوں ماهی بےآب موج از اضطراب

شاعر : لفظ اضطراب زائد ہے ' کیونکہ می طپد کافی ہے ' بینش نے مان لیا ۔

اور اعظم نے فوراً مصرعہ کو یوں بنا دیا :

کشتۂم چوں ماہی بے آب موج از اضطراب

تمام احباب نے اس تصرف اور ترمیم کو پسند کیا —

بینش : مردم ز شوق بوسہ بہ پیش دہان من
آئینہ نہ ز روے تو گر اعتبار نیست

شاعر : " آئینہ پیش نفس گذاشتن " یا " پیش روے نہادن " اساتذہ کے کلام میں آیا ہے ' نہ کہ " پیش دہان " کیونکہ سکتہ کے عالم میں منخرین (دونوں نتھنوں) سے سانس نکلتی ہے نہ کہ دہان (منہ) سے —

بینش نے منارا لضوابط سے یہ شعر سنداً پیش کیا :

دارد بدود چشم تو جبریل آفتاب پیش دہان عیسیِ پیغمبر آئینہ

بینش : چشم ارباب حقیقت کے کشاید بر مجاز
مست ساقی برنتابد منت صہبا عبث

خالص : عبث کا لفظ زائد ہے - کیونکہ بغیر اس کے بھی شعر کے معنے پورے ہوجاتے ہیں - بینش نے اعتراف قصور کرلیا —

بینش : خط برلب نوشین تو بیوجہ نہ باشد
ہر جاکہ بود تنگ شکر جوش مگس شد

شاعر : دوسرے مصرعہ میں لفظ " شد " بجاے " شود " واقع ہوا ہے - یہ کیونکر درست ہوسکتا ہے —

بینش : اذا وقع الماضی فی محل الشرط والدعاء یکون معناہ مستقبلاً - فعل ماضی جب شرط یا دعا کی محل میں آئے تو مستقبل کے معنے دیتا ہے '

سعدی فرماتے ہیں :

گر یکے زیں چہار شد غالب جان شیرین بر آید از قالب

حکمین نے جواب پسند کیا —

بینش : پاے تو بہ کنج آمدہ بینش ز خموشی

غواص گہر یاب نہ بے پاس نفس شد

خالص : پاس بہ معنی نگہبانی ہے اور یہاں بمعنے ضبط آیا ہے - سند درکار ہے —

بینش : عرفی کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

اے آنکہ بہنگام ستایش کرسی تو

صوفی شمرد عیب نگہبانی دم را

بینش : صبر از دل ، دل ز من ، من از در یارم جدا

کس مبادا در جہاں چوں من پریشاں روز کار

اعظم : یارم کی جگہ اگر لفظ دلبر ، ہو تو الفاظ سابقہ پر نظر کرتے ہوے بہت مناسب ہوگا - تمام احباب نے پسند اور بینش نے تسلیم کیا —

بینش : بیک اشارۂ ابرو ، بکشت چشم تو ام

فدائے قاتل و قربان ایں خم و چم تیغ

خالص : چشم کا ابرو سے اشارہ کرنا نظر نہیں آیا - سند چاہئے —

بینش ۰ صائب کا شعر ہے :

بابرو می کشد آن چشم میگونش نگاہے را

تکلف برطرف شمشیر می باید سپاہی را

بلیغ : شاہ روح اللہ نقشبندی خوشنویس ملازم سرکار :

نیست ممکن شرح حسن بے مثال او بلیغ
گرچہ باشد صد زباں ہم چوں گل سوسن مرا

فرحت : شعرا نے سوسن کو صد زبان اور دہ زبان باندھا ہے نہ کہ گل سوسن کو - بلیغ نے برہان قاطع سے سند دی کہ " سوسن نام گلے ست دہ زبان " اور صد زبان کی جگہ دہ زبان داخل کیا —

بلیغ : تا دادہ یاد قد تو مضمون آفتاب
خوش بست چرخ مصرعہ موزون آفتاب

فرحت : آفتاب کو قد سے کچھہ مناسبت نہیں ہے ' شعر کا مضمون کیونکر درست ہوسکتا ہے —

بلیغ نے انوری کے نام سے یہ شعر اپنے کلام کی سند میں پڑھا :

سحر خیال قدش بود اول مصرعہ
چو آفتاب بر آمد تمام شد مطلع

فرحت نے کہا یہ شعر خزانۂ عامرہ میں آذری اسفرائینی کے نام سے بتغیر لفظ " رخت " بجاے " قدش " دیکھا ہے - ارباب مذاکرہ نے کتب خانۂ سرکاری خاص سے تذکرہ منگوا کر دیکھا - فرحت کا بیان درست نکلا - حکمین نے بلیغ کو شعر بدلنے کا حکم دیا —

بلیغ : چوں بعشق تو نہ باشد دل نالاں محتاج
ہست آرے بعصا دست ضعیفاں محتاج

اعظم : دونوں مصرعوں میں مطابقت نہیں پائی جاتی - عشق کو عصا اور دل نالاں کو ضعیفاں سے کوئی مناسبت نہیں ہے ' اور مان لیا جاے تب بھی پہلے مصرعہ کا مضمون درست نہیں - کیونکہ دل نالاں وہی ہے جو عشق رکھتا ہے - اس دل کا محتاج عشق ہونا بے فائدہ ہے -

پہلا مصرعہ یوں ہو تو بہتر اور ٹھیک ہے :

'پھر آہ دل افسردہ شد ایجاں محتاج' سب احباب نے پسند کیا۔

بلیغ : حسن‌صافش نہ شد ز خط زائل زانکہ آیئہ درنمد باشد

فرحت : دوسرا مصرعہ جو پہلے کی علت واقع ہوا ہے معلول سے مناسبت نہیں رکھتا زانکہ کی جگہہ صاف ہو تو خوب ہے۔ واقف بولے : اس کی جگہہ جاے بہتر ہے۔ صاحب نے کہا : بلکہ لفظ حفظ ہو۔ سب کو صاحب کی ترمیم پسند آئی —

بلیغ : شادم بخون خویش زتیغ ادائے یار

کیں شربت اجل بود از دست آں لذیذ

احمدی نے ایک عزیز کے اشارے سے اعتراض کیا کہ اس شعر میں تلوار کو تشبیہہ شربت اجل سے ہے' وجہ شبہہ نہیں معلوم ہوتی۔ بلیغ نے جواب دیا : وجہ شبہہ فنا ہے۔ واقف : تیغ کی تشبیہہ شربت سے' نظر میں نہیں آئی۔ اس کی سند ضروری ہے۔ بلیغ نے صائب کا یہ شعر پڑھا :

ایں تیغ آبدار در آغوش زخم من

در کام تشنہ است چو آب رواں لذیذ

اور کہا کہ جب تلوار کی تشبیہہ پانی سے درست ہے تو شربت سے کیوں درست نہیں۔ حکمین نے جواب کو پسند اور تسلیم کیا —

بلیغ دیدہ ام تا آتشیں رویش برنگ لالہ .

می زند از ہر نفس سرشعلۂ جو الہ را

ثاقب : جب روے محبوب کو آتش سے تشبیہہ دی تو اس کا فروغ بدرجۂ کمال ثابت ہوا۔ پھر دوسری تشبیہہ لالہ کے ساتھہ بے فایدہ معلوم

ہوتی ہے۔ بلیغ نے نظامی گنجوی کا یہ شعر پیش کیا :

درو آتشے چوں گل افروختہ گل از رشک آن گل ستاں سوختہ

حکمین نے پسند کیا —

بلیغ : دمبدم از آتش شوق تومانند سپند

برکشم تا چند از بیتابی دل نالۂ

ثاقب : " دمبدم یک نالہ کشیدن " کیونکر درست ہو سکتا ہے —

بلیغ : یاے وحدت نالۂ کے آخر میں زائد ہے اور یہ کیثر الوقوع ہے۔

حکمین نے جواب کو پسند کیا —

ثاقب : دل کشاید بمی گساری ما غنچہ خندد ز آبیاری ما

خالص : لفظ دل اس مطلع میں زائد ہے اس کی تخصیص کوئی فائدہ نہیں دیتی ' ارباب محاکمہ نے اس کے اعتراض کو پسند کیا۔ ثاقب دوسرے مشاعرے میں اس کی عوض دوسرا مطلع یہ لائے :

تافت آن‌ماہ روز یاری ما بر فلک رفت شور زاری ما

ثاقب : گر نگیرد فیض از افتادگان صاحب دماغ

بہر نفع سر چرا ما لند روغن زیر پا

خالص : یہ پہلا مصرعہ یوں ہو تو بہتر ہے : " گرنہ گیرد فیض از کم مایگان عالی دماغ " حکمین نے ان کے اس دخل کو پسند کیا —

ثاقب : در بر نمود جامعۂ نیلی فلک ز غم

تا زد سپاہ حسن تو شبخون آفتاب

خالص : " بر آفتاب شبخون زدن " تو فارسی زبان کا محاورہ ہے ' اور کلام شعرا میں آیا ہے۔ لیکن " شبخون آفتاب " اضافت کے ساتھ محتاج سند ہے۔ ثاقب سند نہ لاسکے —

ثاقب نے ایک غزل پڑھی ' جس کے قافیے تھے : دل نقاب ' گل آفتاب ' قاتل آب ۔" اور کہا کہ یہ ذوقافیتین ہے ۔ اعظم نے کہا کہ : یہ سقم ہے ' اس لیے کہ قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ غزل اگر ذوقافیہ والی ہو تو دوسرا قافیہ بہ منزلۂ ردیف واقع ہوتا ہے ۔ یعنے اس کا متحد اللفظ ہونا ضروری ہے ۔ جیسے نقاب ۔ گلاب ' عقاب ۔ یہ نہیں کہ آب ۔ انقلاب ' وغیرہ ۔ میری غزل ہے :

تیر عدو چو اصغر بے شیر خست و رفت

بر عرش آہ با نوے دلگیر جست و رفت

از فرش و عرش نعرۂ تکبیر شد بلند

اکبر بہ قتل گاہ چو شمشیر بست و رفت

بست ' خست ' جست دوسرے قافئے ہیں ۔ یہ سب ہم وزن ہیں ۔ نقاب ' آفتاب ' آب ' ثاقب کی غزل میں ہم وزن نہیں ہیں ۔ اشعار اساتذہ بھی اس پر شاہد ہیں ۔ یہاں یہ کلیہ قاعدہ فوت ہوا جاتا ہے ۔ تمام یاران مجلس نے یہ بات مانی اور حضرت ثاقب نے اپنی نادانستگی کا اعتراف کیا —

ثاقب : عیب نا صافیم از یک نگہش صاف برفت

چشم شوخ تو عجائب ہنر آموختہ است

حالص : عجائب ' عجیب کی جمع ہے اور یہاں مفرد کے معنے میں مستعمل ہوا ہے ۔ کیونکر درست ہوگا ؟

ثاقب نے حدائق البلاغۃ سے یہ شعر پیش کیا :

کلید در بدست باغباں است عجائب حاتمے سالار خان است

حالص : چشم حیران بہ گلرخے داریم نرگس آسا ست انتظاری ما

بینش : لفظ انتظار خود مصدر ہے ' اس میں یاے مصدری بڑھانا درست نہیں

ہے یائے نسبت کا اضافہ البتہ جائز ہے مگر یہ اضافت کی صورت میں صحیح
ہوگا - جیسے غم انتظاری ' باد بہاری وغیرہ —

اظم : یہ اعتراض صرف خالص پر نہیں بلکہ واقف ' قدرت وغیرہ پر بھی
وارد ہوتا ہے - انہوں نے بھی اس طرح باندھا ہے ' لہذا یہ سب لوگ اساتذہ
کے کلام سے سند پیش کریں ورنہ مورد شبہ ابیات کو بدل دیں —

اقف دوسرے مشاعرے میں اپنے کلام کی سند خاقانی کا یہ شعر لائے :

گاہ چو حال عاشقاں صبح کند تلونی
گہ چو حلی دلبراں مرغ کند نوا گری

بینش نے قبول کیا - اعظم نے کہا کہ میری تحقیق میں آگیا ہے کہ مصدر
کے بعد (ی) کی زیادتی درست ہے ' چنانچہ میر غلام علی آزاد خزانہ
عامرہ میں مائلی کے حال میں لکھتے ہیں کہ فارسیوں نے عربی کے بعض
الفاظ میں تصرفات کئے ہیں جو اساتذہ کے اختیار کرلینے کی وجہ سے سند
ہوگئے ہیں - مثلاً لفظ کساد میں جو مصدر ہے (ی) الحاق کرتے ہیں .
کلیم کہتا ہے .

کم خریداری برائے ما ہنر باشد نہ عیب
کے تواں بہر کسادی طعنہ برگردن زدن

کمال بھی مصدر ہے - اس میں (ی ' ت) مصدری اضافہ کرتے ہیں -

سعدی : اگر مانند رخسارت گلے در بوستاں رستے
زمین را از کمالیت شرف بر آسماں رستے

اسی طرح امن مصدر ہے ' (ی ' ت) اس میں مصدری بڑھا کر
" امنیت " بنا لیا ہے - ظہوری ترشیزی کہتا ہے :

ظہوری ایں سخن باور ندارد کہ در ملک خطرا منیتے نیست

امن کو مامون کے معنے میں بھی استعمال کرتے ھیں - صائب کہتا ھے

عشق سازد ز ھوس پاک دل آدم را
دزد چوں شحنه شود امن کند عالم را

بظاھر یه معلوم ھوتا ھے که امن میں دو (ی ' ت) الحاق کرتے ھیں ' اس کی وجه یه ھے که پہلے اُسے مامون کے معنے میں لیتے ھیں - اور مامونیت کے بجائے " امنیت " بولتے لکھتے ھیں - کیونکه یه اصول عربی کے خلاف ھے ' عربی میں جو مشدد (ی) اور (ت) جو مصدری معنے کا فائدہ دیتی ھے صفت کے آخر میں آتی ھے نه که مصادر کے آخر میں - جیسے قابلیت' مقبولیت وغیرہ - اسی سبب سے کمالیت اور امنیت کلام عرب میں نہیں آیا ھے -

میر عبدالرشید تتوی شاہ جہانی نے منتخب اللغات میں لکھا ھے که " امنیت " بالفتح و تشدید یا ایمنی " - بظاھر معلوم ھوتا ھے که میر صاحب نے غور نہیں کیا صرف لفظ کی شہرت پر اکتفا کی - قاموس وغیرہ عربی لغات میں نه امنیت ھے اور نه اس قسم کے دیگر الفاظ ـــ

یہاں تک تو نواب اعظم کی تحقیق ھے' مگر ایک بات مجھے بھی اثنائے تحریر میں یاد آگئی ھے اس کو ظاھر کردینا بھی فائدے سے خالی نہیں - جلال لکھنوی نے جو باکمال محقق سمجھے اور لکھے جاتے ھیں اور ان کے شاگرد یا کم سواد اردو کے غزل گو شعرا ' ان کی تحریر اور تحقیق کو آیت و حدیث سمجھتے ھیں ' انتظاری ' اضطرابی کو غلط قرار دیا ھے - شاگردوں کو ھدایت کرتے ھیں که شعر میں یه لفظ نه کہے جائیں اور اس زمانے کے " لکیر کے فقیر " بعض استادوں نے بھی ان کو متروک کردیا - اور اسے اپنی علمی

تحقیق کا کمال خیال کیا ہے - حالاں کہ یہ الفاظ اب تک لکھنؤ میں زبانوں
پر ہیں ، بے تکلف بولے جاتے ہیں ' خاص کر عورتیں بولتی اور استعمال
کرتی ہیں - میرے نزدیک اس قسم کے متروکات زبان کے لیے سم قاتل ہیں۔
ضرور بولنا اور لکھنا چاہیے - زبان کی وسعت کے لیے ایسی حد بندیاں
مناسب نہیں ہیں - جلال مرحوم کے بیٹے کمال نے تو کمال ہی کیا ہے کہ اس
قسم کی بہت سی لا یعنی بحثوں پر ایک رسالہ لکھ مارا ہے - گویا بڑا
تیر مارا ہے - اب تو کوئی اسے جانتا بھی نہیں - لیکن بدنصیبی سے ملک
میں چند ایسے بے زبان ، تک بند' یا بند ' مقلد غزل گو ہیں جو اب بھی اس
کو آیت و حدیث سمجھتے ہیں ورنہ اس کی اور کہیں وقعت اور پرسش نہیں ہے -

خالص : ز غفلت باز دارد صحبت صاحب دلاں دائم
بلے خالص کسے را نے بروے آب خواب آید

والا : بروے آب ' بمعنے بالاے آب کلام اساتذہ میں میںنے نہیں دیکھا -
بروے کی جگہ " بہ سطح آب " کہدیا جاے تو خوب ہے -

خالص نے سعدی کا یہ شعر اپنے کلام کی سند میں پڑھا :

مرا پیر دانائے مر شد شہاب دو اندرز فرمود برروے آب (بوستان)

خالص : نے زخاک خالص ما سر کشد جاے گیاہ
بس بدل دارد ' و لاے دلبر کم سال خویش

والا : لفظ ولا کی جگہ " ہوا " ہو تو بہت خوب ہے - خالص اسی وقت
شکریۂ اصلاح کی تسلیم بجا لاے - کیا منصف مزاج اور شریف الطبع
لوگ تھے - اور یہ مشاعرے میں عام بات تھی کہ عمدہ اور صحیح

بات کو مان کر شاعر اپنے معترض کا شکریہ ادا کرتا اور تسلیم بجا لاتا تھا —

شاعر : ہالہ گرد ماہ تاباں حلقہ زد نیست در رخسار آں دلدار خط

فرحت : ردیف متحدالفظ والمعنی ہونا چاہیے - یہاں اس کے خلاف ہے - تمام اشعار میں خط بمعنی مکتوب آیا ہے اور یہاں بمعنی " ریش " - یہ درست نہیں - دیر تک دونوں میں مباحثہ گرم رہا - انفصال کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی -

اعظم نے کہا : اگر چہ اکثر شعرا ردیف کو مختلف المعنی بھی لاے ہیں ' لیکن فرحت کا اعتراض بجا ہے - کیونکہ ردیف کی تعریف یہ ہے کہ وہ مستقل کلمہ یا بیشتر از کلمہ جو قافیے کے بعد آے اور اس کا اختلاف جمہور کے نزدیک نہ لفظاً درست ہے نہ معناً - البتہ محقق نصیرالدین طوسی استقلال لفظ اور اتحاد معنے کو معتبر اور ضروری نہیں جانتا - جیسا کہ حدائق البلاغۃ میں ہے لیکن نظر انصاف میں محقق کا قول پسند نہیں - کیونکہ اس صورت میں ردیف کا قافیہ سے متمایز ہونا دشوار ہوتا ہے - تمام احباب نے یہ بات پسند اور تسلیم کی " -

لیکن اس پر عام طور پر عمل نہیں بلکہ عمل محقق ہی کے قول پر ہے - نہ فارسی کے شعرا نے دیا اور نہ اردو کے - (محوی)

ولا چوں ذرہ را کشد رخ گلگون آفتاب

از خود روم چو شبنم مفتون آفتاب

فرحت : آفتاب طلوع کے وقت سرخ ہوتا ہے ' اس وقت ذرہ نہیں پایا جاتا -

ولا : رخ گلگوں کا استعارہ آفتاب سے ذرہ کھینچنے کے وقت مجاز مرسل کی قسم سے ھے اور مجاز مرسل ھے : کسی شے کا نام ایسے نام پر رکھنا کہ گذشتہ زمانے میں رکھتا ھو - جیسے : " اتوالیتامی اموالھم " یعنے یتیموں کو ان کا مال دیدو بلوغ کے بعد - اور یہ بالکل ظاھر و معلوم ھے کہ یتیم بلوغ کے بعد شرعاً یتیم نہیں رھتا - اور عطار کا شعر ھے :

حمد بیحد مر خدائے پاک را آں کہ ایماں داد مشت خاک را

آدم کو مشت خاک سے تعبیر کیا ھے اور ظاھر ھے کہ آدم وجود سے پہلے خاک تھا - حکمین نے پسند کیا - راقم الحروف کا ایک مطلع ھے کہ

اب خون کے آنسو بھی نہیں دیدۂ تر میں ایسی بھی کوی آگ لگاے نہ جگر میں

اس پر بھی بعض ناواقفان فن احباب وغیرہ نے اعتراض کیا تھا - جس کا جواب اسی وقت دیدیا گیا تھا -

ولا - محفل بادہ کشاں بیتو خموش است امشب
قلقل شیشۂ سے سرمہ فروش است امشب

بینش نے دریافت کیا کہ مصرعۂ ثانیہ سے قائل کا کیا مطلب ھے ؟

ولا : قلقل شیشۂ سے سرمہ فروش ھے ' یعنے خاموش ھے کہ شراب نہیں نکلتی۔

بینش : جب قلقل شیشے سے نکلتی ھے تو ریزش لازم ھے - پس خموشی کیونکر پیدا ھوگی - دیر تک بحث و تکرار دونوں میں رھی -

راقم بولے : میرے خیال میں اس شعر کے معنے یہ آتے ھیں کہ " بادہ کشوں کی محفل باوجود مے خواری کے بغیر محبوب کے خاموش ھے ' یعنے شور و غوغا نہیں ھے - پس اس صورت میں گویا قلقل شیشۂ سے سرمہ فروشی کر رھی ھے - یعنے بجاے شور و غوغا پیدا کرنے کے جو شراب خواری کا لازمہ ھے ' خموشی نمایاں ھے " - تمام احباب نے بہت پسند کیا - اور

ولا شکریہ و تسلیم بجا لائے —

واقف کجا بعشوہ خون ریز او رسد دم تیغ
که طاق ابروے یار است قبلۂ غم تیغ

ثاقب : دوسرے مصرعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابروے یارقاتل تیغ ہے
اور یہ درست نہیں ہے —

واقف : اس کا مطلب یہ ہے کہ طاق ابروے یار پرستش گاہ تیغ ہے - یعنے
تلوار اُس کو اپنا قبلہ جان کر پرستش کرتی ہے - والا نے واقف کے کلام
کی سند میں یہ شعر پڑھا "ابروے او قبلۂ حاجات شمشیر من است"
یہ جواب سب کو پسند آیا —

واصف . عاشق کہ شکریں دہنت را چو پستہ گفت
تشبیہ تازہ بزبان شکستہ گفت

فرحت . لفظ تازہ یہاں بیجا ہے . کیونکہ بہتوں نے باندھا ہے -

واصف : میری مراد عاشق سے یہاں وہ شخص ہے جس نے اس تشبیہ کو
ایجاد کیا ہے -

فرحت : یہ تاویل دور از کار ہے . کیونکہ جس نے جو نئی چیز ایجاد کی
ہے ، ضرور وہ تازہ ہوگی - پھر اسے تازہ کہنا کیا فائدہ دیتا ہے -
: اس شعر کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ " عاشق جو شکریں دہن
محبوب کو مثل پستہ کہتا ہے ، تشبیہ تازہ یعنے کہنہ اپنی شکستہ
زبان سے کہتا ہے - اور یہ صورت تشبیہ تضاد کے قانون سے درست
ہے ، کیونکہ تشبیہ تضاد کے لحاظ سے کہنہ کو تازہ ، مردہ کو زندہ
کہا جا سکتا ہے —

مولوی راقم : اس تشبیہ کے ثبوت کے لیے کوئی قرینہ چاہیے مگر یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے ' پہر کیوں کر درست ہوگی -

واصف نے تازہ کی جگہ ناقص رکھہ دیا اور اس عذاب سے جان بچائی - غرض کہ بہ کثرت وہ تمام اعتراضات اور جوابات ہیں کہ ان سب کو لکھنا بے جا طول سے خالی نہیں اور اُس کا زیادہ مذاق بھی نہیں رہا ہے -

یہ پتہ نہیں چلتا کہ ٹھیک کتنے سال اور کس سال تک یہ مشاعرہ قائم رہا - رہے نام اللہ کا —

ابسن اور اس کی تصانیف

(۳)

از

جناب عبدالشکور صاحب ام اے ' بی ٹی - بریلی

گذشتہ مضامین میں ہم نے ابسن کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا ' اس کے خیالات اورفلسفے سے واقفیت حاصل کی ' اور اس کے پہلے اور دوسرے دور کے ڈرامے پڑھے جو اقصائے عالم میں مشہور ہوچکے ہیں - ابسن کی ذہنیت کی نشو و نما کے مدارج دلچسپی سے خالی نہیں ' اس کے دل میں آئیڈیل کی جستجو کبھی تو برینڈ کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی اس کے بالکل بر عکس پیئر کے لباس میں نمودار ہوتی ہے یعنی کبھی ترک دنیا کی طرف مائل ہوتی ہے ' اور کبھی طلب دنیا کی طرف - کبھی اس رہبانیت کی طرف جس کی تعلیم عیسوی مذہب دیتا ہے - کبھی وثنی لذت پرستی کی طرف - مگر ان دونوں راہوں میں سے کوئی بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی - برینڈ اپنے نفس پر تکلیفیں اٹھانے کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہتا ہے اور اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا ہے کہ پیئر دنیا میں غیر معمولی طور سے کامیاب ہوکر زر و جواہر کا انبار لگا دیتا ہے ' مگر یہ کامیابی ایک سراب ہے ' ایک دھوکا ہے جو اُس کے روحانی اضطراب کو تسکین نہیں دے سکتا —

اس کے بعد ابسن جولین کا روپ بہرتا ہے اور کفر و عیسائیت سے علیحدہ ہوکر ایک تیسری سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے ' مگر یہاں بھی اُسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی - اس کی نگاہ کے سامنے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے - اب وہ حیات اجتماعی کو چھوڑ کر انفرادی اور گھریلو زندگی کی طرف توجہ کرتا ہے 'گرجے اور شاہی ایوانوں کی تعمیر اور تخریب کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے ' خوبصورت گھر بنانا شروع کرتا ہے - فلسفے اور مذھب کے گورکھ دھندے سے اُکتا کر وہ اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جب تک عام لوگوں کی روز مرہ کی زندگی پاکیزہ اور بلند نہ ہوگی حیات ملی کا کامیاب ہونا ' اور قوم کا سر بلند و سر فراز ہوکر اقوام عالم کے دوش بدوش کھڑا ہونا ناممکن ہے - اس لئے اب وہ افراد کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے - ان کی خانگی زندگی کو سدھارنا چاھتا ہے جس کو وہ استعارے میں مکانوں کی تعمیر نو سے تعبیر کرتا ہے - ان مکانات میں روشن دان نہ تھے ' ان کی چھتیں بہت نیچی تھیں ' ان کی محرابیں خمدار ہوگئی تھیں ' ان کے دروازے تنگ تھے اور ان میں جا بجا طاقوں پر بدنما بت کھے ہوئے تھے - ابسن ان مکانات کو صاف کرنا شروع کرتا ہے ' ان کے صحن میں جو کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا اس کو دور کرتا ہے ' دیواروں میں روشن دان بناتا ہے کہ ھوا اور روشنی آسکے ' چھتوں کو بلند کرتا ہے کہ لوگ آزادی کے ساتھ سانس لے سکیں ' اور آخر میں اُن بتوں کو توڑتا ہے جن کی ان مکانات میں روز پوجا ہوتی تھی اور جن کے وجود نے مکنوں کے قوائے ذہنی و دماغی کو ماؤف کر رکھا تھا - ابسن کا یہ کارنامہ سب سے زیادہ مفید ' شاندار اور دیر پا ہے ' برینڈ اور پیئر کے پڑھنے والے دنیا میں بہت کم ہیں لیکن نورا کے چاھنے والے ' ھامر سے ھمدردی رکھنے والے ' مسزالونگ کے

عشاق اور پترا کے چاہنے والے ہمیشہ باقی رہیں گے - بنی نوع انسان کے خیالات کے ذخیرے میں ابسن کے خیالات اور نتائج فکر کا حصہ نہایت اہم ہے - اُنیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر آج تک دنیا کے خیالات میں مسلسل تغیر ہوتا چلا آیا ہے ' لیکن اس صدی کا آخری حصہ دنیا کے اُن خیالات کے انقلاب کے لئے وقف تھا جن کا تعلق شادی ' متاہل زندگی ' عورت کے فرائض اور عورت کے حقوق سے ہے - یہ در اصل اُس سیاسی انقلاب کا دوسرا پہلو تھا جس کی ابتدا والٹیر اور روسو کے خیالات نے کی تھی —

جس طرح آئینے میں اُسی منظر کا عکس پڑتا ہے جو اس کے مقابل ہوتا ہے اسی طرح شاعر کے کلام میں بھی کم و بیش اس کے ماحول کی تصویر نظر آتی ہے - کالیداس ہو یا شکسپیر ' سبھی اپنے زمانے کے حالات کے مصور اور خیالات کے ترجمان ہیں - مگر ابسن کا رتبہ اس لحاظ سے سب سے اعلی ہے کہ وہ اُن خیالات کے خلاف بغاوت کرتا ہے جو اس کے عہد میں کار فرما تھے - ذوکر نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے ناروے کے سفر کے دوران میں ابسن نے اپنی قوم کی معاشرتی خرابیوں کا مشاہدہ کیا اور انھوں نے اس کے نازک احساس کو بے حد متاثر کیا اور اس کی تصانیف کا رخ بدل دیا - سویڈن کی ایک شریف خاتون کرسچیانا میں آئی اور اس نے کھلم کھلا ایک طالب علم پر یہ الزام لگایا کہ اس نے پہلے تو مجھے اپنی محبت کے دام تزویر میں گرفتار کیا اور پھر کنارہ کش ہوگیا - اس خاتون نے تحریر و تقریر کے ذریعے سے ناروے کے قوانین کو آگاہ کیا کہ ملک کے قوانین عورتوں کی تکالیف کی چارہ جوئی کے لئے کافی نہیں ہیں - ناروے کے ایک مصور نے اس مسئلے کو اُٹھایا ' اخبارات میں اس پر بڑے زور و شور سے مضمون لکھے گئے " سوسائٹی کے ستون " اس پر بر افروختہ ہوکر اس خاتون کی

مذمت کرنے لگے ۔ مزاحی رسائل اور جرائد نے اس کے کارٹون چھاپے ۔ اُسی زمانے میں ابسن کا پرانا دوست اور ناروے کا جید نقاد جارج براندیس برابر اُسے اس امر کی ترغیب دیتا تھا کہ اب سوشل ڈراما لکھنا شروع کرو ۔ اس کا خیال تھا کہ مستقبل کے لٹریچر میں عہد حاضرہ کی سچی تصویر موجود ہونی چاہئے جس میں اس زمانے کے اہم مسائل پر مکمل اور صحیح تنقید ہو ۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ابسن کے ادبی رقیب بیورنسن کا ایک معاشرتی ڈراما " دیوالہ " عین اُسی زمانے میں شائع ہوکر مقبول عام ہوا اور لوگوں میں یہ چرچا ہوا کہ بیورنسن ابسن سے بازی لے گیا ۔ چنانچہ ابسن نے قلم اُٹھایا اور " سوسائٹی کے ستون " اور " انجمن شباب " میں معاشرتی تنقید کو اُس بلندی پر پہنچایا جو اس کے رقیب کے وہم و گمان سے بھی بالا تر تھی ۔ اسی لڑی کے آخری موتی وہ تارے ہیں جن پر اس حصے میں بحث کی جائےگی اور جن کی آب و تاب ناظرین کے حسن مذاق سے کما حقہ خراج تحسین حاصل کر لے گی —

ڈوکر کہتا ہے کہ یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ ابسن نے عورتوں کی آزادی کی حمایت میں ڈرامے لکھے ۔ وہ ایک خود پسند آدمی تھا اور اس نے اس مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی جس کا حکم ہے کہ " عورتوں کو اپنی زبان بند رکھنا چاہئے " ۔ اس کے بعد وہ ایک رومان پرست شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوا جس کے نزدیک عورت کا محض یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ہیرو کی ہم جلیس ہو ' اُس کو کار زار حیات کے لیے مشتعل اور تازہ دم کرتی رہے ۔ مگر جب ہم اس کے خیالات کے ارتقا پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے —

سنہ ۱۸۷۶ ع میں ابسن لارا کیلر سے ملا جس سے اس کی بہت پرانی

دوستی تھی۔ اس خاتون نے ناول نویس کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی تھی۔ لارا سے اس کی پہلی ملاقات سنہ ۱۸۷۰ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ایک بلبل شیریں نوا معلوم ہوتی تھی، مگر اس دوران میں اس کی شادی ہو چکی تھی، اور اس نے اُس کی زندگی میں بڑی تبدیلی پیدا کردی تھی۔ اب وہ اپنے شوہر کے گھر میں ایک گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ حالت زیادہ عرصے تک باقی نہ رہی۔ اس کا شوہر بیمار پڑا اور اس بیماری نے طول پکڑا۔ لارا کو مجبور ہوکر روزی کمانی پڑی۔ لیکن اس نے اپنے شوہر کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا۔ جب صحت حاصل کرنے کے بعد شوہر کو اس کا پتہ چلا تو میاں بیوی میں سخت اختلاف پیدا ہوا۔ شوہر اس بات کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز طیار نہ تھا کہ اس کی بیوی ضرورت کے وقت بھی روزی کمائے۔ یہ افسانہ ابسن کے تخیل میں پیوست ہوگیا اور وہ عرصۂ دراز تک اس مسئلے پر غور و فکر کرتا رہا۔ آخر کار اس موضوع نے ایک ڈراما کی صورت اختیار کی جو سنہ ۱۸۷۹ء میں "گڑیا کا گھر" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے شائع ہوتے ہی ناروے، سویڈن، جرمنی اور انگلینڈ میں ہلچل مچ گئی۔ کلیسا کے محافظین اور اخلاق عامہ کے نگہبانوں نے ابسن پر لعنت ملامت کی بوچھار کردی، کیوں کہ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابسن کی تعلیم سوسائٹی کی بنیادیں زیر و زبر کردے گی۔ ذیل میں ہم اس ڈرامے کا مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں —

پہلے ایکٹ میں ہماری ملاقات نورا سے ہوتی ہے۔ وہ ابھی ابھی بازار سے کرسمس کا سامان خرید کر واپس آئی ہے۔ ایک شوخ چلبلی لڑکی کی طرح کچھ گاتی، کچھ گنگناتی، بسکٹ کھا رہی ہے۔ حمال کو اجرت دیتی ہے لیکن ریز گاری واپس نہیں لیتی۔ اس کا شوہر ہلمر اس کی آواز سن کر دوسرے کمرے میں سے آموجود ہوتا ہے۔ اور اس کی فضول خرچی کی جانب اشارہ کر کے نرم اور ملائم الفاظ میں

سرزنش شروع کرتا ہے۔ لیکن نورا اس کے فلسفے کے سمجھنے سے قاصر ہے۔
وہ کہتا ہے:

" فرض کرو، میں آج ایک ہزار کراؤن قرض لے لوں اور تم یہ
رقم کرسمس کے ہفتے میں خرچ کر ڈالو، اُدھر نو روز کے دن
چھت کا ایک کھپرا (Tile) گرجائے اور میرا سر چکنا چور ہوجائے ..."

نورا۔ " خاموش! ایسی فال منہ سے نہ نکالو "۔

ہلمر۔ " مگر بفرض محال ایسا سانحہ پیش آجائے، پھر کیا ہوگا؟ "

نورا۔ " اگر خدا نخواستہ ایسا سانحہ پیش آے تو مجھے اس کی ذرا بھی
پروا نہ ہوگی کہ میں مقروض ہوں یا نہیں "۔

ہلمر۔ " لیکن قرض خواہوں کا کیا حشر ہوگا؟ "

نورا۔ " ان کی کسے پروا ہے۔ وہ تو غیر لوگ ہوں گے "۔

ہلمر۔ " نورا۔ نورا! تم بھی کیا عورت ہو۔ مگر سنو نورا، تم میرے اصولوں
سے واقف ہو۔ خبردار! نہ کبھی قرض لینا، اور نہ کوئی شے اُدھار
منگوانا۔ جب گھریلو زندگی کا انحصار قرض پر ہوتا ہے تو وہ نہ خوبصورت
رہتی ہے اور نہ آزاد۔ ہم دونوں نے اب تک بہادری سے زمانے کا مقابلہ
کیا ہے اور ہم آخری وقت تک ہتیار نہ ڈالیں گے "۔

ہلمر اپنے بٹوے میں سے نوٹ نکالنا شروع کرتا ہے اور چالیس کراؤن
کے نوٹ دے کر کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کرسمس میں ہر قسم کا خرچ
کرنا ہوتا ہے۔ نورا نوٹوں کو شمار کر کے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوے کہتی ہے
کہ یہ رقم عرصے کے لیے کافی ہوگی۔ نورا خوشی خوشی اپنے شوہر کو وہ سامان
دکھاتی ہے جو وہ ابھی بازار سے خرید کر لائی ہے۔ ہلمر سب کھلونے دیکھتا
ہے اور پوچھتا ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ میں اب تمہارے لیے کیا تحفہ خریدوں؟

نورا کہتی ہے کہ میں کوئی تحفہ وغیرہ نہیں چاہتی ' ہاں اگر تم مجھے کچھہ دینا ہی چاہتے ہو تو سب سے بہتر یہ ہوگا کہ نقد روپیہ دے دو ' میں روپوں پر پنی چڑھا کر کرسمس ٹری میں لٹکاؤں گی - ہلمر اپنی بیوی کو پیار کر کے کہتا ہے ' میں اگر نقد روپیہ دے بھی دوں تو خدا جانے تم کہاں غائب کردو گی ' کون یقین کرے گا کہ ایسی چھوٹی سی بلبل کے رکھہ رکھاؤ میں اتنا روپیہ صرف ہوتا ہے - تمہارے ہاتھہ میں روپیہ آتے ہی غائب ہو جاتا ہے - اتنے میں ہلمر سے ملنے ڈاکٹر اور نورا سے ملنے اس کی ایک سہیلی آموجود ہوتی ہے - اس کا نام کرسٹنا لنڈن ہے - یہ نورا سے نو دس برس کے بعد مل رہی ہے - اس عرصے میں اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن تین سال ہوئے اس کا شوہر فوت ہو گیا —

بجائے اس کے کہ نورا اپنی سہیلی کی داستان درد سنے ' اور اس کی بیوگی پر ہمدردی کرے خود اپنا دکھڑا لے بیٹھتی ہے اور ہلمر کی علالت ' اٹلی کا سفر ' روپیہ کا فراہم کرنا ' باپ کی موت ' بچوں کی پیدائش ' شوہر کی ترقی ' غرض شادی سے لے کر اس وقت تک کے سارے اہم واقعات کرسٹنا کو سناتی ہے ' اور بیچ بیچ میں یہ بھی کہتی جاتی ہے میں بھی کیسی بد تمیز ہوں کہ اپنی ہی داستان سنائے چلی جارہی ہوں - دوراں گفتگو میں ہلمر کی علالت کا قصہ آجاتا ہے ' اور نورا وہ اسباب بیان کرنا شروع کرتی ہے جن کی وجہ سے ہلمر بستر علالت پر پڑا تھا - اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ اُسے جنوب میں لے جانا چاہئے - اس ضمن میں روپیہ کی فراہمی کا مسئلہ آجاتا ہے - نورا کہتی ہے کہ اُس سفر میں جتنا روپیہ صرف ہوا وہ میں نے ہی حاصل کیا تھا ' گو دنیا یہ سمجھتی ہے کہ وہ میرے والد کا عطیہ تھا - کرسٹنا متعجب ہوکر پوچھتی ہے کہ آخر کیسے حاصل کیا ؟ تم

قرض تو لے نہیں سکتی تھیں کیونکہ کوئی بیوی اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر قرض نہیں لے سکتی - نورا یہ جواب دیتی ہے :

" میں اپنے شوہر کو اس راز میں شریک نہیں کرسکتی تھی - میں نے اُسے یہ معلوم ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ اس قدر علیل ہے ' ڈاکٹر مجھے اکثر بتا جاتے تھے کہ اس کی جان خطرے میں ہے - میں نے پہلے تو تدبیر سے کام لیا اور شوہر سے کہا کہ میں جنوب کا سفر کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی .. .. "

اسی دوران میں نورا کے والد کا انتقال ہو گیا ' اور ہلمر کو اس کا علم نہ ہوسکا کہ یہ روپیہ اس کے والد کا عطیہ نہ تھا - نورا کا خیال ہے کہ یہ راز اُسے بتانا نہیں چاہئیے - ممکن ہے کہ اس کی خود داری کو صدمہ پہنچے ' مگر وہ اس کا وعدہ کرتی ہے کہ بہت عرصے بعد جب وہ بوڑھی اور بد شکل ہوجائےگی تب اس راز کا انکشاف کرے گی - وہ اپنا قصہ جاری رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ قرضے کی قسطیں بھرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ' میں ہی جانتی ہوں کہ میں یہ مشکل کس طرح حل کررہی ہوں ' لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ اُسے اس کا بھی علم نہیں کہ اس نے کتنی رقم ادا کردی ہے —

اس گفتگو سے اُکتا کر نورا دل خوش کن باتیں کرنے لگتی ہے - وہ کہتی ہے کہ اب میں خدا کے فضل سے تفکرات سے آزاد ہو گئی ہوں ' مجھے ہر طرح کا عیش و آرام حاصل ہے - میرا گھر نہایت خوبصورت اور حسین ہے - موسم بہار شروع ہونے والا ہے - اب شاید ہم تفریح کے لیے کسی ساحلی مقام کو جاسکیں - اسی اثنا میں کروگ اسٹاد آموجود ہوتا ہے - جس

کو دیکھ کر نورا کچھ پریشان سی ہوجاتی ہے - یہ شخص بینک کا ایک ادنی ملازم ہے اور اپنے نئے افسر سے ملنے آیا ہے - نورا اُسے اپنے شوہر کے دفتر میں بھیج دیتی ہے - دفتر کے کمرے میں سے ڈاکٹر رینک نورا کے کمرے میں آتا ہے - نورا اُس کا تعارف اپنی سہیلی سے کراتی ہے - اور تینوں میں دلچسپ گفتگو ہونے لگتی ہے - اس دوران میں هلمر بھی آجاتا ہے - اس کا تعارف کرسٹنا لنڈن سے کرایا جاتا ہے - هلمر امید افزا الفاظ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہے - اس کے بعد هلمر ' ڈاکٹر اور نورا کی سہیلی چلے جاتے ہیں اور بچے مکان میں داخل ہوتے ہیں - اس کو دیکھ کر نورا فرط مسرت سے اُنہیں پیار کرنے لگتی ہے اور ان کے ساتھ دھما چوکڑی مچانے میں مشغول ہو جاتی ہے - یکایک کروگ اسٹاد آموجود ہوتا ہے ' اس کو دیکھتے ہی نورا کہتی ہے کہ ابھی کیسے آے ابھی پہلی تاریخ کو تو بہت عرصہ ہے - وہ کچھ لجاجت اور کچھ دھمکی کے انداز میں گفتگو شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غالباً مسز لنڈن کے لیے جگہ نکالنے کی غرض سے میں برطرف کیا جا رہا ہوں - میں اس آسامی کے لیے جان لڑا دوں گا ' اب میرے لڑکے جوان ہو رہے ہیں - مجھے عزت آبرو سے رہنا چاہئے اور اس کی پہلی سیڑھی بینک کی یہ ملازمت ہے جس سے هلمر مجھے دھکا دے کر پھر اُسی قعر ذلت میں گرادینا چاہتا ہے - وہ نورا کو آگاہ کرتا ہے کہ تمہاری عزت میرے ہاتھ میں ہے - قصہ یہ ہے کہ نورا نے اس سے روپیہ قرض لیا تھا - ضمانت نورا کے باپ نے کی تھی ' مگر اس کے دستخط نورا نے اپنے ہاتھ سے کردیے تھے اور جلدی میں تاریخ ۲ اکتوبر ڈال دی تھی - حالانکہ اس کے باپ کا انتقال ۲۹ ستمبر کو ہوچکا تھا - اس طرح وہ بغیر جانے ہوے جعل سازی کی مرتکب ہوئی -   سمیا ، ہے ہے

گ اسٹاد نورا کو اس قانونی شکنجے کا خوف دلاتا ہے جس سے

وہ پھنس چکی ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر لڑکی اپنے باپ کی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کرے ' یا اگر اپنے شوہر کی صحت حاصل کرنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرے تو یہ جرم کیوں کر ہوسکتا ہے - اسے اپنے خیال پر اس قدر وثوق ہے کہ وہ کروگ اسٹاڈ کی قانون دانی کو ناقص تصور کرتی ہے اور کہتی ہے کہ قانون خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو اس میں اس طریقۂ عمل کی ایسی حالت میں اجازت ضرور ہوگی - کروگ اسٹاڈ یہ کہہ کر چل دیتا ہے کہ اگر میں قعرمذلت میں گرا تو تمھیں بھی اپنے ساتھ کھینچ لوں گا -

اتنے ہی میں ہلمر داخل ہوتا ہے ' اور نورا سے دریافت کرتا ہے کہ کیا کروگ اسٹاڈ یہاں آیا تھا - میرے خیال میں وہ تم سے یہ درخواست کرتا تھا کہ اس کی سفارش کرو - دیکھو خبردار ایسا ہرگز نہ کرنا - اور اس کے بعد میاں بیوی میں پیار اور محبت کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں ' ایکٹ کے آخری حصے میں ہلمر کروگ اسٹاڈ کی ناپاک زندگی کے حالات مختصر طور پر نورا کو سناتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی کبھی سفارش نہ کرنا - میں ایسے شخص کے ساتھ ہرگز کام نہیں کر سکتا - ہلمر اپنے دفتر کے کمرے میں چلا جاتا ہے - نورا کا دماغ کسی خاص مسئلے پر غور کر رہا ہے اور اس کے یہ الفاظ :

" بچوں کو خراب کروں ' اپنے گھر کی فضا زہریلی بناؤں ....

یہ ٹھیک نہیں ... یہ کبھی جائز نہیں ہوسکتا - "

غالباً اُس عظیم‌الشان ٹریجڈی کا پیش خیمہ ہیں جس کی تکمیل میں نورا اپنے دل و دماغ کی پوری قوت صرف کردیتی ہے —

دوسرے ایکٹ میں ٹریجڈی کے خد و خال اُبھرتے نظر آتے ہیں - نورا عجب کشاکش میں مبتلا ہے - کبھی تو وہ یہ سمجھتی ہے کہ کروگ اسٹاڈ خالی

خولی دھمکی دیتا تھا - کبھی خیال ہوتا ہے کہ شاید سچ کہتا ہو - نورا کچھہ سوچ کر اپنے بچوں کے پاس جاتی ہے اور دایہ سے پوچھتی ہے " کیا بچے مجھے ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں- دایہ اس کی تصدیق کرتی ہے تو نورا کہتی ہے کہ آئندہ میں بچوں کو زیادہ وقت نہ دے سکوں گی —

یہ کہہ کر وہ بات ٹال دیتی ہے اور ناچ کے جلسے میں جانے کی تیاری کرنے لگتی ہے - اتنے میں مسز لنڈن آموجود ہوتی ہے - گذشتہ شام کے واقعات اور افراد کے متعلق بات چیت شروع ہو جاتی ہے - کرسٹنا کہتی ہے تم مجھہ سے کوئی بات چھپا رہی ہو - کل شاید کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے - اسی دوران میں ہلمر آموجود ہوتا ہے - کرسٹنا بچوں کے کمرے میں چلی جاتی ہے - میاں بیوی میں راز و نیاز کی باتیں شروع ہوتی ہیں - نورا ہلمر کا دل موهنے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرتی ہے - ہلمر سمجھہ جاتا ہے کہ یہ سارے انداز کروگ اسٹاد کی بحالی کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں - اب نورا دوسری تدبیر سے کام لیتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ شخص بعض نہایت غیر ذمہ دار اخبارات میں مضامین لکھتا رہتا ہے - اس لیے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ ہلمر کے خلاف حملے نہ شروع کردے - بہت سنجیدگی کے ساتھہ معاملے کی اصلی صورت نورا کے سامنے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بینک میں یہ مشہور ہو چکا ہے کہ میں اس شخص کو نکالنے والا ہوں ' اب اگر رائے بدلوں گا تو میرا رعب اُٹھہ جائے گا اور لوگ خیال کریں گے کہ میں بیوی کے ہاتھہ میں ایک کھلونا ہوں - علاوہ ازیں یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ میں کروگ اسٹاد کے ساتھہ کام کرسکوں- میں اور وہ کالج میں ساتھہ ساتھہ پڑھتے تھے ' چنانچہ اب تک وہ سب کے سامنے مجھے میرے پہلے نام سے مخاطب کرتا ہے اور بے تکلفی سے پیش آتا ہے - اس لیے اس کے ساتھہ ہیلمک

میں میرا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ ماما کو ایک خط دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اسے فوراً روانہ کردو۔ ماما خط لے کر چلی جاتی ہے۔ نورا پوچھتی ہے کہ اس خط میں کیا ہے۔ هلمر جواب دیتا ہے کہ اس میں کروگ استاد کی موقوفی کا حکم ہے۔ نورا بے چین ہو جاتی ہے۔ اور اپنا اور اپنے بچوں کا واسطہ دے کر هلمر سے کہتی ہے کہ خط واپس لے لو، هلمر بات کو ٹال کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نورا کو ترددات کا هجوم سراسیمہ کردیتا ہے۔ وہ چلا اٹھتی ہے:

" کاش بچنے کی کوئی تدبیر ہوتی! ہائے میں اب کیا کروں "۔

اتنے میں ڈاکٹر رینک آجاتا ہے اور نورا سے گفتگو شروع کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے بُشرے اور بات چیت سے سخت مایوسی ٹپکتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی صحت کا جائزہ لیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ مجھ میں اب کچھ باقی نہیں۔ ایک مہینے کے اندر ہی میں قبرستان میں سڑ رہا ہوں گا۔ نورا شکایت کرتی ہے کہ تم آج ایسی اول جلول باتیں کیوں کر رہے ہو۔ مگر ڈاکٹر کہتا کہ موت مجھے گھور رہی ہے، میں دوسرے کے گناہوں کا خمیازہ اٹھانے والا ہوں۔ پھر بھلا میں بشاش کیسے ہوسکتا ہوں * ۔

ڈاکٹر مایوسانہ انداز میں کہتا ہے کہ تم اور هلمر دونوں میری موت کے بعد مجھے جلد بھول جاؤ گے۔ رینک کے جذبات کی فراوانی ضبط و احتیاط کی بندشوں کو توڑ دیتی ہے اور وہ کہہ گذرتا ہے " میں دل و جان سے تم پر عاشق ہوں "۔ نورا اس سے قبل رینک کو اس بات پر راضی کر چکی تھی کہ

---

* غالباً ڈارون اور اسپنسر کے مقالات سے متاثر ہوکر ابسن مسئلۂ توارث سے خاص دلچسپی لینے لگا۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

وہ ایک خاص معاملے میں جس کو اُس نے پوشیدہ رکھا تھا اس کی پوری پوری مدد کرے گا ۔ لیکن اس گفتگو کے دوران میں وہ اپنا خیال بدل دیتی ہے اور جب رینک حقیقت معلوم کرنے پر مُصر ہوتا ہے تو وہ چپ ہو جاتی ہے ۔ اتنے میں ماما داخل ہوتی ہے اور کروگ استاد کا کارڈ نورا کو دیتی ہے ۔ رینک هلمر کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور خفیہ طور سے کروگ استاد نورا کے کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔ نورا سخت بد حواسی کے عالم میں اس سے باتیں کرتی ہے ۔ نہایت عاجزی کے ساتھہ کہتی ہے کہ میرے بچوں کا خیال کرو ۔ میری مالی حالت اس وقت اس قابل نہیں کہ میں بقیہ رقم ایک دم سے ادا کردوں ۔ کروگ استاد کہتا ہے کہ میری جیب میں ایک خط ہے جس میں میں نے تمہارے شوهر کو کل واقعات لکھہ دیے ہیں ۔ نورا گھبرا کر کہتی ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح تمہاری رقم کا بندوبست کر دوں گی ' تم یہ خط فوراً چاک کردو ۔ کروگ استاد کہتا ہے کہ میں روپیہ نہیں چاهتا بلکہ بینک کی اسامی چاهتا ہوں ۔ یہ کہہ کر وہ چلا جاتا ہے ۔ خط کے لیٹر بکس میں گرنے کی آواز نورا کے کان میں آتی ہے ' اور اس کے منہہ سے ایک چیخ نکل جاتی ہے ۔ مسز لنڈن نورا کے کمرے میں آجاتی ہے ' اور اسے اس درجہ پریشان دیکھہ کر متعجب ہوتی ہے ۔ نورا اپنا درد دل بیان کرتی ہے ' جس کو سن کر مسز لنڈن یہ رائے دیتی ہے کہ اس معاملے کو هلمر پر ظاہر کردینا ہی اچھا ہے ۔ مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوتی ۔ آخر کرسٹنا کہتی ہے کہ میں خود کروگ استاد کے پاس جاتی ہوں ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ وہ میری بات نہ ٹالتا تھا ۔ تم هلمر کو باتوں میں لگائے رکھو کہ وہ لیٹر بکس تک نہ جاسکے ' میں جا کر کروگ استاد کو اس پر آمادہ کرتی ہوں کہ وہ یہ خط هلمر سے واپس لے لے ۔ چنانچہ وہ روانہ ہوجاتی ہے اور ادھر هلمر اور رینک نورا کے

کمرے میں داخل ہوتے ہیں - ہلمر کو یہ خیال تھا کہ نورا ناچ کا لباس پہنے ہوے ہوگی ' چنانچہ جب وہ اپنی بیوی کو معمولی سادے لباس میں دیکھتا ہے تو متعجب ہوتا ہے - نورا اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ اپنے شوہر کو لیٹر بکس تک نہ جانے دے - چنانچہ اس کے لیے وہ عجیب عجیب بہانے کرتی ہے - وہ ہلمر کو اپنے ساتھہ ناچنے پر آمادہ کرتی ہے اور رینک پیانو بجانے لگتا ہے - اسی اثنا میں مسز لِنڈن واپس آجاتی ہے - ہلمر نورا سے کہتا ہے کہ تم تو ناچنا بالکل بھول گئیں - نورا کہتی ہے کہ ہاں میں دو دن کا وقفہ ہے ' اس دوران میں اور کوئی کام نہ کرو ' خط تک نہ پڑھو ' اور مجھے خوب مشق کراتے رہو - ہلمر سمجھتا ہے کہ نورا کے دل میں اب تک وہ خطرہ موجود ہے جس کا حوالہ وہ پہلے دے چکی تھی - ماما آتی ہے اور اطلاع دیتی ہے کہ کھانا تیار ہے ' نورا ہلمر سے کہتی ہے کہ تم رینک کو لے کر کھانے کے کمرے میں جاؤ ' میں کرسٹنا سے بال بنوا کر آتی ہوں - کرسٹنا اُسے اطلاع دیتی ہے کہ کروگ استاد شہر سے باہر گیا ہوا ہے ' مگر میں ایک پرچہ چھوڑ آئی ہوں کہ جب وہ واپس آے مجھہ سے فوراً ملے - نورا اس کا جواب بے پروائی سے دیتی ہے ' جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنا ارادہ پختہ کر چکی - وہ کہتی ہے کہ اب کچھہ نہ کرو ایک معجزہ ہونے والا ہے اس کا انتظار کرو - کرسٹنا چلی جاتی ہے - نورا تنہائی میں کہتی ہے :

" پانچ ' آدھی رات تک سات گھنٹے - کل آدھی رات
تک اور چوبیس گھنٹے ' اس وقت تک رقص ختم ہو
جاے گا ' چوبیس اور سات ' اکتیس - ابھی زندگی کے اکتیس
گھنٹے اور باقی ہیں - - - "

تیسرا ایکٹ ڈراما کی جان ہے - اس میں ابسن نے اپنی پوری قابلیت

صرف کردی ہے - یہ تو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر رینک نورا پر بری طرح ریجھے ہوئے ہیں ' اور ان کی ہلمر سے روزانہ کی ملاقاتیں محض نورا ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں - دوسری بات یہ ہے کہ مسز لِنڈن شادی سے قبل کروگ استاد کی محبوبہ تھی ' اور اُس سے اس لیے شادی نہ کرسکی تھی کہ وہ اُس زمانے میں بہت غریب تھا اور شادی کی مقدرت نہیں رکھتا تھا - اس کا پرچہ پاتے ہی کروگ استاد اُس سے ملنے آموجود ہوا - نورا اور ہلمر وغیرہ تو بالاخانے پر رقص کر رہے تھے ' نیچے مسز لنڈن اپنے پرانے عاشق سے باتیں کرنے لگی - اُس نے کروگ استاد کو خلوص کے ساتھ اس بات کا یقین دلایا کہ اُس نے پہلی شادی محض مجبوری سے کی تھی جس میں جذبۂ محبت کا شائبہ تک نہ تھا - دونوں میں مصالحت ہوجاتی ہے اور ان کی شادی طے پا جاتی ہے - کروگ استاد اس پر تیار ہوجاتا ہے کہ ہلمر سے اپنا خط واپس لے کر نورا کو اس عذاب سے نجات دلائے - لیکن کرسٹنا کہتی ہے کہ اس راز کا ظاہر ہو جانا ہی بہتر ہے ' تاکہ شوہر اور بیوی میں پوری طرح مفاہمت ہو جائے اور یہ کھٹکا نورا کے دل سے بالکل دور ہو جائے - کروگ استاد چلا جاتا ہے ' کیونکہ اب رقص ختم ہونے والا ہے اور ہلمر اور نورا نیچے آرہے ہیں ' جب کرسٹنا نورا کو یہ خبر دیتی ہے کہ وہ خط واپس نہیں لیا جائے گا تو وہ یہ جواب دیتی ہے : تمھارا شکریہ ' کرسٹنا ! میں سمجھ گئی ہوں کہ کیا کرنا چاہئے —

کرسٹنا چلی جاتی ہے ' مکان میں اب صرف نورا اور ہلمر ہیں ' ہلمر اس وقت نورا کی محبت میں سرشار ہے اور اختلاط کی باتیں شروع کرتا ہے - مگر نورا دوسرے عالم میں ہے - اسے یہ باتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں —

اتنے میں ڈاکٹر رینک آموجود ہوتا ہے - تیلوں میں ادھر اُدھر کی

باتیں ہوتی ہیں ۔ آخر کار ہلمر لیٹر بکس تک پہنچ کر معلوم کرتا ہے کہ اُس کے قفل کو کھولنے کی نا کام کوشش کی گئی ہے ' یہاں تک کہ اُس میں نورا کی ہیر پن پیوست ہو کر رہ گئی ہے ۔ ہلمر آخر کار قفل کھول لیتا ہے اور خطوط لے کر واپس ہوتا ہے ۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے دفتر کے کمرے میں جاکر خطوط کا مطالعہ شروع کرے وہ پھر نورا کے پاس آموجود ہوتا ہے اور از سر نو پیار اور محبت کی باتیں شروع کر دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ ایک عاشق جانباز کی طرح اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں

" نورا میرے دل میں اکثر یہ ولولہ اٹھتا ہے کہ کوئی خطرے کا وقت آے اور میں اپنا جسم و جان اور سب کچھ تمھاری خاطر جوکھم میں ڈال دوں " —

اب اس کے بعد جو کچھ واقع ہوا وہ آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے ۔ ہلمر اس راز سے واقف ہوجاتا ہے ۔ اس خط کو پڑھتے ہی ہلمر غیض و غضب کی تصویر بنا ہوا کمرے سے نکلتا ہے ' اور اس موقعے پر اس کے اور نورا کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ ادب کا شاہکار ہے ۔ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے تمام و کمال پڑھنے کی ضرورت ہے ۔ ہلمر نہایت سخت الفاظ میں نورا سے کہتا ہے کہ تم نے میری زندگی تباہ کردی ۔ میری امیدوں پر پانی پھیر دیا ۔ نورا کو بہت کچھ برا بھلا کہنے کے بعد وہ کہتا ہے اب اس راز کو کسی نہ کسی طرح مخفی رکھنا چاہئے ۔ وہ نورا کو اپنے گھر سے تو نہیں نکالتا لیکن یہ جتا دیتا ہے کہ بچے اب اس کی نگرانی میں نہ رکھے جائیں گے ۔ اتنے میں گھنٹی بجتی ہے ' اور ملما نورا کے نام ایک خط لے کر آموجود ہوتی ہے ۔ نورا کی اجازت سے

ھامر وہ خط پڑھتا ھے - اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی - کروگ استاد نے پرامیسری نوٹ اور معافی نامہ بھیجدیا تھا - ھامر کے خطرات یک لخت کافور ھوجاتے ھیں - وہ خوشی سے ناچنے لگتا ھے - لیکن نورا کے چہرے پر ملال کے آثار دیکھہ کر خیال کرتا ھے کہ شاید اسے یہ یقین نہیں آتا کہ اس نے اس کا قصور معاف کردیا - اس کے بعد وہ اپنا مربیانہ راگ الاپنے لگتا ھے - اور کہتا ھے کہ میری آغوش وسیع ھے ' میں تجھے بخوشی نباہ دوں گا - نورا اندر جاکر کپڑے بدلتی ھے اور بہت جلد باھر آجاتی ھے - وہ اس وقت باھر جانے کے کپڑے پہنے ھوے ھے - یہ دیکھہ کر ھامر حیران ھوجاتا ھے -

نورا نہایت استقلال سے صاف صاف گفتگو کرتی ھے - وہ کہتی ھے جب تک میں اپنے باپ کے گھر میں رھی میری حیثیت ایک کھلونے کی تھی ' اس کے بعد جب میری شادی ھوئی تو میں تمہارے گھر میں ایک گڑیا بن کر آئی اور گذشتہ آٹھہ سال گڑیا ھی بنی رھی ' میرے باپ نے اور تم نے مجھے کبھی اچھی طرح نہ سمجھا ' اور دونوں نے میری زندگی خراب کی - ھامر ان باتوں سے متاثر ھوتا ھے اور کہتا ھے کہ اب کھیل اور تفریح کا زمانہ ختم کرکے ھم سنجیدگی اور تعلیم کا دور شروع کریں گے - لیکن نورا اس گھر میں رھنے سے قطعاً انکار کرتی ھے اور کہتی ھے کہ تم مجھے تعلیم نہیں دے سکتے ' نہ بقول تمہارے میں اس قابل ھوں کہ تم سے قریب رہ کر میں بچوں کو تعلیم دے سکوں ' لیکن اس وقت سب سے ضروری مسئلہ یہ ھے کہ میں خود اپنے آپ کو تعلیم دوں ' تم اس معاملے میں میری مدد نہیں کرسکتے اس لیے میں تمہارے گھر سے رخصت ھوتی ھوں - میں جب تک تنہا نہ رھوں گی نہ اپنی ذات کو پہچان سکوں گی اور نہ اپنے ماحول کو - ھلمر کہتا ھے کہ تمہارے اس عزم کے تو یہ معنے ھوے کہ تم مجھہ سے

محبت نہیں کرتیں ' نورا جواب دیتی کہ اسی لیے تو میں اس گھر میں اب ایک منٹ نہیں رہ سکتی - نورا اس کی دلیل پیش کرتی ہے ' اور کہتی ہے :

" میں برابر آٹھ سال تک صبر کے ساتھ منتظر رہی ' بیشک میں یہ جانتی تھی کہ معجزے روز ظاہر نہیں ہوتے ' جب یہ اہم سانحہ مجھے پیش آیا تو میں نے اپنے دل میں کہا " لو ' اب معجزے کا وقت آگیا " - جب کروگ استاد کا خط لیٹر بکس میں موجود تھا اس وقت مجھے یہ وہم بھی نہیں گذرا تھا کہ تم اس کی شرائط منظور کرلو گے ' بلکہ مجھے یہ یقین تھا کہ تم اس سے کہہ دو گے کہ جا تیرا جی چاہے تو اس معاملے کا دنیا بھر میں ڈھنڈھورا پیٹ دے " —

ہلمر : خوب ' کیا میں اپنی بیوی کی رسوائی کراتا ؟

نورا : نہیں ' مجھے یہ یقین تھا کہ تم خود اس گناہ کو اپنے سر لے لوگے اور اعلان کردوگے کہ میں خود مجرم ہوں —

ہلمر . نورا !

نورا : تمہارا مدعا یہ ہے کہ میں اس قربانی کو کبھی قبول نہ کرتی - بیشک میں ہرگز نہ کرتی - لیکن میرے بیانات تمہارے بیان کے مقابلے میں کیا حقیقت رکھتے ' مجھے اس معجزے کی اُمید بھی تھی اور خوف بھی تھا ' اور اسی کے روکنے کے لیے میں مرنے کے واسطے تیار تھی —

ہلمر : میں شب و روز خوشی کے ساتھ تیرے لیے محنت کروں گا ' ہر طرح کا رنج و محن تیرے لیے بخوشی برداشت کروں گا لیکن کوئی مرد اپنی محبوبہ کے لیے بھی اپنی عزت قربان نہیں کرتا —

نورا : مگر لاکھوں عورتیں ایسا کر گذری ہیں -

ہلمر : تم ایک نادان بچے کی سی باتیں کر رہی ہو -

نورا : بہت ممکن ہے ' لیکن نہ تمہارے خیالات اور نہ تمہاری گفتگو اس شخص کی سی ہے جس کے ساتھہ میں زندگی بسر کر سکوں ' جب تمہارا خوف جو میری وجہ سے نہیں ' اپنی وجہ سے تھا کافور ہوگیا ' جب خطرے کی کوئی بات باقی نہ رہی ' تو تم پھر ایسے بن گئے گویا کچھہ ہوا ہی نہ تھا ..... (کھڑی ہو جاتی ہے) اس وقت مجھے یکایک یہ پتہ چلا کہ میں آٹھہ سال تک ایک اجنبی کے ساتھہ رہی - تین بچے پیدا ہوے - میں اس خیال کو بھی برداشت نہیں کر سکتی ' جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں ......

کچھہ دیر اور گفتگو جاری رہتی ہے ' آخر وہ عورت جو پہلے ایکٹ میں گڑیا معلوم ہوتی تھی آہنی عزم کے ساتھہ ہلمر کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو جاتی ہے —

ڈراما کا لب لباب آپ کی خدمت میں موجود ہے - اب ہم اس کے اہم اشخاص کے کردار کا خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس کے بغیر ہماری تنقید مکمل نہیں کہلا سکتی - سب سے پہلے تو نورا کو لیجیے - شروع کے دو تین صفحے پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کس قسم کی عورت ہے - گو وہ تین بچوں کی ماں ہے مگر اب تک ایک الھڑ لڑکی معلوم ہوتی ہے - قدم قدم پر گنگناتی ہے ' بات بات پر ناچنے لگتی ہے ' باتیں کرتے کرتے جیب سے بسکٹ نکال کر کھانے لگتی ہے - اس کے انداز میں وہ جادو ہے کہ دیکھنے والا دیوانہ ہو جاے - اس کی طبیعت میں غضب کا ابالی پن ہے - جھوٹ اس صفائی سے بولتی ہے کہ کچھہ نہ پوچھیے - روپیہ کو کوڑی سے

زیادہ بے حقیقت سمجھتی ہے ' ہمال سے ریز کاری واپس لینا عمداً " بھول " جاتی ہے ۔ کروگ استاد کا قرض ادا کر رہی ہے لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ کتنی رقم ادا کردی - انتہا یہ کہ اپنے باپ کے جعلی دستخط کرتی ہے "اور اسے یہ خیال تک نہیں ہوتاکہ میں ایک سنگین جرم کی مرتکب ہوی - مگر حقیقت میں وہ بڑی خود دار باوفااور شریف النفس ہے- وہ خوب جانتی ہے کہ ریلنک اس کی تیر نگاہ سے گھائل ہوچکا ہے ' اور اس کی فرمائش کے پورا کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے گا - وہ یہ بھی جانتی ہے کہ رینک دولت مند ہے ' اور بارہ سو ڈالر بات کی بات میں جیب سے نکال کر اسے دے دے گا - لیکن وہ اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ رینک کی ممنون احسان ہو - اس کی محبت اور وفاداری کی مثال وہ خدمت ہے جو اس نے اپنے شوہر کی علالت کے زمانے میں کی جس کی وجہ سے وہ ہلاکت سے محفوظ رہا - روپیہ جو وہ قرض لے چکی ہے اسے ادا کرنے کے لیے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھاتی ہے ' اجرت پر کاغذات کی نقلیں کرتی ہے ' کمرہ بند کرکے گھنٹوں لکھا کرتی ہے - تھک تھک جاتی ہے لیکن اسے گوارا نہیں ہے کہ یہ راز هلمر کو معلوم ہو - اس کے علاوہ گھر کے خرچ میں سے روپیہ بچاتی ہے ' خود بہت معمولی لباس پہنتی ہے ' اور جو کچھ پس انداز کرتی ہے وہ سود اور اصل کی ادائگی میں بڑی خوشی سے صرف کرتی ہے —

بحیثیت ماں کے وہ محبت کی دیوی ہے - لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسی راہ پر چلا رہی ہے جس پر اس کے باپ نے اسے چلایا تھا - تینوں بچے اس کے ہاتھ میں کھلونے ہیں جن سے وہ اپنا دل بہلانے کے لیے کھیلا کرتی ہے - اس کے کردار پر نظر ڈالیے - آپ کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ اس کے باپ نے اس کی کیسی ناممکمل تربیت کی تھی - وہ بلا کی ذہین تھی' اس کی قوت

متخیلہ نہایت قوی تھی ' اس کے علاوہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک ذی فہم انسان میں ہونی چاہئیں ' لیکن وہ اپنے باپ کے ہاں اور اپنے شوہر کے ہاں محض بے حقیقت شمار کی جاتی تھی - اس اعتبار سے کہ اُسے سنجیدہ زندگی کے فرائض کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا - جب نورا کی روح بیدار ہوتی ہے تو وہ اس نقطۂ نظر کے خلاف سخت احتجاج شروع کر دیتی ہے - آئینۂ روح کی صیقل کے لیے رنج و ملال ضروری ہے اور شخصیت کی پختگی اور تکمیل حوادث زمانہ کے برداشت کیے بغیر نا ممکن ہے - چنانچہ یہی الہڑ لڑکی یعنی پیاری گڑیا جب مصیبت کی آنچ سہتی ہے تو اس کے جوہر کھلتے ہیں - دیکھتے ہی دیکھتے وہ عزم و ثبات کا مجسمہ بن جاتی ہے اور دم بھر میں ساری زنجیروں کو جنہوں نے اس کی روح کو جکڑ رکھا تھا توڑ کر پھینک دیتی ہے ' اس کا شوہر ہکا بکا رہ جاتا ہے اور وہ رات کی تاریکی میں غائب ہوجاتی ہے —

ہلمر کے کردار کی خصوصیات معمولی ہیں - وہ غیور ' متدین ' جفاکش ' خود دار ہے ' لیکن نورا کا شوہر ہونے کے قابل نہیں - وہ اپنے کار و بار میں ہوشیار اور تجربہ کار ہے ' دفتری معاملات کو خوب سمجھتا ہے - لیکن انسانی طبیعت کی باریکیاں ' خصوصاً فطرت نسوانی کی پیچیدگیاں اُس کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں ' تخیل سے وہ قریب قریب محروم ہے - چنانچہ اُن مصیبتوں کا وہ اندازہ نہیں کر سکتا جو نورا کو قرض لینے ' اور اس کے ادا کرنے میں اُٹھانی پڑی تھیں - اس کی محبت اور وفا داری بھی رسمی اور محدود ہے - نورا اس خیال میں تھی کہ ہلمر سا عاشق جانباز دنیا میں ملنا محال ہے ' لیکن وہ جس وقت اپنی عزت پر آنچ آتے دیکھتا ہے توتے کی طرح آنکھیں بدل لیتا ہے - وہ شدت سے تنگ نظر اور رسم پرست واقع ہوا ہے - وہ

خوب جانتا ہے کہ کروگ استاد اپنے کام میں ہوشیار ہے ' اور اپنی پچھلی حرکتوں سے توبہ کر کے صاف اور ستھری زندگی بسر کرنا چاہتا ہے - لیکن اس کے باوجود صرف اس بنا پر کہ دونوں نے ایک ہی مدرسے میں تعلیم پائی ہے اور کروگ استاد کسی قدر بے تکلفی کا برتاؤ کرتا ہے وہ منیجری کا جائزہ لیتے ہی اُسے موقوف کردیتا ہے - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی اکثر باتیں جو ہمیں قابل اعتراض معلوم ہوتی ہیں اس کے معاشرتی اور اخلاقی ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہیں - اپنی ذات سے وہ برا آدمی نہیں البتہ اس میں اتنی وسعت نظر نہیں کہ مروجہ معیار اخلاق کے تنگ دائرے کے باہر نظر ڈال سکے۔

ڈاکٹر رینک کے " بغیر گڑیا کا گھر " ایک نہایت بے کیف ڈراما ہوتا - ڈراما کا وہ سین جہاں وہ رقص کے بعد اچانک ہلمر اور نورا کے اختلاط کو برہم کردیتا ہے ابسن کے کمال فن کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے - ویگیلنڈ کا خیال ہے کہ کسی اور ڈراما میں ایسا معرکے کا سین موجود نہیں - وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ محض اس سین کی بنا پر ابسن کو بقائے دوام حاصل ہوسکتی تھی - اس سین کو غور سے پڑھ کر ہمیں نہ صرف رینک بلکہ ہلمر اور نورا کے کردار کا بھی پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے - رینک ایک اندرونی موروثی بیماری کی بدولت قریب مرگ ہے اور یہ اُسے بخوبی معلوم ہے کہ شاید اُسی وجہ سے وہ ہلمر اور اپنی محبوبہ سے رخصت ہونے آیا ہے - ایک طرف ناکام محبت کا زخم رس رہا ہے دوسری جانب موت کی بھیانک تصویر پیش نظر ہے۔ مایوسی اُسے تھوڑی دیر کے لیے اس بلندی پر پہنچا دیتی ہے جہاں خود غرضی کا نام و نشان تک نہیں - اس سین کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں تینوں کی شخصیت جدا جدا نظر آتی ہے - اس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہلمر ایک دنیادار ' ہوس پرست ' اور تنگ نظر شخص ہے - اس

کے برخلاف رینک انتہائی مایوسی اور موت کے لیے تیار ہوکر دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے اور انسانیت کا خالص نور اس کی بہترین صفات کو چمکا دیتا ہے ۔ نورا کے چہرے پر آزادی کی صبح صادق کی جھلک آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی ہے ۔ اس سورج کی شعاعیں دھیمی دھیمی نظر آرہی ہیں جو تھوڑی دیر میں اس کی خانگی زندگی کی کھیتی کو جھلسا کر رکھ دے گا

ابسن نے جو مسائل اس ڈرامے میں پیش کیے ہیں ان کا حل کرنا کچھ آسان نہیں ہے ۔ مثلاً ان حالات میں رہ کر آخر نورا کیا کرتی ؟ کیا وہ تمام عمر گڑیا بنی رہتی ؟ کیا وہ ہمیشہ ہلمر کے مربیانہ اور بزرگانہ برتاؤ کو برداشت کرتی رہتی ؟ کیا وہ اپنی روح کو جو بیدار ہو رہی تھی پھر سلا دیتی ؟ کیا وہ بچوں کی محبت میں اپنی ذات کو بالکل فراموش کر دیتی ؟ کیا وہ ایک اجنبی (کیوں کہ اس بیداری کے بعد وہ ہلمر کو اجنبی سمجھتی ہے) کے مکان میں رہتی اور اس کے آغوش میں آسودۂ راحت ہوتی ؟ فرض کیجئے اُس نے اچھا کیا کہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تو پھر اب یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں :

(۱) ہلمر کی خانہ بربادی کا ذمہ دار کون ہے ؟

(۲) بچوں کا بغیر ماں کے کیا حال ہوگا ! کیا ان کو چھوڑ کر چلا جانا فرائض مادرانہ کی خلاف ورزی نہیں ہے ؟

(۳) اُس معاہدے کو توڑنا کہاں تک جائز ہے جو آٹھ سال ہوے گرجے میں کیا گیا تھا ؟

(۴) کیا اس آزادی سے جو نورا چاہتی ہے نظام معاشرت تہ و بالا نہ ہو جاے گا ؟

ہم یہ جانتے ہیں کہ اپنی شخصیت کو ہر نوع سے مکمل کرنا انسان

کا اہم ترین اور اولین فرض ہے - بلکہ یوں سمجھنا چاہئیے کہ انسان کی تخلیق کی علت غائی یہی ہے - مگر سوال یہ ہے کہ اس کی جو قیمت نورا ادا کر رہی ہے وہ مناسب ہے یا نہیں ؟ ابسن جیسا تصور پرست تو یہی کہتا ہے کہ یہ دولت ہر قیمت میں سستی ہے - ظاہر ہے کہ شخصی آزادی کا یہ تصور ایک آئیڈیل ہے جہاں تک انسان کا پہنچنا محال ہے - ابسن اصلاح کے جوش میں حد سے گذر گیا ہے لیکن اگر اپنے خیالات اس شدت سے پیش نہ کرتا تو بے حس قدامت پسند لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہوتا - اس تحریک سے اتنا تو ہوا کہ عورتوں کو حقوق ملنے لگے ' وہ ووٹ دے سکتی ہیں ' بڑے بڑے عہدوں پر کام کر سکتی ہیں ' اپنے خیالات میں اپنی رائے میں آزاد ہیں ' قومی اور ملی تحریکوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کررہی ہیں اور قوم میں وہ تہذیب باطن ' شرافت نفس اور بلند خیالی پیدا کررہی ہیں جو ہر قوم کی کامیابی اور ترقی کے لیے ناگزیر ہیں - ابسن عورت کو جسمانی اور روحانی غلامی میں مبتلا دیکھہ کر کڑھتا ہے اور اس کی شخصیت کو آزاد کرانا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے - اس کے علاوہ ' وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہے کہ سوسائٹی کے سارے پیمانے مردوں کے بنائے ہوے ہیں جن سے عورتیں ناپی جاتی ہیں حالانکہ ان کے لیے یہ پیمانے ہرگز مناسب نہیں - اسی لیے نورا یہ سمجھنے سے معذور ہے کہ اپنے باپ کا نام لکھہ دینا " جعلسازی " کیونکر ہو سکتا ہے - نورا نہایت خلوص اور وفاداری سے اپنے شوہر کی جان بچانے کی کوشش کرتی ہے اور اپنے والد کو علالت کے زمانے میں کاروبار کے جھگڑوں سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے - اس کی نیت کی قدر کرنے کے بجاے مردوں کے بنائے ہوئے قانون اُسے مجرم ٹھیرا دیتے ہیں - ابسن کا کہنا یہ ہے کہ سوسائٹی بالکل مردوں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے - اس

کے قواعد وضوابط سب مردوں کے بنائے ہوئے ہیں ' اس لیے عورت کا نقطہ نظر سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے —

ہمارے سامنے اب دو سوال قصے کے متعلق ایسے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ نورا اپنے راز کو اتنے عرصے تک ہامر سے کیسے چھپائے رہی ؟ دوسرا یہ ہے کہ اس کے دل سے دفعتاً بچوں کی محبت کیوں کر جاتی رہی ؟ پہلے سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں نورا بخوبی جانتی تھی کہ ہامر کو قرض لینے سے سخت نفرت ہے ' اور وہ کسی حالت میں بھی کسی شخص کا مقروض ہونا نہیں چاہتا ' دوسرے اسے معلوم تھا کہ اُس نے جس طریقے سے یہ روپیہ حاصل کیا وہ ہامر کی انتہائی برھمی کا موجب ہوگا ' تیسرے وہ اپنی خدمت کا اظہار کرنا آئین محبت کے خلاف سمجھتی ہے ' اسے اپنی رسوائی کا بھی خوف ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اور اس کے شوہر میں وہ باہمی اعتماد نہیں کہ دونوں اپنے راز ایک دوسرے پر ظاہر کردیں ۔ اس لیے وہ ہامر کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی ۔ حالاں کہ کرسٹنا سے پہلی ہی ملاقات میں کل ماجرا کہہ گذرتی ہے ۔ اب رہا بچوں کی محبت کا سوال ' سو اس کا جواب ضمناً اوپر آچکا ہے ۔ ڈراما کی روئداد سے معلوم ہوتا ہے کہ نورا کی روح اب تک خوابیدہ تھی ' جس کی وجہ سے اس کی شخصیت ہمیشہ دوسروں کی پابند اور مطیع رہی ۔ اب اس کی روح بیدار ہوتی ہے ' اس کی رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑنے لگتا ہے ۔ اپنی شخصیت کے آزاد ہونے کے بعد وہ پہلی نورا نہیں رہتی بلکہ اور ہی کچھ ہو جاتی ہے ۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی سے نفرت کرنے لگتی ہے ۔ وہ جب یہ خیال کرتی ہے کہ وہ آٹھ سال تک ایک اجنبی کی بیوی بنی رہی یہاں تک کہ تین بچوں کی ماں ہوگئی

تو اس کا خون کھولنے لگتا ہے ' اور وہ چاہتی ہے کہ اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے - ایسی حالت میں وہ بچوں کو اپنے بچے سمجھتی ہی نہیں پھر محبت مادری کا کیا ذکر ہے - اس میں شک نہیں کہ یہاں بھی ابسن نے بہت مبالغے سے کام لیا ہے اور نورا کی تصویر کا یہ پہلو اصلیت سے بہت دور ہے —

ابسن کے اس دور کا دوسرا ڈراما ایک شدید ٹریجڈی ہے ' جس میں ہم ایک ہونہار ' نوجوان کو اپنے باپ کے گناہوں کی پاداش میں فنا ہوتے دیکھتے ہیں اور معاً یہ عقدہ مالا ینحل ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ زید کے افعال کی سزا زید کا بیٹا کیوں بھگتے ' یہ کہاں کا انصاف ہے کہ چوری کوئی کرے اور سزا کسی اور کو ملے ؟ ابسن کے زمانے میں یورپ کی ذہنی فضا میں ڈارون اور ہکسلے کے خیالات کا تسلط تھا اور مسئلۂ توارث کی طرف لوگوں کو بے حد توجہ تھی - ابسن بھی ان خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ' اپنے ڈراموں میں بھی اس نے جا بجا اس مسئلے کی جانب خفیف سا اشارہ کیا ہے - مگر اس ڈراما " بھوت پریت " کی تو روئداد ہی اس مسئلے پر مبنی ہے —

ڈراما کے پہلے سین میں ریگینا اینگ اسٹرینڈ سے بات چیت کرتی ہوئی نمودار ہوتی ہے ' دو باتوں کا پتہ اس مکالمے سے چلتا ہے - پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس خاندان کا چشم و چراغ اوسوالڈ الونگ پردیس سے آیا ہے اور سو رہا ہے ' دوسری بات یہ ہے کہ اینگ اسٹرینڈ اپنی لڑکی ریگینا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے ' لیکن وہ جانے پر راضی نہیں ہے - اسی ضمن میں ہم پادری منڈرس سے روشناس ہوتے ہیں ' ان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جذبات سے خالی ' اور خود نمائی اور کم فہمی سے معمور ہیں بے جا نہ ہو گا - ریگینا اور اینگ اسٹرینڈ کے مابین مکالمہ جاری رہتا ہے ' وہ کہتا ہے کہ

میں ملاحوں کو سرائے کھولنا چاہتا ہوں ' لیکن تنہا اس کام کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اس کے علاوہ ایسی جگہ شام کو کچھہ ناچ گانا بھی ضروری ہے جس کے بندوبست کے لیے تمہاری ضرورت ہے ' لیکن ریگینا صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ میں تمہارے ساتھہ نہ رہونگی - اسی اثنا میں پادری آموجود ہوتا ہے ' اور اینگ اسٹرینڈ چلا جاتا ہے ' ریگینا اور پادری بات چیت کرنے لگتے ہیں ' ریگینا پادری سے کہتی ہے کہ میں اپنے والد کے اصرار کے باوجود اس کے ساتھہ جانا نہیں چاہتی - لیکن بہتر ہو کہ مجھے شہر میں کوئی جگہ مل جائے کہ میں قصبے کی تنہا اور خاموش زندگی سے نجات پاؤں - اس کے بعد مسز الونگ آتی ہیں اور پادری سے گفتگو کرنے لگتی ہیں - پادری اپنی مصروفیت کی شکایت کرتا ہے —

اس کے بعد دونوں میں کاروبار کی بات چیت شروع ہوتی ہے ' اور پادری مجوزہ یتیم خانے کے متعلق کاغذات اور دستاویزیں دکھانا شروع کر دیتا ہے - پھر وہ سوال کرتا ہے کہ اس یتیم خانے کی عمارت کا بیمہ کرایا جائے یا نہیں - مسز الونگ بیمہ کرانے پر زور دیتی ہیں لیکن پادری اس کے خلاف ہے ' وہ کہتا ہے کہ اس عمارت کا جو ایک پاک مقصد کے لیے وقف کی جائے بیمہ کرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا - یہ نکتہ مسز الونگ کے سمجھہ میں نہیں آتا ' مگر جب پادری خیالات عامہ کا حوالہ دے کر زور دیتا ہے تو مسز الونگ با دل نا خواستہ اس کی بات مان لیتی ہیں —

اس گفتگو کے دوران میں اوسوالڈ اوور کوٹ پہنے ' سگار پیتا ہوا کمرے میں آموجود ہوتا ہے - سلسلۂ کلام میں پادری اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ اوسوالڈ

کو صغر سنی میں پردیس جانا پڑا اور وہ گھریلو زندگی سے سراسر نا آشنا رہا ۔ اوسوالڈ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں گھریلو زندگی سے خوب واقف ہوں ' بہت سے میرے ہم عصر آرٹسٹ اپنی آشناؤں اور ان کے بچوں کی پرورش کرتے ہیں ۔ پادری ان ناجائز تعلقات کا نام سن کر بد حواس ہو جاتا ہے ۔ اوسوالڈ دل ہی دل میں پادری کی بد حواسی دیکھ کر خوش ہوتا ہے ' اور معذرت کر کے چہل قدمی کے لیے باہر چلا جاتا ہے ۔ پادری اور مسز الونگ میں گفتگو جاری رہتی ہے ۔ ماں اپنے بیٹے کے خیالات کی تائید کرتی ہے ۔ پادری غصے میں اس کا کچا چٹھا بیان کرتا ہے کہ شادی کے ایک سال بعد تم گھر سے فرار ہو گئی تھیں اور کسی طریقے سے واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوتی تھیں ۔ اس وقت سوائے میرے کس نے تمہاری مدد کی تھی —

مسز الونگ : مگر تم شاید یہ بھول گئے کہ میں پہلے سال کس قدر مصیبت میں تھی ۔

پادری : یہ انسان کا جذبۂ بغاوت ہے کہ وہ اس زندگی میں خوشی کا آرزو مند ہوتا ہے ' بھلا ہم کو خوشی حاصل کرنے کا کیا حق ہے ۔ ہمیں تو صرف اپنا فرض انجام دینا چاہئیے ' اور تمہارا یہ فرض تھا کہ تم اس شخص کا دامن پکڑے رہتیں جس کو تم نے اپنی رفاقت کے لیے منتخب کیا تھا اور جس سے تم ایک مقدس رشتے کے ذریعے سے وابستہ ہوچکی تھیں —

اس کے جواب میں مسز الونگ اپنے شوہر کی بے راہ روی کی جانب خفیف سا اشارہ کرتی ہے ' لیکن پادری کے غصے میں ذرا بھی کمی نہیں ہوتی ' اور وہ کہتا ہے کہ تمہارا میری پناہ لے کر مجھے بد نام اور رسوا کرنا نہایت نا عاقبت اندیشی تھی ۔ تمہیں میرا ممنون ہونا چاہئیے کہ میں نے تمہیں تمہارے شوہر کے گھر میں واپس بھیجا اور تمہیں سیدھی راہ

دکھائی، اس کے بعد وہ فہمائش کرتا ہے کہ اوسوالڈ کو بچانا چاہتی ہو تو ابھی سے اس کی فکر کرو ورنہ وہ بہت جلد ہاتھہ سے جاتا رہے گا۔ مسزالونگ اب تک تو صبر کیے ہوے تھی لیکن اب اس سے نہیں رہا جاتا اور وہ اس راز کو بے نقاب کرتی ہے جو اب تک پادری کی اور پبلک کی نگاہ سے پوشیدہ تھا، اس کے شوہر کی نفس پرستی، ہوسناکی، اور بد اعمالیوں کا قصہ سن کر پادری ہکا بکا رہ جاتا ہے —

مسز الونگ کہتی ہیں میری ساری عمر اسی کوشش میں گذری کہ الونگ کے کرتوت آشکارا نہ ہونے پائیں، اور اوسوالڈ کو یہ پتہ نہ چلے کہ اس کے باپ کا اخلاق اس قدر پست اور گندا ہے۔ اسی ضمن میں مسز الونگ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کا شوہر گھر کی ماما سے ناجائز تعلق رکھتا تھا جس سے ریگینا پیدا ہوئی، اور اس خیال سے کہ اوسوالڈ ان زہریلے اثرات سے پاک رہے اسے صغرسنی میں پیرس بھیجنا پڑا۔ اب اس کے باپ کے نام سے یتیم خانے کی عمارت اس لیے منسوب کر رہی ہے کہ عوام‌الناس میں اس کے اعلیٰ اخلاق کا بھرم قائم رہے، اس کے علاوہ الونگ کا سارا اثاثہ اس لیے صرف کردینا چاہتی ہے کہ اوسوالڈ کو یہ ترکۂ پدری نہ ملے، بلکہ جو کچھہ ملے اپنی ماں سے ملے۔ بقیہ قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ اوسوالڈ بے خبری میں ریگینا پر دیوانہ وار عاشق ہو جاتا ہے مگر وہ ایک موروثی مہلک بیماری میں مبتلا ہے اور چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف یتیم خانے کی عمارت نذر آتش ہو جاتی ہے۔ اوسوالڈ ایک طرف اپنے اس شدید مرض کو محسوس کرتا ہے جو اسے پھونکے ڈالتا ہے اور دوسری طرف آگ کے شعلوں کو دیکھتا ہے جو یتیم خانے کی عمارت کو جلا رہے ہیں، اور حالت یاس میں چلا اٹھتا ہے:

" سب کچھہ جل جاے گا - کوئی چیز جو میرے باپ کی زندگی کو
یاد دلاتی ہے بچ نہیں سکتی - میں خود پھنکا جا رہا ہوں "-

آخری مکالمے میں وہ اپنی ماں سے کہتا ہے :

اوسوالڈ : (بے صبری کے ساتھہ) ' پھر وہی " باپ ! " " باپ !! " مجھے باپ کا کچھہ حال معلوم نہیں ' ان کے متعلق کچھہ بھی یاد نہیں سواے اس کے کہ ایک مرتبہ ان کی بدولت میں بیمار پڑ گیا تھا —

مسز الونگ : یہ کیسی باتیں کر رہے ہو ! آخر بیٹے کو باپ سے محبت کرنا چاہیے کہ نہیں -

اوسوالڈ : ایسی حالت میں کہ باپ نے میرے ساتھہ کوئی بھلائی نہیں کی میں اُنہیں کیا جانوں ' کیا تم واقعی اس پرانے ڈھکوسلے پر اب تک مصر ہو ' اور باتوں میں تو تم نہایت روشن خیال ہو ؟

مسز الونگ : تو یہ محض ڈھکوسلا ہے -

اوسوالڈ : بیشک ' اماں ! تم سمجھتی نہیں - یہ ان خیالات میں سے ہے جو دنیا میں رائج ہوگئے ہیں اور اس لیے ....

مسز الونگ : (بے حد متاثر ہوکر) خیالوں کے بھوت !

اوسوالڈ : ہاں انہیں بھوت کہیں تو بیجا نہیں —

ہم نے مندرجۂ بالا سطور میں ڈرامے کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کردیا - پادری کے کردار اور مسز الونگ کی شخصیت سے تو آپ ایک حد تک واقف ہوگئے ' ان کے علاوہ اوسوالڈ ہے جسے قصے کا " ہیرو " سمجھنا چاہیے- وہ ایک ہونہار مصور ہے - بچپن سے پیرس میں رہا ہے - ناروے کی دیہاتی

زندگی اور خیالات سے بالکل بے تعلق ہوگیا ہے - پردیس میں رہ کر وہ ان نئے خیالات سے روشناس ہو چکا ہے جو اس وقت تک ناروے میں کفر و الحاد شمار کیے جاتے ہیں - وہ اس باپ سے محبت کرنے سے انکار کرتا ہے جس نے اس کے ساتھہ کوئی بھلائی نہیں کی - ان خیالات کو بھوت پریت سے تشبیہ دیتا ہے جن کے وجود کا کسی کو یقین نہیں ہوتا ' لیکن ان سے ڈرتا ہر شخص ہے - وہ نکاح اور عقد کی رسم کو مقدس نہیں سمجھتا بلکہ اس کو خواہمخواہ کی پابندی تصور کرتا ہے جس کے بغیر لوگ عیش و آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں- وہ اتوار کے دن اور ہفتے کے دوسرے دنوں میں کوئی فرق نہیں کرتا - اس کے نزدیک کام بدبختی یا گناہ کی سزا نہیں ہے - زندگی کو مصیبت نہیں سمجھتا ' وہ پیرس کے ماحول سے جو نشاط زندگی سے معمور ہے متاثر ہو چکا ہے اور کہتا ہے کہ اس خوش نما وسیع دنیا میں سانس لینا ہی ایک نعمت ہے - پیرس میں رہ کر اُس نے جتنی تصویریں دیکھیں ان سب میں روشنی اور دھوپ معتدل ہواؤں کا فرحت بخش اثر ' خوشی سے دمکتے ہوے چہرے دکھائے تھے- ناروے کی لگا تار بارش سے وہ بہت جلد اُکتا جاتا ہے- اس فضا میں جہاں بے کیفی اور بے حسی چھائی ہوئی ہے گھر کے نظام میں ہر چیز قاعدے اور ضابطے میں جکڑی ہوئی ہے ' خیالات میں پادری کی خشک مذہبیت کا نقش موجود ہے ' صرف ایک ذات جو اس مکان میں زندگی بخش ' متحرک اور زندہ ہے وہ رگینا ہے - چنانچہ پیرس کا بدکا اُس لڑکی پر عاشق ہوجاتا ہے- وہ اپنے باپ کی عیاشیوں کی سزا میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہے اور آخر اُسی کی بدولت عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے - ابسن نے اسے توارث کے بے پناہ اثر کا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے ' وہ جیتا جاگتا انسان ہے ' مگر جب مرض کا حملہ ہوتا ہے تو گویا وہ اپنے باپ کا " بھوت "

بن جا تا ھے —

توارث کے اثر کو اس خوفناک شکل میں دکھانے سے ابسن کا مدعا اس حقیقت کو واضح کرنا ھے کہ انسان کے افعال کے نتائج اس کی ذات تک اور اس کے زمانے تک محدود نہیں رھتے بلکہ ان کا دائرہ اس کی اولاد کے ذریعے سے پھیلتا چلا جا تا ھے یہاں تک کہ اس کی وسعت اندازے کی حد سے باہر ھوجاتی ھے۔ اسی ضمن میں وہ اس عمرانی مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاھتا ھے کہ شادی اور توالد و تنا سل کی اھمیت محض انفرادی نہیں بلکہ معاشرتی ھے۔ اس کے علاوہ وہ فرد کے اخلاق اور عادات پر وراثت کا اثر دکھا کر ابسن کی مجبوری اور بے بسی کو واضح کر تا ھے —

اس ڈرامے کا اصل موضوع مسئلۂ توارث ھے لیکن بیچ میں ایک اور اھم چیز بھی آگئی ھے یعنی انسانی طبیعت کے فطری جوش اور ولولے کا مقابلہ معاشرت کے رسمی ضوابط اور فرائض سے؛ مذھب اور اخلاق کی سخت گیری اگر حد سے گذر جاے تو انسان کی روح کو پامال کر کے اُسے نشاط زندگی سے محروم کر دیتی ھے —

دوسرے ایکٹ میں اوسوالڈ اپنی ماں سے کہتا ھے :

"اماں! نشاط زندگی —— وہ ایک ایسی شے ھے جو
اس ملک میں دستیاب نہیں ھوتی' میں نے اُسے یہاں
کبھی محسوس نہیں کیا "۔

اس کی تعریف میں وہ کہتا ھے کہ یہ " نشاط کار " کا دوسرا نام ھے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ھو تا ھے کہ ھم " نشاط زندگی " کے مفہوم کی ذرا وضاحت کردیں۔ ناروے کی زندگی ابسن کے زمانے میں محض قصباتی زندگی تھی۔ کم فہم تنگ نظر پادریوں کا زور تھا۔ کٹر مذھبیت کا عمل دخل

تھا - تعلیم عام نہ تھی - سوسائٹی کے اونچے سے اونچے طبقے میں آرٹ ' لٹریچر اور سائنس کا نام بھی سننے میں نہیں آتا تھا - کام کو لوگ ایک ناگوار فرض ' ایک ناگزیر مصیبت سمجھتے تھے - ان کی روح پر افسردگی ' پژمردگی اور مایوسی مسلط تھی - اوسوالڈ کی زبان سے ابسن ان مردہ دلوں کو ایسی زندگی کا حال سناتا ہے جس میں انسان تمام مادی اور روحانی نعمتوں سے لطف اٹھاتا ہے اور اپنے کام کو اپنے فطری ذوق کی تسکین ' اپنی خلقی استعداد کی تکمیل ' اپنے ولولۂ حیات کے اظہار کا ذریعہ سمجھتا ہے - یہی نشاط کار اصل میں نشاط زندگی ہے —

عورت کی آزادی کا مسئلہ جس پر ابسن نے " گڑیا کا گھر " میں بحث کی ہے ضمنی طور پر اس ڈرامے میں بھی آگیا ہے - مسز الونگ کو اصل میں پادری سے محبت تھی مگر اس کی ماں اور خالہ نے مجبور کر کے الونگ سے شادی کردی —

مسز الونگ اپنے شوہر کی ناگوار صحبت اور اس کی بدکاریوں سے عاجز آکر گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے اور پادری کے یہاں پناہ لیتی ہے - پادری اسے سمجھا بجھا کر پھر واپس کر دیتا ہے - وہ اسے اپنا بڑا اخلاقی کارنامہ سمجھتا ہے - مگر ابسن مسزالونگ کے پردے میں اس کی تنگ نظری اور قدامت پرستی کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے —

اس ڈرامے کا اوسوالڈ محض برائے نام ہیرو ہے - اصل میں سب سے زیادہ اہمیت مسز الونگ کے کردار کو حاصل ہے - اس کے دو پہلو ہمیں نظر آتے ہیں جو بظاہر بالکل متضاد ہیں - وہ اپنے اعزا کی رائے سے خود اپنی مرضی کے خلاف شادی کرتی ہے - شوہر کو بدکار پا کر بھاگنا چاہتی ہے لیکن پھر واپس آجاتی ہے ' تمام عمر مصیبت میں گذارتی ہے لیکن زبان سے اُف تک نہیں

کرتی - چاہتی ہے کہ یتیم خانے کی عمارت کا بیمہ ہوجاے - لیکن جب پادری کو اس کا مخالف پاتی ہے تو چپ ہو جاتی ہے ' ایک تو اُس کی زندگی کا یہ پہلو ہے ' دوسری طرف وہ پادری کی تعلیم کی کھلم کھلا تردید کرتی ہے ' قاعدے اور ضابطے کی زنجیریں توڑ کر پھینک دینا چاہتی ہے- بات یہ ہے کہ اس کے دل اور دماغ میں ہم آہنگی نہیں بلکہ ہمیشہ کشمکش رہتی ہے - اس میں شک نہیں کہ اس کا دماغ کتب بینی کی بدولت آزاد ہو چکا ہے ' لیکن اُس کے جذبات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی - وہ اپنے شوہر کی یادگار میں ایک یتیم خانہ تعمیر کراتی ہے - وہ چاہتی ہے کہ کیپٹن الونگ کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو خیالات اور شبہات پیدا ہوے تھے وہ دور کردیے جائیں - وہ اچھی طرح واقف تھی ' وہ ایک ایسے بت کو سجدہ کر رہی ہے جس کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی - جب ریگینا کی شادی کا قصہ پیش ہوتا ہے تو فوراً وہی طریقۂ عمل تجویز کرتی ہے جو خود اس کی شادی میں اس کی ماں اور خالہ نے اختیار کیا تھا ' اور جس کا وہ تمام عمر خمیازہ اُٹھاتی رہی - وہ بہ قول اپنے دو قسم کے بھوتوں سے لڑ رہی ہے ' ایک اندرونی اور دوسرے بیرونی ' وہ اس خیال میں ہے کہ ان پر فتح پا چکی ہے - مگر یہ خیال خام ہے ' اندرونی بھوت اب تک اُس پر مسلط ہیں - اور اس کی عقل نہیں تو اس کا عمل اب تک ان کے حکم کا پابند ہے —

اس ڈرامے کے شائع ہوتے ہی ابسن پر بڑی سخت لے دے ہوئی ' اس ڈرامے پر یہ بھی اعتراض کیا گیا تھا کہ یہ نفی تہذیب (Nihilism) کی تعلیم دیتا ہے - مگر ابسن کا یہ خیال ہے کہ اس تصنیف میں تعلیم یا تبلیغ کا کوئی عنصر موجود نہیں' صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے- یعنی یہ بات واضح کی گئی ہے

کہ دنیا کی موجودہ سوسائٹی میں نفی اور انکار کا ایک خفی عنصر ہر جگہ موجود ہے ۔ مگر ہمیں ابسن کا یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے ' یہ ضرور ہے کہ ڈرامے میں لمبی لمبی تقریریں نہیں ہیں جن میں تبلیغ کی گئی ہو' لیکن جس رنگ میں اس نے ڈرامے کے اشخاص کا کردار پیش کیا ہے اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ان میں سے کن کے خیالات سے ابسن ہمدردی رکھتا ہے ۔ جب اوسوالڈ پہلے ایکٹ میں یہ کہتا ہے کہ بے فکرے لوگ مزے اُڑانے پیرس میں آتے ہیں اور اپنے گھر جا کر وہاں کی زندگی کے بد اخلاقی کے افسانے سناتے ہیں تو ابسن کی آواز صاف سنائی دیتی ہے ۔ اس کے علاوہ تیسرے ایکٹ میں جب اوسوالڈ اپنے وطن کی تاریکی ' سردی ' بارش کی شکایت اور جہالت اور کور ذوقی کا ماتم کرتا ہے تو ہماری نظروں میں ابسن کی تصویر پھر جاتی ہے جو اسی وجہ سے سالہا سال ناروے سے دور رہا ' اور جب تک زندہ رہا اپنے وطن کی نوحہ خوانی کرتا رہا ۔ اس لیے ہم یہ کبھی نہیں مان سکتے کہ اس ڈرامے میں ابسن کے ذاتی خیالات کی جھلک نہیں ہے —

پبلک کا دشمن (" An enemy of the people ") ابسن کا ایک دلچسپ اور سبق آموز ڈراما ہے جس میں اس نے قوم کے نا اہل رہنماؤں کی خود غرضی اور ہوس پرستی کی دھجیاں اُڑائی ہیں - ہر ملک ' ہر قوم اور ہر زمانے میں ایسے لیڈر موجود ہوتے ہیں جو بظاہر رفاہ عام میں منہمک ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھتے ہیں ۔ دراصل سیاسی زندگی میں بے لوث رہنا بڑا مشکل کام ہے' اس وادی میں ہوا و حرص کی ایسی آندھیاں چلتی ہیں کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں ۔ ابسن نے اس ڈرامے میں اپنے ملک کے بد دیانت لیڈروں کو بے نقاب کیا ہے

اور انداز بیان حقیقت نگاری کے اس قدر قریب آ گیا ہے کہ ڈراما پر تاریخ کا دھوکا ہوتا ہے - ابسن کے زمانے میں ناروے میں جہالت کا دور دورہ تھا - ملک میں رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی مگر تعلیم سے محروم ہونے کے سبب سے لوگوں کو کھوتے کھرے کی تمیز نہ تھی - خود غرض لیڈروں کے لیے بڑا اچھا موقعہ تھا - اس قصے میں ہم برگو ماسٹر * سے ملاقات کرتے ہیں اُس کے ہتکنڈوں سے واقف ہو جاتے ہیں —

ایک روز شام کے وقت برگو ماسٹر اپنے بھائی ڈاکٹر استاکمان کے یہاں آیا ہے ' اور اخبار پیام جمہور کے اڈیٹر ہواستاد سے باتیں کر رہا ہے ' گفتگو کے دوران میں برگو ماسٹر کہتا ہے کہ ہمارے قصبے میں بہت اچھی پبلک اسپرٹ موجود ہے ' لوگوں کے اغراض و مقاصد ایک ہیں اور اس وجہ سے سارے صحیح الدماغ لوگ ہم آہنگ اور ہم خیال ہیں ' برگو ماسٹر کا اشارہ قصبے کے صحت بخش چشموں † کی طرف ہے اور وہ یہ جتانا چاہتا ہے کہ قصبے کی ساری معاشرتی ' اقتصادی ' اور کار باری زندگی کا انحصار ان ہی چشموں پر ہے - گفتگو جاری رہتی ہے اور ہر شخص ان چشموں کی برکات بیان کرتا ہے - ڈاکٹر کی بیوی کہتی ہے کہ ان چشموں کو میرے شوہر نے شناخت کیا اور یہ اسی کے دماغ کا فیض ہے - برگو ماسٹر کب چوکنے والا ہے ' فوراً یہ جتاتا ہے کہ

---

* برگو ماسٹر ہندوستان کی اصطلاح میں میونسپلٹی کا چیرمین ہوا -

† بعض مقامات پر صحت بخش چشمے ہوتے ہیں جہاں مریض جاکر رہتے ہیں اور غسل کرتے ہیں ' مریضوں کی آمد و رفت کی وجہ سے وہاں ہوٹل ' قہوے خانے ' مکانات اور باغات بن جاتے ہیں - اس وجہ سے یہ بستیاں بہت جلد مالا مال ہو جاتی ہیں - اس ڈرامے کا سین ایک ایسا ہی قصبہ ہے جس کی خوش حالی اس کے چشموں پر منحصر تھی - برگو ماسٹر کا بھائی ڈاکٹر استاکمان وہاں کی میونسپلٹی کا طبیب تھا —

اس کام میں میرا بھی حصہ تھا —

اڈیٹر کھانے کے کمرے میں چلا جاتا ہے ۔ اس کے جانے کے بعد ہی ڈاکٹر اسٹاکمان داخل ہوتا ہے ۔ وہ اس وقت بہت خوش خوش نظر آتا ہے ۔ دونوں بھائیوں میں گفتگو شروع ہوتی ہے ' اور سلسلۂ کلام آپس کی شکر رنجی پر ختم ہوتا ہے ۔ برگو ماسٹر اپنے بھائی سے کہتا ہے کہ اڈیٹر تمہارا ایک مضمون شائع کرنا چاہتا ہے مگر تم نے نہ معلوم کیوں اسے یہ ہدایت کردی ہے کہ وہ مضمون اس وقت نہ شائع ہو ۔ یہ مضمون در اصل قصبے کے صحت بخش چشموں کی تعریف و توصیف میں لکھا گیا تھا ' اس لیے برگو ماسٹر کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کی اشاعت ملتوی رکھی جائے ' وہ اس کی وجہ دریافت کرتا ہے ۔ مگر ڈاکٹر نے اس عقدے کو اس وقت کھولنا مناسب نہ سمجھا ۔ برگو ماسٹر نے اپنے عہدے کے زعم میں کہا " میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ساری کار روائی ضابطے کے مطابق اور افسران متعلقہ کے ذریعے سے عمل میں آے " ۔ مگر ڈاکٹر اسٹاکمان اس تقریر سے مرعوب نہ ہوا اور برگوماسٹر غصے میں اٹھ کر چلا گیا : مگر چلتے چلتے اپنے بھائی کو دھمکی دے گیا کہ تمہیں اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا ۔ اس کے بعد سب لوگ ملاقات کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور شراب کا دور چلنے لگتا ہے ۔ اسی دوران میں ڈاکٹر کی بیٹی پیٹرا داخل ہوتی ہے ' اور اپنے باپ کو ایک خط دیتی ہے جس کا اُسے شدید انتظار تھا ' اس کو پڑھتے ہی وہ کتب خانے میں چلا جاتا ہے ' اور تھوڑی دیر میں واپس آکر کہتا ہے ' لیجئے یہ خبر سارے قصبے میں ہلچل مچا دے گی ' یہ چشمے جن پر بے شمار روپیہ صرف کیا گیا اور جن کی خوبی اور فائدہمندی کے راگ گاے جاتے ہیں در اصل سخت زہریلے اور مہلک ہیں —

ڈاکٹر کے اس اعلان کو سن کر سب ششدر رہ جاتے ھیں - وہ کُل ماجرا بیان کرتا ھے کہ میں نے اس معاملے کی بڑی جانفشانی اور ایمانداری سے تفتیش کی کیونکہ گذشتہ سال مریضوں میں میعادی بخار معمول سے زائد پھیلا تھا ' اس وقت یہ خیال ھوا تھا کہ شاید خود مریض اس کے جراثیم اپنے ھمراہ لائے تھے ' لیکن بعد میں معلوم ھوا کہ یہ پانی کا نقص ھے ' اس لیے میں نے پانی کے نمونے امتحان کے لیے ماھرین کے پاس بھیجے ' جن کی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ پانی میں ایسے جراثیم موجود ھیں جو انسانی صحت کے لیے سخت مضر ھیں - ڈاکٹر نے اپنی رپوٹ پہلے ھی لکھہ لی تھی ' صرف ماھرین کی تصدیق کی دیر تھی؛ چنانچہ اس کے وصول ھوتے ھی کاغذات بند کرکے برگو ماسٹر کے پاس روانہ کردیے جاتے ھیں —

دوسرے ایکٹ کی ابتدا میں معلوم ھوتا ھے کہ برگو ماسٹر نے وہ رپوٹ واپس کردی اور یہ کہلا بھیجا کہ میں خود دوپہر کے قریب ملنے آؤں گا —

ڈاکٹر کا خسر مارٹن‌کل اپنے داماد سے ملنے آیا ھے - وہ برگو ماسٹر کا مخالف ھے اور چاھتا ھے کہ چشموں کے معاملے میں اس کی شکست اور بدنامی ھو - اس کے بعد ھوواسٹاڈ پیام جمہور کا اڈیٹر آتا ھے اور ڈاکٹر کو بتاتا ھے کہ برگوماسٹر کی پارٹی ڈاکٹر کی رپوٹ منظور نہ ھونے دے گی اور چشموں کی صفائی کی مخالفت کرے گی ؛ مگر وہ وعدہ کرتا ھے کہ اس کا اخبار اس معاملے میں ڈاکٹر کی پوری مدد کرے گا —

اسی ملاقات کے دوران میں جمہوری پارٹی کا لیڈر الاسکن آتا ھے اور ڈاکٹر کو یقین دلاتا ھے کہ وہ اپنی جماعت کے ساتھہ ڈاکٹر کی امداد پر کمر بستہ ھے - الاسکن اور ھوواسٹاڈ اور برگو ماسٹر داخل ھوتے ھیں '

مسزاسٹاک مان اور پیٹرا ہٹ جاتی ہیں، اور دونوں بھائیوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے —

برگوماسٹر : کیا یہ ضروری تھا کہ میری اطلاع کے بغیر یہ تحقیقات کی جاے ؟

ڈاکٹر : ہاں ، جب تک مجھے پورا یقین نہ ہو گیا تب تک میں ......

برگوماسٹر : تو کیا اب تمہیں پورا یقین ہے ؟

ڈاکٹر : تمھیں خود میری رپوٹ سے اس کا پتہ چل گیا ہوگا —

برگوماسٹر : تو کیا تمہارا یہ مقصد ہے کہ ڈائرکٹروں کے بورڈ میں یہ رپوٹ بطور با ضابطہ مراسلے کے پیش کی جاے ؟

ڈاکٹر : بےشک ، اِس معاملے میں کچھہ نہ کچھہ جلد کرنا چاھئے ۔

برگوماسٹر : حسب معمول تم نے پھر سخت الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ اور باتوں کے علاوہ تم نے یہ لکھا ہے کہ ہم مسافروں کو زہر دیتے ہیں ۔

اس انداز سے بات چیت کی ابتدا ہوتی ہے ، برگوماسٹر کہتا ہے کہ نلوں کو از سر نو لگانے میں کئی لاکھہ کراؤن صرف ہوں گے ، اور دو سال کی مدت درکار ہوگی ۔ اُس وقت تک اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ چشموں کو بند کردیا جاے ، اس دوران میں گرد و نواح کے قصبے اپنے ہاں حوض تعمیر کر لیں گے اور ہمارا قصبہ ہمیشہ کے لیے برباد ہوجاے گا ، چنانچہ برگوماسٹر کا خیال ہے کہ ان چشموں کو جوں کا توں چھوڑ دیا جاے ۔ آگے چل کر جب موقعہ ہوگا ان کی درستی اور اصلاح ہو جاے گی ۔ ڈاکٹر اس تجویز کو بے ایمانی سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس میں شریک نہیں ہوسکتا —

برگوماسٹر اسے سمجھاتا ہے کہ مناسب یہی ہے کہ یہ رپوٹ بورڈ کی خدمت میں پیش نہ کی جاے اور وعدہ کرتا ہے کہ کچھہ دن بعد میں خود اس معاملے کو پیش

کروں گا اور جو کچھہ ہو سکے گا وہ کیا جاے گا، مگر اس شرط پر کہ اس کی بھنک کسی کے کان میں نہ پڑنے پاے - مگر جب برگوماسٹر کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس افواہ نے نہ صرف شہر میں گشت لگانا شروع کر دیا ہے بلکہ پیام جمہور کے دفتر میں اس کا مسودہ پہنچ چکا ہے تو اس کے ہاتھہ کے طوطے اُڑ جاتے ہیں —

گفتگو اس حد تک پہنچتی ہے کہ برگوماسٹر کہتا ہے میں بحیثیت افسر کے تمھیں حکم دیتا ہوں کہ پبلک کو یقین دلاؤ کہ چشمے خراب نہیں ہیں بلکہ ہر طریقے سے مکمل اور صحت بخش ہیں - ظاہر ہے کہ ڈاکٹر اس سے انکار کرتا ہے جس پر برگوماسٹر اُسے بر طرف کرنے کی دھمکی دیتا ہے —

تیسرے ایکٹ کی ابتدا اڈیٹر کے دفتر سے ہوتی ہے - اڈیٹر سے اور اس کے ایک ماتحت سے ڈاکٹر کے مضمون کے متعلق گفتگو ہورہی ہے، ان کا خیال ہے کہ مضمون بہت زور دار ہے، لیکن ایک حملے میں دشمنوں کا خاتمہ نہ ہو سکے گا، اس لیے وار پر وار کیے جائیں یہاں تک کہ بلدی حکومت کے پرزے پرزے اُڑ جائیں - اس اثنا میں ڈاکٹر آتا ہے اور اپنے مضمون کی طباعت کی اجازت دے کر کہتا ہے کہ اس کے متعلقہ مسائل پر چند اور مضامین کا خاکہ میرے ذہن میں موجود ہے - میں اس اخبار کے ذریعے بلدی حکومت پر ایسے شدید حملے کروں گا کہ اس کی شان و شوکت خاک میں مل جاے گی - اس گفتگو کے بعد ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا جاتا ہے کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آکر پروف دیکھوں گا —

تھوڑی دیر کے بعد الاسکن اڈیٹر کو یہ اطلاع دیتا ہے کہ برگو ماسٹر مطبع میں موجود ہے اور تم سے وہاں ملنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ پوشیدہ طور سے آیا ہے - اڈیٹر اس کا خیر مقدم کرتا ہے - بر گو ماسٹر الاسکن سے کہتا

ہے کہ چشموں کی مرمت اور صفائی میں کئی لاکھ کراؤن صرف ہوں گے ' میں خوش ہوں کہ پبلک اس بوجھ کو اُٹھانے کے لیے تیار ہے' مگر اُسے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ پبلک اس کے لیے تیار نہیں ہے - وہ جواب دیتا ہے کہ ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ چشموں کو بند کر دیا جائے - یہ سنتے ہی سب کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور سب سے پہلے الاسکن یہ کہتا ہے کہ ہم لوگ اُسے ہرگز پسند نہیں کریں گے —

تصویر کا یہ رخ جب لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے تو ان کے خیالات میں کایا پلٹ ہوجاتی ہے - تھوڑی دیر میں ڈاکٹر پھر نمودار ہوتا ہے اور برگوماسٹر ایک دوسرے کمرے میں چھپ جاتا ہے ' مگر اپنی لکڑی اور ٹوپی لینا بھول جاتا ہے - ڈاکٹر کی نظر برگوماسٹر کی لکڑی اور ٹوپی پر پڑتی ہے اور وہ ٹوپی کو ہاتھ میں اُچھالتے ہوے دریافت کرتا ہے کہ یہ چیزیں یہاں کیسے آئیں - وہ اس وقت نشہ میں مخمور ہے - برگوماسٹر کی ٹوپی اوڑھ کر اور لکڑی ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتا ہے اور اس کمرے کا دروازہ کھول کر جہاں برگوماسٹر پناہ گزیں ہوا تھا دوہری سلام کرتا ہے ' برگوماسٹر غصے میں لال پیلا ہو رہا ہے مگر ڈاکٹر اکڑ اکڑ کر ٹہلنے لگتا ہے - برگوماسٹر جھلجلا کر اپنی ٹوپی اور لکڑی طلب کرتا ہے ' ڈاکٹر کہتا ہے

" کیا تم سمجھتے ہو کہ جمہوریت کا بیدار شدہ شیر کا مدار ٹوپی سے فرار ہوجائے گا ؟ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ کل شہر میں ایک انقلاب ہونے والا ہے ' تم نے مجھے برطرفی کی دھمکی دی تھی ' لو ' اب میں تمھیں برطرت سارے عہدوں سے یک قلم برطرت کیے دیتا ہوں - تم یہ خیال کرتے ہو گے کہ میں ایسا

نہیں کرسکتا - یقیناً میں کرسکتا ہوں ' سوسائٹی کی عظیم الشان
طاقت میری حمایت کے لیے آمادہ ہے ' ہواستاد اور بلنگ اخبار
کے کالموں میں گرجیں گے ' اور الاسکن مالکان مکانات کی انجمن
کے صدر کی حیثیت سے میدان میں آجاے گا " —

ڈاکٹر یہ تقریر ختم کرتا ہے مگر الاسکن اور ہواستاد اسے جلد یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ اس کی تائید کے لیے ہرگز طیار نہیں ہیں - بلکہ اڈیٹران اخبار تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہم یہ مقالے بھی شائع نہیں کرسکتے - ڈاکٹر کو یہ جلد معلوم ہوجاتا ہے کہ اخبار کی پالیسی خریداروں کے ہاتھ ہے ' خریدار بالعموم درمیانی طبقے کے لوگ ہوتے ہیں جن کی آمدنی کا ذریعہ وہ مکانات ہیں جو مریضوں کو کرایہ پر دیے جاتے ہیں - چنانچہ اس طبقے کا چودھری الاسکن صاف صاف کہدیتا ہے :

" اگر آپ کا مضمون اخبار میں چھاپ دیا جاے تو ہمارا قصبہ
بالکل برباد ہوجاے گا " —

ڈاکٹر ٹوپی اور لکڑی برگو ماسٹر کو دے دیتا ہے - آخرالذکر کا مسودہ اڈیٹر کے ہاتھ میں ہے جس کی اشاعت کا وہ وعدہ کرتا ہے - ڈاکٹر امر سازش کو دیکھ کر الاسکن سے کہتا ہے کہ میرے مضمون کو ایک رسالے کی صورت میں جدا گانہ چھاپ دو - میں خود اس کا ناشر بننے کو طیار ہوں لیکن وہ اس کی طباعت سے قطعی انکار کرتا ہے بلکہ اسے یہ یقین دلاتا ہے کہ اس مضمون کو شہر کا کوئی مطبع نہیں چھاپے گا اور کوئی ایسا پبلک ہال بھی نہیں مل سکے گا جہاں وہ جلسہ کرکے اُسے پڑھ سکے —

چوتھے ایکٹ کی ابتدا اس جلسے سے ہوتی ہے جس میں ڈاکٹر اپنا مقالہ پڑھنے والا تھا ' جہاز کے کپتان ہواسٹر نے اس جلسے کے لیے اپنا ہال دیدیا

تھا - مسز استاکمان اور پٹرا جلسہ شروع ہونے سے قبل پہنچ گئے ' شہر کے آدمی کثرت سے شرکت کے لیے آے ' مگر قبل اس کے کہ ڈاکٹر اپنی تقریر شروع کرے لوگوں نے فرمائش کی کہ ایک چیرمین کا انتخاب پہلے ہونا چاہیے ' ڈاکٹر نے اس کی مخالفت کی لیکن نقار خانے میں طوطی کا آواز کون سنتا ' الاسکن صدر منتخب ہوا - برگو ماسٹر بھی موجود تھا ' سب سے پہلے اس کو تقریر کا موقعہ دیا گیا ' اس نے یہ تجویز پیش کی کہ حاضرین جلسہ میں کوئی شخص بھی ڈاکٹر استاکمان کے مبالغہ آمیز خیالات سننا نہیں چاہتا ' اس لیے اس جلسہ کو فی الحال ملتوی کر دینا چاہیے ' صدر نے اس تجویز کی تائید کی ' اخبار کے اڈیٹر نے تائید مزید کی ' مگر لوگوں کی خواہش سے صدر نے ڈاکٹر استاکمان کو تقریر کی اجازت دے دی —

ڈاکٹر اپنی تقریر شروع کرتا ہے ' وہ سامعین کو یقین دلاتا ہے کہ میں چشموں کی حالت کو معرض بحث میں نہ لاؤں گا ' مگر اسی حد و حہد میں میں نے ایک اور بات دریافت کی ہے جسے ظاہر کر کے میں اپنا فرض ادا کروں گا : وہ بات یہ ہے کہ ہمارے وطن کی روحانی زندگی کے سر چشمے زہر آلود ہیں ' اور سوسائٹی کی بنیادیں مکر و فریب پر قائم ہیں - اس تقریر کے دوران میں برگو ماسٹر ' اڈیٹر ' صدر اور بلنگ بار بار ڈاکٹر کی تقریر میں رخنہ اندازی کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر کا جوش کم نہیں ہوتا ' وہ شہر کے عمائدین کو بھڑوں سے تشبیہ دیتا ہے جو آزادی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں - تعصب ' کج فہمی اور خود غرضی پر اپنے اعمال و افعال کی بنا رکھتے ہیں اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ عمائدین صداقت اور آزادی کے ایسے مہلک دشمن نہیں ہیں جیسے وہ اوسط درجے کے لوگ ہیں جن پر آبادی کی اکثریت مشتمل ہے اور جو زعم باطل میں اپنے آپ کو آزادی کا علم بردار

تصور کرتے ہیں —

اس کے بعد جلسے میں اور زیادہ ہنگامہ برپا ہوتا ہے ۔ جس کے کم ہونے پر مقرر پھر اپنی تقریر شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اکثریت کبھی صداقت کی پیرو نہیں ہوتی ' ہر ملک میں عقلمندوں کے مقابلے میں احمقوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے ' اس لیے یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ احمقوں کی اکثریت کو عقلمندوں کی اقلیت پر حکمرانی کرنا چاہئے ۔ جو اخبار تمہیں یہ بتائے کہ عوام الناس حکومت میں شریک ہونے کے قابل ہیں سمجھہ لینا چاہیے کہ وہ مکار اور فریبی ہے ۔ یہاں وہ اس حقیقت کو بھی واضح کردیتا ہے کہ جن ادنیٰ درجے کے لوگوں کی جانب وہ اشارہ کررہا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ نیچے طبقے میں پائے جائیں بلکہ سوسائٹی کے اونچے سے اونچے حلقے میں موجود ہیں —

غرض وہ سوسائٹی کے ہر طبقے کو کھری کھری سناتا ہے ' سب کے عیوب ایک ایک کرکے گناتا ہے ' آخر میں وہ کہتا ہے کہ ہمارے وطن کا برباد ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ اس کی خوش حالی کی بنیاد مکر و فریب پر قائم ہو ۔ اس پر جلسے میں ہڑبونگ مچ جاتی ہے ' ہرطرف شور برپا ہے کہ یہ وطن کا بدخواہ ہے ' پبلک کا دشمن ہے' چنانچہ جلسے میں یہ ریزولوشن پیش کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر اسٹاکمان پبلک کا کھلا ہوا دشمن ہے ' اور سوائے ایک شخص کے سارا مجمع ڈاکٹر کے خلاف ووٹ دے کر اس تجویز پر صاد کرتا ہے ' جلسہ بے ترتیبی اور شور و غل کے ساتھہ منتشر ہوتا ہے ' لوگوں میں ڈاکٹر کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوتی ہیں ' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اپنی تنخواہ میں اضافہ چاہتا ہے اس لیے اس نے یہ سوانگ بھرا ہے ۔ اس پر آوازے کسے جاتے ہیں اور اس کے مکان پر پتھر پھینکنے کی سازش ہوتی ہے —

پانچواں ایکٹ اس شب کی صبح کو شروع ہوتا ہے ' ڈاکٹر اسٹاکمان وہ پتھر چنتا نظر آتا ہے جن سے شہر کے لوگوں نے اس کے مکان کی کھڑکیاں توڑی تھیں ' وہ ان کو یادگار کے طور پر محفوظ رکھنا چاہتا ہے ۔ اسے پہلی خبر یہ ملتی ہے کہ ملازمہ غائب ہے ' اس کے بعد ہی مکان کے مالک کا نوٹس آتا ہے کہ مکان خالی کردیجیے ۔ وہ خود بہت نیک نفس ہے ' لیکن رائے عامہ سے مجبور ہے ۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میں ایسے شہر میں رہنا نہیں چاہتا جہاں کے لوگ اس قدر بزدل ہوں کہ اپنی ذات کو پبلک میں ضم کردیں ۔ اتنے میں پیٹرا داخل ہوتی ہے ۔ وہ اس اسکول سے برطرف کردی گئی جہاں وہ کام کرتی تھی ' اُس پر الزام یہ لگایا گیا کہ وہ بہت آزاد خیال ہے —

برگوماسٹر ڈاکٹر کی برطرفی کا حکم لیے ہوے آتا ہے اور یہ بھی جتا دیتا ہے کہ قصبے کے لوگ تمھارا علاج کرانا چھوڑ دیں گے ۔ غرض بیچارے ڈاکٹر پر ہر طرف سے نرغہ ہے ۔ بیچ میں یہ خبر مشہور ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کے خسر مارٹن کل نے چشموں کی کمپنی کے حصے جن کی قیمت بہت گر گئی ہے ہزاروں کی تعداد میں خرید لیے ہیں ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر کی یہ چال کہ اس نے چشموں کو بدنام کیا اسی لیے تھی کہ حصوں کی قیمت گرجائے اور اس کا خسر انھیں کوڑیوں کے مول خرید لے ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب وہ چشموں کی مخالفت ترک کردے گا اور اسے مبارک باد دینے آتے ہیں مگر وہ سب کو نکال باہر کرتا ہے ۔ ڈاکٹر کی تقریر کے آخری الفاظ جن پر ڈراما ختم ہوتا ہے یہ ہیں " سب سے قوی وہی شخص ہے جو بالکل تنہا ہے '' —

اس ڈراما میں ابسن حسب ذیل سیاسی اور معاشرتی اصولوں کو ثابت کرنا چاہتا ہے :

(۱) عوام‌الناس ہمیشہ بے عقل اور گمراہ ہوتے ہیں —

(۲) ملک کے خیالات اور اخلاق کی اصلاح ان لوگوں کے ہاتھہ میں ہے جو عوام‌الناس سے تعلیم ' تہذیب اور تمدن میں برتر ہیں ۔ اس لیے سیاسی قوت انہیں کے ہاتھہ میں ہونی چاہیے —

(۳) لبرل پارٹی ملک کی بدترین دشمن ہوتی ہے —

(۴) خیالات اور اعتقادات کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں ہوتی اس لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ نئے خیالات پیدا ہوتے رہیں —

(۵) ملک میں سیاسی پارٹیوں کا قائم ہونا افراد کی روحانی اور اخلاقی ہلاکت کا باعث ہے —

(۶) دنیا میں سب سے کمزور انسان وہ ہے جو فرقہ بندی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ۔ بہ خلاف اس کے سب سے طاقتور وہ ہے جو بالکل تنہا ہے —

اس ڈرامے کے اشخاص کے کردار پر فرداً فرداً تفصیلی نظر ڈالنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ' ان کے طبائع اور خصائل کا اندازہ قصے کے واقعات سے اچھی طرح ہوسکتا ہے —

اس میں سب سے زیادہ نمایاں ڈاکٹر کی شخصیت ہے ۔ ابسن نے اسے ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے ' اسے شہید قوم کا رتبہ دیا ہے ' ہماری محبت اور ہمدردی اس کے لیے شروع ہی سے وقف ہوجاتی ہے اور ہم اس کے عیوب اور اس کی کمزوریاں دیکھہ کر دلگیر ہوتے ہیں ۔ وہ جلد باز ہے ' دوست بہت جلد بن جاتا ہے ' لوگوں کو پہچاننے کا ملکہ بالکل نہیں رکھتا ' اچھے برے آدمی میں تمیز نہیں کرسکتا ' بڑا مہمان نواز ہے مگر اس کی مہمان نوازی میں مربیانہ انداز کی جھلک ہے ۔ وہ نام و نمود کا طالب ہے ' کم فہم ' اور ناتجربہ کار ہے ۔ معاملہ فہمی اور موقع شناسی سے بالکل بے بہرہ ہے ۔ فرض شناسی کے زعم میں وہ اپنی تجاویز کے نتائج کو نظر انداز کردیتا

ہے ' وہ حق کا پرستار ہے ' چاہے حق کی آگ سارے وطن کو جلاکر خاک کر دے بلکہ وطن کا کیا ذکر ہے اس کا بس چلے تو ساری دنیا کو تباہ کر دے۔ وہ خود کہتا ہے کہ جھوٹ کے سہارے زندگی بسر کرنے والے انسانوں کا قلع قمع کر دینا چاہئیے اور اس کے خیال میں ہر وہ صداقت جو فرسودہ ہوجاتی ہے جھوٹ سے زیادہ زہریلی ہے۔ ابسن کا نصب‌العین اس قدر بلند ہے کہ دوسروں کا خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہمیں برینڈ کی داستان یاد ہے جو نصب‌العین کے مقابلے میں حیات انسانی کو بے حقیقت تصور کرتا تھا۔ اسی فلسفے کی جھلک ڈاکٹر اسٹاکمان کی گفتگو میں پائی جاتی ہے۔ ابسن کے خیال میں انسان طبعاً کاہل اور سہولت پسند ہے اس لیے اسے ہمیشہ مہمیز کی ضرورت ہے۔ یہ سخت گیر محتسب محض ظاہری افعال کو نہیں دیکھتا بلکہ دلوں کا چور پکڑتا ہے اور طنز و ملامت کے کوڑوں سے انسان کے نفس کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا —

تبصرے

ادب

تاریخ و سیر

مذہب و اخلاق

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

تبصرے

اردو

جامع اللغات اردو والسنۂ متعلقہ

(حصہ اول و دوم مرتبہ خواجہ عبدالمجید صاحب بی - اے -
جامع اللغات کمپنی لاہور - قیمت فی حصہ ایک روپیہ چار آنے)

لائق مؤلف و مرتب نے اتنا بڑا کام اپنے سر لیا ھے کہ اُس کا نباھنا بہت مشکل ھے - انہوں نے صرف اردو تک اس کام کو محدود نہیں رکھا بلکہ السنۂ متعلقہ کو بھی لے لیا ھے جس سے ان کی دشواری بہت بڑھ گئی ھے - اول اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری تھا کہ السنۂ متعلقہ میں سے (جو متعدد ھیں) کس قسم کے اور کون کون سے لیے جائیں - اگر یہ امر طے نہ کیا جائے تو پھر عربی فارسی سنسکرت وغیرہ زبانوں کا ھر لفظ داخل ھو سکتا ھے - یہ مرتب کی مرضی پر ھے کہ جسے چاھے داخل کرے اور جسے چاھے چھوڑ دے - لغت نویس زبان کا بنانے والا نہیں ھے بلکہ زبان کا تابع ھے - وہ صرف انہیں الفاظ کی تشریح کرتا ھے جو زبان میں آگئے ھیں - اس

امر کو ملحوظ نہ رکھنے سے یہ کتاب عجیب و غریب ہو گئی ہے —

اس کتاب میں دو باتوں سے بالکل بحث نہیں رکھی - ایک الفاظ کے اصل کی تحقیق ' دوسرے استعمال کی سند - الفاظ کی اصل کی تحقیق نہایت مشکل کام ہے اور اس سے خاص خاص لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں - عام لغت میں اگر اس سے قطع نظر کی جائے تو کوئی زیادہ ہرج نہیں لیکن استعمال کی سند نہ دینا بہت بڑا نقص ہے - خصوصاً جہاں معانی میں نازک فرق ہوتے ہیں یا ایک ہی لفظ مختلف معنوں میں مختلف طرح استعمال ہوتا ہے یا بعض محاورے خاص انداز یا خاص خاص موقعوں پر ہوتے ہیں اُن کے استعمال کی سند مستند مصنفین کے کلام سے دینا لازم ہے - محض مختصر طور سے تشریح کر دینے یا معنے لکھ دینے سے اصل مفہوم کبھی سمجھ میں نہیں آتا - بالفرض اگر سمجھ میں آ بھی جائے تو بھی ایسی صورتوں میں لغت نویس کا لکھنا سند نہیں ہو سکتا اور لغات کار آمد نہیں ہوسکتی بلکہ بعض اوقات گمراہ کردیتی ہے - معنی کی صحیح تشریح ہمیشہ استعمال کی مثالوں سے ہوتی ہے اور یہ لغت کا اہم جز ہے - قابل مولف اس سے بے خبر نہیں لیکن محض اس اندیشہ سے کہ کتاب ضخیم نہ ہو جائے انہوں نے اسناد ترک کردیں - ہماری رائے میں یہ اچھا نہیں کیا ' اس سے کتاب کا فائدہ بہت کم ہوگیا ہے - البتہ یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر خریداروں نے پسند کیا تو ہم بعد کو اسناد کی زائد جلدیں مرتب کردیں گے - اس سے مطالعہ کرنے والوں کو اور الجھن پیدا ہو گی - ان کا یہ کہنا کہ فی الحال ضرب الامثال اسناد کا فائدہ دے سکتی ہیں صحیح نہیں - ضرب‌الامثال کو اس سے کوئی تعلق نہیں —

الفاظ کی تشریح و تعریف میں بھی بعض جگہ بے احتیاطی ہو گئی ہے - " آویزہ " کے معنے لکھے ہیں " وہ شخص جو آویزے پہنتا ہو " - یا " آل و اطفال " کے معنوں میں ایک معنے " کل خاندان " بھی ہیں - " آہ نہ کرے " کا ایک محاورہ لکھا ہے اور اس کے معنے " وہ بے رحم آدمی .... " ہیں - " آہ نیم شب " - " وہ جو آدھی رات کو نکلے "—

محاورات کے سمجھنے میں بھی بعض مقامات پر غلطی ہو گئی ہے - صرف چند مثالیں نمونے کے طور پر لکھی جاتی ہیں —

" آپ ہر فن مولی ہیں " - ہر فن مولی بے شک محاورہ ہے مگر اس محاورہ

کو " آپ " سے کوئی خاص تعلق نہیں ' ہر ضمیر اور ہر شخص کے ساتھہ آسکتا ہے - اگر یہ اصول رکھا گیا تو جگہ جگہ اسے لکھنا پڑے گا —

" آج کل جنگل میں سونا اُچھالتے چلے جاؤ کوئی نہیں پوچھتا " - اس سے محاورے کو " آج کل " سے کوئی تعلق نہیں - " آج کل " اس محاورے کا جز نہیں ہے —

" آدھی تولی " نہ کوئی محاورہ ہے اور نہ اس میں کوئی خاص بات ہے - آدھا اور آدھی اکثر چیزوں کے ساتھہ آتا ہے - تولی کے ساتھہ " آدھی " کا لفظ کوئی خاص معنی پیدا نہیں کرتا - " آواز قدم " کوئی محاورہ نہیں - اس طرح کے الفاظ اور جملے اگر اکھٹے بیٹھیں تو روز مرہ کا کوئی جملہ بھی نہ چھٹے گا - یہ غلطی محاورہ کے صحیح معنے نہ سمجھنے سے پیدا ہوی ہے —

" آنکھوں کا ڈھونڈھنا " کوئی محاورہ نہیں - " آنکھوں کا کسی کو ڈھونڈھنا " ہونا چاہیے تھا - " آنکھیں اُستاد سامری ہونا " کوئی محاورہ نہیں - یہ محض تشبیہہ ہے —

اس قسم کی بیشتر غلطیاں اس وجہ سے ہوی ہیں کہ دوسری لغت کی کتابوں کو سامنے رکھہ کر نقل کرلی ہے اور ان کی صحت اور غلطی کو تحقیق نہیں کیا - اور اسی نقل و تقلید کی وجہ ہے کہ سینکڑوں ہزاروں لفظ جو بول چال میں آتے ہیں یا مختلف پیشوں اور علوم و فنون سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب میں نہیں پائے جاتے —

ہمارا مقصد اس تبصرے سے قابل مولف کی محنت کی تنقیص کرنا نہیں - ہم ان کی محنت اور خاص کر ان کی ہمت کی داد دیتے ہیں - یہ دو چار باتیں صرف اس لیے لکھہ دی گئی ہیں کہ اگر مناسب خیال کریں تو آیندہ اوراق میں اس کا خیال رکھیں -

قابل مولف نے یہ اہتمام کیا ہے کہ بالالتزام ہر مہینے ایک حصہ شائع کیا جائے اور تیس مہینوں میں کتاب ختم کردی جائے - اس وقت تک دو حصے شائع ہو چکے ہیں - کاغذ اور چھپائی بہت خوب ہے - البتہ اعراب دینے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت پائی جاتی ہے - اعراب کے جو قواعد مقرر کیے گئے ہیں وہ بھی مکمل نہیں ' ان میں ترمیم اور اضافے کی ضرورت ہے —

ترکوں کی اسلامی خدمات

اور
ان کی زبان و ادبیات

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد)

یہ ان تین لکچروں کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر جولیس جرمانس، پروفیسر بداپست یونیورسٹی نے جامعہ عثمانیہ میں دئے تھے۔ پہلے لکچر میں ترکوں کی اسلامی خدمات کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ انہوں نے دو صدی کے اندر اندر وسط یورپ تک نعرۂ توحید کی آواز پہنچادی اور اپنی سلطنت کو دنیا کی بزرگ ترین سلطنتوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ زمانے کے ہاتھوں ان میں زوال کے آثار شروع ہوے جن کے اسباب کے متعلق پروفیسر موصوف نے داد تحقیق دی ہے —

دوسرے اور تیسرے لکچر میں ترکی ادبیات پر نہایت دلاویز پیرایہ میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ترکی ادب بھی کچھہ عرصہ قبل مصنوعی اور تقلیدی تھا۔ اس میں اجتہاد نام کو نہ تھا۔ سب سے پہلے نپولین اعظم کے زمانے میں ترکوں کو فرانس کے انقلابی ادبیات کا علم ہوا جس کی بدولت ان میں بیداری اور احساس پیدا ہوا۔ بقول قابل لکچرار جب نپولین مصر میں پہنچا تو دئی نئی حربی چالوں کے ساتھہ نیا عربی چھاپے خانہ بھی اس کے ساتھہ وہاں داخل ہوا۔ انقلابی خیالات اور یورپی باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات اور احساسات میں بھی حرکت پیدا کی اور جب انہوں نے دیکھا کہ فرانسیسی فوجوں نے یورپ کے صدیوں کے جمے ہوے تخت الٹ کر رکھہ دئے تو مشرق کی کہنہ اور خواب آلود فضا میں بھی انفرادیت، تشکیک اور نئی تحقیق و تلاش کا شوق تیزی کے ساتھہ سرایت کر گیا —

ترکوں کا ادبی احیا فرانسیسی ادب کے اثرات کا رہین منت ہے۔ شروع شروع میں جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے فرانسیسی خیالات و افکار کی اندھی تقلید کی گئی، لیکن کچھہ عرصے بعد ذہنی توازن قایم ہو گیا اور ترکوں

کو ادبی حیثیت سے اپنے گمشدہ وقار قومی کا احساس ہوگیا - اس دور کے شعرا اور ادیبوں میں سنائی ، نامق کمال ، عبدالحق حامد حامی کر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے فرانسیسیت کے گھوڑے اور کے سادہ اپنے وطن اور اپنی زبان کو عظمت کو کبھی فراموش نہیں کیا - عبدالحمیدخاں کے عہد میں توفیق فکرت نے فرانسیسی اسالیب بیان کو ترکی رنگ میں رنگ کر پیش کیا - آہستہ آہستہ ترکی ادب سے اندھی تقلید کی جگہ اجتہاد فکر نے لے لی - چنانچہ خالدضیاء ، ادھم عزت ، رضا توفیق ، محمدعاکف ، یوسف ضیاء اور خالدہ خانم کے نام اس ضمن میں پیش کیے جاسکتے ہیں - ان سبھوں کے ہاں ترکی زندگی کی سچی زندگی آپ کو نظر آے گی —

قابل لکچرار نے موجودہ عہد کے ادبی رجحانات پر بھی سرسری تذکرہ اشارہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ عربی رسم خط کی جگہ لاطینی رسم خط اختیار کرنے سے ترکوں کو کوئی خاص زحمت محسوس نہیں ہو رہی ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے —

ان لکچروں کو مولوی سید وہاج‌الدین صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ موصوف کے اور دوسرے ترجموں کی طرح یہ ترجمہ بھی خوب ہے مطالب کی صفائی اور لطف بیان کو نہایت سلیقے سے ایک دوسرے کے ساتھ سمویا ہے - ترجمہ میں یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ پڑھنے والے پر گراں نہ گذرے اور وہ مطالب و معانی سے اسی طرح لطف اندوز ہو جیسے اصل پڑھ کر ہوتا - اس ترجمے میں بدرجہ اتم یہ خوبی موجود ہے —

(ی)

قسمت اور دوسرے افسانے

(از پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم اے - رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز - لاہور)

یہ سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے - بعض افسانے دلچسپ ہیں ، مثلاً

صحت ، تسلسل ، قسمت اور فریب نگاہ - ان افسانوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر کوئی خاص تصویر حیات نہیں ہے - یہ ضروری نہیں کہ خواہ مخواہ فلسفیانہ مسائل کو اس صنف ادب میں چھیڑا جائے لیکن پھر بھی کم سے کم پڑھنے والوں کو اس مطالبہ کا حق تو حاصل ہے کہ جب انھیں مخاطب کیا جائے تو اُن سے کوئی بات بھی کہی جائے - افسانے کی معنوی خوبیوں میں زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے - ان افسانوں کی زبان میں نہ صرف یہ کہ کوئی خاص لطف نہیں ہے بلکہ زبان و محاورے کی بھی غلطیاں ہیں - مثال کے طور پر چند پیش کی جاتی ہیں :

(۱) " محراب کے پناہ سائے میں چھپ جاتے ہیں " صفحہ ۱۰

(۲) " ممکن ہے کہ میں غلط ہوں " - صفحہ ۱۹

(۳) " یہ شیشی اس نے میرے لیے رکھی ہوئی ہے " - صفحہ ۵۳

(۴) " اس تصویر کا بیان کون کرے گا جو تمام نیلی ہی نیلی تھی " - صفحہ ۶۵

(۵) " اس کا رنگ (آدمی کا) یاس انگیز نیلا تھا " - صفحہ ۶۵

(۶) " اشجار کے مرے مرے ہوئے سائے " - صفحہ ۱۱۸

(۷) " مسعود کے لبوں پر ایک طنزیہ سا تبسم نمودار ہوا " - صفحہ ۷

(۸) " چاروں طرف ایک مہیب چپ مسلط تھی " - صفحہ ۹ -

یہ مثالیں ہم نے تنقیص کی غرض سے نہیں پیش کی ہیں - ہم مصنف کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ افسانہ نگاری میں زبان و محاورے کا پورا لحاظ رکھنا چاہئیے - ویسے تو خشک علمی مضامین میں بھی زبان کا خیال ضرور ہے لیکن بالخصوص ادب میں تو زبان ہی پر سارا دارو مدار ہے —

(ی)

یوسف ہندی قید فرنگ میں

(از محسن بن شہر - مطبوعہ دکن لا ربوٹ مشین پریس - جام باغ حیدرآباد)

اس رسالے میں نہایت محنت سے غالب کی قید کے واقعے کی تحقیق

کی گئی ہے - یادگار غالب میں مولوی حالی مرحوم نے اس کے متعلق تفصیلی معلومات جمع کردی ہیں لیکن بعض باتیں رہ گئی ہیں جو اس رسالے میں بیان کیا گیا ہے - غالب کے فارسی اشعار میں اس زمانے کے قیدیوں کی جو حالت ہوتی تھی اور جو سلوک ان کے ساتھہ روا رکھا جاتا تھا ' اس کی تصویر پیش کی گئی ہے - ترکیب بند اسیری سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حجرے میں غالب رکھے گئے تھے اس پر دو نگہبان متعین رہتے تھے -

لرزد از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطر از کار نہنگم نہ بود
زین دو سرهنگ کہ پیوند بہم می ترسم
بیمے از شیر و هراسم ز پلنگم نہ بود

آخر میں ترکیب بند اسیری پورا نقل کردیا گیا ہے -

ں ا

"انگار"

دس چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا یہ مجموعہ تین مردوں (غالباً نوجوان) اور ایک خاتون کے نام سے نظامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ہے . ۱۳۴ صفحات کی اس مختصر کتاب پر ملک کے بعض اسلامی اخبارات نے اپنے بیسیوں کالم سیاہ کردیے ہیں - اُن کے جوش وخروش و غیض و غضب کی وجہ وہ تحقیر بتائی جاتی ہے جو اس کتاب میں مذہب کے اُس تخیل کی دی گئی ہے جس کو اس زمانے میں ہمارے " مولوی " اور " ملا " پیش کرتے ہیں - ان جراید کی وحشت اور گھبراہٹ کا یہ عالم ہے کہ اُن میں سے بعض نے تو کتاب کو دیکھے اور پڑھے بغیر ہی اس پر سختی کے ساتھہ تبصرہ شروع کردیا ! کہتے جاتے ہیں کہ ہم نے ابھی کتاب دیکھی تو نہیں مگر وہ ہے بہت بری کتاب ! ساتھہ ہی حکومت سے اس دل آزاری کی داد چاہی جاتی ہے جو بقول ان

صاحبان حرایف کے مسلمانوں کی کی گئی ہے - اور سخت اصرار ہے کہ کتاب کو ضبط کیا جاے ' ممنوع الاشاعت قرار دیا جاے اور اس کے مصنفین کو سزائیں دی جائیں - آئندہ جو کچھ بھی ہو حکومت کوئی کار روائی کرے یا نہ کرے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی شدید نکتہ چینی بلا معاوضہ کتاب کو خوب مشتہر کر رہی ہے اور اگر حکومت نے بھی اس کے خلاف کوئی کار روائی کی تو انسداد اشاعت تو کجا ' شاید اس کی اشاعت میں کچھ اور ترقی ہوجائیگی !

بہر حال دیکھنا یہ ہے کہ یہ کتاب کہاں تک اُس " الامان " و " الحفیظ " کی مستوجب ہے جو ہم ہر طرف سن رہے ہیں - ہم نے " انگارے " کے صفحات کو بغور پڑھا ہے - پہلے اس سے کہ ہم اس کتاب کے متعلق توصیف یا تنقیص کا ایک حرف بھی کہیں اتنا تو بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ ان کہانیوں میں سے بعض کا انداز بیان اور طرز نگارش اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی جدت ہے - لیکن اگر ان کہانیوں کی بنیاد کوئی مستقل " تصور " ہوتا اور وہ کسی معین مقصد کو پیش نظر رکھہ کر لکھی گئی ہوتیں تو وہ شاید زیادہ قابل بحث اور مفید ہوتیں - موجودہ حالت میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کے لکھنے والوں کے پیش نظر کوئی مستقل " تصور " اور کوئی گہرا " مطالعہ " نہ تھا - بلکہ یہ سب جذبات کے بعض اضطراری ' منتشر اور غیر منظم کیفیات کے چند بے اختیار مظاہرے معلوم ہوتے ہیں جس کے ٹکڑے پرزے وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور اب یکجا سمیٹ کر چھاپ دئے گئے ہیں ! گویا حیات و نفسیات کا یہ ایک بے ترتیب " اثر " ہے جس کے مختلف گوشوں میں تیز و تند و تلخ جذبات بکھرے ہوے ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ " انگارے " کسی بڑے آتش فشاں کے دہانے سے اڑکر دور جا پڑے ہیں - ان چند انگاروں کا تجزیہ کرنے اور انگاروں کے جواب میں انگارے برسانے کے بجاے ہم کو اس آتش فشاں کا پتہ چلانا چاہئیے ' جس کی یہ چند چنگاریاں ہیں ! ان صفحات کے عام انتشار میں چند چیزیں نمایاں ہیں :

(۱) " مولویت " اور مولویوں کی نفسیات پر ایک تحقیر آمیز تبصرہ -

(۲) مذہب و عقل کی بحث۔
(۳) سرمایہ دار و مزدور کی آویزش اور دولت کی غیر مساوی تقسیم۔
(۴) مرد کی نظر میں عورت کی حیثیت۔
(۵) آزادی فطرت پر تمدن جدید کی پابندیاں۔

ہم ہر کہانی سے چند ایسے نمونے اخذ کرکے پیش کئے دیتے ہیں' جن سے نہ صرف طرز بیان اور جذبات کی قوت کا کافی اظہار ہوسکے بلکہ بعض نکات و اشارت بھی کسی قدر واضح ہوجائیں —

پہلی کہانی " نیند نہیں آتی " کے عنوان سے بے قید اور بے تکان اردو نگاری کا ایک نیا نمونہ ہے - ایک شخص رات کی تنہائی میں کچھہ سوتا کچھہ جاگتا' اپنے خیالات و تصورات میں غلطاں و پیچاں ہے' اس کو کبھی دوستوں کی بے اعتنائی کا خیال آتا ہے' کبھی وہ اپنی تنگدستی اور اپنی بیوی کی تکالیف کا خیال کرکے بیچین ہوتا ہے' کبھی سوچتا ہے کہ جو لوگ اس کی بیوی کی تحقیر کرتے ہیں ان کو جان سے مار ڈالے۔ اُس کرب کی حالت میں کبھی دوزخ کا تصور سامنے آتا ہے' کبھی فرشتے نظر آتے ہیں' کبھی دوزخ اور فرشتوں کے اس مرکب میں کہیں سے سنی جان طوائف جھانکنے لگتی ہیں۔ غرض یہ کہ دماغ کی منتشر فضا میں یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اڑتے پھرتے ہیں اور جس طرح وہ نقوش رات کی تاریکی میں دماغ کے پردے پر نظر آتے رہے بجنسہ اسی طرح' کہنے والے نے کوشش کی ہے کہ وہ تاثرات قلم کے ذریعے سے کاغذ پر منتقل ہوجائیں —

دوستوں کی دنیاداری کا عکس ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :—

" بڑا میرا دوست بنتا ہے' جب ملاقات ہوئی' آئیے اکبر بھائی! آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ ہیں - ہیں - ہیں - کچھہ تازہ کلام سنائیے ... لیجئے سگریٹ نوش فرمائیے' مگر شعر سمجھتا ہے' خوب سمجھتا ہے ...... وہ دوسرا الو کا پٹھا تو بالکل خردماغ ہے۔اخاہ! آج تو آپ نئی اچکن پہنے ہیں' نئی اچکن پہنے ہیں ...... تیرے باپ کا کیا بگڑتا ہے جو میں نئی اچکن پہنے ہوں - تو چاہتا ہے کہ بس ایک تیرے ہی پاس نئی اچکن ہو' اور شعر سمجھنا تو ہر کنار صحیح پڑھ

بھی نہیں سکتا ' ناک میں دم کردیتا ھے - بیہودہ بد تمیز کہیں کا ! مگر بڑا بھائی ' میرا دوست بنتا ھے ' ایسوں کی دوستی کیا ' میری باتوں سے اس کا دل بھل جاتا ھے ' بس یہی دوستی ھے ' مفت کا مصاحب ملا - چلو مزے ھیں ......
خدا سب کچھہ کرے ' غریب نہ کرے ' دوسروں کی خوشامد کرتے کرتے زبان گھس جاتی ھے اور وہ ھیں کہ چار پیسے جو جیب میں ھم سے زیادہ ھیں تو مزاج ھی نہیں ملتے - میں نے آخر کہہ دیا کہ میں نوکر ھوں ' کوئی آپ کا غلام نہیں ھوں ' تو کیا آنکھیں نکال کرلگا مجھے دیکھنے - بس جی میں آیا کہ کان پکڑ کے ایک چانٹا رسید کروں ' سالے کا مزاج درست ھوجائے .... "
بیوی اور دوزخ اور منی جان ' سب کے سب آگے پیچھے ' چلے آتے ھیں :—
" میری جان ' مگر تم تو میری جان سے زیادہ عزیز ھو ... چلو ھٹو ' بس رھنے بھی دو ' تمھاری میٹھی میٹھی باتوں کا مزہ خوب چکھہ چکی ھوں ... کیوں ' کیا ھوا کیا ؟ ...... ھوا کیا ؟ - مجھہ سے یہ بے عزتی نہیں سہی جاتی - تم جانتے ھو کہ دن بھر لونڈی کی طرح سے میں کام کرتی ھوں ' بلکہ لونڈی سے بدتر ' جب سے میں اس گھر میں آئی ھوں کسی خدمت گارن کو ایک مہینے سے زیادہ ٹکتے نہ دیکھا - مجھے سال بھر سے زیادہ ھوگیا اور کبھی جو ذرا دم لینے کی فرصت ملی ھو - اکبر کی دولہن یہ کرو ' اکبر کی دولہن وہ کرو ...... ارے ' ارے کیا ھوا کیا ' تم نے تو پھر رونا شروع کردیا ...... میں تمھارے ھاتھہ جوڑتی ھوں ' مجھے یہاں سے کہیں دور لےجاکر رکھو ...... میں شریف زادی ھوں ' سب کچھہ تو سہ لیا - اب مجھہ سے گالی برداشت نہ ھوگی - گالی ! گالی ! معلوم نہیں کیا گالی دی ' میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں - یااللہ ! یااللہ ! اُس بیگم کمبخت کا گلا اور میرا ھاتھہ ' اُس کی آنکھیں

نکل پڑیں ' زبان باہر لٹکنے لگی ... خس کم جہاں پاک ... خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو ' قصور ہوا ' معاف کردو ' اکبر میں نے تمھارے ساتھ احسان بھی کئے ہیں ...... احسان تو ضرور کئے ہیں ۔ احسانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں ' مگر اب تمھارا وقت آگیا ۔ کیا سمجھ کے میری بیوی کو گالیاں دی تھیں ؟ بس ختم ! آخری دعا مانگ لو '! گلا گھونٹنے سے سر کاٹنا بہتر ہے ' بالوں کو پکڑ کر کٹا ہوا سر اٹھانا ' زبان ایک طرف کو نکلی پڑرہی ہے' خون ٹپک رہا ہے ' آنکھیں گھور رہی ہیں ...... یا اللہ ! آخر مجھے کیا ہوگیا ؟ خون کا سمندر ! میں خون کے سمندر میں ڈوبا جارہا ہوں ۔ چاروں طرف سے لال لال گولے میری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں ۔ وہ آیا ! وہ آیا ! ایک دو تین ۔ سب میرے سر پر پھٹیں گے ... کہیں یہ دوزخ تو نہیں ؟ مگر یہ تو گولے ہیں ۔ آگ کے شعلے نہیں ... میرے تن بدن میں آگ لگ گئی : میرے رونگٹے جل رہے ہیں ' دوڑو ارے دوڑو ! خدا کے لیے دوڑو ! میری مدد کرو ' میں جلا جارہا ہوں ' میرے سر کے بال جلنے لگے ۔ پانی ! پانی ! کوئی سنتا کیوں نہیں ؟ خدا کے واسطے میرے سر پر پانی ڈالو ! کیا ؟ ان جلتے ہوے انگاروں پر سے مجھے ننگے پیر چلنا پڑیگا ؟ کیا میری آنکھوں میں دہکتے ہوے لوہے کی سلاخیں ڈالی جائیں گی ؟ کیا مجھے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملیگا ؟ کیا ' کیا ' کیا ؟ مجھے پیپ کھانا پڑیگی ؟ یہ شعلے میری طرف کیوں بڑھے چلے آرہے ہیں ؟ یہ شعلے ہیں یا نیزے ہیں ؟ آگ کے نیزے ! ....

یہ کون آرہا ہے میرے سامنے ؟ ارے معاذاللہ ! سانپ چمٹے ہوے ہیں اس کی گردن میں ...... اس کے پستان کو کاٹ رہے ہیں ...... اے حضور ! آداب عرض ہے ! اے حضور ! بھول گئے ہم غریبوں کو ؟ میں ہوں منی جان ! کوئی ٹھمری ۔ کوئی دادرا کوئی غزل ! اے ہے ۔ تو آپ جیسے ڈرے جاتے ہیں ۔ حضور ! یہ سانپ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے ......"

اس کے بعد منی جان اپنے "پیغمبر صاحب" کے سامنے پیش ہونے کا ذکر کرتی ہیں اور مصنف نے اس سلسلے میں بعض اشارات منی جان سے ان خیالات کے جانب کرائے ہیں جو مذہب کے تخیلات سے آزاد رہنے والے لوگ رکھتے ہیں - در حقیقت کہانی کا یہ ٹکڑا عصمت فروش عورت کے خیالات کا ایک عکس ہے - وہ جہنم کے سانپوں سے اکبر کے دل کا ڈوت نکالنے کی کوشش کرتی ہے —

"مجھے دو ایسے سانپ ملے جو بس میرے پستان چاٹا کرتے ہیں، سچ پوچھئے تو حضور، اس میں تکلیف کچھ نہیں اور مزا ہی ہے .... مگر آپ مجھ سے ڈرے جاتے ہیں، اکبر صاحب، اے حضور، اکبر صاحب، کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل ——"

پھر مذہب کے متعلق بازاری عورت کی اس بے پروائی کے ساتھ ہی ساتھ کسی طرف سے ایک دیندار مسلمان کی آواز بھی آتی ہے —

"یا اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا، تو ارحم‌الراحمین ہے، میں تیرا ناچیز گناہگار بندہ ترے سامنے دست بدعا ہوں ——"

طوائف اور دیندار کے درمیان جو فصل ہے، اس میں مصنف گویا خود اپنے اور اپنے ہم خیالوں کے محسوسات کا ایک عکس پیش کرتا ہے - اس کا نقطۂ نظر، دنیا کا عام نقطۂ نظر ہے، ہر چیز کا فیصلہ آخر دو و متھی آنے پر ہوتا ہے! زندگی کی اقتصادی مشکلات کا ہجوم مصنف کے تمام دوسرے مباحث پر حاوی ہے:

"میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں، کروں تو کیا کروں، بھوکا مروں؟ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، اس پر ایک کھوپڑی کھٹ کھٹ کرتی سڑک پر چلی جارہی ہے! اکبر صاحب، آپ کے جسم کا گوشت کیا ہوا؟ اپ کا چمڑا کدھر گیا؟ جی ہاں! میں بھوکا مر رہا ہوں، گوشت اپنا میں نے گدھوں کو کھلا دیا - چمڑے کے طبلے بنوا کر بی منی جان کو تحفہ دیدئیے، کہئیے کیا خوب سوجھی! آپ کو رشک آتا ہو تو بسم‌اللہ میری پیروی کیجئیے، میں کسی کی پیروی نہیں کرتا، میں آزاد ہوں، ہوا کی طرح

ہے ! آزادی کی آج کل اچھی ہوا چلی ہے - پیٹ میں آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ہیں کے آزادی کے چکر میں ہیں ' موت یا آزادی ! نہ مجھے موت پسند نہ آزادی ' کوئی میرا پیٹ بھردے ! .... پن پن پن ' چت ' ھت تیری مچھر کی ... تن تن تن

" کوئی میرا پیٹ بھردے " اس کہانی میں لکھنے والے کی اصلی صدا یہی ہے - زندگی کے تمام مشکل مسایل کا عطر اور خلاصہ یہی آواز ہے - یہی صدا ہے جو مذہب ' تہذیب اور آزادی کا دشمن بنا دیتی ہے - خالی پیٹ ہی دنیا میں انقلاب پسند ' کمیونسٹ ' سو شلسٹ ' بولشویک ' نہلسٹ ' پیدا کرتا ہے ' تہذیب و تمدن ایک طرف ' اور مذہب کا تخیل دوسری طرف : دونوں پیٹ کے اس مرض کا علاج کرنے سے لاچار ہیں ' دنیا کی نئی نسلیں بقدر اپنی سمجھ کے اس بلا سے نکلنے کے راستے ڈھونڈھ رہی ہیں - مصنف نے اس اہم مسئلے کو اپنے قلم سے چھو کر خو ا ب کی حالت میں بیداری کی ایک بات کہی ہے —

دوسری کہانی " جنت کی بشارت ' ہے جس میں " مولویت " کے اس فریب تقدس کی طرف بیباکانہ اشارے کئے گئے ہیں جس کا بہت گہرا تعلق شیرمال اور پلاؤ سے بھرے ہوے معدوں کے ساتھہ ہوتا ہے ! مولانا داؤد کی داستان کوئی نئی داستان نہیں ہے جو بیان کی گئی ہو ' لیکن اس داستان کا دوسرا پہلو ' یعنی خود لکھنے والے اور بیان کرنے والے کے تاثرات ' ایک قابل غور پہلو ہے ' سید سجاد ظہیر صاحب ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہیں ' جنھوں نے غالباً اس کہانی میں ان کیفیات کا نقشہ کھینچا ہے جو " مولویت " کے متعلق اس ملک میں ان پر اور ان کے ہم خیالوں پر طاری ہیں - " مولوی داؤد " صاحب لیلۃالقدر میں ' عبادت کرتے کرتے پلاؤ اور کھیر سے بھرے ہوے معدے کے بخارات سے مغلوب ہوکر دعائیں پڑھتے پڑھتے سوجاتے ہیں - ان کے فانی جسم و دماغ نے اس رات بھی انسانی کمزوریوں سے شکست کھائی ہے اور اب عالم خواب میں وہ بہت بلند مقامات طے کر رہے ہیں :

" پہلے تو ان پر نیند کی گم شدگی طاری رہی ' اس کے بعد

انھوں نے یکایک محسوس کیا کہ وہ اکیلے تن تنہا ایک تاریک میدان میں کھڑے ہوے ہیں اور خوف سے کانپ رہے ہیں - تھوڑی دیر کے بعد یہ اندھیرا روشنی سے بدلنے لگا اور کسی نے اُن کے پہلو سے کہا " سجدہ کر ! تو بارگاہ باری تعالی میں ہے - کہنے کی دیر تھی کہ مولوی سجدے میں گر پڑا اور ایک دل ہلا دینے والی آواز بادل کی گرج کی طرح چاروں طرف گونجتی ہوئی مولوی کے کان تک آئی " میرے بندے ہم تجھہ سے خوش ہیں ، تو ہماری اطاعت میں تمام زندگی اس قدر محو رہا کہ کبھی تو نے اپنی عقل اور اپنے خیال کو جنبش تک نہ دی ، جو دونوں شیطانی طاقتیں ہیں اور کمزوراعتقاد کی جڑ ہیں ، انسانی سمجھہ ایمان و اعتقاد کی دشمن ہے جو اس راز کو خوب سمجھا اور تو نے کبھی نور ایمان کو عقل کی زنگ سے تاریک نہ ہونے دیا - تیرا انعام جنت ابدی ہے جس میں تیری خواہش پوری کی جائے گی " —

ان الفاظ میں ایک کھلا ہوا اشارہ مذہب کے ٹھیکہ داروں کی اُس تاریک ذہنیت کی طرف ہے جو آج عقل اور مذہب کے تمدیل کے درمیان ایک سخت کشمکش کا باعث ہورہی ہے اسی کشمکش سے وہ انکارے پیدا ہوتے ہیں جو زیر بحث ہیں - نئی نسل کا یہ استہزا درحقیقت مولوی کی اُس مذہبیت پر ہے جس کی بہت ہی بھدی تصویر " مولوی ، سائنس اور علوم کی ترقیوں کے مقابلے میں پیش کیا کرتا ہے —

داستاں گو کا " مولوی " جنت میں داخل ہوتا ہے اور وہاں جو کچھہ دیکھتا ہے وہ وہی ہے جس کے نقوش پہلے سے اُس کے دل و دماغ پر ثبت ہیں - وہ جنت کو اپنے ادنیٰ انسانی خواہشات و جذبات کی روشنی میں دیکھتا ہے - وہ دیکھتا ہے کہ جنت کی بارہ دری کے ہر دروازے پر ایک حور کھڑی ہے —

" مولانا جس طرف نظر پھیرتے حوریں ان کی طرف دیکھہ کر مسکرادیں اور دل آویز اشارے کرتیں - مگر مولانا جھینپ کر آنکھیں جھکا لیتے ، دنیا کا مہذب زاہد اس لیے سرمندہ تھا کہ یہ سب

کی سب حوریں سر سے پیر تک برہنہ تھیں - دفعتاً "مولانا"
نے اپنے جسم پر جو نظر ڈالی تو وہ خود بھی اُسی نورانی جامہ
میں تھے! گھبرا کر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ھنس
تو نہیں رہا ھے - مگر سوائے ان حوروں کے اور کوئی بھی نظر نہ
آیا - دنیا کی شرم گو کہ بالکل غایب نہیں ھوئی تھی لیکن اُس
کے وجود کی سب سے بڑی وجہ یعنی اغیار کا طنز و تمسخر
جنت میں کہیں نام کو بھی نہ تھا - مولانا کی گھبراھٹ کم
ھوئی، ان کی رگوں میں جوانی کا خون از سر نو دوڑ رھا تھا،
وہ جوانی جس کا زوال نہیں -"

اب "مولانا" آگے بڑھتے ھیں، اور ھر حور کو فرداً فرداً بغور دیکھتے ھیں :

"آخر کار ایک حور کی پیاری ادا نے "مولانا" کا دل موہ لیا،
وہ فوراً اچک کر اس کے حجرے میں داخل ھوے اور اُسے بیساختہ
اپنے سینے سے لگا لیا - ابھی لب سے لب ملے ھی تھے کہ پیچھے
سے قہقہہ کی آواز آئی، اس بے موقع ھنسی پر مولانا کے غصے کی
کوئی انتہا نہ رھی، ان کی آنکھ کھل گئی، سورج نکل آیا تھا،
مولانا جانماز پر پیٹ کے بل پڑے ھوئے قران کریم کو سینے سے
لگائے تھے - ان کی بیوی پہلو میں کھڑی ھنس رھی تھیں ......"

مشکل یہ ھوگئی ھے کہ مولویت کی تنقیص کو خاص مذھب کی تنقیص سمجھا جاتا ھے - حالانکہ وکیل اور جج پر نکتہ چینی قانون پر نکتہ چینی کے مرادف نہیں ھے مذھب کے جو نمائندے آج جانشینی پیغمبر کے مدعی ھیں ان میں سے بہت سے انسانیت اور بشریت کے بہت ھی برے نمونے اس نسل انسانی کے سامنے پیش کر رھے ھیں جو عہد حاضر کی کشمکش سے متاثر ھوکر انسانی زندگی میں امن و سکون پیدا کرنے کے راستے ڈھونڈھ رھی ھے اور یہ سمجھتی ھے کہ دنیا اور دین کے سرمایہ داروں نے انسانی زندگی کے توازن کو اتنا خراب کر دیا ھے کہ جب تک اِن اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کی بیخ کنی نہ کی جائے گی زندگی کا بہتر نظم قایم ھونا مشکل ھے - ایسے خیالات رکھنے والی نسلوں کو مردود و ملعون بتاکر ان کی تحریکات کو روکنا مشکل ھی نہیں بلکہ محال ھے - اگر فی الواقعہ ان تحریکات میں کوئی عنصر اخلاق و تمدن انسانی کی تخریب

کا موجود ہے تو اس کی اصلاح کے لیے ایک نئی "مولویت" اور ایک نئی قسم کی "مولانائیت" در کار ہے - اِن پرانی بوتلوں میں یہ نئی شراب سما نہیں سکتی! "انگارے" کو بحق سرکار ضبط کیا جا سکتا ہے مگر "انگارے" کی حدت و حرارت کو کوئی قانون بھی ضبط نہیں کر سکتا - اس آگ پر اچھے اور برے دونوں قسم کے کھانے پک سکتے ہیں - باورچی اپنی قابلیت اور اہلیت سے جو کام لے وہی یہ آگ اُس کو دے گی!

تیسری کہانی "گرمیوں کی رات" افسانہ نگاری کا کوئی غیر معمولی نمونہ نہیں ہے - اس کا مقصد غالباً دولت وثروت کی غیر مساوی تقسیم پر توجہ دلانا ہے —

چوتھی کہانی "دلاری" عورت کے متعلق مرد کی حیوانیت کے خلاف ایک قوی احتجاج ہے - "دلاری" شریفوں کے گھرانے کے ایک لونڈی تھی - اسی گھر کے صاحبزادے میاں کاظم تھے جنہوں نے "دلاری" کی دو شیزگی کو اپنے نفس کی خواہشات پر قربان کردیا تھا - ایک سال تک وہ اس لونڈی کی نسوانیت سے لطف اندوز ہوتے رہے ' ایک سال بعد میاں کاظم کی شادی ہوگئی - شادی کے ہنگامے میں یکایک "دلاری" بھاگ گئی ' اور آخر چند ماہ بعد سربازار عصمت فروشی کرنے لگی - مگر ایک بڈھے ملازم کے کہنے سننے سے متاثر ہو کر وہ پھر اس پیشے کو ترک کر کے واپس آگئی - اس کی واپسی نے گھر کے مختلف افراد کے قلوب میں جو مختلف جذبات پیدا کیے ان کی تصویر بہت دلچسپ طریقے پر کھینچی گئی ہے:

> دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھل بلی ڈال دی- وہ گردن جھکائے سر سے پیر تک ایک سفید چادر اوڑھے پریشان صورت اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جاکر زمین پر بیٹھ گئی"

یہ تو دلاری کی پشیمانی کا حال تھا - اب گھر کے مالک ناظم علی صاحب تشریف لاتے ہیں اور دلاری پر ایک غلط انداز نظر ڈالتے ہوے اور یہ کہتے ہوے گذر جاتے ہیں:

"بے وقوف اب ایسی حرکت نہ کرنا" —

چھوٹی صاحبزادی ' جو بچپن میں برسوں دلاری کے ساتھ کھیلی ہیں تشریف لاتی ہیں مگر زیادہ قریب آنا پسند نہیں فرماتیں ' وہ فرماتی ہیں:

" یہ تو نے کیا کیا "۔

" دلاری " گردن اٹھا کر دبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنے بچپن کے ہمجولی کو دیکھتی ہے اور پھر سر جھکا لیتی ہے ، کہتی کچھہ نہیں —

اب گھر کی بیگم صاحبہ اس طرف رخ کرتی ہیں اور اس طرح برس پڑتی ہیں :

" بے حیا ! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ ، مگر منہ کالا کر کے ! سارا زمانہ تجھہ پر تھوڑی تھوڑی کرتا ہے ، برے فعل کا یہی انجام ہے ! "

طنطنۂ شرافت ، اور افتخار نسل و خون اس گری ہوئی عورت سے بہت بالمد ہو کر اُس کو حقارت کے ساتھہ ٹھکراتا ہے !

" اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے ۔ ایک نحس ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھہ کر سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے ۔ مردار خوار گدھ کب سمجھتے ہیں کہ جس بیکس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں مارتے ہیں وہ بے جان ہونے کے باوجود بھی ان کے ایسے زندوں سے بہتر ہے " ۔

آخر میں خود کاظم صاحب اپنی دلہن کو لیے ہوئے کمرے سے نکلتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کو اس طرح جھڑکتے ہیں :

امی ، خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلا چھوڑ دیجیے ، وہ کافی سزا پاچکی ہے ، آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو رہی ہے

گویا قاتل خود مقتول سے ، اپنی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے ، قصاب بکری کو ذبح کرنے کے بعد اس کے حال زار پر کف افسوس ملتا ہے ! ان " شرفا " کی زبانوں سے جو زخم دلاری کے وجود معنوی پر لگ رہے تھے ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ زخم تھا جو خود کاظم میاں کی ہمدردی نے لگایا —

" لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لا سکی اس کی ۔ آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم رات کی تنہائی میں یکجا ہوتے تھے ، جب اس کے کان پیار کے الفاظ سننے کے عادی تھے

کاظم کی شادی اُس کے سینے میں نشتر کے طرح چبھی تھی - اسی خلش اسی بیدلی نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اب یہ حالت ہے کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگی ! اس روحانی کوفت نے دلاری کو اُس وقت انسانی حمیت کا مجسمہ بنا دیا - وہ اُٹھہ کھڑی ہوئی اور اُس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کرکے سب نے ہنسنا شروع کردیا - مگر یہ ایک مجروح پر شکستہ چڑیا کی طرح پرواز کی آخری کوشش تھی - اُس دن رات کو وہ پھر غائب ہوگئی - "

کاظم اور دلاری کی کہانی ہمارے بہت سے گھروں کی کہانی اور ہماری اُن ہزاروں بہنوں کی داستان غم ہے جن کو مردوں کی نفس پرستی نے دکان پر بٹھا دیا ہے !

پانچویں کہانی " پھر یہ ہنگامہ " منتشر خیالات کا ایک کشکول ہے جس میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ " انسانیت کسے کہتے ہیں " ؟ لیکن اس سوال کا جواب ملنے کے بجائے بحث اسی پر ختم ہوگئی کہ حیوانیت کسے کہتے ہیں - انسانی زندگی کے چند تکلیف دہ اور عبرت انگیز حقائق کی طرف جو اشارے کیے گئے ہیں وہ محض سر راہ ہیں ، اُن اشاروں کی صحیح سمت بھی مشکل سے سمجھہ میں آتی ہے - نیز انسانی زندگی کے سیاہ و سفید کو بالمقابل پیش کرنے کی کوشش بھی کچھہ زیادہ کامیاب نہیں ہے —

" برسات میں بادل کی گرج اور پہاڑوں کے تنہائی میں ایک چشمے کے بہنے کی آواز لہلہاتے ہوے شاداب کھیت اور بندوق کے فیر کی تڑاقے دار صدا - اس کے بعد ایک زخمی سارس کی دردناک قائیں قائیں "

کپڑے پر رنگ کے چھینٹے دیے گئے ہیں ، تصویر نہ بن سکی - سرمایہ داروں کی طرف اشارہ ہے :

" چاروں طرف سانپ رینگ رہے ہیں ، کالے کالے ، لمبے لمبے ، پھن اُٹھا کر جھوم رہے ہیں ، اُن کو کون مارے ؟ کس چیز سے ماریں ؟ "

لکھنے والا اپنے مضمون سے الجھہ رہا ہے ' اس کی طبعیت الجھہ رہی ہے ' اور ہر سطر میں یہ الجھاو موجود ہے —

چھٹی کہانی " بادل نہیں آتے " شوہر اور بیوی کی باہم زندگی کے بہت سے حقائق سے پردے - لیکن زور قلم جائز حدود سے بہت آگے نکل گیا ہے ' طرز بیان کثیف ہے ' واقعات کی گندگی کو واضح کرنے کے لیے گندے الفظ استعمال کیے گئے ہیں ' الفاظ کی گندگی نے ساری حکایت کو گندہ کردیا ہے - دنیا میں الفاظ کا اعتدال اور ان کی خوبصورتی ہر تحریک اور ہر بحث کی جان ہے - بہتر سے بہتر تحریکیں زبان کی گندگی کے وجہ سے کمزور ہو جاتی ہیں ' کہانی کا مفہوم ضروری ہے ' موضوع بھی ضروری اور قابل توجہ ہے لیکن طرز بیان بھدا اور گندہ ہے - کہنے کو تھوڑا کہنے کی ضرورت نہ تھی - بغیر اس کے بھی ہر بات صاف صاف کہی جاسکتی تھی - اعلی جذبات سے اپیل کرنے کے لیے وہ الفاظ کیوں استعمال کیے جائیں جو مذاق لطیف پر گراں گذریں - یہ کہانی وقایع نگاری اور صاف گوئی کی بدهضمی ہے - اس قابل بھی نہیں کہ ہم نکتہ چین کی حیثیت سے اس کے اقتباسات پیش کرسکیں - افسوس ہے کہ اس کہانی کو اس مجموعے میں شامل کیا گیا —

ساتویں کہانی " مہاوٹوں کی ایک رات " زندگی کی غیر مساوی بخششوں کا شکوہ ہے - انداز بیان میں کوئی خاص جدت یا خوبی نہیں - ایک مفلس عورت ایک ٹوٹے ہوے مکان میں اپنے بچوں کو لیے پڑی ہے ' رات کا وقت ہے ' شدت کے ساتھہ بارش ہو رہی ہے ' بچے ڈر رہے ہیں ' ماں اُن کو تسکین دے رہی ہے - مگر اُس کے دل میں مختلف اور متضاد خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں - آپ صرف یہ کہہ کہہ کر کہ اس عورت کا ایمان ضعیف ہے وہ لا مذهب ہے ' وہ خدا پر بھروسہ نہیں کرتی اُس عورت کی تکلیف کو تو کم نہیں کرسکتے - مذهب کے نمایندوں کا دعوی ہے کہ مذهب انسانی زندگی کو پرامن بناتا ہے ' اگر کوئی مصیبت زدہ اس دعوی کو قبول کرنے سے انکار کرے تو پھر گلے کی رگیں پھلا کر اور منہ سے جھاگ اُڑا کر اس کی ذهنی دماغی اور روحانی خستہ حالی کا مداوا نہیں کیا جاسکتا - اُس عورت کے دل کو دیکھئے کہ

وہ کیا کہہ رہی ہے :

" یا اللہ ! رحم کر ! خدا غریبوں کے ساتھہ ہوتا ہے ' اُن کی مدد کرتا ہے ' اُن کی آہ کو سن لیتا ہے ' کیا میں غریب نہیں ؟ خدا سنتا کیوں نہیں ؟ ہے بھی یا نہیں ؟ آخر ہے کیا ؟ جو کچھہ بھی ہے بڑا جلاد ہے اور پھر بڑا بے انصاف ! کیوں امیر کیوں ؟ کوئی غریب کیوں ؟ اُس کی حکمت ہے ! اچھی حکمت ہے ؟ کوئی جاڑے میں اینٹھے ' لیٹنے کو پلنگ تک نہ ہوں ' سردی کھائیں ' بارشیں سہیں فاقے کریں اور موت بھی نہ آئے - کوئی ہیں لاکھوں والے ' ہر قسم کا سامان ہے کسی بات کی تکلیف نہیں ' اگر وہ تھوڑا سا ہم کو دیدیں تو اُن کا کیا جائیگا ؟ غریبوں کی جانیں پل جائیں گی ' لیکن اُن کو کیا پڑی - کس کی بکری اور کون ڈالے گھانس - ہم کو بنایا کس نے ؟ اللہ نے ! تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا ؟ کس لیے بنایا ' رنج سہنے اور مصیبت اُٹھانے کے لیے ؟ ارے کیا انصاف ہے ؟ وہ کیوں امیر ہیں ' ہم کیوں نہیں ؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے گا ' مولوی تو یہی کہتے ہیں عاقبت کس کی ؟ بھاڑ میں جائے عاقبت تکلیف تو اب ہے ضرورت تو اب ہے بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہے اور دوا دو برس بعد ملے گی ؟ باز آے ایسی عاقبت سے ' جب کی جب بھگت لیں گے ' اب تو کچھہ ہو ! خدا ؟ محض ایک بہانہ ایک دھوکا ہے - غربت میں غریب رہنے کی تسلی ' مصیبت میں تکلیف سے قانع رہنے کا ذریعہ ' خدا ؟ صرف ایک دھوکے کی ٹٹی ! اور مذہب ہے کہ وہ بھی یہی سکھاتا ہے ' یہی پڑھاتا ہے ... ... آگے بڑھتے ہوؤں ' اوپر چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے ' ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے ' غریب رہو ' غربت ہی میں خدا ہے ! ہم نے تو پایا نہیں ! امیروں سے کیوں نہیں روپیہ دلوا دیتا ؟ دولت کا کیا ہوگا ؟ صرف اتنا چاہئے کہ اوقات بسر ہو جاے ! ... ... "

اس الجھیتے کو جو عہد جدید کی علمی اور عقلی ترقیوں کا لازمی نتیجہ ہے ' محض کفر و الحاد کہہ کر ٹال دینا بے سود ہے - سوال تو یہ ہے کہ سلجھایا کیونکر جاے ؟ جو لوگ " انکارے " کے خلاف آمادۂ جہاد ہیں وہ درخت کی شاخوں میں الجھے رہنے کے بجاے جڑ ' اور بنیاد پر توجہ کریں —

آٹھویں کہانی " دلی کی سیر " کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتی ' البتہ نویں کہانی " پردے کے پیچھے " ایک ایکٹ کا ایک ڈرامہ ہے جس میں مسلمان گھر کی اندرونی زندگی کے چند تکلیف دہ حقایق کو بے نقاب کیا گیا ہے - اولاد کی کثرت ' بیوی کی صحت سے نفس پرست شوہروں کی بے پروائی بوڑھے مردوں کی جوان عورتوں سے شادی ' تعدد ازدواج ' سوکن کا جلاپہ اور اسی قسم کے مسائل پر مختصراً بحث کی گئی ہے - لیکن کہیں کہیں تفصیلات میں ضرورت سے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے جس نے طرز بیان کی لطافت کو کثافت سے بدل دیا ہے - مثلاً آفتاب سوال کرتی ہیں "اے ہاں ہم نے تو سنا تھا ' تم نے کچھ ایسا کروالیا ہے کہ اب تمہارے یہاں بچے نہ ہوں گے " اور محمدی جواب میں اپنے اندرونی مرض کے وہ تفصیلات بیان کرنے لگتی ہیں ' جن کو شاید کوئی ڈاکٹر اور طبیب بھی اس قدر تفصیل سے بیان کرنا پسند نہ کرے گا - اس قسم کی تشریحات کا متحمل انکارے کے صفحات کو نہ ہونا چاہئے تھا - بغیر ان تشریحات کے بھی بحث کی قوت کم نہ ہوتی - آخری کہانی " جواں مردی ' ہے - وہ بھی زیادہ تر زن و شو کے تعلقات پر ایک تبصرہ ہے - طرز بیان فی الجملہ برا نہیں لیکن شروع کی کہانیوں میں جو روانی اور جدت ہے وہ دو چار کہانیوں کے بعد باقی نہیں رہی - بعض اجزا تو بھرتی کے معلوم ہوتے ہیں - اور بعض غیر ضروری ' بعض کثیف اور گندہ اور بعض بھدے اور غیر متناسب - زبان کا معیار بھی کچھ بلند نہیں محاورے اور اصطلاح کی غلطیاں اور کتابت کی خامیاں بھی کم نہیں ہیں —

یہ ہے انکارے کی ہیئت مجموعی - اس کے خلاف بعض حلقوں میں جو جہاد شروع کیا گیا ہے وہ درحقیقت ایک کھسیانا پن ہے - وہ طبیب ضرور بیوقوف ہے جو مرض کے اسباب تو دریافت نہ کرے اور بخار کی حدت کو

کم کرنے کی کوشش میں اپنی دوائیں اور نسخے ضایع کرتا رہے ۔ ہندوستان کی نئی نسلوں کے دل میں بے چینی اور بے اطمینانی کا جو بیج جم رہا ہے اُس کے قدرتی مظاہرات پر نکتہ چینی اور اظہار غم و غصہ فضول ہے ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ان مظاہرات کی سطح کے نیچے کون سی قوت کام کررہی ہے اور اُس قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ لوگ ظاہری لباس کو معیوب سمجھ کر پھاڑتے اور نوچتے ہیں مگر اصلی روح کو جو جسم کے اندر متحرک ہے تسکین دینے کی کوئی صورت پیدا نہیں کرتے ۔ اس میں شک نہیں کہ " انگارے " کے صفحات پر مذہبی عقائد ' خدا کے وجود اور موجودہ نظم زندگی کا حقارت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور غالباً مصنفین کا اصلی منشا بھی یہی ہے کہ دیرینہ نظم زندگی کے خلاف احتجاج کرکے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کریں ۔ بے سونچے سمجھے اُن کے خیالات کو مستوجب سزا قرار دینا محض بے نتیجہ ہے ۔ وہ قوت جو سطح کے نیچے اور طبایع کے اندر کام کررہی ہے کافر و ملعون کی صداؤں سے مرعوب و متاثر نہیں ہوا کرتی ۔ اُس کو پہلے اچھی طرح سمجھ لینا ہے ' اور اُس کے ساتھ ہمدردی اور شرکت عمل کا پہلو اختیار کرکے ' ایک ایسی سطح پیدا کرنی ہے جس پر قدیم و جدید مل سکیں ۔ لیکن اگر قدامت کا شہنشاہ اپنے غرور کے تخت پر بیٹھا ہوا ساری دنیا کو غیظ و غضب سے گھورتا رہے گا تو باغیوں کا گروہ ایک نہ ایک دن اُس کے تخت کو تختہ بنا دے گا —

" نقاد "

مقام محمود

یہ مثنوی آغا صدیق حسن صاحب ضیا کی طبع رسا کا نتیجہ ہے اور راولپنڈی کے ایک عام جلسۂ میلاد میں پڑھی گئی تھی ۔ وہاں کی بزم ادب نے اب اسے چھوٹی تقطیع کے چالیس صفحات پر عبدالعزیز خاں صاحب صدر بزم کی مختصر تمہید کے ساتھ شائع کردیا ہے ۔ حضرت ضیا ایک صاحب فن شاعر ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان کی دوسری نظمیں اور تمثیلات بھی جلد شائع کی جا سکیں گی ۔ زیر نظر مثنوی کا آغاز اس

طرح ہوتا ہے :—

هوا حسن مطلق کو ذوق شکار پس پردہ کرنے لگا انتظار
جہاں گھات پائی کہیں میں چھپا کبھی چرخ پر گہ زمیں میں چھپا
رہا عرصہ تک وہ اسی تاک میں یکایک نگہ جم گئی خاک میں
چلا یا بصد ناز تیر نظر ہوئی سامنے خاک سینہ سپر
پڑا جب نگہ کا نشانہ درست ہوا زیست کا کارخانہ درست
بہ اندازۂ بیقراری لگا دل خاک پر زخم کاری لگا
کھلا زخم سے قفل باب حیات کھلا زخم سے جوہر کائنات
وہی زخم زخموں کا مرہم ہوا
اسی زخم سے کشف آدم ہوا

اس کے بعد مقام آدم ' مقام عشق' عرفان اور آخر میں ظہور حضرت خاتم النبیین رحمۃ للعالمین کو بھی اسی رنگ میں بیان کیا ہے - حضرت ضیاء بظاہر کائنات کے ابدی رموز کو فلسفۂ عقلی کے زور سے حل کرنا چاہتے ہیں - لیکن اس طرز استدلال کی کمزوری شعر کے پردے میں چھپ گئی ہے - بہر حال ' محض ادبی اعتبار سے ان کی مثنوی بہت اچھی اور قابل قدر ہے - غالباً صدر نشین بزم ادب راولپنڈی کے پتے سے دستیاب ہوگی - قیمت کہیں تحریر نہیں —

(ہ)

—— * ——

مولانا شبلی اینڈ عمر خیام (انگریزی)

مسٹر پستن جی بھادی والا نے جن کو خیام کی رباعیات سے گہری دلچسپی ہے ' مولانا شبلی مرحوم کے تذکرے ' شعرالعجم حصہ اول سے وہ ٹکڑا جو خیام کے متعلق ہے ' انگریزی میں ترجمہ کیا اور مصنف مرحوم کے حالات زندگی پر پچاس صفحات علحدہ لکھکر یہ کتاب شائع کی ہے - شروع میں پارسی مستشرق ڈاکٹر (شمس العلما ' سر) موڈی سے ایک مقدمہ بھی لکھوایا ہے حالانکہ اُن غریب کو اقرار ہے کہ وہ شعر شاعری سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے (صفحہ ۱۶) - خیام کی خمریات کی بحث میں بھی وہ لائق مترجم کے بیان سے بھک کر یہ سمجھہ گئے کہ مولوی شبلی صاحب معتدل شراب خواری کے

حامی ہیں (صفحہ ۲۴) - اور قدیم پہلوی کتابوں کے طول طویل اقتباسات سے یہ ثابت کرنے لگے کہ پارسی قوم کا بھی عقیدہ یہی تھا اور اسی کی تحریروں کا اسلام اور تصوف پر بہت کچھ اثر پڑا ! شمس العلما موصوف کے مولوی شبلی مرحوم کے ساتھ اس حسن ظن کو غلط فہمی پر مبنی دیکھکر ہمیں بھی افسوس ہوا —

خود مسٹر بھاجی والا کی مصنف شعرالعجم سے عقیدت مندی قابل ستائش ہے - انہوں نے مرحوم کے حالات زندگی لکھنے میں کافی محنت اور دردسری اٹھائی ہے اور انگریزی دانوں کو اسلامی ہند کے اس مشہور اہل قلم سے روشناس کیا ہے جس کی اردو میں بھی ابھی تک کوئی معقول سیرت نہیں لکھی گئی - مسٹر بھاجی والا کی یہ کوشش قابل شکر گزاری ہے لیکن ذوق تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ مصنف مرحوم کے مضمون کو ' جس کا ترجمہ کیا ہے ' اچھی طرح جانچ لیتے - کیوں کہ مرحوم کی یہ کتاب تحقیق کے معیار پر قابل اصلاح پائی گئی ہے - رسالہ اردو ' بابتہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ میں شعرالعجم کے اسی حصے پر جو تنقید چھپی تھی اس میں مصنف مرحوم کی بعض سنگین غلطیاں بتائی گئی ہیں - مسٹر بھاجی والا پروفیسر ژوکوفسی کے معرکہ آرا مضمون ہی کو سامنے رکھ لیتے اور کم سے کم ذیلی حواشی میں لکھ دیتے کہ فلاں فلاں رباعیاں جن کو مصنف مرحوم نے خیام کے نام سے نقل کیا ہے ' الحاقی ثابت ہوچکی ہیں - اس روسی مضمون کا انگریزی ترجمہ سر ڈینوسن راس نے رائل ایشیاٹک سوسائیٹی کے رسالہ (اپریل سنہ ۱۸۹۸ ع) میں شائع کیا تھا اور مسٹر بھاجی والا اس سے واقف ہیں - (ذیلی حاشیہ صفحہ ۱۰۸) طرفہ تر یہ کہ خود مصنف مرحوم نے بھی اس مضمون کا تحسین کے ساتھ ذکر کیا ہے (شعرالعجم - صفحہ ۲۹۰) لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں اور مصنف و مترجم دونوں نے اصل مضمون کو مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی —

مسٹر بھاجی والا نے خیام کی رباعیات کا جو شعرالعجم کے مضمون میں آگئی ہیں ' انگریزی ترجمہ خود کیا ہے - یہ ان کے ذاتی شوق اور محنت کا ثبوت ہے - ورنہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی یہ توقع نہیں کرسکتے کہ اسے دوسرے انگریزی تراجم پر فوقیت دی جائے گی - بعض رباعیات کے ترجمے میں مسٹر

بھاجی والا سے اصل خیال کے سمجھنے میں فرو گذاشت ہوئی ہے ۔ مثلاً :

فریاد عمر رفت بر بیہودہ ۔ الخ ۔ اس میں شاعر نے اوامر کو جن کے انجام دینے میں قصور ہوا " فرمودۂ نا کردہ " اور جو گناہ سرزد ہوں انھیں " کردھاے نافرمودہ " تحریر کیا ہے اور مصنف شعرالعجم نے بھی اشارتاً یہ معنی بیان کردیے ہیں لیکن مسٹر بھاجی والا کے انگریزی ترجمے میں یہ دونوں پہلو موجود نہیں ہیں ۔ (صفحہ ۶۹) —

بایں ہمہ مجموعی طور پر اُن کے ترجمے صاف اور خاصے شگفتہ ہیں ۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر بھاجی والا کی یہ شوقیہ محنت رائگاں نہ جاے گی اور ان کی کتاب کی خاطر خواہ قدر ہوگی ۔ اس کی ضخامت تقریباً دوسو صفحہ اور مجلد شائع کی گئی ہے ۔ قیمت چار روپے کچھہ زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔ مترجم سے " امباواڑی ' مزے گام ' بمبئی " کے پتہ سے طلب کی جاے —

(ہ)

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

نوشتۂ جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ ' درمیانی تقطیع ' صفحات ۱۲۵ طباعت وغیرہ پاکیزہ ' کاغذ عمدہ ' قیمت آٹھہ آنے ۔ ملنے کا پتہ :

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن —

مسلمانوں کی حکومت دکن اور خصوصاً مہاراشتر میں تیرھویں صدی عیسوی سے قائم ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مرہٹی زبان ادبی حیثیت اختیار کررہی تھی ۔ عین ایسے زمانے میں مسلمانوں کی باضابطہ حکومت قائم ہوگئی اور ان کی تہذیب و معاشرت اور حکومت و سیاست کے گہرے اثرات اہل مہاراشتر کے تمدن معاشرت اور خیالات پر پڑے ۔ اس اثر سے زبان کس طرح بچ سکتی تھی ؟ اس کے خمیر ہی میں فارسی کا زبردست عنصر جاگزین ہوگیا —

اس اثر کو فاضل مصنف نے بڑی خوبی سے دکھایا ہے ' فارسی زبان کے جو اثرات مرہٹی کے قواعد ' اسالیب اور مختلف نوعیتوں کی تحریروں پر پڑے ہیں ان کو نہایت محنت اور قابلیت سے واضح کیا ہے ۔ فارسی اثر

کے مختلف دور علمی اور اصولی طریقوں سے مقرر کئے ھیں اور ھر دور کی تحریروں پر محققانہ اور نا قدانہ بحث کی ھے - اپنے خیال کے ثبوت میں قدیم مرھٹی زبان کی تحریروں ، تاریخی اور دفتری کاغذوں اور کتبوں سے جگہ جگہ حوالے اور اقتباسات پیش کئے ھیں اور ھر جگہ ان کو نہایت قابلیت سے حل کرکے سمجھایا ھے - پوری کتاب عالمانہ تحقیق اور تنقید کا اعلیٰ نمونہ ھے - یہ کتاب ان لوگوں کو ضرور مطالعہ کرنی چاھئے جو فارسی یا مرھٹی سے بہرہ رکھتے ھیں - وہ لوگ بھی اس سے مستفید ھوسکتے ھیں جو زبان و ادب کا ذوق رکھتے ھیں اور لسانیات و ادبیات پر تحقیقی و تنقیدی کام کرتے ھیں —

(چ)

کیمیا گر

ار

(محمد مجیب صاحب- جامعہ ملیہ اسلامیہ - دھلی)

یہ نو افسانوں کا مجموعہ ھے - (۱) کیمیا گر (۲) خان صاحب (۳) نیا مکان (۴) باغبان (۵) باغی (۶) چراغ راہ (۷) ایک جھلک (۸) پتھور اور (۹) اندھیرا —

محمد مجیب صاحب کے ان افسانوں کو پڑھ کر معلوم ھوتا ھے کہ اردو میں اس صنف ادب کی ترقی کے کس قدر امکانات موجود ھیں - موصوف کے افسانے ایک خاص رنگ رکھتے ھیں - وہ نہایت سیدھے سادے طور پر جیسے انھیں کچھ کہنا ھی نہ ھو ، سب کچھ کہہ جاتے ھیں - ان کے ھر افسانے میں ایسی پتے کی باتیں ملیں گی جو اردو کے اور دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں اب تک نہیں پائی جاتیں - وہ دور از کار خیال آرائی کو

اپنے ہاں راہ نہیں دیتے - لیکن ہر افسانہ کی تہ میں کوئی نہ کوئی اعلیٰ خیال جو کسی نہ کسی اعلیٰ قدر حیات کا حامل ہوتا ہے، آپ ضرور پائیں گے - زیادہ تر روز مرہ کے معمولی واقعات کے ذریعہ سے وہ مختلف اشخاص کی سیرت کے مخصوص خط و خال پیش کرتے ہیں - اکثر تو وہ کسی ایک واقعہ کو لیتے ہیں اور اسے اس دلاویز طور پر پیش کرتے ہیں کہ پوری زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے - آرٹ اسی کو کہتے ہیں —

موصوف کے افسانوں کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جھوٹ موٹ کی جذبات پرستی کو اپنے افسانوں کے اشخاص کی سیرت میں نہیں داخل ہونے دیا - آج کل اردو کے افسانہ نگار اس کثرت سے عشق و عاشقی کے موضوع پر طبع آزمائی کر رہے ہیں کہ اگر بہت عرصے تک بھی اس موضوع کو ہمارے ادیب "شجر ممنوعہ" قرار دیں تو چنداں مضائقہ نہیں — موضوع کی پامالی کی وجہ سے حقائق حیات بھی مصنوعی نظر آنے لگے ہیں - اگرچہ ہم اس خیال کے قائل نہیں کہ جذبات لطیف ادب سے خارج کردیے جائیں - بغیر ان کے ادب کا جمالیاتی پہلو تشنہ رہ جائے گا - بالکل اسی طرح ہم اس کے بھی معتقد نہیں کہ عشق و حسن ہی بس ادب کا موضوع ہونا چاہئے - یہ بھی ادب کی یکرخی تصویر ہوگی - ادب کی ہمہ گیری نہ صرف حیات انسانی بلکہ کائنات فطرت کو بھی اپنی وسعتوں میں جگہ دینے کو تیار ہے - جس طرح حسن و عشق زندگی سے علحدہ نہیں اسی طرح معمولی واقعات بھی زندگی کے رنگین واقعات سے اہل نظر کے لیے کم اہمیت نہیں رکھتے —

یہ افسانوں کا مجموعہ اردو میں قابل قدر اضافہ ہے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے نے زندگی کے مسائل پر غور کیا ہے - زبان سادہ اور موثر ہے اور لطف سے خالی نہیں - ہمیں پوری توقع ہے کہ محمد مجیب صاحب اپنے آئندہ افسانوں میں ہندوستانی ماحول کو ذرا اور زیادہ اجاگر کریں گے - ہر اس شخص کو جسے اردو ادب سے ذوق ہے یہ افسانے پڑھنے چاہئیں —

(ی)

دیانت

از

(ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب - مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی)

یہ اخلاقی ڈراما ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ نے جامعہ ملیہ کے یوم تاسیس کے موقع پر چھوٹے بچوں کے تمثیل کرنے کی غرض سے لکھا تھا - اس ڈرامے کی تمثیل بہت پسند کی گئی - یہ ڈراما تین منظروں پر مشتمل ہے - اس میں رشید آباد کے ایک غاصب تعلقدار نواب ظالم جنگ کا قصہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عملی زندگی میں دیانتداری کا پھل میٹھا ہوتا ہے - نواب ظالم جنگ جو ایک بد دیانت آدمی تھا شروع شروع میں پھلا پھولا لیکن انجام کار وہ خسارے میں رہا - اس کا دور دورہ گنتی کے تھوڑے دن رہا - بالآخر ایک غریب لکڑ ہارے نے جو ایک دیانتدار شخص تھا اسے نیچا دکھایا - ڈراما ان اشعار پر ختم ہوتا ہے —

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو ہوس اور لالچ کو دل سے نکالو
اور اک چیز ہے جس کا سب دھیان رکھو دیانت دیانت دیانت دیانت

یہ ڈراما بچوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے —

(ی)

عید زبون

(از اشتیاق حسین قریشی - مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی)

اس ڈراما میں ایک لڑکی زینب کی سرگزشت حیات بیان کی گئی ہے - زینب کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک دولت مند نوجوان کے ساتھ کردی گئی جس کا نام مزمل ہے - اپنے شوہر کے گھر اس کی زندگی عذاب میں رہی - مزمل نہایت مغرور ، تنک مزاج اور ظالم آدمی تھا - اس نے غریب زینب پر سکھ چین حرام کردیا - کچھ دنوں اس نے ظلم جھیلے لیکن بالآخر اس نے اپنے ایک بچپن کے دوست جعفر کی مدد سے

ظالم کے پنجے سے نجات حاصل کی —

اس ڈرامے میں خلع کی معاشری اصلاح کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے - اسلام نے جہاں طلاق کی اجازت دی وہاں خلع کی بھی اجازت دی ہے - لیکن چونکہ مرد زندگی کے ہر شعبے پر حاوی رہے ہیں اس لیے اس پر عمل بہت کم ہوا - یہ معاشری اصلاح مسلم ہے اور قرین انصاف ہے —

ڈرامے کی زبان سلیس اور عام فہم ہے - ڈراما نگار نے جان بوجھکر مناظر کی تعداد تھوڑی رکھی ہے - ان کا خیال ہے کہ مصنوعی اور غیر ضروری طور پر مناظر کی تعداد بڑھانا بیکار ہے - ہم بھی اس خیال میں ڈراما نگار کی رائے سے متفق ہیں - خواہ مخواہ مناظر کی تعداد بڑھانا ذی حیثیت سے کوئی خوبی کی بات نہیں جیسا کہ عام طور پر اردو کے ڈراما نگار تصور کرتے ہیں - ہاں یہ ضرور ہے کہ نشستیں زیادہ طویل بھی نہ ہوں —

تاج آفرینش

(ترجمہ عبدالحمیدنعمانی - اجمل بک ڈپو - پرنسس بلڈنگ - بمبئی -)

یہ کتاب ادارۂ اجمل (بمبئی) کے سلسلۂ مطبوعات کی پہلی کتاب ہے - یہ مصر کی مشہور اہل قلم خاتون ملک خانم باحثۃالبادیہ کے چند مقالات کا اردو ترجمہ ہے جو انہوں نے اپنے ملک کی عورتوں کی زندگی کی اصلاح کی غرض سے عربی میں لکھے تھے - یہ مقالات شادی ، تعدد ازدواج ، فضول خرچی اور ولادت وغیرہ جیسے مسائل کے متعلق ہیں - موصوفہ نے تعلیم نسواں اور عورتوں کی زندگی کی عام اصلاح پر جو کچھ لکھا ہے وہ محض یورپ کی تقلید میں نہیں ہے بلکہ معاشری زندگی کی بعض اہم ضروریات اور کوتاہیوں کے ہاتھوں مجبور ہوکر لکھا ہے - ان

کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاح کے ساتھ ساتھ وہ اس کی حامی ہیں کہ اپنی قوم کے تہذیبی سرمایہ کو حتی المقدور محفوظ رکھیں اور اسے برباد نہ ہونے دیں —

ترجمہ سلیس اور عام فہم ہے —

(ی)

تاریخ و سیر

سیرت محمد علی

(مرتبہ رئیس احمد صاحب جعفری - مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دهلی -
صفحات ۵۴۳ قیمت تین روپے)

(یہ کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے)

اس کتاب میں مولانا محمد علی مرحوم کی سوانح حیات ہیں جو جعفری صاحب نے مرتب کی اور جامعۂ ملیہ اسلامیہ نے شائع کی ہے - مولف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - پہلے حصے میں عام حالات زندگی اور اخلاق و عادات سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں اُن کی زندگی کے کارنامے ہیں - دو حصے کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی' زیادہ آسانی اسی میں تھی کہ ان دو چیزوں کو الگ کیے بغیر تمام حالات بیان کردیے جاتے - اس صورت میں بیان مسلسل بھی ہوتا اور تکرار اور اعادہ کی بھی نوبت نہ آتی —

هندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولود ہے ' مولانا محمد علی مرحوم " عجیب و غریب " شخص ہوے ہیں - وہ مختلف ' متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے - اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ

یا گلیشیر سے تشبیہ دی جاے تو کچھہ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا - ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے —

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب ' زبردست انشاپرداز اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا ' لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تھا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہوجاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھہ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے - وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا - لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھہ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا - وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذراسی بات پر اس قدر آگ بگولا ہوجاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی - دوست بھی اُس کے جان نثار اور فدائی تھے ' لیکن اس طرح پوجتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے - وہ اپنے رفیقوں اور ہمکاروں کے ساتھہ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتا تھا اور طرح طرح کے سلوک کرتا تھا - لیکن جب بگڑتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا ' اس وقت اسے نہ کسی کی عزت آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا - اسی لیے وہ اپنے ہمکاروں سے نباہ نہ سکا اور وہ لوگ جنھیں وہ چن چن کر لایا تھا آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہوگئے - وہ جب کبھی کسی کام کو اُٹھاتا تو بڑی شان و شکوہ سے اُٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا لیکن تکمیل کو پہنچانا اس کی طبیعت ہی میں نہ تھا - کامریڈ کس شان سے نکلا ' قدر بھی اس کی وہ ہوئی جو شاید ہی کسی اخبار کی ہوئی ہو' اپنے پراے سب اسے سر آنکھوں پر رکھتے تھے ' لیکن جو اس کا حشر ہوا وہ بھی معلوم ہے - مسلم نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی بنیاد جس زور شور اور شد و مد کے ساتھہ ڈالی گئی اس کا حیرت انگیز منظر اب تک ہماری نظروں کے سامنے ہے - اس وقت قومیت اور آزادی کی کھولن انتہائی نقطے تک پہنچ گئی تھی - اسی ہفتے جب یونیورسٹی کے نصاب تعلیم و نظم و نسق پر غور کرنے کے لیے اُن کے رفقا کی کمیٹی ہوی ہے تو وہ سماں ہم کبھی نہیں بھول سکتے - مجذوب کی بڑ بولتے اور سنتے آتے تھے لیکن اُس روز اپنے کانوں سنی اور بڑی عبرت ہوئی - ان کے بعض سنجیدہ اور صاحب نظر رفیق جو اس مجلس میں شریک تھے ششدر و حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ

ھے اور بے بسی کے ساتھہ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے - وہ اس وقت اس خیال میں مست تھے (اور انھیں اس کا پورا یقین تھا) کہ کوئی دن جاتا ھے کہ ھندوستان ان کے قدموں کے تلے ھوگا اور اس کی حکومت کی باگ ان کے قوی ھاتھوں میں ھوگی - اس خیال سے ان کا (اور ان سے زیادہ ان کے برادر بزرگ کا) دماغ بہک سا گیا تھا اور جو بات اس وقت ان کے منہ سے نکلتی تھی اس میں ایک عجیب مستانہ ادا اور بے تکا پن ھوتا تھا - خلافت کا ذکر جتنا کم کیا جائے بہتر ھے- اس کا غلغلہ صور اسرافیل کی طرح ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا اور وضیع و شریف ' عالم و عامی ' ھندو اور مسلمان سب ھی اس کی لپیٹ میں آگئے - اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ سے حمیت و جوش قومی کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی تھی لیکن جو انجام ھوا وہ بے کہے سب کو معلوم ھے - اب یہ ایک اسم ھے بلا مسمی - سانپ نکل گیا مگر ھم ابھی تک لکیر پیٹتے جارھے ھیں - محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وہ اپنے کاموں کے لیے گھر بیٹھے ھزاروں لاکھوں روپیہ جمع کرسکتے تھے ' اور کرتے تھے - لیکن وہ اس بے دردی ' بے پروائی اور غیر ذمہ دارانہ طور پر اسے صرف کرتے تھے کہ ان کے کام بھی برباد ھو جاتے تھے - اورخود بھی قلاش ھوجاتے تھے - ھم میں (خاص کر یو پی والوں اور خصوصاً مسلمانوں میں) اب تک زمیندار کی شان قائم ھے جو بادشاھی شان کی نقل ھے - ھم انتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے ' ھم صرف ایک ھی بات جانتے ھیں ' لوٹنا اور لٹانا —

محمد علی مرحوم ھر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا - اُس کے رفقا اور اس کے ھم عصر اُس کے سامنے بودنے تھے مگر افسوس اُسے اپنے اُوپر قابو نہ تھا اور یہی اُس کی ناکامی کی اصل تھی - اس کے ایک دوست جو اُسے بچپن سے جانتے تھے اور جنھوں نے زندگی کی ھر منزل میں اُسے دیکھا اور اس کا ساتھہ دیا تھا ' فرماتے تھے کہ " محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا " - اس میں مطلق شبہہ نہیں کہ وہ اپنے ھم عصروں میں سب سے زیادہ لیڈری کے قابل تھا بشرطیکہ اُسے اپنے نفس پر قابو ھوتا - وہ جس طرح بیماری میں پرھیز پر قابو نہیں رکھتا تھا اسی طرح ھر معاملے میں جوش کے وقت وہ اپنے اختیار سے باھر ھو جاتا تھا —

محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اُس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہمارے ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شے کے لیے ہم لڑ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں اس کے لیے پختہ سیرت اور اعتدال طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے —

سوامی دیانند اور ان کی تعلیم

(مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی - شائع کردہ اورینٹل پبلک لائبریری پانی پت - صفحات ۳۰۴ ۲۸ ۲۰ ۲۴ قیمت دو روپے، مجلد دو روپے آٹھ آنے)

سوامی دیانند جدید ہندوستان کی تاریخ میں اور ہندو مذہب کی جدید تحریک میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ آریاؤں میں اب وہ شدت باقی نہیں رہی جو کبھی پہلے تھی بلکہ بہت سے تعلیم یافتہ ہندو جو ان کے مقلد ہیں اور اُن کا بہت احترام کرتے ہیں اُن کی بعض تاویلوں اور توجیہوں کو طفلانہ سمجھ کر ہنستے ہیں، تاہم آریہ فرقے پر اُن کا اب تک بہت اثر ہے، وہ اُن اصول پر اب تک قائم ہے جو سوامی جی نے مقرر کر دیے تھے اور اُن مقاصد کی تکمیل میں اب بھی جوش سے کام کر رہا ہے جو اس کے پیش نظر ہے۔ اس کا ہمیں ہمیشہ افسوس رہا کہ باوجود آئے دن کے مناظروں اور بدمذاقی اور قسم قسم کی بے تمیزی اور لڑائی جھگڑے کے اردو میں کوئی کتاب ایسی نہ لکھی گئی جس میں سوامی جی اور اُن کی تعلیم پر محققانہ بحث ہو۔ مناظروں کی کتابوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ ان میں اکثر اوقات اصل مطلب کو اس طرح بگاڑ کر بیان کیا جاتا ہے یا اصل قول کی

توجیہہ اس طور پر کی جاتی ہے جو دیانت کے خلاف ہوتی ہے —

کتاب زیر تبصرہ کو دیکھہ کر ہمیں کسی قدر مسرت ہوئی کہ خواجہ غلام الحسنین صاحب نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے - ہر شخص ہندی اور سنسکرت اور انگریزی کی اصل کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور اس لیے اُن لوگوں کے لیے جو ان زبانوں سے نا واقف ہیں اور اس بڑی تحریک اور بانیٔ تحریک کے حالات معلوم کرنے کا شوق رکھتے ہیں ' کوئی ذریعۂ معلومات نہیں - خواجہ صاحب کسی کام کو ادھورا نہیں کرتے ' ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ' بال کی کھال نکالتے ہیں اور جب تک کامل تحقیق کے بعد پورا اطمینان نہیں کر لیتے وہ چین سے نہیں بیٹھتے - یہ کتاب خواجہ صاحب کی عمر بھر کی محنت ' مطالعہ اور تحقیق کا نتیجہ ہے - خواجہ صاحب نے ایک ایک کتاب کو جو اس مضمون پر مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں' پڑھا ہے ' خود سوامی جی کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہے یہانتک کہ اُن اخبارات کو بھی نہیں چھوڑا جو سوامی کے زمانے میں شائع ہوتے تھے اور جن میں سوامی جی کی زندگی اور تعلیم کے متعلق بحثیں تھیں - کوئی بات بغیر سند کے نہیں لکھی ' اصل عبارتیں تک نقل کردی ہیں اور تفصیلی حوالے دیے ہیں - مخالف و موافق رائیں نہایت صحت و دیانت سے درج کی ہیں - غرض سوامی جی کی زندگی اور اُن کی تعلیم کی پوری کیفیت ابتدائی حالت سے آخر تک اور پھر اس میں جو جو تبدیلیاں ہوئیں یا جو جو مصلحتیں مد نظر تھیں ' سب کو صفائی کے ساتھہ بیان کردیا ہے - زبان بہت صاف اور سلجھی ہوی ہے اور طرز بیان بہت سہل اور بے تکان ہے - لیکن سب سے زیادہ قابل تعریف اور قابل قدر چیز اس کی ترتیب اور باقاعدگی ہے - اول باب ' باب میں فصلیں ' فصلوں میں دفعات اور ہر دفعہ کا عنوان - پھر خاص خاص عنوان خط نسخ میں ' ضروری عبارتیں جلی حروف میں ' اور خاص خاص فقرے خط کشیدہ ' خلاصہ یا دوسروں کی عبارتوں کی نقل خفی میں- یہ سب باتیں ایسی خوبی اور حسن کے ساتھہ انجام دی گئی ہیں کہ جی خوش ہوجاتا ہے اور میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ اپنے بعض ہم کاروں یا طالب علموں کو تربیت کے لیے خواجہ صاحب کے پاس بھیج دوں - پھر اس پر بس نہیں کیا ' کئی ضمیموں کا اضافہ کیا ہے ' آخر میں ساری کتاب کا خلاصہ

دیا ہے اور آخر میں ایک انڈکس یعنی مکمل اور مفصل فہرست مضامین بہ ترتیب حروف تہجی دی ہے - کتاب کے شروع میں سوامی جی کے دو فوٹو دو مختلف زمانوں اور مختلف حالتوں کے دیے ہیں جنہیں دیکھکر زمانے کے نیرنگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے -

خواجہ صاحب ' خواہ کسی حالت میں رہے ہوں ' عمر بھر مدرس رہے ہیں اور اب بھی اسی فن شریف کی خدمت کررہے ہیں - اس کی وجہ سے ایک خوبی تو ان میں یہ پیدا ہوگئی ہے کہ وہ مشکل سی مشکل بات کو اس نہج اور ایسے سہل طور سے سمجھاتے ہیں کہ کوڑہ مغز بھی سمجھہ جائے لیکن اسی کے ساتھہ یہ عیب بھی پیدا ہوگیا ہے (ممکن ہے کہ یہ عیب نہو) کہ جس طرح طالب علموں سے پچھلے سبق کا اعادہ کراکر نیا سبق پڑھایا جاتا ہے اسی طرح خواجہ صاحب نے ہر نئے باب کے شروع میں پہلے باب کے خلاصہ کا اعادہ کردیا ہے - یہ اعادہ اور اس قسم کی تکرار بعض وقت طبیعت کو ناگوار گذرتی ہے - ایک خوبی اس کتاب میں یہ ہے کہ ساری کتاب میں کہیں کوئی جملہ ایسا نہیں لکھا جو خلاف ادب و تہذیب یا ناگوار خاطر ہو —

جو صاحب ہندوستان کی مذہبی تاریخ اور جدید مذاہب کا منشا و مقصد اور ان کی ظاہری اور باطنی عیوب و محاسن سے واقف ہونا چاہتے ہیں اُنہیں یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنی چاہئے —

زندہ تاریخ

کلیۂ جامعۂ عثمانیہ میں دس سال سے بزم تاریخ قائم ہے اور حال میں اس کی دہ سالہ جوبلی کا جشن منایا گیا تھا - اسی تقریب کی یادگار میں یہ مجموعہ مضامین شائع کیاگیا ہے - اس قسم کے دو "گلدستے" پہلے بھی شائع کیے جاچکے ہیں اور آئندہ بھی اسی نام سے شائع ہوتے رہیں گے - لہذا مناسب ہوگا کہ ان پر سلسلہ وار نشان درج کر دیا جایا کرے -

زیر نظر مجموعے کے اردو حصے میں ۲۵ سالہ روداد اور خطبۂ صدارت و ادارت کے اقتباسات وغیرہ کے علاوہ صرف دو مضمون شامل ہیں - ایک پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے خواجہ نظام الملک طوسی کے اصول حکومت پر تحریر فرمایا ہے اور دوسرا عبداللہ چغتائی صاحب نے روضہ ممتاز محل کی تعمیر کے متعلق پڑھا تھا - پہلے مضمون کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل پروفیسر نہ صرف مشرقی تاریخ سے نہایت دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ ان کا مذاق تحریر بھی بہت کچھ مشرقی ہے - چنانچہ اپنے ممدوح کی تحسین کو انہوں نے تنقید و نکتہ چینی کے کچوکوں سے داغ دار نہیں کیا جیسا کہ یورپ والوں اور ہمارے نئے تعلیم یافتوں کا طریقہ ہوگیا ہے - بلکہ نظام الملک کے کام اور کتاب سے بڑھ کر اس کے اوصاف ذاتی کی صرف ستائش سے کام رکھا ہے - چغتائی صاحب کا مضمون بھی اسی پائے کا ہے مگر ان کا طرز بیان اتنا زیادہ بلیغ ہے کہ بعض جملوں کا مفہوم متعین کرنا دشوار نظر آتا ہے - آپ نے بنا یا بانی یا عمارت گر کے واسطے "تعمیر کار" کی نئی اصطلاح غالباً خود وضع کی ہے اور شاید اسے رواج دینے کی خاطر مضمون کا عنوان " روضہ تاج محل اور اس کے تعمیر کار " اور ایک ذیلی عنوان " شاہ جہاں بہ حیثیت ماہر تعمیر کار " ثبت فرمایا ہے - مضمون میں اس خیال کی بدلائل تردید کی ہے کہ اس عمارت کے بنانے میں کسی فرنگی کا کوئی حصہ تھا - اسی کے ساتھ خود فاضل مقالہ نگار کی فراخ دلی کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے عمارت کے اصلی نام کی بجائے انگریزوں کے مسخ شدہ نام (تاج محل) کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیا —

حصہ اردو میں تاریخی مذاق کی چند نظمیں بھی شامل ہیں - ان کے متعلق ہم کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتے مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جامعہ عثمانیہ کے ایک رسرچ اسکالر نے حضرت اویس قرنی کو حضرت بی بی فاطمہ (رض) کا ہم عصر قرار دیا ہے اور بظاہر حضرت خلیفہ ثانی (رض) کے زمانے میں حضرت سیدہ کی ایک تقریر بھی نقل کی ہے —

انگریزی حصے میں سب سے بڑا اور قابل ذکر مضمون راؤ بہادر ڈاکٹر کرشنا سوامی آینگر کا ہے جس میں ابوالحسن تاناشاہ کے برہمن وزیروں

(مادنا اور اس کے بھائی اکناپنّدت) کی انتظامی قابلیت اور وفاداری کے ثبوت پیش دئے گئے ہیں - یہ پرازمعلومات مقالہ کافی محنت و تحقیق سے لکھا گیا ہے اور فارسی مورخوں نے ان بھائیوں کی جو تصویر دکھائی ہے گویا اس کا دوسرا رخ ہے - لیکن چند صفحے پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون شاید کبھی ختم نہ ہوگا - اور بہت سی غیر متعلق جزیات کے باوجود بعض اہم پہلو تشنہ رہ گئے ہیں —

ہمیں وہم ہو گیا تھا کہ کتابت کی غلطیوں کا بڑا سبب اردو رسم الخط ہے - لیکن اس رسالے کے بھرۂ انگریزی میں بے حساب اغلاط دیکھہ کر یہ بد گمانی رفع ہوگئی - رسالے پر قیمت درج نہیں ہے - غالباً بزم تاریخ کی ' مجلس کابیلہ ' کے پتے سے دستیاب ہوسکتا ہے - یہ ' کابیلہ ' بھی تنظیم جدید کا دلچسپ نمونہ ہے کہ اس میں پانچ ارکان ' ایک مدیر' پانچ بڑے عہدہ دار ' پانچ ناظم ' ایک ناظم ادارہ ' ایک ناظم مستوفی اور ایک صدر ناظم ' شریک ہیں - مستوفی کی قدیم اصطلاح کے تازہ کئے جانے سے ہمیں خوشی ہوئی اور خیال آیا کہ دانیان بزم اسی کے جوڑ پر ' وکیل در ' دیوان کل ' مُشرف ' صدر جہاں ' باربک ' میر بخشی وغیرہ کے تاریخی عہدوں کو بھی دوبارہ رواج دیں تو لطف اور افادے سے خالی نہ ہوگا —

(ہ)

ترکی جمہوریہ

جناب ضمیر احمد صاحب (ہاشمی) ڈپٹی کلکٹر صوبۂ متحدہ نے اس کتاب کے ابتدائی چند ابواب میں ترکوں کی تاریخ کو بہ اختصار بیان کیا اور پھر جدید انقلابات محاربات اور حالات حاضرہ کو کافی تفصیل سے قلم بند کردیا

ہے ۔ کتاب مختلف انگریزی کتابوں اور جرائد سے ماخوذ ہے۔ لیکن لائق مولف نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا جس سے اندازہ ہو تا کہ ان بیانات کی وقعت اور پایۂ استناد کیا ہے ۔ صرف دیباچہ میں مسٹر ٹوائن بی اور ان کی کتاب "ماڈرن ٹرکی" کا ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں جب کہ ترکوں کے متعلق بہت سے باتیں اختلافی ہیں کافی نہیں معلوم ہوتا ۔ یہ امر کہ کم سے کم بعض اجزا محض ترجمہ ہیں ذیل کے چند جملوں سے ہی عیاں ہو جاتا ہے —

" ترک ایک دل آزار شکیب کے ساتھ دول متحدہ کے جملہ احکامات ماننے کے لیے تیار ہو گئے " ۔ (صفحہ ۱۱۰)

جنگ سقاریہ کا اثر بہت معنی خیز ہوا ۔ (۱۴۴) ۔

" غیر مذہبی تعلیم کے لیے ملتوں کے مدارس جدا گانہ تھے " (۲۸۶) ۔ اسی طرح اتحاد اسلامی کو زمانہ حال کی تحریک قرار دینا ' جو پہلے کبھی رونما نہ ہوئی تھی (صفحہ ۲۲۲) ۔ یا موتمر حجاز کو غیر معمولی اہمیت دینا (۲۳۸) ۔ فرنگی مصنفوں ہی کے خیالات نظر آتے ہیں ۔ ایک جگہ لائق مولف قسطنطنیہ کے فاتح کو " محمود دویم لکھ گئے ہیں (۳۵) اور اگر یہ ناقابل معافی غلطی کاتب کے سر ڈالی جائے ' تو بھی ان کو ترکی تاریخ سے کوئی خاص واقفیت نہیں معلوم ہوتی ۔ بہرحال ان کی کتاب کے آخری ابواب کافی دلچسپ اور پر از معلومات ہیں ۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے صفحات ۳۰۸ ہیں ۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی کے پتے سے طلب کی جائے —

(ہ)

موازنۂ صلیب و ہلال

مولانا عبدالسمیع صاحب نکہت (شاہ جہاں پوری) نے اس کتاب میں مسلمانوں کے گذشتہ علمی اور صنعتی کارناموں کا جوش انگیز تذکرہ کیا ہے ۔ اس میں زیادہ تر اندلس کی تاریخوں سے جو خود فرنگی اہل قلم نے لکھی ہیں ' مدد لی ہے ۔ اور بتایا ہے کہ اس عہد میں ممالک مسیحی پر کیسی وحشت و جہالت چھائی ہوئی تھی ۔ شروع میں نوجوان مولف کی تصویر

اردو اپریل سنہ ۳۳ ع

ثبت ہے کہ " توفنی مسلماً و الحقنی بالصالحین "۔ لائق مولف کا منشا بہت مبارک اور کوشش بہت مسعود ہے کہ اسلاف کے ان شاندار کارناموں کو پڑھ کر شاید نوجوان ملت کو کچھہ غیرت آے۔ دو سو صفحے سے کچھہ زیادہ ضخامت چھوٹی تقطیع پر صاف ستھری چھپی ہے، مولف سے متوسط انجمن اسلامیہ ہارن بی روڈ بمبئی ایک روپیہ آٹھہ آنے میں مل سکتی ہے -

(م)

تخت طاوس

منشی فاضل، کشتہ قادری، منشی عبداللطیف صاحب، ایڈوائسڈ ان اردو (؟) معلم انٹر کالج، دہانسی (یو پی) نے ساہجہاں کے شہرہ آفاق تخت طاوس کی ساخت، آراستگی وغیرہ کے حالات لکھے ہیں۔ لائق مولف کے ادبی ذوق اور تاریخی شوق میں شک نہیں، مگر اس کتاب میں بہت سے غیر متعلق مباحث اور طول طویل حواشی ایسے آگئے ہیں کہ اصل مضمون کو سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ آپ کے کسی وکیل دوست نے شروع میں چالیس صفحے کا " تعارف و تبصرہ " تحریر فرمایا ہے اور اس میں مولف کی ہمہ دانی اور قابلیت کی اتنی مفرط تعریف کی ہے کہ ہجو ملیح کا گمان ہوتا ہے۔ کتاب بہت صاف ستھری، مجلد شائع ہوتی ہے اور ایک روپیہ آٹھہ آنے میں مولف کے مذکورہ بالا پتے سے دستیاب ہوسکتی ہے —

(م)

تاریخ امریکہ

مولانا محمد یحییٰ صاحب تنہا بی ۔ اے ۔ ایل ایل بی ۔
وکیل غازی آباد۔ بڑی تقطیع صفحات ۲۷۶ قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

اردو میں امریکہ کی اب تک کوئی مفصل تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ خوشی کا مقام ہے کہ تنہا صاحب نے اس کی ابتدا کردی ہے۔ یہ کتاب امریکہ کی کوئی مفصل اور مبسوط تاریخ نہیں، بلکہ ایک سر سری خاکہ ہے۔ جیسا کہ خود مولف کو بھی اعتراف ہے، یہ کتاب در اصل ان لوگوں کے لیے ہے جو اردو کے سوا کسی دوسری یورپی زبان سے استفادہ کرنے سے قاصر ہیں۔ مولف نے انگریزی کی مختلف کتابوں کی مدد سے اس کو مرتب کیا ہے، لیکن ان کتابوں کے نام یا حوالے کہیں درج نہیں کیے۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولف کے ماخذات مستند اور معتبر ہیں یا غیر مستند اور پایۂ اعتبار سے گرے ہوے۔ یہ چونکہ امریکہ کی تاریخ کا ایک سر سری خاکہ ہے اس لیے اس میں فن تاریخ کے علمی اور اصولی آثار کم پاے جاتے ہیں، اور اسی لیے اس موضوع پر اس کی حیثیت ابتدائی کتاب سے زیادہ کی نہیں —

فاضل مولف نے چونکہ انگریزی کی کتابوں سے اخذ کر کے اس کو لکھا ہے اس لیے جگہ جگہ انگریزی اسلوب بیان کی جھلک اس کتاب میں نظر آتی ہے، جس کو اردو کے فطری اسالیب بآسانی قبول نہیں کرتے۔ ایک مقام پر ہے:

> "کناڈا جو سلطنت اور کلیسا کا نوزائیدہ بچہ تھا طاقت کی گود میں پرورش پاتا رہا، اس کی طاقت مصنوعی مقویات کے ذریعہ سے قائم رکھی گئی اور اس کے حرکات و سکنات کو ضابطہ بنایا گیا، اس کے اعضا کو فوجی قواعد سکھائی گئی جو بوجہ قلت حرارت غریزی آخر کار ٹھنڈا ہو گیا"

مولف نے جا بجا جمع کی حالت میں بعض الفاظ استعمال کئے ہیں جو علمی اور ادبی تحریروں میں متروک ہیں اور غلط سمجھے جاتے ہیں —

صفحہ - ۲۲۹ " جن کے گولوں سے جنگلات صاف ہو گئے "
صفحہ ۲۲۸ " صنوبر کے جنگلات ہیں "
صفحہ ۱۹۱ " اس مقدمہ کی ملازمان کی طرف سے پیروی کی "
صفحہ ۱۲۸ " نو آبادوں نے نہ مالکان کی کچھ پروا کی اور نہ بادشاہ کی "

ان چند فرو گذاشتوں کے قطع نظر کتاب کے مفید اور کار آمد ہونے میں شبہہ نہیں کہ جو لوگ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کی تاریخ سے نا واقف ہیں وہ آسانی سے امریکہ کے ضروری تاریخی حالات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں —

(چ)

تاریخ ہند

(مولفہ غلام محمد اے شیخ صاحب - قیمت ایک روپیہ - پاور پرنٹنگ پریس - راجکوٹ)

اس کتاب میں مولف نے مختصر طور پر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ بیان کی ہے - محمود غزنوی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے اہم حالات ۲۰۸ صفحوں میں پیش کیے ہیں - مولف اپنی تمہید میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی تالیف کی ضرورت اسواسطے محسوس کی کہ انگریزی زبان میں اب تک ہندوستان کے اسلامی عہد کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں جانبداری اور تعصب برتا گیا ہے - چنانچہ مولف نے اُن الزاموں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلامی بادشاہوں پر وارد کئے جاتے ہیں - یہ کتاب مدارس کے طلبہ کے لیے مفید ہے —

مذہب و اخلاق

۱ - سرکار دو عالم

۲ - اسلامی عقائد

یہ دونوں کتابیں مسلمان بچوں کے لیے جامعہ ملیہ ' دہلی نے شائع کی ہیں - " سرکار دو عالم " رسول اللہ صل اللہ علیہ و صلم کی سیرت مبارک پر چوتھی پانچویں جماعت کے طلبہ کے واسطے لکھی گئی ہے اور اس کے آخری حصے میں آں حضرت صلعم کے اخلاق ستودہ کو حلم ' ایثار ' انصاف وغیرہ علوانوں کے تحت میں بیان کیا ہے - ہمارے خیال میں سب سے مفید اور سبق آموز یہی موضوع ہے اور دوسرے حالات کو جو طلبہ ابتدائی درجوں میں پڑھ چکے ہیں ' کم کرکے اس حصے کو اور بڑھا دیا جاتا تو اور بھی بہتر ہوتا - طرزبیان میں بھی ہم زیادہ سلاست اور شگفتگی کو ترجیح دیں گے - (ضخامت ۱۳۹ صفحات - چھوٹی تقطیع - قیمت ۸ آنہ) دوسری کتاب ' " اسلامی عقائد " جسے ارباب جامعہ نے اپنے سلسلۂ دینیات کی تیسری کتاب قرار دیا ہے ' بہت صاف اور اچھی زبان میں لکھی گئی ہے - اس میں خدا ' رسول ' انبیا ' فرشتے ' ایمان ' اسلام تقدیر وغیرہ اسلامی عقائد کو بہ اختصار اس طرح بیان کیا ہے کہ بچوں کے ذہن نشین ہوسکے - لکھائی چھپائی بہت اچھی اور قیمت صرف ڈیڑھ آنہ ہے - یقین ہے کہ اسلامی مکاتب و مدارس اس مضمون کی کتابوں میں اس کو سب سے ارزان اور کارآمد پائیں گے —

(ہ)

اچھی باتیں

یہ کتاب جامعہ ملیہ کے استاد ' مولانا سعدالدین انصاری نے بظاہر طلبہ ہی کے واسطے تحریر کی ہے - بہت سے اخلاقی اصول اور فرائض کو بطور عنوان لکھہ کر قرآن شریف کی آیات اور ان کے ترجمے اور تفسیر سے ان اصول

کی تعلیم دی ہے - کہیں کہیں اخلاقی احادیث بھی آگئی ہیں - لائق مولف کا خیال تو بہت اچھا ہے لیکن کتاب کی ترتیب وتبویب میں کسی خاص اصول کی پیروی نہیں کی گئی اور زباں بھی اتنی سلیس و دلنشیں نہیں ہے جتنی چھوٹے لڑکوں کے واسطے ہونی چاہئے - ہمیں امید ہے کہ وہ طبع ثانی کے وقت ان پہلوؤں پر توجہ فرمائیں گے اور اپنی کتاب کو زیادہ مفید ومقبول بناسکیں گے - (چھوٹی تقطیع - ضخامت ۵۶ صفحے - قیمت درج نہیں)

(ھ)

بشارات یسین

اس رسالے میں مولوی غلام یسین خان صاحب ساکن اکولہ (برار) نے پیغمبر علیہ الصلواۃ والسلام کے ظہور کی دوسرے مذاہب کی آسمانی کتابوں سے پیشین گوئیاں نقل کی ہیں - زیادہ زور وید و پران وغیرہ ہندوستانی کی مذہبی کتابوں کے اقوال پر دیا گیا ہے - ضمناً یہ بحث بھی کی ہے کہ دیوناگری رسم الخط کی اصل عربی حروف ہیں - لیکن یہ ایک مستقل اور جدا گانہ مبحث ہے اور ہمارے خیال میں اس مختصر رسالے میں اسے چھیڑنے کی ضرورت نہ تھی - موڑی الفاظ سے مصنف نے عربی الفاظ اور عبارتیں پڑھ کر دکھائی ہیں مگر علمی اعتبار سے یہ کوشش غالباً تفنن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی - (بڑی تقطیع - صفحات ۴۰ - قیمت (۵) آنے - پتہ : غلام یسین خان صاحب گنج بیس - آکولہ - برار) —

(ھ)

بارش اور قرآن

اس رسالے میں مولوی طیب علی صاحب عبد الرسول نے بارش اور بادلوں کے متعلق قرآن کریم کی بہت سی آیتوں کو جمع کیا اور بتایا ہے کہ اب تک بارش اور بادلوں کی جو مختلف قسمیں اہل سائنس نے تجویز کی ہیں ' قرآن مجید

میں وہ اور ان سے زیادہ' نہایت خوبی سے مذکور ھیں - لائق مولف علوم جدید اور قرآن' دونوں سے کافی واقفیت رکھتے ھیں اور پہلے بھی دو رسالے زلزلوں اور سیارات پر تحریر کر چکے ھیں - اس دلچسپ سلسلے میں یہ رسالہ بھی ایک مفید اضافہ ھے - ھم امید رکھتے ھیں کہ وہ اپنے افادات کو جاری رکھیں گے - (ضخامت ۴۰ صفحے - تقطیع متوسط - غالباً مطبع نادری ' جبل پور سے ۴ آنہ میں طلب کیا جا سکتا ھے) —

(ه)

متفرقات

کلید عربی (حصہ اول)

یہ مختصر رسالہ جدید مصری یا مغربی اصول کے مطابق لکھا گیا ھے کہ بچوں کو عربی سیکھنے میں سہولت ھو - بشری بک ڈپو - نمبر ۳۱ کتابت خاں اسٹریٹ ' مونٹ روڈ ' مدراس سے ۳ آنے میں مل سکتا ھے —

(ه)

مشاھدات

یہ رسالہ علامہ سیماب اکبرآبادی مدیر تاج و پیمانہ (آگرہ) نے داؤدی بوھروں کے اوقات کے متعلق تحریر کیا ھے - اور اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ھے کہ ان اوقات کا موجودہ انتظام ھر طرح قابل اطمینان ھے اور داؤدی بوھروں کی استدعا کے مطابق انھیں قانون اوقات اسلامی کے دائرۂ اثر سے آزاد و مستثنی رکھنا چاھئیے - تحقیق کے شوق میں حضرت علامہ نے خود بمبئی '

سورت ، اور راندیر کا سفر کیا اور خفیہ طور سے ان اوقات کا معاینہ فرمایا - اگرچہ راندیر میں آپ کو لوگوں نے پہچان لیا اور خوب آو بھگت کی - اس جماعت کے پیشوا ملا طاہر سیف الدین صاحب سے بھی علامہ نے بلا تعارف ملاقات کی اور کمال خوش اعتقادی بہم پہنچائی ہے - یوں بھی آپ کی ادبی دلچسپی کا یہ میدان بالکل نیا ہے اور اس اشتہار بازی کے زمانے میں ممکن ہے خردہ چینوں کو بدگمانی کا موقع ملے لیکن اصل موضوع پر علامہ کی تحریر بہت صاف اور معقول نظر آتی ہے اگرچہ ہمیں اپنا ہم خیال بنانے میں وہ ناکامیاب رہی - قیمت ۳ آنے —

(ھ)

بڑھاپے سے مقابلہ

کرنل ، ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب نے تجدید شباب کے تازہ ترین نظریات اور اصول کے متعلق یہ دوسرا رسالہ پروفیسر اشتائنناخ کے اصل رسالے سے اردو میں ترجمہ کیا اور دھلی میں صاف ستھرا چھپوا کر ، گولکنڈہ ، حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے - ڈاکٹر صاحب کا زبان پر احسان ہے کہ وہ ایسے دقیق علمی مضامین پر اردو میں نہایت کار آمد کتابیں شائع فرما رہے ہیں - ڈاکٹر صاحب کی پہلی تالیف کی طرح یہ ترجمہ بھی بہت صاف اور عمدہ ہے اور فن سے نا واقف اشخاص بھی اس سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں - جن صاحبوں کو ان جدید نظریات اور یورپ کے حیرت انگیز طبی انکشافات سے دلچسپی ہو وہ فاضل مترجم سے طلب فرمائیں - اس سلسلے میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے اس جدید طریق علاج کا خود یورپ جاکر بہت تفصیل و محنت سے مطالعہ کیا اور خود بھی اس کے مطابق کئی جراحی عمل کرچکے ہیں —

(ھ)

مبادی علم المعیشت

(مولفہ آغا محمد اشرف صاحب - حسب فرمائش شیخ مبارک علی
تاجر کتب - اندرون لوہاری دروازہ - لاہور - قیمت بارہ آنے)

یہ کتاب چار حصوں پر منقسم ہے - پہلے حصے میں صرف دولت ' دوسرے میں پیداوار دولت ' تیسرے میں تبادلہ ' اور چوتھے میں تقسیم دولت کے مسائل سے بحث کی گئی ہے - معاشی مسائل کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے - اس کتاب کی تقریب میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب " علم المعیشت کے طلبہ کی سہولت " کے لیے لکھی گئی ہے - ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ طلبہ کے لیے یہ کتاب مفید ہوسکتی ہے - ہر حصے کے آخر میں طلبہ کی مشق کے لیے سوالات بھی درج ہیں —

اردو کے جدید رسالے

کاروان

(مرتبہ پروفیسر تاثیر صاحب ایم اے - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے - پتہ :
منیجر رسالہ کاروان - چابک سواران - لاہور)

سال نامہ کاروان علم و ادب اور آرٹ کے ذریعہ اردو زبان کی خدمت کرنا چاہتا ہے - یہ خیال نہایت مبارک ہے اور ہر شخص کو اس سے ہمدردی ہونی چاہئیے - مرتب نے " سخنہائے گفتنی " میں اپنے مقاصد کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ " کاروان ان ادبا کو صلائے عام دیتا ہے جو وبائی رسائل میں مضامین بھیجنے سے اس لئے احتراز کرتے ہیں کہ وہاں ہر

رطب و یابس کی نکاسی ہوتی ہے " - یہ بہت نیک اور عمدہ ارادہ ہے - فی الواقع اس کی سخت ضرورت ہے کہ اردو کے رسائل کا معیار بلند کیا جائے - اس میں مضائقہ نہیں کہ کچھ رسالے نوبشق ادیبوں کے لئے ہوں لیکن چند رسالے ایسے بھی ہونے چاہئیں جن میں صرف اعلی معیار کے مضامین شائع ہوا کریں —

ظاہری اعتبار سے رسالۂ کارواں میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو اس قسم کے رسالے میں ہونی چاہئیں - لکھائی چھپائی نہایت عمدہ ہے - لیکن ہمیں یہ کہتے ہوے افسوس ہوتا ہے کہ مضامین کا جو معیار ہونا چاہیئے وہ نہیں ہے - اس رسالے میں ۳۱۳ صفحوں کے اندر ۸۵ مضامین ہیں - اتنے زیادہ مضامین کی جگہ اگر چند اعلی پایہ کے مضامین ہوتے تو یہ رسالہ اپنی خصوصیت قائم کرلیتا - بیشتر مضامین کا معیار وہی ہے جو اور دوسرے رسالوں میں ہمیں نظر آتا ہے - اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رسالے کی اس اشاعت میں اعلی پایہ کے مضامین نہیں - بعض علمی مضامین در حقیقت اعلی پایہ کے ہیں - " آئین نغمے " اور " دعاے صحرا " اور یگانہ صاحب کی " رباعیات " اعلی معیار کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں - ادبی مضامین نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ ہوگئے ہیں بلکہ ہمیں اس میں بھی شبہ ہے کہ آیا واقعی ان کا معیار وہی ہے جو مرتب اور ان کے احباب کے پیش نظر ہے - ادب لطیف اور آرٹ اردو میں نئی چیز ہے - کسی قوم کا ادب بغیر ان کے معراج ترقی تک نہیں پہنچ سکتا - لیکن اس وقت عام طور پر ادب لطیف کے مضامین کی اردو زبان میں جو وبا پھیلی ہوئی ہے اس کی روک تھام ضروری ہے ورنہ ممکن ہے کہ وہ قوم کے مذاق میں اس قدر دخل حاصل کرلے کہ اصلاح ناممکن ہوجاے - اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے ایک خاص سلیقہ درکار ہے جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوسکتا —

لیکن ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اس رسالے کی تصاویر دوسرے رسائل کے مقابلے میں اعلی معیار رکھتی ہیں - اگر ادب اور آرٹ کے مضامین میں بھی یہی معیار پیش نظر رکھا جاتا تو یقیناً رسالہ اس سے بہتر ہوتا جیسا اب ہے —

آخر میں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے - مرتب نے

" سخنہاے گفتنی " میں لکھا ہے کہ وہ اور ان کے چند احباب علامہ اقبال کے پاس ان کا کلام رسالے کے لیے لینے کی غرض سے گئے اور ان سے کہا " اردو میں آپ نے دیر سے نہیں لکھا ۔ اردو بہ حیثیت زبان کے مستحق امداد ہے... مسلمانان ہند کو اور کون اُبھارے گا " ۔ اس پر علامہ نے فرمایا : " اردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے۔ فارسی کو چھوڑ کر اردو میں شعر کہنا سنگ مرمر کی بجاے گارے کی عمارت بنانا ہے " ۔ علامہ جیسے ہوش مند شخص سے ہمیں اس کی توقع نہ تھی کہ وہ اردو کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کریں گے ۔ یہ مانا کہ اردو ایک نئی زبان ہے اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ بعض وقت دقیق مطالب کو ادا کرنے میں دشواری اور الجھن ہوتی ہے ۔ لیکن دنیا کی ہر زبان اس دور سے ہوکر گذری ہے ۔ کچھ عرصہ قبل بنگالی زبان اردو سے بھی زیادہ تہی مایہ تھی لیکن پچاس سال کے اندر وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ ٹگور اور ان کی طرح کے چند اعلیٰ قابلیت کے لوگوں نے اس کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ۔ علامہ نے تعجب ہے شاعر ہوکر یہ کہا کہ " اردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے " ۔ دنیا کی مذہبی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ پیغمبروں کو ہمیشہ خود ان کی زبان میں وحی والہام ہوا ہے ۔ ایسا ہونا ، بالکل قدرتی امر ہے ۔ اگر اس کے خلاف ہوتا تو محل تعجب تھا ۔ پھر اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ دنیا کی ہر زبان میں الہامی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے ۔ اگر کسی کو اپنے تاثرات اور کیفیات قلبی دنیا کے روبرو پیش کرنی ہیں تو وہ جس خوبی اور سچائی کے ساتھ اس کام کو اپنی زبان میں کرسکتا ہے دوسری زبان میں کبھی بھی نہیں کرسکتا ۔ اگر کسی کو واقعی کچھ کہنا ہے تو اس کی زبان اس کے لیے پوری صلاحیت رکھتی ہے ۔ علامہ کو اپنے فارسی کلام پر بجا ناز ہے لیکن انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ وہ لوگ جن کی زبان میں وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کے کلام میں وہ لطف اور اثر محسوس نہیں کرتے جو اپنے ملک کے شاعر کے کلام میں محسوس کرتے ہیں۔ اگر علامہ اپنی فارسی شاعری کے ذریعہ سے صرف خیالات کی اشاعت چاہتے ہیں تو اس کے لیے نظم کی بجاے نثر بہتر ہوگی ۔ خیالات کی اشاعت نثر کے ذریعہ سے ٹھیک اور بہتر طریقہ سے ہوسکتی ہے ۔ رہا " آپ

و رنگ شاعری " کا خیال تو اس کے علامہ اصولا قائل نہیں اگرچہ " پیام مشرق " ان کی اس باب میں نہایت کامیاب کوشش ہے —

در اصل زبان اردو کی صلاحیتیں ہمارے نزدیک اتنی ہی وسیع ہیں جتنی ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی ترقی کے معیار کی بلندی - زبان ایک جماعتی ادارہ ہے - ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعتی زندگی صرف اردو کے ذریعہ اپنے فکر و احساس کی بلندیوں کو ظاہر کرسکتی ہے - ہم نے علامہ کے کلام کا ایک ایک حرف پڑھا ہے - ان کے خیالات میں کوئی ایسی بات نہیں جو اردو کے ذریعہ ادا نہ ہوسکے - جہاں تک احساس کا تعلق ہے وہ یقیناً اردو میں بہتر طریقے سے ادا کیا جاسکتا ہے کیونکہ اردو ان کی زبان ہے - ہاں، اگر علامہ اردو کو اپنی زبان تسلیم کرنے کو طیار نہیں تو خیر، پھر تو بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی - تاہم اُن کا یہ کہنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ " فارسی کو چھوڑ کر اردو میں شعر کہنا سنگ مرمر کی بجائے گارے کی عمارت بنانا ہے " —

مرتب کارواں اور ان کے احباب کے اصرار پر علامہ نے جو غزل فی البدیہہ کہی ہے اس سے ان کے شاعرانہ کمال کا اظہار ہوتا - ان کا موضوع کلام اور طرز ادا مخصوص ہے چنانچہ اس غزل میں بھی وہی موضوع موجود ہے - یہاں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں —

اپنی جولان گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
تھی کسی در ماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(ی)

آئینہ

(اڈیٹر محمد اسحاق صاحب امرتسری - کلکتہ ۔
سالانہ چندہ دو روپے آٹھ آنے)

یہ ماہانہ رسالہ کلکتہ سے شائع ہوتا ہے - علمی اور ادبی رسالہ ہے ۔ مضامین موضوع کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں - فسانے اور نظمیں بھی ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں ۔ اڈیٹر قابل اور آزاد خیال شخص ہیں اور اپنی رائے کے اظہار میں بے ریا اور کسی قدر بے باک ہیں ۔ کلکتہ سے ایسے رسالے کا شایع ہونا بہت غنیمت اور قابل قدر ہے - مضمون لکھنے والے بھی اچھے ملے ہیں

یادگار

(اڈیٹر نیر صاحب بی - اے لاہور)

یہ رسالہ ماہانہ لاہور سے سایع ہوتا ہے - صرف ادبی مضامین ہوتے ہیں ۔ تصویروں کا بھی اهتمام کیا گیا ہے - نامور شعرا کی غزلیں اور نظمیں بھی موجود ہیں - ایک ناول بھی مسلسل سایع ہورہا ہے - رسالہ دلچسپ ہے —

معیار

(اڈیٹر ڈاکٹر فیض قادری صاحب' پی ایچ - ڈی - و ابراهیم شاہ
صاحب کلکتہ - سالانہ چندہ دو روپے)

یہ ماہانہ رسالہ ابھی حال میں کلکتہ سے شایع ہونا شروع ہوا ہے اور

ابھی دو ہی نمبر شایع ہوے ہیں۔ رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے اور امید ہے کہ مفید ثابت ہوگا ۔ مارچ کے رسالے میں بنگالے کے نامور شاعر قاضی نذر الاسلام صاحب کے مختصر حالات مع تصویر کے شایع ہوے ہیں ۔ نیز قابل اڈیٹر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بنگال کے اردو اہل قلم کے حالات وقتاً فوقتاً شایع کرتے رہیں گے ۔ یہ بڑی خدمت ہوگی —

بزم خیال

(اڈیٹر لیاقت علی صدیقی صاحب عاشقی شرقی ۔
شیلانگ ۔ سالانہ چندہ تین روپے)

یہ رسالہ شیلانگ سے شایع ہوتا ہے ۔ ایک ایسے مقام سے اردو کے رسالے کا شایع ہونا بہت قابل قدر ہے ۔ علمی اور ادبی مضامین اور نظمیں اچھی خاصی ہیں ۔ تصویریں بھی ہوتی ہیں ۔ لکھائی چھپائی میں اصلاح کی ضرورت ہے —

زبان ہند

(اڈیٹر ہرگوبند پرشاد صاحب ایم ۔ اے دہلوی ۔ کراچی
سالانہ قیمت تین روپے)

بظاہر یہ اردو زبان کی ترقی کے آثار ہیں کہ نئے نئے رسالے کلکتہ، کراچی اور شیلانگ سے شایع ہورہے ہیں ۔ یہ رسالہ اسی سال سے شایع ہونا شروع ہوا ہے ۔ اس میں قابل اڈیٹر نے ادب کی دلچسپیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے ۔ رسالے کے شروع میں ایک مضمون " سندھ میں اردو " کے عنوان

سے شایع ہوا ہے جس میں سندھ کے دو شاعروں یعنی سید ضیاءالدین ضیا اور ملا باقر شہید کے حالات اور کلام کا کچھہ نمونہ درج ہے - یہ دونوں صاحب خاص سندھ کے باشندے تھے - اس سے اردو کا عالمگیر ہونا ثابت ہوتا ہے - قابل اڈیٹر نے یہ رسالہ محض ہندوستانی زبان کو فروغ دینے کی خاطر سے نکالا ہے اور امید ہے کہ وہ اسے استقلال سے جاری رکھیں گے —

بشریٰ

(اڈیٹر ابوالجلال صاحب ندوی و عبد الرزاق صاحب دیوبندی
مونٹ روڈ مدراس - سالانہ قیمت تین روپے)

یہ ماہانہ رسالہ مدراس سے اس سال کی ابتدا سے شایع ہوا ہے - یہ مذہبی اور علمی رسالہ ہے - لیکن اس کا ساتھہ غزلوں ، نظموں اور افسانے کی بھی چاشنی موجود ہے - مدراس میں ایک ایسے اردو رسالے کی بہت ضرورت تھی اور ہمیں یقین ہے کہ اس رسالے کے فاضل اڈیٹر اپنے فرائض کو وہاں کے حالات مدنظر رکھکر بخوبی انجام دیں گے - فاضل اڈیٹروں نے اپنے شذرات میں مغرب زدہ مسلمانوں کی المناک مذہبی بیگانگی اور تغافل پر افسوس ظاہر کیا ہے لیکن شاید لکھتے وقت انہیں یاد نہیں رہا کہ مشرق زدہ مسلمانوں کی حالت اُن سے زیادہ قابل افسوس ہے - فاضل اڈیٹروں کی خدمت میں باادب یہ التماس ہے کہ وہ اس طریقۂ انشا و خیال کی پیروی نہ فرمائیں جو ہمارے دو نامور ہم عصروں کی مخصوص روش ہے - مغرب و اہل مغرب یا مغربی تعلیم یافتہ اصحاب پر سب و شتم کرنے سے اصلاح نہیں ہوسکتی - یہ صرف اپنے ہم خیال دوستوں ، نادان پیروں یا سادہ لوح مسلمانوں کو خوش کرنے کا ڈھنگ ہے —

رسالے کا جو دستور العمل قرار دیا گیا ہے وہ بہت معقول اور کار آمد ہے اور اس پر کاربند ہونے سے ضرور فائدہ پہنچے گا —

مبلغ

(اڈیٹر الوالبلاغہ سید علی داور صاحب صدرالا فاضل - لکھنؤ -
سالانہ قیمت دو روپے آٹھہ آنے)

یہ رسالہ ایک عرصے سے لکھنؤ سے شایع ہورہا ہے - اس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے - یہ خالص مذہبی رسالہ ہے لیکن علمی اور اخلاقی مضامین بھی ہوتے ہیں - جو صاحب مذہبی مضامین اور مسائل سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے پڑھنے کے قابل ہے —

حاذق

(اڈیٹر حکیم سید محمد حسن صاحب رضوی و حکیم
سید عطاءالرحمن صاحب قرول باغ دھلی-سالانہ چندہ دو روپے)

یہ ماہانہ طبی رسالہ ہے اور اسی سال کے شروع میں اس کا اجرا ہوا ہے - رسالے کے اڈیٹر طبیہ کالج دھلی کے قدیم طالب علم ہیں اور وہ اس کے ذریعہ سے اس فن شریف کی خدمت کرنا چاھتے ہیں - رسالے کے پہلے نمبر سے جو ہمارے سامنے ہے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے - رسالے کی ترتیب اور مضامین کی نوعیت بہت امید افزا ہے اور قابل اڈیٹروں نے استقلال سے اس کام کو جاری رکھا اور اس کی ترقی میں کوشش کرتے رہے تو اردو کے طبی رسالوں میں یہ سب سے فوقیت لے جاے گا - اس رسالے میں انھوں نے اُسی اصول کو مدنظر رکھا ہے جو مرحوم حکیم اجمل خاں نے طبیہ کالج کے قائم کرنے میں رکھا تھا - دتنے مضامین اس رسالے میں درج ہوں وہ اپنی اپنی خصوصیت کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں -

حسن کار

(اڈیٹر سید محمد اکبر وفا قانی ' بی ۔ اے (عثمانیہ)
حیدرآباد دکن سالانہ چندہ چھہ روپے)

یہ نیم ماہانہ جریدہ ہے ۔ اس میں تصویروں اور کارٹونوں کا بہت خوب انتظام کیا گیا ہے ۔ ایسا مصور جریدہ اردو میں کوئی دوسرا نہیں ہے ۔ مضامین بھی بہت دلچسپ ہیں اور بعض مصور ہیں ۔ سیاسیات سے اس اخبار کو مطلق کوئی تعلق نہیں ۔ باقی ہر قسم کے مضامین معاشرتی ' تاریخی مزاحی وغیرہ شایع ہوتے ہیں ۔ جریدے کے دیکھنے سے قابل اڈیٹر کا ذوق اور سلیقہ معلوم ہوتا ہے ۔ اگرچہ حیدرآباد میں چھپائی کا انتظام اچھا نہیں تاہم اس جریدے کی طبع میں صفائی کی پوری کوشش کی گئی ہے —

دستور

(اڈیٹر آزاد دہلوی ۔ دہلی ۔ سالانہ قیمت چھہ روپے)

یہ ہفتہ وار باتصویر اخبار دہلی سے اسی سال شایع ہوا ہے ۔ تصویروں کا انتظام نہایت عمدہ ہے ۔ علاوہ سیاسی معاملات حاضرہ کے ہر قسم کے حالات مثلاً معاشرتی ' معاشیاتی ' فلم و اسٹیج ' طبقہ نسوان وغیرہ سے بحث ہوتی ہے اور حتی الامکان ضروری معلومات کے بہم پہنچانے میں کوشش کی گئی ہے ۔ اردو میں ایسا اچھا ہفتہ وار اخبار اس وقت کوئی نہیں ہے —

فہرستِ مضامین

مرحوم دهلی کالج

(۱)

از اڈیٹر

مرحوم میں اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ایک عزیز چیز تھی جسے زمانے کے اتفاقات اور حالات نے عین ایسے وقت میں زندہ دفن کردیا جب کہ اس کے عروج کا وقت آیا تھا اور جب کہ وہ گذشتہ تجربوں سے سبق حاصل کر کے ملک کے لئے تبلیغ علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز بن سکتا تھا۔ اس کے ثبوت میں صرف ان ناموں کا گنا دینا کافی ہے جنھوں نے محض اس کالج کے فیض سے ملک میں علم کی روشنی پھیلائی اور علم کی ایسی خدمت کی جو مدتوں یادگار رہے گی۔ اس نے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا جس سے بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق میں ہو نہیں سکتا۔ اگرچہ اس کے مٹتے ہی یہ طریقہ بھی مٹ گیا لیکن اتنی مدت کے تجربے کے بعد ہماری یونیورسٹیاں رفتہ رفتہ پھر اسی طرف عود کر رہی ہیں اور آخر وہی ڈھنگ اختیار کرنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں اسے مرحوم تو کیا شہید بھی کہیں تو بجا ہے۔ کیوں کہ وہ بلا وجہ اور بغیر کسی الزام کے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ دلی کو سیاسی انقلاب نے جہاں اور داغ دیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ افسوس اب لوگ اس کا نام بھی بھولتے جاتے ہیں۔ اب میں اس عزیز کی کہانی جہاں تک مجھے نئے پرانے کاغذات اور کتابوں میں

میں ملی یا اس کے سوگواروں کی زبانی معلوم ہوئی ہے ' آپ کو سناتا ہوں اور اس کے کارناموں کی یاد دلاتا ہوں —

تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس تعلیم گاہ کی ابتدا سنہ ۱۷۹۲ ع میں ہوئی * لیکن مسٹر ٹامسن وزیٹر † اورنٹیل کالجز ممالک مغربی شمالی اپنی تعلیمی رپوٹ بابت سنہ ۱۸۴۱-۴۲ ع میں لکھتے ہیں کہ اورنٹیل کالج دہلی کو عالم وجود میں آئے سولہ سال ہوتے ہیں - اس حساب سے اس کی ابتدا کا سنہ ۱۸۲۵ ع ہوتا ہے - لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا' اس لئے کہ گورمنٹ آف انڈیا کی تعلیمی اور دفتری تحریروں میں اس کے ابتدائے قیام کا سنہ ۱۷۹۲ ہی لکھا ہے - اور ۱۸۳۸-۳۹ ع کی تعلیمی رپوٹ میں اس سال کو کالج کا سیلتا لیسواں سال اور سنہ ۱۸۴۰ ع کی رپوٹ میں چالیسواں سال بتایا ہے - مسٹر ٹامسن نے غالبا اس کے قیام کا شمار اس وقت سے کیا ہے جب اس کی جدید تنظیم ہوئی اور انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس کا آغاز سنہ ۱۷۹۲ ع میں ہوا - اور قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بسم‌اللہ دہلی کی اس خوبصورت اور تاریخی عمارت میں ہوئی جو غازی الدین خاں کے مدرسے کے نام سے مشہور ہے اور نواب غازی‌الدین خاں فیروز جنگ ثانی خلف نواب نظام‌الملک آصف جاہ کا بنایا ہوا ہے - مخیر بانی کی نیک نیتی کا پھل ہے کہ اب تک وہاں تعلیم کا فیضان جاری ہے اور اینگلو عربک اسکول جو اب کالج ہوگیا ہے ' سالہاسال سے اس کے درس و تدریس کا سلسلہ وہیں قائم ہے

* دی بنگال اینڈ آگرہ اینول گائڈ اینڈ گزیٹیر سنہ ۱۸۴۱ ع
† وزیٹر اس زمانے میں ایسا ہی تھا جیسے آج کل انسپکٹر

البته یه نهیں کهلتا که اس وقت مدرسے کی کیا حالت تهی، تعلیم کیسی هوتی تهی تعلیم دینے والے کون تهے، دلی میں مقبول تها یا نهیں۔ غرض اس کے سی ساله حالات پر بالکل پرده پڑا هوا هے۔ قیاس غالب یه هے که یهاں بهی مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجه تعلیم هوتی هوگی اور وهی رنگ هوگا جو اُس وقت دوسرے مدرسوں کا تها۔ کیوں که سنه ۱۸۲۵ ع سے قبل اُن مدارس میں بهی جو سرکاری کهلاتے تهے، مشرقی السنه و علوم هی کی تعلیم دی جاتی تهی اور اُن میں وهی پرانا طریقهٔ تعلیم، وهی حالات اور وهی رنگ تها۔ اس کی تصدیق بعض سرکاری تحریروں سے بهی هوتی هے خصوصاً ناظم تعلیمات احاطهٔ بنگال کے تعلیمی تبصرے سے جس کا خلاصه ذیل میں دیا جاتا هے —

سنه ۱۸۲۳ ع کے اواخر میں مجلس تعلیم عامه (General Committee of Public Instruction) نے ایک مطبوعه گشتی چٹهی دهلی، آگره اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کی، جس میں اُن اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کیے گئے تهے۔ نیز یه بهی دریافت کیا گیا تها که ان مقامات میں توسیع و ترقیٔ تعلیم کے لئے کیا کیا وسائل اور ذرائع اختیار کئے جاسکتے هیں۔ اُن کے استفسارات یه تهے که اُن اضلاع کے قصبات و دیهات میں کون کون سے مکتب یا تعلیم گاهیں هیں۔ اُن میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی هے اور کون کون سی کتابیں پڑهائی جاتی هیں۔ اُن میں سے کون کون سے مدارس سرکاری امداد و اعانت کے مستحق معلوم هوتے هیں اور اس امداد کی کونسی صورت زیاده مناسب اور بهتر هوگی۔ ان سب امور کے بیان کرنے کے بعد یه اطلاع بهی دی گئی که گورنمنٹ کا منشا دلی میں کالج قائم کرنے کا هے۔ نیز کمیٹی نے یه خواهش بهی ظاهر کی که اگر اُن مقامات میں ایسے اوقاف

موجود ہوں جو تعلیمی اغراض کے لئے کام آسکیں تو ان سے بھی مطلع کیا جاے —

دہلی کی مقامی مجلس نے جنوری سنہ ۱۸۲۴ ع میں اپنا جواب بھیجا جس میں اُس نے مختلف امور سے بحث کی ہے - اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہاں بہت سے خانگی مدارس موجود ہیں اور جیسا کہ مسلمانوں میں دستور ہے یہ کار خیر سمجھہ کر قائم کئے گئے تھے - ان مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ہوتی ہے - طالب علموں کا بہت سا وقت قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے اور فقہ کی تعلیم میں صرف ہوتا ہے - آبادی کے مقابلے میں طالب علموں کی تعداد بہت ہی کم ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کچھہ نہیں - حاضری بے قاعدہ ہے اور جو تعلیم کہ ان مدرسوں میں دی جاتی ہے اس سے بہت ہی کم فائدہ پہنچتا ہے —

اس جواب میں اس کا ذکر بھی تھا کہ کچھہ دنوں پہلے یہاں متعدد درسگاہیں حکومت وقت کی طرف سے قائم تھیں لیکن اب وہ نہایت خراب و خستہ حالت میں ہیں - ان کے مصارف کے لئے جو انتظام تھا وہ سیاسی انقلاب کی وجہ سے درہم برہم ہوگیا ہے اور اب اُن رقوم کا پھر حاصل کرنا امکان سے باہر ہے —

دہلی میں سرکاری درسگاہ کے قیام کے متعلق مقامی مجلس نے لکھا کہ اس کی امداد کے لئے ساڑھے تین ہزار روپے سالانہ کی گنجائش نکل سکتی ہے اور کچھہ دنوں بعد اس میں اضافہ بھی ممکن ہے —

اس مجلس نے یہ بھی لکھا کہ دہلی جیسے آباد شہر میں ایسے اشخاص کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے جو کسی زمانے میں بہت مرفہ الحال تھے لیکن سیاسی تغیرات کی وجہ سے اب نان شبینہ کو محتاج ہیں مگر اس

پر بھی وہ کسی ادنیٰ پیشے کو اختیار کرنا باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر مجوزہ کالج قائم ہوگیا تو اس قبیل کے بعض لوگ ضرور اس کی طرف مائل ہوں گے تاکہ تعلیم پاکر عزت سے بسر کرسکیں —

مجلس نےیہ بھی تجویز کیا کہ یہ کالج بلا تاخیر فوراً قائم کردیا جائے اور تعلیم کے لئے مولویوں کا تقرر کیا جائے۔ اور چونکہ یورپی علوم کی تعلیم اس کا خاص مقصد ہوگا لہذا بعض اعلیٰ درجے کی کتابیں جو مشرقی زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہوں، اس کالج کے لئے مہیا کی جائیں۔ مجلس نے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ اس نئے طریقے کے جاری کرنے میں اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ طالب علموں کے لئے اس میں ایسی کشش ہو کہ وہ خوشی خوشی اس تعلیم کو حاصل کریں اور وہ کشش ملازمت کی توقع ہوسکتی ہے —

مجلس نے اپنے جواب کو بہت ہی پرجوش الفاظ پر ختم کیا ہے جن سے دلی کی محبت ٹپکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں —

"جب آپ کی کمیٹی کے ارکان اس ملک کے گزشتہ عہد کے عروج اور شان و شوکت کو یاد کریں گے جب کہ دلی اس عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا شاندار دارالخلافہ تھی، جو علوم و فنون کی سر پرستی اور ہنر پروری کے لئے چار دانگ عالم میں مشہور تھی اور اس کے زرخیز و خوش حال خطوں کے فرزند علم کے شوق میں اس مشرقی علوم کے گہوارے میں جوق جوق آتے تھے اور جہاں ایسے ایسے شاعر اور حکیم پیدا ہوئے ہیں جن کے نام اب تک تاریخ کے صفحات پر یادگار ہیں۔

اور پھر جب آپ کے ارکان اُن بیشمار تعلیم گاہوں کے
کھنڈروں کا خیال کریں گے جو اُن شاہانہ فیاضیوں کے
آثار ہیں جو علم کی اشاعت و ترقی کے لئیے وقف تھیں
اور اب خراب و خستہ اور شکستہ حال ہیں - اور جب
وہ گزشتہ عہد کی اُن مقدس علمی یادگاروں کو دیکھیں
گےجن پر اب ویرانی و بیکسی برستی‌ہے اور کوئی‌ان
کا پرسان حال نہیں تو ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ارکان کے
دلوں میں دلی کی ہمدردی کا جوش پیدا ہوگا اور
آپ ' جن کے ہاتھوں میں رعایا کی دماغی ترقی و اصلاح
کا کام تفویض کیا گیا ہے ' ضرور دلی کے لیے اس
عطیے کا ایک حصہ مخصوص کردیں گے جو گورمنٹ نے اس
غرض کے لیے منظور کیا ہے " —

جس عطیے کی طرف اوپر کی تحریر میں اشارہ کیا گیا ہے یہ وہ رقم تھی جو جنرل کمیٹی کی تفتیش حالات تعلیم کے بعد ایست انڈیا کمپنی کے نظما کی سفارش پر پارلیمینٹ نے ہندوستان کی تعلیم کے لیے سنہ ۱۸۲۴ ع میں منظور کی تھی - اس کی کل مقدار ایک لاکھ روپیہ تھی —

غرض اس مجوزہ کالج کا افتتاح سنہ ۱۸۲۵ ع میں ہوا اور اُس " شاہانہ عطیے " میں سے اس کالج کے لیے پانسو روپیہ ماہانہ مقرر کیے گئے - مسٹر جے - ایچ ٹیلر مقامی مجلس کے سکرٹری ایک سو پچھتر روپیہ ماہانہ پر اس کے پرنسپل مقرر ہوے - ہیڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپیہ قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے ' باقی پچیس پچیس اور تیس تیس کے تھے ' طلبہ کے لیے بھی وظائف مقرر ہوئے سالانہ رپوٹیں باقاعدہ مجلس تعلیم عامہ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں جن میں

مولویوں کے عزل و نصب ' سالانہ امتحانات کے نتائج اور دوسرے امور متعلق کالج درج ہوتے تھے —

انگریزی زبان کی تعلیم کی ابتدا

سنہ ۱۸۲۸ ع میں جب سر چارلس مٹکاف برٹش ریذیڈنٹ کمشنر کی سفارش پر کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا تو لوکل فنڈ کی تعلیمی بچت سے دو سو پچاس روپے * اور کالج کے لیے منظور کیے گئے —

اس بدعت سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی - دیندار بزرگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کے مذہب بگاڑنے اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب کے پھیلانے کی ترکیب ہے - یہی مشکل بنگال میں بھی پیش آئی تھی ' لیکن وہاں راجہ موہن رائے جیسا روشن خیال اور زبردست رہنما موجود تھا ' وہاں یہ آندھی اُٹھی تو سہی مگر چند ہی روز میں بیٹھ گئی - وہاں مخالفت برہمنوں سے شروع ہوئی تھی تو یہاں مسلمان پیش پیش تھے - یہ بدگمانی کچھ زیادہ بیجا بھی نہ تھی - بات یہ ہے کہ ابتدا میں جب لڑکے انگریزی مدرسوں میں داخل ہوئے اور انہوں نے وہاں نئی نئی چیزیں دیکھیں اور پڑھیں تو وہ اس قسم کی واہی تباہی باتیں کرنے لگے جس سے پرانے خیال کے لوگوں کو خواہ مخواہ بدگمانی کا موقع ملا - یہ بھی ایک وجہ ہے (جیسا کہ آگے چل کے معلوم ہوگا) کہ مسلمان طلبہ کی تعداد انگریزی شعبے میں

---

* مسٹر ٹامس فشر (searcher of Records) نے جو یاد داشت سنہ ۱۸۲۸ ع میں ایسٹ انڈیا ہوس میں مرتب کی تھی اس میں تحریر ہے کہ دھلی کالج کے لیے چھ سو روپے ماہانہ تعلیمی فنڈ سے اور دوسو پچاس روپے ماہانہ دھلی کے فنڈ سے منظور کئے گئے اور دھلی مدرسہ کے لیے سات سو روپے ماہانہ اور اس کے علاوہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مسٹر ٹیلر کا الونس منظور کیا گیا جو اس کے مہتمم مقرر ہوئے -

انگر کم رھی - مولانا حالی نے ایک موقع پر اس کا اشارہ کیا ھے جس سے اس وقت کے خیالات کا اندازہ ھوتا ھے وہ لکھتے ھیں کہ

" اگرچہ اِس وقت قدیم دھلی کالج خوب رونق پرتھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وھاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر قصبۂ پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ھی سننے میں نہیں آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھہ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ھے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ھوتا ہے - بلکہ بر خلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ھمارے علما مجہلے کہتے تھے - دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھہ کو شب روز رھنا پڑا وھاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاھل سمجھتے تھے - غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا - ڈیڑھ برس دھلی میں رھنا ھوا اس عرصے میں کبھی کالج کو جاکر آنکھہ سے نہ دیکھا اور نہ اُن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ھوا جو اس کالج میں تعلیم پاتے تھے "

مگر رفتہ رفتہ یہ تعصب کم ھوتا گیا - زمانہ ایسی چیزوں کی اصلاح خود کر دیتا ھے - اگر چہ بعد میں بعض واقعات ایسے پیش آے کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ان کی بدگمانی بیجا نہ تھی —

نواب اعتماد الدولہ کا وقف

سنہ ۱۸۲۹ ع کی رپوٹ * غیر معمولی طور پر دلچسپ ھے - ایک بات تو قابل ذکر یہ ھے کہ ایک اعزازی جماعت ایسی بنائی گئی جس نے طلبہ میں خاص جوش اور شوق پیدا کردیا - دوسری چیز کتب خانے کی توسیع ھے اور ان کے علاوہ سب سے بڑھ کر قابل ذکر اور لائق ستائش بادشاہ اودہ کے وزیر کا فیاضانہ عطیہ اور وقف ھے جس کا مختصر واقعہ یہ ھے —

* تبصرہ تعلیم عامہ احاطہ بنگال نوشتہ مسٹر جے - کر بابت سنہ ۱۸۳۵ ع تا سنہ ۵۱ ع (حصہ دوم - باب ۹)

نواب اعتمادالدوله سید فضل علی خاں بهادر وزیر بادشاه اوده نے دهلی کے رزیڈنٹ سے یه خواهش ظاهر کی که وه ایک لاکهه ستر هزار کی رقم اس غرض سے گورمنٹ کے حوالے کرنا چاهتے هیں که اس کی آمدنی سے دهلی میں مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے واسطے ایک درس گاه قائم کی جاے اس کی صورت وقف کی هوگی اور یه رقم گورمنٹ کے پانچ فیصدی والے قرضے میں لگا ی جاے —

گورمنٹ نے اس فیاضانه عطیے کو نهایت شکریے کے ساتهه قبول کیا مگر جنرل کمیٹی تعلیم عامه کے مشورے کے بعد نواب صاحب کو جو راے دی وه رزیڈنٹ دهلی کی حسب ذیل تحریر میں مندرج هے —

" اس خیال سے که پانسو روپے ماهوار مقصد پیش نظر کی تکمیل کے واسطے کافی نهیں هیں لاٹ صاحب دوستانه مشوره دیتے هیں که مذکورهٔ بالا مقصد کے لئے جو رقم آپ خرچ کرنا چاهتے هیں اگر اسے اس رقم میں شامل کرلیا جائے جو گورمنٹ نے شهر دهلی میں اپنے کالج کے واسطے مقرر کی هے اور یه دونوں رقمیں مل کر موجوده کالج پر خرچ هوں تو لوگوں کو متوقع نفع حاصل هو گا اگر آپ اس تجویز کو منظور فرمالیں گے تو آپ گورمنٹ کالج کے معاملات کے مهتمم یا افسر سمجهے جائیں گے اور پروفیسروں اور طلبه کا تقرر آپ کے نام سے هوگا ۔"

نواب صاحب نے اسے منظور فرمایا اور سنه ۱۸۳۰ ع میں جو وصیت نامه نواب صاحب نے اس کے متعلق تحریر فرمایا اس میں یه الفاظ درج هیں —

"................. میں ایک لاکھ ستر هزار کی رقم
نیک نیتي سے اس کالج کی امداد کے واسطے برٹش
گورمنٹ کی تحویل میں چھوڑتا هوں جو نواب
غازی الدین خاں سرحوم نے میرے وطن دهلی میں عربی
و فارسی علوم کی ترقی و تعلیم کے واسطے قائم کیا تھا
جو میرے مذهبی علوم هیں اور اخلاق کے سر چشمه هیں
اور میں وصیت کرتا هوں که رقم موقوفه کا منافع ان
علوم کے طلبه اور اساتذه پر خرچ کیا جائے"

اس وصیت نامے میں انھوں نے اپنے داماد سید حامد علی خان کو ان شرائط کا نگراں بنایا تھا که اگر گورمنٹ کی طرف سے بوجه کثرت مشاغل یا دیگر غیر متوقع اسباب کی وجه سے تساهل واقع هو تو وه گورمنٹ کو اس طرف توجه دلائیں اور بصورت ناکامی گورمنٹ سے ایک جداگانه کالج قائم کرنے کی درخواست کریں * —

سنه ۱۹۳۰ ع میں نواب صاحب کا انتقال هوگیا - مگر افسوس که حسب وعده نه پروفیسروں اور طلبه کا تقرر ان کے نام سے هوا نه وظائف ان کے نام سے دئے گئے نه کسی قسم کی کوئی یادگار کالج میں ان کی قائم کی گئی ۔ البته اتنا ضرور هوا که اس رقم سے کالج کی آمدني میں اضافه هوگیا - نواب حامد علی خاں نے اس رقم کے بیجا صرف هونے کی طرف بارها توجه دلائی اور اهل دهلی نے اس رقم سے علحده کالج بنانے کی بھی درخواست کی لیکن کوئی نتیجه نه نکلا سوائے اس کے که نواب حامد علی خان بھی کالج کمیٹی کے

چھپیس
قومس
میں

---

* کانفرنس گزٹ علی گڑه - ۱۵ نومبر سنه ۱۹۳۰ ع ترجمه مضمون مستر سها

مہر بنادئے گئے - آخر جہاں یہ جانہار کالج گیا وہیں یہ عطیہ بھی گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کیا حشر ہوا —

کالج کی ترقی کا سال

اس سال کی رپوٹ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سال کالج کے بڑے عروج کا زمانہ تھا - امتحان کی کامیابی پر عام طور سے بڑی تعریف و تحسین ہوئی - سکرٹری صاحب اپنی رپوٹ میں لکھتے ہیں کہ جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے اس لئے کہ طلبہ کی استعداد ایسی عمدہ اور ان کے جوابات ایسے کامل تھے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مشکل تھی - بہت سے دیسی شرفا جو امتحان کے وقت موجود تھے ' اپنے شہر کے ہونہار بچوں کی لیاقت دیکھہ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے —

انگریزی جماعت کی علحدگی

غالباً اسی زمانے میں لوگوں کی مخالفت اور شور و غوغا کی وجہ سے انگریزی جماعت مشرقی مدرسہ سے علحدہ کردی گئی - لیکن یہ علحدگی برائے نام تھی ' پرنسپل دونوں کے ایک ہی تھے اور نگراں کمیٹی بھی ایک ہی تھی —

اگر چہ ابتدا میں انگریزی جماعت کے قیام کی بہت کچھہ مخالفت ہوئی مگر تین ہی سال میں (یعنی سنہ ۱۹۳۱ ع میں) انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد تین سو * تک پہنچ گئی - یہ زمانے کی ہوا تھی —

اس زمانے کی دلی

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز ملک کے اندرونی خرخشوں سے نچنت ہوگئے تھے - بنگالہ مدت ہوئی ان کے قبضے

* ذکاءاللہ آف دہلی مصنفۂ سی - ایف انڈریوز - غالباً یہ تعداد پورے کالج کی تھی جس میں شعبۂ مشرقی اور انگریزی کے کل طلبہ شریک تھے جس کی تصدیق آیندہ اوراق سے ہوگی —

میں آچکا تھا ۔ جنوب میں مرہٹوں اور خاص کر ٹیپو سلطان کا کھٹکا تھا سو وہ کانٹا بھی نکل گیا تھا ۔ ملک میں امن و امان تھا اور یہ امن خاص کر دلی شہر میں جو ایک مدت سے ارضی و سماوی آفات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا ، اور بھی اجاگر نظر آتا تھا ۔ چیزیں سستی تھیں ، روپے کی کمی نہ تھی ، حرفت و صنعت فروغ پر تھی ، لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے ۔ شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ، ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی ، خاص کر چاندنی چوک میں جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی ۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آج کل اس کا یقین کرنا مشکل ہے ۔ ایک دوسرے کی غمی شادی اور تیوہاروں میں بے تکلف شریک ہوتے اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے ۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے لیکن کیا ہندو کیا مسلمان سب ان سے محبت کرتے اور ان پر جان فدا کرتے تھے ۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا ۔ چنانچہ مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ قلعۂ معلی میں عجیب ماجرا تھا کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگر چہ قدرتاً ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے ۔ اگر چہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے وہ عام طور پر پایا جاتا تھا ، یہاں تک کہ ان پڑھ بھی اہل ذوق کی فیض صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے ۔ خوش اطواری اور سلیقہ دلی کا جوہر تھا ۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی جس نے دلی نہیں دیکھی یا جو دلی میں

نہیں رھا وہ زباندان ھی نہیں ' گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں ادبستان زبان تھیں - شاعری کا گھر گھر چرچا تھا ' خود بادشاہ شاعر تھے ' شعر و سخن کے قدردان تھے - قلعہ معلی کی زبان فصاحت کی جان تھی —

یہ خوش حالی اور زندہ دلی جو بظاھر نظر آتی تھی ' اس کی بنیاد کھوکھلی ھو چکی تھی ' تساھل اور غفلت جو اعمال کا نتیجہ ھیں اپنا کام کرچکے تھے - یہ ساری چہل پہل عادتاً اور روایتاً ھوتی چلی آتی تھی اور کسی اصل کی نقل معلوم ھوتی تھی - ایسے وقت میں زمانے کا رنگ پہچاننا بہت مشکل ھوتا ھے اور پہچانتے کیونکر سب پر ایک ھی رنگ چھایا ھوا تھا اور وہ ایسا رچ پچ گیا تھا کہ اس کا نکلنا آسان نہ تھا - دلی والوں میں دو بڑے عیب تھے اور شاید اب بھی ھیں ایک تو وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور دوسرے کسی نئی چیز کے آسانی سے قائل نہیں ھوتے - ایسی عادت کا ھونا لازمی اور قدرتی تھا کیونکہ ان کا شہر وہ تھا جو صدھا سال سے تہذیب و شایستگی اور علوم و فنون کا مرکز تھا ' جہاں کی ھر بات دوسروں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید تھی ' وہ دوسروں کے کیونکر قائل ھوتے - یہ سب کچھہ سہی ' لیکن اس زمانے کی ایک یادگار نہایت قابل قدر ھے - وہ اردو زبان کی ترقی ھے - اس زمانے میں اور اس کے بعد ایسے ایسے صاحب کہاں گزرے ھیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کے نام خصوصیت کے ساتھہ ذکر کئے جائیں گے اور ان کا کلام ھمیشہ ذوق شوق کے ساتھہ پڑھا جاے گا - یہ زمانہ ابتدا ی ترقی کا تھا اور اس وقت سے ایسی بنیاد پڑی کہ یہ زبان آگے ھی بڑھتی گئی - یہ سب کچھہ فارسی کا طفیل تھا - کئی صدی سے فارسی کی تعلیم کا رواج عام طور پر چلا آرھا تھا یہ کسی ایک مقام سے مخصوص نہ تھا بلکہ بنگال ' بہار ' دوآبہ ' پنجاب ' گجرات ' دکن ' مدراس

سب جگہہ اس کا تسلط ہوگیا تھا - ہمارے اخلاق و آداب ' طور طریقے ' نشست برخاست ' طرز کلام وغیرہ پر فارسی کا اثر صاف نظر آتا تھا - اور یہ کچھہ مسلمانوں ہی پر موقوف نہ تھا ' ہندو مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے - بات بات میں فارسی امثال اور جملے ' سعدی و حافظ ' رومی و جامی یا خسرو کے اشعار بے ساختہ زبان سے نکل جاتے تھے - گلستان بوستان ' دیوان حافظ ' یوسف زلیخا ' سکندر نامہ اور شاہنامے کا پڑھنا قومی شعار ہوگیا تھا - مدرسوں ہی میں نہیں ' ہر گھر میں یہ کتابیں نظر آتی تھیں - اُس وقت کے کسی ہندو مصنف کی کتاب اُٹھا کر دیکھئے ' وہی طرز تحریر ہے اور وہی اسلوب بیان ہے - ابتدا میں بسم‌اللہ لکھتا ہے ' حمد و نعت و منقبت سے شروع کرتا ہے ' شرعی اصطلاحات تو کیا حدیث و نص قران تک بے تکلف لکھہ جاتا ہے - ان کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی نہیں - قومی یگانگت میں تہذیب و ذوق کی یکسانی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے —

جب فارسی اس طرح چھا گئی تھی تو بول چال کی عام زبان اس سے کس طرح بچ سکتی تھی - اردو نے اس کا دودھ پیا تھا ' اسی کے سہارے پروان چڑھی اور وہ رنگ روپ نکالا کہ سب میں مقبول ہوگئی رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ اسی کا چلن ہوگیا - یہ ایک قدرتی اصول تھا - جس طرح باپ کا جانشین بیٹا ہوتا ہے اسی طرح فارسی کی قائم مقام اردو ہوگئی - یہی وہ زمانہ تھا کہ دلی کالج کا فروغ شروع ہوا —

ذریعۂ تعلیم

اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اس کی کامیابی

کا راز تھا کہ ذریعہ تعلیم اردو تھا - عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اردو میں ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اُردو ہی تھا لیکن سرکاری حلقے میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو رہی تھی جسے مشرقی تعلیم سے سخت سوء ظنی تھی اور جب مشرقی اور مغربی تعلیم کا قضیہ پیش ہوا تو بازی اُسی کے ہاتھ رہی —

۱۸۳۵ ع ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز سال ہے- اس تاریخ سے اس ملک کی تعلیم کی کایا پلٹ ہوتی ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے - اب تک یہاں کی تعلیم کی دو بڑی خصوصیتیں تھیں - ایک تو جتنے مدارس تھے، خواہ سرکاری، یا غیر سرکاری، اُن سب میں مشرقی السنہ و علوم (عربی، سنسکرت، فارسی) کی تعلیم ہوتی تھی، طریقۂ تعلیم بھی مشرقی تھا، ذریعۂ تعلیم بھی مشرقی زبانیں تھیں: غرض سارا رنگ ڈھنگ مشرقی تھا- وہ کمیٹی جو تعلیم عامہ کی نگراں کی گئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مشرقی السنہ کی تعلیم کی ترقی میں کوشش کرے - اگرچہ دہلی اور بنارس کے کالجوں میں انگریزی مدرسے بھی ملحق کردیے گئے تھے اور کلکتہ مدرسہ اور کلکتہ سنسکرت کالج میں بھی انگریزی جماعتوں کا اضافہ کردیا گیا تھا اور چند درسگاہوں میں جغرافیہ ہیئت، ہندسہ اور تشریح کی تعلیم بھی جاری کردی گئی تھی لیکن ان کی حالت محض ابتدائی تھی اور مشرقی تعلیم کے سامنے ان کا چراغ جلنے نہیں پایا تھا- دوسری بات یہ تھی کہ جتنے سرکاری اور امدادی مدارس تھے اُن میں تقریباً سب طلبہ کو وظیفے دیے جاتے تھے ایک تیسری بات اور تھی، یعنی سنسکرت اور عربی کی ترقی کی خاطر ان قدیم زبانوں میں تراجم کے لئے فیاضی سے امداد دی جاتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے

کے لحاظ سے یہ علمی سرپرستی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ صرف ایک کتاب کے عربی ترجمے کے لئے بتیس ہزار روپے کی منظوری دی گئی۔ بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر ترجمہ ایسا ہوتا جو سمجھ میں نہ آتا تو اس کی تشریح کے لئے مترجم کو معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا جاتا۔ بہت سا روپیہ ان کتابوں کے چھاپنے پر صرف ہوتا تھا، لیکن چھپنے کے بعد ایک دوسری مشکل کا سامنا ہوتا تھا کہ یہ ڈھیر کے ڈھیر رکھے کہاں جائیں۔ اس ذخیرے کے لئے مکان کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ چونکہ ان کتابوں کی عام طور پر تو مانگ ہوتی نہ تھی اس لئے ان کا سارا بار الماریوں پر تھا۔ یہ لکھتے ہوئے مجھے حیدرآباد دکن کی مجلس دائرۃ المعارف یاد آتی ہے اور اگر جلد خبر نہ لی گئی تو ڈر ہے کہ دارالترجمہ کا بھی کہیں یہی حشر نہ ہو—

ان لوگوں کی نظروں میں جو مشرقی تعلیم کو بیکار محض خیال کرتے تھے، یہ تینوں باتیں سخت قابل اعتراض تھیں، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر واویلا مچایا جائے۔ اول تو گورنمنٹ کا تعلیم پر صرف ہی کیا ہوتا تھا، اور اگر اس کے انتظام کا دوسرے شعبوں سے مقابلہ کیا جائے تو اس رقم کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی جو تعلیم پر صرف کی جاتی تھی۔ رہے ترغیبی وظائف، تو اس وقت کی حالت کے لحاظ سے ان کا دینا ضروری اور قرین مصلحت تھا۔ جب تعلیم کا شوق پیدا ہو جاتا تو رفتہ رفتہ کم کردئے جاتے اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اب رہا کتابوں کا ترجمہ اور طبع کے مصارف، سو اس کے متعلق شکایت کرنا کسی قدر تنگ نظری ہے۔ اسے تجارتی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ بیشک اس وقت ان کی مانگ نہ

تھی، لیکن ہر چیز کے لئے یہ ضروری نہیں ھے کہ مانگ ھو تو بہم پہنچائی جاے۔ بعض اوقات مانگ پیدا کرنی پڑتی ھے۔ ان کتابوں کا وجود میں آجانا ھی غنیمت تھا، خواہ کوئی لے یا نہ لے، کیوں کہ انھیں پر آیندہ علم کی ترقی و اشاعت کا دار و مدار تھا۔ اُس وقت کا یہی اقتضا تھا اور انھیں کے طفیل میں ایک وقت ایسا آتا کہ اس قسم کی کتابیں ھاتھوں ھاتھ بکتیں۔ مانگ یا قدر کے لئے یہ کیا ضرور ھے کہ فوراً ھی ھو۔ آج وہی کتابیں ھیں کہ اُن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ھیں، ڈھونڈھتے ھیں اور نہیں ملتیں۔ کبھی کبھی تجارتی نظر سے ھٹ کر بھی دیکھنا پڑتا ھے —

اس میں شک نہیں کہ نقص تھے، انھیں رفع کرنا چاھئے تھا۔ خرابیاں تھیں، ان کی اصلاح ھونی چاھئے تھی۔ لیکن یہ کیا کہ سرے سے عمارت ھی کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاے —

بہرحال لارڈ بینٹنگ کے رزولیوشن مورخہ ۷ مارچ سنہ ۱۸۳۵ ع نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ وہ رزولیوشن جسے اب تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ھے، یہ ھے —

> "گورنر جنرل باجلاس کونسل کی یہ راے ھے کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اھل ھند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ھے اوو جس قدر رقوم مقاصد تعلیم کے لئے مخصوص ھیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ھونی چاھئیں —
>
> ھز لارڈ شپ کا یہ منشا نہیں ھے کہ دیسی تعلیم کے کسی ایسے کالج یا مدرسے کو توڑ دیا جاے جس کے

فوائد سے دیسی لوگوں میں تمتع حاصل کرنے کا شوق پایا جاتا ہو —

گورنر جنرل باجلاس کونسل طلبہ کو زمانۂ تعلیم میں وظائف دینے کا عمل قطعاً قابل اعتراض خیال کرتے ہیں - اُن کی رائے میں یہ اُن علوم کی تشویق کی مصنوعی ترغیب ہے اور جب زیادہ مفید علوم کی تعلیم دی جائے گی تو یہ خود بخود ان پر سبقت لے جائیں گے اس لئے وہ ہدایت کرتے ہیں کہ آیندہ کسی طالب علم کو کسی قسم کا کوئی وظیفہ نہ دیا جائے - اور جب کبھی مشرقی تعلیم کے کسی پروفیسر کی جگہ خالی ہو تو اس کی رپوٹ گورمنٹ کو کی جائے اور ساتھ ہی یہ بتایا جائے کہ جو جماعت اس کے زیر تعلیم تھی اس میں طلبہ کی کیا تعداد ہے اور اُس جماعت کی کیا حالت ہے تاکہ گورنمنٹ اس کے جانشین کے تقرر پر غور کر سکے —

ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل کو یہ اطلاع ملی ہے کہ کمیٹی نے رقم خطیر مشرقی کتب کے طبع میں صرف کی ہے - ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل ہدایت کرتے ہیں کہ آیندہ ان رقوم کا کوئی جز اس کام میں نہ لایا جائے —

ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ تمام رقوم جو ان اصلاحات کے رو سے کمیٹی کے قبضے

میں آئیں وہ آئندہ دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے
ذریعہ سے انگریزی علم ادب اور سائنس کی اشاعت میں
صرف کی جائیں " —

اس حکم کے جاری ہونے پر بڑا ہنگامہ مچا۔ صرف وہی لوگ اس کے مخالف نہ تھے جن کی روزی پر اس سے آنچ آتی تھی بلکہ اُن بڑے بڑے صاحب اثر یورپین عہدہ داروں نے بھی جو مشرقی علوم و السنہ کے حامی تھے اس کی اسی زور سے مخالفت کی ۔ مشرقی علوم و السنہ کا سب سے بڑا حامی اور اس معاملے میں میکالے کا بہت بڑا حریف مسٹر ہنری ٹامس پرنسپ تھا جو گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر تھا اور بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر ہوگیا۔ اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کونسل میں پرنسپ اور میکالے میں بہت تیز اور سخت بحث ہوئی —

لیکن احکام جاری ہوچکے تھے اور ناطق تھے ۔ تعلیمی کمیٹی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تعمیل کرے۔ کمیٹی کے صدر مسٹر شیکسپیر نے بنا راضیء احکام استعفا دیدیا اور ان کی جگہ مسٹر میکالے (مشہور لارڈ میکالے) کا تقرر ہوا ۔ یہ شخص یک بکا اور اپنی رائے کا بڑا پکا تھا لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن پر اسی کے خیالات کا اثر پڑا ' مشرق و مغرب کے مسئلے میں وہ اپنی خوش بیانی اور طلاقت کے زور سے بازی لے گیا ۔ اس نئے صدر کے تحت میں ' جو در حقیقت خود ہی اس تجویز کا بانی تھا ' کمیٹی نے احکام بالا کی تعمیل بڑے شد و مد سے کی —

اگرچہ لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن میں آنسو پونچھنے کے لئے یہ لکھ دیا گیا تھا کہ اس سے ایسے دیسی علوم کے مدارس کا بند کرنا مقصود نہیں ہے جن کے فوائد سے دیسی لوگوں کو متمتع ہونے کی توقع ہے لیکن کمیٹی نے

اس ریزولیوشن کی تعمیل ایسے عجیب طریقے سے کی کہ مشرقی تعلیم کا خاتمہ ھی ہوگیا —

ان احکام کی تعمیل میں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ سرکاری مدارس میں دیسی زبانوں کی تعلیم کس حد تک ہو۔ بعض کہتے تھے کہ گورمنٹ کے ریزولیوشن کے رو سے دیسی زبانیں بالکل خارج ہوگئی ہیں اور تمام رقم صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاھئیے۔ جنرل کمیٹی نے فوراً اس غلطی کی اصلاح کی اور ایک بیان شایع کیا جس میں اس نے اظہار افسوس کیا کہ ریزولیوشن کے یہ معنے لئے گئے ہیں اور یہ بیان کیا کہ ان احکام کے جاری ہونے سے پہلے اس مسئلے کے متعلق جو بحث ہوئی تھی اس میں ہر فریق نے دیسی زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کیا تھا۔ اصل تنازع انگریزی زبان اور مشرقی علمی زبانوں کے درمیان تھا' دیسی زبانوں سے اسے کچھ تعلق نہ تھا —

مگر اس بیان سے بھی تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ جنرل کمیٹی کا منشا یہ تھا کہ دیسی لڑکوں لڑکیوں کو بالکل ابتدائی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے دی جاسکتی ہے —

اصل بحث مشرقی اور مغربی علوم السنہ کی تھی' اس میں غریب دیسی زبان مفت میں پٹ گئی۔ آپس کے مباحثے اور نزاع کی گرما گرمی میں صحیح رستہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صحیح فیصلہ دونوں کے بین بین تھا۔ مغربی علوم اور انگریزی زبان کے فوائد سے کسے انکار ہوسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی قدیم زبانوں کو کیوں کر چھوڑ سکتے تھے جن پر ہماری تہذیب کی بنیاد ہے ۔ دوسرا مسئلہ ذریعۂ تعلیم کا تھا۔ مقصد تو حصول علم سے تھا اور اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں کہ علم کی تحصیل جس آسانی اور خوبی سے اپنی زبان کے واسطہ سے ہوسکتی ہے

غیر زبان کے ذریعہ سے نہیں ہوسکتی۔ اس کی طرف کسی کا خیال نہ گیا۔ اس کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں تو کتابیں کہاں سے لائیں۔ بیشک یہ بڑا نقص تھا مگر لا علاج نہ تھا۔ لارڈ بنٹنک کے ریزولیوشن نے اس کی گنجائش نہ چھوڑی اور ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی ہی قرار پایا —

لارڈ بنٹنک کے ریزولیوشن سے اور خاص کر جس نامناسب اور ناگوار طریقے سے تعلیمی کمیٹی نے اس کی تعمیل کی تھی اس سے جو بے اطمینانی اور بدگمانی پیدا ہوگئی تھی وہ رفع نہ ہوئی۔ اس بے اطمینانی کے اسباب یہ تھے —

۱ - سب سے پہلی بات یہ تھی کہ مشرقی مدارس کو کم زور کر دیا گیا۔ اُن کی رقمیں اُن سے چھین کر یا تو ایسی انگریزی جماعتوں کی اعانت میں صرف کی گئیں جو اُن کی نظر کے سامنے ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم پاتی تھیں یا اضلاع (مفصلات) کے ایسے مدارس کی مدد کے لئے مخصوص کر دیں جہاں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ عمل خلاف انصاف اور خلاف احکام گورنمنٹ خیال کیا گیا —

۲ - جہاں کہیں دیسی زبان کی تعلیم کے لئے جداگانہ جماعتیں تھیں، انھیں توڑ دیا گیا اور ذریعۂ تعلیم کے لئے عام طور پر انگریزی کو دیسی زبان پر ترجیح دی گئی اور دیسی زبان کی تعلیم برائے نام انگریزی تعلیم کے ساتھ لگا دی گئی —

۳ - وظائف مسدود کر دیے گئے جس سے دہلی اور دوسرے مقامات میں بہت ناراضی پھیلی کیوں کہ لوگ تعلیم کو کار خیر سمجھتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اکثر طالب علم نادار تھے اور وہ اپنی تعلیم

زیادہ دنوں تک جاری نہیں رکھہ سکتے تھے —

اس عام بے اطمینانی کی بنا پر لارڈ آکلنڈ نے جو لارڈ بنٹنک کے بعد ھندوستان کے گورنر جنرل ھوکر آے' ان تمام امور پر غور کیا اور ۲۴ نومبر سنہ ۱۸۳۹ ع کو جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کے نام ایک یاد داشت لکھی - یہ یاد داشت بہت اھم ھے - اس نے ان غلط فہمیوں کو رفع کیا جو لارڈ بنٹنک کے ریزولیوشن سے پیدا ھوگئی تھیں —

لارڈ آکلنڈ نے صاف الفاظ میں یہ فیصلہ کیا کہ مشرقی مدارس میں مشرقی تعلیم کی تکمیل و ترقی کو قطعی طور سے ترجیح دی جاے اور کامل ترقی و تکمیل کے بعد (اس سے قبل ھرگز نہیں) جو رقم بچے وہ انگریزی تعلیم کی ترقی میں صرف کی جاے - مشرقی مدارس کی بہتری اور اصلاح کے لئے یہ مناسب ھوگا کہ اعلی قابلیت کے دیسی مدرسین مقرر کئے جائیں اور یہ اُسی صورت میں ھوسکتا ھے کہ ان کو معقول تنخواھیں دی جائیں - طلبہ کے وظائف کا دستور پھر جاری کیا جاے - مشرقی زبانوں کی مفید کتابیں شایع کی جائیں - تجربہ کار اور واقف کار یورپین وزیٹر کا تقرر کیا جاے تاکہ وہ اُن پر نگرانی رکھے اور وقتاً فوقتاً ان کا معائنہ کرتا رھے —

یہ تجویزیں بہت معقول تھیں اور کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی اپنی راے میں انھیں خیالات کا اظہار کیا - انھوں نے لکھا کہ ھمارا منشا بھی یہی ھے کہ جو رقم جس مشرقی مدرسے کے لئے مخصوص کردی گئی ھے وہ بالکلیہ اُسی مدرسے کی تعلیم پر صرف کی جاے اور مدرسے میں مشرقی تعلیم کی ترقی و تکمیل سب سے مقدم رکھی جاے —

اس بنا پر لارڈ آکلنڈ نے یہ حکم دیا کہ لارڈ بنٹنک کے ریزولیوشن

سے قبل جو جو رقمیں جن جن مشرقی مدارس کے لئے مخصوص تھیں وہ سب اُن کو واپس کردی جائیں اور اگر انگریزی تعلیم کی ترقی کے لئے مزید رقم کی ضرورت ہوئی تو اس کے لئے جدید منظوری دی جاے گی —

انگریزی اور دیسی زبان مدارس کا ذریعۂ تعلیم

لارڈ آکلنڈ نے ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر بھی کامل غور کیا اور گزشتہ اور موجودہ حالات پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی اور دیسی زبان کی مشترکہ تعلیم کا جو اصول اس وقت رائج ہے' وہی مناسب ہے اور فی الحال اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں - البتہ جب دیسی زبانوں میں اچھی کتابوں کا سلسلہ تیار ہوجاے تو پھر اس میں کسی قدر تغیر و تبدل کی ضرورت واقع ہوگی - اُس وقت مسئلہ یہ ہوگا کہ آیا صوبے کے مدارس میں تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے دی جاے یا دیسی زبان کے ذریعہ سے - اُن کے خیال میں جب ایسی کتابوں کا سلسلہ تیار ہوجاے تو یہ جو قاعدہ ہے کہ ان مدارس میں دیسی زبانوں کی جماعتیں جاری نہ رکھی جائیں اُسے نرم کرنا پڑے گا - اُس وقت انگریزی یا دیسی زبان لازمی طور پر پڑھنے کی شرط لگانی ضروری نہ ہوگی بلکہ طالب علم کو پوری آزادی ہوگی کہ خواہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرے یا دیسی تعلیم —

بہر حال لارڈ آکلنڈ کی راے میں مزید تجربے کی ضرورت تھی - اُس وقت دو بڑے تجربے زیر امتحان تھے - ایک بنگال میں جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم تھی اور دوسرا احاطۂ بمبئی میں جہاں دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی تھی - ان دونوں طریقوں کو ابھی اور آزادی سے چلنے دینا چاہئے اور اُن کے نتائج پر نظر رکھنی چاہئے —

غرض گورنر جنرل بہادر کا منشا یہ تھا کہ تعلیم کی اشاعت اعلیٰ

اور اوسط دونوں طبقوں میں ہونی چاہئے - موجودہ طریقے سے تعلیم صرف ایک چھوٹے سے طبقے میں محدود رہے گی' لہذا ملک کے باقی حصے کو دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم دینے پر قناعت کرنی چاہئے اگرچہ وہ انگریزی کے مقابلے میں کم درجے کی ہوگی —

اسی زمانے میں تعلیمی کمیٹی نے اپنی راے کا اظہار کیا کہ جس اصول پر وہ عامل ہے وہ اس کی راے میں بالکل صحیح ثابت ہوا ہے اور کمیٹی اس امر کی کوشش کرتی رہے گی کہ بڑے بڑے شہروں میں اینگلو ورنیکلر مدارس کو ترقی دے اور جہاں تک حالات مساعدت کریں تعلیم کو ملک کے با اثر طبقے میں شایع کرے - کمیٹی کو توقع ہے کہ جب وہ طالب علم جو ان مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں مغربی علوم سے کامل واقفیت حاصل کر لیں گے تو سارے ملک میں ترقی کی ایک لہر دوڑ جاے گی اور بالآخر ملک کا ہر طبقہ اس کے فوائد سے مستفید ہوگا —

دیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کے متعلق جو دلخوش کن توقع لارڈ آکلنڈ نے اپنے فیصلے میں دلائی تھی وہ کاغذ ہی پر رہ گئی - اس میں سلسلۂ کتب تیار ہونے کی شرط تھی اور یہ شرط بڑی کڑی تھی - کتابیں کیسے تیار ہوتیں جب کہ اُن کے تیار کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ اور سچی کوشش نہیں کی گئی - آنے والے ماہرین تعلیم نے اسے بالکل نظر انداز کردیا اور سہل رستہ اختیار کرلیا کہ مغربی علوم کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے سے دی جاے' اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سنسکرت' عربی' فارسی کی تعلیم بھی انگریزی کے ذریعے ہونے لگی - دیسی زبانوں کی بدقسمتی کا کچھ ٹھکانا ہے - سنہ ۱۸۳۵ ع سے قبل تقریباً تمام مدارس میں عربی' فارسی' سنسکرت کی تعلیم ہوتی تھی اور گورنمنٹ بھی اس کی پوری تائید پر تھی اور ساری

توجہ اور معلت اسی پر صرف کی جاتی تھی اور دیسی زبانوں کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ جب لارڈ بنٹنگ کا ریزولیوشن عمل میں آیا تو انگریزی نے وہ زور پکڑا کہ اس نے عربی، سنسکرت ھی کو نہیں بٹھا دیا بلکہ دیسی زبانیں بھی کس مپرسی کی حالت میں آ گئیں۔ ایک دھلی کالج ایسا تھا جہاں مغربی علوم یعنے ھیئت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی اور باوجود اُن تمام موانعات کے جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ھر موقع پر پیش کرتے تھے وہ نہایت کامیاب رھا —

اس کی تصدیق مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج کے اُس بیان سے ھوتی ھے جو ان کی سالانہ رپوٹ بابت سنہ ۱۸۵۲ ع میں درج ھے۔ وہ لکھتے ھیں کہ :

> " مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ھوا ھے " —

اس کے بعد ھی وہ اس پر اظہار افسوس کرتے ھیں کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں ورنہ اس کا علم اور بھی بہتر ھوتا۔ پھر وہ لکھتے ھیں کہ :

> " حال ھی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور اُن سے علم ھیئت، جنرل سائنس، اخلاقی اور مذھبی مسائل میں گفتگو کی۔ اِن سب کا یہ بیان ھے کہ اس شعبے میں قطعی

طور پر بہت بڑی ترقی پائی جا تی ہے اور مختصر
یہ کہ تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے
آثار نہیں نظر آتے " —

اس رپوٹ پر افتنلت گورنر بہادر نے اپنے تبصرے میں مشرقی شعبے کے متعلق جو یہ الفاظ تحریر کئے ہیں :

" طلبہ (شعبۂ مشرقی) کی سائنس کی ترقی
کے متعلق جو تیقن دلایا گیا ہے اُس سے بےحد مسرت ہوئی "—

سنہ ۱۸۵۶ ع کی ربوٹ میں درج ہے کہ عربی فارسی کی جماعتوں کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں جن میں نہایت احتیاط سے مغربی سائنس زبان اردو کے ذریعہ کامل طور پر پڑھائی جاتی تھی - ماسٹر رام چندر اور دیگر اساتذہ کی قابلانہ درس تدریس سے طلبہ ایسے ہوشیار ہوگئے تھے کہ وہ ریاضی' نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ میں شعبۂ انگریزی کے طلبہ کو نیچا دکھانے لگے تھے اور مقابلے کے امتحان میں بازی لے جاتے تھے —

رام سرن داس صاحب ڈپٹی کلکٹر اور ممبر لوکل کمیٹی دلی کالج نے اس سال طلبہ کا امتحان لیا اور انھوں نے اس بارے میں جو کیفیت درج کی ہے وہ طلبہ کی محنت و ذکاوت پر دلالت کرتی ہے - طلبہ نے نہایت اطمینان بخش جوابات دیے اور ممتحنین اس سے بہت خوش ہوے - طلبہ بالعموم تمام مضامین میں نہایت اچھے نکلے - صرف ایک چیز کی یعنی بد خطی کی شکایت کی ہے اور یہ شکایت غالباً ہمارے کالجوں اور مدرسوں میں اب بھی پائی جاتی ہے —

مسٹر فریڈرک جان موات Mouat ایم - ڈی' ال ال - بی فسٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ و سکرٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے اپنی رپوٹ

میں دھلی کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی استعداد اور قابلیت اور خاص کر ان کی سائنس کی واقفیت پر بہت قابل تحسین الفاظ میں تعریف کی تھی - گورنمنٹ ممالک متحدہ مغربی شمالی نے جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی رپورٹ بابت سنہ ۱۸۵۳ - ۵۴ پر جو ریزو لیوشن لکھا ہے اس میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے —

" اردو کے ذریعے سے دھلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی مسٹر موات نے بہت تعریف کی ہے - ھزآنر ایسی تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی، بہت قدر کرتے ھیں " —

یہ ساری برکت اس کی تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور تمام مضامین اسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے حس کی تائید میں ہم اُس وقت کے دو ذمہ دار ماھران تعلیم کی رائیں پیش کرتے ھیں - مسٹر کر ناظم تعلیمات احاطۂ بنگال اپنے تبصرہ تعلیمی بابت سنہ ۱۸۵۳ ع میں لکھتے ھیں کہ —

" ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرھی ھے جو اُسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ھے اور وہ یہ ھے کہ وھاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ھے اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفۂ (مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ھے - اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بترو نے اپنے زمانہ پرنسپلی میں

استقلال کے ساتھ عملدرآمد کیا اور اُن کے جانشین
ڈاکٹر سپرنگر نے اُسی جوش کے ساتھ اُسے جاری رکھا '
یہ اب دھلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم
کر لیا گیا ھے - مناسب یہ ھے کہ اسے آزادی کے ساتھ
بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے - چند سال بعد ھمیں
اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں کے نتائج سے مقابلہ کرنے
کا موقع ملے گا "

افسوس یہ موقع کبھی نہ آیا !!

ناظم صاحب تعلیمات ممالک مغربی شمالی نے اپنی رپوٹ سنہ ۱۸۵۲ ع میں شعبۂ مشرقی کے قائم رکھنے پر اسی لئے زور دیا ھے کہ اس کی وجہ سے اردو کے ذریعے علوم کی اشاعت ھوتی اور روشن خیالی پھیلتی ھے —

تعلیمی حالت

مشرقی شعبہ | کالج کے ابتدائی زمانے میں زیادہ تر فارسی اور عربی کی تعلیم ھوتی تھی - اس کے ساتھ سنکرت کا شعبہ بھی تھا۔ حساب اور مبادیات اقلیدس کی بھی کچھہ کچھہ تعلیم دی جاتی تھی - کالج کی رپوٹوں میں بار بار اس کا ذکر ھے کہ تقسیم انعام کے موقعوں پر فارسی خوشخطی کے نمونے اور فارسی کے مضامین بطور نمائش کے رکھے جاتے تھے —

سنہ ۱۸۲۹ ع کا حال میں لکھہ چکا ھوں کہ اس سال کے امتحان کے عمدہ نتائج پر بڑی تعریف ھوئی اور جس قدر انعام طلبہ کے لیے رکھے گئے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے کیونکہ طلبہ کی تعداد ایسی اچھی اور ان کے

جوابات ایسے بر جستہ اور معقول تھے کہ وہ طلبہ کو انعام سے محروم نہ کر سکے —

سنہ ۱۸۳۱ ع میں جب لارڈ ہنٹنگ نے کالج کا معائنہ فرمایا تو لارڈصاحب کی فرمائش پر مسٹر میکناٹن نے عربی' فارسی اور سنسکرت کی اعلی جماعتوں کا امتحان لیا - نتیجہ کچھہ زیادہ قابل اطمینان نہ پایا گیا - ممتحن کی رائے میں طلبہ کا علم شرع محمدی (فقہ) میں زیادہ وسیع نہ تھا اور طلبہ کی زیادہ تر تعداد فارسی میں گلستان بوستان سے آگے نہ بڑھی تھی حالانکہ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ کالج میں داخل ہونے سے پہلے پڑھ کر آنی چاهئیں —

یہ رپورٹ جنرل کمیٹی کو بھیجی گئی تو اُس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور لکھا کہ کالج کی حالت کئی سال سے روبہ تنزل ہے - لوکل کمیٹی نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ طلبہ عموماً کچھہ شد بد ہونے کے بعد تلاش معاش کی خاطر کالج کو خیر باد کہہ دیتے ہیں - بعض مشرقی شعبے کو چھوڑ کر انگریزی شعبے میں چلے جاتے ہیں - کمیٹی نے آخر میں یہ رائے ظاہر کی کہ کسی ایسی ترغیب کا ہونا ضروری ہے کہ جس کی وجہ سے طلبہ زیادہ مدت تک کالج میں رہ سکیں —

کالج کے سکرٹری نے اپنی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۸۴۳ ع میں لکھا کہ عربی کی اعلی جماعت میں صرف تین طالب علم ہیں - بہت لوگوں کا خیال ہے کہ عربی کی تعلیم نہ تو ویسی عام رهی ہے اور نہ ویسی پختہ جیسی پہلے تھی - اب یہ ذریعہ معاش بھی نہیں رهی اور خالی خولی نام یا شہرت کا موجب رہ گئی ہے - یہ امر قابل افسوس ہے کہ طلبہ فارسی کا نصاب ختم کرکے کالج چھوڑ دیتے ہیں اور جو عربی پڑھتے ہیں اُن

کا یہ حال ہے کہ کافیہ اور دوسری آسان کتابوں سے آگے نہیں بڑھتے اور سو میں بہ مشکل چار پانچ ایسے نکلتے ہیں جو اعلیٰ شعبوں تک پہنچتے ہیں * —

سنہ ۱۸۳۵ ع کی تعلیم عامہ کی رپوٹ میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ فارسی اور عربی کا اب وہ شوق نہیں رہا جو انگریزی کا ہے۔ لوکل کمیٹی کو یہ شکایت ہے کہ فارسی عربی کی اعلیٰ قابلیت جو بڑی محنت، وقت اور روپیہ صرف کرنے سے حاصل ہوتی ہے، حصول معاش میں کچھہ کام نہیں آتی - جنرل کمیٹی نے اس شکایت پر تعجب ظاہر کیا کہ اس وقت جب کہ فارسی دفتری زبان ہے اُس کا یہ حال ہے تو آئندہ جب کہ دیسی زبان کا سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں رواج ہو جاے گا اور سب غیر زبانیں مساوی حالت میں ہوجائیں گی تو وہ نظام تعلیم جو اس وقت مشرقی شعبے میں جاری ہے اور بھی بے سود ہوجاے گا —

سنہ ۱۸۳۷ ع میں جو امتحان ہوا - اس میں ممتحنین نے تعلیمی حالت کی تعریف کی ہے —

سنہ ۱۸۳۸ ع کے آخر میں سالانہ امتحان ہوا امتحان کے وقت شہر کے بہت سے شرفا مدرسے میں جمع تھے - وہ طلبہ کی لیاقت اور جوابات سے بہت خوش ہوے - جماعت اعلیٰ کے عربی ترجمے اور فارسی انشاپردازی کے نمونے گورنمنٹ میں بھیجے گئے اور گورنمنٹ نے انہیں پسند فرمایا - سنسکرت کی جماعت کی حالت بھی قابل اطمینان بتائی گئی —

---

* تبصرۂ تعلیم عامہ احاطۂ بنگال بابت سنہ ۱۸۵۳ ع مسٹر جے - کر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن —

سنہ ۴۰-۱۸۳۹ ع کی رپوٹ سے معلوم هوتا هے کہ اس سال بھی تعلیمی حالت قابل اطمینان تھی اگرچہ نصاب گذشتہ سالوں سے بڑھا ہوا تھا - عربی کی اعلیٰ جماعت شمس بازغہ ختم کرچکی تھی اور میر زاهد معہ حاشیہ عبدالعلی اور مقامات حریری کا درس لے رهی تھی - اردو کی جماعتوں نے خاص کر بہت قابل تعریف ترقی کی تھی —

مسٹر ٹامسن مشرقی کالجوں کے وزیٹر (انسپکٹر) نے اپنی رپوٹ بابت سنہ ۴۲-۱۸۴۱ میں دهلی کالج کے طلبہ کی استعداد کے متعلق اچھی راے نہیں دی - اُن کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم اس سے اعلیٰ هونی چاهئے وہ لکھتے هیں کہ اکثر طلبہ عربی صرف و نحو یا عربی کی آسان کتابیں پڑھتے تھے - شعبۂ سنسکرت کی جماعت اعلیٰ میں پانچ طالب علم آسانی سے سنسکرت عبارت کی لکھہ سکتے تھے اور نظم بھی خاصی لکھہ لیتے تھے - اُن کی راے میں سنسکرت کی تعلیم اچھی تھی اور طلبہ اس زبان میں پوری مہارت رکھتے تھے —

اس کے چند سال بعد لوکل کمیٹی نے فارسی اور عربی شعبوں میں کامل اصلاح کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ باقاعدہ نصاب تعلیم میں صرف کارآمد علوم کی تعلیم رکھی جاے اور عربی نحو اور منطق کی اعلیٰ کتابوں اور فقہ کی مستند کتب اور احادیث پر " فری لکچر " هوا کریں اس تجویز کے جواب میں لفٹنٹ گورنر بہادر نے جواب دیا کہ کمیٹی نصاب تعلیم میں اس قسم کا تغیر و تبدل کر سکتی هے جو مناسب غور کے بعد مفید معلوم هو —

سنہ ۱۸۴۵ ع میں ڈاکٹر سپرنگر پرنسپل کالج نے جن کا تقرر اسی سال هوا تھا ممالک مغربی شمالی کی گورنمنٹ کی خدمت میں یہ تجویز

پیش کی کہ مدرسے کی بعض ابتدائی جماعتیں توڑ دی جائیں اور اُن کی بجاے ابتدائی تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیا جاے جس میں لڑکے مدرسے کی تعلیم کے لیے تیار کئے جائیں - لفٹننٹ گورنر بہادر نے اگرچہ اس تجویز کو پسند کیا اور اسے بھی تسلیم کیا کہ جب تک لڑکے خاص درجے کی لیاقت نہ رکھتے ہوں مدرسے میں داخل نہ کئے جائیں لیکن مدرسہ سے متعلق مجوزہ اسکول قائم کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کی سود مندی مشتبہ ہے - اس رائے کی تائید میں بعض وجوہ یہ بیان کی گئیں :—

" جہاں تک ہماری درسگاہیں دیسیوں کو اُن مضامین کی تعلیم دیتی ہیں جن کی تعلیم وہ دوسری جگہہ نہیں حاصل کرسکتے یا اگر وہ اُن مضامین کو دوسری جگہہ حاصل کرسکتے ہیں مگر ہم عمدہ طریقہ پر دیتے ہیں تو وہاں تک ان درسگاہوں کا فائدہ بہت بڑا ہے - لیکن جب ہماری درسگاہیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کرتی ہیں جسے لوگ دوسری جگہہ بخوبی حاصل کرسکتے ہیں یا خود اس کا انتظام کرنے کے لیے آمادہ ہیں تو ہماری درسگاہوں کا فائدہ بہت کچھہ کم ہوجاتا ہے بلکہ شاید مضر ہے - اس لئے کہ ہم یہ تعلیم مفت دیتے ہیں جس کے ایسے لوگ اجرت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس طرح ہم لوگوں کی ذاتی مساعی کے مانع ہوتے ہیں —

دیسی زبانوں کی ابتدائی تعلیم کالج کے باہر آسانی سے حاصل ہوسکتی ہے اور روز بروز ان کی تعلیم سہل ہوتی جاتی ہے -

پڑھنا لکھنا اور تقسیم تک حساب دیسی لوگ خود اپنے
طریقے پر سکھا سکتے ھیں اور انگلستان نے یہ طریقہ
انھیں سے سیکھا ھے اور اسے ان کے قومی طریقہ سے نام زد
کیا ھے ' ان چیزوں کو ھمارے کالج میں پڑھانا گویا وقت اور
روپے کا ضائع کرنا ھے - مناسب یہ ھوگا کہ فی الحال
بہترین دیسی لڑکے داخل کرلیے جایا کریں اور انھیں علم
کی اُن شاخوں میں اعلیٰ تعلیم دی جاے جن میں
ھم اُن کی ترقی چاھتے ھیں —

داخلے کے لیے سہ ماھی امتحانات لیے جائیں اور حسب
گنجائش بہترین امیدوار انتخاب کرلیے جائیں - اگر درسگاہ
مقبول نہیں تو تعداد کم ھوجاے گی ورنہ زیادہ ھوجاے گی
اور غالباً اس قدر زیادہ کہ تعلیمی فیس لگانی پڑے اور
اس سے بہتر کیا ھوگا —

یہ توقع کی جاتی ھے کہ اگر کالجوں کی حالت
اچھی رھے اور جو تعلیم وھاں دی جاتی ھے اس کی
قدر کی گئی تو داخلے کا معیار بڑھا دیا جاے اور رفتہ
رفتہ وہ ابتدائی تعلیم موقوف کردی جاے جو اب
ادنیٰ جماعتوں کو دی جاتی ھے — "

ان خیالات کی بنا پر ادنیٰ وظائف کے مستحق باھر والے بھی قرار
دئے گئے - جس کا ذکر اس کے موقع پر کیا جاے گا —

مسٹر بٹرو جو اس وقت پرنسپل تھے اور نہایت قابل اور ھمدرد شخص
تھے اس سال (سنہ ۱۸۴۵ ع) بوجہ علالت دو سال کی رخصت لیکر انگلستان

چلے گئے۔ انھوں نے اپنی آخری رپوٹ میں مشرقی شعبے کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں ' اس سے معلوم ہوگا کہ اس طریقۂ تعلیم نے کیا کیا کام کیا تھا —

مسٹر بٹرو نے اپنی ان مساعی پر جو انھوں نے کالج میں تاریخ' اخلاق اور سائنس کی تعلیم کے متعلق کی تھیں' اپنا پورا اطمینان ظاہر کیا اور اس امر کی توقع ظاہر کی کہ اگر ایک سال اور اسی طرح کوشش جاری رہی تو مشرقی شعبے کے طالب علم سوائے تاریخ کے کسی علم میں انگریزی شعبے والوں سے کم نہیں رہیں گے۔ تاریخ کی کمی پوری کرنے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے کی ضرورت ہے' اس وقت تک جو ترجمے ہوے ہیں وہ کافی نہیں ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ جو تعلیم مشرقی کالج کے نوجوانوں کو دی گئی ہے اس کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ اُن میں سے متعدد طالب علم اپنی فرصت کے اوقات میں انگریزی زبان کی تحصیل میں بڑی مستعدی سے کوشش کررہے ہیں تاکہ وہ تلاش حق میں زیادہ آزادی سے کام کرسکیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض نوجوان آئندہ سال سینیر انگلش وظائف کے لئے مقابلے کی کوشش کریں گے۔ مسٹر بٹرو نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ مشرقی کالج کے نصاب تعلیم میں علاوہ ان علوم کے جو عام طور پر دیسی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں بعض دوسرے علوم کے داخل کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان علوم نے اس تعصب اور تنگ خیالی میں جو محض عربی فارسی کے طلبہ میں پائی جاتی ہے تخفیف اور اعتدال پیدا کردیا ہے —

ایک دوسرا امید افزا واقعہ مسٹر بٹرو نے یہ بیان کیا ہے کہ دیسی شرفا و امرا میں جو بدگمانی انگریزی طریقۂ تعلیم کی طرف سے تھی اس میں بہت کچھ کمی نظر آتی ہے۔ اس کے ثبوت میں دو امیر خاندانوں کے

لڑکوں کا ذکر کیا هے جو کالج میں داخل هوے - ایک تو نواب جھجور کا بیٹا اور دوسرا سوهن لال وزیر اعظم بادشاہ دهلی کا بیٹا - ادر امید ظاهر کی هے کہ اس طبقے کے اور طالب علم بھی کالج میں داخل هوں گے —

انگریزی شعبہ

انگریزی جماعت کا اضافہ سنہ ۱۸۲۸ ع میں کیا گیا تھا - اول اول ان تمام طلبہ کو داخل هونے کی اجازت دی گئی جو مشرقی السنہ کی تعلیم حاصل کر رهے تھے کہ وہ وظیفے بھی پاتے رهیں اور اپنے نام بھی مشرقی شعبے میں بدستور رهنے دیں - لیکن اس انتظام میں دقت معلوم هوئی کیوں کہ نصف سے زیادہ طلبہ نے انگریزی پڑھنے کی خواهش ظاهر کی - لہذا انگریزی شعبے کو علحدہ قائم کرنے کی راے قرار پائی - پندرہ وظیفے صرف انگریزی جماعت کے لئے الگ قائم کئے گئے - اور یہ قاعدہ قرار دیا گیا کہ مشرقی شعبے کا جو طالب علم اُس شعبے کو چھوڑ کر انگریزی شعبے میں داخل هونا چاهے گا تو وہ اس وظیفے سے محروم کر دیا جاے گا جو اُسے مشرقی شعبے میں مل رها هے - انگریزی خواں طلبہ کے وظائف کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھا دی گئی —

سنہ ۱۸۲۹ ع میں ممتحن کی رپوٹ سے یہ معلوم هوتا هے کہ طلبہ نے انگریزی تعلیم میں خاطر خواہ ترقی کی هے اور تاریخ انگلستان کے ابتدائی حصے کے واقعات سے نہایت تفصیل کے ساتھہ واقف هیں ممتحن کہتا هے کہ میں گھنٹے بھر جرح کرتا رها لیکن کوئی ایک غلطی بھی طالب علموں نے اپنے جوابات میں نہیں کی ، اُن کو نہایت جزئی اُمور بھی صحت کے ساتھہ یاد تھے - انگریزی صرف و نحو کے قواعد سے بھی وہ بخوبی واقف تھے البتہ فارسی اُردو سے صحیح انگریزی میں ترجمہ کرنے میں ناقص تھے —

دوسرے سال کے امتحان میں یہ معلوم هوا کہ لڑکوں نے انگریزی پڑھنے

کے طریقے میں خاص ترقی کی ہے اور انگریزی میں گفتگو بھی کرسکتے ھیں مگر بے تکلفی ساتھہ کے نہیں اور نحوی قواعد کی صحت کا بھی خیال نہیں کرتے - انگریزی ترجمے میں بھی ممتحن نے ان کی تعریف کی ہے اور لکھا ھے کہ ان کے " ترجمے ایسے ھی اچھے تھے جیسی ان سے توقع ھو سکتی تھی "

سنہ ۱۸۳۴ ع میں نصاب میں جیومیٹری (علم ھندسہ) کا اضافہ کیا گیا - اُس سال کی رپوٹ سے ظاہر ھوتا ھے کہ طلبہ نے کچھہ زیادہ ترقی نہیں کی - رپوٹ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اب وہ اس درجے کو پہنچ گئے ھیں کہ جہاں ترقی اُستاد کی کوشش پر نہیں بلکہ اپنی محنت پر ھے —

سنہ ۱۸۳۵ ع کی رپوٹ میں جنرل کمیٹی نے یہ رائے ظاھر کی کہ انگریزی شعبے میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ھے کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کے وسائل مہیا کئے جائیں - لوکل کمیٹی سے یہ خواھش کی گئی ھے کہ وہ کالج کی تنظیم کی اسکیم پیش کرے جس میں پروفیسروں کا تقرر بھی شریک ھو - جب لارڈ آکلنڈ نے ایک یا دو سال بعد کالج کا معائنہ فرمایا تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اعلیٰ جماعت کے لئے اعلیٰ قسم کی تعلیم کا انتظام ھونا چاھئے - دیسی مدرسین کی تنخواہ بہت کم ھے یعنے دس روپے ماھانہ سے کچھہ ھی زیادہ - جس کا نتیجہ یہ ھے کہ کم لیاقت لوگ رکھنے پڑے ھیں - ان نقائص کی اصلاح اس وقت ھوئی جب سنہ ۱۸۴۰ ع میں درسگاھوں کی جدید تنظیم عمل میں آئی اور مدرسین کی تنخواھوں میں اضافہ کیا گیا —

انگریزی شعبے کے ابتدائی زمانے میں ممتحنین کو اس امر کی بڑی شکایت تھی کہ طلبہ زبان میں ناقص تھے - سنہ ۱۸۳۶ ع میں ممتحن نے یہ خیال ظاھر کیا تھا کہ بعض طلبہ نے انگریزی زبان میں کافی لیاقت بہم پہنچانے سے قبل سائنس

شروع کردی۔ اس کی راے میں زبان کی تعلیم کی مدت بڑھا دی جاے اور اس کے بعد سائنس وغیرہ شروع کرائی جائیں۔ چند سال بعد سر ای۔ ریان نے معائنہ کے وقت یہ بیان کیا کہ سارے مدرسہ میں شاید ھی کوئی لڑکا ھو جو انگریزی صحت اور اچھے تلفظ کے ساتھہ پڑہ سکتا ھو، اگرچہ ان میں سے بعض ہرنکلے کی ھیئت پڑھتے تھے —

سنہ ۱۸۳۹ ع میں تعلیمی ترقی کے بہت اچھے آثار نظر آتے ھیں چنانچہ سالانہ امتحان میں ممتحنوں نے اعتراف کیا کہ طلبہ کی لیاقت ریاضیات کی مختلف شاخوں میں بہت اچھی ھے اور ملٹن کی کتاب Paradise Lost سے جو اشعار تشریح کے لئے دیے گئے تھے ان کے معانی و مطالب خوبی سے بتاے اور سوالات کے جوابات بہت معقول دیے۔ مضامین اور ترجمے جو گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجے گئے تھے وہ پسند کئے گئے۔ ادنیٰ جماعتوں کی حالت بھی قابل اطمینان پائی گئی —

مشرقی اور مغربی انگریزی اور مشرقی شعبے کئی سال تک نصاب تعلیم نیز شعبوں کا انضمام تقریباً ھر پہلو سے ایک دوسرے سے جدا اور مختلف رھے جب پرنسپل کا تقرر ھوا تو اس نے (مسٹر بٹرورتھ) اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دونوں شعبوں کی تعلیم کو ملا کر ایک کردیا جاے اور اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے کامل کوشش کی جاے تاکہ بالآخر ان دونوں کی تعلیم اگر بالکل یکساں اور ایک نہ ھو سکے تو کم سے کم برابر ضرور ھو جاے —

اس مقصد کے مد نظر سنہ ۱۸۴۴ ع میں دونوں شعبوں کا امتحان لیا گیا اور جہاں تک ممکن ھوا یہ امتحان ایک ھی مضامین میں لیا گیا اور ایک ھی سوالات دیے گئے۔ نتیجے میں مشرقی شعبہ کسی طرح مغربی شعبے سے کم نہ رھا۔

لفٹننٹ گورنر بہادر نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس کے قائم رکھنے کی خواہش ظاہر کی - نیز انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دونوں شعبوں کو ایک ھی مکان میں ایک چھت کے نیچے تعلیم دینے سے اس تجویز کی کامیابی میں زیادہ سہولت پیدا ہوگی ' علاوہ اس کے بعض اور وجوہ بھی ھیں جن کی بنا پر ان کا ایک جگہ رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے - چنانچہ دوسرے ھی سال یعنی سنہ ۱۸۴۴ ع میں اس پر عمل در آمد شروع ہوگیا —

دونوں شعبوں کی تعلیم کو ایک کردینے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں شعبوں میں تاریخی ' اخلاقی اور سائنٹفک مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جاے - ان مضامین کے ذیل میں حساب ' جیومیٹری ' الجبرا نیچرل فلاسفی ' جغرافیہ ' تاریخ ھند ' معاشیات (پولیٹیکل اکانومی) اور اصول قانون (جورس پروڈنس) کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا - کالج کے پرنسپل مسٹر بٹرو کا خیال تھا کہ ایسے مضامین اور علوم کی تعلیم سے جو دیسی مدارس میں عموماً نہیں پڑھاے جاتے اُس تعصب اور تنگ خیالی میں کمی پیدا ہوگئی ہے جو صرف عربی فارسی پڑھنے والوں میں پیدا ہوجاتی ہے - اور جب موجودہ نسل کے اساتذہ رخصت ہوجائیں گے اور اِن کے جانشین وہ ہوں گے جنھوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے - تو روشن خیالی میں اور بھی زیادہ ترقی ہوجاے گی —

انگریزی اور مشرقی شعبوں کے نصاب تعلیم کے یکساں کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مبارک کام یہ ہوا کہ دیسی زبان (اردو) کی تعلیم و تکمیل کی طرف بھی توجہ شروع ہوگئی - یہ غالباً لفٹننٹ گورنر بہادر کی اس راے کا اثر معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے صوبے کی تعلیمی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوے ظاہر کی تھی کہ " دھلی میں بھی ' جہاں فصیح ترین زبان بولی

جاتی ہے اور جسے ہر طبقہ کے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں ' طلبہ کو فصیح زبان میں انشاپردازی یا با محاورہ ترجمہ سکھانے میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت اکثر یہ ہوتا ہے کہ جملوں کی نحوی ساخت بدل دی جاتی ہے لیکن اصل زبان کا اسلوب بیان اور طرز ادا جوں کا توں رہتا ہے " —

سالانہ رپوٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں انگریزی پڑھنے کا شوق دن بدن بڑھتا جاتا ہے ۔ اس شوق کا پتا سنہ ۱۸۴۳ ع کی روئداد سے لگتا ہے جب کہ انگریزی شعبے میں ۱۱۶ نئے طالب علم داخل ہوے ۔ سنہ ۱۸۴۵ ع میں پرنسپل نے رپوٹ کی کہ ابتدائی جماعتوں میں طالب علموں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ عملے اور مکان میں اضافے کی ضرورت پڑے گی ۔ لفٹننٹ گورنر بہادر نے جواب دیا کہ اگر تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی تعلیم آسانی سے ممکن نہیں تو داخلے میں کمی کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو داخلے کی فیس بڑھا دی جاے یا داخلے کا معیار لیاقت زیادہ کردیا جاے ۔ امیدواروں میں سے سب سے مستعد اور ہوشیار لڑکوں کے انتخاب کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ امیدوار زیادہ تیاری کرکے آئیں گے اور ابتدائی جماعتیں خود بخود برخاست ہو جائیں گی ۔ اب چونکہ دونوں شعبے ایک ہوگئے ہیں ' اس لئے ان کا ذکر الگ الگ نہیں کیا جاے گا ' دونوں ساتھہ ساتھہ آئیں گے ۔ البتہ اس قدر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوگا اور یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس سال (سنہ ۱۸۴۵ ع) طالب علموں کی تعداد ۴۶۰ ہوگئی ۔ انگریزی کے ۲۴۵ ' عربی کے ۷۵ ' فارسی کے ۱۰۹ ' سنسکرت ' کے ۳۱ طالب علم تھے ۔ جن میں ۱۵ عیسائی ۱۴۶ مسلمان اور ۲۹۹ ہندو تھے —

اس سے ظاہر ہے کہ پرانی بدگمانی رفع ہو گئی تھی اور کالج رفتہ رفتہ مقبول ہوتا جاتا تھا - مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ نہ تھی تاہم کافی تھی —

انگریزی شعبے کے طلبہ میں سے ۴۴۰ ' سنسکرت کے تمام طلبہ یعنے اکتیس کے اکتیس اُردو پڑھتے تھے ناگری یا ہندی پڑھنے والے کلّہم ۴۲ تھے —

یہ تعداد خود اپنی زبان سے اُردو کا کلمہ پڑھ رہی ہے - یعنے ۴۹۰ میں سے ۴۵۵ اُردو پڑھنے والے تھے اور ہندی پڑھنے والے فقط ۴۲ - اور یہ بھی ہندی اس لئے پڑھتے تھے کہ بعض ان میں سے فوج میں منشی گری کی نوکری کر لیتے تھے اور وہاں اس کی ضرورت پڑتی تھی —

سنہ ۴۶ - ۱۸۴۵ کی رپوٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نصاب کی کتابوں کا تعین گورنمنٹ کی منظوری سے ہوتا تھا لیکن کام کی مقدار کا تعین پرنسپل اور مدرسین کے ہاتھ میں تھا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض طلبہ جو غیر معمولی طور پر ذہین اور محنتی ہوتے تھے وہ باقی طلبہ سے آگے نکل جاتے تھے - مدرس زیادہ تر ایسے ہی طلبہ کی طرف توجہ کرتے تھے کیوں کہ اُن کی وجہ سے اُن کے کام کی داد ملتی تھی - اس طرح ایک جماعت کے دو دو تین تین فریق ہو جاتے تھے - سال کے آخر میں صرف ایک ہی فریق نصاب پورا کرتا تھا ' باقی طلبہ کی تعلیم میں بہت کم ترقی ہوتی تھی - اس سے جماعت کی عام ترقی پر برا اثر پڑتا تھا - لہذا کمیٹی نے یہ تجویز کی کہ ہر سال کے شروع میں جماعت کا سال بھر کا کام پہلے سے مقرر کردیا جاے اور پھر اُسے بارہ مہینوں میں تقسیم کیا جاے اور ماہانہ امتحانات میں دیکھ لیا جاے کہ اس مہینے میں جو سبق پڑھاے گئے ہیں وہ طلبہ نے بخوبی سمجھ

لیے هیں یا نہیں - سال کے آخر میں اسی مدرس کا کام سب سے بہتر سمجھا جاے گا جس کے طالب علم زیادہ سے زیادہ تعداد میں کامیاب هوں گے - جو طالب علم زیادہ ذهین اور محنتی هیں وہ اپنا وقت اپنے ذوق کے مطابق دوسرے مضامین کے مطالعہ میں صرف کریں اور جو طالب علم باقی جماعت کے ساتھ نہیں چل سکتے وہ آیندہ سال نیچے کی جماعت کے ساتھ اُسی نصاب کو پھر پڑھیں —

یہ تجویز بہت مناسب اور معقول خیال کی گئی اور کمیٹی نے یہ خود پیش کی کہ آیندہ امتحان کے بعد جہاں تک جلد ممکن هو هر جماعت تجویز بالا کے مطابق ایک گوشوارہ هر جماعت کی تعلیم کا تیار کرکے پیش کیا جائے تاکہ وہ گورنمنٹ میں بغرض اطلاع بھیج دیا جائے —

اس سال میقات ختم هونے پر ۲۶ دسمبر ۱۸۴۶ ع کو تقسیم انعامات کا جلسہ هوا اعلی جماعتوں کے امتحان کے لیے تاریخ ، انگریزی ، عربی ، سنسکرت کے سوالات کے پرچے گورنمنٹ کی جانب سے وصول هوے اور قانون ، سیاست مدن (معاشیات) نیچرل فلاسفی Smiths, Moral Sentiments کے سوالات اور انشاپردازی کا پرچہ کالج هی میں مرتب کیا گیا —

ریاضی ، طبیعیات ، نیچرل تھیالوجی اور سیاست مدن کے سوالات کے پرچے انگریزی اور مشرقی شعبے کے لیے ایک هی تجویز کئے گئے تاکہ دونوں شعبوں کی استعداد کا مقابلہ کیا جاسکے - مضمون نگاری کا موضوع بھی دونوں کے لئے ایک هی رکھا گیا ، جو یہ تھا —

" بالائی (شمالی) هندستان پر ریلوں کے جاری

هونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا " —

تاریخ کے سوالات جدا جدا تھے ، کیونکہ مشرقی شعبے میں یہ مقابلہ

انگریزی شعبے کے اس مضمون کی تعلیم کم ہوی تھی - جس کی ایک وجه یه بھی تھی که تاریخ کی کتابوں کے ترجمے مہیا نہیں ہوسکے تھے - تاہم دونوں شعبوں کے طلبه کے جوابات بہت قابل اطمینان پائے گئے —

ادنی جماعتوں کا امتحان ڈاکٹر راس نے لیا اور طلبه کی استعداد ترقی پر اظہار مسرت کیا اور خصوصاً مبتدیوں کے عمدہ تلفظ کو بہت پسند کیا —

سالانه امتحان کے موقع پر دھلی اور قرب و جوار کے فارسی طلبه کو ادنی و ظائف کے مقابلے کی دعوت دی گئی باھر سے ۲۸ طالب علم شریک ہوے جن میں سے سات نے چار چار روپے ماهانه کا وظیفه حاصل کیا —

پرنسپل صاحب (ڈاکٹر سپرنگر) نے اپنی رپوٹ میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے - وہ لکھتے ہیں که فارسی جماعتوں کی تعلیم ناقص ہونے کی وجه یه ہے که مولوی صاحب (مدرسین فارسی) پر تکلف یعنے مسجع مقفی طرز تحریر کے دلدادہ ہیں اور متاخرین کے کلام کو پسند کرتے ہیں —

سنسکرت کے شعبے کی حالت خراب پائی گئی جس کی وجه یه بتائی گئی که پنڈت صاحبوں پر پوری نگرانی نہیں رکھی جاتی - البته جب پرنسپل صاحب سنسکرت سے زیادہ واقف ہو جائیں گے تو اس شعبے میں ضرور ترقی ہوگی —

ہندی کی تعلیم بھی اچھی نہیں تھی - دونوں استادوں نے ہندی خود ہی محنت سے پڑھی ہے اور با وجود مقدور بھر کوشش کے ان میں معلم ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوی —

شعبۂ مشرقی کے طلبہ انشا پردازی میں خاص طور پر ناقص پائے گئے اس کے متعلق ڈاکٹر سپرنگر نے مفصلۂ ذیل راے کا اظہار کیا : —

" مولوی صاحب جو اپنے شاگردوں سے فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کراتے ھیں وہ اس قدر لفظی ھوتا ھے کہ میں نے اکثر یہ دیکھا ھے کہ اگرچہ طالب علم اپنے استاد کے منشا کے مطابق ترجمہ کرلیتا ھے لیکن اصل مفہوم سے نا آشنا رھتا ھے ' یہی وجہ ھے کہ مولویوں اور ان کے شاگردوں کا طرز تحریر بھدا اور زبان بے مزہ اور غلط ھوتی ھے - اُن کے خیالات ملایانہ طرز تعلیم کی وجہ سے نہایت محدود ھوتے ھیں - میری راے میں مشرقی شعبے کے تمام نقائص میں سے سب سے پہلے اس کی اصلاح ھونی چاھئے اور مجھے یقین ھے کہ اس کے بعد دوسرے ھی امتحان میں ترقی نظر آئے گی " —

دھلی کے شرفا اور امرا میں زیادہ تر تعداد مسلمانوں کی تھی - ڈاکٹر سپرنگر چونکہ عربی زبان سے واقف تھے اس لئے انہوں نے وھاں کے شرفا میں خاصی مقبولیت حاصل کرلی تھی —

کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ میں جو یورپین ادب و علوم کا ذوق پیدا ھوگیا تھا وہ برابر جاری رھا - اس میں دھلی ورنیکلر سوسائٹی کی کوششوں نے بہت مدد دی اور اس سوسائٹی کے روح و رواں ڈاکٹر صاحب ھی تھے —

سنہ ۱۸۴۷ ع کا امتحان اس سال کے آخر اکتوبر میں شروع ھوا اور ۲۴ دسمبر تک رھا اور میقات ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۴۷ ع کو ختم ھوگئی —

اس سال بھی یہ اهم اصول مد نظر رہا کہ مشرقی شعبے کے درجوں کو مغربی علوم کی مبادیات کی تعلیم دی جاے - کمیٹی نے اس امتحان کا جو گوشوارہ تیار کیا تھا اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان کے مضامین دونوں شعبوں میں تقریباً یکساں تھے - مثلاً احصاے تفرقات (Differential Calculus)، علم مثلث (Trignometry)، اقلیدس، نیچرل فلاسفی، الجبرا، جغرافیہ، مضمون نویسی یہ سب مضامین دونوں کے ہاں تھے - البتہ تاریخ کے مضمون میں کچھ فرق تھا - انگریزی شعبے میں مارشمین، ہیوم، گبن وغیرہ کی تاریخیں تھیں اور مشرقی شعبے میں مختصر خاکۂ تاریخ اور جامع التواریخ تھی - وجہ یہ تھی کہ انگریزی تاریخیں جو انگریزی شعبے میں پڑھائی جاتی تھیں ان کا ترجمہ اردو میں موجود نہ تھا اور یہ مجبوری تھی -

امتحان کے نتائج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شعبوں کی کامیابی قریب قریب یکساں ہے -

عربی اور فارسی شعبوں کی مجوزہ اصلاح — کمیٹی نے بہ نظر اصلاح یہ تجویز کی کہ عربی اور فارسی شعبوں میں صرف مفید اور کار آمد علوم کا درس دیا جاے اور عربی صرف و نحو، منطق، فقہ اور حدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں نصاب تعلیم میں نہ شریک کی جائیں بلکہ ان کی تعلیم عام لکچروں کے ذریعہ دی جاے - اس کے متعلق کمیٹی کو اطلاع دی گئی کہ کمیٹی نصاب تعلیم میں اس قسم کے تغیر و تبدل کی مجاز ہے جس سے طلبہ کی دماغی ترقی متصور ہو، اگر ضرورت ہو تو وہ ایسے اصحاب کو بلا معاوضہ لکچر دینے کی اجازت دے سکتی ہے جو اس کام کے اہل ہوں، گورمنٹ کو بھی ان اشخاص کے تقرر میں کوئی عذر نہ ہوگا -

سنسکرت اور ہندی کے شعبے — جب کمیٹی کی توجہ اس طرف منعطف کی گئی کہ سنسکرت اور ہندی شعبوں میں کسی قسم کی کوئی ترقی نظر

نہیں آتی تو کمیٹی نے یہ تجویز کی کہ سنسکرت کی جماعت توڑ دی جائے۔ اور ہندی کے شعبے کو زیادہ کارآمد اور بہتر بنایا جائے۔ ہندی زبان تمام طلبہ کے لئے لازمی کردی جائے اور وظیفے کے لئے ہندی کا جاننا لازم قرار دیا جائے۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور یہ لکھا کہ سنسکرت کی جماعتوں کا برخاست کرنا اہل ملک اور طلبہ کو ملک کی ایک قدیم اور علمی زبان کے علم سے محروم رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہندی کے متعلق یہ لکھا کہ ایک ایسی زبان کا علم تمام طلبہ کے لئے لازم قرار دینا جو ملک کی سرکاری اور دفتری زبان نہیں ہے ہماری رائے میں درست نہیں۔ علاوہ اس کے مسلمان طلبہ جن کی تعداد اس کالج میں بہت بڑی ہے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔

انگریزی شعبے کی ترقی

دو سال قبل انگریزی شعبے کے صرف چھ طالب علم ایسے تھے جو امتحان میں سوالات کے جوابات انگریزی میں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس سال ۵۲ نے تاریخ کے سوالات کے جواب انگریزی میں لکھے اور ۴۵ طالب علموں نے (علاوہ درجۂ اول کے طلبہ کے) جیومیٹری (علم ہندسہ) کا مطالعہ شروع کیا اور ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی تعلیم چار سال سے اوپر کی ہو۔ لہذا کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ صرف چند منتخب طلبہ پر خاص توجہ مبذول نہیں کرنی چاہئے بلکہ عام طور پر ترقی کا خیال رکھنا چاہئے۔

سنہ ۱۸۴۸ ع۔ کا امتحان

سنہ ۱۸۴۸ ع کا امتحان ۲۴ نومبر سے ۲۱ دسمبر تک یعنی ۲۱ دن تک رہا۔ (باستثنائے ایام تعطیلات) —

ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورنمنٹ نے مرتب کراکر بھیجے باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کئے۔ باقی جماعتوں کا امتحان اردو کے مولوی مملوک علی نے اور انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا —

مسعودی ' تاریخ یمینی ' قدوری ' میر قطبی ' حماسہ ' حسینی کے پرچے گورمنٹ نے بھیجے اور سنی اور شیعہ طلبہ کی اعلیٰ جماعتوں کو دیے گئے - ان کے تحریری جواب مفتی صدرالدین صاحب نے معائنہ کئے - عربی کی باقی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ھی نے لیا - عربی جماعتوں کے پرچے ڈاکٹر سپرنگر نے بھی دیکھے - فارسی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ھی نے لیا - ان کی راے میں ان جماعتوں کے طلبہ کی قابلیت نہایت عمدہ تھی - تاریخ اور سائنس وغیرہ کا امتحان ' جن کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی ' تحریری ھوا اور جوابات قائم مقام پرنسپل نے ماسٹر رامچندر اور اجودھیا پرشاد (مدرسین سائنس) کی معیت میں دیکھے —

مضمون نویسی کے لئے عنوان مسٹر کوپ نے دیا تھا اور یہ مضمون انگریزی کی دو اعلیٰ جماعتوں اور مشرقی شعبے کی چار جماعتوں کے طلبہ کو لکھنے کے لیے دیا گیا - انگریزی میں موتی لال کا مضمون بہ لحاظ زبان اور بہ لحاظ طریقۂ بیان سب سے بڑھ کر رھا - مشرقی شعبے کے طلبہ میں محمدحسین * کا مضمون سب سے بہتر خیال کیا گیا - بہت سی معلومات اس مضمون میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں جو نصاب تعلیم میں شریک نہ تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق دہلی گزٹ یا دہلی اردو اخبار سے تھا اور اس لئے اُسے اردو اخبارات کے پڑھنے کی عادت تھی اوران سے اس نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں - اس لئے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ بعض اردو اخبار ھندوستان میں صحیح اور مفید معلومات کی اشاعت میں بہت اچھا کام کررھے ھیں —

* شمس العلما محمدحسین آزاد ھیں —

ہندی | اگرچہ ہندی کی تعلیم لازمی نہ تھی لیکن اس کی طرف ہر سال زیادہ توجہ ہوتی جاتی تھی - عربی کے ۸۳ اور انگریزی کے ۹۵ طلبہ بیتال پچیسی پڑھ سکتے تھے اور ۱۹ پریم‌ساگر ' اور بہت سے ناگری خط میں لکھہ سکتے تھے —

تمغہ یاب | اس سال انگریزی جماعت میں مسٹر گوپال سہائے کو برنکلے کی کتاب ہئیت کے بہترین جوابات دینے پر چاندی کا تمغہ عنایت ہوا جو سر تی - مٹکاف نے کمیٹی کو اسی غرض سے دیا تھا - انھوں نے الفسٹن کی تاریخ ہند کے لئے بھی ایک تمغہ تجویز کیا تھا وہ کوئی حاصل نہ کرسکا —

سنہ ۵۰-۱۸۴۹ | اس سال ۸۷ طلبہ فارغ التحصیل ہوے جن میں سے پانچ رڑکی کالج کی جماعت سوم میں گئے اور دس نے ملازمت حاصل کی —

سالانہ مضمون نویسی کے لئے مسٹر جے گبنز نے ذیل کا مضمون تجویز کیا :—

" اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا
کے بارے میں کیا فرق تھا " —

اس مضمون کے جوابی پرچوں میں تاریخی اور عام معلومات اچھی خاصی پائی گئیں اور لکھنے والے قومی تعصبات سے بری تھے - موتی لال کا مضمون انگریزی میں اور محمد حسین کا اردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا - موتی لال نے اس کے علاوہ مضمون نویسی کے دو تمغے بھی حاصل کئے ایک نقرئی تمغہ انگریزی مضمون کا تاریخ برطانیۂ ہند پر ' یہ سر تی - مٹکاف کا عطا کردہ تھا - دوسرا طلائی تمغہ جو اردو مضمون کے لئے سرھر برٹ میڈوک نے عطا کیا تھا - یہ مضمون دونوں شعبوں کے طلبہ کے لئے

تھا - مضمون کا عنوان یہ تھا :—

" مختلف آزاد پیشے اور مفید کار و بار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک میں کامیابی کے بہترین طریقے' خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ سے یا ما بعد کی مساعی کے اعتبار سے "—

موتی لال اس کے بعد لاہور کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن میں ایک سو پچاس روپے ماہانہ پر ملازم ہوگئے —

کالج کی حالت اب بہت درست ہوگئی تھی اور ہر طرف سے اطمینان حاصل ہوگیا تھا اور زیادہ توجہ اب نصاب تعلیم کی اصلاح کی طرف ہوگئی تھی سنہ ۱۸۵۳ ع میں طلبہ کی تعداد یہ تھی —

انگریزی	۱۹۹	جملہ ۳۲۰
عربی	۳۹	
فارسی	۵۷	
سنسکرت	۲۵	

عیسائی	۱۰	
مسلمان	۹۳	۳۲۰
ہندو	۲۱۷	

انگریزی شعبے کے سب کے سب یعنی ۱۹۹ طالب علم اور سنسکرت شعبے کے بھی کل طالب علم یعنی پچیس کے پچیس اردو پڑھتے تھے - فارسی عربی والوں کو تو یوں بھی پڑھنی ہی پڑتی تھی —

فارسی شعبے میں سے ۷ انگریزی اور فارسی عربی کے ۷۴ ناگری اور انگریزی شعبے کے ۸ فارسی پڑھتے تھے —

ماسٹر رام چندر اور چمن لال اس سال ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے
کے عیسائی ہونے سے شہر میں ہیجان کالج کو کسی قدر دھچکا لگا - وہ یہ تھا
کہ ماسٹر رام چندر جو اردو میں سائنس پڑھاتے تھے اور لالہ چمن لال فرسٹ
سب اسسٹنٹ سرجن دھلی دونوں کے دونوں عیسائی ھوگئے - اس سے دلی
کی مخلوق بہت بگڑی اور شہر میں بڑا غلغلہ پیدا ھوا - ایسا سننے میں
آیا ھے کہ بعض اور طالب علم عیسائی ھونے پر تلے ھوے تھے لیکن دلی والوں کے
ڈر سے رہ گئے - لیکن تارا چند نے بعد میں عیسائی مذھب قبول کر لیا -
جو ریورنڈ تاراچند کے نام سے مشہور ھوے اور چند سال کا عرصہ ھوا
اجمیر میں انتقال کر گئے - ۱۱ جولائی کو ماسٹر رام چندر اور چمن لال
نے بپتسمہ لیا - ۱۰ جولائی تک کالج میں داخلہ برابر ھوتا رھا اور طلبہ
کی تعداد ۳۴۲ تھی لیکن اس خبر کے اڑتے ھی دفعتا داخلہ بند ھوگیا
اور چوبیس پچیس لڑکوں نے فورا اپنے نام کٹوالئے - لیکن جنوری سنہ ۵۳ ء
میں لوگوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑگیا اور پھر لڑکے داخل ھونے
شروع ھو گئے —

مسٹر کارگل پرنسپل کالج نے مشرقی شعبے کے نصاب تعلیم کے
متعلق ایک تجویز گورنمنٹ میں پیش کی - وہ لکھتے ھیں کہ
مسلمانوں میں جدید تعلیم کی طرف سے جو بدگمانی اور تعصب
تھا وہ اب کم ھوتا جا رھا ھے اور " اب وہ سمجھہ گئے ھیں
کہ تاریخ اور نیچرل سائنس کی تعلیم منطق ، فقہ اور تفسیر کے
مقابلے میں زیادہ اھم ھے - منطق و فقہ و تفسیر کا پڑھنا
نہایت ضروری ھے تاکہ طلبہ عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی
واقف ھو جائیں - کیونکہ تاریخ اور نیچرل سائنس پر کافی

کتابیں نہیں ہیں جن کے مطالعہ سے ان زبانوں کا علم حاصل ہوسکے ' لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر اس قسم کی کتابیں مہیا ہو جائیں تو منطق و فقہ کی کتابیں پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ' لہذا گورنمنٹ کی توجہ اس جانب مبذول کی جاتی ہے کہ کالجوں میں عربی اور فارسی کی تاریخوں کے بہت اچھے کتب خانے قائم کئے جائیں - ایسے منطق پر زیادہ تر توجہ صرف کرنا جس میں نہ فلسفہ ہے نہ عقلیت بے سود ہے - اب رہی فقہ ' سو اس کا بالکل خارج کر دینا خلاف دانشمندی ہوگا - عربی کے علما ایک معقول اور مختصر نصاب تعلیم اس مضمون کا انتخاب کرکے مرتب کرسکتے ہیں - ریاضیات اور نیچرل سائنس کے متعلق میری یہ راے ہے کہ جب انگریزی کا نصاب قطعی طور سے متعین ہو جائے تو اس کا اردو میں ترجمہ کرکے مشرقی شعبے کے لئے مقرر کر دیا جاے - ایسے نصاب کی سخت ضرورت ہے - گزشتہ تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایسی کتابوں کے ترجمے اور طبع پر وقت اور روپیہ صرف کرنا جو کبھی پڑھنے میں نہ آئیں گی ' بیکار ہے - مشرقی شعبے کا طالب علم سائنس کی تعلیم میں آگے بڑھ رہا ہے اور کسی طرح اپنے حریف یعنی انگریزی شعبے کے طالب علم سے پیچھے نہیں ہے ' لیکن اندیشہ یہ ہے کہ مناسب کتابوں کے نہ ہونے سے وہ بخوبی اس علم کو حاصل نہیں کرسکتا جو کتابوں کے موجود ہونے سے کرسکتا تھا - حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے - انھوں نے

مشرقی شعبے کے طلبه کا امتحان لیا اور اُن سے علم هئیت ' جنرل سائنس ' اور اخلاق اور مذهبی مسائل پر گفتگو کی ۔ ان سب کا یه بیان هے که اس شعبے میں قطعی طور سے بہت بڑی ترقی پائی جاتی هے اور مختصر یه که تمام هندوستان میں کسی جگه ترقی کے ایسے آثار نظر نہیں آتے "

اسی پر لفٹنٹ گورنر بہادر نے جو جواب دیا اس کا خلاصه یه هے —

لفٹنٹ گورنر ' پرنسپل صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے هیں اسلامی فقه ' مذهب اور منطق کی تعلیم اُسی حد تک هونی چاهئے جہاں تک ان کے مطالعه سے زبان اور اصول فقه کے علم حاصل هونے میں مدد ملے ان خاص اور رسمی علوم کے مطالعه میں زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں معلوم هوتا ۔ عربی ادب سے ایسے مفید انتخابات جو مستند اور اعلی درجے کی کتابوں سے کئے جائیں گے کالجوں میں جاری کرنے سے موجودہ نظام تعلیم کی خرابیاں بہت کچھه کم هو جائیں گی ۔ ایسے انتخاب کی ترتیب کے لئے دهلی کمیٹی کے پاس خاص سہولتیں موجود هیں اور اگر وہ اس معاملے میں کوشش کرے گی تو هز آنر اُسے بنظرتحسین دیکھیں گے ۔ مشرقی شعبے کے طلبه کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو یقین دلایا گیا هے اس پر بیحد مسرت کا اظہار فرمایا ۔ اور آخر میں یه تحریر فرمایا که لفٹنٹ گورنر کی خوشی کا موجب هوگا اگر کمیٹی اردو تعلیم کے ایسے نصاب کے انتخاب کا اهتمام کرے گی جس کی سفارش سکرٹری نے کی هے " —

۱۸۵۴ ع

وہ طوفان جو ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال کے تبدیل مذهب پر اٹھا تھا ' بالکل فرو هوگیا اور طلبه کی تعداد میں کسی قدر اضافه هوا ۔ سنه ۵۳ ع میں تعداد ۳۱۵ تھی ' اس سال

۳۴۳ هوگئی —

مسلمان طلبه میں انگریزی زبان سیکھنے کا شوق بڑھتا جاتا تھا اور گورمنت نے بھی لوکل کمیٹی کے یہ امر ذهین نشین کرنے کی کوشش کی که گورمنت کا هرگز یه منشا نہیں هے که مشرقی شعبے کے تمام طلبه انگریزی پڑھنے پر مجبور کئے جائیں ' لیکن اس کی تمنا ضرور هے که اگر انگریزی زبان نه سیکھیں تو کم از کم مغربی سائنس هی کی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں ' کیونکه تجربے نے ثابت کر دیا هے که اس طریقه سے بھی نہایت مفید اور کار آمد معلومات حاصل کی جاسکتی هیں —

تعداد طلبه بحیثیت تعلیم زبان		
	صرف انگریزی پڑھنے والے	۱۹
	انگریزی اور اردو پڑھنے والے	۱۹۲
انگریزی اردو اور فارسی مل کر پڑھنے والے		۱
صرف اردو پڑھنے والے		۰
اردو کے ساتھه فارسی اور عربی پڑھنے والے		۹۵
اردو کے ساتھه هندی یا سنسکرت پڑھنے والے		۲۷
محض هندی پڑھنے والے		۰
هندی اور سنسکرت پڑھنے والے		۰
هندی اور فارسی و عربی پڑھنے والے		۹۵
محض فارسی پڑھنے والے		۵۷
محض عربی پڑھنے والے		۳۸
محض سنسکرت پڑھنے والے		۲۷

عربی فارسی کے تمام متعلمین هندی پڑھتے تھے اس میں مصلحت یه تھی که ان زبانوں کے طلبه عموما اعلیٰ قابلیت کے هوتے تھے اور جب وه

دیہات میں جاتے تھے تو گانو والوں سے معاملہ کرنے میں یہ زبان کار آمد ثابت ہوتی تھی ۔ سنسکرت پڑھنے والے بلا استثنا اردو پڑھتے تھے ۔ ان کے لئے ہندی کا پڑھنا ضروری نہیں تھا اس لئے کہ سنسکرت اور اردو کا طالب علم ہندی زبان لازمی طور پر سمجھتا ہے —

تعداد طلبہ بلحاظ مذہب			
عیسائی	۱۵		
مسلمان	۱۱۲	جملہ	۳۳۳
ہندو	۲۰۶		

اس سال مسلمان طلبہ کی تعداد میں بین اضافہ ہوا اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس سال زبان اردو کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا تھا ' اس لئے مسلمان زیادہ داخل ہوے اور ان میں سے نصف تعداد نے انگریزی بھی سیکھنی شروع کردی تھی ۔ اس پر انگریزوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں ۔ مسٹر کار گل نے جو کہا تھا کہ مسلمانوں میں سے تعصب اٹھتا جاتا ہے وہ بات سچ نکلی —

اس سال انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی خاص مشق کرائی گئی ۔ اس کام کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ وقف کردیا گیا تھا ۔ بہت سے طالب علم ایسے تھے جن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو کافی تھا لیکن وہ آسانی سے صحیح ترجمہ کرنے سے قاصر تھے ۔ فارسی زبان کے اساتذہ سینیر یا اعلی جماعتوں کو اردو پڑھاتے تھے —

انگریزی اور اردو میں ملکاف صاحب مرگئے تھے' اس لئے کالج فنڈ سے ہر سال مضمون نویسی کے لئے تمغے بیس روپیہ کا تمغہ تیار کرایا جاتا تھا اور انگریزی میں بہتر مضمون لکھنے والے کو ملتا تھا اس سال یہ تمغہ بھگوانداس کو ملا ۔

مفتی صدرالدین صاحب کا تمغہ اردو زبان میں بہترین مضمون لکھنے والے

کو دیا جاتا تھا وہ خواجہ ضیاءالدین کو ملا - مضمون کا عنوان یہ تھا :-

" شاهی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کونسی بہتر هے
اور اس کی فضیلت کی کیا وجہ هے ؟ " —

مسٹر وهرٹر نے ایک نقرئی تمغہ میکینکس کے لئے دیا - مضمون اردو میں لکھوایا گیا - شیخ ضیاءالدین کو ملا -

نیچرل فلاسفی پر اردو میں لکچر

ڈاکٹر میوآٹ نے هز آنر کو لکھا تھا کہ اردو کے شعبۂ سائنس میں ریاضی هي پر تمام کوشش نہیں صرف هونی چاهئیے بلکہ نیچرل فلاسفی اور مخلوط ریاضی پر بھی اردو زبان میں لکچر دینے چاهئیں۔ هز آنر نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور بیان دیا کہ بنارس اور آگرہ کے کالجوں میں اس طریقے سے بیحد فائدہ پہنچایا جارها هے' یہی التزام دلی میں بھی هونا چاهئیے - کلکتہ سے جو آلات منگائے گئے هیں ان سے کام لیا جاے - چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی - تقریباً چھہ سو روپے کے آلات کلکتہ سے آے تھے - ماسٹر رام چندر سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دیتے تھے —

سنہ ۱۸۵۴ ع اور ناظم تعلیمات کا تقرر

سنہ ۱۸۵۴ ع تک ممالک مغربی شمالی میں محکمۂ تعلیمات کا کوئی ناظم نہ تھا۔ یہ محکمہ براہ راست لفٹننٹ گورنر کے ماتحت تھا - ٹامسن صاحب گورنر ممالک مغربی شمالی تھے اور وهی اس صوبے کے تمام کالجوں کے وزیٹر تھے - اس وقت صوبے میں تین کالج تھے - دلی' آگرہ اور بنارس - بعد میں ایک کالج بریلی میں قائم کیا گیا -

کالجوں کے قیام کا منشا

کالجوں کے قیام کا منشا یہ تھا کہ هندوستانیوں کو زبان اردو کے ذریعہ ادب اور سائنس کی تعلیم دی جاے۔ اس مقصد میں حکومت کو ایک گونہ کامیابی هوئی - اس سال کالجوں میں جدید قواعد و ضوابط کا نفاذ هوا - اس کا نتیجہ طلبہ کے حق میں اچھا نکلا اور یہ

سال تمام کالجوں میں سالہائے ماسبق کے مقابلے میں مسعود ثابت ہوا - سوائے دلی کے باقی تمام کالجوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا - دھلی میں مسلمان طلبہ کی کمی کی یہ وجہ بیان کی گئی کہ چھہ مسلمان طالب علم جو عربی فارسی کی اعلیٰ جماعتوں میں تعلیم پاتے تھے ناظم صاحب تعلیمات نے ڈپٹی کمشنر جہلم کی درخواست پر فارسی اور اردو کے مدرسین کی حیثیت سے ضلع جہلم کے مدارس میں بھیج دیے - اسی طرح اور طلبہ نے بھی ملازمتیں اختیار کرلیں - البتہ دوسرے کالجوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد میں نسبتاً ترقی نظر آتی ہے خصوصاً بریلی کالج میں - مسلمانوں کے لیے بڑی کشش شعبۂ علوم مشرقیہ میں تھی - ان تمام کالجوں میں مسلمان ۳۰۳ اور ھندو ۱۵۱۹ تھے - مسٹر ٹیلر پرنسپل دھلی کالج جن کا تعلق اس کالج سے عرصۂ دراز سے تھا اور اس کی حالت سے خوب واقف تھے ، اُن کا بیان ہے کہ دھلی کالج میں مسلمان طلبہ کی کمی کا ایک باعث یہ تھا کہ شہر میں متعدد فارسی اور عربی درسگاہیں کھل گئی تھیں اور عربی فارسی پڑھنے والے طلبہ ان قومی درسگاہوں میں اٹ گئے تھے - کالج کی عربی جماعت میں اُنیس کے انیس طالب علم مسلمان تھے - فارسی کی جماعتوں میں ۲۵ اور انگریزی میں ۲۱ - اس کے باوجود فارسی زبان تحصیل کرنے والے طلبہ میں ھندؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی —

شہر میں ایک فارسی اردو کا مدرسہ تھا اس کے مدرس مسلمان تھے - ۱۰۴ طلبہ اس میں تعلیم پاتے تھے ان میں سو ھندو تھے اور چار مسلمان - اس سے صاف ظاھر ہے کہ اس زمانے میں ھندؤں کو فارسی پڑھنے کا کس قدر شوق تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے مدرسے میں غیر مسلم طلبہ کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی —

مسٹر ٹیلر نے ایک اور بات بھی لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان شرفا ، نواب اور سلاطین دلی کالج کو ایک خیراتی درس گاہ تصور کرتے تھے

اور اس بنا پر اپنے بچوں کو وهاں تعلیم کی غرض سے نہیں بھیجتے تھے لہذا انھوں نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ استادوں کو ملازم رکھه کر اپنے بچوں کو گھروں پر تعلیم دلاتے تھے لیکن اس کے برعکس هندو مالدار سے مالدار اور عزت دار سے عزت دار، دلی کالج کو تمام خانگی درس گاهوں پر ترجیح دیتا تھا اور اپنے بچے کو وهاں تعلیم دلانا پسند کرتا تھا اس وجه سے هر شعبه میں هندو طلبه کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ رهتی تھی —

عیسائیوں کی تعداد تمام کالجوں میں گھٹتی جاتی تھی - اس کی وجه یه تھی که انھوں نے اپنے مدارس میں جہاں صرف انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں کی تعلیم هوتی تھی، الگ کھول لئے تھے - آگرہ میں اس قسم کا مدرسه قائم هوگیا تھا —

اصول تعلیم کا تعین

تعلیم کا اصول یه رکھا گیا تھا که گورمنٹ کالجوں میں آیندہ ایسے مضامین کی تعلیم دی جاے جو دیسی مدارس میں میسر نه آسکیے اور هندوستانیوں کو اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی جاے - ناظم سررشتۂ تعلیمات ممالک مغربی شمالی نے لفتنٹ گورنر سے اس پر عمل در آمد کی شد و مد سے التجا کی تھی اور اس غلطی پر متنبه کیا تھا که بعض طالب علم محض اس خیال سے کالجوں میں داخل هوجاتے هیں که وهاں تعلیم کا نرخ ارزاں هے اور تعلیم بھی کونسی جو کالج کے باهر بھی میسر آسکتی هے - لہذا انھوں نے استدعا کی که ایسے طلبه کو داخل هی نه کیا جاے (در اصل دلی کالج میں یه صورت پیش آئی تھی، بنارس کالج اس سے مستثنیٰ تھا) ناظم تعلیمات نے اس بات کی سفارش کی تھی که طلبه کی دماغی اور ذهنی قوتوں کو علم کے ایسے شعبوں پر مرکوز کرایاجاے جو سب سے زیادہ کار آمد اور اهم هیں موجودہ طرز تعلیم سے اساتذہ اور طلبه

دونوں کی جان ضیق میں آجاتی ھے' ان کے سامنے اتنے مضامین گڈ مڈ کر کے رکھ دیے جاتے ھیں جن کا بار اُتھائے نہیں اتھتا اور غریب طلبہ کی راہ ترقی مسدود ہوجاتی ھے - لہذا یہ تجویز کی جاتی ھے کہ کوئی لڑکا دو زبانوں سے زیادہ نہ سیکھے - ہر ایسا طالب علم جو انگریزی پڑھتا ھے صرف اردو لازمی طور پر پڑھے اور ناگری حروف سے بخوبی شناسا ہوجائے تاکہ انھیں کامل صحت اور پوری آسانی سے بے روک ٹوک اور بے جھجک اُتھا لے اور اگر وہ گورمنٹ کا افسر مال گذاری ہوجائے تو اُسے کوئی دقت پیش نہ آئے —

ھندی اُڑا دی جائے اور اردو　س کے ساتھ یہ بھی تجویز کی کہ بنارس' کو ترقی دی جائے　ساگر اور اجمیر کے علاوہ باقی کالجوں میں سے ھندی کو یکسر اُڑا دیا جائے - وجہ یہ بیان کی گئی کہ تحصیلی اور دیگر مدارس میں ھندی پڑھنے پڑھانے کا کافی انتظام ھے - تمام فارسي طلبہ پر اردو پڑھنا لازمی کیا جائے اور انھیں کسی دوسری زبان سیکھنے کی اجازت نہ دي جائے - شعبۂ عربی پر بھی یہ بات لازمی کردی جائے اور اس طرح جونیر کلاسوں کے تمام طلبہ عربی' فارسی' انگریزی' اردو میں ایک جگہ ملا دیے جائیں اور زبان اردو کا ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے جس میں حساب' جبرومقابلہ' جیومیٹری (علم ھندسہ) تاریخ اور جغرافیہ سے پوری واقفیت اور آگاھی حاصل کی جائے یعنے طلبہ زبان اردو کے ذریعے اِن مضامین میں مہارت تامہ حاصل کریں اور انگریزی عربی فارسی زبانوں کی تحصیل نکتہ فہمی اور دقیقہ سنجی کے ساتھ علحدہ علحدہ جماعتوں میں کی جائے - مزید برآں شعبۂ اردو میں قواعد اردو اور زبان اردو میں مضمون نگاری کی کامل دسترس حاصل کی جائے ؛ انگریزی' فارسی اور عربی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے

کی مشق بہم پہنچائی جاے - اسی طرح انگریزی فارسی اور عربی کی جماعتوں میں طلبۂ کو ایسی تربیت دی جاے کہ وہ اردو سے ان زبانوں میں ترجمہ کرنے کا ملکہ پیدا کرلیں " * —

لفٹنٹ گورنر کی منظوری

لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز کو بہت پسند فرمایا اور خاص طور پر اردو شعبے کے علحدہ طور پر قائم کرنے کو بہ نظر استحسان دیکھا —

هندی اردو دهلی کالج میں

دلی کالج میں نہ تو کوئی باقاعدہ هندی جماعت تھی اور نہ کوئی طالب علم - شعبۂ سنسکرت کی جونیر جماعتوں میں حساب ' الجبرا ' جیومیٹری اردو زبان میں پڑھائی جاتی تھی - عربی فارسی کے طلبہ بیتال پچیسی ' سنگھاسن بتیسی اور پریم ساگر پڑھتے تھے ' یہ اس خیال سے کہ اگر کوئی طالب علم فوجی منشی گری کی خدمت قبول کرے تو اسے انجام دے سکے —

بنارس میں تمام جونیر جماعتوں میں هندی اور اردو ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی تھی —

۱۸۵۶ ع کی حالت

دسمبر سنہ ۱۸۵۵ ع اور دسمبر ۱۸۵۶ ع کے اختتام پر طلبہ کی تعداد علی الترتیب ۳۷۲ اور ۳۴۵ تھی - طلبہ کی تعداد میں کمی کو پرنسپل صاحب نے حسب ذیل وجوہ سے منسوب کیا —

۱ - شعبۂ سنسکرت دلی کالج سے اُڑا دیا گیا - اس سے ۱۴ کی کمی ہوی —

۲ - سرکاری اور دوسرے محکموں میں دلی کالج کے ۳۷ طلبہ ملازم

---

* مراسلۂ ناظم تعلیمات نشان ۴ مورخہ ۲ مئی سنہ ۱۸۵۵ ع مع رپوٹ دلی کالج -

ہوکر چلے گئے —

۳ - بعض غریب اور نادار طلبہ کے پاس اتنے دام نہ تھے کہ کتابیں خرید کر اگلی جماعتوں میں شریک ہوتے -

۴ - غیر حاضری کے متعلق نہایت سخت قواعد کا نفاذ ' جس کے سبب سے ۴۵ طلبہ کے نام خارج کردیے گئے -

۵ - ناظم صاحب کے حکم کے بموجب ہر چھمائی پر داخلہ عمل میں آیا اس لیے طلبہ کم داخل ہوے —

۶ - شہر میں مشن ہائی اسکول نے نادار طلبہ کی دستگیری کا ایسا بیڑا اٹھایا کہ کالج کی طرف غریب طلبہ نے رخ کرنا چھوڑ دیا —

طلبہ کی تعداد باعتبار قومیت | عیسائی ۴ ' ہندو ۲۸۵ ' مسلمان ۸۳ —

اردو — تمام طلبہ اردو میں درس پاتے تھے ' عربی اور فارسی کے طلبہ نے ہندی میں کافی استعداد پیدا کرلی —

مصارف تعلیم | ہر طالب علم پر اس سال تقریباً ۱۰ روپیہ ۸ آنے صرف ہوے —

ملازمت — چودہ طلبہ شعبۂ انگریزی کے اور ۲۳ شعبۂ مشرقیہ کے ملازم ہوے افسران کالج نے نئے پرانے طلبہ کو ملازمتیں حاصل کرنے میں ت مدد دی —

شعبۂ علوم مشرقی | شعبۂ مشرقی میں فارسی کی تین جماعتیں تھیں ' ہر ایک جماعت کے دو فریق تھے اور چار عربی کی جماعتیں تھیں - شعبۂ فارسی میں ۶۹ اور شعبۂ عربی میں ۳۹ طالب علم تھے - ان جماعتوں کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں جن میں بڑی احتیاط سے مغربی سائنس زبان اردو کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھی - ماسٹر رام چندر اور دیگر اساتذہ بڑے شوق اور قابلیت سے درس دیتے تھے اور طلبہ ریاضی '

نیچرل فلاسفی اور تاریخ میں ایسے مستعد ہوگئے تھے کہ شعبہ انگریزی کے طلبہ سے برابر کا مقابلہ کرتے تھے اور اکثر بازی لے جاتے تھے - اس بارے میں رام سرن داس صاحب کی رائے پہلے لکھ چکا ہوں —

سنہ ۵۷ ع کے غدر میں کالج کا حشر

گیارھویں مئی پیر کا دن تھا - کالج کا وقت صبح کا تھا - پڑھائی حسب معمول ہورہی تھی - ساڑھے آٹھ بجے چند لالہ ھانپتے کانپتے آئے ' ان کی سراسیمگی اور وحشت کا عجیب عالم تھا - دوڑے آے اور جماعتوں میں بے تحاشا گھس گئے اور اپنے لڑکوں سے کہا ' گھر چلو ' بھاگو ' غدر مچ گیا ' سپاھی اور سواروں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ھے - یہ سنتے ھی لڑکے اپنے بستے سنبھال چمپت ہونے لگے - پرنسپل صاحب حیران و ششدر تھے کہ یہ کیا تماشا ھے - اتنے میں میگزین کا چپراسی آیا اور کمانڈنٹ کا خط لایا ' اس میں مرقوم تھا کہ شورش بپا ہوگئی ھے اور حالت لمحہ بہ لمحہ خطرناک ہوتی جاتی ھے ' مصلحت یہ ھے کہ آپ فوراً مع انگریزی اسٹاف یہاں آجائیں اور میگزین میں پناہ لوں - پرنسپل ٹیلر ' رابرٹس ھیڈ ماسٹر ' اسٹوارٹ سیکنڈ ماسٹر ' اسٹینفر تھرڈ ماسٹر بوکھلاے ہوے بھاگے اور میگزین میں پناہ گزیں ہوے —

مسٹر ٹیلر کالج ھی کی کوٹھی میں رھتے تھے ' رابرٹس کا بنگلہ بھی کالج کے احاطے میں تھا ' ان کے بیوی بچے بھی ساتھ رھتے تھے ' اسٹوارٹ منصور علی خاں کی حویلی میں اور اسٹینفر کشمیری دروازے کی طرف کسی مکان میں اقامت گزیں تھے - پروفیسر یسوع داس رام چندر چاندنی چوک میں ایک کوٹھے پر رھتے تھے —

اس کے بعد ھندوستانی سپاھیوں نے میگزین کو گھیر لیا - وہ ھر

انگریزی چیز کو تباہ کرتے چلے آتے تھے میگزین میں پانچ چھ انگریز افسر اور دو تین سارجنٹ تھے۔ ان لوگوں نے اپنی ننھی سی جماعت سے بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن تھوڑے ھی عرصے میں هندوستانی سیڑھیاں لگا کر میگزین کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ جب انگریزوں کو کمک کی کوئی توقع نہ رهی تو انھوں نے میگزین کو آگ لگا دی اور هزاروں هندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کوئی پانچ انگریز خود بھی لقمۂ اجل ھوے —

مسٹر ٹیلر اور مسٹر اسٹینفرجان بچا کر بھاگے اور میگزین سے صحیح سلامت باهر نکل آے، لیکن هوش و حواس باختہ۔ حیران تھے کہ کہاں جائیں، هر سمت موت کھڑی نظر آتی تھی۔ رابرٹس غریب تو وهیں ڈھیر هوگیا اور اسٹوارٹ بھی میگزین کے شعلوں کے نذر ھوے۔ بہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آے اور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انھیں محمد باقر صاحب مولوی محمد حسین آزاد کے والد ماجد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے روز جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام هوگئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو هندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ مگر ان کا بڑا افسوسناک حشر هوا قریب بیرام خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے لٹھ برساے کہ بیچارے نے وهیں دم دے دیا۔ بعد میں مولوی محمد باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھاے گئے، اور اُن کا کوئی عذر نہ چلا۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا۔

مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی تھی اور ان پر بھی قوی شبہ تھا ' مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سر زمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے جب معافی ہوئی تو هندوستان واپس آے —

مسٹر ٹیلر نہایت قابل' نہایت همدرد اور شریف النفس انسان تھے ان کے مرنے کا سب کو رنج اور صدمہ تھا۔ ان کے حالات میں کالج کے اساتذہ کے عنوان کے تحت الگ لکھوں گا ' اس سے معلوم ہوگا کہ یہ کیسا عجیب و غریب شخص تھا —

اسٹینڈر صاحب سب سے اچھے رہے ' میگزین اُڑنے سے جو اس کی چار دیواری میں درز پڑ گئی تھی اس سے ٹیلر صاحب کے ساتھہ باھر نکل آے۔ ٹیلر صاحب کی اجل تو اُنھیں کالج کی طرف لے گئی اور ان کی حیات انھیں جمنا پار میرٹھہ لے گئی۔ وھاں یہ زندہ پہنچ گئے اور غدر کی پر آشوب دارو گیر سے بچ گئے —

رھے پروفیسر رام چندر ' یہ پیدل چل کر پن چکی کی سڑک پر ہوتے ہوے قلعے کے سامنے آے۔ انھوں نے دیکھا کہ چند ترک سوار یا مغلوں کا دستہ ننگی تلواریں ھاتھہ میں لئے ہوے لال ڈگی کی سڑک پر آ رھا ھے یہ اسے دیکھہ کر اپنے گھر کی طرف مڑ گئے اور چاندنی چوک کے کوٹھے پر صحیح سلامت پہنچ گئے۔ وھاں سے انھیں ان کے بھائی راے شنکر داس اپنے ساتھہ لے گئے اور کایستوں کے محلے میں اپنے کسی عزیز کے ھاں جا چھپایا مگر ان کے اقربا نے کہا اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے کہیں ھم پر آفت نہ آے ان کا وھاں زیادہ قیام گوارا نہ کیا۔ ان کا ایک قدیم نوکر جاٹ تھا اس نے بڑی وفاداری اور رفاقت کی۔ انھیں جاٹ بنا کر گنواروں کے سے کپڑے

پہنا پگڑ بندھوا اپنے گاؤں لے گیا اور وہاں رکھا۔ وہاں سے یہ باولی کی سرا میں انگریزی لشکر سے جا ملے —

رابرٹس صاحب کی دو لڑکیاں اور پانچ عیسائی طلبہ بھی اِن بے رحموں کے ہاتھہ سے مارے گئے —

کالج کا کتب خانہ

دن کے بارہ بجے کے کچھہ دیر بعد کالج کا کتب خانہ لٹنا شروع ہوا۔ لٹیرے بڑے بے ڈھب تھے۔ انگریزی کی تمام کتابوں کی خوبصورت خوبصورت سنہری فرموں کی جلدیں پھاڑ لیں اور ورقوں کا کالج کے تمام باغ میں دو دو انچ موٹا فرش بچھا دیا۔ عربی فارسی اردو کی جتنی کتابیں تھیں ان کی گٹھریاں باندھہ باندھہ کر اپنے گھر لے گئے اور پھر کباڑیوں اور مولویوں کے ہاتھہ کوڑیوں کے مول فروخت کردیں۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ میں جتنے آلات تھے انھیں بھی توڑ پھوڑ ڈالا اور لوہا پیتل وغیرہ دھاتیں لے گئے —

غدر کے بعد کالج سنہ ۱۸۶۴ ع میں از سر نو جاری ہوتا ہے

غدر میں جو کالج بند ہوا تو بند کا بند ہی رہا، کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ حالات ہی کچھہ ایسے رونما ہوگئے تھے کہ کوئی توجہ کرتا تو کیا کرتا۔ آخر مئی ۱۸۶۴ ع میں اس کی قسمت جاگی اور از سرنو کھلا۔ شروع شروع میں سارا کام پروفیسر ہٹن (Hatton) کی نگرانی میں رہا، اس کے بعد اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ ع کے آخر میں مسٹر اڈمنڈ ولمٹ (Edmand wilmot) بی۔ اے، ٹرنٹی کالج کیمبرج نے انگلستان سے آکر پرنسپل کی خدمت کا "چارج" لیا۔ اور جب پروفیسر ہٹن لفٹنٹ ہارانڈ کی جگہ انبالہ سرکل کے انسپکٹر مقرر ہوے تو اُن کی جگہ مسٹر سی۔ ک۔ کوک بی۔ اے سن جان کالج کیمرج کا تقرر انگریزی زبان کی پروفیسری پر ہوا۔ لیکن جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع میں

مسٹر ولمٹ کو ایسا سخت حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں اپنا تعلق کالج سے قطع کرنا پڑا - انھوں نے نہایت قابلیت اور جوش سے ریاضیات پر لکچر دینے شروع کئے تھے اور اُن کے طریقۂ تعلیم سے بہت کچھ توقعات پیدا ہوگئی تھیں لیکن ایک اتفاقی حادثے نے ان توقعات کا خاتمہ کردیا - اس کام کا بار بھی پروفیسر کک پر آپڑا اور انھوں نے اس فرض کو بڑی محنت اور خوبی سے انجام دیا —

ایس - پی - جی مشن اسکول کا الحاق دلی کالج سے

اس سال ریورنڈ آر - ڈنٹر R.Dinter صدر ایس - پی - جی مشن نے اپنی درس‌گاہ (سن اسٹیفن کالج) کے شعبے کو بند کر دیا اور اپنے ھاں کے میٹریکولیشن کامیاب طلبہ کو دلی کالج میں بھیج دیا —

انگریزی کھیل

یہ پہلا سال تھا کہ کالج میں انگریزی کھیل اور ورزشیں جاری کی گئیں

اخبارات کے مطالعہ کی ترغیب

اس سال طلبہ کو اخبارات کے مطالعے کی ترغیب دی گئی اور " پنجاب ایجو کیشنل میگزین " جاری کیا گیا - چونکہ طلبہ کے مطالعے میں انگریزی کے قدیم اساتذہ کا کلام رھتا تھا اس لئے وہ معمولی خط و کتابت میں بھی مرصع اور پر شکوہ عبارت لکھتے تھے اور سادہ زبان لکھنے کے عادی نہ تھے - اس نقص کے رفع کرنے کے لئے کالج میں السٹرٹیڈ لنڈن نیوز (Illustrated London News) منگا یا گیا ' اس کے علاوہ صوبے کے اخبار بھی منگائے جاتے تھے —

کالج کی جماعتیں

کالج میں اس وقت دو جماعتیں تھیں - اعلیٰ جماعت یعنے سال دوم میں ۱۳ طالب علم تھے جو کلکتہ یونیورسٹی

کے امتحان فسٹ آرٹس (سنہ ۱۸۶۵ ع) کے لئے تیاری کررہے تھے —

طلبہ کی تعلیمی حالت

پرنسپل کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان میں طلبہ کی حالت بہت قابل اطمینان رہی ۔ انہوں نے طلبہ کی محنت اور ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور بعض طلبہ کا خصوصیت کے ساتھہ ذکر کیا ہے —

نصاب تعلیم میں بھی بہت کچھہ تبدیلی کی گئی ۔ عربی کی تعلیم پر خاص توجہ کی گئی اور لاطینی زبان کے سبق شروع کئے گئے تاکہ انگریزی الفاظ کے مادوں کے سمجھنے میں آسانی ہو ۔ صرف یہ دو تبدیلیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں —

سنہ ۱۸۶۵ ع کا تعلیمی دربار

۲۵ مارچ سنہ ۱۸۶۵ ع کو لفٹنٹ گورنر پنجاب نے شام کے پانچ بجے ملکہ کے باغ میں ایک تعلیمی دربار کیا ۔ اس میں دلی کالج کے اساتذہ و طلبہ اور دلی کے تمام ہندی اسکولوں کے مدرس اور متعلمین اور مضافات دہلی کے مدارس کے استاد اور طالب علم جمع ہوئے تھے ۔ ہزآنر ، لارڈ بشپ کلکتہ ، کمشنر دہلی ، جنرل ایرنگٹن اور حکام صیغۂ تعلیمات نے ایک گشت لگایا ، مدارس کے طلبہ جو صف بہ صف کھڑے تھے انہیں دیکھا اور ہر مدرسے کے طلبہ و اساتذہ سے مختلف سوالات کئے اور سب کی ہمت افزا الفاظ میں دلجوئی کی —

اس کے بعد ہزآنر تخت پر جلوہ افروز ہوے اور کمشنر دہلی نے زبان اردو میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کی اور دربار کا مقصد بیان کیا ۔ ان کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات کپتان فلر آر ۔ اے اتھی اور انہوں نے ایڈریس پیش کیا ۔ اس ایڈریس میں علوم مشرقیہ کی تعلیم اور دہلی کالج کے متعلق جو ذکر آیا ہے اُسے یہاں نقل کیا جاتا ہے :—

" انگریزی زبان کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کی یوماً فیوماً ترقی کی تو یه کیفیت هے (جو اوپر بیان هوئی) لیکن اس کے ساتھه ساتھه علوم مشرقیه کے طلبه کے وظائف بھی بڑہ رهے هیں اور ان کو اور بڑھایا جارها هے - همارے کالجوں میں عربی ' مشرقی ادبیات کی بیخ و بنیاد هے اور فارسی هندوستانی (زبان) کے هاتھه میں هاتھه لئے هوئے الگ بڑھی چلی جارهی هے - همارے اینگلو ورنیکلر اور ورنیکلر مدارس اس کام کو انجام دے رهے هیں - جب طلبه آگے بڑھیں گے اور اعلیٰ جماعتوں میں آجائیں گے تو ابوالفضل ' حافظ اور ظهوری جیسے فارسی ادیبوں سے سرگوشیاں کریں گے ' ان پر تنقید و تبصرہ کریں گے اور ان کے کلام کو اچھی طرح ذهن نشین کرلیں گے — دلی کالج کے طلبه کو اگرچه اب وظائف کی رقم گذشته زمانے کے مقابلے میں جب وہ حکومت ممالک شمالی مغربی کے تحت میں تھا ' نسبتاً چھٹا حصه دی جارهی هے لیکن اس کی بجائے تعلیم کی ایسی ترغیبات موجود هیں که طلبه کی تعداد قدیم دلی کالج کے متعلمین کے مقابلے میں چوگنی هے - اس سے میرا یه مدعا نهیں هے که حکومت ممالک شمالی مغربی کی کسی طرح اهانت کروں بلکه در اصل بات یه هے که سنه ۱۸۵۷ ع کے غدر کا دهکا اٹھانے کے

بعد تہذیب و شایستگی زندگی کے ھر شعبے میں نہایت
سرعت سے قدم بڑھا رھی ھے اور حکومت کا صرف
یہ ادعا ھے کہ وہ زمانے کی رفتار کے قدم بقدم
چل رھی ھے "۔

سنہ ۱۸۶۵ تا ۶۶ کی تعلیمی حالت

پرنسپل کی رپوٹ سے معلوم ھوتا ھے کہ سنہ ۱۸۶۵ ع میں ایف ۔ اے کا نتیجہ اچھا نہ رھا ۔ وجہ یہ بتائی گئی ھے کہ کسی پروفیسر کا تقرر نہیں ھوا تھا ۔ مسٹر ٹورن کی مساعی کے باعث میٹرک کا نتیجہ اچھا رھا ۔ پرنسپل نے ماسٹر پیارے لال اور ساگر چند کی بھی بہت تعریف کی ھے —

سنہ ۶۶ ع میں بھی یونیورسٹی امتحان کا نتیجہ اچھا نہ رھا ۔ سبب وھی تھا کہ کوئی پروفیسر نہ تھا ۔ انٹرینس میں ۱۷ میں سے چھ اور ایف ۔ اے میں چھ میں سے تین کامیاب ھوے —

اس سال کالج کے ایک طالب علم بھیروں پرساد نے لالہ وزیر سنگھ کے وظیفہ ریاضی (۱۲۰ روپے) کے لئے مقابلہ کیا اور سب امید واروں میں کامیاب رھا —

امتحانات

جولائی سنہ ۱۸۶۶ ع میں خانگی امتحانات میں گیارہ طالب علم سال اول کے دھلی اور لاھور سے بیٹھے ۔ ان میں صرف چار طلبہ کامیاب ھوے وہ سب کے سب دھلی کے تھے ۔ سال دوم کے ۱۴ طلبہ میں سے دلی کا ایک کامیاب رھا سال سوم میں آٹھ شریک امتحان ھوے ۔ سالانہ امتحان میں سال اول میں سات طالب علم دلی کالج کے شریک ھوے ' تین کامیاب رھے ۔ سال سوم میں چار نے امتحان دیا ' بھیروں پرشاد اول ایا —

کالج میں طلبه وظائف اس درجه کم اور ان کے قواعد ایسے سخت هوگئے تھے که طلبه تعلیم جاری نهیں رکھه سکتے تھے اور اس لئے کالج میں بڑی چھیچ هوگئی پرنسپل صاحب نے اس خطرے کو محسوس کرکے لفتنت گورنر کو رپوٹ کی که اگر یهی لیل و نهار هے تو پنجاب کے تمام کالج بیٹھه جائیں گے - اس کے برعکس آگره اور بریلی میں حکومت صوبه هاے متحده بڑی فیاضی سے کام لے رهی تھی —

کی چھیچ

پروفیسر جارڈین Jardine نے دلی کالج میں دو ماه لکچر دئے اور ۳۱ جولائی کو لاهور کالج کے پرنسپل هوکر چلے گئے ' اس کے بعد ممالک مغربی شمالی میں پروفیسر قانون هوگئے - یه بهت بڑے ریاضی داں اور ماهر مابعد الطبیعیات تھے - مسٹر ٹک بھی یکم مئی سنه ۱۸۶۶ ع کو استعفا دیکر آگره چلے گئے اور وهاں ان کا تقرر پروفیسری پر هوگیا ان صاحبوں کے جانے کے بعد مسٹر ولمٹ اور مسٹر ڈورن جو دونوں السنه و علوم مشرقیه سے نابلد تھے ' کام کرتے رهے - پرنسپل کو اس کی سخت شکایت هے که کالج میں کوئی پروفیسر نهیں هے اور لفتنت گورنر کو کئی بار لکھا مگر کوئی توجه نه هوی حالانکه اب کالج میں پوری چار جماعتیں هوگئی تھیں —

کالج کا اسٹاف

سنه ۶۷ ع کی اس سال ایف - اے میں چار طالب علم شریک هوے - دو دوسرے ڈویژن میں اور دو تیسرے ڈویژن میں کامیاب هوے لیکن نند کشور طالب علم دوسرے ڈویژن میں پنجاب کے تمام طلبه میں اول آیا - امتحانات کلکته یونیورسٹی میں هوتے تھے ' اس لئے نند کشور کو پنجاب کا اول انعام کو پر سلور میڈل ملا بی - اے میں دو شریک هوے ایک نا کام رها دوسرا فسٹ ڈویژن میں کامیاب هوا اور پنجاب کے تمام طلبه

تعلیمی حالت

میں اول آیا - اس طالب علم کا نام بھیروں پرشاد تھا' اسے آرنلڈ گولڈ مڈل ملا - یہ پہلا سال تھا کہ کالج سے بی - اے کے امتحان میں طلبہ شریک ہوے تھے —

کالج کی حالت پنجاب کے تمام کالجوں میں نتیجے کے اعتبار سے اول رہی —

گبنز سکالر شپ

مسٹر چارلس گبنز بیتھوس میجسٹریٹ و کلکٹر دهلی کی بیوہ نے اپنے خاوند کی یادگار میں گیارہ ہزار روپے دلی کالج کو دیے تاکہ مرحوم کے نام سے ایک وظیفہ قائم کیا جاے - مسٹر بیتھوس دلی میں چارلس گبنز کے نام سے مشہور تھے اس لئے اسکالر شپ کا نام گبنز اسکالر سپ رکھا گیا —

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ لاهور میں اورنٹیل یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویزیں ہو رهی تھیں —

سنہ ۶۸ ع

مسٹر وامیٹ ۶ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع تک کالج میں رہے - ۹ مارچ کو مسٹر کک آگئے - مسٹر ولمٹ انسپکٹر مدارس انبالہ ہوکر چلے گئے - مسٹر ایلس نے کک صاحب کے آنے تک پرنسپلی کا کام کیا -

۲۵ مارچ سنہ ۶۸ ع کو میک نیل صاحب کمشنر دهلی کی صدارت میں کالج کے احاطے میں دربار ہوا - لفٹنٹ گورنر بھی رونق افروز تھے - ایسے طلبہ کو انعامات دے گئے جو اس سال امتحانات میں نام کے ساتھ کامیاب ہوے تھے اور ایسے حضرات کو خلعتیں اور تمغے ملے جنھوں نے دلی اور مضافات دهلی میں ترقی تعلیم میں کوشش کی تھی —

۶۹ - ۱۸۶۸ ع

اس سال سریرام نے سیکنڈ ڈویژن میں امتحان میں کامیابی حاصل کی - حکم چند تمام کلکتہ یونیورسٹی کے

امتحان ایف اے میں پانچویں نمبر پر رہا دو لڑکے اور کامیاب ہوے —

اینگلو سنسکرت اسکول

اس سال دلی میں ہندؤں نے اینگلو سنسکرت اسکول قائم کیا اس میں اردو کے ذریعہ تعلیم ہوتی تھی فارسی بھی اتنی پڑھائی جاتی تھی جتنی اردو کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے اس کا دہلی کالج سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ یہ معلوم ہو کہ سنہ ۱۸۶۸ ع تک اردو زبان کس قدر مقبول تھی —

سنہ ۷۰ - ۱۸۶۹ ع

نند کشور، شیو ناتھ نے بی - اے میں کامیابی حاصل کی - ایف اے میں پانچ طالب علم کامیاب ہوے - مسٹر ایلس اس سال ڈاکٹر لائٹنر کی جگہ پرنسپل ہوکر لاہور چلے گئے —

اسٹنٹ پروفیسر سنسکرت

کالج میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام نہ تھا ہندو طلبہ اس وقت تک عربی لیتے تھے - گزشتہ سال طلبہ نے بڑا غل مچایا تھا اور ایف - اے کے ۱۲ طلبہ نے سنسکرت لی تھی - چنانچہ ہیڈ پنڈت جی کو کالج میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے متعین کیا - اس سال کالج کے ۲۵ طلبہ میں سے ۲۱ نے سنسکرت لی —

سنہ ۷۱ - ۱۸۷۰ ع

اس سال ایم - اے کی جماعت بھی کھل گئی کالج کی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد یہ تھی :—

ایم - اے	۱
بی - اے سال چہارم	۵
سال سوم	۹
سال دوم	۱۷
سال اول	۲۱

حکم چند کلکتہ یونیورسٹی کے بی ۔ اے میں تمام یونیورسٹی میں دوم آیا ۔ چھ طالب علم ایف ۔ اے میں کامیاب ہوے ۔ ایک درجۂ اول میں اور پانچ دوم میں —

سنہ ۷۱ - ۱۸۷۰ میں تعداد طلبہ یہ تھی :—

ایم ۔ اے	۱
سال چہارم بی ۔ اے	۹
سال سوم	۸
سال دوم	۲۴
سال اول	۱۴

ایم ۔ اے کے امتحان میں حکم چند کلکتہ یونیورسٹی میں اول آیا ۔ سری رام بھی کامیاب ہوا ۔ مدن گوپال، لچھمی داس بی ۔ اے میں کامیاب ہوے —

غرض اس طرح یہ کالج سنہ ۱۸۷۷ ع تک برابر چلتا رہا ۔ اصل یہ ہے کہ سنہ ۱۸۶۴ ع سے جب یہ غدر کے بعد سے دوبارہ کھلا تو زمانہ دوسرا تھا ۔ انتظام تعلیم میں نیا ورق اُلٹ چکا تھا، ہر چیز کی تنظیم و ترتیب بالکل نئے سرے سے کی گئی، دلی کالج کی جو خصوصیتیں اور جن پر اس کالج اور کالج کے اساتذہ اور اس کے خیر اندیشوں کو ناز تھا وہ باقی نہ رہیں ۔ اُردو زبان اور اردو تالیف و ترجمہ کا چرچا رفتہ رفتہ اُٹھ گیا اور زیادہ زور انگریزی پر دیا جانے لگا ۔ کالج اگرچہ بظاہر پنجاب یونیورسٹی سے ملحق تھا مگر طلبہ اکثر کلکتہ یونیورسٹی میں امتحان دیتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں یونیورسٹی تو تھی لیکن وہ مسلمہ نہ تھی سنہ ۱۸۸۱ ع یا سنہ ۱۸۸۲ ع میں تسلیم کی گئی ۔ کالج کے قدیم طالب علم جو چلد سال پہلے زندہ باقی یا جو دو ایک صاحب باقی

ھیں سب کا بیان تھا کہ کالج سنہ ۱۸۷۷ ع تک اچھا خاصا چل رھا تھا کہ نہ معلوم گورنمنٹ کے جی میں کیا آئی کہ اسے اپریل ۱۸۷۷ ع میں توڑ دیا اور اس کا سارا اسٹاف لاھور کالج میں بھیج دیا یعنی اس کالج کو لاھور کالج میں مدغم کردیا۔ بات یہ ھے کہ ڈاکٹر لائٹنر جو گورنمنٹ کالج لاھور کے پرنسپل تھے اور پنجاب گورنمنٹ میں بڑا رسوخ رکھتے تھے وہ گورنمنٹ کالج لاھور کو فروغ دینا چاھتے تھے، لفٹننٹ گورنر کا بھی یہ منشا تھا کہ صوبے کی تمام اچھی اچھی چیزیں سمٹ کر مرکز حکومت یعنی لاھور میں آجائیں چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ دلی اپنے عزیز کالج سے محروم ھوگئی اور سب اساتذہ اور طلبہ لاھور چلے گئے —

کالج ٹوٹنے کے بعد یہاں صرف اسکول رہ گیا دلی کالج کی جگہ مشن کالج نے لے لی یہ پہلے صرف ھائی اسکول تھا —

روسی ناول

پہلا دور

دوسرا باب

سر گے ئی تیمو فے یوچ اکساکوت

(۱۷۹۱ - ۱۸۵۹)

از

[جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی ۔ اے (آکسن)]

ہم دیکھ چکے ہیں کہ "مردہ روحوں" کی حقیقت نگاری نے لوگوں کو گویا ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جہاں سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں ملا' اور ایک قیدی کی طرح جو آزادی کے لئے تڑپ رہا ہو وہ اپنے قید خانے کی دیواروں پر سر پٹک پٹک کر رہ گیا ۔ اس کے ہم عصر اکساکوت نے بھی حقیقت کو اتنی ہی تیز اور نکتہ بیں نگاہوں سے دیکھا' مگر اپنے آپ کو جان بوجھ کر کسی فریب میں مبتلا نہیں کیا' اور اس کی حقیقت نگاری خود اس کے اور دوسروں کے لئے تسکین اور تسلی کا ذریعہ اور امید کا ایک پیغام بن گئی جیسا کہ ایک اخبار نے اکساکوت کی تصنیف "ایک خاندانی داستان" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا' اس وقت روسی انشا پردازوں میں وہی ایک ایسا تھا جس نے روسی زندگی کو محض نکتہ چینی کے لئے تختۂ مشق نہیں بنایا' بلکہ روسی سر زمین اور روسی رہن سہن سے سچے دل سے دلچسپی ظاہر کی اور محبت برتی ۔ یہی اس کی عظمت

کا راز ہے - اکساکوف کی تصانیف مروجہ مذاق اور معیار کے مطابق ممکن ہے ناولیں نہ کہی جاسکیں، مگر جس زندگی کا ان میں خاکہ کھینچا گیا ہے، جو داستان وہ سناتی ہیں وہ لطف، دل کشی، حقیقت نمائی اور سبق آموزی میں بہترین ناولوں کا مقابلہ کرسکتی ہے - انہیں پڑھ کر روسی اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے بیزار نہیں ہوے، ان کی قوم اور قومی معاشرت سے اور گہرا تعلق ہوگیا، اس وجہ سے نہیں کہ اکساکوف نے انہیں خود ستائی اور حیوانوں کے سے سکون و اطمینان کا سبق پڑھایا، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے ان کے دلوں میں محبت کے جذبے کو بیدار کیا اور اس جذبہ نے ان کی نظر کو برائی کے ساتھ اچھائی کا دیکھنا بھی سکھایا یورپ پرستی کرتے کرتے ان کے دلوں میں جو بے صبری اور بے اطمینانی کا طوفان برپا ہوا تھا اسے کسی قدر فرو کیا، اور روسی عینیت کے بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل مقصود کا راستہ بتایا۔
اکساکوف شہر اوف، صوبۂ اورن برگ میں پیدا ہوا، اور اس نے کازان کے اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم پائی - تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ پانچ سال تک پیٹر برگ میں ملازم رہا، چلند سال ماسکو پیٹر برگ اور اوف کا چکر لگاتا رہا اور ۱۸۱٦ میں مستقل طور پر ماسکو میں سکونت گزیں ہوگیا انشا پردازی کا اسے لڑکپن ہی سے شوق تھا، لیکن اس کی نامور تصانیف کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہوچکی تھی - اس دوران میں اس نے متعدد مضامین لکھے اور کئی ڈراموں کے ترجمے کئے مگر ان میں اُن خوبیوں کا نام و نشان تک نہیں جنھوں نے اس کے بڑھاپے کی تصانیف کو اس قدر مشہور اور ہر دلعزیز کردیا۔
یہ معمہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے اگر ہم اکساکوف کی طبیعت پر غور کریں اور یاد رکھیں کہ انسان اپنا جوہر اس حالت میں دیکھا سکتا ہے

جب وہ اپنی تخلیقی کوششوں میں اپنی پوری شخصیت کو محو کرسکے۔
اکسا کوف طبعاً نہائت درجہ نیک دل ' خوش اخلاق اور محبت کرنے والا تھا ' ادبی شہرت حاصل کرنے سے پہلے اس نے ہزارہا لوگوں کو اپنی شریفانہ سیرت اور دوستانہ سلوک کا گرویدہ کرلیا تھا ۔ مضامین اور ترجمے اُس کی شخصیت کی تاثیر سے محروم رہے ' مگر وہ اپنے بچپن کے حالات اور خاندان کی سر گذشت سنانے بیٹھا تو وہ تمام صفتیں جلوں نے ماسکو کے ہر بھولے آدمی کو اس کا دلدادہ بنا دیا تھا اس کی تصانیف میں ایک ساتھ ظاہر ہوتیں ' اور ادبی دنیا میں اس کا وہی مرتبہ ہوگیا جو دوستوں کے حلقے میں تھا یہ مچھلی کے شکاری کا روز نامچہ ۱۸۴۷ ع میں شائع ہوا ' " جونڈ اورن برگ کے شکاری کا روز نامچہ " ۱۸۵۲ میں اس کے تین سال بعد " شکاری کے قصے اور تذکرے " تینوں کتابوں کی بہت جلد کئی اشاعتیں نکل گئیں ' اور جب ۱۸۵۶ میں اکسا کوف نے " خاندانی داستان " کے ابواب کی اشاعت شروع کی تو اس کا روس کے ادبی مشاہیر میں شمار ہونے لگا تھا ' اور تعلیم یافتہ روس اس کے فریفتہ ہوچکے تھے —

ان تصانیف میں اکسا کوف کا ارادہ اپنی طبیعت کا جوہر یا اپنی انشا پردازی کے کرشمے نہیں دکھانا چاہتا تھا ۔ اسے بڑھاپے میں اپنا بچپن یاد آیا اور اپنے لڑکپن اور جوانی کی دلچسپیاں ' وہ لوگ یاد آئے جن کی صحبت میں وہ پلا تھا اور اس طرح اس کی نظر ایک نسل سے دوسری تک دوڑ گئی جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ جیتی جاگتی تصویروں کی طرح پھر اس کے سامنے آگیا ' اور اس کے قلم نے بڑے شوق سے صفحہ کاغذ پر ان کا سچا نقشہ کھینچ دیا ۔ اکسا کوف کے بیان سے سادگی اور خلوص ٹپکتا

ہے ' اور ان کی رونق اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان مناظر اور انسانوں کی تصویروں میں جو وہ دکھاتا ہے اپنی طرف سے کچھہ گھٹاتا بڑھاتا نہیں اور اس اصول پر استقلال سے عمل کرتا ہے کہ سچی بات اور سچی تصویر میں رنگ آمیزی کی حاجت نہیں ہوتی ۔ پہلی دو تصانیف میں اس نے اپنے وطن کے مناظر قدرت ' اس کی فضا ' اس کے حیوانات و نباتات کا ذکر کیا ہے - اسے اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت تھی ' ایسی گہری اور سچی محبت کہ وہ اس کی تصانیف کا ایک جزو بن گئی اور پڑھنے والے کو فوراً اپنی تاثیر سے مسحور کر دیتی ہے - اسی طرح " خاندانی داستان " میں جن لوگوں کی سرگزشت سنائی گئی ہے ان سے اکساکوف کو محبت تھی ' وہ ان کی برائی بھلائی سب دیکھتا اور دکھاتا ہے ' مگر وہ ہر حالت میں انہیں اپنا سمجھتا ہے اور جو محبت اپنوں سے کرنا چاہتے اسے ہمیشہ برتتا ہے - پڑھنے والے کو بھی یہی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہوتا ہے ' اکساکوف کے عزیز اس کے عزیز بن جاتے ہیں ' ان کی بری حرکتیں اور خصلتیں اس کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرتی ہیں ' کیونکہ اکساکوف سے وہ یہ سبق سیکھ لیتا ہے کہ خطاؤں سے درگزر کرنا نفرت کرنے سے بہت بہتر ہے ' اور اگر اس کے دل میں ذرا بھی محبت کا مادہ ہے تو وہ محسوس کرلیتا ہے کہ محبت کا یہی تقاضا ہے ۔ اکساکوف کے عزیز ان لوگوں سے کسی صورت سے مختلف یا بہتر نہیں ہیں جن سے " مردہ روحوں " میں چچکوف بیوپار کرتا ہے ' لیکن اکساکوف کی انسانی ہمدردی اور محبت نے دونوں کتابوں کی روح اور ان کی تاثیر میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا ہے —

" خاندانی داستان " روسی طرز معاشرت کی بہت ہی صحیح اور سچی

تصویر ہے، اس لئے ذیل میں اس کے چند اقتباس دئے جاتے ہیں کہانی سنانا اکسا کوف کا مقصد نہیں تھا، اس داستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں بیان کیا گیا ہے مگر مصنف کی انشا پردازی کے کمال نے روز مرہ زندگی کو ایک دن رات نہیں کا رنگ روپ دے دیا ہے اور ہمیں وہ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے —

"خاندانی داستان" کا قصہ یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ اکسا کوف کے دادا نے خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر اپنا وطن چھوڑ دیا اور صوبۂ اورن برگ میں شہر اوفا سے کوئی دھائی سو میل کے فاصلہ پر زمین خریدی اور گاؤں آباد کرلیا۔ یہ جگہ نہایت خوبصورت اور یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی، جس پر رہنے والے دونوں اپنے وطن کو بہت جلد بھول بھال گئے اور نئی بستی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر بھی گاؤں کے گاؤں کو ایک بستی سے لے جا کر اور کئی سو میل کا سفر کرکے کسی دوسری جگہ آباد کرنا ہمت کا کام تھا، اور ستیپیاں میخائلووچ اکساکوف کے دادا کو کامیابی زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے دنیا سے نرالی طبیعت پائی تھی اس کے آسامی اس سے ڈرتے بھی تھے، اور محبت بھی کرتے تھے " وہ قرب و جوار کے تمام لوگوں کے سچے محسن تھے ... ان کے لبالب بھرے ہوئے کھلیانوں کے اگلے کھلے تھے، جس کا جو جی چاہتا لے سکتا تھا ... وہ ایسے سمجھدار تھے، دوسرے کی خواہشوں اور ضرورتوں کا اتنا لحاظ کرتے تھے، اپنے قول کے اتنے پکے تھے کہ بہت جلد ان لوگوں کی نظر میں جو وسیع صوبۂ اورن برگ کے ایک کونے پر آباد ہوئی تھی علم و دانشمندی کا مجسمہ بن گئے وہ اپنے ہمسایوں کو مدد پہنچانے کے علاوہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کرتے تھے ... جس نے ایک بار جھوٹ بولا،

ایک بار دھوکا دیا اس کی خیریت اسی میں تھی کہ پھر وہ ان کو اپنا منھہ نہ دکھائے : کیونکہ تب صرف یہی اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ خالی هاتھہ واپس جائے کا ' بلکہ اگر وہ الٹے پیروں بھاگ کر اپنی جان بچالیتا تو بھی سمجھنا چاھئے تھا خدا نے اس کے حال پر رحم کیا - ستیپان میخائلووچ نے بہت سے خاندانوں کے جھگڑے طے کئے ' هزا رها فتنوں کو سر اٹھا تے هي کچل دیا .... ..

میں نے * لوگوں کی زبانی ———— ان کی بہت سی باتیں سنی هیں ' بعض معمولی ' بعض ایسی جنھوں نے دل پر بہت گہرا اثر کیا ' اور جن کو سنا تے وقت لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے ......

" اس نیک دل فیاض اور با مروت شخص پر کبھي کبھی غصے کا بھوت ایسا سوار هوتا تھا کہ اس کے چہرے پر انسا نیت کی علامتیں باقی نہیں رهتی تھیں ' اور اس وقت وہ نہایت درجہ بے رحم اور نفرت انگیز حرکتوں پر اتر آتا تھا - میں نے اپنے بچپن میں انھیں اس حالت میں دیکھا تھا ... اور میرے دل پر خوف کا نقش ابھي تک تازہ هے ' ان کی صورت هو بہو میرے سامنے آجاتی هے : وہ اپنی لڑکیوں میں سے کسی پر خفا هوئے تھے ' غالباً اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولی تھی اور دھوکا دینے کی کوشش میں پکڑي گئی تھی : دو آدمی دادا کی بغل میں هاتھہ ڈالے هوئے انھیں

---

* اکساکوف نے " خاندانی داستان " کی پہلی اشاعتوں کی تمہید میں لکھا تھا کہ یہ اس کے اپنے خاندان کا قصہ نہیں هے اس خیال سے کہ شائد جن لوگوں کا اس میں ذکر آیا هے ان کے عزیزوں کو کوئی شکایت هو مگر ' اس داستان میں واحد متکلم کا صیغہ اکساکوف نے اپنے لئے استعمال کیا هے —

تھاسے تھے ؛ انھیں دیکھہ کر میں مشکل سے کہہ سکتا تھا کہ یہ میرے دادا ھیں : وہ سر سے پیر تک کانپ رہے تھے ' چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی ' ان کی آنکھوں سے ھیبت ناک شعلے نکل رہے تھے ' غصے سے انھیں کچھہ دکھائی نہیں دیتا تھا - وہ چلا رہے تھے - "اسے یہاں پکڑ لاؤ !" اور ان کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ھے ... میری دادی چاھتی تھیں کہ ان کے پیروں پر گر کر معتوصہ کی طرف معافی مانگیں ' لیکن ایک لمحے میں ان کے سر سے رومال * اور ٹوپی غائب ہوگئی اور ستھپان میخائلووچ نے اپنی چوڑی موٹی دوڑھی اور ضعیف ارنیا وسیل یفنہ کے بال پکڑ کر انھیں دینجہوز ڈالا - اس درمیان میں صرف معتوصہ ھی نہیں بلکہ اس کی اور سب بہنیں ' بھائی اور بھاوج مع اپنے بچے کے سب گھر سے نکل بھاگے ' اور ایک دمج میں جو مکان کو چاروں طرف سے گھیرے تھا جاکر چھپ رہے ! رات کو سب وھیں سوئے : صرف دادا کی نوجوان بھو اپنے بچے کو وھاں سے لیکر چلی آئیں اور اس اندیشے میں کہ نہیں بچے کو سردی نہ لگ جائے نوکروں کی ایک کوٹھری میں رات گذاری - میرے دادا میدان اور خالی مکان میں بہت دیر تک دھاڑتے گرجتے رہے ' آخر کار وہ تنہائی : چیونٹی اور سازان کو ٹھونکتے ٹھوکتے اور ارنیا وسیل یفنہ کے دھوتے نوچتے نوچتے تھک گئے

* پرانی روسی وضع کے مطابق بال بڑی حتم بھی شامل تھے اور عورتیں سر کو ھمیشہ ایک رومال سے ڈھکے رکھتی تھیں جو ٹھڈی کے نیچے گرہ دے کر قائم رکھا جاتا تھا - اس کے نیچے بعض عورتیں ایک تنگ ٹوپی بھی پہنتی تھیں —

؛ اکسادوف کی دادی کا نام ھے —

: نوکروں کے نام —

اپنے پلنگ پر بے ہوش ہو کر پڑے اور دوسرے دن صبح تک گھری نیند سوتے رہے۔ سو کر اٹھے تو چہرہ صاف اور روشن تھا' بڑی خوشی کے لہجے میں اپنی اریشا (اریڈنا وسیل یفنہ) کو پکارا' اور وہ پاس کے کمرے سے فوراً دوڑتی ہوئی پہنچیں۔ ان کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار ایسے نمایاں تھے کہ گویا کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پچھلے دن کے دیوانے نے سو کر اٹھتے ہی کہا "چائے لاؤ! بچے کہاں ہیں' اور الکسئی * اور میری بہو ا؟ لاؤ' سھر یوڑا † ادھر لاؤ!" کو اور بہو پوتے کے سوا گھر بھر میں سب خوش اور مطمئن یکے بعد دیگرے ستیپان میخائلووچ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی بہو بھی نازک مزاج اور ضدی تھی۔ اس کی لاکھ خوشامد کی گئی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئی کہ جس شخص نے پچھلے کل ہی ایک درندے کی خاصیتیں اختیار کرلی تھیں اس سے آج میل کر لے... اس کی طبیعت کچھ واقعی ناساز معلوم ہوتی تھی' اس لئے اس نے کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں اور اپنے بچے کو بھی نہیں جانے دیا۔ سب پر خوف طاری ہو گیا' سب سمجھے کہ کل کا سا حشر پھر برپا ہوگا۔ لیکن کل کا درندہ سو کر اٹھا تو آدمی تھا... چائے کے بعد ... خسر خود بہو کے پاس گئے... اس کے پلنگ پر بیٹھ گئے' اسے گلے لگایا' پیار کیا'... پوتے کو بھی خوب پیار کیا اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ "بہو کے بغیر تو زندگی بے مزہ ہو جائے گی" آدھے گھنٹے کے بعد ان کی بہو' ایک پرتکلف شہری وضع

---

* ستیپان میخائلووچ کے بیٹے' اکساکوف کے باپ کا نام دراصل الیکسی تیمو فیئی ہونا چاہئے —

† مصنف کی ماں۔ ‡ خود مصنف —

کا جوڑا پہنے ... اور بچے کا ہاتھ پکڑے ان کے کمرے میں آئی. دادا اس سے مخاطب ہوے تو آنکھوں میں آنسو بھر آے. انہوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا. "دیکھو بہو نے اپنی بیماری کا خیال نہیں کیا، اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے پہن کر مجھ بوڑھے کا جی خوش کرنے آئی ہے." للدوں نے ہونٹ چباکر نظریں نیچی کر لیں. انہیں سب کو اپنی بھاوج سے بالکل محبت نہیں تھی. بہو نے احترام اور مسرت سے خسر کی شفقت کا جواب دیا، اور اپنی بد خواہوں کو فخر اور فتح مندی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی..."

یہ ستیپان میخائلووچ کا برا دن تھا. معمولاً ان کے دن اچھے ہوتے تھے. اچھے دن کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

" دادا سوکر اٹھے اور .. مسہری سے سر نکال کر قہقہہ لگایا، کیوں کہ سازان اور تلائی چیونک ایک عجیب مضحک انداز سے زمین پر ہاتھ پیر پھیلائے پڑے خراٹے لے رہے تھے. دادا نے کہا "دیکھو یہ کتے کے پلے کیسے خراٹے لے رہے ہیں!" اور پھر مسکرائے - ان کی طبیعت بھی ایک معمہ تھی - ایسے سخت الفاظ استعمال کرنے کے بعد انہیں چاہئے تھا کہ سوتوں کی پسلیوں میں اپنا ڈنڈا جو ہمیشہ ان کے پلنگ کے پاس کھڑا رہتا تھا بھونک دیں یا ان کے ایک لات لگائیں یا ان پر کرسی دے ماریں لیکن وہ ہنس کر رہ گئے وہ اچھی طرح سے سوئے تھے، اور ان کے مزاج میں دن بھر خوش رہنے کا سامان تھا ... انہوں نے خاموشی سے اٹھ کر دو چار دفعہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اپنے بادامی رنگ کے سلیپر پیر میں ڈالے اور سوتی سن کے کپڑے کی دیہاتی وضع کی قمیص پہنے (باریک بنا ہوا کپڑا دادی انہیں قمیصوں کے لئے کبھی نہیں دیتی تھیں) جاکر برساتی میں کھڑے ہوگئے - وہاں صبح کی تازگی اور طراوت نے نہایت دل پذیر طریقے سے ان کا استقبال کیا - میں نے ابھی کہا تھا کہ ارنیا وسیل لفیہ ستیپان میخائلووچ کو باریک کپڑا قمیصوں کے لئے نہیں

دیتی تھیں، اور ہر شخص اعتراض کرسکتا ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتیں دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا ... لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے، عورت کی فطرت اس معاملے میں بھی مرد پر فتحیاب ہوئی! میری دادی نے موٹے کپڑے کے پیچھے کئی دفعہ مار کھائی مگر وہ قمیص موٹے کپڑے ہی کی بناتی رہیں اور اخر کار دادا کو اس کی عادت ہوگئی - ایک بار تو انھوں نے نہایت ہی موثر اور اپنے نزدیک انتہائی تدبیر اختیار کی: یعنی تمام موٹے سن کے سوت نے بنے ہوئے کپڑے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر رکھے اور کلھاڑی سے کاٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردئیے - میری دادی روتی پیٹتی رہیں، دادا سے التجا کرتی رہیں کہ "مجھے مارلو مگر اپنی چیز نہ برباد کرو" دادا نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ... مگر یہ تدبیر بھی نا کامیاب رہی پھر انھیں ویسے ہی موٹے کپڑے ملنے لگے اور آخر کار انھوں نے ہار مان لی ... دادا کے "اچھے دن" کی داستان کا سلسلہ توڑنے کی معافی چاہتا ہوں ... خیر اب آگے سنئیے - دادا بغیر کسی کو بلائے خود ہی جاکر اپنا نمدے کا سوئیٹر اسباب کی کوٹھری سے، جہاں وہ ہمیشہ رکھا رہتا تھا، لے آئے اسے برساتی کی پہلی سیڑھی پر بچھایا اور اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گئے کہ سورج کو نکلتے ہوئے دیکھیں - طلوع آفتاب کے وقت ویسے بھی انسان کا دل آپ ہی آپ خوش ہوتا ہے اس کے علاوہ میرے دادا کو سویرے اٹھ کر اپنے گھر بار کی ہر چیز پر نظر ڈالنے میں لطف آتا تھا، اور ان کے یہاں اس زمانے کے لحاظ سے زندگی کی تمام ضروریات مہیا تھیں ... پھر دادا کا ٹھنڈے پانی سے منھ ہاتھ دھوکر چائے پینے کو دل چاہا، اور انھوں نے اپنے خادموں کو جو بے تکے طریقے سے سو رہے تھے جگایا - خادم دیوانوں کی طرح خوف سے اچک کر کھڑے ہوگئے، مگر ستیپان میخائلووچ کی خوش و خرم آواز نے پھر ان کی جان

میں جان ڈال دی : " سازان ' منہ دھونے کا پانی لاؤ ! تنائی چیولوب ' اکسیوتکا *
اور بی‌بی کو جگاؤ ! - اور چائے لاؤ ! " ان حکموں کے دھرانے کی ضرورت نہ
تھی کہ ڈول ساران چشمے سے پانی لانے کے لئے چمکتی ہوئی پیتل کی چلمچی لے
کر سرپٹ بھاگا ' پھرتیلے تنائی چیونگ نے بد صورت ' نوجوان اکسیوتکا کو
اٹھایا - وہ اپنے سر پر رومال ٹھیک کرتی ہوئی گئی اور بوڑھی سوتی بی بی
ارنیا وسیل نفیہ کو جگا آئی - چند منٹ میں گھر بھراٹھہ کھڑا ہوا اور سب کو
معلوم ہوگیا کہ بڑے میاں خوش خوش اٹھے ہیں - پندرہ منٹ کے اندر برساتی
میں ایک میز بچھہ گئی ' اس پر ایک سفید گھر میں بنے ہوے کپڑے کی
چادر اڑا دی گئی ' ایک بہت بڑے پیتل کے چائداں نما سماوار میں چاے
ابلنے لگی ' اور میز کے گرد اکسیوتا مختلف کاموں میں مشغول ہوگئی -
بوڑھی بی بی ارنیا وسیل نفیہ اور ستیپان میخا ئلووچ نے ایک دوسرے
کی مزاج پرسی کی بوڑھی بی بی نے لئے اور دونوں کی طرح آج
نہ انھیں بیرنا ضروری تھا نہ کارکھنا ' انہوں نے بلند آواز اور خوشی
کے لہجے میں دادا کا مزاج پوچھا اور کہا " کہئے کیسی نیند آئی
کیا کیا خواب دیکھے ؟ " دادا نے بڑی شفقت سے اپنی بیوی کا مزاج پوچھا
اور پیار میں انھیں اریشا کہہ کر پکارا وہ ان کے ہاتھہ کبھی نہیں چومتے
تھے ' بلکہ عنایتاً اپنا ہاتھہ چومنے کے لئے دیتے تھے - اریلا وسیل نفیہ
پھول کی طرح کھل گئیں ' چہرے پر جوانی کا رنگ آگیا - کہاں گیا اب ان
کا موٹاپا ' ان کا بے ڈھنگا پن ! وہ جلدی سے اسٹول لائیں اور برساتی میں
دادا کے پاس بیٹھہ گئیں اس کی انھیں کبھی ہمت نہ ہوتی اگر دادا

---

* خادمہ کا نام -

بیمار سے نہ پیش آئے ہوتے ۔ دادا نے کہا آؤ اریشا ' گھر میں ہونے سے پہلے چائے پی لیں - رات کو حبس تو تھا مگر میں ایسی گہری نیند سویا کہ خواب تک نہیں دیکھا - ہاں اور تم ؟ یہ سوال ایک غیر معمولی پیار کی نشانی تھا اور ارینا وسیل نفیعہ نے جلدی سے جواب دیا کہ " جس رات کو ستیپان سیغا ٹلووچ اچھی طرح سوتے ہیں مجھے بھی خوب نیند آتی ہے ' مگر تانیوشا * نے رات کچھ بے چینی سے گذاری - تانیوشا سب سے چھوٹی لڑکی تھی ' اور جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے ' بوڑھے باپ کو وہ اور لڑکیوں سے زیادہ عزیز تھی - وہ یہ خبر سن کر کچھ پریشان ہوئے اور انہوں نے حکم دیا کہ جب تک لڑکی خود نہ اٹھے اسے کوئی نہ جگانے پائے - تتیانہ ستیپانو فنہ اپنی بہنوں الک ندرا اور ایلی زاوتیا ستیپانو فنہ کے ساتھہ جگادی گئی تھی ' اور کپڑے پہن کر تیار بھی ہوچکی تھی ' مگر دادا سے یہ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی - تانیوشا پھرتی سے کپڑے اتار کر پھر پلنگ پر لیٹ گئی ' اور کھڑکیاں سب بند کرادیں - اسے نیند تو نہیں آئی ' مگر دو گھنٹے اندھیرے میں لیٹی رہی ' دادا کو اطمینان ہو گیا کہ تانیوشا جی بھر کر سو لی ہے - دادا کا اکلوتا لڑکا جو کوئی نو سال کا تھا ' کبھی سویرے جلدی نہیں جگایا جاتا تھا - بڑی لڑکیاں تھوڑی دیر بعد حاضر ہوئیں - ستیپان میغا ٹلووچ نے شفقت سے انہیں ہاتھہ چومنے کو دیا ' ایک کولز انکا † کہہ کر پکارا ' دوسری کو لکسانیما ‡ - دونوں بڑی ہوشیار تھیں - الک ندرا کی طبیعت میں چالاکی کے ساتھہ باپ کی تیزی اور تنک مزاجی تھی ' مگر باپ کی اچھی صفتیں اس

* تتیانہ کا مخفف —

† ایلی زاویتا کا مخفف - ‡ الک ندرا کا

میں نہیں تھیں ' دادی بہت ھی سیدھی سادی عورت تھیں ' اور ان کی لڑکیاں ان پر بالکل حاوی تھیں ' اگر وہ ستیپان میخائلووچ سے چالاکی کرنے کی ھمت درتیں تو محض لڑکیوں کے سکھانے سے اور اپنی سادگی کی وجہ سے اکثر انھیں اس کی سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی ' ستیپان میخلووچ کو یہ بخوبی معلوم تھا ' اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب کبھی موقع ملا انہیں دھوکا دینے پر تیار ھو جاتی ھیں ' جب ان کا مزاج ٹھیک ھوتا تو ... صرف بکھیڑے سے بچنے اور اپنا سکون قلب قائم رکھنے کے لئے وہ ایسی باتیں کرتے کہ لڑکیاں سمجھتیں کہ ان کو بیوقوف بنا رھی ھیں ' لیکن جہاں انہیں غصہ آیا وہ لڑکیوں کو بے تکلف خوب کھری کھری سناتے بلکہ کبھی مار بھی بیٹھتے تھے ' مگر لڑکیاں پوری حوا کی بیٹیاں تھیں ' وہ کبھی باز نہ آئیں ' غصے کی گھڑی گزری اور دادا کی پیشانی کے بل دور ھوے کہ وہ پھر دھوکا دینے کی نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگتیں جن میں وہ اکثر کامیاب بھی رھتی تھیں ' —

چائے پی کر اور بیوی بیٹیوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرکے دادا کھیتوں کے معائنے کے لئے چلدئے ... باوجود گرمی کے وہ دوپہر تک گاڑی پر چڑھے گھوما کئے جیسے ھی دادا کی گاڑی پھاٹک پر سے اترتی نظر آئی کھانا میز پر لگا دیا گیا اور سارا خاندان ان کے استقبال کے لئے کھڑا ھوگیا ... کھانے پر سب بہت خوش تھے ... سب بلند آواز میں باتیں کرتے ' مذاق کرتے ' ھنستے رھے ... کھانے کے بعد دادا فوراً سونے کے لئے لیٹ گئے ... اور بہت جلد ان کے خراٹوں کے شور و غل کو سن کر سب سمجھ گئے کہ صاحب خانہ سورماؤں کی نیند سو رھے ھیں سب اپنی اپنی جگہ پر آرام کرنے چلے گئے نوکر اور نوکرانیاں چھوٹے بڑے ... دادا کی خوابگاہ

کے دروازے کے سامنے دراز ہوگئے ... نیند اور گرمی سے ان کا گلا سوکھ گیا تھا ان کا جی چاہتا تھا اپنے آقا کی طرح بیر میں خوب برف ڈال کر پئیں اور حلق تر کرلیں ۔ دیکھئے ان ڈھیٹھ چھوکروں نے کیسی ترکیب سوچی ' دادا کی خواب گاہ کا دروازہ کچھ کھلا تھا ' وہ کمرے میں جاکر ان کی ٹوپی اور چوغا لے آئے جو دروازے کے پاس ہی کرسی پر رکھا تھا ۔ تنائی چیونک آقا کے کپڑے پہن کر برساتی میں بیٹھ گیا ... سازان جگ لے کر تہ خانے بھاگا ہوا گیا اور خادمہ کو جگا کر صاحب خانہ کے لئے ٹھنڈی بیر طلب کی ' خادمہ نے جب شک ظاہر کیا کہ صاحب خانہ واقعی اٹھ بھی ہیں تو سازان نے اسے تنائی چیونک کی طرف اشارہ کردیا ' جو چوغا اور ٹوپی پہنے برساتی میں بیٹھا تھا ' بیر انڈیل دی گئی ' اس میں برف ڈال دی گئی ' اور سازان مال غنیمت لے کر چلتا ہوا ' دونوں لڑکوں نے ایک ہی جگ سے پی کر پھر چوغا اور ٹوپی پرانی جگہ پر رکھ دیا ... دادا اٹھے تو صبح سے بھی زیادہ خوش و خرم تھے اور اٹھتے ہی ٹھنڈی بیر مانگی ... نوکروں کے دھوکے کا راز فاش ہوگیا ' سازان اور تنائی چیونک خوف سے لرزتے ہوئے آقا کے قدموں پر گر پڑے ' اور آپ کیا سمجھتے ہیں دادا نے کیا کیا ؟ ... انہوں نے قہقہہ لگایا ' اپنی بیوی اریشا اور وہ لڑکیوں کو بلا بھیجا اور خوب زور سے ہنس ہنس کر اپنے نوکروں کی چالاکی کا قصہ سنایا ...

دادا سہ پہر کو پانچ بجے اٹھے تھے اور ٹھنڈی بیر کے بعد باوجود

* لفظی معنی میں " کنجی والی " وہ خادمہ جس کے پاس گدام وغیرہ کی کنجیاں رہتی تھیں ۔

غت گرمی کے انھیں چائے پینے کی خواہش ہوئی ' س خیال سے کہ گرمیوں میں گرم چیز پینے سے طبیعت کا بھاری پن ' کم ہوجاتا ہے البتہ درمیان میں وہ جاکر بوگورسلاں دریا کے ٹھنڈے پانی میں نہا آئے ' جو گھر کی کھڑکیوں کے نیچے سے بہتا تھا - واپسی پر انھیں سارا خاندان اس سویرے والی چائے کی میز کے پاس ان کا انتظار کر رہا تھا - چائے کی میز سائے میں رکھی تھی ' اس چاندان نما سماوار میں چائے ابل رہی تھی اور وہی خادمہ اکسیوتکا موجود تھی - دادا نے اپنا مرغوب پسینہ لانے والا گرم پانی جی بھر کر پی لیا ... اور تب سیر کے لئے پن چکی پر جانے کی تجویز پیش کی - ظاہر ہے سب بڑی خوشی سے راضی ہوگئے ... "

" شام ہوئی تو ستھیپاں میخائلووچ نے کہا " اریشا ' اب گھر واپس ہونے کا وقت آگیا ' گھر پر غالباً مکھیا میرا انتظار کر رہا ہوگا " ... ستھیپاں میخائلووچ کا اندازہ غلط نہیں تھا برساتی میں کانوں کا مکھیا ان کا راستہ دیکھہ رہا تھا ' اور صرف اکیلا نہیں بلکہ کئی کسانوں اور عورتوں کے ساتھہ مکھیا دادا کو پہلے دیکھہ چکا تھا ' اس نے پہچان لیا کہ ان کی طبیعت خوش ہے اور کسانوں میں سے کسی کو یہ خبر سنادی بعضے جنھیں کوئی غیر معمولی درخواست کرنی تھی - اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپہنچے ' اور سب کی خواہشیں اور حاجتیں پوری کردی گئیں ... صرف یہ نہیں بلکہ سب کو ایک چاندی کے پیالے بھر ... گھر کی بنی ہوئی زوردار شراب بھی ملی ... رات اور دن کے کھانے میں بہت کم فرق تھا ' اور غالباً اس وقت سب نے اور زیادہ پیٹ بھر کر کھایا ' اس وجہ سے کہ گرمی کم تھی - رات کا کھانا کھا کر ستھیپان میخائلووچ نے خاندان کو آرام کرنے کے لئے بھیج دیا اور خود حسب معمول فقط قمیص پہنے

برساتی میں جاکر رات کی خنکی کا لطف اٹھانے کے لئے بیٹھ گئے " ۔

" خاندانی داستان " میں ستیپان میخائلووچ کے وطن سے ھجرت کرکے نئی بستی میں آباد ھونے اور ان کے اچھے اور برے دنوں کی سر گذشت سنانے کے بعد ان کی چچیری بہن اور ان کے اپنے لڑکے الکسئی ستیپانووچ کی شادیوں کا تذکرہ کیا گیا ھے ۔ ستیپان میخائلووچ کو اپنی چچیری بہن پراسکوویا اوانوفنہ بہت عزیز تھی ' اور چونکہ اس کے والدین کا انتقال ھوچکا تھا اور اس کی نانی کا ستیپان میخائلووچ کو زیادہ اعتبار نہ تھا اس لئے وہ پراسکوویا اوانوفنہ کو زیادہ تر اپنے ھی ساتھ رکھتے تھے ۔ ستیپان میخائلووچ سے سب بہت ڈرتے تھے ' لیکن اس کے باوجود خاندان کی عورتوں نے مل کر ان کی مرضی کے خلاف پراسکوویا اوانوفنہ کی پندرہ برس کی عمر میں میخائل ماکسیموچ کورولےموت نامی ایک فوجی افسر سے شادی کرادی ۔ پراسکوویا اوانوفنہ کو ورثے میں کئی گاؤں ملنے والے تھے ۔ اور اس سے شادی کر لینا قرب و جوار کے تمام نوجوانوں میں بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی ۔ ظاھر ھے اس سے شادی کرنے کے بہت سے امیدوار تھے ' صرف اس کی نوعمری کی وجہ سے سب نے اس کی کوشش ملتوی کر رکھی تھی ۔ اتفاق سے کورولےموت ' جس کی پراسکوویا کے ننھیال کے قریب کچھ زمین بھی تھی ملازمت سے چند مہینوں کی رخصت لے کر اپنے گانو آیا ۔ پراسکوویا کے ورثے کی خبر سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا ' اور اس نے اس کی عمر کا لحاظ کئے بغیر اس سے شادی کرنے کی ٹھان لی ۔ وہ آدمی بہت ھوشیار اور تجربہ کار تھا ' دو چار ملاقاتوں کے بعد ھی پراسکوویا کی نانی کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ وہ اس سے پراسکوویا کا نکاح کرنے پر آمادہ ھوگئیں اور کورولیوت

کو ستیپان میخائلووچ اور ان کے خاندان سے رضا مندی لینے کے لئے ان کے گاؤں بھیجا ۔ ستیپان میخائلووچ کی بیوی اور لڑکیوں کورولیوت بہت پسند آیا ۔ لیکن ستیپان میخائلووچ کو صورت دیکھتے ہی اس سے نفرت ہوگئی، اور اس کا انہوں نے بے تکلفی سے اظہار بھی کر دیا ۔ ان کی بیوی اور لڑکیوں نے سمجھہ لیا کہ وہ اسے اپنا بہنوئی بنانے پر کبھی راضی نہ ہوں گے ، لیکن ان کی ضد میں ، اور کچھہ اس لئے کہ کورولیوت انہیں واقعی بہت معقول آدمی معلوم ہوتا تھا انہوں نے پراسکوویا کی نانی سے مل کر سازش کی ، اور چند مہینے بعد جب ستیپان میخائلووچ کسی ضرورت سے ماسکو چلے گئے تو انہوں نے پراسکوویا کا کورولیوت سے نکاح کرا دیا ۔ پراسکوویا بہت سیدھی سادی نیک دل لڑکی تھی اور پہلے پہل کورولیوت کا ان کے ساتھہ سلوک بھی اتنا اچھا تھا کہ انہیں اس سے گہری محبت ہوگئی ۔ مگر کچھہ سال بعد کورولیوت کا چال چلن بالکل بگڑ گیا ۔ اس نے پراسکوویا کے لئے اس کے ایک گاؤں میں بہت عالی شان مکان بنا دیا جہاں وہ بیچاری اکیلی پڑی رہتی تھی ، اور خود دوسرے گانو میں عیاشی شراب خواری میں مصروف رہتا تھا : رعایا اس کے ظلم سے نالاں تھی ، جان پہچان کے لوگ اس کی ساری بد کاریوں سے واقف تھے ، مگر پراسکوویا کو اس کی طرف سے کچھہ ایسا حسن ظن ہوگیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتی تھی ۔ آخر کار اس کی نوبت آئی کہ اسے بھی شک ہوگیا اور اپنے شوہر کو اطلاع دئے بغیر وہ اس گانو میں پہنچ گئی جہاں وہ رہتا تھا ۔ وہاں کی حالت دیکھہ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں ، وہ چاہتی تھی کہ کورولیوت کو منتظم کے عہدے سے معزول کر دے لیکن کورولیوت نے اسے ایک تہ خانے میں بند کر دیا ، اور ستیپان میخائلووچ اس حادثے کی خبر سن کر وقت پر پہنچ نہ گئے ہوتے تو غالبا وہ وہیں بھوکوں مر جاتی ۔ ستیپان میخائلووچ اسے

چھڑا لائے، اور چند دن کے بعد ہی خبر ملی کہ کوروليوف مرگیا :

الکسئی * ستیپا نووچ کی شادی کا قصہ اس سے بہت زیادہ دلچسپ اور ستیپان میخائلووچ کی شخصیت کا ایک اور پہلو دکھاتا ہے جو درحقیقت حیرت انگیز ہے. الکسئی ستیپا نووچ کچھہ سال فوج میں ملازم رہنے کے بعد شہر اوف میں وکالت کرنے لگے. یہاں وہ سوفیانکو لائففنہ، نائب گورنر صوبۂ اورن برگ کی بیٹی پر عاشق ہوگئے. اس کا عشق نہایت شاعرانہ قسم کا تھا، یہ ایک دل کی بیماری تھی، جس نے انہیں دبلا اور کم زور اور زندگی سے بے پروا کر دیا. سوفیانکو لائففنہ بہت ہی مہذب تعلیم یافتہ اور لائق تھی، روس کے اکثر ادبی مشاهیر سے اس کی واقفیت تھی اور سب اُس کا ادب کرتے تھے، خود شہر اوف میں کوئی خاتون حسن اور ذہانت اور سلیقے میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں. اس کا اور الکسئی ستیپا نووچ کا، جو ایک معمولی زمیندار کا لڑکا تھا کوئی جوڑ نہ تھا، اور اس کے علاوہ الکسئی ستپانووچ ایسا جھیپو، بز دل اور کم زور طبیعت کا تھا کہ شادی کیا پیغام دینے کی نوبت آنا بھی مشکل تھا. لیکن الکسئی ستیپا نووچ دل کے ہاتھوں ایسا مجبور ہوا کہ شادی کے سوا اسے جان بچانے کی کوئی اور صورت ہی نظر نہیں آتی، وہ پیام دینے پر تل گیا اُس نے ایک خاتون کے ذریعے سے جس سے ان کی کچھہ عزیز داری تھی سوفیان کو لائففنہ کی رائے معلوم کی اور اس سے اُس کی امیدیں بہت بڑہ گئیں. سوفیان کولائففنہ مردم شناس تھی گو الکسئی ستپا نووچ شرمیلا آدمی تھا اور اس میں یہ مادہ نہیں تھا کہ کسی مجمع پر رعب جما سکے مگر وہ دل کا بڑا اچھا اور بہت مخلص تھا. اور سوفیان کو لائففنہ نے اس کے یہ

---

* اکساکوف کے والد، جن کا شروع میں ذکر آیا تھا. ستیپان میخائلووچ کی بہو انہیں کی بیوی اور اکساکوف کی ماں تھیں —

اوصاف پہچان گئے اور اس کی قدر کرنے لگی - دشواریاں بہت تھیں ' لیکن سوفیاں کولائفنہ کی راے معلوم کرنے کے بعد الکسئی میخا ئلووچ کو کچھہ کچھہ امید بندھی اور وہ اس مسئلے پر اپنے خاندان کی راے لینے کو گھر آئے گھر پر ان کی بہنوں نے سب حال دریافت کرلیا تھا - انھیں سوفیاں کو لائفنہ سے دلی بغض ہوگیا تھا ' زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ حسین شائستہ اور ہوشیار تھی اور ارادے کی ایسی مضبوط کہ اس کے سامنے کسی کی دال گلنا ممکن نہیں تھا - بہنیں اپنے بھائی پر قبضہ رکھنا چاہتی تھیں ' اور ستیپان میخا ئلووچ کے خیال میں بھی ایک معمولی حیثیت اور معمولی تعلیم کے زمیندار اور ایک شائستہ شہری خاتون کا نباہ اس قدر دشوار تھا کہ انہوں نے بھی اپنے بیٹے کو یہ خیال چھوڑ دینے کا مشورہ دیا - سب کی مخالفت کا بیچارے الکسئی ستیپانووچ پر ایسا اثر پڑا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑ گیا اور موت کے منہ سے بال بال بچا آخر کار جب وہ اچھا ہوکر شہر لوٹ واپس ہوا تو اس کے خاندان کا خیال تھا کہ وہ سوفیاں کولائفنہ کو بالکل بھول گیا ہے مگر وہاں پہنچنے کے کچھہ دنوں بعد ہی اس نے گھر والوں کو یہ دھمکی لکھہ بھیجی کہ اگر سوفیاں کولائفنہ سے شادی نہ ہوئی تو میں خودکشی کرلوں گا وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا - اس کا بے اولاد مرنا گویا خاندان کا خاتمہ تھا - اس لئے ستیپان میخا ئلووچ نے مجبوراً سوفیاں کو لائفنہ کے نام پیغام بھیج دیا اور دونوں کی کچھہ عرصہ بعد شادی ہوگئی —

سوفیاں کولائفنہ اور ستیپان میخا ئلووچ " خاندانی داستان " کے بہترین کیرکٹر ہیں ' اور وہ حصہ جہاں ان دونوں طبیعتوں کا خود بخود ملنا ' ایک دوسرے کو سمجھنا اور ایک دوسرے کی عزت کرنا دکھایا گیا ہے

انشا پردازی اور کیرکٹر کی مصوری کا کرشمہ ہے - ستیپان میخائلووچ نے اپنی وضع نہیں چھوڑی' سوفیان‌کولائفنہ نے اپنی شائستگی سے ہاتھہ نہیں دھویا' ان کی ساس اور نندیں شروع سے آخر تک ان سے نفرت کرتی رہیں' اور الکسئی ستیپانووچ نے دنیا داری نہیں سیکھی' لیکن سوفیان‌کولائفنہ کے سلیقے اور ستیپان‌میخائلووچ کی محبت سب برداشت کر لے گئی' خاندان میں امن قائم رہا اور ایک پوتے کی پیدائش نے بوڑھے دادا کی پرانی آرزو پوری کرکے سوفیان کو لائفنہ سے ان کی محبت اور گہری کر دی —

" خاندانی داستان " کا قصہ ستیپان میخائلووچ کے پوتے سر گئی کی پیدائش پر ختم ہوجاتا ہے' اور مصنف اپنے خاندان سے رخصت ہوتا ہے :
"الوداع میرے روشن اور تاریک پیکرو' میرے اچھے اور برے لوگو! ... تم بڑے سورما نہیں تھے' نہ ایسی شخصیت کے مالک جس کی شہرت کا نقارہ بجتا ہو! خاموشی اور گم نامی میں تم نے اپنی زندگی بسر کی' اور ایک زمانہ گذرا کہ تم دنیا سے سفر کرچکے ہو - لیکن تم انسان تھے - تمہاری جسمانی اور روحانی زندگی شاعری سے لبریز ہے' جو ہمارے لئے اتنی ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے جتنی ہماری ذات اور ہماری زندگی آئندہ نسلوں کے لئے دلچسپ اور سبق آموز ہوگی۔ اور انسانوں کی طرح تم بھی اس دنیا کے عظیم الشان میدان عمل میں اپنا کام کر گئے ... اس ڈراما میں تم نے بھی صدق دل سے اپنا پارٹ دکھایا' اور اور تمہاری یادگار بھی زندہ رکھے جانے کی مستحق ہے ... تمہاری اولاد ہمدردی سے تمہارا ذکر کرتی ہے تمہیں اپنا عزیز اپنا بزرگ سمجھتی ہے تمہارا زمانہ' طرز معاشرت اور لباس خواہ کچھہ بھی رہا ہو خدا کرے تمہاری یادگار کی کبھی متعصبانہ رائے اور گستاخانہ الفاظ سے توہین نہ کی جائے " —

خطبات گارسان دتاسی

پندرھواں خطبہ

۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ ع

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ڈی لٹ پیرس (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی)

حضرات !

وہ زمانہ اب گیا گذرا جب کہ کہا جاتا تھا کہ جدید ھند کی قومی زبان در حقیقت توٹی پھوٹی بولی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ممکن ھے اس خیال کے حامیوں میں آپ کو چند لوگ ایسے ملیں جو یہ کہتے ھیں کہ ھندوستانی زبان میں یک جنسیت نہیں پائی جاتی۔ اسی وجہ سے وہ اس زبان کو ھیچ پوچ سمجھتے ھیں۔ لیکن اس خیال کی حمایت کے وقت وہ یہ بھول جاتے ھیں کہ خود یورپ کی زبانیں اور خاص کر انگریزی زبان متفرق عناصر کے امتزاج سے بنی ھے۔ بھر نہج لوگوں کا خیال ھندوستانی کی نسبت چاھے کچھ بھی ھو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ھندوستان کی مشترک زبان بن گئی ھے۔ دن بدن جو اس کی ترقی ھو رھی ھے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ھے۔ اس مسئلہ کی نسبت کپتان ایچ مور (H. moore) نے اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا ھے۔ موصوف مرکزی حکومت میں ترجمان کے عہدہ پر فائز ھیں۔ آپ کے

الفاظ یہ ہیں - " بلا شبہ کچھ عرصہ بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کر لے گی - اسی زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں - ریل کی وجہ سے اور بھی جو اندرون ملک میں ہزار میل کی مسافت پر پھیل گئی ہے ہندوستان اور وسط ایسیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ہے - چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں - ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی اور عربی کے عنصر شامل ہیں - اس زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کے مقاصد کو پورا کرے - میرے خیال میں ہندوستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندوستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں - ان قدرتی وسائل کی ترقی کی بدولت یورپ کے ہر ملک کے لوگ ہندوستان کھینچے چلے آ رہے ہیں - کشمیر میں مجھے فرانسیسی لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا - یہ لوگ فرانسیسی کارخانوں کے ایجنٹ ہیں - ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ایسا ہوگا جہاں فرانسیسی موجود نہ ہوں - پچھلے دس برس میں کلکتہ بمبئی میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے - * بندرگاہوں میں جہاں ساری دنیا کے تجارتی جہاز نظر آتے ہیں وہاں فرانسیسی جھنڈا بھی

---

* بہت عرصہ سے کلکتہ میں فرانسیسی کونسل (Consul) رہتا ہے - اب بمبئی میں بھی رہنے لگا - بمبئی میں موسیو اے تھینو کو ابھی حال میں حکومت نے نامزد کر کے بھیجا ہے - موصوف کو اُردو زبان سے شوق ہے - کلکتہ کے کونسل موسیو لو مبار ہیں - انھیں بھی اردو کی ترقی کا بڑا خیال رہتا ہے - دونوں صاحبوں نے از راہ نوازش وعدہ کیا ہے کہ وہ میری تحقیق میں حتی المقدور مدد فرمائیں گے —

کہیں نہ کہیں ضرور لہلہاتا نظر آتا ہے —

بابو راجندر لال متر نے اپنے مضمون " ہندی زبان کی ابتدا اور اردو کے ساتھہ اس کا تعلق " * میں یہ بتلایا ہے کہ ہندوستانی کی ابتدائی صورت ہندی ہے جو عام طور پر ہندو لوگ بولتے ہیں مسلمانوں کی اُردو ہندی ہی سے نکلی ہے - میں نے ابھی حال میں بابو راجندر لال متر کی تصویر دیکھی جس سے ان کی خوش اخلاقی اور ذہانت کا پتہ چلتا ہے - موصوف کا دعوی یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جس قدر زبانیں رائج ہیں ان سبہوں میں ہندی سب سے زیادہ اہم ہے - ہندی زبان جن لوگوں کے گہروں میں بولی جاتی ہے وہ ہندو معاشرت کے مہذب ترین طبقہ سے تعلق رکہتے ہیں - ہندی مشرقی بہار سے لیکر کوہ ہمالیہ کے دامن تک اور بندھیاچل سے لیکر ترائیں تک ہر کہیں بولی اور سمجہی جاتی ہے - گورکہوں کے ذریعہ سے اس زبان نے کمایوں اور نیپال تک رسائی پیدا کرلی ہے - ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے پیشاور کے کوہستان سے لیکر آسام تک اور کشمیر سے لیکر راس کماری تک اس زبان نے اپنا سکہ بٹہادیا ہے - ہزار سال کے عرصہ میں اس زبان نے جلیل القدر ادب دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے ادب کا مقابلہ ہندوستان کی اور کوئی زبان کیا بلحاظ اپنی وسعت اور کیا بلحاظ اپنی قدامت نہیں کرسکتی - بابوصاحب نے بہی وہی بات کہی ہے جومیں بار بار آپ صاحبوں کے سامنے کہہ چکا ہوں کہ ہندی اور اُردو میں سوائے اسکے کوئی فرق نہیں کہ اول الذکر کے سارے اسماء ہندی ہوتے ہیں اور ثانی الذکر کے اسماء میں عربی فارسی کا عنصر شامل ہوتا ہے افعال دونوں کے خالص

-Journal of the Asiatic Society of Bengal, No. 5,1854. *

ہندی ہیں اور دونوں کی صرف ونحو میں بھی کوئی بنیادی فرق نہیں ہے —

موصوف نے اسکے علاوہ یہ بات ثابت کی ہے کہ ہندی کے نوے فیصدی لفظ آریائی تقسیم السنہ سے متعلق ہیں - ان الفاظ کی صوتی اور تصریفی کیفیت سنسکرت سے مشابہ ہے - اس باب میں مکس ملر کی بھی یہی رائے ہے - وہ کہتے ہیں " ہندوستانی اس سنسکرت زبان سے نہیں نکلی ہے جس کی مثالیں ہمیں ویدوں میں یا برہمنی ادبیات میں ملتی ہیں - وہ اس زبان کی ایک سرسبز شاخ ہے جس سے سنسکرت کا بھی تعلق ہے * ہندوستانی میں اس قدیم ہندی زبان کا اثر بھی ملتا ہے جو سنسکرت سے پہلے بولی جاتی تھی - ہندی زبان فرانسیسی کی طرح نہیں ہے جو بالکل لاطینی رنگ میں رنگ گئی ہے - قدیم کلتکی (Celtic) زبان لاطینی کی یلغار کے آگے پسپا ہوگئی - ہندی کی اپنی خاص خصوصیات ہیں اور باوجود اسکے کہ سنسکرت کے الفاظ اور مشتقات اس میں مستعمل ہیں لیکن پھر بھی اسکے خدوخال صاف نمایاں نظر آتے ہیں - سنسکرت نے ہندوستان کی قدیم زبان کے ساتھہ وہی سلوک کیا تھا جو بعد میں عربی فارسی نے ہندی کے ساتھہ کیا —

فاضل بابو صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندی کے پاس اپنے حروف تہجی نہیں ہیں وہ غلطی پر ہیں - اس لئے کہ دیوناگری یا ناگری حروف ہندی کے اپنے ہیں بالکل اسی طرح جیسے یہ حروف سنسکرت کے اپنے ہیں ہندوستانی زبان دو رسوم خط میں لکھی جاتی ہے - ناگری اور فارسی - لیکن یہ دونوں لکھنے کے طریقہ ایک ہی بولی کے لئے نہیں استعمال ہوتے -

* The Science of Language, t I, P 63

ناگری رسم خط ہندوؤں کی ہندوستانی کے لئے اور فارسی رسم خط مسلمانوں کی ہندوستانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں - مجھے بابو صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ اُردو کو بھی ہندی کی طرح ناگری رسم خط میں لکھنا چاہئے - اس لئے کہ عربی فارسی الفاظ کو ناگری خط میں پڑھنا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے کہ سنسکرت کے الفاظ کو فارسی رسم خط میں پڑھنا - چنانچہ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ دیو ناگری رسم خط مقدس سمجھا جاتا ہے اکثر ہندو فارسی حروف تہجی کو استعمال کرتے ہیں - اور وہ خالص ہندی عبارت کو فارسی رسم خط میں بلا تکلف لکھتے ہیں * میں بابو صاحب کا اس بات میں ہم خیال ہوں کہ ہندوستانی زبان کو لاطینی رسم خط میں لکھنے کا رواج دینا مفید نہیں ہوگا اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھ اور دوسری تحریری علامتیں رائج کرنا پڑیں گی ان کو سیکھنا موجودہ حروف تہجی کو سیکھنے سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوگا —

نسولیز (Nassau Lees) نے جو سامی السنہ کے بڑے ماہر ہیں اور جن کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف مستشرقین میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانی زبان کو رومن حروف میں لکھنا چاہئے - وہ وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی زبان کا اپنا کوئی مخصوص رسم خط نہیں - فارسی رسم خط ہندی نژاد نہیں ہے اور دیوناگری رسم خط میں جو ہندوؤں میں بالعموم مروج ہے ، یہ صلاحیت نہیں ہے کہ فارسی زبان کے عناصر کا بخوبی اظہار کر سکے - بابو صاحب نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے

* میرے پاس بہاری لال کبھا اور دوسرے ہندی شعرا کے کلام کے قلمی نسخے فارسی خط میں لکھے ہوئے موجود ہیں —

وہ میں ابھی اوپر لکھ چکا ہوں - میری بھی وہی رائے ہے جو ان کی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ شمال اور وسط ہند میں سنسکرت زبان دیوناگری خط ہی میں لکھی جاتی رہی ہے - اور یہ کہ سنسکرت سے قبل جو زبان شمالی ہند میں رائج تھی اس کا رسم خط کوئی اور تھا - اس قسم کا اعتراض فارسی، مالیائی، ترکی اور دوسری زبانوں پر بھی عاید ہوسکتا ہے جنھوں نے حروف تہجی دوسری زبانوں سے مستعار لئے ہیں - دوسرے اعتراض کے جواب میں یہ عرض کیا جائے گا کہ دیوناگری رسم خط کے ذریعہ فارسی حروف کو نہیں ادا کیا جاسکتا - یہ ٹھیک ہے لیکن دیوناگری رسم خط صرف ہندوؤں میں مروج ہے جو عربی فارسی کے الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں - ہندوستانی زبان چاہے وہ شمالی ہند کی اردو ہو یا دکن کی دکنی ہو فارسی رسم خط ہی میں لکھی جاتی ہے اس رسم خط سے سب مخارج اچھی طرح ظاہر کئے جا سکتے ہیں سوائے ان مخارج کے جو زبان کو تالو سے ملاتے وقت نکلتے ہیں * دندانی حروف کو ان سے تمیز کرنے کے لئے خاص خاص علامتیں استعمال کی جاتی ہیں † چنانچہ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فارسی رسم خط کے ذریعہ ہندی کے سارے الفاظ لکھے جا سکتے ہیں - یہی وجہ تو ہے کہ ہندو لوگ بھی بآسانی اس رسم خط کو استعمال کرتے ہیں میری رائے میں اردو کو ہندی پر فضیلت حاصل ہے - برطانوی ہند کی سرکاری زبان انگریزی اور اس کے ساتھ اردو دونوں کہی جاسکتی ہیں - یہ سچ ہے کہ بعض ہندوؤں کی یہ رائے تھی کہ صوبجات شمال مغربی کی عدالتوں میں بجائے اردو کے ہندی کو رائج کرنا چاہئے اس واسطے کہ بعض علاقوں میں ہندی بمقابلہ اردو زیادہ

* Cerebrals † Dentals

بولی جاتی ہے اور آگرہ کے متعدد مدارس میں ہندی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا ہے نہ کہ اردو کو - چنانچہ ڈاکٹر ڈبلو انڈرسن (W Anderson) نے جو اس علاقہ کے ناظر مدارس ہیں ' اس بات کو اپنی رپوٹ میں ظاہر کیا ہے - ہاں ' اردو ان طبقوں کی زبان ہے جن پر اسلامی تہذیب کا اثر ہوا ہے - ڈاکٹر انڈرسن نے اپنی رپوٹ میں اس امر پر اظہار تاسف کیا ہے کہ صوبہ جات شمال مغربی میں عربی ' فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا شوق دن بدن کم ہوتا جاتا ہے - بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سارے ہندوستان میں یہی حال ہے - میں اس تاسف میں موصوف کا شریک ہوں مجھے پوری امید ہے کہ موصوف وکٹوریہ کالج میں جو ہندوستان کی بہترین درسگاہوں میں ہے قدیم زبانوں کی تعلیم کو رائج کریں گے - اس کالج کے ساتھ چار ابتدائی مدارس بھی ملحق ہیں —

میں اب اپنے چہیتے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی ہندوستانی (اردو) کی ہندوستان میں اہمیت - گزشتہ جنوری کی ۷ تاریخ کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا جس میں لاہور اور امرتسر کے مجسٹریٹوں کو خطابات دئے گئے جو وائسرائے کی طرف سے انہیں ملے تھے جن لوگوں نے تعلیم نسواں میں سرگرمی کا ثبوت دیا تھا انہیں خلعت دئے گئے - اس موقع پر کئی راجے بھی موجود تھے اور مختلف ہندوستانی امراء اور سرکاری عہدہ داروں نے اس میں شرکت کی - لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستانی زبان میں حاضرین جلسہ کو خطاب کیا* —

Allens Indian Mail Feb 23 1863

فروری کے مہینے میں لکھنؤ میں چیف کمشنر کے زیر صدارت ایک جلسہ ھوا جس میں اس نے اودھ کے تعلقہ داروں کے رو برو ھندوستانی میں طول طویل تقریر کی - یہ جلسہ کیننگ کالج کے لئے کیا گیا تھا * —

مہاراجہ گوالیار نے گنگت راؤ سندھیا کو اپنا جانشین مقرر کرتے وقت ۶ اکتوبر کو ھندوستانی ' فارسی اور مرھٹہ زبان میں ان کا امتحان لیا - موصوف اس امتحان میں کامیاب رہے † —

گورنمنٹ ھند نے نوجوان سول سروس والوں سے ھمت افزائی کا جو وعدہ کیا تھا اسے نہایت دریا دلی کے ساتھہ پورا کیا - چنانچہ جو سولین اپنے قیام کے ابتدائی زمانہ میں زبانوں کے امتحانات میں کامیاب رہے انھیں انعامات دئے گئے - فوجی افسروں کو مشرقی السنہ سکھانے کی غرض سے ترجمانوں کو مقرر کیا گیا ھے کہ انھیں ابتدائی باتیں بتائیں - ترجمانی کو اس کے بدلے میں علحدہ الاونس دیا جائے گا ‡ —

بر طانوی ھند کے اعلی عہدہ داروں میں کپتان " فلر " (Fuller) کو جو لاھور میں ناظم تعلیمات ھیں خاص کر کے ھندوستانی زبان کے ساتھہ دلچسپی ھے - آپ نے ھندوستانی کی متعدد قدیم نایاب کتب طبع کرائی ھیں اور خود بھی نئی کتابیں اس زبان میں لکھی ھیں اور لکھوائی ھیں - آپ کے زیر اہتمام نہ صرف یہ کہ ایک سالانہ رپورٹ مرتب کی جاتی ھے جس میں پنجاب کے وسیع علاقے کی تعلیمی ترقی کی سالانہ روئداد درج ھوتی ھے بلکہ ساتھہ ھی آپ ایک ھندوستانی ماھوار رسالہ بھی

---

* اخبار عالم - ۵ رمضان ۱۲۸۱ ھجری (۶ فروری سنہ ۱۸۶۵ ع)

† Times of India, 28 Oct. 1865.

‡ Indian Mail, 6 Nov. 1865.

شائع کراتے ہیں —

لندن میں ایک مجلس ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان کے متعلق اخلاقی معاشرتی اور مادی ترقی کے حالات جمع کرے اور ضروری معلومات بہم پہنچائے گزشتہ ۲ مئی کو مسٹر کنیرڈ (Kinnaird) کے دولت خانہ پر اس مجلس کے ارکان جمع ہوئے - اس موقع پر بعض ہندوستانیوں کو بھی جلسہ میں شریک کیا گیا - کلکتہ کے جان لانگ (Rev John Long) بھی جلسہ میں موجود تھے جو ہندوستان میں مدت سے مسیحی مشن کا کام انجام دے رہے ہیں - یورپ کے مختلف حصوں میں تین سال قیام کرنے کے بعد اب وہ پھر ہندوستان جانے والے ہیں - مدراس کے مسٹر ٹامس نے وسط ہند میں جو عام خیالات کی ترقی ہوئی ہے اس کی نسبت تذکرہ کیا - ڈاکٹر ڈاڈس (Dr Dod) نے کہا کہ ہندوستان میں مسیحی مذہب کی خوب ترقی ہورہی ہے - اس پر ایک ہندو نے جو اس جلسہ میں موجود تھا اس کی تردید کی - یہ ہندو اپنے قدیم دھرم پر قائم تھا —

ڈاکٹر جے بی گلکرسٹ جو مشہور مستشرق گزرے ہیں اور جنھوں نے ہندوستانی ادب کی بڑی خدمت کی تھی ان کا انتقال پیرس میں سنہ ۱۸۴۱ء میں ہوا تھا - ان کی بیوہ نے بعد میں جنرل پپ (Pepe) سے شادی کرلی تھی - ابھی حال میں اس خاتون کا بھی انتقال ہوگیا - موصوفہ نے اپنے دیس کے مرکزی شہر ایڈنبرا کی یونیورسٹی کے نام سترہ سو ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی چھوڑی ہے اور اس رقم کے متعلق یہ وصیت کی ہے کہ اس سے تیس وظیفے قائم کئے جائیں اور یہ وظیفے تین ہندوستانی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دئے جائیں - یہ تینوں طلبہ بنگال ، مدراس یا بمبئی کے صوبے کے باشندے ہوں - ان تین صوبوں میں جتنے مشہور کالج

ھیں ان کے طلبہ میں سے تیں بہترین کو مقابلہ کے ذریعہ منتخب کرنا چاھئیے اور ان کو یہ وظیفے ملنے چاھئیں —

ھندوستانی لوگ بھی اس بات میں پیچھے نہیں ھیں - مرشد آباد کے نواب ناظم نے مغربی تعلیم کو بنگالی مسلمانوں میں مقبول بنانے کی غرض سے چھہ سال کی مدت کے لئے چار وظائف دئے ھیں - یہ چاروں وظیفے اس طرح تقسیم ھوں گے - ایک نظامت کالج کے طالبِ علم کو، ایک مدرسہ کے طالب علم کو، اور دو کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج کے طلبہ کو - موصوف کے تینوں صاحب زادے حسن علی مرزا، حسین علی مرزا، اور محمد علی مرزا تعلیم کی غرض سے انگلستان آئے ھوئے تھے اور اس ملک میں انھوں نے ایک سال قیام کیا - ان صاحب زادوں کے ھمراہ سید وزیر علی اور کرنل سی ھربرٹ تھے - صاحب زادوں میں دو اول الذکر انگریزی زبان میں بلا تکلف گفتگو کر سکتے ھیں —

ھندوستانی زبان کی ترقی کا اظہار اس سے ھوتا ھے کہ برابر ھر سال اس زبان کے نئے اخباروں کی تعداد میں اضافہ ھورھا ھے - پچھلے سال نئے اخبارات غیر معمولی طور پر زیادہ نکلے ھیں - چنانچہ صوبجات شمال مغربی کے بعض شہروں میں جہاں سے ایک اخبار بھی نہ نکلتا تھا اب کئی کئی نکلتے ھیں - یہی حال پنجاب، اودھ اور بمبئی کا ھے - افغانستان اور سندھ سے بھی اردو اخبارات نکلنا شروع ھوگئے ھیں - میں ذیل میں تفصیل بیان کرتا ھوں :—

(۱) "سروپ ھراک" - آگرہ سے نکلتا ھے - یہ اخبار اردو کے "مفیدالخلائق" کا ھندی ترجمہ ھے - اس کے مدیر کا نام شیونرائن ھے - "مفید الخلائق" کئی سال سے جاری ھے —

(۲) " دل کُشا " ۔ اردو میں فتح گڑھ سے شائع ہوتا ہے —

(۳) " شعلۂ طور " ۔ اردو میں کانپور سے شائع ہوتا ہے —

(۴) " احسان الاخبار " ۔ اردو میں بریلی سے نکلتا ہے ۔ ہفتہ وار ہے ۔
مدیر کا نام احسان محمد ہے —

(۵) " آئینۂ ہند " ۔ اردو میں بریلی سے شائع ہوتا ہے ۔ مدیر کا نام
ہرداس سنگھہ ہے —

(۶) " تتوبودھنی پتر کا " ۔ ہندی میں بریلی سے شائع ہوتا ہے مدیر
کا نام گلاب شنکر ہے —

(۷) " رفاہ خلائق " ۔ اردو میں شاہجہاں پور سے نکلتا ہے ۔ اس کے مدیر
کور بہادر ہیں —

(۸) " نور نظر " ۔ اردو میں بلند شہر سے نکلتا ہے ۔ ہفتہ وار ہے ۔اس
کے مدیر شیو پرساد ہیں —

(۹) " مظہر العجائب " ۔ اردو میں رڑکی سے شائع ہوتا ہے ۔ ہفتہ وار ہے ۔
مدیر کا نام نجف علی ہے —

(۱۰) " لارنس گزٹ " ۔ میرٹھہ سے اردو میں نکلتا ہے ۔ ہفتہ وار ہے ۔
اس کے مدیر اسمعیل خاں ہیں —

(۱۱) " میرٹھہ گزٹ " ۔ ضمیمۂ اخبار عالم ۔ یہ اخبار سنہ ۱۸۶۴ ع کے آخر سے نکلنا
شروع ہوا ہے ۔ یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ چھوٹی تقطیع پر ہر
صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں ۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے ۔ " دارالاسلام "
کے مطبع سے طبع ہوتا ہے ۔ میرے پیش نظر اس اخبار کے چار نمبر ہیں
جو میرے نوجوان کیمبرج کے دوست " ایچ پامر " نے مجھے بھیجے
ہیں ۔ میں نے ان نمبروں کو شروع سے آخر تک پڑھا لیکن کوئی

ایسی دلچسپ چیز نہیں نظر آتی جو قابل ذکر ہو - "احبار عالم" میں دلچسپ مضامین برابر نکلا کرتے ہیں - چنانچہ ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۱ ہجری (۱۹ جنوری سنہ ۱۸۹۵ ع) کی اشاعت میں متعدد نئی ہندوستانی کتابوں کا اعلان ہے اور (سالار) سید عبدالغنی خاں کی ایک غزل ہے - موصوف ساچین (گجرات) کے نواب زادہ ہیں اور "شوریدہ" تخلص کرتے ہیں * —

اس احبار کی ۵ رمضان (۶فروری) کی اشاعت میں نواب محمد زین العابدین خان کی پہلی غزل شائع ہوئی ہے - موصوف نواب رامپور کے داماد ہیں - 'عابد' تخلص کرتے ہیں - مدیر نے اسی غزل کی بہت بڑھا چڑھا کر تعریف کی ہے لیکن مجھے اس میں کوئی نئی بات ایسی نہیں نظر آتی جو قابل ذکر ہو —

(۱۲) پچھلے سال کے عرصہ میں آگرہ سے ایک قانونی رسالہ سائع ہونا شروع ہوا ہے - اس کی اشاعت انگریزی (Agra Law Journal) اور اُردو دونوں میں ہوتی ہے† —

(۱۳) لاہور سے "پنجابی" نام کا ایک احبار نکلنا شروع ہوا ہے —

صوبجات شمال مغربی کا ذکر میں اس وقت تک ختم نہیں کر سکتا جب تک کہ ڈاکٹر آرسی ماتھر کی تصانیف کے متعلق ذکر نہ کر دوں - موصوف مرزا پور سے "خیر خواہ ہند" ناگری اور فارسی رسوم خط میں برابر شائع کر رہے ہیں - اس اخبار کے بعض اہم اجزا کا انگریزی ترجمہ

---

* یہاں ان کے تین اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

† Indian Daily Mail 5 Dec. 1864.

بھی کبھی کبھی شائع کر دیتے ہیں۔ مرزا سید عبد اللہ نے مجھے اس اخبار کا حال میں ایک نمبر بھیجا ہے اس میں بعض اجزاء مجھے نہایت دلچسپ معلوم ہوئے ——

(۱۴) اودھ کی قدیم سلطنت کی راجدھانی لکھنؤ سے ' ان اخبارات کے علاوہ جن کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ' اودھ گزٹ نکلنا شروع ہوا ہے۔ پہلے اس کا نام "اودھ گزٹ سماچار" تھا ——

"اودھ اخبار" بدستور جاری ہے۔ اس اخبار کی متعدد اشاعتیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ مسٹر ای ایچ پامر کی نوازش ہے کہ وہ مجھے یہ پرچے بھیج دیا کرتے ہیں۔ موصوف خود بھی کبھی کبھی اس اخبار میں مضامین لکھتے ہیں۔ اس میں "انجمن آگرہ" کے متعلق حالات درج ہوتے ہیں۔ اس انجمن کا نصب العین یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اہل ہند میں رواج دے۔ منشی نول کشور بھی اس انجمن کے رکن ہیں جو لکھنؤ کے مشہور مطبع کے مالک ہیں جہاں سے "اودھ اخبار" شائع ہوتا ہے۔ ایک اشاعت میں سندیلہ کے مدرسہ کا احوال ہے - اس درس گاہ میں مغربی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے - اس کی مالی حالت بھی بہت اچھی ہے - راجہ فتح چند نے اس درس گاہ کو قایم کیا تھا - راجہ صاحب کو ہندوستانی ادب سے خاص لگاؤ تھا - آس پاس کے گاوں کے آپ تعلقہ دار بھی ہیں - آپ کا صدر مقام سندیلہ ہے - اس اخبار میں بعض اوقات عمدہ قسم کے اشعار پڑھنے میں آتے ہیں جن سے موجودہ عہد کے شعراء کا علم ہوتا ہے - چنانچہ ایک شاعر ہیں رانا جو اکثر اس اخبار میں اپنا کلام بھیجتے ہیں رانا نے اپنی موت کے متعلق ۲۱ فروری کے نمبر میں اشعار لکھے ہیں - ایک شاعر جوہر ہیں جو اپنا کلام اس میں شائع کرتے ہیں - یہ جرات کے شاگرد ہیں -

اور دوسرے شاعر جن کا کلام شائع ہوتا ہے یہ ہیں : صفی ' موجد اور فضا ۔ ۲۴ جنوری کے نمبر میں ان میں سے اکثر شاعروں کا کلام شائع ہوا تھا اس لئے کہ یہ سال کی پہلی اشاعت تھی —

(۱۵) بمبئی کے جن اخباروں کا میں ذکر کر چکا ہوں ان کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے ۔ اس کا نام " روضۃالاخبار " ہے ۔ یہ ہفتہ وار شائع ہوتا ہے —

(۱۶) مفرح‌القلوب ۔ یہ اخبار افغانستان میں مقام شکار پور سے شائع ہوتا ہے ۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور ملکی زبان پشتو ہے لیکن ہندوستانی یہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہے ۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سے ایک اردو اخبار نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی —

(۱۷) کرانچی سے جو سندھ کا بندرگاہ ہے ' فارسی زبان میں ایک اخبار نکلتا ہے جس میں ہندوستانی کے مضامین بھی فارسی کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں ۔ اس اخبار کا نام " مطلع خورشید " ہے ۔ یہ اخبار بہت دنوں سے شائع ہورہا ہے لیکن مجھے اس کا ابھی حال میں علم ہوا ہے ۔ اس اخبار کے مدیر مرزا محمد شفیع ہیں جو ایک مطبع کے مالک ہیں —

مدراس سے اردو کا اخبار " صبح صادق " برابر شائع ہورہا ہے ۔ یہ ہفتہ وار ہے اور ہر سہ شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے ۔ یہ بڑی تقطیع پر ہوتا ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں ۔ اس کے مدیر عبدالرحمن شفات ہیں ۔ اس کی متعدد اشاعتیں میری نظر سے گذری ہیں ۔ ان میں سے ایک میں ہندوؤں کی غیر اخلاقی اور وحشیانہ رسوم پر تنقید ہے ۔ ان رسموں میں سے ایک " چرک پوجا " ہے ۔ جس طرح ستی کی رسم کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے ۔ اسی طرح اس کو بھی خلاف قانون قرار دینا

چاہئیے ۔ اس مضمون میں بعض ہندو فقیروں اور مالا بار کی برہنہ عورتوں کے حالات درج ہیں ۔ اس رسم کو شاستروں کی تعلیم کے حلات بتایا گیا ہے ۔ ہندو عورتوں کو اگر بالکل نو عمری میں بیاہ نہ دیا جائے تو عمر بھر وہ بن بیاہی رہتی ہیں اور دیوتاؤں کے نذر کردیا جاتا ہے ۔ یہ سب عورتیں فحش میں مبتلا ہوتی ہیں ۔ اس اخبار میں سیفی کا ایک مضمون نظر سے گذرا ۔ یہ اچھا خاصا لکھہ لیتے ہیں ۔ یہ مضمون امام حسن اور امام حسین کی شہادت سے متعلق تھا ۔ اس کے علاوہ غالب کی ایک غزل اِس میں درج تھی جس کی ردیف " پاؤں " ہے ۔ مدیر نے مسٹر پامر کے ان مضامین پر تبصرہ لکھا ہے جو موصوف نے " اودھ اخبار " اور " اخبار عالم " کے لئے لکھے تھے ۔ تبصرہ میں مسٹر پامر کے طرز انشا کی تعریف کی گئی ہے اور اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ کیا اچھا ہو اگر گورنمنٹ ایسے یوروپیلوں کو مدراس کے سررشتۂ تعلیم میں اعلی خدمات پر مقرر کرے تاکہ ان سے نفع حاصل کیا جاسکے ۔ ایسے اشخاص کا اثر مدراس پر بہت مفید ہوگا اس لئے کہ وہ ہندوستانی عربی اور فارسی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں —

حضرات ! ان اخباروں کا ذکر کرنے کے بعد مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اجازت دیں گے کہ انگریزی کے ایک رسالہ " پنجاب ایجوکیشنل میگزین " کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں ۔ یہ رسالہ انگریزی زبان میں نکلتا ہے ۔ لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کے فروغ اور ترقی کے لئے نشر و اشاعت کا کام کرے ۔ گزشتہ جنوری سے یہ رسالہ ماہوار نکلتا ہے ۔ اس کے پانچ نمبر یہاں پہنچ چکے ہیں ۔ اس میں تعلیمی خبروں اور مشوروں کے علاوہ پر مغز مضامین ہوتے ہیں اور مہینہ بھر کی ادبی مشاغل کی

کیفیت درج ہوتی ہے اس کے علاوہ پنجاب کی علمی انجمنوں کی روئداد ین
اور تعلیمی نصابوں کی رپوتیں ہوتی ہیں —

پہلی اشاعت میں بعض مضامین ایسے ہیں جو ہماری دلچسپی کے
ہیں - مثلاً عربی حروف تہجی پر ڈاکٹر لٹنیر (Dr. Leitner) کا مضمون
ہے - اس کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے اردو امتحان کے
سوالات اور جوابات درج ہیں - بیشتر سوالات آرائش محفل اور اخوان الصفا
میں سے ہیں - خاتمہ پر ادبی اور علمی انجمنوں کی روئدادیں ہیں
اور تعلیم سے متعلق بعض ادھر ادھر سے اقتباسات ہیں —

اخبارات کے علاوہ اس سال جو کتب شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد
بھی بہت زیادہ ہے * - ان کتب میں بعض یقیناً ایسی ہیں جو نہ صرف
ہندوستان میں بلکہ یورپ کی علمی دنیا میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی
جائیں گی - ان کتابوں میں سے بیشتر آگرہ میں طبع ہوئی ہیں - ان کی
فہرست ڈاکٹر ڈبلوانڈرسن (W. Anderson) نے مجھے ازراہ عنایت
بھیجی ہے - بعض کپتان فلر کے حکم سے طبع ہوئیں - موصوف جیسا کہ
میں پہلے بتلا چکا ہوں پنجاب میں ناظم تعلیمات ہیں - میں ان میں
سے بعض کی نسبت اپ کے سامنے ذکر کرتا ہوں - میں دیدہ و دانستہ
مذہبی کتابوں کا اس وقت ذکر نہیں کرونگا اس لئے کہ ان کی فہرست

---

* کتابوں کی تعداد میں ہرسال اس قدر اضافہ ہو رہا ہے کہ حکومت
نے ' جیسا کہ دو سال کا عرصہ ہوا اس کے متعلق اعلان بھی کیا تھا اور
مسٹر وھیلر (Wheeler) نے اپنی رپوٹ پیش کی تھی ' یہ ارادہ کرلیا ہے
کہ نئی مطبوعات کی اطلاع حاصل کرنے کا پورا انتظام کرے —

بہت طویل ہے * —

Rev. H. W. Shackell اور M. W. Anderson نے مجھے " مجموعہ القواعد " کے نسخے بھیجے ہیں - اس کے مصنف منشی راجا رام ہیں جن کی تصویر سر ورق پر ہے - موصوف ہندوستانی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں اور اہل مشرق جیسے بیٹھا کرتے ہیں اسی طرح یہ بیٹھے ہوئے ہیں اور حقہ ان کے سامنے رکھا ہے - یہ کتاب ہندوستانی مدارس کے لئے لکھی گئی ہے اور اس میں مفید معلومات مصنف نے جمع کردی ہیں - اس میں اکبر اباد (آگرہ) اور صوبجات شمال مغربی کے بعض دوسرے شہروں کا ذکر ہے - امیر چلد کے سفر نامہ سے بعض اقتباسات کشمیر اور لاہور کے متعلق بھی درج کردئے ہیں ہندوستان کے مہاراجوں و نوابوں کے ناموں کی فہرست ہے اور اب تک ہندوستان میں جتنے گورنر جنرل رہ چکے ہیں ان کے متعلق معلومات ہیں - اس کے علاوہ پہاڑوں ' سمندروں ' ہواؤں ' بارش اور انگلستان سے ہندوستان کی جو تجارت ہوتی ہے اس کا حال ہے - بغض ' حسد ' غرور ' جہالت اور وقت کی قدر و قیمت کے متعلق اخلاقی پند و نصائح ہیں - اگرچہ کتاب کے مصنف خود ہندو ہیں لیکن خانگی زندگی کے متعلق انہوں نے جو مشورے دیے ہیں ان سے مسلمانوں کی

---

* مرزا پور کے اخبار " خیر خواہ ہند " میں ان ہندوستانی کتابوں کا ذکر ہے جو مسیحی مبلغوں کی جانب سے طبع ہوئی ہیں - ان میں ایک ہندوستانی دعاؤں کا مجموعہ ہے - اس میں موسیقی کی علامات وغیرہ بھی درج ہیں - یہ دعائیں بعض تو ہندوستانی ہی میں لکھی گئی ہیں اور بعض انگریزی یا جرمن سے ترجمہ کی گئی ہیں - آگرہ کے Rev. S. H. Ullman نے یہ ترجمے کئے ہے —

خانگی زندگی کی جھلک نظرآتی ہے - ایک فارسی کتاب " کیمیائے سعادت " شائع ہوئی ہے اس کے مصنف امام غزالی ہیں - ایک تاریخ Dabischalim ہے " کلیلہ و دمنہ " کا خلاصہ ہے —

اس کتاب میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو غالباً کہیں اور نہیں ملیں گی مثلاً ان سب شہروں کے نام ہیں جنہیں مسلمان مقدس سمجھتے ہیں - ساتھ ہی ان کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں - اس ضمن میں اجمیر ' ملتان ' دہلی ' آگرہ ' الہ آباد ' پانی پت ' تھانیسر ' کشمیر لکھنؤ وغیرہ کے حالات لکھے ہیں - مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ہردوار اور بنارس کے نام بھی اس فہرست میں شامل ہیں اس لئے کہ ان مقامات میں اورنگ زیب نے مساجد بنوائی تھیں - اس کے ساتھ ایک فہرست ان مقامات کی ہے جو برہمنی ہند کے نزدیک مقدس خیال کئے جاتے ہیں - اس کے بعد پان کی کاشت اور آموں کے باغ لگانے کے متعلق معلومات ہیں - سب سے زیادہ دلچسپ وہ حصہ ہے جہاں بادشاہ دہلی کے اس اعلان کی نقل ہے جو سنہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر اس نے ہندوستان کے راجوں اور اور رئیسوں کے نام بھیجا تھا * —

دیوان ' گویا ' بھی طبع ہوگیا - ' گویا ' لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے - ان کا دیوان پہلی مرتبہ کانپور میں سنہ ۱۸۶۴ء میں طبع ہوا - یہ ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے —

فارسی کے مشہور شاعر حافظ کے دیوان کا اردو ترجمہ آگرہ سے طبع ہوا ہے اور " بھگوت گیتا " کا اردو ترجمہ اٹاوہ سے شائع ہوا ہے —

---

* یہ اعلان صفحہ ۱۱۸ اور اس کے بعد کے صفحات پر درج ہے - پورے چار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے —

الہ آباد کے اخبار "امین الاخبار" کے مدیر نے جن کا نام عزیزالدین خاں ہے (Pilgrims Progress) کے طرز پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "جواہر اصل" رکھا ہے اس کی عبارت میں نثر اور نظم دونوں ملی ہوئی ہیں —

لکھنؤ سے رانا کی مثنوی "ضبط عشق" طبع ہو گئی۔ * یہ تین تین مصرعوں کے واسوخت کے طرز پر ہے۔ اس میں مشرقی عورتوں کے مکروفریب کا حال اخلاقی مقصد کو پیش نظر رکھ کر بیان کیا ہے —

"بغاوت مالوہ" کی "اخبار عالم" نے اپنی ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۸۱ ھ (۲۶ جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع) کی اشاعت میں بہت تعریف کی ہے۔ یہ نظام الدین کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے طرز تحریر اور بیان میں تفصیل کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ صوبہ مالوہ میں ۱۸۵۷ ع میں جو شورش ہوئی تھی اس کے متعلق بہت سارے واقعات اس کتاب میں مل جاتے ہیں۔ اس میں تصاویر ہیں اور ان مقامات کے نقشے ہیں جہاں شورش کو فرو کرنے کے سلسلہ میں لڑائیاں ہوئیں تھیں —

قصائد طیبی میں طیبی کے قصائد ہیں۔ ان قصائد میں مزاح کا پہلو نظر آتا ہے۔ قصائد کے ساتھ ان کی تشریح کے لئے حواشی بھی ہیں —

"جہاں نما" میں کائنات کے عجائب و غرائب کا بیان ہے۔ جیسے پہاڑ، سمندر، جنگل، انسان اور حیوانات وغیرہ۔ طرز تحریر صاف ہے۔ اسی نام کی ایک کتاب ترکی میں ہے جس میں علم جغرافیہ پر بحث کی گئی ہے —

"بہارستان ناز"۔ یہ تقی الدین کی نظم کا عنوان ہے —

---

* ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۲۱ سطریں ہیں —

" نیرنگ نظر " - لڑکیوں کے مدارس کے لئے محمد اسمعیل نے لکھی ھے —

" درد غمناک " - یہ ایک عشقیہ افسانہ ھے —

گنگا پرشاد نے ھندوستان کی ریت رسوم کے متعلق " رو داد " لکھی ھے - موصوف اور دوسری متعدد کتابوں کے مصنف ھیں —

" تمیزاللغات " - اس میں عربی کے الفاظ کے اردو معنی ھیں - الفاظ کے معنوی فرق کو بھی اس میں واضح کیا ھے یہ اُسی قسم کی کتاب ھے جیسے فرانسیسی میں (Guard et Bauzee) کی کتاب ھے جس کی نقل میں اب انگریزی بھی لکھی گئی ھے - اس کے مولف کا نام مولوی نیاز حسین ھے*—

اسی قسم کی ایک کتاب کریم‌الدین نے لکھی ھے جس کا نام " تکریم ظھوری " رکھا ھے - یہ " تشریح ظھوری " کے بعد لکھی گئی ھے جس کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ھوں - ان دونوں میں " ھوم نثر ظھوری " کی تشریح کی گئی ھے اور اصل میں جو مترادف الفاظ استعمال کئے گئے ھیں ان کے معنی کی بھی توضیح کی گئی ھے —

میں اردو کی کتابوں کے ذکر کو بغیر مولوی جلال‌الدین رومی کی " مثنوی معنوی " کی نسبت کچھہ کہے ختم نہیں کروں‌گا - محمد کریم‌الدین نے مجھے اس کا نظم میں اردو ترجمہ بھیجا ھے - مثنوی کی پہلی کتاب کا ترجمہ موصوف نے کاتبوں سے نقل کراکے مجھے بھیجا ھے - یہ عجب اتفاق کی بات ھے کہ جس کاغذ پر کاتبوں نے نقل کی ھے وہ فرانس کا بنا ھوا کاغذ ھے - ترجمہ مولوی اللہ بخش نشاط اور مولوی ابوالحسن نے کیا ھے - ترجمہ کا نام " مجموعہ فیض العلوم " رکھا ھے - بمبئی میں سنہ ۱۲۴۳ ھجری (۱۸۲۷ ع) میں جو فارسی ایڈیشن طبع ھوا تھا اس کو ترجمہ میں پیش

* مطبوعہ سنہ ۱۸۹۵ ع - لاھور - یہ کتاب کپتان فلر کے حکم سے طبع ھوئی ھے—

نظر رکھا گیا ہے —

محمد کریم الدین نے مجھے باغ ارم کا بھی ایک نسخہ بھیجا ہے۔ یہ بھی مثنوی معنوی کے بعض منتخب حصوں کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام شاہ مستان ہے جو مدراس کے رہنے والے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ میں طبع ہوا تھا۔ حافظ کمال نے دوسرے ایڈیشن پر نظر ثانی کی ہے۔ مثنوی فارسی زبان میں تصوف کی اعلیٰ ترین کتاب ہے۔ صوفیا کے نزدیک یہ کتاب قرآن کی بہترین تفسیر ہے۔ چنانچہ اس کو قرآن پہلوی کہا جاتا ہے۔ ۴۰ ہزار بیت میں قصوں کہانیوں کے پیرایے میں اس میں صوفیا کے عقائد و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جو پراسرار شاعری کو پسند کرتے ہیں ان کے لئے مثنوی میں ایک خاص لطف ہے۔ بقول یوریپید (Euripide) ناقابل فہم چیزوں میں ایک طرح کا تقدس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے " یا بقول پوپ " اس قسم کا تخیل عدم کمال پر دلالت کرتا ہے " —

بالعموم ان سب کتب کے آخر میں چند اشعار ہوتے ہیں جن کو " تاریخ " کہتے ہیں۔ ان اشعار کے حروف تہجی سے ایک خاص حساب کے مطابق کتاب کی تصنیف کی تاریخ نکلتی ہے۔ قدیم عبرانیوں میں بھی یہ طریقہ رائج تھا۔ چنانچہ توراۃ میں بعض حروف بڑے ہیں اور بعض چھوٹے۔ ان بڑے حروف سے بعض تاریخیں نکلتی ہیں لیکن ان کی ابھی تک پورے طور پر تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ ڈبلو ایچ بلیک (W. H. Black) نے انہیں حروف سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے ۱۴۵۱ ق م میں انتقال کیا * بقول (Malachie) ۶۹۳ ق م

* " Ancient Biblical Chronograms Or a Discovery of the Chronological use of the majuscular Letters occuring in the text of the Hebrew Scripturs. " London 1864.

میں اور یقول دانیال ۹۲۵ ق م میں حضرت موسیٰ کا انتقال ہوا اور Esther کا واقعہ ۳۴۷ ق م میں ہوا —

حضرات ! اب آپ اگر اجازت دیں تو میں ہندی کی چند مطبوعات کی نسبت ذکر کروں جو مجھے بھیجی گئی ہیں یا جن کے متعلق میں نے معلومات جمع کی ہیں —

" اتهاس تمرناسک " (Itihas timir nacak) کے مصنف کا نام شیو پرشاد ہے - یہ " تاریخ ہند " ہے - جس حصہ میں سنہ ۱۸۹۵ سمبت درج ہے وہ درحقیقت سنہ ۱۵۶۶ ع سے لے کر سنہ ۱۸۵۷ ع تک کے حالات پر حاوی ہے - یہ کتاب بنارس میں طبع ہوئی ہے - شیو پرشاد نے اس کتاب میں بھی اپنی اور دوسری کتابوں کی طرح اس امر کی کوشش کی ہے کہ نہایت مختصر انداز میں زیادہ سے زیادہ معلومات کو یک جا کیا جائے - اس کتاب کا تیسرا حصہ جب شائع ہوا اس وقت کہیں یہ مکمل ہو پائے گی —

پچھلے سال میں نے کہا تھا کہ " پربودھاچندر دیا " کا اردو ترجمہ شائع ہوچکا ہے - آج میں آپ کے سامنے اس کا اعلان کرتا ہوں کہ اس ناٹک کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوگا - ترجمہ نند اس (Nandas) نے کیا ہے —

" اندر سبھا " - ہندی کا افسانہ ہے - بلدیو پرشاد نے فارسی سے اس کا ترجمہ کیا ہے - ہندی میں اس کا اصل موجود نہیں ہے —

" کرشن کا بارہ ماسا " - کرشن بھگتی کی دعائیں ہیں جن میں سال بھر کے حالات بیان کئے گئے ہیں " رس راج " - ہندی نظموں کا مجموعہ ہے ' ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے —

" بھرتری چرتر " - یہ کہانیوں کا انتخاب ہے - ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے - آگرہ میں طبع ہوا —

" راگ مالا " - یہ عوامی گیتوں کا مجموعہ ہے - امراؤ سنگھ نے انہیں ایک جگہہ جمع کیا ہے - میرٹھہ میں سنہ ۱۸۶۴ ع میں طبع ہوا —

" ونایا پتر کا " - یہ تلسی داس کی نظم ہے - پہلے بھی چھپ چکی ہے - اس مرتبہ شیوپرکاش نے اس کی تشریح میں حواشی بھی لکھے ہیں ' ۳۸۰ صفحات ہیں - بنارس میں طبع ہوئی ہے —

پنچ رتن " - یہ بھی تلسی داس کی پانچ مشہور نظموں کا مجموعہ ہے - پنڈت درگا پرساد نے شائع کیا ' ۲۷۴ صفحات ہیں - بنارس میں طبع ہوا —

سور ساگر رتن " - یہ سور داس کی نظموں کا مجموعہ ہے - سورداس کو ہندوستان کا ہومر سمجھنا چاہئے —

" سکنتلا " - یہ سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ ہے - بنارس میں سنہ ۱۸۶۴ ع میں طبع ہوا —

" بیدھ درپن " اس کے مولف کا نام نتھاجی ہے - میرٹھہ میں سنہ ۱۸۶۴ ع میں طبع ہوا —

" امرت ساگر " - یہ کتاب فن طب پر ہے ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے - آگرہ میں طبع ہوئی —

" بن مادھو " اور " پدمالا " - یہ دونوں علم العروض کی کتابیں ہیں آگرہ میں سنہ ۱۸۶۴ ع میں طبع کی گئیں —

بابو متھراپرشاد کی انگریزی ہندوستانی کی لغت (ہندی کے ساتھہ اردو بھی ہے) بنارس میں زیر طبع ہے - یہ لغت بہت ضخیم ہوگی - موصوف اس لغت کو ان لوگوں کی سہولت کے لئے تیار کررہے ہیں جنہیں دن رات انگریزی زبان سے سابقہ رہتا ہے — *

* Trubner, Am. and Oriental Literary Record, Oct. 1865.

اس سال انگریزی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں ۸۰ ہندی کتابوں کا ذکر ملتا ہے جو زیادہ تر برج بھاشا میں ہیں - اس کتاب کی تالیف میں ان سبھوں نے استفادہ دیا ہے - میری مراد ہے "History of the sect of maharajas or wallabhacharya in western India" سے جو علمی نقطۂ نظر سے یقیناً اعلیٰ پایے کی کتاب ہے - ہندوؤں کی مذہبی تاریخ اور فلسفے پر اس بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - ہمیں اس کا تو پہلے سے علم تھا کہ ہندی میں کتابوں کی بڑی تعداد ہر سال شائع ہوتی ہے - اس کتاب کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہندی کی بیسیوں کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہمیں مطلق کوئی علم نہیں - ہندوستان کے کتب‌خانوں نے اس باب میں اب تک کچھ نہیں کیا —

مسٹر Erskine کے کتب خانے میں بھی ہندی قلمی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ذخیرہ ہے جو کچھ عرصہ ہوا برٹش میوزیم نے حاصل کرلیا ہے - موصوف وہی ہیں جنھوں نے " تزک بابری " کا ترجمہ کیا ہے - مشہور مستشرق مسٹر Charles Rieu اس ذخیرہ کی ترتیب میں آج کل مشغول ہیں - کو اجی جہانگیر جن کو انگریز لوگ " نقدہ " (Ready money) کے نام سے پکارتے ہیں انھوں نے بھی بمبئی کی رائل ایشیا ٹک سوسائٹی کی شاخ کو ۲۹۲ کتب بطور عطیہ دی ہیں - اس ذخیرے میں بھی یقین ہے کہ ہندی کی کتابیں ہونگی (*) —

موصوف نے سکوں اور تمغوں کا ایک مجموعہ بھی دیا ہے - اس میں وہ سب روپے شامل ہیں جو مختلف زمانوں میں مغربی ہند میں رائج رہے ہیں - اس کے علاوہ پونا میں کالج قائم کرنے کے لئے ۵۰ ہزار روپے کی رقم بطور عطیہ دی ہے - اس کالج کا سنگ بنیاد گذشتہ سال ۹ اگست کو رکھا گیا —

اب میں ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے متعلق کچھ کہونگا اور یہ بتلاونگا کہ خود ہندوستانیوں نے مغربی علوم و فنون حاصل کرنے کی غرض سے جو انجمنیں بنائی ہیں وہ کیونکر چل رہی ہیں اور مغربی تہذیب و تمدن اور مسیحی مذہب کی نشرو اشاعت کا کیا حال ہے —

ہندوستانی انشاپرداز افسوس نے " آرائش محفل " میں یہ لکھا ہے (*) —

" ہندوستانیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے - وہ اس تعلیم کے فوائد سے باخبر نہیں " - وغیرہ - (†) —

ہندوستانیوں کے متعلق جو یہ تصویر کھینچی گئی ہے اس میں ممکن ہے کہ کچھ مبالغہ ہو - اس لئے کہ اہل مشرق کی تحریریں مبالغہ سے کبھی خالی نہیں ہوا کرتی ہیں - لیکن اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے - حکومت جس سرگرمی کے ساتھ مغربی علوم و فنون کو ہندوستان میں رواج دے رہی ہے اس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہو رہا ہے - چنانچہ اس تعلیم کی بدولت ہندؤں کی رسوم میں اصلاح ہو رہی ہے اور ان کے مذہبی رواج بھی بدلتے جاتے ہیں - ایسے رواج جو معاشرت کے لئے نقصان رساں تھے انہیں لوگ ترک کررھے ہیں - یہ تبدیلی پورے طور پر خارجی اثر سے نہیں پیدا ہوسکتی بلکہ اندرونی طور پر اس کا پیدا ہونا ضروری ہے جیسا کہ مسٹر جے - بی لارٹن کا خیال ہے : کلکتہ کی " برھمو سماج " مدراس کی " وید سماج " اور اسی طرح کی دوسری انجمنیں اس

* صفحہ ۴۰ - کلکتہ ایڈیشن ، عبارت کا فرانسیسی ترجمہ —

† مدراس میں موصوف نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا تھا - انڈین ڈیلی میل ۱۸ اگست سنہ ۱۸۷۵ ع —

کو پیش نظر رکھ کر قائم ہوئی ہیں کہ وحدت کی تعلیم دیں ، ہندؤں کو مذہب کو توہمات کی الائش سے پاک کریں ، نیچ ذات والوں کے ساتھ جو مذہبی فرق برتا جاتا ہے اسے دور کریں ، عقد بیوگان ، ایک بیوی سے عقد کرنے اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کی نشر و اشاعت کریں - چنانچہ اسی تحریک سے متاثر ہو کر ایک بنگالی نے ایک نوجوان بیوہ کے ساتھ عقد کیا - یہ بیوہ کش نگر کے مدرسہ کی ایک متعلمہ تھی - مقامی ہندو شرفا نے اس شادی کے موقع پر شرکت کی اور برھموسماج کے اصولوں کے مطابق سب رسمیں پوری کی گئیں - ہندوستانی اور یوروپین مذہبی جماعتیں آپس میں اپنی مطبوعات کا تبادلہ بھی کرتی ہیں - چنانچہ برھموسماج اور Calcutta Tract Society نے اس پر عمل کرنا شروع کردیا ہے —

پنجاب میں سرشتۂ تعلیم سنہ ۱۸۵۶ ع میں قائم ہوا جب کہ سرجان لارنس جو آج کل ہندوستان کے وائسرائے ہیں ، چیف کمشنر تھے - شورش عظیم کے باعث اس سرشتہ کی ترقی رک گئی لیکن اب امن و امان قائم ہونے کے بعد تعلیم کو فروغ شروع ہوگیا ہے - بایں ہمہ سنہ ۱۸۶۰ ع تک صرف ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ کی گئی (ورنیکلر مدارس) - اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کا خیال پیدا ہوا - سنہ ۱۸۶۰ ع سے برابر ایسے اضلاعی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے جہاں انگریزی اور ہندوستانی دونوں پہلو بہ پہلو سکھائی جاتی ہیں - اس وقت پنجاب میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو ہزار سات سو تیس ہے جن میں ۸۶ ہزار ، دو سو بانوے طلبہ تعلیم حاصل کررہے ہیں - بڑے سرکاری مدارس تین ہیں - لاہور ، امرتسر ، اور دہلی میں - ان مدارس سے کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان کے لئے طلبہ ہر سال

جاتے ھیں جن میں سے اکثر کامیاب رہتے ھیں ان مدارس کے علاوہ لاھور کا مشن اسکول بھی قابل ذکر ہے —

لاھور کے میڈیکل اسکول میں ایک کلاس انگریزوں کے لئے ہے اور دوسرا ھندوستانیوں کے لئے ۔ ثانی الذکر میں داخل ھونے کے لئے لازمی ہے کہ ھندوستانی زبان کا ایک امتحان میں کامیابی حاصل کی جائے ۔ اس امتحان میں فارسی رسم خط میں املا لکھنا ھوتی ہے —

میں ان مدارس کی تعلیم کے متعلق تفصیلات بیان کرسکتا ھوں اور یہ بھی بتلا سکتا ھوں کہ ان میں اساتذہ اور طلبہ کی تعداد کیا ہے لیکن ایسا کرنا غیر ضروری ہے اس واسطے کہ کپتان فلر (Fuller) کے ایک خطبہ میں یہ سب باتیں تفصیل سے موجود ھیں ۔ انھوں نے پنجاب کے ناظم سررشتۂ تعلیمات کی حیثیت سے جو حال ھی میں رپوٹ پیش کی ہے اس سے اس صوبہ کے ھندوستانیوں کی تعلیمی ترقی کا ایک خاکہ نظر کے سامنے آجاتا ہے ۔ اس رپوٹ سے ھندوستانی کی ترقی کا حال بھی معلوم ھوتا ہے * ۔ حکومت نے اس غرض کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا ہے کہ ھندوستانی زبان کی کتب لکھوائی جائیں ۔ اس سے معلوم ھوتا ہے کہ حکومت ھندوستانی زبان کی ترقی کے لئے کوشاں ہے † —

۱ جنوری کو لاھور میں جو دربار ھوا اس میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر

* دھلی کے نارمل اسکول میں سب طلبہ کے لئے ھندوستانی لازمی قرار دی گئی ہے ۔ مولوی خدا بخش ھندوستانی کی تعلیم دیتے ھیں ۔ کالی مسجد میں لڑکیوں کا جو مدرسہ ہے اس میں انجیل اردو میں پڑھائی جاتی ہے —

† Indian Mail 26 Dec. 1854.

سر آر مونٹگمری نے ہندوستانی میں تقریر کی، دوران تقریر میں آپ نے اس ترقی کا ذکر کیا۔ جو صوبہ پنجاب نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں کی ہے آپ نے بتلایا کہ اس وقت پنجاب میں لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۶۶۲ ہے اور ان میں ۱۳ ہزار سے زائد لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ اس موقع پر کپتان 'فلر' نے بھی ہندوستانی میں تقریر کی اور صوبہ کی تعلیمی ترقی کے متعلق نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ بعض ہندوستانیوں نے بھی تقاریر کیں اور تعلیم کو اپنے ہم ملکوں میں عام کرنے کے وعدے کئے —

ان ہندوستانی مستورات کو جو پردہ کے اندر زندگی بسر کرتی ہیں تعلیم سے بہرہ یاب کرنا بہت دشوار کام ہے۔ صرف عورتیں ہی یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ سال گزشتہ میں نے اس کے متعلق ذکر کیا تھا کہ بعض خواتین نے یہ کام شروع کردیا ہے*۔ Rev. J. Long نے انگریز خواتین سے اپیل کی ہے کہ وہ از راہ خدمت خلق یہ کام شروع کر دیں۔ ان میں جذبۂ حمیت پیدا کرنے کے لئے موصوف نے طبقۂ امرا کی روسی خواتین کی مثال پیش کی ہے کہ وہ اپنی رعایا کو خود تعلیم دینے میں اپنی ذلت نہیں سمجھتی ہیں —

۲۵ فروری کو لاہور میں ہندو اور مسلمان طلبہ کو انعام تقسیم کرنے کی غرض سے ایک جلسہ ہوا۔ یہ انعامات ان طلبہ کے لئے مخصوص تھے جو سرکاری مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ حلقۂ لاہور کے ناظر مدارس مسٹر 'الکزنڈر'، سرکاری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر 'ایٹنر' اور مسٹر 'کوپر' نے اس جلسہ میں شرکت کی تھی۔ ان تینوں نے ہندوستانی میں جلسہ کے روبرو

* دیکھو خطبہ۔ ۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ ع —

تقاریر کیں *—

بنارس میں مشن مدارس کے تقسیم انعامات کے جلسہ میں جہاں اور دوسرے طلبہ کو انعامات ملے وہاں ایک انعام ایک کم عمر بچہ کو دیا گیا جن سے وائسرائے کی آمد کے موقع پر ہندوستانی میں اشعار لکھے تھے † —

پہلی فروری کو آگرہ میں زرعی نمائش کے افتتاحی جلسہ میں وکٹوریہ کالج کے سکریٹری نے ہندوستانی میں تقریر کی تاکہ اس موقع پر جتنے ہندوستانی موجود تھے وہ سمجھ سکیں ‡ —

مسٹر ای ہاورڈ (E. Howard) نے صوبہ بمبئی کی نظامت تعلیمات سے علحدہ ہوتے وقت اس صوبے کی تعلیمی ترقی کے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے ۔ اس رپورٹ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اس وقت بمبئی کے صوبہ میں مدرسوں اور کالجوں کی تعداد ۹۵۴ ہے ۔ ان میں ۹۲ هزار طلبہ تعلیم پاتے هیں ۔ اس تعداد میں حکومت کے سرکاری مدارس شامل نہیں هیں ۔ جن میں طلبہ کی تعداد کم و بیش اسی قدر ہوگی ۔ سرکاری تعلیم گاهوں کی بدولت انگریزی زبان کی تعلیم لازمی طور پر بڑھ رهی هے ۔ اس کے ساتھ ساتھ هندوستانی ادب نیز ان دوسری زبانوں کو فروغ حاصل هورها هے جو مختلف صوبوں میں استعمال کی جاتی هیں ۔ ان مختلف زبانوں میں انگریزی کلاسک کتابوں کے ترجموں سے ترقی هورهی هے § —

* Punjab Educational Magazine 26th., Feb. 1865.

† Friend of India, 1st., Dec. 1864.

‡ Indian Mail, 15 March 1865.

§ Indian Mail, 28 Oct 1865.

بمبئی یونیورسٹی کی خوش حالی بدستور قائم ہے - پچھلے دسمبر کے مہینے میں ۲۴۱ اُمید واروں نے میٹریکولیشن کے امتحان میں شرکت کی - ان میں سے اکثر ہندو تھے - جملہ تعداد میں سے ۱۰۹ کامیاب ہوے —

ڈاکٹر برڈوڈ (Dr. Birdwood) کی وجہ سے جیسا کہ میں پچھلے سال کہہ چکا ہوں بمبئی میں عنقریب وکٹوریہ میوزیم قایم ہوجاے گا - اس میں شمالی ہند اور دکن کے نوادر رکھے جائیں گے- مدارس میں تو پہلے سے ایک عجائب گھر موجود ہے - لندن کے انڈیا ہاؤس میں وہ اشیاء بھیجی جائیں گی جن کے ہندوستانی عجائب خانوں میں دو نمونے ہوں گے —

لاہور کے " سرکاری اخبار " کی بدولت اودھ کی تعلیمی ترقی کے حالات مجھے معلوم ہوے - اودھ کو بارہ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے - اضلاع تحصیلوں میں تقسیم ہیں اور تحصیل دیہوں میں، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اودھ کے ہر ضلع میں بھی ایک ہائی اسکول ہے - ان مدارس میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ دو ہندوستانی پڑھانے والے ضرور ہوتے ہیں - ایک اُردو پڑھانے کے لئے اور دوسرا ہندی پڑھانے کے لئے- یہاں فارسی، سنسکرت ، انگریزی ، علوم صحیحہ ، تاریخ اور دوسرے مفید علوم کی تعلیم دی جاتی ہے- تعلیم ہندوستانی زبان میں دی جاتی ہے- ہاں اونچی جماعتوں میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے —

ڈاکٹر ایٹنر پرنسپل گورمنٹ کالج نے جو " انجمن اشاعت مطالب مفیدہ " لاہور میں قائم کی ہے اس کے سرپرست کپتان فلر (Fuller) ہیں- اس انجمن میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں- چنانچہ کوہ نور کے مدیر ہر سکھ راے اس انجمن کے سکریٹری ہیں - ان کے علاوہ اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانی اس انجمن کے رکن ہیں - ہندو لوگ اس انجمن کو " سکش سبھا " کے نام سے پکارتے ہیں - ہر روز اس انجمن کی اہمیت

اس کے کام کی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے - اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی ملحق ہے جس سے پبلک مستفید ہوسکتی ہے - اس انجمن کے سربراہوں کا خیال ہے کہ ادبی اور معاشری مسائل پر کتابیں شائع کرائیں - اس انجمن کی پنجاب کے اور دوسرے شہروں میں بھی شاخیں موجود ہیں - پہلی اکتوبر سے اس انجمن کے زیر اہتمام اردو میں تقاریر کرائی جاتی ہیں - ان تقاریر کے موضوع بالعموم عام دلچسپی کے ہوتے ہیں - ڈاکٹر لیٹنر کا خیال ہے کہ لاہور میں ایک یونیورسٹی قایم کریں گے جس کا دستورالعمل بہت وسیع اور آزاد اصول پر مبنی ہوگا - اس یونیورسٹی کا نصب العین یہ ہوگا کہ ہندوستانی لوگوں میں علوم و فنون کو رواج دیا جائے ہندوستانی ادبیات کو فروغ دینے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور کوشش یہ کی جائے کہ ایک جدید ادب اس زبان میں وجود میں آئے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے موصوف نے ایک سرمایہ جمع کر لیا ہے - اس سرمایہ سے ان طلبہ کو انعامات دئے جائیں گے جو اردو ، ہندی ، فارسی، سنسکرت یا عربی میں نمایاں کامیابی حاصل کریں گے - موصوف نے اپنی اس اسکیم کے متعلق مولانہ عمل اردو میں تیار کیا ہے وہ اس وقت میرے پیش نظر ہے - لاہور کے بعض روساء موصوف کی ہمت افزائی کر رہے ہیں - چنانچہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر مک لیود (Mc Leod) نے جو خود مستشرق ہیں اور علوم مشرقیہ کے قدردانوں میں ہیں ، سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ حکام کو مجوزہ علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی کے متعلق ایک مراسلہ بھیجا ہے * —

انجمن لاہور کے اجلاس کا ذکر " سرکاری اخبار " " کوہ نور " اور دوسرے ہندوستانی اخباروں میں ملتا ہے ۲۱ جنوری کو اس انجمن کا افتتاحی جلسہ

* Times of India , 28 Oct. 1865.

ہوا تھا جس میں ڈاکٹر لیٹنر اور پنڈت من پھول نے اظہار خیال کرتے وقت کہا کہ یہ علمی مجلس عوام کی خدمت کی غرض سے قایم کی گئی ہے۔ اس کا مقصد تھام یہ ہے کہ عوام کی حالت کو سدھارے۔ یہ انجمن ان لوگوں کو بھی جو اپنے تئیں تعلیم یافتہ خیال کرتے ہیں روشن خیالی اپنا فرض سمجھتی ہے —

اس انجمن کے قواعد و ضوابط جو اردو میں شائع ہوے ہیں ان پر اخبارات میں تنقیدیں ہوئی ہیں۔ وہ تنقیدیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں —

اس انجمن کی ایک اشاعت بابو نوین چندر کا مضمون ہے جو انھوں نے اس موضوع پر لکھا ہے کہ پنجاب میں ہندی کی ترقی کی کوشش کرنی چاہئیے۔ بابو صاحب نے یہ بتلایا ہے کہ ہم لوگ جس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ترقی کا زمانہ ہے۔ ہر قوم تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوشاں ہے۔ ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ متحدہ سعی و جہد سے اپنے تمدن اور اپنی ادبیات کو فروغ دیں۔ ہمیں مغربی علوم و فلسفہ کی کتابوں اور سنسکرت کی قدیم کتابوں کو ہندی میں ترجمہ کرنا چاہئیے۔ مسلمانوں کو بھی اردو کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ ہندی کے حقوق کو فراموش نہ کرنا چاہئیے۔ اردو اور ہندی جڑواں بہنیں ہیں۔ ہمیں ان دونوں کی ترقی کے لئے بیک وقت کوشش کرنا چاہئیے —

اسی قسم کی ایک انجمن روہیلکھنڈ کے علاقہ کے لئے بریلی میں قایم ہوئی ہے میرٹھہ کے اخبار "اخبار عالم" میں اس انجمن کے متعلق حالات نکلتے ہیں۔ اس انجمن کا اصلی مقصد جدید علوم کو ہندوستانیوں میں رواج دینا ہے۔ چنانچہ یہ انجمن عام دلچسپی کی کتابیں شائع کر رہی

ہے اس انجمن کی حتی‌المقدور یہ کوشش ہے کہ خود ہندوستانی لوگ ان کتابوں کو لکھیں۔ انجمن انہیں اس کا معاوضہ دیتی ہے اور ان کی اشاعت کا پورا انتظام کرتی ہے۔ انجمن کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ اردو زبان میں خطابت اور بلاغت کو ترقی دی جاے اور اس زبان کي جو خصوصیت ہے یعنی مطالب کو صفائی کے ساتھہ ادا کرنے سے اور اجاگر کیا جاے۔ اس سے یہ ہوگا کہ زبان میں نزاکت اور لطف دکھنا ہوجاے گا۔ اور اس زبان میں گفتگو کرنا شائستگی کی علامت تصور کیا جاے گا۔ اس کے علاوہ انجمن مغربی علوم و فنون کی کتابوں کا ہندوستانی (اردو - ہندی) میں ترجمہ کراے گی اور انجمن جن ترجموں کو قبول کرے گی۔ اُس کا معاوضہ ادا کرے گی صوبجات شمالی مغربی یا ہندوستان کے کسی اور گوشہ کا باشندہ علمی کتب کا ترجمہ اس انجمن میں پیش کرسکتا ہے۔ انجمن اس ترجمہ کو دیکھے گی کہ آیا واقعی وہ اس کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اگر ترجمہ قابل قبول ہے تو اس کی طباعت کا انتظام کیا جائے گا۔ انجمن کی تنظیم حسب ذیل ہے۔ ایک کمیٹی ہے جو اپنا صدر، نائب صدر معتمد اور خزانہ دار منتخب کرتی ہے۔ انجمن کے معمولی ارکان کی تعداد غیر محدود ہے۔ اس کا چندہ چوبیس روپے سالانہ ہے۔ کمیٹی کے ارکان زیادہ تر ہندو اور مسلمان امراء ہیں۔ ان کے علاوہ بریلی اور روھیلکھنڈ کے دوسرے حصوں کے اہل علم و فضل بھی اس میں شریک ہیں۔ مہینہ میں ایک مرتبہ کمیٹی کا جلسہ ہوتا ہے —

انجمن کا ارادہ ہے کہ ایک ماہوار ادبی رسالہ جاری کیا جاے۔ انجمن کا معتمد اس رسالہ کا نگران ہوگا۔ ہر سال انجمن اپنا ایک عام جلسہ منعقد کرے گی جس میں انجمن کی سال بھر کی سرگرمیوں کا حال ایک رپورٹ کے ذریعہ جو اردو میں لکھی جاے گی، پیش کیا جاے گا —

چند سال کا عرصہ ہوا کہ بدایوں نے بعض راجہ اور امراء کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ ہندوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جو مہمل رسوم برتی جاتی ہیں اور جو بے کار جشن منائے جاتے ہیں انہیں کس طرح ترک کرنا چاہئے - فتح گڑہ کے بابو ایشوری داس نے ان مسائل کے متعلق ایک مضمون پڑھا - موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں - ان کا نام ہندووں کا سا ہے لیکن انھوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا ہے —

حضرات! پچھلے سال میں نے کلکتہ کی ادبی انجمن کا ذکر کیا تھا * جس کے بانی اردو زبان کے مشہور مصنف اور انشا پرداز سید احمد ہیں † جنھوں نے انجیل کی شرح لکھی ہے - موصوف کی حیثیت مسلمانوں میں وہی ہے جو آج سے چالیس سال قبل رام موہن رائے کی ہندووں میں تھی - موصوف کے جوش اور خلوص کی بدولت انجمن ترقی کر رہی ہے - اس کام میں مولوی عبداللطیف اور بعض انگریز ان کی مدد کر رہے ہیں - ہماری پوری توقع ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس انجمن سے بہت فائدہ پہنچے گا جن کی تعداد اس وقت ۲ کروڑ سے زیادہ ہے - اس انجمن کی بدولت ان مسلمانوں کے لئے جو تاج برطانیہ کے سایہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں یہ ممکن ہو گا کہ اس عظیم‌الشان تعلیمی تحریک میں شرکت کرسکیں جو اس وقت بنگال میں اپنے اثرات دکھا رہی ہے - اس انجمن کا مقصد بھی یہ ہے کہ قومی

* قسطنطنیہ میں بھی اس قسم کی ایک ادبی انجمن قایم کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے کئے جائیں سلطان اس انجمن کو سالانہ ۲ لاکھ ۵۰ ہزار فرانک دیتے ہیں —

† سر سید احمد خان مرحوم —

ادبیات کو فروغ دیا جائے۔ انجمن نے ۲ ہزار روپے کے انعامات ان کے لئے مقرر کئے ہیں جو اردو میں مندرجہ ذیل موضوعوں پر مضامین لکھیں گے حیات اورنگ زیب، ہندو مسلمان، انجن اور اس کے کل پرزے: مطبع کی تاریخ اور تمدن پر اس کے اثرات۔ ۱۶ اگست کو اس انجمن کا [illegible] اسہ علیگڑہ میں ہوا۔ اس جلسہ میں یہ طے پایا کہ انجمن کی اپنی ایک عمارت ہونی چاہئے جس کے لئے کتابیں فراہم کرنی چاہئیں اور سائنس کے آلات منگانے چاہئیں۔ اس انجمن کی سرپرستی بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے قبول فرما لی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی اس انجمن کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے —

اس انجمن کے ایک پچھلے جلسہ میں مولوی عبداللہ نے سلطنت روما کی ابتدا اور اس کے استحکام پر ایک مضمون پڑھا۔ مولوی عبدالرؤف نے لندن اور اس کے نواح پر ایک مضمون پڑھا۔ اس موضوع پر متعدد ہندوستانی سیاحوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ شمشیر نے "شگرف نامۂ ولایت" اور کریم خاں نے "سیاحت نامہ" میں لندن کے حالات بیان کئے ہیں۔ یورپین لوگوں میں جنہوں نے اس انجمن کے مقاصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے سر چارلس ٹریولین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب موصوف کلکتہ سے ولایت واپس جارہے تھے تو اس انجمن کے ارکان کی طرف سے ایک الوداعی ایڈریس پیش کیا گیا جس میں اس خیال کو ظاہر کیا گیا کہ ان کے ولایت جانے سے اس انجمن کا ایک عملی معاون کم ہوگیا —

کیا اچھا ہو اگر ہندوستان جلد نسل سے بت پرستی کی لعنت دور

Indian Mail 6 jan 1861

ہوجائے - کلکتہ کے مہا پادری Reginald Heber نے پچاس سال کا عرصہ ہوا جب یہ اشعار لکھے تھے :-

خدا نے اپنے لطف و کرم کو بیکار فیاضی کے ساتھہ اس
جگہ صرف کیا جہاں کی حالت یہ ہے کہ بت‌پرست لوگ
چوب و سنگ کے آگے اپنا سر نیاز خم کرتے ہیں "

ہمیں پوری امید ہے کہ مسیحی مبلغین سے ہندوستان میں بلکہ سارے عالم میں زبور کے اس سرود عارفانہ کی تصدیق ہوگی —

" خدا مشرکوں کو زیر کرے گا - وہ اپنے مقدس تخت
پر جلوہ افروز ہے " *

اگر ہندوستانی مسیحیت کی پر اسرار کشتی پر سوار ہوجائیں تو وہ نجات کے گھاٹ اتر سکتے ہیں - اس کشتی میں انہیں عافیت نصیب ہوسکتی ہے اگر وہ مسیحی دین قبول کر لیں تو یوں سمجھو جیسے انھوں نے صداقت کے کھمبے کو پکڑ لیا جو اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہلتا —

ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کو زیادہ کامیابی اب تک نہیں حاصل ہوئی - لیکن بعض مسلمانوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے مسیحی مذہب کی تعلیم کو قبول کر لیا ہے - ناگپور کے ناظر مدارس نے جن کا نام مولوی صفدر علی ناگپوری ہے ؛ ابھی حال میں مسیحی دین قبول کیا ہے - موصوف نے مسیحی کتابوں کو پڑھکر خود بخود مذہب تبدیل کر لیا - ان کے اثر سے ایک اور مسلمان عیسائی ہوگیا جو ان کے ماتحت اسکول میں مدرس تھا - ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ٥١٥ مبلغین مسیحیت کام کر رہے ہیں ان میں انگلیکن (Anglicans) اور دوسرے غیر کیتھولک شامل

*Ps. × h vII, 9 verse.

هیں * همارے خیال میں کیتھولک مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ هوگی اس لئے که اس وقت هندوستان میں کم و بیش دس لاکھ کیتھولک موجود هیں ۰ —

مسیحی مبلغین اپنا مذهبی جوش میلوں کے موقع پر ظاهر کرتے هیں - هندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگالیتے هیں - تقریریں اور وعظ کرتے هیں رسالے تقسیم کرتے هیں وغیرہ وغیرہ - چنانچه پچھلے دنوں ۲۸ جنوری الہ آباد میں میلے کے موقع پر کوئی ۷۰ هزار نفوس جمع هوئے تھے - اس میلے میں ان مبلغوں نے بڑی سرگرمی سے کام کیا —

۲۱ دسمبر کو بمبئی کے مہاپادری نے ۹ کم عمر هندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی رسم ادا کی - ان میں دو مسلمان هیں ' ایک پارسی هے ' ایک تاملی هے ' چار مرهٹے هیں ' اور ایک اودہ کا هندو هے - ان کے علاوہ دس لڑکیاں بھی مسیحی دین کے حلقه میں داخل هوئیں ان میں سے دو مسلمان هیں ' اور باقی سب هندو هیں - ان میں ایک لڑکی برهمن هے - مہاپادری نے اپنی تقریر هندوستانی میں کی اور بعد میں مرهٹی میں اس واسطے که اس علاقه میں یہی زبان بولی جاتی هے ‡ —

اس سال ۹ اپریل کو کلکته کے مہاپادری نے امرتسر میں ۴۰ هندوستانیوں کو مشرف به مسیحیت کیا - اس موقع پر جو مذهبی رسم ادا کی گئی اس میں موصوف نے بلا تکلف هندوستانی زبان میں تقریر کی - اس تقریر میں الفاظ اور محاوروں کا استعمال اس قدر صحیح تھا که جو هندوستانی اس

---

* "Church Missionary Intelligencer

" India its nations and mission " by Rev. G. Trever.

‡ Indian Mail 8 Feb 1865

وقت موجود تھے وہ سب بہت متاثر ہوئے - موصوف نے اپنی تقریر میں اس موقع کی اہمیت کو سامعین کے روبرو واضح کیا —

اس کے کچھہ عرصہ بعد موصوف نے ایک نوجوان کو جو هندوستانی زبان بخوبی جانتا تھا اور اب تک بچوں اور نو مسیحیوں کو " سوال و جواب " کی مشق کراتا تھا (Catechist) کلکتہ کے شمالی محلوں کے لئے پاسٹر (Pastor) مقرر کردیا ہے - ان محلوں میں زیادہ تر انگریز یورشین اور پرتگیزی آباد ہیں —

اب هم ان کی طرف توجہ کرتے هیں جنہوں نے اس سال داعی اجل کو لبیک کہا - سب سے پہلے ڈاکٹر Falconer کا میں ذکر کرنا چاهتا هوں کوئی دس سال کا عرصہ هوا جب وہ هندوستان سے تازہ تازہ واپس هوتے تھے اس وقت میری ان سے ملاقات هوئی تھی - موصوف هندوستانی زبان بلا تکلف بولتے تھے - میں بھی ان کے ساتھہ هندوستانی میں گفتگو کرتا تھا - میں پہلی مرتبہ جب ان سے ملا تھا تو اس وقت ان کے همراہ (M. P. de Cavardie) بھی تھے جو هندوستانی بولنا جانتے هیں - انھوں نے یہ مشق پانڈیچری کے دوران قیام میں کی ہے —

اس سال Hugh Falconer کا لندن میں ۳۱ جنوری کو انتقال هو گیا - آپ کلکتہ کے سرکاری باغ کے سپرنٹنڈنٹ رہ چکے تھے - آپ ویلز میں پیدا هوئے تھے - ۵۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کرگئے - پبلک میں آپ کا نام زیادہ مشہور نہیں هوا لیکن لندن کے علمی حلقوں میں آپ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - آپ سنہ ۱۸۳۰ ع میں هندوستان پہلی مرتبہ گئے اور اپنی عمر کے بہترین بیس سال اسی ملک کی خدمت میں صرف کئے - آپ علم نباتات و حیوانات کے ماهر تھے اور خاص کرکے Paleonthology میں

آپ کی میرے حال پر بڑی عنایت تھی - چنانچه هندوستانی کے متعدد قلمی نسخوں کی نقلیں آپ کی مدد سے میں نے کرائی تھیں ۔ آپ کے "دبستان مذاهب" کے انگریزی ترجمے کی تکمیل کی جسے Shea نے شروع کیا تھا - "راج ترنگنی" کا بھی انگریزی ترجمه آپ نے ختم کیا - اس کتاب کو کشمیر کی تاریخ سمجھنا چاهئیے - اس کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین پیرس کے Journal Asiatique میں نکلتے رہے هیں —

Edward Place Stevenson کا بمبئی میں ۴۵ سال کی عمر میں ۲۱ جون کو انتقال هوا - آپ Deccan Herald کے مدیر رہ چکے تھے ۔ اس کے بعد Elphinston Institution کی مرکزی تعلیم گاہ کے صدر مدرس هوگئے تھے - آخر میں احمد آباد کالج کی پرنسپلی انھیں تفویض کی گئی ۔ آپ کی موت پر علم اور احباب دونوں نے ماتم کیا —

۱۳ اگست ایک اور مشهور مستشرق هم میں سے اُٹھ گیا - میری مراد Alexander kinloch Forbes سے هے جنھیں Justice Forbes بھی کہتے تھے آپ کا پونا میں انتقال هوا - رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی کی شاخ کے آپ نائب صدر رہ چکے تھے اور بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے - هندوستانی سے آپ کا تعلق ضمنی رها لیکن گجراتی کی ترقی میں آپ نے بہت کوشش کی چنانچه گجراتی زبان کو فروغ دینے کی غرض سے آپ نے اپنی صدارت میں ایک انجمن قایم کی اور تاریخ اور ادب العوام جیسے گیت وغیرہ جمع کئے ۔ آپ کی کتاب "رس مالا" گجرات کے لئے وهی نوعیت رکھتی هے جو کرنل ٹوڈ کی کتاب راجپوتانے کے لئے هے - آپ کے انتقال پر ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی صدر Rev. Dr. Wilson نے ۱۴ ستمبر کے اجلاس میں آپ کے علمی کارنامے ایک ایک کر کے گنائے اور بتلایا که آپ کی زندگی نہایت بھرپور رهی - آپ نے یه بھی کہا که

Forbes کا نام ہندوستان میں لوگوں کو بہت عزیز ہے Sir Charles Forbes اور Duncan Forbes کے ناموں کے علاوہ James Forbes کا ذکر کیا جو "Oriental Memiors" کے مصنف ہیں اور Compte de Montalembat کے رشتہ میں دادا ہوتے ہیں—

۱۷ نومبر لندن کے قریب David Lister Richardson کا ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ آپ کلکتہ کے Hindou Metropolitan College کے پرنسپل رہ چکے تھے سنہ ۱۸۵۷ ع میں آپ ہندوستان سے ولایت چلے آئے تھے اور Court Circular کی ادارت قبول کرلی تھی بعد میں Allen's Indian Mail کے مدیر ہوگئے تھے جس کی معلومات سے میں اپنے لکچروں کے لئے ہمیشہ استفادہ کیا کرتا ہوں۔ آپ نے لارڈ 'میکالے' کے ساتھ ہندوستانیوں میں مغربی علوم و فنون کو رواج دینے کے لئے بہت جد و جہد کی تھی۔ اس کے علاوہ آپ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی چوٹی کے لوگوں میں سمجھے جاتے تھے—

میں ان مرنے والوں کا ذکر ایک مشہور ہندو کے انتقال کے حالات بیان کرکے ختم کرتا ہوں۔ میری مراد جگن ناتھ 'شنکر سیٹھ' سے ہے جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے 'بمبئی' کے شہریوں نے یہ تجویز کی ہے کہ ان کا ایک مجسمہ شہر میں نصب کیا جائے۔ آپ الفنسٹن کالج کے بانیوں میں سے تھے اور مغربی ہند میں تعلیمی تحریک کے روح رواں تھے۔ اس کے علاوہ آپ "انجمن زرعی" کے بھی صدر رہ چکے تھے۔ مرنے سے کچھ قبل آپ نے خواہش ظاہر کی کہ بھگوت گیتا پڑھی جائے' اپنے مکان سے پیدل برہنہ پا باہر آئے برہمن کانپنے لگے کھڑے تھے۔ انہوں نے "گجندر مکشا" پڑھنا شروع کی جو "بھگوت پران" کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد 'وشنو' کے ایک ہزار ناموں کا ورد کیا

گیا - اس کے بعد وہ جا کر لیٹے اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ مرنے سے کچھ پہلے ان کے جسم پر گنگا جل چھڑک دیا گیا تھا - جب جنازہ سرگھٹ کو جانے لگا تو ان کا بیٹا ننگے سر اور ننگے پیر اس کے ساتھ تھا - اس کے ہاتھ میں آگ تھی جس کو وہ اپنے باپ کی نعش جلانے کے لئے لئے جا رہا تھا - ساتھ میں سناروں کی جاتی کے کوئی پانچ سو لوگ تھے - راستہ میں غریب غرباء کو پانچ سو روپے تقسیم کئے گئے - نعش جلانے کے لئے صندل کی لکڑی ' تلسی اور بلوا استعمال کئے گئے جب نعش جل چکی تو دودھ سے آگ بجھائی گئی اور ہر شخص نے اپنے گھر واپس آکر اشنان کیا —

یہ سچ ہے کہ اس قسم کی رسومات کی بدولت یورپ اور ہندوستان میں بہت فرق ہے - لیکن دخانی جہازوں نے اور تار برقی نے ان دونوں ملکوں کے فاصلے بہت کم کردئے ہیں - اہل یورپ تجارت اور سیر سیاحت کی غرض سے ہندوستان جاتے ہیں اور اہل ہند بھی یورپ آنے لگے ہیں - اس سال ہندوستان کی سیاحت کے لئے Duke of Barleant اور شہزادہ فریڈرک آف ہالسیئن گئے تھے - ثانی الذکر سنسکرت اور ہندوستانی زبان جانتے ہیں اور ' پیرس ' اور ' لندن ' میں باقاعدہ ان السنہ کی تحصیل کرچکے ہیں - ہندوستان سے آنے والوں میں نواب اقبال الدولہ بہادر شہزادۂ اودھ کا نام قابل ذکر ہے - * میں ایڈورڈ ایچ پامر کے ساتھ آپ سے

---

* آپ شمس الدولہ کے پوتے اور غازی الدین حیدر کے بھائی ہیں جنہوں نے فارسی لغت " ہفت قلزم " لکھی تھی - آپ بھی ایک کتاب کے مصنف ہیں جس کا نام " اقبال فرنگ " ہے —

ملنے گیا تھا اور ہندوستانی میں آپ سے بہت دیر تک گفتگو رہی -
میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ ایڈورڈ ' ایچ ' پامر ہندوستانی زبان میں
اظہار خیال پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور ہندوستانیوں کی قومی زبان میں
انہوں نے مہارت بہم پہنچالی ہے ۔ " قومی زبان " میں نے اس لئے کہا کہ
اہل ہند ایک قوم ہیں جیسا کہ کلکتہ کے Urdu Guide نے اپنی حال کی
اشاعت میں لکھا ہے - انگریزی حکومت ہندوستانی میں جو تعلیم دے رہی ہے
اس سے ہندوستان کے مختلف عناصر میں اتحاد پیدا ہوگا - ادھر مغربی تہذیب
و تمدن کی بدولت مذہبی تعصب کم ہو رہا ہے غرض کہ انگلستان حتی المقدور
ہر ممکن کوشش کررہا ہے اہل ہند ترقی کی راہ پر گامزن ہوں ۔ بقول
بائرن انگلستان چاہتا ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لے اور انھیں اپنے
ساتھ وابستہ کرے —

> " دشمن کے دل کو موہ لینا اس پر فتح حاصل کرنے سے
> زیادہ اچھا ہے - فتح سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن فوری
> نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن اگر دشمن کے دل کو رام
> کر لیا تو اس کے دل سے ہمیشہ کے لئے بدی نکل
> جاتی ہے " —

—— • ——

ابسن اور اُس کی تصانیف

(۲)

از

[جناب عبدالشکور صاحب ایم ۰ اے ۰ بی ۰ تی (علیگ)

لکچرر شاسٹری کالج ۰ ڈربن ۰ جنوبی افریقہ]

سنہ ۱۸۶۸ ع کے قریب ' ابسن کی وضع قطع میں ایک انقلاب پیدا هوا ۔ یہ کایا پلٹ ایسی حیرت انگیز تھی کہ اس کے دوست بھی کچھ نہ سمجھ سکے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے ' اب تک ' ابسن کی ڈاڑھی بہت لمبی ' گھنی اور بے ڈھنگی تھی ۔ اُس کا لباس همیشہ بے ترتیب اور بے تکا هوتا تھا ' ٹائی کی گرہ ' اور کالر کی درستی کا وہ کبھی احسان مند نہ هوا ' کوٹ اور پتلون پر اکثر میل جما هوتا تھا ' مگر اب یہ حالت تھی کہ وہ مخمل کا فراک کوٹ ' سفید صدری ' کلف دار گریباں کی قمیص پہنتا تھا اور سفید بوٹائی لگاتا تھا ' اور داڑھی کی کتر بیونت میں بھی خاصا اهتمام کرتا تھا ۔ سنہ ۱۸۶۹ ع میں اس کمیٹی کا ممبر منتخب هوا جو ناروے ' سویڈن اور ڈنمارک کی زبانوں کی اصلاح کے لئے بنائی گئی تھی ' سویڈن کے پائے تخت کے لوگوں نے ابسن کو بڑے تعجب کی نظر سے دیکھا ' اُن کا خیال تھا کے بریلنڈ کا مصنف کوئی بوڑھا ' کھوسٹ ' گوشہ نشیں '

عزلت گزیں ہوگا ' مگر ابسن جوانوں کی شان سے طرح دار لباس پہنے نمودار ہوا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی - اس وقت وہ بہت مہذب ' خوش سلیقہ ' خوش پوش نظر آتا تھا ' اس کی باتوں میں ظرافت کی چاشنی تھی اس کے لب و لہجے میں دلکشی تھی اور اس کے انداز میں رعنائی کا عنصر غالب تھا - اسی زمانہ میں ایک دن شاہ چارلس نے ابسن کو تھیٹر میں اپنے پاس شاہی نشست گاہ میں بلاکر بٹھایا اور دوسرے روز شاہی محل میں مدعو کرکے گستاف واسا (Gustava Wasa) کے تمغہ سے سر فراز کیا - انہیں دنوں اُسے ایک اور عزت حاصل ہوئی ' وہ ناروے کے نمایندے کی حیثیت سے نہر سوئیز کے افتتاح کی رسم میں بھیجا گیا - مصر میں اُسے ابوالہول کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر اس نے پیئر گنٹ میں کیا ہے - دریاے نیل کا سفر کرکے اور مصر کے عجائبات دیکھ کر وہ واپسی میں پیرس پہنچا ' اور کچھ عرصہ اس تاریخی شہر کے آرٹ کے نمونے دیکھنے میں مصروف رہا - اس مہم میں اُسے خدیو مصر کی جانب سے تمغۂ مجیدیہ عطا ہوا - ابسن کی بڑی آرزو یہہ تھی کہ ڈنمارک کی حکومت کی جانب سے اُسے کوئی اعزاز حاصل ہو ' یہ آرزو پوری ہوئی اور وہ سلسلۂ ڈینبروگ کا نائٹ بنایا گیا —

اس سر فرازی پر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ' کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اب میری تصانیف کی قدر میرے ملک میں پہلے سے زیادہ ہوگی —

اُس زمانے میں شمالی یورپ کا ایک بڑا ادیب اور نقاد برینڈز (B‥ndes) میونک (Munich) ہوتا ہوا ڈریسڈن پہنچا ' اُس نے ابسن کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے :—

" ابسن کی صورت میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں -
جو اُس کے کلام میں نمایاں ہیں ' اس کے چہرے کی ٹھنڈی
سنجیدگی اُس رقت قلب اور محبت کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتی
ہے جس سے اُس کا دل لبریز ہے ' ابسن مضبوط اور توانا ہے '
اُس کا لباس نفاست اور خوش مذاقی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے '
اس کی رفتار دھیمی ' اس کا انداز بیاری بھر کم ہے اور اس کی '
حرکات و سکنات میں وقار و تمکین کی شان نظر آتی ہے '
اس کا سر بڑا ' اور سڈول ہے ' اُس کے بال لانبے اور گھنے ہیں اور اب
سفید ہو چلے ہیں ' اُس کی پیشانی جو چہرہ کو گھیرے ہوے
ہے بلند اور کشادہ ہے ' اور پاکیزہ خیالات کا خزانہ معلوم
ہوتی ہے - جب وہ خاموش ہوتا ہے تو اس کا منہہ کچھہ اس
طرح بند ہو جاتا ہے جیسے کسی نے ہونٹوں کو سی دیا ہو -
مجلس میں ابسن بسا اوقات ساکت و صامت بیٹھا رہتا ہے '
اور کبھی کبھی اس پر ایسی محویت طاری ہوتی ہے کہ گویا
وہ اپنی روح کے مندر کا پجاری ہے " -

ابسن کے ڈراموں میں انسان کی خودی (Self) پر بہت زور دیا
گیا ہے ' برینڈ اور پیئرگنٹ میں فاضل مصنف نے خودی کے دو جدا گانہ
پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے - برینڈ کی شخصیت ایک طاقتور چٹان کے
مانند ہے - دنیا کی ساری چیزیں جو برینڈ کو عزیز ہوسکتی ہیں اس
چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں - ابسن برینڈ کی خوفناک سختیوں
و تلخیوں سے اپنے اہل وطن کے لئے تازیانۂ عبرت کا کام لیتا ہے اس کے
بر خلاف پیئر کا اصول تو یہ ہے کہ انسان اپنی قانون پر

کاربند ہو سکر عملا وہ اپنے نفس کی ہر خواہش کو رندانہ اور غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے پورا کرتا ہے ' گویا پیئر ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ابسن نے اپنے ملک والوں کو ان کی کمزوریوں کی تصویر دکھادی ' ان دونوں ڈراموں کو غور سے پڑھئے تو آپ کو اس ہیجان اور بے اطمینانی کا پتہ چل جائے کا جو ابسن کے دل و دماغ پر اس وقت طاری تھی ' وہ خود یہ نہ جانتا تھا کہ نظام عالم میں قوت ارادی اور شخصیت کو کیا جگہ دینا چاہئے ' ایک شخصیت اپنے کڑے اصولوں سے انسان کو تنہا کرکے چھوڑتی ہے ' دوسری سر سبز ہوتی ہے لیکن حیات کی ہر منزل پر ایک نیا سوانگ بھرتی ہے ' اور موت کے سامنے آکر بمنزلہ صفر رہ جاتی ہے ۔ برنارڈ شا کا خیال ہے کہ اگر سنہ ۱۸۶۷ میں ابسن مر جاتا تو گویا وہ خود اپنا مدعا سمجھے بغیر دنیا سے رخصت ہوتا ' اس موقعہ پر شا نے ایک نہایت دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے جسے ہم ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں —

شا کہتے ہیں کہ شاعر جو کچھہ صفحۂ قرطاس پر لکھتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ خود اُسے پوری طرح سمجھہ بھی لے ' اور دوسروں کو سمجھا بھی سکے ' اس کے معنے یہ ہوئے کہ شاعرانہ الہام کی بلاغت بعض وقت شاعر کے فہم و ادراک سے بالا تر ہوتی ہے ' اور اس لئے اس کے کلام کی تحلیل کر کے اس سے اُس کا مفہوم دریافت کرنا ایک نہایت غیر شاعرانہ حرکت ہے ' ورڈسورتھہ کے الفاظ " ہم چیر پھاڑ کے شوق میں (شعر) کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں " اور فارسی کا مشہور فقرہ " شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد " اسی غیر شاعرانہ تحلیل کی جانب اشارہ کرتے ہیں ' چنانچہ برینڈ اور پیئر گنٹ کی تصنیف کے بعد ابسن اس غور و فکر میں ڈوبا ہوا

نظر آتا ہے کہ آخر یہ میں لکھا گیا ' چنانچہ " شہنشاہ جولین " صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتا ہے ' اور ابسن وثنیت * و عیسائیت کا ایک مرکب طیار کر کے دنیا کے امراض کا مداوا پیش کرتا ہے ' ابسن کے دل میں کفر و عیسائیت کی جنگ مدت سے چھڑی ہوئی تھی ' مگر اس کی تسکین نہ اس سے ہو سکتی تھی نہ اُس سے ' وہ وثنیت سے بھی اُسی قدر خائف اور ہراساں ہے جس قدر عیسائیت سے بد دل اور نالاں ہے ' اس لئے ' ابسن جولین کی آڑ میں ایک تیسری سلطنت کی تعمیر میں مصروف ہوتا ہے ' جہاں انسان کے افعال کا معیار نہ رسم و رواج ہوگا ' اور نہ عقاید و روایات ' بلکہ خود اُس کا اندرونی احساس شرافت ۔ جہاں خدا کی تلاش میں نہ وادی سینا میں جانا ہوگا ' اور نہ کوہ اُلمپس پر ' بلکہ خدا خود حواس ' قوت ارادی ' اور روح کے قریب آجائے گا ۔ ابسن کی نظر میں دو چیزیں ہیں ' ایک تو عیسائیت کا جذبہ قربانی و ایثار ' اور دوسرے یونان کی آزادی روح ' وہ ان دونوں کو متحد کرنا چاہتا ہے ' اور ان کے امتزاج سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کا آرزو مند ہے —

" شہنشاہ اور گلیلی † " کا ڈراما دو حصوں پر مشتمل ہے ' پہلے حصہ کا نام " قیصر کا ارتداد " ‡ ہے ' اور اس کے پانچ ایکٹ ۱۵۵ صفحات پر پھیلے ہوے ہیں ' دوسرے کا نام ہے شہنشاہ جولین ' اور اس کے پانچ ایکٹ ۳۰۳ صفحہ تک چلے گئے ہیں ' ڈراما میں مذہب ' فلسفہ ' اور مابعدالطبیعات تینوں کا رنگ موجود ہے ' لیکن یہ چیزیں سطحی ہیں ' کہیں گہرائی

* Heatheniesm. † Emperor and Galilean.

‡ Caeser's Apostacy.

نہیں پائی جاتی ' ڈراما کی داستان میں یہ روانی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُبل رہا ہے ' مختلف منظروں میں اشخاص اور واقعات اُمڈے چلے آتے ہیں ' لیکن ڈراما دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اسٹیج کے لئے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ پڑھنے کے لئے ۔ یہ واضح رہے کہ یہ ابسن کا شاہکار نہیں ہے ' بلکہ محض تعلیم و تبلیغ کا ایک ذریعہ ہے ۔ اس لئے اس میں آرٹ کی اعلیٰ خوبیوں کو تلاش کرنا بے سود ہے یوں تو " گڑیا کا گھر " بھی ایک خاص درس کا حامل ہے ' لیکن اس ڈراما میں مذہب اور فلسفے کے مسائل پر بہت زور دیا گیا ہے —

پہلے حصے کا پہلا ایکٹ قسطنطنیہ میں شروع ہوتا ہے ' ایسٹر کی رات ہے ' شاہی محل کے قریب شاہی گرجا نظر آرہا ہے ' سرو کے درختوں کی قطاروں میں سے ایشیا کے ساحل اور باسفورس نظر آتے ہیں ' گرجے میں حمد کے گیت کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ اس کے بعد Phocion یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ شہنشاہ نے اس امر سے ناخوشی ظاہر کی ہے کہ عیسائی کفار سے اس طرح ربط ضبط رکھتے ہیں ۔ گویا ان دو جماعتوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہے ۔ یہ ڈراما کے موضوع کی جانب اشارہ ہے ۔ اس کے بعد اسٹیج پر جولین نمودار ہوتا ہے ' جو اس وقت اُنیس سال کا نوجوان تھا اُس کے ساتھ شہزادی ہیلینا (Helena) بھی نظر آتی ہے ۔ ایک کمزور اور معمولی دلچسپ کیریکٹر کی طرح ڈراما کے بعض غیر اہم حصوں میں اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہوجاتی ہے ۔ اس ڈراما کا ہیرو دراصل جولین ہے جس کی شخصیت فی الحال تو ایک ناشگفتہ کلی

کی طرح ہے ، لیکن دوسرے حصہ میں اس کی ساری دماغی ، جسمانی اور روحانی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں ، اور وہ میدان جنگ ، سریر سلطنت ، مذہبی مناظروں ، اور علمی مباحثوں میں اپنا جوہر دکھاتا ہے۔ جولین قسطنطنیہ کی زندگی سے بد دل ہے ، وہ شہنشاہ سے التجا کرتا ہے کہ وہ مصر کی جانب روانہ کر دیا جائے ، وہ کہتا ہے کہ یہاں میری روح سخت اذیت میں ہے ، بڑے بڑے فاسد خیالات مجھے گھیرے رہتے ہیں ، نو دن سے میں بالوں کی قمیص * پہنے ہوئے ہوں لیکن اُس سے بھی مجھے تسکین نصیب نہیں ہوتی ، اس کے بعد جولین کا ایک دیرینہ دوست اگاتھن (Agathon) اسٹیج پر آتا ہے ، اور دونوں ایک دلچسپ مکالمہ میں مشغول ہو جاتے ہیں ، اسی دوران میں اُس کا دوست کہتا ہے :—

" جولین ! کیا یہ خبر صحیح ہے کہ شہنشاہ تمہیں تخت و تاج کا وارث بنانے والے ہیں "

جولین :— " ایسی خطرناک باتوں کو زبان پر نہ لاؤ ، مجھے نہیں معلوم کیسی بے سروپا خبریں گشت لگاتی ہیں ... "

آگے چل کر اسی سلسلہ میں جولین کہتا ہے :—

" اے میرے محافظ ! کاش میں اس کفرستان سے بھاگ نکلوں ، یہاں رہنا ایسا ہے جیسا کہ ایک شیر کی ماند میں رہنا "

اسی دوران میں جولین کی ملاقات ایک فلسفی سے ہوتی ہے ، جو اُسے پیرو گلیلی † کا لقب عطا کرتا ہے ، لیکن جولین کہتا ہے کہ گو ظاہری لباس کے امتیاز سے میں گلیلین نظر آتا ہوں لیکن اصل میں حق کا متلاشی فلسفی

---

* ریاضت کا ایک طریقہ ہے —

† حضرت عیسیٰ سے مراد ہے

ہوں ' معاملہ طول پکڑتا ہے ' اور فلسفی جولین کے سامنے یہ اعتراض پیش کرتا ہے —

" ایک پوری شاندار دنیا ایسی ہے جو تم لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے ' اُس دنیا میں ہماری زندگی دائمی عید کے مانند خوش آئند ہوتی ہے ' ہمارے بالوں میں گلاب کے پھول آویزاں ہوتے ہیں ' ہمارے ہاتھوں میں لبالب پیالے نظر آتے ہیں ' اور ہم مقدس مجسموں کے درمیان گیت گاتے ہوتے ہیں ' اُس دنیا میں اتھاہ خلیج ایک روح کو دوسری روح سے جدا کرتے ہیں ' اور فضا میں دور تک پھیلاتے چلے جاتے ہیں —

(پہلا ایکٹ)

اس گفتگو کے بعد فلسفی باہر چلا جاتا ہے ' اور جولین پھر اپنے دوست اگاتھن سے باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے ' جولین اس پر مصر ہے کہ میں اب ان لوگوں میں نہیں رہ سکتا ' میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عیسیٰ مسیح نے مجھے ترک کر دیا ہے ' میں یہاں بدی کی طرف مائل ہوتا جاتا ہوں ' اگاتھن اُس سے اُس بشارت کا ذکر کرتا ہے جو اُن دنوں ہوئی تھی۔

" یکایک میں نے دیوار کے قریب ایک تیز روشنی دیکھی جس کے جلوے میں مجھے ایک شخص لبادہ پہنے ہوئے نظر آیا اس کے سر کے چاروں طرف ایک روشن حلقہ تھا ' اس نے مجھ سے کہا ! اگاتھن اُٹھو ' اس شخص کو تلاش کرو جو اس سلطنت کا وارث ہوگا ' اس سے کہو کہ شہر کی مانند میں جاکر شیروں

سے جنگ کرے "

اس کے بعد ھی شہزادہ گیلس (Gallus) اسٹیج پر آتا ھے اور جولین کو یہ خوش خبری سناتا ھے کہ شہنشاہ تم کو تخت کا وارث اور ولیعہد بنانا چاھتا ھے ' لیکن جولین کہتا ھے ' کہ

" مجھے ایک اس سے بڑے شہنشاہ نے منتخب کرلیا ھے "

اس موقع پر جولین اپنے پرانے اُستاد ھیکے بولی آس سے ملتا ھے جو ان الفاظ سے اس کا خیر مقدم کرتا ھے :—

" عیسیٰ مسیح تم سے خفا ھیں ' تمھاری حریت کی روح نے اُنھیں خفا کردیا ' تمھارے خیالات میں محبت کا شائبہ تک نہیں ' تم دنیاوی غرور میں سرشار ھو "

اس مکالمہ کے بعد ھی جولین کو شہنشاہ کی جانب سے پرگے مس جانے کی اجازت مرحمت ھوتی ھے ' حالانکہ وہ حقیقتاً ایتھنس جانے کا خواھش مند ھے —

دوسرے ایکٹ کے شروع ھی میں باسی لی آس اور جولین میں ایک دلچسپ مکالمہ شروع ھوتا ھے ' اور اول الذکر اس خط کا تذکرہ کرتا ھے جو اُس کے پاس اس کی فاضل اور حسین بہن ماکرینا (Makrina) نے بھیجا تھا ۔ اس کے الفاظ یہ ھیں —

" جب تم شہنشاہ کے عزیز کا جو تمھارا دوست ھے حال لکھتے ھو تو میری روح مسرت سے لبریز ھو جاتی ھے ' جس بے باکی اور دلیری کے ساتھ وہ ایتھنس میں داخل ھوا اس کا تذکرہ یقیناً عہد قدیم کی تواریخ کا ایک ورق ھے ' مجھے ایسا معلوم ھوتا ھے گویا حضرت داؤد نے پھر سطح گیتی پر قدم رکھا ھے

کہ کفار کے حامیوں کی سر زنش کرسکیں ' اس جنگ میں اور
اس کے بعد خدا اُس کا نگہبان رہے " —

ان الفاظ کو سنتے ہی جولین جوش سے بے قابو ہوجاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ خدا جانے ساری دنیا اس سے کس بات کی آرزو مند ہے ' اور کیا اہم کام کرانا چاہتی ہے ' اس پر باسی‌لی اس اُسے یقین دلاتا ہے کہ دنیا کے سارے عیسائی آپ کی راہ دیکھہ رہے ہیں ' یہ سنتے ہی جولین بدحواس ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ یا الہہ ' ایک طرف آسمان کی سی بلندی ہے ' دوسری جانب ایک عمیق غار ہے ' مشرق اور مغرب سے کیوں صدائیں آرہی ہیں کہ میں عالم عیسائیت کو سنبھالوں ' اور وہ عالم عیسائیت ہے کہاں ؟ شہنشاہ کے یہاں یا قیصر کے یہاں ؟ عالی خاندان ذی اقتدار اُمرا کے یہاں یا کمزور اور عیاش درباریوں کے یہاں ؟ یا ان علما اور فضلا کے یہاں جنہوں نے قدیم یونان کے سرچشموں سے اخذ حسن کیا اور علوم حاصل کئے ؟ باسی لی‌اس اس کا ایک مبہم سا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی تلاش بزرگان دین کی کتابوں میں کرنا چاہئے ' مگر اس جواب سے جولین کی تشفی نہیں ہوتی ' اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ میں کتابوں پر اکتفا نہیں کرسکتا ' مجھے زندگی کی تلاش ہے ' میں روح سے بلا واسطہ تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں ' اُس کے خیال میں کتابوں کی مدد زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتی بلکہ تکمیل انسانی کے لئے غیبی امداد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جولین کا خیال ہے کہ حقیقی زندگی الہامی لٹریچر اور کفار کے فلسفہ کے درمیان ڈانواڈول پھرنے سے اس کا سر چکرا گیا ہے ' وہ ایک شدید تاریکی میں گرفتار ہے جہاں ہاتھہ کو ہاتھہ نہیں سوجھتا ۔ وہ گھبرا کر بار بار

کہتا ہے کہ وقت آن پہنچا ' اب وحی نازل ہونا چاہئے ' بارش عرفان کی اشد ضرورت ہے ' حسن قدیم کا حسن زائل ہوچکا ' اور حکمت جدیدہ کی صداقت اب خواب و خیال ہوگئی ' اس لئے الہام کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں - چنانچہ اگر عیسیٰ مسیح مجھہ سے کچھہ کام لینا چاہتے ہیں تو وہ مجھے صاف صاف ہدایت کریں - اسی تذبذب اور بے چینی کے عالم میں باسیلی اس کے سختی سے منع کرنے کے باوجود جولین اِفی سس کی طرف رجوع کرتا ہے ' جو اول الذکر کے خیال میں ایک عیار شعبدہ باز ہے - اس کے بعد جولین اور گریگری کے درمیان گفتگو شروع ہوجاتی ہے - جولین اُسے یہ خوش خبری سناتا ہے کہ اس کا سینہ نور حقیقت سے معمور ہوچکا ہے - اس موقع پر جولین کی زبان سے ان حقائق کا انکشاف ہوتا ہے " پر ہر نسل میں ایک ایسی روح پیدا ہوتی ہے جس میں انسان کامل کا جلوہ نظر آتا ہے ' وہ جلوہ حامل شریعت حضرت موسیٰ کی ذات میں چمکا تھا ' مقدونیہ کے سکندر اعظم کی شکل میں اس نے فاتح کی شان دکھائی ' اور اسی طرح عیسیٰ مسیح میں اس کی تکمیل نظر آئی " اس کے بعد جولین ایک پیغمبر کی حیثیت سے پیشین گوئی کرتا ہے —

" میں کہتا ہوں کہ یہ مادہ پرست نسل بہت جلد مٹ جائے گی جو آنے والا ہے اس کا جلوہ جسم کی بجائے روح میں چمکے گا ' آدم میں روح اور جسم کا توازن موجود تھا لیکن اس کے بعد یہ توازن قائم نہ رہ سکا ' کیا موسیٰ کی زبان بند نہ رہتی تھی ؟ کیا سکندر کو ہوش دلانے کے لئے مصنوعی ادویہ اور شراب کو ....

ہم اس جنگل میں اپنے آپ کو پوشیدہ کریں گے جو دریائے فرات کے کنارے پر واقع ہے ' اور وہاں سے ایک نئی قوم برآمد ہوگی جو حسن اور توازن میں مکمل ہوگی ' وہاں روح کی سلطنت قائم ہوگی " —

جولین اور Maximus کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ اس لئے اہم اور دلچسپ ہے کہ اس سین میں جولین ارواح سے ہم کلام ہوتا ہے ' چنانچہ جولین ایک روح سے سوال کرتا ہے کہ میری پیدائش کی علت غائی کیا ہے - وہ روح جواب دیتی ہے —

" روح کی خدمت کرنا "

جولین پھر دریافت کرتا ہے :- میرا مشن کیا ہے ؟

روح :- سلطنت قائم کرنا —

جولین :- کونسی سلطنت ؟

روح :- سلطنت !

جولین :- کس طریقہ سے ؟

روح :- آزادی کے طریق سے —

جولین :- وضاحت سے بتاؤ ' آزادی کی کونسی راہ ہے ؟

روح :- وہی جو ضرورت کی راہ ہے -

جولین :- کس قوت سے ؟

روح :- قوت ارادی سے !

جولین :- میں کیا ارادہ کروں ؟

روح :- جو لابدی اور ناگزیر ہو —

اس کے بعد روح غائب ہوجاتی ہے اور اس معمہ کے حل کے لئے جولین میک سی‌مس کی جانب متوجہ ہوتا ہے —

میک‌سی‌مس ' تین سلطنتیں ہیں '

جولین - تین ؟

میک‌سی‌مس - پہلی سلطنت وہ ہے جو شجر علم پر قائم ہے '
دوسری وہ جس کی بنیاد صلیب پر رکھی گئی -

جولین- اور تیسری ؟

میک سی مس - "تیسری سلطنت * ایک بڑی پر اسرار سلطنت ہے ' اس کی بنیاد شجر علم اور صلیب پر ساتھہ ساتھہ رکھی جائے گی ' کیوں کہ اُسے دونوں سے اسی قدر محبت ہے جتنی نفرت ہے "—

اس موقعہ پر ابسن کے خیالات موجودہ علم النفس کے نتائج سے اختلاف رکھتے ہیں - ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری قوت ارادی آزاد ہے - ہم جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں ' اسی لئے قیامت کے دن ہمارے اعمال و افعال کی جزا و سزا ہو گی ' لیکن ابسن کا خیال ہے کہ فطرت حس سے جو کام چاہتی ہے لے لیتی ہے ' پھر اسے چون و چرا کا موقع نہیں دیا جاتا - قوت ارادی کی یہ پابندی بظاہر خلاف عقل معلوم ہوتی ہے ' کیوں کہ پھر عذاب و ثواب کا مسئلہ بے معنی ہو جاتا ہے ' لیکن اس نظریہ پر ابسن بہت سختی سے قائم ہے —

جولین - " تو نے کیوں دستگیری کی ؟ "

---

* The third is the empire of the great mystery; that empire which shall be founded on the tree of knowledge and the tree of the cross together. (act, III.)

' ابسن اس امتزاج کا بہاہت آرزو مند ہے ' یہی اس کی بڑی آرزو ہے ' اور ' کو وہ بلمی نوع انسان کی نجات کا وسیلہ تصور کرتا ہے ' اس خیال کو قرآ کی جان سمجھنا چاہئے !

آواز - کیوں کہ یہ میری مرضی تھی —

جولین - تیری مرضی کیا تھی —

آواز - وہی جس پر میں مامور ہوں —

جولین - تجھے کس نے مامور کیا —

آواز - مالک نے —

جولین پانچویں ایکٹ میں سالست سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے ' بے شک تمہارے دیوتا دور ہیں ' وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتے ' وہ کسی پر بار نہیں ڈالتے ' وہ ہر شخص کے لئے عمل کی گنجائش چھوڑ دیتے ہیں - کیا کہنا یونانیوں کی اس حقیقی خوشی کا! کیا کہنا ان کے جذبۂ آزادی کا!

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جولین اس خوشی اور آزادی کا کس درجہ آرزومند ہے' وہ شب و روز انہیں باتوں کو حاصل کرنے کی تدبیریں کر رہا ہے' اور اسی وجہ سے وہ کفر و عیسائیت کی خوبیوں کا ایک مرکب طیار کرنا چاہتا ہے ' مگر 'میک سی مس ' اُسے بار بار ڈراتا ہے ' تم اضداد کو جمع نہیں کرسکتے ' اور اسی لئے اس تاریکی میں غلطاں و پیچاں ہو' مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جولین عیسائیت سے اُسی قدر متنفر ہے جس قدر کفر و الحاد سے ' وہ کہتا ہے :—

" اگر میری روح ایک مہلک جذبۂ نفرت سے لبریز ہو کر اس شخص سے انتقام لینے پر مجبور ہوتی ہے جو میرے اعزا کا قاتل ہے تو مذہب کا حکم ہوتا ہے " اپنے دشمن سے محبت کرو "

اگر میرا دماغ حسن کی تلاش میں خوشنما مناظر اور قدیم یونانی رسوم کا جویاں ہوتا ہے تو عیسائیت برہم ہوجاتی ہے '

اور للکارتی ہے "صرف اس شے کی جستجو کرو جس کی ضرورت ہو - اگر میں دلی آرزو کے ساتھہ کسی شے کی جانب متوجہ ہوتا ہوں تو پرہیزگاری کا بادشاہ مجھے یہ کہہ کر ڈراد یتا ہے" جسم کو ہلاک کر ڈالو تاکہ روح کی پرورش ہوسکے"۔ جس دن سے گلیلی کا حکیم دنیا کا حکمراں ہوا ہے ہر فطری شے خلاف قانون قرار دیدی گئی ہے - اُس کے ساتھہ رہنا موت ہے - محبت اور نفرت دونوں جرم ہیں ' کیا اس نے انسانی آب و گل کو بالکل بدل دیا ؟ کیا دنیا میں رہنے والا انسان بالکل ویسا ہی نہیں جیسا کہ پہلے تھا ؟ ہماری اصلی اور صحیح فطرت اس کے حکم کے خلاف بغاوت کرتی ہے' پھر بھی ہمیں چار و ناچار اپنے ارادے کو مغلوب کرنا پڑتا ہے"-

(ایکٹ پانچواں)

میکسی مس اور جولین کے درمیان یہ فلسفیانہ اور دلچسپ مکالمہ جاری رہتا ہے ' یہاں تک کہ اس سین کے آخر میں ہم جولین کا ایک شہنشاہ کی حیثیت سے خیر مقدم کرنے کے لئے طیار ہوجاتے ہیں ' اور سنگت کے یہ الفاظ :—

" تیری ہی سلطنت ہے ' تیری ہی طاقت اور شان ہے "

دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں —

ڈراما کا پہلا حصہ یہاں ختم ہوتا ہے ' اس حصہ میں ہم نے خیر و شر ' روشنی و تاریکی ' نیکی و بدی ' کفر و مذہب کی کشمکش دیکھی ' اور دونوں جانب کے حکما کی دلیلیں سنیں ' اور جولین کو " ہر کہ آمد و عمارت نو ساخت " کا مصداق پایا - ظاہر ہے کہ محض وثنیت دنیا کی

بیماریوں کی ہمیشہ دوا نہیں ہوسکتی اور محض عیسائیت بھی اقوام کے مسائل سلجھانے کے لئے ناکافی ہے - ابسن بخوبی واقف تھا کہ یورپ کی عالمگیر فرماں روائی کے لئے اس مذہب کی بنیاد قائم کرنا سراسر نادانی ہے، اس لئے وہ تیسری سلطنت کی بنا ڈالتا ہے —

ڈرامے کے دوسرے حصہ کا نام "شہنشاہ جولین" ہے - پہلے ہی سین میں قسطنطنیہ کے بندرگاہ پر ہم جولین کو شاہی لباس میں شہنشاہ قسطنطین کی لاش کا منتظر پاتے ہیں، تخت شاہی تو جولین کے ہاتھ آگیا لیکن اس کے دل پر اب تک خوف اور ہراس طاری ہے اور وہ مے مرتی‌نس سے بار بار یہ کہتا ہے کہ ایسے جلیل‌القدر، نیک دل اور ہر دلعزیز شہنشاہ کے بعد تخت پر بیٹھنے کی میری ہمت نہیں پڑتی کاش میں گوشۂ تنہائی ہی میں زندگی گذار سکتا، ایسے موقعہ پر اس کا دوست مے مرتی‌نس اس کی تسلی کرتا ہے اور اُسے یقین دلاتا ہے کہ آپ سے بہتر شخص اور کوئی نہیں ہوسکتا جو تخت کے لئے موزوں ہو، اس کے بعد وہ جولین کو فرماں روا کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے اور کہتا ہے —

> "شب و روز عوام‌الناس کی بہبودی کی فکر کرنا، صرف نام کے آقا نہ بننا، حقیقت میں پبلک کا خدمت گذار ہونا، میدان میں تمھاری جگہ سب سے آگے ہے، اپنے لئے کچھ نہ لینا، بلکہ سارے تحائف و انعامات دوسروں کو بخش دیا کرنا، تمھارے انصاف میں نہ ظلم کا شائبہ ہو اور نہ غفلت کو جگہ ملے"—

اس کے بعد جولین اپنی روا داری کی پالیسی کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ کل رعایا کو مذہب اور اعتقادات کے بارے میں کامل آزادی حاصل ہوگی - جن کی روح کو عیسائیت کے پیام

میں سکون حاصل ہو وہ اس مذہب کے پابند رہیں' لیکن میں خود اس خدا پر تکیہ نہیں کرسکتا جو ہمیشہ میرا دشمن رہا ہے' مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے گال کی سر حد پر جو فتوحات حاصل کی ہیں وہ اُن ہی دیوتاؤں کی مدد سے حاصل ہوئیں جو سکندر اعظم پر مہربان تھے' انہی دیوتاؤں کے سایۂ عاطفت میں میں سارے خطرات میں سے صاف بچ کر نکل آیا۔ اس لئے میں ان خداؤں کے سامنے کیسے ناشکر گذار بن سکتا ہوں' میں ان کو پھر انہیں بلند مقامات پر جگہہ دینا چاہتا ہوں جو آرٹ کے بہترین نمونوں سے بارہا مرصع ہو چکے ہیں' لیکن گلیلیوں نے خدا کے ساتھہ بھی کوئی نا روا سلوک نہ کیا جاے گا اور نہ عیسائیوں کے گرجوں سے تعرض ہوگا - لیکن مے مرتی نس اپنی دمگ نظری کا ثبوت یہ کہہ کر دیتا ہے کہ شہنشاہ جو آگ پرستش کے وقت روشن کرتا ہے اسی سے مشتعل ہو کر نئے نئے علوم و فنون کی مشعلیں بلند ہوں گی' اور علوم کے ایک احیاء نو کی ابتدا کا آغاز کریں گی —

بعد ازاں جولین کو یہ خبر ملتی ہے کہ دبو' اور سرندیپ کے بادشاہوں کے ایلچی اس کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتے ہیں' اُن سے ملاقات کرنے سے قبل بادشاہ شاہی حجام کو طلب کرتا ہے' لیکن اُس کا لباس فاخرہ دیکھہ کر سخت برہم ہوتا ہے' اور طیش میں آکر اس سے دریافت کرتا ہے —

" تونے کونسے دیوتا کا مندر لوٹا ہے ؟ کیا تونے شاہی خزانہ میں ہاتھہ مارا کہ تجھے یہ شان و شوکت حاصل ہو گئی" ؟ —

بادشاہ کا خیال ہے کہ سرکاری عملہ میں ابتری پھیلی ہوئی ہے' اس لئے وہ حکم نافذ کرتا ہے کہ پوری سختی سے جانچ پرتال کی جاے اور جو قصور وار ہو وہ ایک قلم علحدہ کردیے جائیں - اس کے بعد وہ ایلچی دو

شرف باریابی عطا کرتا ھے ' اور اس کے رخصت ھونے پر اُرسواس سے بات چیت کرنے لگتا ھے - اس موقعہ پر اُرسولس جواین کی تھکنت کو ایک ھلکی سی ٹھیس لگاتا ھے ' اور اُسے یقین دلاتا ھے کہ یہ ایلچی قسطنطین کی فرمان روائی کے چرچے سن کر روانہ ھوئے تھے نہ کہ جو لین کے - پھر بھی جولین کا اقبال ترقی پر ھے' اس کی رعایا کا ایک گروہ اُسے دیوتا جانتا ھے ' اور اس کے جلوس پر پروانہ وار فدا ھوتا ھے - مگر جلوس کے بعد ھی اس کے خیال میں تبدیلی پیدا ھوتی ھے اور اس کے قدیم اُستاد ھے کے بولیاس کے درمیان ایک عالمانہ گفتگو شروع ھوتی ھے ' اُستاد اپنے جلیل‌القدر شاگرد سے کہتا ھے کہ گو میں نے ساری عمر مطالعہ اور غور و فکر میں صرف کی لیکن میں اس کا اقرار کرنے آیا ھوں کہ میں گمراہ تھا ' اور اس لئے میں نے اپنے شاگرد کو غلطی میں عمداً مبتلا نہیں کیا ' آپ ان دیوتاؤں کا احسان مانئے جن کے آپ چہیتے ھیں ' اس کے جواب میں جولین اپنے اُستاد کو یہ مژدہ سنا کر تسلی دیتا ھے کہ میں نے خود پرانی غلطی کا جوا اتار دیا ' سورج کے نور فانی خدا کو جس کے ھم سب اس درجہ ممنون احسان ھیں میں نے پھر وھی قدر و منزلت کی جگہ دی ھے ' دولت و اقبال کی دیوی فار چونا کی میں نے خود ان ھاتھوں سے پوجا کی ' اور اس وقت میں اسی لئے ذرا خستہ ھوں کہ ابھی ڈیونی‌سس کا ایک تیوھار منا کر آ رھا ھوں - یہ سن کر استاد کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رھتی —

رفتہ رفتہ جولین عیسائیوں سے سخت برھم ھوتا جاتا ھے ' یہاں تک کہ ایک موقعہ پر یہ حکم دیتا ھے :—

" اپنے ساتھ سپاھیوں کا ایک دستہ لے جؤ ' جتنے ان بختوں کو اسیر کر سکو گرفتار کر ڈالو ' پھر اُنھیں قید خانہ میں ڈال دینا ' قیدی بقیہ ساتھیوں کا نام بتا دیں گے ' ...... "

لیکن اس کے بعد ہی جولین کی مڈ بھیڑ ' بشپ میرس ' سے ہوجاتی ہے - یہ ایک بے خوف اور نڈر مذہبی پیشوا ہے اور جولین کے افعال پر اس کی سخت سرزنش کرتا ہے ' اس پر جولین کہتا ہے :—

" تیرا خدا طاقتور نہیں ' میں تجھے دکھا سکتا ہوں کہ بادشاہ اس سے زیادہ طاقتور ... "

پادری میرس ! گمراہ حیوان ! گرجا کے مردود بیٹے !! اب میں تیرے اوپر قہر نازل کراؤں گا ! جولین! لعنت ' جولین شہنشاہ !! تجھ پر لعنت ...... تیری آنکھوں اور ہاتھوں پر لعنت ' تیرے سر اور تیرے اعمال پر لعنت "—

پانچویں ایکٹ میں آخر کار جولین دبے الفاظ میں اپنی ناکامی کا اعلان کرتا ہے :—

" میں نے ابھی یہ خواب دیکھا کہ میں نے ساری دنیا کو زیر نگیں کر لیا ' اور یہ حکم دیا کہ عیسائیوں کا نام تک دنیا سے نیست و نابود کر دیا جائے ' اس کے بعد روحیں میرے پاس آئیں اور انہوں نے میرے شانے پر بازو آویزاں کر دئے - میں فضا میں تیرنے لگا ' یہاں تک کہ میں ایک دوسرے عالم میں پہنچ گیا - وہاں سے میں نے اس دنیا پر نظر ڈالی جس کو میں نے عیسائیوں سے پاک کرد یا تھا - مجھے خیال ہوا کہ میں نے اچھا کیا - لیکن میک سی مس ! دیکھنا ' اس نئی سر زمین پر ایک جلوس نمودار ہوا ...... اس جلوس کے وسط میں خود عیسیٰ (مسیح) بہ نفس نفیس موجود تھے اور ان کی پشت پر صلیب تھی "

وہ اپنے دوست کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ عیسائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ایک امید موہوم ہے، یہ دراصل وہ خیال ہے جو اُس کے علم اور احساس کے بغیر اُس کے دل و دماغ پر طاری ہوتا جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اس کے ارادے میں تزلزل پیدا کر رہا ہے، اس کے بعد جولین ایرانیوں کے مد مقابل بر سر پیکار نظر آتا ہے اور ہم کچھ عرصہ بعد اُسے زخمی اور قریب مرگ دیکھتے ہیں۔ اس کے زخمی ہوتے ہی 'جووین' (Jovian) افواج کی سرداری شروع کر دیتا ہے اور عیسیٰ مسیح کا نام لے کر میدان جنگ میں اُتر جاتا ہے، اور ایرانی عساکر فرار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرنے سے کچھ دیر قبل ہم جولین کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ ابسن نے اپنے اس غیر فانی ہیرو کو ایسی دلکش اور فطری خصوصیات سے متصف کیا ہے کہ ہم خواہ مخواہ داد دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جولین کے دل میں خود اعتمادی اس قدر مکمل اور زبردست تھی کہ اس کی مثال کسی اور کیرکٹر میں بہت کم نظر آئے گی۔ مرنے سے کچھ دیر قبل وہ یہی کہتا ہے کہ کاش! میری موت مجھے مہلت دیتی تو میں اپنی وہ کتاب تصنیف کر سکتا جو اب تک ناتمام ہے۔ یہ کتاب اس نے عیسائیت کے رد میں شروع [illegible] لکھی تھی۔ اس کے بعد وہ علانیہ کہتا ہے کہ میں نے دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر میں اب پشیمان ہوں، میں نے اپنی طاقت کو بہترین طریقہ سے استعمال کیا ہے، اور میں نے قصداً کبھی کسی شخص کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا۔ یہ اس کے کیرکٹر کے استحکام کی ایسی مثالیں ہیں کہ جس کی نظیر قرون وسطیٰ کے لٹریچر میں ذرا کم ملے گی۔ وہ اپنی ناکامی کو اُس آسمانی قوت کا ایک شعبدہ

تصور کرتا ہے جس پر اس کا بس نہیں۔ آخری لمحات میں میک ری نا اس کی تیمار داری کرتی ہے اور اس کے مرنے پر اس کے لئے دعاے مغفرت میں مشغول ہو جاتی ہے —

ابسن کے نقطۂ نظر سے تیسری سلطنت قائم کرنے کی یہ ایک ایسی سعی ہے جس میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ابسن کے زمانہ میں قرون وسطیٰ کی خصوصیات رفتہ رفتہ زائل ہو رہی تھیں' اور دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ وہ دور جو آج کل اقصاے عالم میں کار فرما ہے۔ ابسن وثنیت سے شاید اس لئے مانوس ہوا کہ اُس نے ناروے کی قدیم زبان کی پرانی پرانی کتابیں' قصے کہانیاں اور روایات بڑے غور و فکر کے ساتھ پڑھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے اُسے یونان کا علم الاصنام اور ڈرامے ضرور پڑھنا پڑے ہوں گے' اس لئے وہ یونان کی روح آزادی کا اس درجہ دلدادہ ہے کہ اسے عیسائیت کی خوبیوں سے ملا دینا چاہتا ہے' اس کے برخلاف عیسائیت میں سے اُس نے صرف ایک شے پسند کی ہے' وہ اس مذہب کا جذبہ قربانی ہے —

اس ڈرامے میں ابسن کو آرٹ کے بجاے اپنے خیالات کی تبلیغ کی زیادہ فکر معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ڈراما آرٹ کے اعتبار سے اس قدر نمایاں نہیں جیسا خیالات' اور دلائل کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اول تو خود تیسری سلطنت کا خیال ایک انوکھا اور دلیرانہ خیال ہے۔ اس کے علاوہ جولین' مکرینا' میک سی مس' اور باسی لی اس کی عالمانہ اور فلسفیانہ بحثیں نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں' اور چونکہ جولین ایک مخصوص زمانہ اور ملک سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اُسے بہادری کے علاوہ علم و فضل' دقت نظر' بلندی خیال' شیریں گفتاری و فصیح بیانی سے متصف کیا گیا ہے'

اس لئے وہ سپاهی اور ناظم ریاست هونے کے علاوہ خطیب اور حکیم بھی هے -

ڈراما میں ناٹک کا رنگ بہت کم معلوم هوتا هے ' اس کی خاص وجه یه هے که ابسن نے اس ڈراما کو اسٹیج کے لئے تحریر نہیں کیا تھا - بلکه اپنے خیالات کو اس نے یه صورت اس لئے دی هے که مکالمے اور مناظرے کا موقعه آتا رهے ' چنانچه ڈراما میں قدم قدم پر مذهبی اور فلسفیانه مباحثے اور مکالمے کثرت سے موجود هیں —

گذشته صفحات میں هم نے ابسن کی تصنیف " شہنشاہ اور گلیلی " کی خصوصیات پر پوری بحث کرلی هے - اب قبل اس کے که هم اس کی دیگر تصانیف کی جانب متوجه هوں یه ضروری معلوم هوتا هے که ابسن کی لائف کو ختم کردیا جائے ' اس کے بعد هم پوری تفصیل کے ساتھه اس کے دوسرے ڈراموں پر نظر ڈال سکیں گے - میرا خیال هے که مصنف کی لائف اُس کی تصانیف سے کم دلچسپ اور سبق آموز نہیں هوتی - اس لئے میں نے ابسن کی زندگی کے واقعات کو ذرا طوالت کے ساتھه تحریر کیا هے ' اگر تصانیف کو مصنف کی روح اور شخصیت سے علحدہ کردیا جائے تو عموما وہ تصانیف نیم جان اور بے کیف هوجاتی هیں - یه اصول ابسن کی تصانیف سے بہت گہرا تعلق رکھتا هے - سائنس' منطق ' فلسفه ' مابعدالطبعیات ' تاریخ ' نجوم و هندسه کی تصانیف کا مصنف کی لائف سے بہت کم تعلق هوتا هے ' لیکن اس کے بر خلاف ادب کی ساری اصناف مصنف کی روح اور شخصیت کا آئینه هوتی هیں ' جس میں هم اس کے خد و خال دیکھه سکتے هیں —

دس سال قبل ابسن ایک نا امید ' مایوس ' مقروض ' شکسته دل مصنف تھا ' لیکن جب اس نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی تو اس کی حالت بہت کچھه تبدیل هوچکی تھی - ناروے ' سویڈن ' اور ڈنمارک میں اس کی شہرت

اچھی طرح پھیل چکی تھی، اور اس کے علاوہ انگلستان اور جرمنی کے ادیب بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نا اُمیدی اور مایوسی دور ہونے لگی، اس کا افلاس دولت مندی اور فارغ البالی میں تبدیل ہونے لگا، شکستہ دلی کی بجائے اس کے دل میں ہمت، جرأت، اور خود اعتمادی کی لہریں اٹھنے لگیں، رفتہ رفتہ اس کے سوشل ڈراموں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، اور وہ دنیا کا سب سے بڑا ڈراما نویس مانا جانے لگا۔ ایک نقاد کا بیان ہے کہ میں شکسپیر کے بعد ہی بے تکلف ابسن کو جگہ دیتا ہوں۔ یہ رائے محض ایک شخص کی رائے نہ تھی بلکہ جرمنی، فرانس، انگلستان نے خود ابسن کی حیات ہی میں اسے سب سے بڑا ڈراما نویس تسلیم کر لیا تھا، اور اس کے ڈرامے بحر اوقیانوس کے دونوں جانب نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں ابسن میونک (Munich) میں مقیم تھا، اور روز شام کو ساڑھے سات اور ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان میں وہ قہوہ خانہ میکس میلین میں آتا، اور یہاں بیٹھ کر یا تو اخبار پڑھتا رہتا، یا اس قہوہ خانے کے مہمانوں کے خد و خال، چال ڈھال، چہرے مہرے کو نہایت غور و خوض کے ساتھ دیکھتا رہتا۔ یہ حقیقتاً فطرت انسانی کا نہایت عمیق مطالعہ تھا جو اس کے ڈراموں کے کیریکٹر کے لئے مفید ہوتا تھا۔ مگر چاہے آندھی آئے چاہے پانی برسے اس کا قہوہ خانے میں آنا ایک ناگزیر امر تھا۔ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۸۸ ع کو ابسن کی ساٹھویں سال گرہ تھی، اُس وقت بھی وہ میونک میں مقیم تھا۔ اس روز ابسن کا مکان گلدستوں، گجروں اور پھولوں سے پٹا پڑا تھا، تحائف کی کوئی انتہا نہ تھی، مبارک باد کے تار اور خطوط دنیا کے ہر گوشے سے اُمڈے چلے آرہے تھے، گوشہ نشین ابسن تحائف کی بیشمار تعداد کو دیکھتا تو بار بار اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے

" آخر کوئی حد بھی ہے - میرے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں "
اور اس کی بیوی مسرت و شادمانی کا مجسمہ بنی ہوئی خانہ داری کے انتظام میں مصروف نظر آرہی تھی ' یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک گوشہ نشیں کو آخرکار دنیا نے اس کے عزلت کدے میں ڈھونڈھ نکالا ہے - چنانچہ بیورن سن کے تار کے یہی الفاظ تھے : -

" آج دنیا گوشہ نشین کے دروازے پر آئی ہے "

غرض ابسن کی زندگی کے آخری ایام نہایت مسرت ' شادمانی ' فارغ البالی اور علمی تحقیق میں بسر ہوے - میونک میں اس کا مکان مہمان نوازی کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ' گو اس کے ہاں مہمان بہت کم اتے تھے ' لیکن جو انے تھے وہ ابسن کی صحبت اور اس کی بیوی کی سلیقہ شعاری کا ایک گہرا نقش اپنے دل پر لے جاتے تھے " شام کے وقت مسز ابسن اپنے شوہر کو ناولیں پڑھکر سناتی تھی ' ابسن اپنی بیوی کی بہت قدر کرتا تھا - اور کہتا تھا کہ اس کا ذہن بالکل آزاد ہے ' اور اس کی شخصیت مکمل ہے - اس میں شک نہیں کہ وہ ذہنی بیداری ' علمی ذوق اور غور و فکر کا مادہ رکھتی تھی - اس کا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا ' اور وہ ان کے مطالب سے اپنے شوہر کو مطلع کرتی رہتی تھی ' گو وہ ابسن پر اعتماد کامل رکھتی تھی لیکن اسکے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ کمال آزادی کے ساتھ بے خوف ہو کر ابسن کی تصانیف پر تنقید کرتی تھی ' یہاں تک کہ دونوں میں کبھی کبھی اختلاف رائے بھی ہو جاتا تھا - لیکن اُس نے اپنے خیالات کی آزادی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا - ابسن ادبی معاملات میں ہمیشہ اس سے مشورہ لیتا تھا اور اس کا اعتراف کرتا تھا کہ وہ اس کے لئے الہام کا بہترین ذریعہ ہے —

" اس کو رنج یہ تھا کہ خطرات نے

میری راہ مسدود کردی تھی -
اس کی خوشی یہ تھی کہ نیک روحیں
میرے بوجھ کو ہٹا لیتیں-

اس کا گھر وہ غیر محدود کھلا سمندر ھے
جس کی موجیں میرے خوابوں کی
ساکت اور جامد کشتی کو
حرکت میں لاتی ھیں-

اس کا قبیلہ ایک پریوں کا پرا ھے
جو نت نئے رنگ بدلتی ھیں
اور شوخی کا انداز دکھاتی ھوئی
میرے راگوں کے ساتھہ رقص کرتی ھیں-

جب میری آگ بجھہ جاتی ھے
تو اسی کے نور سے روشن ھوتی ھے
لوگ دیکھتے ھیں کہ آگ جل اٹھی
لیکن انھیں خبر نہیں ھوتی کہ اسے کس نے روشن کیا

چونکہ وہ مجھہ سے
کسی صلے کی طالب نہیں
اسی لئے میں نے شکرئے کا یہ گیت
لکھا اور طبع کرایا ھے " *

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۹۱ ع کو میونک کے نوعمر مصنفین نے ایک بڑی دعوت میں ابسن کو معزز مہمان بنا کر مدعو کیا - اسی موسم بہار میں برلن اور بڈاپسٹ میں بھی ابسن کو اس عزت سے سرفراز کیا گیا ، چالیس سال قبل اس نے اپنے آپکو ماھر تعمیر (Master Builder) تصور کیا تھا ،

* اس نظم کا عنوان ھے ' شکریہ ' اس کا حوالہ آگے بھی دیا گیا ھے —

اور اس کی یہ آرزو تھی کہ ایک ایسی عمارت بنادے جو سارے شمال میں چمکے — اس خواب کی تعبیر اس کی توقعات سے کہیں بڑھ کر نکلی۔ اس نے یہ دیکھ لیا کہ ایک غیر فنی شاعر کی حیثیت سے وہ نہ صرف شمال میں بلکہ ساری متمدن دنیا میں مشہور ہوچکا ہے - اسی دوران میں ابسن اور بیورنسن میں مصالحت کی بنا پڑی ' اور وہ دشمنی جو ان دونوں کے درمیان سالہا سال سے چلی آتی تھی اس طریقے سے ختم ہوئی کہ ابسن کے بیٹے نے بیورنسن کی بیٹی سے شادی کرلی - ان تمام واقعات اور مشاغل کے باوجود ابسن کا قلم برابر کام کررہا تھا ' اور اس کے ڈرامے برابر نکل رہے تھے ' جن کی باترتیب فہرست یہ ہے —

The Warriors Barrow & Catiline. — (۱) سنہ ۱۸۵۰ ع

(۲) سنہ ۱۸۵۱ ع — Andrihimmer. کا ایڈٹ کرکے شائع کرانا

St. John's Night — (۳) سنہ ۱۸۵۳ ع

Lady Inger of Oestraat — (۴) سنہ ۱۸۵۵ ع

The Feat at Solhoug — (۵) سنہ ۱۸۵۶ ع

The Vikings. — (۶) سنہ ۱۸۵۷ ع

Love's Comedy. — (۷) سنہ ۱۸۶۲ ع

The Pretenders — (۸) سنہ ۱۸۶۳ ع

Brand. — (۹) سنہ ۱۸۶۶ ع

Peer Gynt. — (۱۰) سنہ ۱۸۶۷ ع

The League of Youth. — (۱۱) سنہ ۱۸۶۹ ع

Emperor & Galilean. — (۱۲) سنہ ۱۸۷۳ ع

Pillars of Society. — (۱۳) سنہ ۱۸۷۷ ع

(۱۴) سنہ ۱۸۷۹ ع	A Doll's House .
(۱۵) سنہ ۱۸۸۱ ع	Ghosts.
(۱۶) سنہ ۱۸۸۲ ع	An Enemy of the People.
(۱۷) سنہ ۱۸۸۴ ع	The Wild Duck.
(۱۸) سنہ ۱۸۸۶ ع	Romersholm.
(۱۹) سنہ ۱۸۸۸ ع	The Lady From the Sea.
(۲۰) سنہ ۱۸۹۰ ع	Hedda Gabler .
(۲۱) سنہ ۱۸۹۲ ع	The Master - Builder .
(۲۲) سنہ ۱۸۹۴ ع	Little Eyolf .
(۲۳) سنہ ۱۸۹۶ ع	John Gabriel Borhman.
(۲۴) سنہ ۱۸۹۹ ع	When We Dead Awaken .

ابسن کی سترویں سالگرہ کے موقعہ پر پروفیسر کوہن کی ادارت میں ایک کتاب شائع ہوئی جس میں ناروے اور سویڈن کے سارے ادبی نقادوں نے اس جید ڈراما نویس کی معرکۃ الآرا تصانیف پر تحسین آمیز تبصرے لکھے۔ پہلا مقالہ ہزمجسٹی شاہ آسکر ثانی کا تھا ' اس کے بعد دیگر ارباب ذوق کے تبصرے تھے ' اس کتاب میں کچھہ اعداد و شمار بھی درج تھے ' جن سے پتہ چلتا تھا کہ صرف کوپن ہاگن کے ناشر کے ہاں سے تقریباً پانچ لاکھہ نسخے اس کی تصانیف کے فروخت ہوچکے ہیں ۔ انگلستان کی جانب سے مسٹر گاس نے چاندی کا ایک ست پیش کیا اور سارے دن مختلف ملکوں ' قوموں اور مذہبوں کے لوگ آتے رہے اور تحفے پیش کرتے رہے ۔ دوسرے روز شام کو کرسچیانا کی تماشاگاہ میں " دشمن خلق " کا تماشا کیا گیا ۔ ۲۳۔ مارچ کو حکومت کے نمایندوں اور ارباب علم و فن کی جانب سے ابسن

کو ایک پر تکلف دعوت دی گئی جس میں وزیر مملکت نے معزز مہمان کا جام صحت تجویز کیا۔ اس کے بعد ابسن شاہ ڈنمارک اور شاہ سوئڈن کی جانب سے مدعو ہوا۔ اس موقعہ پر اس کے درست کوُنٹ اِسنواِلسکی نے تقریر کرتے ہوے یہ الفاظ کہے تھے۔—

"ھنرک ابسن! تھوڑی دیر کے لئیے ھمیں اپنے ھاتھہ چومنے دو ' جن کی بدولت ایسے نادر شاعرانہ کارنامے وجود میں آے۔ وہ کارنامے جو اپنی تلخی کے با وجود اس قدر مفید ھیں۔ اس صاف اور تیز ھوا کا شکریہ جس نے اندر ھم نے چٹانوں کے درمیان سانس لی —— لیکن ان حسین اور شعر آفرین وادیوں کا بھی شکریہ جو بادلوں کے پھٹنے پر ھمارے نگاھوں کے سامنے آ گئیں ھی مقام پر ایگنس اپنے ابدی تبسم سے مسرور کرتی رھتی ھے۔ —— ایسے ھی مقام پر سلویگ صبر کے ساتھہ منتظر بیٹھی ھوتی ھے

ھنرک ابسن! شکریہ! مرحبا! مرحبا!"

اسی سلسلے میں ناروے کی "انجمن حقوق نسوان" کی جانب سے ۲۶ مئی سنہ ۱۸۹۸ ء کو ایک بڑا جشن منایا گیا۔ وزیر اعظم کی بیوی نے جلسۂ تہنیت کی صدارت کی۔ اس تحریک کے دو نمایاں علمبرداروں نے پر زور تقریریں کیں۔ ابسن نے تقریر کرتے ھوے یہ کہا کہ میں نے محض پروپاگنڈا کی غرض سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ میں ڈراما نویس ھوں ' سوشل ریفارمر نہیں ھوں ' عورتوں کے حقوق کا سوال ایک ایسا سوال ھے جس کا کل بنی نوع انسان سے تعلق ھے ' اسی لئیے جو کچھہ لکھا گیا ھے اس میں میں نے محض نوع انسانی کے خصائل کا تذکرہ کیا ھے —

" میرے پیش نظر یه کام تها که اپنے ملک کو ترقی دی جاے۔ اور اپنے هم وطنوں کے سامنے ایک بلند معیار رکھا جاے ' اس بات کے حاصل کرنے کے لئے دو باتیں ضروری هیں۔ ماؤں کا یه فرض هے که وه لگاتار محنت اور جفاکشی سے اپنی اولاد میں تہذیب نفس اور ضبط نفس کا احساس پیدا کریں۔ جب تک یه احساس پیدا نه هوگا ' باشندوں کی زندگی کسی بلند مرتبے پر نه پہنچ سکےگی۔ اصلاح معشرت کے مسائل کا حل عورتوں کے هاتھه میں هے' یه کام ان کو ماؤں کی حیثیت سے کرنا چاهئے۔ اسی حیثیت سے یه کام انجام پا سکتا هے۔ یه عورتوں کی ایک بڑی اهم ذمه داری هے ... "

اُس حیات نو کے شکریے میں جو عورتوں کو ابسن کی هنگامه خیز تصانیف سے حاصل هوئی یه جشن منایا گیا تها۔ هال میں روشنی مدهم کردی گئی اور ابسن کی تصانیف کے نسوانی کیریکٹر اپنے مخصوص لباس میں ایک ایک کرکے آے اور ابسن کو ایک ایک گلاب کا پهول دے کر چلے گئے۔ سنه ۱۸۹۹ ع میں ابسن ایک اور طریقے سے سرفراز کیا گیا۔ کرسچیانا میں نیشنل تهیٹر کی عمارت کے دروازے پر اس کا نام کنده کیا گیا۔ غرض اس کی زندگی میں جو قدر و منزلت اس کی هوئی وه شاید هی کسی شاعر یا ڈراما نویس کو نصیب هوئی هو —

سنه ۱۸۹۹ ع میں ابسن کی صحت جواب دینے لگی ' اس کا سب سے نمایاں اثر یه هوا که اس کا حافظه روز بروز کم زور هونے لگا؛ یہاں تک که وه الفاظ کی صورتیں بهی بهولنے لگا۔ وه اسی میز پر بیٹهه کر قلم سے کیڑے مکوڑے بناتا رهتا تها جس پر اُس نے ایسے معرکے کی کتابیں لکهی تهیں۔ لیکن سیاست سے اس کی دلچسپی بدستور رهی۔ خصوصاً اس لئے که

اس کے بیٹے نے اس میدان میں قدم رکھا تھا - یہ تقاضاے عمر اس کی کل قوتوں میں انحطاط ظاھر ھونے لگا ' چلنا پھرنا تک مشکل ھوگیا ' پھر بھی وہ کھڑکی میں بیٹھہ کر بنی نوع کا مطالعہ کرتا رھتا - آخرکار دنیا کے اس زبردست فلسفی ' حکیم ' ادیب ' شاعر ' اور دراما نویس نے ۲۳ مئی سنہ ۱۹۰۶ م کو دنیا کو خیر باد کہا - یکم جون کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھہ اس کی لاش سپرد خاک کی گئی —

ابسن شاعر اور ادیب ھونے کے ساتھہ ساتھہ ایک مجتہد اور پیغامبر بھی تھا - یہ ایک ایسی واضح ' اور نمایاں حقیقت ھے جس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ' اس کی چھوٹی چھوٹی نظموں اور غزلوں کا ایک مختصر سا مجموعہ موجود ھے ' جس میں سے ھم نے چند نظمیں اس مقالے کی پہلی قسط میں درج کی ھیں ' لیکن اس کی شاعری کا وھی حشر ھوا جو شکسپیر کی شاعری کا ھوا تھا - شکسپیر کے دراموں نے اس کی غزلوں کی لطافتوں اور خوبیوں کو دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ کر دیا ھے ' شکسپیر کا نام لیتے ھی ھیملٹ ' جولیس سیزر ' فالسٹاف ' ڈیسڈیمونا ' ایاگو ' لیڈی میکبتھہ اور پورشیا کی صورتیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ھیں ' اور ھم اس کے دراموں میں محو ھوکر رہ جاتے ھیں - ابسن کا نام سنتے ھی ھم اپنی نگاھوں کے سامنے اگنیس - نورا ' لونا ' لیڈی انگر بریلنڈ ' پیر گنٹ اور ھیڈا اسٹا کمان کے مجسمے پاتے ھیں ' اور ان کی رعنائیوں کے نظارے میں ڈوب کر یہ بھول جاتے ھیں کہ ابسن غزل گو بھی تھا - گو زمانے نے اُسے اس قدر فرصت نہ دی کہ وہ اس صنف میں کمال دکھا سکتا - اس کے متعلق میرا خیال ھے کہ ابسن ھمیشہ اس امر کو شدت کے ساتھہ محسوس کرتا رھا کہ وہ فطرت کا ایک پیغامبر ھے ' اس لئے اُسے اپنے فرض سے غافل نہ ھونا چاھئے - اس کے دل کے

پاس پاسبان عقل تھا' اس پاسبان نے اُسے کبھی تنہا نہ چھوڑا اور اتنا موقع نہ دیا کہ وہ غزل گوئی کی جانب متوجہ ہوسکتا۔ یورپ کے ممالک میں محض غزل گوئی بہت کم کی جاتی ہے' یعنی یہ کم ہوتا ہے کہ شاعر مرتے وقت صرف غزلوں کے پانچ دیوان چھوڑ جاے اور اس کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف نہ ہو —

ابسن کی غزلوں کا ذخیرہ گیرٹ نے جمع کرکے حاشیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں ۲۸ غزلیں ہیں' مختلف ڈراموں میں سے چھہ‌گیت ماخوذ ہیں' اور آخر میں " بریلنڈ " کا ترجمہ ہے۔ جسے اس مجموعے میں ایک نظم کی حیثیت دی گئی ہے۔ ان میں سے تین چار نظموں کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد ہم بڑی حد تک تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان نظموں کی نصف سے زیادہ حلاوت اور لطافت ترجمہ کرنے میں جاتی رہتی ہے' دوسرے ان کی تعداد اس قدر مختصر ہے کہ معا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ مکمل نہیں ہے۔ ان نظموں میں چند ایسی ہیں جن میں شاعر نے اسرار حقیقت کو بے نقاب کرنے کی بڑی خوبی سے کوشش کی ہے' وہ کہتا ہے :—

زندگی کیا ہے؟ ایک جنگ ہے!

دل اور دماغ کی جنگ دنیا کی زنجیروں سے

شاعری؟ اس کے معنی یہ ہیں

روحوں کی رستخیز کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا۔

(۲)

" آخری " آخری مہمان

پھاٹک تک پہنچا دیا گیا -

خدا حافظ : - اور باقی لوگ

رات کی ہوا میں گھل مل گئے -

مکاں ' باغ ' سڑک '

سب پر تاریکی کے پردے پڑے ہوے ہیں -

اسی فضا میں شیریں الفاظ نے

موسیقی کا لطف پیدا کیا تھا -

وہ گھڑی بھر کی دعوت تھی '

جس پر تاریکی کا غلبہ تھا -

وہ فقط ایک مہمان تھی '

آئی اور چلی گئی -

اس کے آگے ابسن نے دیہاتی دلکشی کا ایک دلفریب مرقع کھینچا ہے ' جس کی سادگی کا حسن ' ورڈ سورتھ ' کی نظم " اکیلا کھیت کاٹنے والا " کی یاد تازہ کرتا ہے : —

" دیکھو گاؤں کی محبوبہ خاموش بیٹھی ہے '

کچھ اندھیرے میں کچھ روشنی میں '

اس کی گہری نظر کے سامنے جو خاموش تصویر ہے

وہ اب تک نام سے بے نیاز ہے -

وہ خود اُس کا کوئی نام نہیں رکھتی ' اور نہ یہ جانتی ہے

کہ اس کی جستجو اُسے کہاں لے جائے گی

جب چو پاؤں کی گھنٹیاں ' اور ناقوس بجنے لگتے ہیں

تو یہ تصور اُسے وہاں لے جاتا ہے جہاں شفق پھولی ہوتی ہے '

بلکہ شائد اس سے بھی آگے !"

ورڈ سورتھ کی نظم سے یہ نظم بہت بڑھی ہوئی ہے ' انگریزی شاعر کے ہاں بھی تخیل کی بلند پروازی ہے لیکن ابسن کی پرواز آسمان تک جا پہنچی اور ورڈ سورتھ گاؤں کی روایات کے بکھیڑوں میں پھنس کر رہ گیا —

دو نظمیں اور ہیں جن کا مختصر سا ذکر کافی ہوگا - پہلی کا عنوان ہے "وقت پر کام آنے والا بھائی" یہ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع میں لکھی گئی تھی' جب پراشا نے ڈنمارک سے ایک صوبہ چھین لیا تھا - اور ناروے و سویڈن ' ڈنمارک کی امداد کا وعدہ کر کے منحرف ہو گئے تھے - اس پالیسی کا ابسن کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا ' وہ اپنے ہم وطنوں کو للکار للکار کر کہتا ہے :—

وہ ایک خواب تھا ' اٹھو ' بیدار ہو '

وہ کام کرو جو ایک قوم کے شایان شان ہے —

ہر شخص اپنے اپنے مورچہ پر ڈٹ جاے '

جلدی کرو ایک بھائی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے

ابھی وقت ہے کہ تم یہ شریفانہ گیت گاؤ :—

ڈیلس' ڈیلس' ڈاڈرا - کا خطہ ہاتھہ سے نہ جانے دینا - !'

یہ نظم جو ہم آخر میں درج کرتے ہیں ابسن کی نظموں میں سب سے پاکیزہ ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ بہت دلچسپی سے پڑھی جاے گی —

"کنول کے ساتھہ"

" پیاری ! دیکھہ ' تیرا عاشق یہ ہے '

ایک پھول ہے جس کے پنکھہ سفید ہیں '

یہ خاموش سطح پر لیٹا ہوا

موسم بہار میں نیند کے مزے لے رہا تھا —

اس مہمان کے ساتھ گھر والوں کا سا سلوک کر '
پیاری ' اسے اپنے سینے میں جگہ دے '
وہاں اس کی پنکھڑیاں ایک راز کو چھپائے رکھیں گی
اُس پر شور سیلاب کا راز جو آکر گذر گیا ۔
لڑکی ! چشمے سے خبردار رہنا ۔
وہاں سو جانے میں خطرہ ہے !
گو پریاں وہاں سونے کا بہانہ کرکے
کنول کے اوپر سے جھانکتی رہتی ہیں ۔
لڑکی تیرا سینہ ایک چشمہ ہے '
لیکن وہاں بھی سو جانے میں خطرہ ہے
گو کنول پر سے جھانکتی ہوئی
پریاں وہاں سو جانے کا بہانہ کرتی ہیں ۔

اس نظم پر ذوکر نے ایک دلچسپ نوٹ دیا ہے جو اس کی ادبی خوبیوں کو دوبالا کر دیتا ہے —

" میری کی نرمی اور تناسب روحانی میں ایسی دلکشی تھی جو ابسن کو بہت پسند آتی تھی ۔ اُس شریفانہ سلوک کی بدولت جو وہ ہمیشہ خواتین کے ساتھ کرتا تھا اس نے درسیڈن میں میری کے قیام کو جہاں تک ممکن تھا خوشگوار بنایا ۔ ایک روز اُس نے ایک نظم کے ساتھ میری کو کنول کے پھولوں کا گلدستہ دیا ۔ اس نظم میں اس نے میری کی شرافت اور حسن سیرت کی مدح سرائی کی تھی " ۔

ظاہرا ابسن بہت خشک اور بے مروت معلوم ہوتا تھا ۔ لیکن اس کا

دل شرافت ' عالی حوصلگی ' احسان مندی اور محبت سے معمور تھا - دوست کی حیثیت سے ابسن ہمیشہ مخلص اور بے لوث رہا اور شوہر کی حیثیت سے محبت کرنے والا ' ہمدرد اور با وفا - لیکن تعجب ہے کہ اپنے والدین سے وہ کبھی مانوس نہ ہوسکا - یہ اس کی بلند خیالی اور شرافت نفس سے بعید معلوم ہوتا ہے ' لیکن ہمیں اس کی اصلی وجہ کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے - مذہب کی اٹل چٹان اس کے اور اس کے والدین کے درمیان حائل تھی جس نے ان کو کبھی ملنے نہ دیا - ابسن میں وہ جراءت اور ہمت نہ تھی جو مصلحوں میں ہوا کرتی ہے - " گڑیا کا گھر " " بھوت " " برینڈ " کی اشاعت نے اُسے ایک زمانے میں مطعون خلائق بنا دیا تھا - ان کے خلاف اخباروں میں مضامین نکلتے تھے ' تقریریں ہوتی تھیں - گرجاؤں کے پادری سخت برہم نظر آتے تھے ' ملک کے مدبر ابسن کو سزا دینے کے لئے طیار تھے ' لیکن اپنے وطن سے دور بیٹھا ہوا ابسن برابر اپنے خیالات کی ترویج میں مشغول رہا ' سیاسی خیالات کی اصلاح کو اُس نے اپنا فرض جانا ' معاشری خرابیوں اور گھریلو زندگی کی ابتری کو دور کرنا اُس نے اپنا مشن تصور کیا - " گڑیا کا گھر " میں نورا یہ محسوس کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے گھر کے ماحول میں وہ اپنی شخصیت کو مکمل نہیں کرسکتی ' اس لئے وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر چل کھڑی ہوتی ہے ' اس سے اصل میں آن میل بے جوڑ شادیوں کی شدید مخالفت مقصود تھی - اس ڈراما کے شائع ہوتے ہی سارے ملک میں آگ سی لگ گئی ' پادریوں نے یہ تصور کیا کہ یہ ڈرما شادی کی مقدس رسم پر ایک ناروا حملہ ہے ' ایکٹروں نے اس ڈراما میں کام کرنے سے انکار کر دیا - آخر کار ابسن نے اس ڈراما کے آخری سین کو از سر نو لکھا اور رائے عامہ

کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے آرٹ کے ایک کامیاب اور دلکش نمونے کو ناقص بنا کر چھوڑا - اس کے خیالات اپنے ملک کے خیالات سے بہت آگے تھے ' لیکن اس میں مجتہدوں کی سی دلیری اور ہمت نہ تھی - ابسن نے ایک جگہ اس بزدلی کا خود اعتراف کیا ہے - اس کے دوست ایک جنگی مہم میں حصہ لینے کی طیاریاں کر رہے تھے ' وہ خود اس جنگ کا سب سے بڑا حامی تھا ' لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ خود تیغ و سپر لے کر میدان جنگ میں اُتر آتا - وہ کہتا ہے کہ میں صرف اسی طرح جنگ کرنے کے قابل ہوں جس طرح کہ کر رہا ہوں ' یعنی اپنے ملک سے دور پردیس میں رہ کر - اسی لئے اس کے ایک دوست نے کہا ہے :—

" ابسن آدمی نہیں ہے ' محض ایک قلم ہے " -

ہم ابسن کو دور اندیش کہہ سکتے ہیں - وہ عہد طفلی سے یہ سوچتا رہتا تھا کہ اسے اس دنیا میں ایک بڑا مشن پورا کرنا ہے - چنانچہ اس کی طیاری میں وہ ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے ' اپنے ملک کی سوشل حالت کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے - سوشل خرابیوں کو ایک نظر میں تاڑ لیتا ہے اور ان پر پیہم ایسے شدید حملے کرتا ہے کہ ملک میں ہلچل مچ جاتی ہے - اور لوگ دیوانہ وار اسے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں - رفتہ رفتہ مہذب سوسائٹی میں اس کا نام لینا جرم قرار دیدیا جاتا ہے ' اس کے موافقین اور مخالفین میں لڑائیاں ہونے لگتی ہیں ' دعوتوں میں اس کے متعلق گفتگو کرنا ممنوع کر دیا جاتا ہے ' اخبارات میں اس کے کارٹون نکلتے ہیں اور اس کی کتابوں کی تحقیر کی جاتی ہے ' مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھئے کہ وہ ایک بزدل انسان تھا ' ان

مخالفتوں سے محفوظ رہنے کی غرض سے وہ اپنی عمر کا زیادہ حصہ اپنے وطن سے دور میونک اور دریسڈن میں بسر کرتا ہے ' بہر حال یہ کمزوری ایسی نہیں تھی جو اس کے آرٹ میں کوئی خامی پیدا کرتی —

ابسن کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی ' اس معاملے میں وہ بہت خوش نصیب تھا - اگر یہ مانا جاے کہ اس کو فطرت نے ایک خاص مشن کے لئیے چنا تھا تو غالباً اس انتخاب میں اس کی بیوی بھی شامل تھی ' بہ الفاظ دیگر اگر سوسانہ اس کی بیوی نہ ہوتی تو وہ اس مشن کے لئے منتخب نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو کامیابی اس کے لئے ناممکن ہو جاتی - "گڑیا کا گھر" کی ہیروئن کے برعکس ابسن کی بیوی ایک مستقل شخصیت کی مالک تھی ' اپنے خیالات اور جذبات میں وہ آزاد تھی ' ادب اور آرٹ کی نہایت اچھی نقاد تھی ' اور اپنے شوہر کی تصانیف اور خیالات پر بے تکلف نکتہ چینی کرتی تھی - اس کا دماغ روشن تھا اور اس کے خیالات میں بلندی تھی - کبھی کبھی بحث مباحثہ ہوتے ہوتے اختلات بھی پیدا ہو جاتا تھا ' مگر اس اختلات کا باہمی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا - ابسن کو پورا پورا احساس تھا کہ اس کی بیوی کا اس پر بڑا احسان ہے ' اس لئے اس نے ایک چھوٹی سی پاکیزہ نظم میں اس کا شکریہ ادا کیا ہے - ہم یہ نظم اوپر درج کر آئے ہیں - ابسن کے گھر میں آزادی ' محبت اور اخلاص کا رنگ چھایا ہوا تھا - اور علوم و فنون کا چرچا رہتا تھا - ابسن کی بیوی کو اس کے کمالات پر بہت پہلے سے اعتماد تھا - اسی بنا پر اس نے ابسن کے افلاس اور اس کی عارضی بے راہ روی کا کمال خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ' وہ ہر ممکن طریقے سے شوہر پر اپنا خوشگوار اثر ڈالتی رہی اور آخر کار کامیاب ہوئی - ابسن

بہت سی کتابیں خود نہیں پڑھتا تھا بلکہ اس کے بجائے اس کی بیوی یہ فرض انجام دیتی تھی اور ان تصانیف کے مطالب سے اپنے سوھر کو آگاہ کرتی رھتی تھی - اس کے علاوہ ابسن اپنی کوئی تصنیف اپنی بیوی کے مشورے کے بغیر طباعت کے لئے نہ بھیجتا تھا - اور اکثر اوقات وہ گور کی اسی دیوی سے فیض حاصل کرتا تھا - بیوی ' ماں ' اور بہن کی حیثیت سے مسز ابسن کا کریکٹر نہایت اعلیٰ تھا - کسی اور شاعر پر بیوی کا اتنا اچھا اثر شاید ھی پڑا ھو جتنا ابسن پر پڑا - اسی لحاظ سے میں نے اوپر کہہ آیا ھوں کہ اس جوڑے کے انتخاب میں خود فطرت کا ھاتھ تھا —

بادی النظر میں یہ معلوم ھوتا تھا کہ ابسن اور اس کی بیوی کی طبیعت ایک دوسرے سے بالکل جدا ھے - کہا جاتا ھے کہ ابسن کے " ماسٹر بلڈر " (Master Builder) میں جہاں سولنس اور اس کی بیوی کو ان بن دکھائی گئی ھے ' وھاں ابسن نے اپنے ھی گھر کا نقشہ کھینچا ھے - مگر یہ خیال حقیقت سے دور معلوم ھوتا ھے - ابسن کی بیوی میں خیال کی آزادی بدرجۂ اتم موجود تھی ' اور وہ اس آزادی میں کسی طرح کی مداخلت برداشت نہ کر سکتی تھی - مگر اس کے معنے یہ نہیں ھیں کہ ان دونوں کے تعلقات کسی عنوان سے بھی خراب تھے —

" آخری زمانے میں جب ابسن بستر مرگ پر پڑا تھا اس وقت بھی اُس کی زبان سے بار بار یہ الفاظ نکل جاتے تھے " میری پیاری ' چہیتی ' چاھنے والی بیوی " - ابسن کو عورت کی فطرت پر اعتماد تھا - اس کی محبت اور اس کے اخلاقی مشن کا وہ دل سے قائل تھا ' اور یہ درس اُس نے اپنی بیوی کی محبت اور اخلاق سے حاصل کیا تھا - ان میاں بیوی کی زندگی مثالانہ زندگی کا سچا نمونہ تھی - لیکن روحانی آزادی کی حفاظت کرکے

اُنہوں نے ہمیشہ اپنی شخصیت کو سنبھالے رکھا ' اور ایک دوسرے کو اس کا موقع دیا کہ جدا جدا اپنے دماغ اور روح کی تکمیل کرسکیں " —

انجمن شباب (The League of Youth) ابسن کا پہلا سوشل ڈراما ہے۔ نثر کے ڈرامے ابسن نے اس سے قبل بھی لکھے تھے ' لیکن اُس کے مشہور و معروف نثر کے ڈراموں کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس ڈراما پر تنقید کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابسن کے ایک دوسرے ڈراما " ماہر تعمیر " سے وہ مقام نقل کردیں جہاں اس نے استعارے میں اپنی تصانیف کی قسمیں بتائی ہیں۔ سولنس ہلڈا سے کہتا ہے کہ میں نے ابتدا میں گرجے تعمیر کئے ' یعنی شاعرانہ ڈرامے تصنیف کئے ' اسکے بعد آدمیوں کے لئے مکانات بنائے ' یعنی وہ سوشل ڈرامے لکھے جن کی مدد سے گھریلو زندگی کی اصلاح مقصود تھی۔ اس کے بعد ہوائی قلعوں کی تعمیر شروع کی۔ یہاں ابسن کے آخری ڈراموں کی جانب اشارہ ہے جو تخیلی رنگ میں ڈوبے ہوے ہیں۔ اس بیان کو ذہن میں رکھئے اور " انجمن شباب " کو ایک اصلاحی ڈراما تصور کیجئے ' جو ملک کی تمدنی حالت کو درست کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ سنہ ۱۸۶۸ اور سنہ ۱۸۶۹ ع کے موسم سرما میں تصنیف ہوا ' اور ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع کو کرسچیانا تھیٹر میں پہلی مرتبہ دکھایا گیا۔ مگر اس ڈرامے کے سیاسی رنگ نے حاضرین میں اتنا اشتعال پیدا کیا کہ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ پھر دو مرتبہ اسٹیج ہوا اور ختم ہونے سے قبل پھر وہی طوفانی مناظر رونما ہوئے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی خوبیاں لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے لگیں اور آخر کار یہ ناروے اور سویڈن میں ایک کلاسیکل ڈراما تصور کیا جانے لگا۔ یہاں پھر وہی بات ذہن میں رکھئے کہ ابسن اپنے زمانے سے آگے دیکھتا ہے

اور اس کی نظر میں وہ جلوے سمائے ہوئے ہیں جہاں تک اوروں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی —

پہلا ایکٹ ۱۷ مئی کو شروع ہوتا ہے جو ناروے میں ایک متبرک دن شمار کیا جاتا ہے، یہ ناروے کی آزادی کا دن ہے۔ اس روز شہروں اور دیہاتوں میں بڑا جشن منایا جاتا ہے، چیمبر لین کے مکان سے قصے کی ابتدا ہوتی ہے - چیمبرلین کا مکان جشن کا مرکز بنا ہوا ہے، گوشے گوشے سے رقص و سرود کی صدا آرہی ہے، درختوں میں رنگین قندیلیں آویزاں ہیں، بڑی بڑی میزوں پر قوا کہات چنے ہوئے ہیں، لوگ کثرت سے جمع ہیں، یہاں ہماری ملاقات استینس کارد سے ہوتی ہے جس کو اس دارما کا روح و رواں کہنا چاہئے۔ لوگ اس کا خیرمقدم کرتے ہیں اور عزت کی جگہہ دیتے ہیں، ایک شخص اس سے کہتا ہے ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ تم یہاں آکر آباد ہوئے۔ ہم نے اخباروں کے ذریعہ سے تمہاری قابلیت اور فصاحت کا حال سنا تھا - اخبار کے نمایندے استینس کارد سے ملنے کے لئے ٹوٹے پڑتے ہیں اور بار بار اُسے یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے اخبار آپ کے رشحات قلم کے لئے وقف ہیں - اسی زمانے میں انتخابات ہونے والے تھے، چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوجاتی ہے - اور موسین کہتا ہے :—

" اگر کچھہ کرنا ہے تو جلد کرنا چاہئے، ابتدائی انتخابات کے صرف تین یوم باقی ہیں " —

اس کے بعد جب خود موسین کا نام تجویز ہوتا ہے تو وہ دوسرے کی بات کات کر کہتا ہے میرے کاروبار کو نقصان پہنچے کا تو پہنچنے دو، اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ میری قوم کی بہبودی اسی میں ہے،

تو میں ذاتی معاملات کو یک قلم نظر انداز کردوں گا " ــــ

گفتگو جاری رہتی ہے ' اور اسی سلسلے میں چیمبرلین کے والد کا ذکر آجاتا ہے ' اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ناروے میں عہدے اور آسامیاں وراثت میں ملتی تھیں ' قابلیت کا کوئی معیار نہ تھا ' بلکہ جس خاندان میں جو عہدہ آ گیا وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا گیا - اسی بات چیت کے دوران میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شہر کے کار و بار کے لئے غیر ملکی افراد قابل ترجیح سمجھے جاتے تھے ' اور انہی کو کام دیا جاتا تھا - اسی طرح مختلف محکموں کی آسامیاں انہی لوگوں کو ملتی تھیں جو افسروں کے واقف کار اور بھروسے کے لوگ ہوتے تھے - اسی دوران میں چیمبرلین اپنی جماعت کے ساتھ آ موجود ہوتے ہیں - ان کی تعریف میں ایک چھوٹی سی تقریر کی جاتی ہے اور ان کے استقبال کے لئے نعرے لگائے جاتے ہیں ' اس کے بعد استینس کارڈ تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے ' لیکن وہ بار بار روکا جاتا ہے ' مگر اخر کار اس کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں :ــــ

" اب تقریر کرنے میں بھی مزاحمت کی جاتی ہے - سنتے ہو ' زبان بندی کا حکم نافذ ہونے والا ہے - اس ظلم کو دور کرو ' میں یہاں کھڑا ہو کر چو پاؤں کے گلے سے ہم کلام نہ ہوں گا - میں بولوں گا - تم بھی خاموش نہ رہو گے - ہم ایک دوسرے سے دل کی بات کہیں گے " -

" ہم ایسے خشک جشن سے باز آے جس میں آدمی کا دم گھٹتا ہے - ۱۷ مئی کے دن نیک کاموں کا زرین موسم شروع ہو گا - کیا یہ موسم بہار اور بالیدگی کا زمانہ نہیں ... ــــ "

چیمبرلین یہ تقریر سنتا ہے اور دم بخود رہ جاتا ہے - مقرر کی

اشتعال انگیزی بڑھتی جاتی ہے - لوگوں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں ' نو جوانوں کے دل اُچھلنے لگتے ہیں ' اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک خیمے کے اندر " انجمن شباب " کی بنا پڑتی ہے ' اور چیمبر لین چیں بجبیں ہوکر اپنی جماعت کے ساتھ رخصت ہوتا ہے —

دوسرے ایکٹ کی ابتدا استینس گارڈ اور سیلما کی گفتگو سے ہوتی ہے ' لیکن اس کے بعد ہی اول‌الذکر چیمبرلین سے ہم کلام نظر آتا ہے - وہ بوڑھے چیمبرلین سے اپنی صاف گوئی کی معافی چاہتا ہے - چیمبرلین اس کو تسکین دیتے ہوے کہتا ہے کہ میں اب بوڑھا ہوگیا دوسرے یہ میری طبیعت کے خلاف ہے کہ میں اصلاحی کوششوں میں سب سے آگے بڑھوں - تم میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مصلح میں ہونا چاہئیں - غرض استینس گارڈ کی تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ انجمن کے قائم کرنے سے اس کا اصل مدعا کیا ہے —

" ایک ایسی زندگی جو میری قابلیتوں کے لئے میدان مہیا کرسکے اور میری آرزوئیں پوری کرسکے ' یعنی یہ کہ میں پارلیمنٹ کا ممبر ہو جاؤں ' مجھے وزارت مل جاے اور ایک دولت مند اور باعزت خاندان میں میری شادی ہوجاے " —

قومی خدمت کا جذبہ ' خطابت کا جوش ' اور " انجمن شباب " کا تصور اس مقصد سے ٹکرا کر فنا ہوجاتا ہے - شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں قومی خادم ذاتی مقاصد کو نظر کے سامنے نہ رکھتے ہوں - بے غرض لوگ ہوتے ضرور ہیں لیکن ان کی تعداد اس قدر کم ہوتی ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے —

استینس گارڈ جب چیمبرلین کی پاکیزہ ستھری اور شریفانہ زندگی

پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے بہت رشک آتا ہے۔ "اس گھر کے انداز کیسے دلکش ہیں، یہاں زندگی کس قدر سبک روی کے ساتھہ حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کا فرنیچر کتنا نفیس ہے، یہاں کا طرز گفتگو کتنا لطیف ہے، یہاں آکر مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کی زندگی کیا شے ہے"۔ لیکن جب سلسلۂ کلام میں اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ میں چیمبرلین کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں توفیلڈبو اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ بہر حال اس فضا نے اسٹینس گارڈ کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ وہ اپنی تقریر میں جا بجا ترمیمیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس نے جو کچھہ چیمبرلین کے متعلق کہا تھا وہ اخبار میں شائع ہو۔ یہاں اخبارات کی پالیسی کے متعلق ایک دلچسپ بحث شروع ہوجاتی ہے۔ اڈیٹر اور مالک اخبار کہتا ہے کہ اس نے اسی اخبار کی بدولت یہ سرمایہ حاصل کیا ہے۔ لیکن اسٹینس گارڈ کے آتے ہی شہر میں نئے نئے خیالات پھیلنے لگے، جنھوں نے رفتہ رفتہ اخبار میں جگہہ پائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کے پرانے خریدار بد دل ہو کر علاحدہ ہو گئے۔ لیکن اب تو اس نئے سیاسی ہیرو کے دل و دماغ میں چیمبرلین کی بیٹی کا خیال بسا ہوا ہے اور اُس نے جو رنگ اختیار کیا تھا اسے چھوڑنے کی فکر کر رہا ہے۔ چنانچہ اخبار کے اڈیٹر کی گفتگو کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ اسٹینس گارڈ اپنی بے راہ روی کی تلافی کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چیمبرلین کے ایک مصاحب نے اس کے کان میں یہ بات کہی تھی کہ بجائے اس کے کہ تم دوسروں کی مدد کرو تم خود پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ دوسرے ایکٹ کے آخر میں اسٹینس گارڈ

اور چیمبرلین کے درمیان صفائی ہو جاتی ہے۔ اور آخرالذکر اس کی مدد کرنے کا پورا پورا وعدہ کر لیتا ہے —

تیسرے ایکٹ کے شروع میں ہم چیمبرلین کی پریشان حالی کا منظر دیکھتے ہیں، چنانچہ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ء سے جب ہمارے والد کا انتقال ہوا تھا دنیا بہت بدل گئی ہے، اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں خطاب اور سرکاری اعزاز کی کچھ زیادہ قدر نہیں کرتا، لیکن مجھے اپنے خاندان کی وہ دیانت داری بہت عزیز ہے جو نسلاً بعد نسل ہمارے گھر میں پختہ تر ہوتی ہوئی چلی آتی ہے، اسی لئے میں پارٹیوں کی تفریق پیدا کرنے والی سیاست سے دور رہتا ہوں۔ یہاں یہ راز کھلتا ہے کہ چیمبرلین کا فرزند اپنے والد کے دشمن موسن سے مل کر ایک تجارتی کاروبار میں شریک ہو جاتا ہے۔ باپ یہ چاہتا ہے کہ لڑکا گھر پر رہ کر عزت آبرو کی زندگی بسر کرے، ورنہ وکالت کی جانب متوجہ ہو، لیکن اس نے موسن سے میل جول پیدا کیا جو چیمبرلین کی نگاہ میں شہر کی عام بد اخلاقی کا ذمہ دار تھا۔ وہ اسی واقعہ سے کیا کم بد حواس تھا کہ استینسں گارد یہ کہہ کر اسے اور زیادہ پریشان کر دیتا ہے

" آپ اور آپ کی بیٹی دونوں بہت جلد
مجھ سے محبت کرنے لگیں گے "

ظاہر ہے کہ یہ اعلان حقارت سے سنا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم استینسں گارد اور بوڑھے لں دے استاد کو ایک اہم مکالمے میں مشغول پاتے ہیں۔ آخرالذکر یہ کہتا ہے کہ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں۔ پارلیمنٹ سے کنارہ کشی کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میری جگہ موسن پارلیمنٹ میں جگہ پائے۔ اس بنا پر وہ استینسں گارد کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ خود

پارلیمنٹ کا امیدوار بنے - یہاں شہر کی فرقہ بندی پر روشنی ڈالی جاتی ہے - اور یہ بتایا جاتا ہے کہ شہر کی ایک جماعت وہ ہے جس میں دولت، وسائل، قوت اور آزادی کے سرمایہ دار شامل ہیں - دوسری جماعت شہر کی نئی پود اور عوام الناس پر مشتمل ہے' جو ان برکتوں سے عموما محروم ہیں - استینس کارڈ اس جماعت کا رکن رکین ہے' اس کا دوست یہ بھی کہتا ہے کہ ملک میں بہت سی دولت مند اور صاحب جائداد لڑکیاں موجود ہیں' ان میں سے کسی ایک سے شادی کرتے ہی وہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں آن واحد میں منتقل ہو سکتا ہے - ہمارا دوست اس جال میں فوراً پھنس جاتا ہے اور بے تابی کے ساتھ کہتا ہے کہ یہی میری دیرینہ دلی آرزو ہے - مجھے خود اسی کی تلاش تھی' خدا کے لئے اس معاملے میں میری مدد کرو —

تیسرے ایکٹ کی ابتدا میں پھر چیمبر لین اور استینس کارڈ میں ردو بدل ہوتی ہے —

چیمبر لین :- تاریکی میں غائب ہو جاؤ' یا پاگل خانے میں پناہ لو' تمہیں وہیں ہونا چاہئے —

استینس :- میں کہے دیتا ہوں کہ مجھ میں خدا کا قہر موجود ہے' تم اس کی مشیت کی مخالفت کر رہے ہو —

استینس کارڈ کے جانے کے بعد چیمبر لین کہتا ہے کہ ایسے گستاخ اور بدمعاش سے مجھے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا .... لیکن اس کے بعد ہی وہ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اس بدمعاش میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو مجھے دل سے پسند ہیں - یہ سین ختم نہیں ہوتا کہ موسن آ موجود ہوتا ہے - اس کو دیکھتے ہی چیمبر لین کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے -

وہ مکالمے کے دوران میں موسن سے کہتا ہے کہ تمہیں یہ عروج اور دولت نا جائز طریقوں سے حاصل ہوئی ہے - جس کا جواب موسن کے پاس یہ ہے کہ بیوپار کی دنیا میں اتار چڑھاؤ ایک عام بات ہے - ایک شخص کے عروج کے ساتھ ساتھ بہت سے افراد کی تباہی وابستہ ہوتی ہے جس کا چارہ کار قانون کے پاس بھی نہیں - چیمبرلین' موسن کے استدلال سے زچ ہوجاتا ہے' لیکن اس کی مالی امداد کرنے سے صاف انکار کردیتا ہے اور اس کا بھی روادار نہیں ہوتا کہ اس کا نام بطور ضامن کے پیش کیا جائے - یہاں اس راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایک دو ہزار کے بل پر چیمبرلین کے جعلی دستخط دئیے گئے تھے - اس کو سنتے ہی وہ پریشان ہوجاتا ہے اور اپنے مصاحبوں کو سیونگ بنک اور آئرن ورکس بنک میں تفتیش کے لئے روانہ کرتا ہے - دوسرے سین میں چیمبرلین کا لڑکا آتا ہے اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ آپ میری مدد کیجئے ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا - باپ مدد کرنے سے انکار کرتا ہے - ایرک پر مایوسی طاری ہوجاتی ہے - اتنے میں سیلما آتی ہے - ایرک اس سے کہتا ہے کہ میری عزت' گھر' بار' اور بزرگوں کا نام سب خاک میں مل گیا - آؤ ہم دونوں اس مصیبت کو برداشت کریں' سیلما چیں بجبیں ہوکر جواب دیتی ہے —

" تم نے میرے ساتھ ہمیشہ ظلم کیا - نہایت سرمناک طریقے سے ... تم نے ... مجھے ہمیشہ تمہارا احسان قبول کرنا پڑا - میں خود کچھہ نہ دے سکی' میں تمہارے ہاں ہمیشہ مفلس رہی - تم نے مجھہ سے کبھی کوئی قربانی طلب نہ کی - گویا میں کسی قابل ہی نہ تھی - میں تم سے نفرت کرتی ہوں' نفرت ! "

میں تمہاری مصیبتوں اور پریشانیوں کے ایک قطرہ تک کی

پیاسی رہی' میں نے جب منت کی تم نے ہمیشہ ہنسی میں
بات ٹال دی - تم نے مجھے ایک گڑیا بنا رکھا ہے' تم مجھ سے
اس طرح کھیلتے رہے جیسے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں - میں نے
ہمیشہ اس کی تمنا کی کہ میں تمہارا بوجھ اٹھانے میں شریک
ہوجاؤں' اور کارزار حیات میں ذمہ دارانہ حصہ لے سکوں' ایرک! اب
تم اس لئے میرے پاس آتے ہو کہ تمہارے پاس کچھ نہیں رہا -
مگر میں اس کو گوارا نہیں کرسکتی کہ مجھے ایک آخری وسیلہ
سمجھا جائے - اب مجھے تمہاری تکالیف سے کوئی سروکار نہیں'
میں تمہارے ساتھ اب نہیں رہ سکتی' اس سے بہتر ہے کہ میں
سڑکوں پر گاتی بجاتی پھروں' مجھے جانے دو' جانے دو"— (ایکٹ تھسرا)
سیلما چلی جاتی ہے اور قبل اس کے کہ چیمبرلین اپنے دل و دماغ کا جائزہ
لے سکے اسے بتایا جاتا ہے کہ بلکوں سے یہ پتہ چلا ہے کہ دو ہزار ڈالر کے
ایک بل کے سوا اور کوئی اس کا دستخطی بل بنکوں میں موجود نہیں -
اسی اثنا میں لن ڈے اسٹاڈ اور فیلڈبو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جعلی بل
اسٹینس گارڈ کے پاس پہنچ چکا اور وہ اسے انتخابات میں استعمال کرنا چاہتا
ہے - یہ سنتے ہی چیمبرلین کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں —

چوتھے ایکٹ میں سب سے پہلے مادام رنڈھول میں سے ملاقات ہوتی ہے'
گو اب ان کے گلستان حسن کی دیواروں پر محض تھوڑی تھوڑی دھوپ باقی ہے
لیکن اب بھی انہیں شوہر کی جستجو ہے' ان کے پبلک ہاؤس میں شہر
کے سیاسی مذاق کے بے فکروں کا مجمع ہوتا ہے - اسٹینس گارڈ اور اڈیٹر
اسلاک سین موجود ہیں اور مخالف اور موافق ووٹ کی تعداد کے متعلق
گرما گرم بحث ہو رہی ہے - مقام رائے شماری سے لوگ برابر آتے اور خبریں

سناتے جاتے ھیں، اسی اثنا میں ڈاکٹر فیلڈبو آتا ھے۔ اور اسٹینس گارڈ کو یہ خوشخبری سناتا ھے کہ اُسے زیادہ ووٹ مل رھے ھیں۔ ان دونوں میں پھر چیمبرلین کے متعلق بات چیت شروع ھو جاتی ھے اور آخر میں اسٹینس گارڈ یہ کہتا ھے :—

"مجھے اس گندے ماحول سے جلد نکلنا چاھئے، آخر اس خشک فضا میں کب تک پھنسا رھوں ..... اگر میں اسی طرح عوام الناس کے گھروندے میں بند رھا تو میرے جذبات مردہ ھوجائیں گے مجھے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ میرے الفاظ سے برقی اثر غائب ھورھی ھے، مجھے تازہ ھوا کے لئے کہیں جگہ نہیں ملتی ... "

اسی مکالمے میں لی ڈے اسٹاد بوی آکر شریک ھو جاتا ھے، اور اپنے دوست کو وہ جعلی بل دکھاتا ھے جس پر چیمبرلین کی عزت کا دار و مدار تھا۔ اسٹینس گارڈ اس بل کو دیکھ کر بہت ملول ھوتا ھے۔ اس کے جذبات میں ایک تلاطم برپا ھو جاتا ھے اور وہ اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کرتا ھے کہ میں قربانی کے لئے تیار ھوں۔ اتنے میں باس تو ان آموجود ھوتا ھے اور اپنے دوست اسٹینس گارڈ سے التجا کرتا ھے کہ اُس کی سفارش اُس کی معشوقہ مادام سے کر دے کیوں کہ مادام کی بہن چیمبرلین کے یہاں کام کرتی ھے، ممکن ھے کہ اس کے وسیلے سے باس تو ان کو کچھ اچھے ٹھیکے مل جائیں۔ مگر اس انداز کلام کا اسٹینس گارڈ پر برا اثر ھوتا ھے اور وہ اپنے دوست سے کہتا ھے کہ ٹھیکوں کا نام لے کر محبت کی توھین نہ کرو۔ اس کے بعد ھی مادام آموجود ھوتی ھے اور اسٹینس گارڈ اس کو بغیر اپنے دوست کا نام بتائے شادی کے لئے راضی کر لیتا ھے۔ یہ

بات ختم نہیں ہوتی کہ موسن کی بیٹی اپنے باپ کی تلاش میں وہاں آجاتی ہے - اس کو دیکھتے ہی ہمارے دوست کی حالت غیر ہوجاتی ہے اور وہ اپنی داستان درد چھیڑ دیتا ہے - راگنا بات کو ٹال کر چلی جاتی ہے اور جاتے وقت یہ کہہ جاتی ہے کہ خدا کا شکر ہے مجھے تمہاری عیاری کا وقت پر پتہ چل گیا، ورنہ میں مصیبت میں پھنس جاتی - اسٹینس گارڈ انتخابات میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد جعلی بل ایک لفافہ میں رکھ کر رنگڈال کی معرفت اس پیام کے ساتھ چیمبرلین کے پاس بھیج دیتا ہے کہ میں اس طریقے سے اپنے دوستوں کے ساتھ سلوک کیا کرتا ہوں خصوصاً ان کے ساتھ جو میرے خلاف ووٹ دیتے ہیں - اس واقعے سے چیمبرلین اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہونے لگتا ہے - اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ موسن کا کاروبار بگڑ جاتا ہے اور وہ قرض خواہوں کے ڈر سے فرار ہو جاتا ہے - اس ناکامی میں چیمبرلین کا لڑکا ایرک بھی ملوث ہے، چنانچہ اسے خیال ہوتا ہے کہ آج میرے قدیم خاندان کی آبرو برباد ہوتی ہے - اس لئے مجھے پبلک عہدے سے دست بردار ہونا چاہئے - ڈاکٹر فیلڈبو اس کو تسکین دیتے ہوے کہتا ہے کہ زندگی میں محض مسرت کو مقصد حیات بنانا اچھا نہیں ہے —

" آپ کی خوشی ایک سراب تھی، - آپ نے بہت سی چیزوں کی بنیادیں کھوکلی رکھی ہیں - یہ آپ کی کوتاہ نظری اور خود رائی کا نتیجہ ہے - آپ اپنے خاندانی اعزاز پر ناز کرتے ہیں لیکن اس اعزاز کی کبھی جانچ بھی ہوئی ہے ؟ ...... آپ نے اپنے لڑکے کی ذہنی تربیت ضرور کی لیکن اس کے کیرکٹر کی تعمیر آج تک نہیں ہوئی ...... لوگ سیکھتے ہیں لیکن جو سیکھا

ہے اسے عمل کا جامہ نہیں پہناتے ... سینکڑوں انساں ہیں جن
کی سیرت نا تمام ہوتی ہے ان کے خیالات اور جذبات کچھ ہوتے
ہیں، اور ان کی عادتیں اور افعال کچھ اور ہوتے ہیں ...... "

اسی سلسلے میں وہ اسٹینس کارڈ پر ایک سخت حملہ کرتا ہے،
لیکن چیمبرلین اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے اور اسے یقین دلاتا ہے کہ اس نے
اسٹینس کارڈ کو پوری طرح سمجھا نہیں - جب ڈاکٹر کو یہ پتہ چلتا
ہے کہ اس نے وہ دعوتی دل خود بخود چیمبرلین کو بھیج دیا تو اس کے
تعجب اور ندامت کی کوئی انتہا نہیں رہتی - چیمبرلین اس کی خوب
خبر لیتا ہے اور کہتا ہے میرا ارادہ ہے کہ " انجمن شباب " میں شریک ہو جاؤں -
اب لائے اسٹاف داخل ہوتا ہے اور چیمبرلین کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری
پالیسی خود ہماری ذات تک محدود ہے، لیکن اسٹینس کارڈ کے طرز
عمل کا اثر جمہور پر پڑتا ہے - اسی گفتگو میں وہ رئیس شہر کو مشورہ
دیتا ہے کہ خیالات جدید اصل میں ایک قسم کے بھوت ہوتے ہیں جنہیں
صندوق میں بند کر کے مقفل نہیں کیا جا سکتا - اس لئے بہتر یہی ہے کہ
ان سے سمجھوتہ کر لیا جائے —

پانچویں ایکٹ کے آخری حصے میں ڈرامے کے تقریبا سارے افراد چیمبرلین
کے عالی شان مکان پر اکٹھا پائے جاتے ہیں اور اس موقع پر اُس راز کا انکشاف
ہوتا ہے جو اس ڈرامے کی جان ہے - رئیس شہر کی تائید سے فیلڈ بو اس امر
کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی منگنی چیمبرلین کی بیٹی تھورا سے ہو گئی- یہ
خبر سنتے ہی اسٹینس کارڈ کے ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے ہیں، لیکن وہ
اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ راگنا
اور ہیلے کی منگنی کا باضابطہ اعلان ہو وہ کہتا ہے :—

" اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حقیقی جذبات کو چھپانے کے لئے
میں حیلے سے کام لوں - جب رفاہ عام کا معاملہ ہو تو میں اسے جائز
سمجھتا ہوں - میری زندگی کا کام یہیں پھیلا ہوا ہے - اور میرے
لئے یہی بہت ہے - میں نے اس شہر کے لئے اپنی ساری قوتیں
وقف کردی ہیں - مجھے یہاں کے خیالات الجھے ہوے معلوم ہوتے
ہیں ' جنھیں سلجھانا میرا فرض ہے ' مگر یہ کام صرف ایک آوارہ
گرد سے انجام نہیں پا سکتا - اس شہر کے لوگوں کو بھی میرا
ساتھ دینا ہوگا - اس لئے میں نے اپنے اغراض آپ کے اغراض سے
وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے ' اگر میں نے اتفاقاً جھوٹی
اُمید کو بیدار کیا ہو تو مجھے معاف کیجئے ' میری بھی
منگنی ہو گئی ہے ! " —

اس تقریر کے بعد یہ سب سمجھتے ہیں کہ اسٹینس کارت کی محبوبہ
مادام رندھول میں ہے - پھر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ خطوط میں رد و بدل
ہو گئی اور جو خط اسٹینس کارت کی جانب سے راگنا کو ملنا چاھئے تھا
وہ مادام کو وصول ہوا اور جو باس تی ان کی جانب سے مادام کو ملنا
چاھئے تھا وہ راگنا کے پاس پہنچا - اس گتھی کو سلجھانے کے لئے ذرا مزید
تفصیل کی ضرورت ہے :—

چیمبرلین :— (مادام سے) تم اپنی بہن کو مبارک باد نہیں دیتیں ؟

مادام :— کس کو ؟

تھورا :- راگنا کو ! ان کی بھی تو منگنی ہو گئی ہے !

باس تی ان :— راگنا کیا تمھاری منگنی ہو گئی ؟

مادام :— سچ مچ ! باس تی ان کہتے تھے کہ کوئی شخص ان سے شادی کی

درخواست کر رہا ہے - میری دعا ہے کہ دولہا دلہن خوش رہیں - مسٹر
استینس کارڈ میں اپنے خاندان میں تمہارا خیر مقدم کرتی ہوں —

فیلڈبو :- نہیں یہ نہیں ہیں —

چیمبرلین :- یہ نہیں بلکہ مسٹر ہیلے ہیں ' نہایت اچھی پسند ہے - اور ہاں !
میری لڑکی کو بھی تو مبارک باد دو —

مادام :- مس بریٹسبرگ ! تو پھر لن تے اسٹڈد ٹھیک کہتے تھے !
مس تھورا ! میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں - اور مسٹر استینس کارڈ
تمہیں بھی !

فیلڈبو :- یعنی ڈاکٹر فیلڈبو کو -

مادام :- یعنی ؟

فیلڈبو :- وہ خوش نصیب میں ہوں -

مادام :- خوب ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ماجرا ہے -

چیمبرلین :- مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے -

استینس کارڈ شرمندہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور چیمبرلین اطمینان کی
سانس لیتا ہوا کہتا ہے خس کم جہاں پاک - حسر کو خوش دیکھ کر
سیلما اپنے شوہر کی سفارش کرتی ہے اور رئیس شہر اپنے بیٹے کی خطا
معاف کرکے کہتا ہے کہ اب میں خود ایرک کا شریک بن کر کاروبار چلاؤں گا - تھورا '
سیلما اور مادام رنڈھولمین سب خوش خوش اپنے اپنے مشاغل میں ملبھک ہو جاتے
ہیں اور ابسن کا پہلا سوشل ڈرامہ ختم ہوتا ہے —

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈراما میں ابسن نے جو خیالات
ظاہر کئے ہیں ان پر ہم ایک گہری نظر ڈالیں - سب سے پہلے ابسن موروثی

عہدے کو لیتا ہے اور اپنے ابنائے وطن کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ملکی انتظام میں وراثت کو جگہ دینا ایک شدید غلطی ہے - یہ ضروری نہیں کہ زید کا بیٹا زید ہی کی طرح ملک کے لئے مفید ہو اور اگر وہ ملک کے لئے مفید نہیں ہے تو اس کا اپنے باپ کی جگہ مقرر کیا جانا ایک نا روا بے انصافی ہے جس کا خمیازہ ملک کو اُٹھانا ہوگا - قرون وسطیٰ میں جب علوم و فنون کے خزانوں تک عوام الناس کا پہنچنا دشوار تھا اس وقت موروثی عہدوں کے کچھ معنی ہو سکتے تھے' لیکن دنیا کی تاریخ کے اس دور میں جب حصول علم میں 'محمود' اور 'ایاز' کی تمیز باقی نہیں رہی' ذہانت اور قابلیت کو حقوق خاندانی پر قربان کر دینا آئین ملک داری کے خلاف ہے- یہ ضرور ہے کہ وراثت اور خاندان کے ماحول کا اثر بچے پر پڑتا ہے' لیکن یہ اثر محدود ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھی تو بالکل مفقود ہوتا ہے - اس لئے مصالح کو توارث کا تابع بنانا ایک خطرناک تجربہ ہے - اس میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں- اولاً یہ کہ جب میراث پانے کا بھروسہ ہوتا ہے تو اولاد غافل اور جاہل رہ جاتی ہے' دوسرے مستحقوں کی حق تلفی ہوتی ہے- پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ چیمبرلین خاندانی اعزاز کے گھمنڈ میں ایرک کو نہ تو وکالت کرنے دیتا ہے اور نہ اس کا تجارت میں شرکت کرنا پسند کرتا ہے - مگر ایرک اپنے باپ کی مرضی کے خلاف تجارت شروع کر دیتا ہے کیوں کہ وہ چاہتا ہے کہ کوئی شے تو ایسی ہو جس کی خاطر وہ زندگی بسر کرے' جو اس کی تمنائی اور آرزوؤں کا مرکز بن سکے - فطرت ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ انسان ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح بے جان ہو جائے —

اس کے بعد ہماری نگاہ ایرک سے ہٹ کر اس کی بیوی سیلما پر پڑتی

ہے۔ سیلما نوجوان اور اغلباً حسین اور ذہین ہے، لیکن سوسائٹی میں اس کی حیثیت کچھ نہیں، اس کا شوہر اُسے ایک کھلونا سمجھتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس سے محبت کرتا ہو لیکن وہ اس کی شریک حیات کسی طرح نہیں کہی جاسکتی اور جو بیوی شریک حیات نہیں ہوسکتی وہ ہرگز بیوی نہیں، بلکہ محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ اس خیال کو ابسن نے پوری وضاحت اور دلیری کے ساتھ "گڑیا کا گھر" میں بیان کیا ہے جس کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔

یہاں سیلما کے اس بیان کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے جس میں وہ شکایت کرتی ہے کہ جب سر سے پانی گذر گیا تب اس کا شوہر اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ابسن کے وطن میں عورتوں کی حیثیت سوسائٹی میں بہت پست تھی اور مردوں کا خیال تھا کہ ان سے مشورہ لینا، ان کو شریک غم اور ہمدرد تصور کرنا، ان کے روبرو اہم معاملات پر گفتگو کرنا، ان کو صاحب عقل و دانش سمجھنا سراسر نادانی ہے۔ اس لئے چیمبرلین کے ہاں اہم معاملات پر بات چیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب عورتیں وہاں موجود نہیں ہوتیں۔ ہم ابسن کے زمانے میں وہاں عورتوں کی وہی حالت دیکھتے ہیں جو اب مشرقی ممالک کی ہے بلکہ مشرقی ممالک کے بعض، صرف ہندوستان اور چین کہنا چاہئے کیوں کہ اور مشرقی ممالک تو بہت آگے بڑھ رہے ہیں۔ "ابسوں سنیپ" کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے فرائض بہت کم ہیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اُمور خانہ داری میں مہارت تامہ رکھتی ہوں، میزبانی کے فرائض سے کماحقہ واقف ہوں اور بس۔ سیاست، لٹریچر، فلسفہ کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی تھی، خیالات میں اور معاشی زندگی میں انہیں مطلق آزادی حاصل

نہیں تھی - وہ محض ماں، بہن، بیٹی اور بیوی سمجھی جاتی تھیں، گویا ان کا وجود محض اضافی تھا، کتابیں وہ پڑھ سکتی تھیں لیکن محض مذہبی کتابیں- ابسن ان حالات کے خلاف جہاد کرتا ہے، اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کے وطن کی عورتوں میں بیداری پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ ایک موقع پر جس کا ہم اوپر ذکر کر آے ہیں ایک محفل منعقد کرکے ابسن کی تعلیم و تبلیغ کا شکریہ ادا کرتی ہیں —

قصے کے دوران میں اخبار کے ایڈیٹر اسلاس کین کا کیرکٹر بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے - ایڈیٹر کے فرائض جس قدر سخت ہوتے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور منصب کے ہوں - سرکاری ملازم دن بھر کام کرتا ہے اور رات کو مزے کی نیند سوتا ہے - جب محلےاور شہر کے اُچکے اور بدمعاش قابو میں آجاتے ہیں تو پولیس کے ملازمین کو بھی عافیت حاصل ہو جاتی ہے - لیکن ایڈیٹر کو ہمیشہ چوکس رہنا پڑتا ہے- اس کو آپ ملک کی ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی حالت کی جانب سے ہمیشہ متردد اور فکر مند پائیں گے - بعض اوقات ملک پر یکایک سیاسی ہیجان چھا جاتا ہے - کبھی اخلاق کی اصلاح کی شدید ضرورت ہوتی ہے - کبھی معاشرت کے معاملات اس قدر پیچیدہ ہوجاتے ہیں کہ خدا کی پناہ - وہ ایڈیٹر جو حقیقی کامیابی کا آرزومند ہو نہ غافل ہوسکتا ہے اور نہ اپنا نقطۂ نظر بار بار بدل سکتا ہے - اس کے خیالات میں استحکام اور استواری نہایت ضروری ہے - مگر اسلاس کین بالکل تھالی کا بینگن ہے - ابھی وہ استیلس گارد کی خوشامد کرتا ہے اور ابھی چیمبرلین کی چاپلوسی میں سرگرم نظر آتا ہے - اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ابسن اپنے ملک کی صحافت سے کتنا بدظن تھا —

اب ذرا ہم اس ڈرامے کے ہیرو کی سیرت کا بھی جائزہ لیں اور یہ

دیکھیں کہ "انجمن شباب" کہاں تک کامیابی حاصل کرتی ہے اور اگر
ناکام ہوتی ہے تو اس ناکامی کی کیا وجوہ ہیں - اسٹینس گارڈ اس کا
اعتراف کرتا ہے کہ چیمبرلین اور اس کا دوست لن دے استاد دونوں میدان
عمل میں متحد ہیں اور جو کچھ کہ چیمبرلین کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ
دراصل اخرالذکر کے خیالات ہوتے ہیں - چنانچہ رئیس شہر کی موجودگی
میں اسٹینس گارڈ "انجمن شباب" کے انعقاد کا اعلان کرتا ہے' اور کہتا
ہے کہ ملک میں ابتری کی علامات اس قدر نمایاں ہو گئی ہیں کہ اصلاح
کی جو توقعات ہو سکتی تھیں وہ بھی خاک میں ملی جارہی ہیں - وہ اپنے
وطن کی افسوس ناک حالت دیکھتا ہے اور رنج کے آنسو بہاتا ہے - اس کے
بعد وہ اپنے دوست فیلڈبو سے یہ کہتا ہوا کہ ہمیں تاریک رسوم و افعال
کو جلد سے جلد برباد کردینا چاہئے وہ دلچسپ خواب بیان کرتا ہے جس
میں اس نے شہنشاہوں کو ایک سخت طوفان کی حالت میں اپنی سلطنتوں
کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا جو ہوا کے جھونکوں میں اڑی
جا رہی تھیں - مگر قبل اس کے کہ یہ طوفان برپا ہو' آندھیاں نظام
عالم کو زیر و زبر کریں اور بادشاہ اپنی اپنی ریاستوں کے پیچھے بھاگیں
اسٹینس گارڈ پر خود ایک تغیر واقع ہوتا ہے اور وہ اپنا پرانا سبق
بھول کر رئیس شہر کے دولت کدے کے ساز و سامان سلیقہ و پاکیزگی ' اطاعت
اور حسن و خوبی سے مسحور ہو جاتا ہے - عورتوں کے حسن و ادا جادو
نظری اور دلفریبی کا اس پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ ملک کی اصلاح سے غافل
ہو جاتا ہے اور آرزو کرنے لگتا ہے کہ میری شادی ایک دولت مند اور
تعلیم یافتہ خاندان میں ہو جائے - وہ چیمبرلین کی حالت کا اپنی حالت سے
مقابلہ کرتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ میری زندگی بھی کیسی

خشک بے مزہ اور محبت سے خالی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ جذبہ حب وطن کو بالکل فراموش کردیتا ہے اور شادی کے چکر میں پڑ کر ایک نہایت خود غرض انسان بن جاتا ہے اور بد قسمتی سے اپنے اغراض میں بھی نا کام رہتا ہے۔ سچ ہے قوم کی خدمت کا دعوی کرنا سہل ہے لیکن اس وادی پر خار میں جتنی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں ان کا صحیح اندازہ وہی کرسکتے ہیں جنھوں نے اس وادی میں قدم رکھا ہو۔ قدم قدم پر اس قدر ترغیبات سد راہ ہوتی ہیں کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ با اثر کامیاب اور لائق قومی خدمت گذاروں کے لئے حکومت کی جانب سے نئے نئے جال ڈالے جاتے ہیں۔ دولت کا وعدہ کیا جاتا ہے، ثروت کا لالچ دیا جاتا ہے، دھمکی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کٹھن راہ میں وہی کامیاب ہوتے ہیں جو مجنوں کی طرح سر فروشی کے لئے آمادہ ہوں۔ جب تک سچا ایثار اور بے نفسی نہ ہو قوم کی خدمت کا دعوی کرنا فضول ہے —

در رہ منزل لیلی کہ خطر ہاست بجان شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

" انجمن شباب" کے بعد ہی " سوسائٹی کےستون " "The Pillars of Society" کا نمبر آتا ہے، یہ ڈراما سنہ ۱۸۷۷ ع میں تصنیف ہوا۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ ابسن کے پیش نظر اصلاح معاشرت کا مقصد ہے۔ پہلے ایکٹ کی ابتدا قنصل برنک کے مکان میں ہوتی ہے۔ پائیں باغ میں خواتین جمع ہیں اور ایک پادری سے باتیں کر رہی ہیں۔ قنصل کا لڑکا اولف تیر و کمان لئے ادھر ادھر دوڑتا پھرتا ہے اور نشانہ بازی کر رہا ہے۔ اسی اثنا میں جہازوں کا معمار اون داخل ہوتا ہے جس کو قنصل کی جانب سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی تقریریں بند کردو۔ مستورات پادری سے گفتگو میں مصروف ہیں، پادری یہ کہہ رہا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اخلاقی اوصاف سے عاری

ہوتی ہیں۔ اور مثال کے طور پر وہ امریکہ کے اُن جہاز رانوں کا ذکر کرتا ہے جو اس وقت بلدرگاہ میں آئے ہوئے تھے۔ وہ زمانے کی ابتری کا نوحہ خواں ہے:-

" ہر طرف شکوک اور ہیجان کی علامات ہویدا ہیں۔ لوگوں کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں ہر طرف بے اطمینانی موجزن ہے' دیکھو خاندانی اہتمام کا شیرازہ کیونکر بکھر رہا ہے اور تخریب کی روح کس طرح اہم ترین حقائق پر حملہ کر رہی ہے ..." —

اسی گفتگو کے دوران میں اس ریلوے کا ذکر آ جاتا ہے جو گذشتہ سال اس نواح میں جاری ہونے والی تھی۔ اور جو قنصل کی کوششوں سے روک دی گئی تھی۔ عین اسی وقت قنصل کابینہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا اسی ریلوے اسکیم پر گفتگو کر رہا ہے۔ گفتگو اس قدر زور شور سے ہوتی ہے کہ عورتیں چونک پڑتی ہیں۔ اسی اثنا میں هلمر آ موجود ہوتا ہے۔ یہ نوجوان مسز برنک کا رشتے کا بھائی ہے اور اپنی باتوں سے اور حرکتوں سے مسخرا سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا کیرکٹر ان سب لوگوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ خواتین قدر سردہ اور بے حس ہیں جیسے عجائب خانوں میں ممیاں ہوتی ہیں۔ ان کے خیالات پر مذہب کا اس قدر گہرا رنگ طاری ہے کہ آزادی کے ساتھ سانس بھی نہیں لے سکتیں۔ باتیں بھی کرتی ہیں تو مذہب کے رعب سے دبی ہوئی آواز میں' ان کی شخصیتیں معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی روایات' مذہبی تعصبات اور رسم و رواج میں محو ہو کر عرصہ ہوا فنا ہو چکی ہیں۔ هلمر آتے ہی اول تو اس مذہبی کتب پر حرف گیری شروع کرتا ہے جو یہ خواتین پڑھ رہی تھیں اور اس کے بعد اولف کو تیر و کمان سے کھیلنے کے بجائے بندوق سے کھیلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ خواتین ان آزاد خیالی کی باتوں پر ھکا بکا رہ جاتی ہیں۔ هلمر پادری پر حقارت کی نظر ڈالتے

ہوے اس بات پر زور دیتا ہے کہ قوم کے بچوں میں ہر ممکن طریقے سے ہمت ' شجاعت اور بہادری پیدا کرنی چاہئیے - اولف اپنے ماموں کی شہ پا کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ امریکہ جانے کا آرزو مند ہے تا کہ یوحان اور لونا سے مل سکے - یہ بات سنتے ہی مسز برنک اُسے اس قدر زور سے للکارتی ہیں کہ وہ دم بخود رہ جاتا ہے ' باتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے اور خواتین اس امر پر مسرت کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کے قصبے سے رقص ' موسیقی اور تمثیل کے کلب غائب ہو گئے جن کی وجہ سے اکثر خاندانوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی - اس کے بعد مسز برنک پائیں باغ میں جاکر میزوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہیں اور بقیہ عورتوں میں یوحان اور لونا کے افسانے کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یوحان کو اپنے وطن سے مجبوراً فرار ہونا پڑا تھا ' کیونکہ وہ ڈینا کی ماں کے ساتھ ملوث ہو چکا تھا - ایک اور وجہ جس سے وہ فرار ہونے پر مجبور تھا یہ تھی کہ وہ مسٹر برنک کے والد کے دفتر کا خزانچی تھا اور جو روپیہ اس کی تحویل میں تھا اس میں غبن ثابت ہوا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے فرار ہونے کی اصلی وجہ کسی کو معلوم نہ ہو سکی - مگر ڈینا کے والد نے اپنی بیوی اور بچی ڈینا دونوں کو چھوڑ دیا ' ناکامی اور تنگ دستی نے ماں کو جلد قبر میں جا سلایا اور ڈینا کو اس مکان میں عافیت نصیب ہوئی - اسی سلسلے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوحان لونا پر عاشق تھا اور وہ اس کے ساتھ امریکہ چلی گئی —

اس کے بعد کے سین میں ڈینا کا کیرکٹر ایک دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے - وہ پادری کے پندار و تمکنت کے پرزے اڑاتی ہے ' اور

اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ کبھی اپنی خودسری سے باز نہیں آ سکتی۔ پھر کہتی ہے کہ میں اس گھر سے عاجز آگئی ہوں جہاں لوگ اس قدر سخت گیر اور ثقہ ہیں کہ سانس لینا بھی دشوار ہے۔ اصل میں اسے نہ تو یہ پادری دل سے پسند ہے اور نہ اس کی باتوں میں لطف آتا ہے۔ وہ اس کی شکایت کرتی ہے کہ آخر وہ اپنی محبت چھپانے کی غیر ضروری کوششیں کیوں کرتا ہے۔ پادری جواب دیتا ہے کہ میں سوسائٹی کا اخلاقی ستون ہوں اس لئے مناسب نہیں کہ میرے جذبات عوام الناس پر ظاہر ہوں پھر بھی اسے امید ہے کہ جب تقدیر یاوری کرے گی تو دینا اس کی محبت کی قدر کرنے کو طیار ہوگی۔ دینا جذبات کا ایک امنڈتا ہوا دریا اپنے دل میں لئے ہوے اس سے اقرار محبت کر لیتی ہے —

دوسرے سین میں برنک کا بیغہ کی مجلس ختم کر کے ممبروں کے ساتھ پائیں باغ میں آتا ہے۔ اور میزوں کے چاروں طرف حلقہ جمتا ہے۔ وہ اطمینان کی سانس لیتا ہوا اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ریلوے اسکیم آخر کار منظور ہو گئی اور جلد جاری ہو جاے گی۔ اس خبر کو سنتے ہی پادری چراغ پا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو گرد و نواح کے اخلاق کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس کے جواب میں برنک عبادت خانوں کی برکات کا ذکر کرتا ہے اور گھریلو زندگی کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے —

"گھر سوسائٹی کا جوہر ہے ' اچھا گھر ' باعزت اور قابل اعتماد احباب کا ایک مختصر سا حلقہ جہاں پریشان کن عناصر کا سایہ تک نہ آ سکے..."

در اصل یہ حصہ ایک قسم کا ضروری دیباچہ ہے جس سے پڑھنے والا زمانے اور ملک کے حالات کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

اس اثناء میں یہ خبر آتی ہے کہ بیرونی ڈاک کا جہاز آگیا اور مجلس یکلخت برخاست ہو جاتی ہے۔ برنک کو نیویارک کا تار ملتا ہے کہ 'جہاز' 'انڈین گرل' جلد سے جلد مرمت کرا کے فوراً روانہ کردو۔ برنک سوچتا ہے کہ جہاز ہرگز سفر کے قابل نہیں ہے' کیسے روانہ کر دیا جائے۔ نفع حاصل کرنے کی ہوس میں انسانی جانوں کا خیال نہ کرنا ان اقوام کا طرۂ امتیاز ہے جن کے دنیا میں بڑے نام ہیں۔ پھر یہ خبر ملتی ہے کہ جہاز میں ایک سرکس کمپنی آئی ہے۔ یہ خبر پادری کو اور عورتوں کو بے چین کر دیتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان لوگوں کو یہاں تماشا کرنے کی اجازت نہیں ملنا چاہئے۔ اتنے میں باغ کے دروازے پر سارے سرکس والے آ موجود ہوتے ہیں اور عورتیں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے ڈال دیتی ہیں۔ ادھر باغ کے پھاٹک سے ایک عورت داخل ہوتی ہے' ساری جماعت ششدر ہو کر اسے دیکھتی ہے' سب یک زباں ہو کر چلا اٹھتے ہیں 'اونا' اونا کی آمد جس قدر حیرت انگیز ہے اسی قدر یہ خبر وحشت اثر ہے کہ اس کے ہمراہ یوحان بھی آیا ہے۔ لونا کھڑکیوں کو بند پاکر یہ دیکھتی ہے کہ عورتیں تاریکی میں بیٹھی ہوئی کوئی سفید کپڑا سی رہی ہیں۔ اسے خیال ہوتا ہے کہ کہیں گھر میں کوئی موت نہ ہوگئی ہو۔ پادری فضا بدلی ہوئی دیکھ کر جانے لگتا ہے۔ اونا کہتی ہے کہ میں بھی تمھارے حلقے میں اس غرض سے شریک ہونا چاہتی ہوں کہ اس میں کچھ تازہ ہوا پھیلا سکوں —

ڈرامے کا اصلی لطف دوسرے ایکٹ سے شروع ہوتا ہے۔ برنک کو یوحان کے آنے سے اپنی بدنامی کا خوف ہے اور وہ پریشان ہے۔ اس وقت اسے اپنی ساکھ قائم رکھنے کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ ریلوے اسکیم نافذ ہونے والی ہے۔ اب اون آتا ہے اور اپنے آقا سے کہتا ہے کہ "پام ٹری" (Palm Tree)

جہاز قریب قریب طیار ہے ' لیکن انڈین گرل (Indian Girl) امریکن جہاز اس قدر ناقص ہے کہ اس کی مرمت جلد نہیں ہوسکتی - برنک کہتا ہے کہ تم دیر اس لئے کرتے ہو کہ مشین استعمال کرنا نہیں چاہتے - اون جواب دیتا ہے کہ اگر مشین یہاں چلائی جائے گی تو ہزاروں مزدور بیکار اور بے روز گار ہوجائیں گے - اون کا انداز کلام اور خیالات برنک کو بیحد برافروختہ کردیتے ہیں - وہ کہتا ہے کہ اگر دو دن کے اندر یہ جہاز طیار نہ ہوا تو تم برطرف کردئے جاؤ گے - اون وعدہ کرلیتا ہے کہ پرسوں جہاز روانہ ہونے کے قابل ہوجائے گا —

ہلمر داخل ہوتا ہے اور مسز برنک کی نمناک آنکھیں دیکھہ کر سمجھہ جاتا ہے کہ اُسے یہ خبر پہونچ چکی ہے کہ یوحان اور اونا ' دینا کے ساتھہ شہر کا چکر لگارہے ہیں اور سارے شہر میں ان کی آمد پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں - یوحان اور دینا میں باہم محبت ہوجاتی ہے جس کا اندازہ اس مکالمے سے ہوگا —

یوحان :- تو اسے گولی مارو اور ہمارے ساتھہ چلی چلو

دینا :- تم تو مذاق کر رہے ہو - تم نے اولف سے بھی یہی کہا تھا - میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کیا وہاں (امریکہ) بھی لوگ ایسے ہی پارسا ہوتے ہیں جیسے یہاں - سمجھے کہ نہیں ؟

یوحان :- پارسا ؟

دینا :- ہاں - میرا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ ایسے ہی با اصول اور سخت گیر ہوتے ہیں جیسے یہاں کے لوگ ؟

یوحان :- کم سے کم وہ اتنے خراب بھی نہیں ہیں جیسا یہاں کے لوگوں نے رکھا ہے - لیکن آخر تم اس قدر خائف کیوں ہو —

دینا :- تم میرا مطلب نہیں سمجھتے ' میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ وہ ایسے پارسا اور سخت گیر نہ ہوں جیسے یہاں والے ہوتے ہیں -

دینا اپنے والدین کے جرم سے واقف ہے - وہ اپنی ماں کی کمزوری اور باپ کے غیض و غضب کی داستان سن چکی ہے - وہ یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ برنک کے خاندان کے افراد اُسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے سامنے اچھے نمونے پیش کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان سے سبق لے سکے کیونکہ ان کے خیال میں دینا کو اچھی تعلیم کی اشد ضرورت ہے - وہ رہبانیت کی فضا اور پادری کی خشک ' بے کیف ' دور از عقل ' غیر دلچسپ اور بے مزہ کتابوں سے اُکتا گئی ہے - مسز برنک وغیرہ کی جا و بے جا نصیحتیں اس کا جام صبر لبریز کر چکی ہیں - وہ کھلی ہوا میں سانس لینے کی آرزو مند ہے - اس لئے امریکہ جانا چاہتی ہے ' مگر پہلے یہ اطمینان کر لینا چاہتی ہے کہ وہاں کی فضا بھی آزاد ہے یا نہیں —

دوسرے ایکٹ کے وسط میں ایک دلچسپ سین آتا ہے جس میں یوحان اور برنک تنہا باتیں کرتے ہیں - برنک ' یوحان سے کہتا ہے کہ مجھے یہ گھر ' یہ دولت اور زندگی کی مسرت و کامیابی سب تمہاری بدولت نصیب ہوئی ہے - تم نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو ہزاروں میں ایک بھی نہ کرتا - یوحان کہتا ہے کہ تم میرے عزیز ترین دوست تھے ' میں نے تمہارے لئے جو ایثار کیا اس پر فخر کرتا ہوں - مجھے اپنے اوپر اس لئے الزام لینا پڑا کہ تمہاری منگنی ہو چکی تھی ' میں ایک لاوارث یتیم تھا ' مجھے ایک نئی دنیا میں زندگی شروع کرنا مشکل نہ تھا - یوحان کی باتیں سن کر برنک کے تشکر و امتنان کی کوئی حد نہیں رہتی - لیکن

دینا کی نگاہ میں حتی کہ خود اپنی بہن مسز برنک کی نگاہ میں یوحان مجرم ہے - اور برنک نیکی اور شرافت کی جیتی جاگتی تصویر - اس سلسلے میں یوحان اُن قربانیوں کا ذکر کرتا ہے جو لونا نے اس کے لئے امریکہ میں کی تھیں —

" میں بیمار ہوگیا اور عرصے تک اچھا نہ ہوسکا ' نہ خود کما سکتا تھا اور نہ اُسے کمانے سے روک سکتا تھا - اُس نے قہوہ خانوں میں گانا شروع کیا ' جلسوں میں لکچر دئے ' ایک کتاب لکھی ' اور یہ سب اس لئے کہ مجھے فاقوں مرنے سے بچائے "

اس کے بعد برنک اور لونا کو تنہائی میں بات چیت کرنے کا موقع ملتا ہے - اس لئے برنک اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے طرز عمل کی قابلیت پیش کرے ' اُس نے ابتدا میں لونا سے عشق بازی شروع کی تھی ' لیکن رسومات کی پابندی اور مصلحت وقت کی وجہ سے وہ اس سے شادی نہیں کرسکا تھا - لونا کہتی ہے تم جب تک وطن سے دور رہے تم آزاد خیال تھے ' مجھ سے محبت کرتے تھے ' لیکن وطن میں آتے ہی قاروے کی تنگ نظری تم پر حاوی ہوگئی اور تمہاری آزاد خیالی اور محبت دونوں جاتی رہیں ' کیونکہ تمہاری بیوی میری خالہ کی وارث بنی ' اور میں مفلس رہ گئی - برنک اپنی کمزوری کا خندہ پیشانی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعی میں اپنی بیوی کی دولت پر فریفتہ ہوا تھا نہ کہ اس کے حسن پر - تنگ نظر برنک اپنے گھر کی خوبیوں اور اپنی شادی کی کامیابی کا ذکر کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ شرافت ' صداقت ' اور تہذیب و شائستگی میں میرا گھر ' میری قوم کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہے - لونا کہتی ہے کہ تم بے شک شہر کے سب سے دولت مند اور بااثر رئیس ہو ' تمہاری زندگی

تمہارا کاروبار ' اور تمہارا گھر عوام کے لئے نمونہ مانا جاتا ھے ' ھر جماعت میں تمہارا نام عزت اور آبرو کے ساتھہ لیا جاتا ھے ' ھر مجلس میں تمہارا احترام کیا جاتا ھے ' لیکن تمہارے کاروبار اور شہرت کا قلعہ ریت کے تودے پر بنا ھوا ھے ' اس کی بنیاد جھوٹ پر قائم ھے ' ممکن ھے کہ ایسا وقت آجائے کہ یہ جھوٹ کُھل جائے اور یہ ساری عمارت دم بھر میں بیٹھہ جائے - میں امریکہ سے اسی غرض سے آئی ھوں کہ اس کی بنیادوں کو استوار کردوں - برنک بد حواس ھوکر کہتا ھے کہ کیا تم مجھہ سے انتقام لینا چاھتی ھو ' اگر تمہارا ایسا خیال ھے تو میں اپنی آبرو بچانے کی پوری کوشش کروں گا - اسی دوران میں کابینہ کے دو ممبر آتے ھیں اور برنک کو اپنے ساتھہ لے جانا چاھتے ھیں کیونکہ لوگوں نے ریلوے اسکیم کی مخالفت شروع کردی ھے - ان کا خیال ھے کہ اس اسکیم سے ذاتی اغراض وابستہ ھیں ' اب برنک اس لئے مدعو کیا جاتا ھے کہ عوام کو اُس پر اعتماد ھے ' اگر وہ اس اسکیم کی تائید کر دے گا تو پبلک کو اس اسکیم کی جانب سے کوئی شبہ باقی نہ رھے گا —

تیسرے ایکٹ کی ابتدا برنک کی ایک تقریر سے ھوتی ھے جس میں وہ اپنی بیوی کی نادانی اور غفلت شعاری پر غصہ کا اظہار کرتا ھے - اتنے میں کراپ داخل ھوتا ھے اور برنک کو یہ خبر سناتا ھے "پام ٹری" کل روانہ ھونے کے لئے طیار ھے - " انڈین گرل " بھی روانہ ھوسکتا ھے ' لیکن سفر خیریت کے ساتھہ ختم نہ کرسکے گا ' کیونکہ اون نے اس معاملہ میں ایک چال چلی ھے ' اس میں نئی لکڑی نہیں لگائی گئی ھے ' بلکہ ناقص طریقے سے مرمت کرکے اوپر سے اچھی پالش کردی گئی ھے - کراپ کا خیال ھے کہ اون نئی مشین کے کام کو بدنام کرنا چاھتا ھے - برنک اس چالبازی

سے سخت پریشان ہوتا ہے اور کراپ سے کہتا ہے قبل اس کے کہ میں اس معاملے کی رپوٹ کروں بہتر ہے کہ تم اس کی پوری تفتیش کرکے اطمینان کرلو —

کراپ کے جاتے ہی ہلمر داخل ہوتا ہے اور برنک کو یہ خبر سناتا ہے کہ سارے شہر میں یہ افواہ ہے کہ ریلوے اسکیم سے بعض اکابر شہر منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں ' چنانچہ اسی غرض سے اس نواح کے سارے جنگلات خریدے جاچکے ہیں - برنک یہ خبر ہلمر سے سن کر اور پریشان ہو جاتا ہے - اس کے بعد ہی لونا آموجود ہوتی ہے اور وہ اور برنک ایک نہایت خفیہ مگر اہم مکالمے میں مشغول ہو جاتے ہیں - لونا جب برنک کی زبان سے یہ سنتی ہے کہ یوحان پر روپیہ غبن کرنے کا الزام سراسر بہتان تھا اور خود برنک نے اس خبر کو اپنے فائدہ کی غرض سے پھیلایا تھا تو اُس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی - برنک کہتا ہے کہ عین اس زمانے میں ہمارے کاروبار کی حالت تباہ ہو رہی تھی ' شہر میں یہ یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ یوحان کثیر رقم لے کر امریکہ چل دیا - میں نے اس افواہ کی اس لئے مخالفت نہ کی کہ مجھے قرض خواہوں سے ادائگی زر کے لئے تھوڑے سے وقفے کی ضرورت تھی -

برنک :- لونا ! اس افواہ نے میرے گھر کو محفوظ رکھا اور مجھے وہ بنا دیا جو تم آج دیکھتی ہو "-

لونا - تو کیا تم جو کچھ ہو وہ ایک جھوٹ کے بنائے ہوئے ہو -

برنک :- مگر اس جھوٹ سے کسے نقصان پہنچا - یوحان کا امریکہ سے واپسی کا مطلق ارادہ نہ تھا -

لونا :- تم یہ پوچھتے ہو کہ اس سے کسے نقصان پہنچا ' خود اپنے اندر دیکھو ' کیا

تمہاری روح مجروح نہیں ہے -

برنک :- ہر شخص کی روح میں کم سے کم ایک داغ تو ایسا ہوتا ہے جسے پوشیدہ رکھنا چاہئے -

لونا :- اور اس پر تم اپنے آپ کو سوسائٹی کا ستون سمجھتے ہو!

برنک :- سوسائٹی کے ستون سب کہیں ایسے ہی ہوتے ہیں -

لونا :- تو پھر سوسائٹی کے قائم رہنے ہی کی کیا ضرورت ہے' اس کے اندر کن باتوں کا چلن ہے' جھوٹ اور فریب کا - اس کے علاوہ کچھ نہیں - تم شہر کے سب سے بڑے آدمی ہو' تمہارے پاس دولت' اثر اور عزت سب کچھ ہے - تم نے ایک بے گناہ انسان پر جرم کا داغ لگایا —

برنک :- کیا تم سمجھتی ہو میں اسے محسوس نہیں کرتا کہ میں نے اسے بدنام کیا ہے' کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس کی تلافی کے لئے طیار نہیں ہوں -

لونا :- کیسے؟ حقیقت حال کا اعلان کرکے؟

اس سوال سے برنک چونک پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس زمانے میں کسی قسم کی بدنامی مول نہیں لے سکتا - اتنے میں یوحان بھی آکر مکالمے میں شریک ہو جاتا ہے اور برنک سے کہتا ہے کہ خیر جو کچھ ہوا سو ہوا - مگر اب تم سچی بات کا اعلان کر کے میری بے گناہی ظاہر کر دو' میں دینا سے شادی کرکے یہاں آباد ہونا چاہتا ہوں - برنک کے ہاتھوں کے توتے اُڑ جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں خاک میں مل جاؤں گا - وہ صاف صاف کہتا ہے کہ جہازوں کی تجارت اور ریلوے اسکیم سے مجھے بڑے منافع کی توقع ہے - ریلوے اسکیم کی مخالفت محض

اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ لوگ مجھ پر بھروسا کئے ہوئے ہیں ورنہ آج بھانڈا پھوٹ جائے اور وہ بے شمار روپیہ جو ہم نے جنگلات، کانوں اور آبشاروں کو خریدنے میں صرف کیا ہے سب غارت ہوجائے یہاں اس راز کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ کابینہ کے سارے ممبر اس سازش میں شریک ہیں۔ اور منافع میں حصہ دار ہیں۔ لیکن ان میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہیں جو برنک کی امداد کے بغیر اس بڑے کام کو چلا سکے۔ اسی گفتگو میں یوحان کہتا ہے، کہ میں کل "انڈین گرل" میں واپس جانے والا ہوں، مگر دو مہینے بعد واپس آکر یہاں آباد ہوں گا۔ اس کے بعد اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے وہ خطوط پیش کروں گا جو تم نے مجھے لکھے تھے۔ یہ جہاز انڈین گرل وہی ہے جس کی مرمت کے لئے اوں کو صرف دو دن کا وقفہ دیا گیا تھا اور جس کی اچھی طرح مرمت نہیں ہو سکی ہے۔ کراپ آتا ہے اور برنک سے کہتا ہے کہ اگر اس حالت میں جہاز روانہ ہوا تو پھر شاید ہی اس کی کوئی خبر ملے۔ اُدھر پادری دینا اور یوحان کے اختلاط کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور سب کے سامنے اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ دینا میری منگیتر ہے۔ دینا اس کا اقرار کرتی ہے اور یوحان غیض و غضب کی حالت میں کہتا ہے کہ میں امریکہ سے جلد واپس آؤں گا اور تم میں سے ایک ایک کو کچل ڈالوں گا۔ اولاف کے چہرے سے اور اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دماغ پر بھی امریکہ کا سودا سوار ہے عین اس وقت یہ خبر ملتی ہے کہ ایک شدید طوفان اٹھا ہے، مگر برنک کہتا ہے اس کے باوجود "انڈین گرل" روانہ ہوگا —

ڈراما کا چوتھا ایکٹ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں نقاش ادب جو نقوش تیار کر رہا تھا وہ پوری آب و تاب کے

ساتھ اس ایکٹ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ رمل برنک سے کہتا ہے کہ تمھاری زندگی کا سب سے کامیاب لمحہ آگیا۔ یہ لمحہ اصل میں نقطۂ انقلاب ہے۔ ابسن کے ہیرو کی سیرت میں کایا پلٹ ہونے والی ہے۔ ڈراما کا یہ حصہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے تاکہ برنک میں جو انقلاب رونما ہوا اس کے اسباب اور کم و بیش علامات بھی پہلے سے رفتہ رفتہ ظاہر کردی جائیں۔ اس کی مثال شیکسپیر کے میکبتھ میں ملتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ابسن کے اشارے بہت لطیف ہوتے ہیں، اس کی تصاویر میں نزاکت ہوتی ہے، وہ اپنے قلم کی ہلکی سی جنبش سے کام لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت میں کایا پلٹ بہت مشکل سے ہوتی ہے، اس لئے برنک میں یہ انقلاب پیدا کرنے کے لئے ابسن کو غیر معمولی پیش بندی کرنا پڑی —

برنک کو جدید واقعات سے متعلق خیالات نے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا ہے اس لئے اسے جب رمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے لوگ ایک جلوس طیار کر رہے ہیں اور اس کے مکان پر اس کی قومی خدمات کا شکریہ ادا کرنے آنے والے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ رمل کا یہ خیال ہے کہ اس پبلک مظاہرے سے پورا فائدہ اٹھاکر دشمنوں کو پامال کردینا چاہئے۔ مگر خلاف توقع برنک کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے، حالانکہ اس جیسے شخص کے لئے اس سے بڑھ کر عزت افزائی نہیں ہوسکتی تھی۔ واقعات کے اثرات اس کے دل و دماغ پر کارفرما ہیں اور اندر ہی اندر اس کی طبیعت میں عجیب و غریب تبدیلی پیدا ہورہی ہے۔ جو عنقریب ایک دلکش صورت میں ہمارے سامنے آنے والی ہے۔ رمل بار بار اس کو اس امر سے مطلع کرتا ہے کہ جلوس آرہا ہے۔ باجوں کی دلفریب صدائیں قریب ہوتی

جاتی ھیں اور کوئی دم میں یہ جلوس اُس کے مکان پر آموجود ھوگا ۔ برنک جلوس کا استقبال کرنے سے عذر کرتا ھے' لیکن وہ تو روانہ ھو چکا ' اب واپس نہیں کیا جا سکتا ۔ اسی بھاگ دوڑ میں اولف کھڑکی سے کود کر جہاز کی راہ لیتا ھے اور لونا سے کہہ جاتا ھے کہ میں اپنے ماموں کو رخصت کرنے جارھا ھوں۔ دوسرے دروازے سے یوحان آتا ھے اور اس کے ساتھہ ساتھہ دینا اور مرتھا بھی داخل ھوتی ھیں ۔ دینا یوحان کے ھمراہ امریکہ جانے کے لئے طیار ھے۔ وہ پھر وھی راگ گانا شروع کرتی ھے کہ میں اس رسمی اخلاق سے اُکتا گئی ھوں اور کسی آزاد فضا میں سانس لینا چاھتی ھوں ۔ مرتھا کہتی ھے کہ ھم عورتیں رسومات کی پابندیوں سے پسی جاتی ھیں ' وہ دینا کو بغاوت کے لئے آمادہ کرتی ھے اور اُسے یوحان سے شادی کرنے کی ترغیب دیتی ھے ' ۔ دینا اقرار کرلیتی ھے ' لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ یہ بھی کہتی جاتی ھے کہ شادی سے قبل میں اپنے پاؤں پر کھڑی ھونا چاھتی ھوں تاکہ میں خود اپنے آپ کو یوحان کی خدمت میں پیش کرسکوں ۔ نہ صرف یہ بلکہ مرتھا سے وہ یہ وعدہ بھی کرنے کے لئے طیار نہیں ھے کہ وہ یوحان کو خوش رکھے گی ۔ وہ کہتی ھے وعدہ کرنا فضول ھے' نظام حیات بالکل فطرت کے مطابق ھونا چاھئیے' جس میں وعدے اور کوشش کی ذرا بھی گنجائش نہ ھو ۔ یہاں مرتھا لونا سے اس امر کا اعتراف کرتی ھے کہ اُس نے تمام عمر یوحان اور اس کی یاد کو جان سے زیادہ عزیز رکھا ۔ لیکن ناروے واپس آنے پر وہ کچھہ ایسا مبہوت ھوگیا کہ اُسے دیکھہ بھی نہ سکا —

دوسرے سین میں شاندار جلوس کی روشنی اور دھواں دھار تقریروں کو پیش کرنے سے قبل ابسن لونا اور برنک میں بات چیت شروع کراتا ھے ' جس میں برنک اعتراف کرتا ھے کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کیا ' خصوصاً اس وجہ سے کہ اگر وہ اپنے ابنائے وطن کے خیالات سے

آگے بڑھنا چاہتا تو اس کا برا حشر ہوتا کیونکہ وہ سوسائٹی کا ستون تصور کیا جاتا ہے ' مگر اُسے اس کا اطمینان ہے کہ آنے والی نسل کو اس کی مساعی سے فیض پہنچ سکے گا لونا برنک کو بتاتی ہے - کہ یوحان دینا کو لے کر جا چکا اور اب کبھی واپس نہ آے گا - برنک متحیر ہوجاتا ہے اور جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں " پام ٹری " میں سفر کرنے والے ہیں تو وہ جلد سے جلد یہ حکم نافذ کرتا ہے کہ " انڈین گرل " کو آج روانہ نہیں ہونا چاہئے - لونا برنک کو تسلی دیتی ہوئی کہتی ہے کہ میں یہ قیمتی خطوط جس سے تمہارے گناہ ثابت ہوسکتے ہیں پھاڑے ڈالتی ہوں ' لیکن یہ ضرور چاہتی ہوں کہ تم اس جھوٹ کے گورکھہ دھندے سے باہر نکل آؤ جس میں تمہارا بال بال جکڑا ہوا ہے - معاً ہلمر آکر یہ خبر سناتا ہے کہ اولف " انڈین گرل " میں فرار ہوگیا ' برنک کا چہرہ زرد پڑجاتا ہے ' وہ اس جہاز کو روکنے کا حکم دیتا ہے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناممکن ہے تو اُس کی افسردگی اور شکستہ دلی دیکھہ کر رحم آتا ہے - اسی اثنا میں جلوس آموجود ہوتا ہے ' مسز برنک کا کہیں پتہ نہیں ' برنک دیوانہ وار سرتھا سے کہتا ہے کہ لڑکا یوں فرار ہوا کہ اس کی جان خطرے میں ہے - بیوی خدا جانے کدھر سدھاریں ' میں کس دل سے جلوس کا استقبال کروں - اس حالت میں مسز برنک داخل ہوتی ہیں ' وہ غریب بچے کی تلاش میں ساحل تک گئی تھیں - " انڈین گرل " کے سامان تجارت کے گٹھوں میں سے اس نے اولف کو نکالا - تلاش میں اتنی دیر لگی کہ رات ہوگئی اور جہاز روانہ نہ ہوسکا - یہ مژدہ سن کر برنک کی جان میں جان آتی ہے کہ لڑکا موت کے منہ میں سے نکل آیا اور سینکڑوں آدمیوں کی جانیں بچیں جو اس جہاز میں سفر کرنے والے تھے - اتنے میں جلوس آموجود ہوتا ہے اور سارا

پائیں باغ آدمیوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارا شہر امڈتا چلا آرہا ہے۔ پادری شہر کی جانب سے برنک کی پبلک خدمات کا شکریہ اداکرتے ہوے اس کی بےلوث زندگی اور حسن اخلاق کی بڑے زور شور سے تعریف کرتا ہے۔ ہر طرف سےنعرہ ہاےتحسین بلند ہوتے ہیں اور لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ سوسائٹی کے ستون کا اخلاق اور کردار ایسا ہی بےلوث اور پاک ہونا چاہئیے جیسا برنک کا ہے۔ اُس کےعلاوہ سوسائٹی کے اور ستون جو برنک کے رفیق اور معین کار تھے ان کی بھی مدح سرائی ہوتی ہے اور سب کو پبلک کی جانب سے قیمتی تحائف دئیے جاتے ہیں —

وہ نا ہموار راہ جس کو مسطح کرنے میں ابسن نے اس قدر عرق ریزی کی تھی ختم ہوتی ہے اور اس کے موڑ پر وہ منزل نظر آرہی ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے یہ زحمت برداشت کی گئی تھی۔ جس خیال پر ڈراما کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ اب واقعے کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ یعنی لونا کی دیرینہ آرزو کہ اس کا محبوب برنک جلد سے جلد اپنے اوپر سے رداے باطل اُتار کر پھینک دے پوری ہونے والی ہے۔ یہ نقطۂ انقلاب ڈراما کی جان اور ابسن کے کمال کا بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے اپنی دنیاوی وجاہت اور ثروت کی عمارت ایک افسوس ناک فریب کی بنیاد پر تعمیر کی تھی جس کا علم یوحان کے علاوہ لونا کو ہو چکا تھا۔ اس ڈرامے کے آخری سین میں رفتہ رفتہ ایسے واقعات رو نما ہوے کہ برنک خود اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ حقیقت کا انکشاف کردے اور گناہ کے داغ کو توبہ کے پاک پانی سے دھو دے۔ چنانچہ جب جلوس اس کے مکان میں پہنچتا ہے اس وقت ہم کو برنک نئی شان سے نظر آتا ہے۔ اس کا دل اس جرأت اور ہمت سے معمور ہے جو اظہار حق کے لئے در کار ہے۔ وہ جب پادری کی مدح سرائی کا جواب دیتا ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے

خود اس کا عزیز ترین دوست حیران رہ جاتا ہے - لوگ گمان کرنے لگتے ہیں کہ برنک کا دماغ مختل ہو گیا ہے - اپنے افعال قبیحہ کا جن پر بھاری ثروت اور دولت کا انحصار ہو اس قدر دلیری کے ساتھہ مجمع عام میں اعلان کرنا اخلاقی جرات کا اتنا بڑا کار نامہ ہے کہ جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے ملتی ہیں - وہ کہتا ہے :—

" ... آج ہم اپنے ملک کی زندگی کا ایک نیا دور شروع کرنے والے ہیں ، لیکن اس کی ابتدا کرنے سے قبل ہمیں سچائی کا دامن مضبوطی کے ساتھہ تھام لینا چاہئیے - سب سے پہلے میں پادری صاحب کے قصیدے کی تردید کرتا ہوں ، میں اس کا مستحق نہیں ہوں ، کیونکہ آج تک میرا کوئی عمل خلوص پر مبنی نہ تھا - گو میں نے ہمیشہ مادی منافع کا خیال نہیں کیا مگر قوت اور اثر حاصل کرنے کی کوشش ہمیشہ کرتا رہا ... ... مثلاً ریلوے لائن کی تجویز کے سلسلے میں ایک بڑی جائداد کے خریدے جانے کی افواہ گرم ہے - میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ جائداد خود میں نے تنہا خریدی ہے - اب میں نے اپنے احباب رمل ، ویگ لانڈ اور سانڈ اسٹاڈ کی شرکت میں ایک متحدہ کمپنی کے اجرا کا ارادہ کیا ہے - اب جو چاہے وہ اس کے حصے خرید سکتا ہے ... یہ بیان کیا گیا ہے کہ " بدی کا عنصر " آج یہاں سے دور ہو گیا ، مگر آپ پر واضح ہو کہ یہ شخص تنہا نہیں گیا - اس کے ساتھہ دینا اس کی بیوی بننے کے لئیے گئی ہے - ...... (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب ہمیں اس شخص کے سامنے ادب سے جھکنا چاہئیے جس کی گردن پر پلڈرہ

برس سے ایک گناہ کا بوجھہ ہے ' وطن کے دوستو ' میں وہ گناہ بیان کئے دیتا ہوں ' اس کا زہر میری رگ رگ میں پیوست ہوچکا ہے - اب سنو ' پندرہ سال ہوے میں مجرم تھا - جرم دوسرے شخص کا نہ تھا میرا تھا - مگر میری جگہہ اسے فرار ہونا پڑا - اب ان پندرہ برس کی افواہوں کے اثر کو زائل کرنا کسی انسان کا کام نہیں ہے ' میں ان افواہوں سے پندرہ سال تک فائدہ اٹھاتا رہا ...... " —

اعلان ہو چکا - لوگ بڑے جوش و خروش سے باتیں کرتے گھر واپس جا رہے ہیں - برنک اور مسز برنک ایک دوسرے سے گلے مل کر سچی خوشی کا لطف حاصل کرتے ہیں - برنک کہتا ہے کہ یہ سب لونا کی خوبیوں کا طفیل ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سوسائٹی کے ستون عورتیں ہی ہوسکتی ہیں - لونا امریکہ سے محض اسی غرض سے آئی تھی کہ اس کی جوانی کا ہیرو برنک اس فریب کے دام سے آزاد ہو جاے - اصل میں لونا کو برنک سے نفرت کرنا چاہئے تھی کیونکہ اس کے محبت کے مقابلے میں اس نے ایک دوسری عورت کی دولت کو ترجیح دی اور لونا کو آخر کار شکستہ دل ہو کر امریکہ بھاگنا پڑا ' لیکن لونا اب تک اس کو دل سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اور اس کو دلدل میں سے نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے ' جس نتیجہ پر برنک پہنچا ہے اس کو سن کر لونا مسکراتی ہے اور کہتی ہے کہ :

" روح صداقت اور روح آزادی ' یہ ہیں دراصل سوسائٹی کے ستون عورتوں کو سوسائٹی کا ستون نہیں کہنا چاہئے " —

ابسن کے اس معرکۃالآرا ڈرامے کا خلاصہ آپ کی خدمت میں موجود ہے - اب اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم ابسن کے ان خیالات پر ایک ناقدانہ نگاہ

ڈالیں جو اس نے اس تصنیف میں ظاہر کئے ہیں اور ڈراما کے خاص خاص اشخاص کے کیرکٹر کا غور سے مطالعہ کریں۔ ڈراما کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے وطن کی طرز معاشرت سے خصوصاً اور یورپ کے سوشل حالات سے عموماً برسر جنگ ہے - ابسن جب جنگ کرنے پر آتا ہے تو پورے ساز و سامان کے ساتھہ میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے - ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ بز دل تھا ' اس لئے اُس نے ناروے کو خیر باد کہہکر براعظم یورپ کو اپنا وطن بنا لیا تھا ' مگر وہاں سے اس شدت سے آگ برساتا تھا کہ مخالفوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے - اس ڈرامے میں وہ جھوٹ ' مکر ' فریب کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے - ان کے علحدہ علحدہ مجسمے بناتا ہے اور غصے میں آکر ان کو پاش پاش کر دیتا ہے - ہر ملک ' ہر طبقے اور ہر زمانے میں سوسائٹی کے بعض ایسے بت ہوتے ہیں جن کو جھوٹ ' مکر ' اور فریب کا دیوتا کہنا بےجا نہ ہوگا - مذہب ' سیاست ' معاشرت ' علم و فن ' غرض شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ ہو جہاں ان بتوں کی پوجا نہ ہوتی ہو - ابسن انہیں حضرات کے مضبوط مورچوں پر حملہ کرکے انہیں مسمار کر دیتا ہے - برنک اپنے وطن میں سب سے ممتاز ' مقتدر ' باعزت اور دیانت دار شمار کیا جاتا ہے - مگر اس کی یہ نیک نامی ایک ناپاک فریب پر قائم ہے جس کا زہر اس کے خاندان کے رگ و پے میں پھیل چکا ہے - ''سوسائٹی کے ستون'' ان الفاظ سے ابسن کو اس قدر نفرت ہے کہ وہ پندرہ مرتبہ اس ترکیب کو اپنے ڈراما میں استعمال کرتا ہے مگر ہر جگہ حقارت اور تمسخر کے ساتھہ - ابسن کا دل غصے اور نفرت سے لبریز معلوم ہوتا ہے ' لیکن وہ قدم قدم پر اپنے طوفان جذبات کی روک تھام کرتا ہے اور اپنے غصے کو طنز کی شکل میں منتقل کرکے سوسائٹی کے ستونوں کا مضحکہ اڑاتا ہے —

قصے کی ابتدا کے لئے ایک ساحلی قصبہ پسند کیا گیا ہے ' جہاں کی آبادی شدت سے قدامت پسند ہے ' لیکن زمانے کی ستم ظریفی سے یہاں بھی دستکاری کی بجائے مشین کا استعمال شروع ہوگیا ہے' ایک اخبار کی بھی ابتدا ہوگئی ہے ' سرمایہ داروں اور مزدوروں کی جنگ بھی چھڑ گئی ہے' جہازوں کی آمد و رفت کی بدولت بیرونی ممالک کے اثرات رفتہ رفتہ پھیلتے جاتے ہیں ' قصبے کے تمدنی اور معاشرتی حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ لوگ بالعموم جاہل اور تنگ نظر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس قصبے کے باہر ہر متمدن شہر میں بدکاری ' بے راہ روی اور بد اخلاقی کا زور ہے۔ اگر دنیا میں اخلاق اور افعال درست ہیں تو صرف اسی خطے میں' وہ بھی اس وجہ سے کہ یہ قصبہ بیرونی اثرات سے نسبتاً محفوظ ہے ۔ قصبے کی عورتیں سمجھتی ہیں کہ ساری خدائی میں بس ہمیں پاک دامن ہیں' بیرونی ممالک کے حالات سنتی ہیں تو بہت خوش ہوتی ہیں کہ ہم اس بدی سے دور ہیں' قصبے میں اگر تھیٹر یا سرکس آجاتا ہے تو عورتیں ناک بھوں چڑھانے لگتی ہیں اور ان " بازاری عورتوں " سے پردہ کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں کہ کہیں ان کی مفروضہ بد اعمالی انہیں وبا کی طرح نہ لپٹ جاے۔ مسز برلک اور ان کا حلقہ جب سنتا ہے کہ سرکس کی ایک عورت سڑک پر منہ دھو رہی ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی ۔ جب سرکس کی عورتیں ان کے پھاٹک کے آگے سے گذرتی ہیں تو پادری کا حکم نافذ ہوتا ہے کہ پھاٹک بلکہ کھڑکیوں پر پردے ڈالدئے جائیں ۔ آزاد خیالی ' تلاش حق ' روح کی آزادی ان کے اندر نام کو نہیں ۔ اصل میں ان کا ماحول ایک آئینہ خانہ ہے جس میں سوائے اس کے کہ اپنی صورتیں دیکھیں اور کسی کی شبیہ ان کو نظر نہیں آسکتی ۔ ان کے مکانات خوب صورت ہیں لیکن ان میں روشندان نہیں کہ ہوا

اور روشنی کا گذر ہو - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نازک نازک موم کی پتلیاں ہیں جو سورج کی روشنی اور ہوا سے بڑی احتیاط کے ساتھہ محفوظ رکھی جاتی ہیں کہ کہیں پگھل نہ جائیں —

لیکن ذرا سطحی میناکاری کو دور کر کے دیکھئے تو دھات کی اصلیت کا پتہ چل جائے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ میناکاری ایسے بھدے طریقے سے کی گئی ہے کہ دور ہی سے دھات کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے - یوں تو یہ عورتیں بڑی معصوم معلوم ہوتی ہیں لیکن جب دینا کی ماں کی بداعمالی کا ذکر آجاتا ہے تو خوب مزے لے لے کر چپکے چپکے اس کی داستان بیان کرتی ہیں : مگر اس کا خیال رکھتی ہیں کہ اس گفتگو کی بھنک مسز برنک کے کان میں نہ پڑجائے - یہ ہے اس اخلاقی بلندی کی حقیقت جو انہیں باہر کی عورتوں سے پردہ کرنے کی تلقین کرتی ہے - یہی حال مردوں کا ہے - ابسن اس بات پر بہت زور دینا چاہتا ہے کہ کسی ملک اور کسی قوم میں مردوں کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی جب تک کہ عورتوں کا اخلاق درست نہ ہو —

دوسری بات جو نہایت غور طلب ہے یہ ہے کہ اس سوسائٹی میں عورتوں کی کوئی اہمیت نہیں - مسز برنک حسین ' دولت مند اور کارگذار ہے لیکن وہ یا تو پادری سے مذہبی باتیں سنا کرتی ہے ' یا اپنی سہیلیوں سے خشک اور سنجیدہ گفتگو کرتی ہے یا شوہر کی جھڑکیاں سہتی ہے - قدم قدم پر اس کو یہ احساس مارے ڈالتا ہے کہ میں یوحان کی بہن ہوں جو برنک کی بدولت بچ گیا ورنہ خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا - بات بات میں وہ اپنے شوہر کی قابلیت' فیاضی' اولوالعزمی اور سیاسی اقتدار سے دبی جاتی ہے - وہ جب یہ سنتی ہے کہ لونا نے امریکہ میں روپے کمانے کے لئے گیت

کا ے ' لکچر دئے اور کتابیں لکھیں تو اس کی روح لرزنے لگتی ھے اور اسی کے ساتھہ ایک خفیف سا غرور اس کے چہرے سے جھلکنے لگتا ھے - مگر ذرا غور تو کیجئے کہ آخر اس کی حیثیت کیا ھے- وہ زیادہ سے زیادہ برنک کے گھر کی منتظمہ ھے- اولف کی دایہ ھے یا پادری کی بے زبان مرید - اس کے علاوہ وہ ایک مٹی کی مورت ھے جسے انسان کا لباس پہنادیا گیا ھے - خود اس کے دماغ سے نکلی ھوئی کوئی بات ھمارے کان میں نہیں پڑتی- وہ سنتی خوب ھے ' سیتی بہت اچھا ھے ' پاکباز ھے ' سلیقہ شعار ھے' لیکن نہ سوچتی ھے ' نہ کسی بات کا ارادہ کرتی ھے اور نہ کچھہ کر گذرتی ھے ' اس کی شخصیت برنک کے دباؤ سے فنا ھو چکی ھے' اس کی روح کو پادری کے تحکم نے پامال کردیا ھے ' اس لئے اس سے آزاد خیالی کی توقع کرنا ایک فعل عبث ھے —

اب ذرا لونا' مرتھا اور دینا پر ایک گہری نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ سوشل قیود نے انکے ساتھہ کیا سلوک کیا ' اور وہ کیوں بغاوت پر آمادہ ھیں - سب سے نمایاں کیرکٹر لونا کا ھے ' وہ یوحان کے ساتھہ امریکہ جاتی ھے اور جب وہ علیل ھو کر مفلس ھو جاتا ھے تو بے دریغ میدان عمل میں اتر آتی ھے- گاتی ھے ' بجاتی ھے ' تقریریں کرتی ھے ' مضامین لکھتی ھے اور یوحان کو مرض کے پنجے سے چھڑا لیتی ھے - ایثار ' قربانی اور عمل کی یہ شاندار مثال ھر پڑھنے والے سے خراج تحسین حاصل کرے گی - وہ جب امریکہ سے آزادی کا پیام لے کر برنک کے مکان میں آتی ھے تو عورتوں کو بغاوت پر آمادہ پاتی ھے- سب سے پہلے تو دینا علم بغاوت بلند کرتی ھے اور رسمی اخلاق کی سخت گیری سے اُکتا کر پادری کو تکا سا جواب دے دیتی ھے - وہ یوحان سے بار بار دریافت کرتی ھے کہ کہیں امریکہ میں تو یہ سخت گیری اور ظاھر پرستی کا

دور دورہ نہیں ہے۔ وہ جوان، حسین، اور ذہین ہے۔ آزادی کے لئے ایسی بے چین ہے۔ جس گھر میں رہتی ہے وہاں ہر شخص زاہد خشک اور رسمیات کا غلام ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اخلاق پر ماں کی بداعمالی کا اثر پڑا ہوگا، اس لئے اس کی ہدایت پر غیر معمولی توجہ کی جاتی ہے۔ اس سے وہ اور تنگ آجاتی ہے۔ آخرکار وہ ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوجاتی ہے اور یوحن کے ساتھ امریکہ چلی جاتی ہے۔ اس کا کیرکٹر دراصل بڑی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ جب یوحان اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے طیار ہوتا ہے تو اس کی حمیت اور غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ میں تمہاری زیادہ ممنون احسان نہیں ہونا چاہتی بلکہ صرف اس کی آرزومند ہوں کہ تم مجھے امریکہ تک پہنچا دو، اس کے بعد میں خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی۔ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ پہلے آزاد ہوجائے اور اس کے بعد اپنی مرضی کے مطابق شوہر تلاش کرے۔ یہ دراصل اس سختی کا ردعمل ہے جس میں اس کی زندگی گذری تھی۔ اسی موقع پر مرتھا کے کیرکٹر کی ایک جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ وہ ڈراما کے واقعات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیتی، لیکن بغاوت کے جذبات اُس کے دل میں بھی اُسی زور شور سے موجزن ہیں، جیسے لونا اور ڈیلا کے دلوں میں۔ خود اُسے ان جذبات کو عمل میں ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا، لیکن ڈینا کی مدد وہ بڑے خلوص سے کرتی ہے —

ابسن نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ عورتیں اس بغاوت سے کیا بات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کوئی بات دبی زبان سے نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے برملا کہتا ہے، ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے۔ ان عورتوں کا مدعا یہ ہے کہ ان فطری روحانی قوتوں کو پامال نہ کیا جائے، بلکہ اُنہیں

اس کا موقع ملے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی شخصیت کی نشو و نما کرسکیں اور اپنے رجحانات کو عمل میں لا سکیں۔ جب پادری کی تلقین شروع ہوتی ہے تو یہ رجحانات مذہب کی پیچیدگیوں میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا نشان تک نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ رسم و رواج کی قید' ظاہری اخلاقی اصولوں کی پابندیاں' روح کو طائر پر بستہ کی طرح جکڑ دیتی ہیں اور وہ تڑپ تڑپ کے رہ جاتی ہے۔ یہ ہے وہ زہریلی آب و ہوا جو پاک روحوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے' اور آخرکار لونا کی رہنمائی اور مرتھا کی ہمت افزائی سے دینا اس قفس کی تیلیوں کو توڑ کر چھوڑتی ہے —

اب ہمیں برنک کے کیرکٹر پر نظر ڈالتے ہوے ان اسباب کا پتہ لگانا چاہئے کہ جن کی وجہ سے اس کے اخلاق میں ایسی عظیم الشان اور حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوئی' وہ ایک بدمعاش کی حیثیت سے زندگی شروع کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ لونا سے محبت کرنا شروع کرتا ہے' پھر یوحان سے اس لئے دوستی کرتا ہے کہ اس کی بہن سے عشق بازی کرسکے۔ لونا ترکۂ پدری سے محروم ہو جاتی ہے اس لئے برنک کا عشق بھی کافور ہو جاتا ہے اور جب ڈوارت کی بیوی کے گناہ کا راز فاش ہوتا ہے تو وہ یوحان کو اس میں اپیٹ دیتا ہے اور خود پاکباز بنا رہتا ہے۔ وہ غریب عورت مصیبت میں مبتلا ہوکر جلد خاک میں مل جاتی ہے اور اس کی بیٹی دینا برنک کی بہن مرتھا کے یہاں پناہ پاتی ہے۔ برنک رفتہ رفتہ اپنی بہن کی جائداد پر قابض ہونا شروع کرتا ہے اور یوحان کو بدنام کرکے پبلک میں اقتدار حاصل کرتا جاتا ہے۔ اپنے فائدے کی غرض سے وہ انڈین گرل جہاز کو جو بہت خراب حالت میں ہے طوفانی سمندر میں روانہ ہونے کا حکم دیتا ہے۔ تجارتی منافع کے

مقابلے میں وہ انسان کی جان کی کچھہ قیمت نہیں سمجھتا۔ وہ تین چیزوں کا طالب ہے۔ دولت ' اثر ' اقتدار اور ان کے حاصل کرنے کے لئے ہر جائز اور نا جائز عمل کرنے کو تیار ہے۔ مگر امریکہ سے لونا کا واپس آنا برنک کی سیرت میں ایک بڑی زبردست تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ اس بات کا بیڑا اٹھا کر آئی ہے کہ برنک کو اس مکر و فریب کی زندگی سے نجات دوں گی۔ جب برنک اس کے قصد کا حال سنتا ہے تو سراسیمہ ہوکر کہتا ہے کہ بھلا میں ایسے وقت میں کس طرح اپنے گناہوں کا اعتراف کرسکتا ہوں جب میری بدنامی سے ریلوے کی اسکیم کے بیٹھہ جانے کا اندیشہ ہے جس میں میری ساری دولت کھپ چکی ہے —

میرا یہ خیال ہے کہ ڈراما کے آخر میں برنک ایک کھلونے کی طرح تقدیر کے ہاتھہ میں ہے' واقعات کی رو اُسے کہیں سے کہیں لے جاتی ہے —

لونا کا امریکہ سے وطن کو محض اس لئے واپس آنا کہ وہ اپنے محبوب کی اصلاح کرے زیادہ موثر نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے اس کا اثر برنک کے دل پر پڑا ہو لیکن وہ اس اثر کو ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن جب وہ یوحان سے مل کر یہ پتہ چلاتا ہے کہ وہ راز افشا کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس کے حواس جاتے رہتے ہیں اور اس کے دل پر یہ خوف چھا جاتا ہے کہ اب میری شہرت اور عزت کا خاتمہ ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اس خیال سے اس کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوئی ہوگی ' چنانچہ یوحان کا قصہ پاک کرنے کے لئے وہ اپنے شکستہ جہاز " انڈین گرل " کو روانہ ہونے کا حکم دیتا ہے' وہ جانتا ہے کہ یوحان اسی جہاز سے جائے گا اور یہ راستے میں ڈوب جائے گا۔ یہ حکم دینا قتل عام سے کم نہیں۔ اتنی جانوں کے خون کرنے کا خیال رفتہ رفتہ اس کے نظام عصبی میں ہیجان پیدا کرنے لگتا ہے۔ اب تک اس نے سب کچھہ

کیا هے لیکن اس کا هاتهه خون سے آلودہ نہیں هوا - اب جہاز کی تباهی سے سینکڑوں جانوں کا خون هونے والا تھا - اس خیال سے وہ اتنا بد حواس هو جاتا هے که پادری سے روحانی تسکین کا طالب هوتا هے - اس سے آپ بخوبی اندازہ کرسکتے هیں که اس کے دل پر کیا گذر رهی هوگی - ٹیگور نے اپنے افسانہ " ماشی " میں انسانی سیرت کا انقلاب دکھایا هے وہ اس قدر جلد اور اچانک طریقے سے رونما هوتا هے که پڑھنے والے کا ذهن اس تبدیلی کے اسباب اور علامت تلاش کرتا هے اور نہیں پاتا - اس کے بر خلاف ابسن ایک شیطان کو فرشته بناتا هے لیکن اس انتقال میں متعدد منازل هیں اور وہ سب مطابق فطرت اور قرین قیاس هیں - اسی کو افسانه نگاری کا کمال کہتے هیں —

یکے بعد دیگرے برنک کو ایسے دماغی دھچکے پہنچتے هیں کہ اس کی آنکھیں کھلتی جاتی هیں اور صداقت کی وہ شمع جو لونا اس کے دل میں روشن کرنا چاهتی تھی خود بخود جل اٹھتی هے اور اپنے نور سے اس کی روح کی گہرائیوں کو منور کر دیتی هے -

اس کی تفصیل حسب ذیل هے :—

لونا اُسے یه بتاتی هے که یوحان دینا کو لے کر امریکه گیا اور اب واپس نہ آئے گا اس لئے وہ سوچتا هے کہ میں نے اس کا اور دوسرے خدا کے بندوں کا خون اپنے سر ناحق لیا - یه ذهن میں رکھئے که جوانی میں یوحان برنک کا عزیز ترین دوست تھا —

لونا وہ خطوط پھاڑ ڈالتی هے جن سے برنک کے گناہ ثابت هوسکتے تھے ' ان سے وہ حد درجه خائف تھا اور یه اس کے خیال میں یوحان کے

پاس تھے - لونا اور یوحان کا یہ عفو و احسان اُسے بلدۂ بے درم بنا لیتا ہے - پھر جب وہ اس ہلاکت کا خیال کرتا ہے جس میں اس نے یوحان کو ڈالا ہے تو کانپ اُٹھتا ہے - اس کے بعد ہی یہ خبر آتی ہے کہ اولف فرار ہو کر " انڈین گرل " میں روانہ ہوچکا ہے - اس خبر نے اس کو حد سے زیادہ سر اسیمہ کر دیا ہے - وہ کف افسوس ملتا ہے کہ میں نے جال تو یوحان کے لئے بچھایا مگر اولف اس میں پھنس گیا —

اسی اثنا میں جلوس پائیں باغ میں آموجود ہوتا ہے - برنک عجیب شش و پنج میں ہے ' اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے ' دل ہے کہ خود بخود بیٹھا جاتا ہے ' سوچتا ہے کہ میرا سارا مکر و فریب دولت کمانے کے لئےتھا اور یہہ دولت اولف کے لئے تھی - اسی تردد اور پریشانی کی حالت میں خبر ملتی ہے کہ اولف مل گیا اور انڈین گرل روانہ نہ ہوسکا - اُس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ سجدۂ شکر ادا کرتا ہے - ان پے درپے دماغی حملوں' ان موثر اور سبق آموز واقعات کا سلسلہ یقیناً ایک شیطان کو عبرت کا درس دے کر راہ راست پر لا سکتا ہے - یہاں ایک علم النفس کا لطیف نکتہ غور طلب ہے ' بڑے بڑے ہیبت ناک پہاڑ جب زلزلوں کی زد میں آ جاتے ہیں تو ان کی قوی بنیادیں ہل جل کر کمزور ہو جاتی ہیں اور ان میں سے خوبصورت پانی کے چشمے بہنے لگتے ہیں - یہی حالت انسانی عقائد اور خیالات کی ہے - جو خیالات سالہا سال سے پختہ ہو چکے ہوں ان کو زیر و زبر کرنے کے لئے دماغی اور دلی زلزلے کی ضرورت ہوگی ' اور یہہ زلزلہ جس قدر قوی ہوگا اسی قدر شدید انقلاب طبیعت میں واقع ہوگا - ابسن برنک کی ذات کو ایک ہی زلزلے میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ زلزلوں کا تار باندھ دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ

برنک کا بدلنا کچھہ آسان نہیں ھے - ابسن کا عمل کامیاب ہوتا ھے اور اس ھیبتناک پہاڑ کے گوشوں سے ایسے لطیف اور پاکیزہ چشمے بہنے لگتے ھیں کہ دل خوش ھو جاتا ھے - برنک اپنے گناھوں کا بڑی خود داری سے اعتراف کرتا ھے ' لیکن وہ یہہ نہیں چاھتا کہ ندامت سے گوشہ نشیں ہوکر خاموشی اور عزلت میں زندگی گذارد ے بلکہ عملی طور پر اپنے گناھوں کی تلافی کرنا چاھتا ھے - وہ جانتا ھے کہ میرے وطن میں اچھے کاروباری افراد کا قحط ھے - وہ یہ بھی جانتا ھے کہ وہ خود قابلیت ' انتظام اور دور اندیشی میں اپنے ھم وطنوں میں سب سے زیادہ ممتاز ھے - اس کو اس کا بھی علم ھے کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ھٹا تو اس کا وطن سخت مصیبت میں مبتلا ھو جائے گا ' اس لئے وہ پبلک لائف سے دست بردار ہونے کے لئے طیار نہیں - ابسن کا نظر یہ اس معاملہ میں دلچسپ ھے ' وہ توبہ کے معاملے میں گذشتہ گناھوں کی فہرست دھرانے کا اس قدر قائل نہیں ھے جس قدر آئندہ کے لئے نیک ارادہ کرنے کا - اس کے نزدیک یہ کافی ھے کہ انسان صداقت کے حسن کا دلدادہ ھو جائے اور سچائی کے راستے پر پورے عزم کے ساتھہ گام زن ہونے لگے ' چاھے وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے یا نہ کرے ' وہ یہہ بھی کہتا ھے کہ جبراً گناھوں کا اعتراف کرانا کبھی کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ انسان کے خیالات ' اعتقادات اور نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا نہ ھو - یہاں ویگ لانڈ نے ابسن پر ایک بہت دلچسپ نکتہ چینی کی ھے - فاضل نقاد کہتا ھے تعجب ھے کہ اعتراف گناہ کے وقت بھی برنک کے حواس اس حد تک قائم ھیں کہ وہ نئی حالات سے پورا فائدہ اٹھانے کا بندوبست کر رہا ھے : حالانکہ جس شخص کو پے درپے اتنے دماغی دھچکے پہنچ چکے ھوں اس کے اوسان ٹھکانے نہیں رہتے ' اس موقع پر ابسن

نے برنک کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں سے جذبات کی شدت کا عنصر بالکل نکال دیا ہے ' حالانکہ ایسے موقع پر جذبات کو نظر انداز کرکے تصویر کو محض دماغی اثرات کا مرقع بنانا جائز نہیں - تصویر دلکش ضرور ہے لیکن یہ دلکشی علم النفس کے اصول کو پامال کرکے حاصل کی گئی ہے —

❋

تبصرے

ادب

تاریخ

مذہب و اخلاق

متفرق

اردو کے جدید رسالے

-(*)-

تبصرے

ا۔د

مشاهیر اردو کے خطوط

(مرتبه مهیش پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبۂ عربی ، فارسی ، اردو ، هندو یونیورسٹی بنارس - مشتهر رائے صاحب رام دیال الہ اباد - قیمت آٹھ آنے) —

ادب میں خطوں کی اهمیت اور دلکشی مسلم هے - بعض اهل قلم نے خط ادب کا زیور اور زبان کی جان هیں - اس سے پہلے جب فارسی کا رواج تھا تو مکاتیب درس میں داخل تھے اور مختلف " انشائیں " اسی غرض سے لکھی گئیں تھیں اور نصاب میں شریک تھیں - لیکن یه مکاتیب عموماً مصنوعی هوتے تھے جن میں اس زمانے کے دستور کے مطابق زیادہ تر لفاظی اور انشا پردازی سے کام لیا جاتا تھا - اس تعلیم کا مقصد یہ تھا که هر موقع کے لحاظ سے خط کیونکر لکھنا چاهئے - مثلاً شادی ، غمی ، تعزیت ، مبارک بادی ، شکریه ، عیادت وغیرہ وغیرہ - اس کے خاص خاص قواعد تھے که ابتداء کیونکر کی جائے ، خاتمه کس طرح هو - مدارج کے لحاظ سے القاب و آداب بھی مقرر تھے - نتیجه اس تعلیم کا یه تھا که عام طور پر سب خط ایک هی قسم کے هوتے تھے

اور جدت کم ہوتی تھی - نظر انشاپردازی پر رہتی تھی - دلی خیالات اور جذبات کا بے تکلف اظہار کم ہوتا تھا - سب سے پہلے مرزا غالب نے جن کی جدت ہر رنگ میں نظر آتی ہے ' اِن خشک اور مصنوعی اصول و قواعد کو توڑا اور خط نویسی میں ایک نئی شان پیدا کی - ان کے خط اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اُن کا لطف کبھی کم نہ ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ اچھا خط زبان میں سب سے اچھی چیز ہے —

اس مجموعے میں مہیش پرشاد صاحب نے زمانہ حال کے ناموں اہل قلم مثلاً سر سید ' آزاد ' حالی ' نذیراحمد ' اکبر ' محسن الملک ' شبلی ' چکبست وغیرہ کے خط جمع کئے ہیں - ہر شخص کے خط ایک سے نہیں ہوتے - اس لئے اس قسم کے مجموعے کے لئے سلیقے اور نظر کی ضرورت ہوتی ہے - قابل مرتب نے اس کا بھی خیال رکھا ہے اور ایسے خط انتخاب کئے ہیں جو فی الحقیقت پڑھنے کے قابل ہیں - ان میں بعض غیر مطبوعہ خط بھی ہیں - مولوی" مہیش پرشادصاحب کا ارادہ اس سلسلے کو جاری رکھنے کا ہے اور دوسرا حصہ بھی وہ شایع کرنے والے ہیں —

ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری

(تالیف میرحسن صاحب - طالب علم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن) -

دوسری زبانوں کی ادبیات اور اس کے ممتاز مصنفین اور شعرا کا کلام اور حالات ہمیشہ بصیرت افروز ہوتے ہیں - خاص کر اردو زبان کو جو ابھی بن رہی ہے اس کی بڑی ضرورت ہے - میرحسن صاحب نے یہ بہت قابل قدر کام کیا ہے کہ ورڈس ورتھ کے حالات اور اس کی

شاعری کی خصوصیات کو اردو زبان میں بیان کیا - ورڈس ورتھ کا پایہ انگریزی شاعری میں بحیثیت فطرت نگاری بہت بلند ہے اور اس کا منتخب کلام بے مثل ہے - قابل مولف نے جگہ جگہ اس کی منتخب اور عمدہ نظموں کے ترجمے بھی درج کیے ہیں - نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے - لائق مولف اور قابل مقدمہ نویس دونوں نے اس امر کو وثوق سے بیان کیا ہے کہ مولانا حالی نے " ورڈس ورتھ کی شاعری اور اس کے شاعرانہ نصب‌العین اور اصلاحی شاعری کی تجویز سے کسی نہ کسی طرح واقفیت حاصل کر لی تھی " - اس قیاس کی بنیاد انہوں نے داخلی اور خارجی شہادتوں پر قائم کی ہے - داخلی شہادت ان کی نظم "شعر سے خطاب" اور مقدمۂ شعر و شاعری کے بعض فقرات ہیں اور خارجی شہادت لاهور بک ڈپو کا تعلق - لیکن یہ دونوں شہادتیں کافی نہیں - حالی کے شعر سے خطاب اور ورڈس ورتھ کے "شاعر سے خطاب" میں کوئی ایسا خاص تعلق نہیں جو یہ قیاس قائم کیا جائے - دونوں کے خیال کا رنگ جدا ہے - شعر و شاعری پر قدیم سے ہمارے شعرا اپنے خیالات ظاہر کرتے آئے ہیں یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی - خصوصاً حالی کے دن میں اس خیال کا آنا جبکہ ہمارے ہاں شاعری کا رنگ بگڑا ہوا تھا - ایک قدرتی بات تھی ' اس کے لئے ورڈس ورتھ کی واقفیت ضروری نہ تھی - رہا بک ڈپو کا تعلق سو وہ بھی اس قیاس کی تائید نہیں کرتا - اس زمانہ میں انگریزی کی بالکل ابتدائی کتابوں اور خاص کر مدرسوں کی درسی کتابوں کے اسباق کا ترجمہ ہوتا تھا - شعر و شاعری یا ادبی تنقید پر کوئی کتاب ترجمہ نہیں ہوئی - علاوہ اس کے اس زمانے میں جب کہ حالی نے جدید شاعری شروع کی ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ورڈس ورتھ سے بہت کم واقفیت تھی - پنجاب یونیورسیٹی کے نصاب میں اس کا کہیں پتا نہیں اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی تعلیم کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ نئے لکھنے والوں پر ہوا اور مولانا حالی بھی ان خیالات کے اثر سے خالی نہ تھے —

بہر حال میر حسن صاحب کی محنت قابل شکر اور لایق قدر ہے اور اردو شعرا کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے —

حقیقی علمی شاعری

(مصنفہ مولوی نصیرالدین ' نصیر ' پیر سترایت لا مطبوعہ
معارف پریس اعظم گڈہ)۔

اس مثنوی میں قابل مصنف نے شروع میں عام شاعری اور اُس کی خوبی پر اور اس کے بعد عبرانی ' سنسکرت ' یونانی ' لاطینی ' عربی ' اور فارسی ' اور هندی بھاشا کی شاعری پر مختصر بحث کی ہے ' پھر شاعری کے اقسام بیان کئے ہیں اور فنون لطیفہ کا ذکر کیا ہے - اس کے بعد اردو شاعری کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور آب حیات کے تتبع میں پانچوں دور کے نامور شعرا کی خصوصیات پر رائے کا اظہار کیا ہے - سب سے آخر میں انگریزی شعرا کا مختصر ذکر کیا ہے - اس کے بعد شاعری پر ملک اور آب و ہوا کا اثر اور مشرق و مغرب کی نظم کا مقابلہ و موازنہ ہے —

حضرت نصیر پختہ شاعر ہیں - ان کی نظم بے تکلف اور سادہ ہے - اپنے خیالات شعر و شاعری اور شعرا کے کلام کے متعلق خوبی سے ظاہر کئے ہیں ان خیالات اور تنقید میں کوئی خاص بات نہیں —

شروع میں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی اور سید محمد اسمعیل صاحب رسا همدانی ایم - اے ' بی - ایل کے دیباچے ہیں —

دیوان گرامی

شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کا کلام ' شاعر خاص اعلی حضرت حضور نظام -
مطبوعہ شیخ مبارک علی ترجر کتب ' لاہور - قیمت دو روپے آٹھ آنے

گرامی سچا شاعر تھا ، ہمارے ہاں شاعر کے لئے جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے - بے نیاز و بے پروا ، دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر ، لا ابالی - اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا - پہروں عالم خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا - اس وقت جو دیکھتا سچ مچ دیوانہ سمجھتا - گھر کا حال گھر والی جانے اور باہر کا حال باہر والے جانیں وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا - شعر اس جوش سے پڑھتا تھا کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا ہے اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا - ذوق سخن ایسا اچھا تھا کہ اچھا شعر سن کر وجد میں آ جاتا تھا - صورت شکل ، وضع قطع سے کبھی یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایسا اچھا شاعر اور ایسا صاحب ذوق ہوگا - اگرچہ بظاہر اکھڑ تھا مگر دل میں خلوص تھا - تواضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے لڑتا ہے اور یہی اس کے عین خلوص کی علامت تھی - دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدر داں تھا —

ضد ضرور تھی لیکن وہی بچوں کی سی ، منانے پر فوراً من جاتا تھا اور دوستوں کا کہنا مان لیتا تھا ، لیکن سچ بات کہنے میں وہ بڑے بڑوں سے بھی نہیں چوکتا تھا - تصنع سے دور ، نہایت بے تکلف اور آشنا پرست تھا - وہ بہت بھولا تھا مگر بکار شعر ہوشیار اور بکار دنیا بیکار تھا - اگرچہ مدتوں دوابۂ گنگ و جمن اور حیدرآباد میں رہا مگر لب و لہجہ ٹھیٹ پنجابی تھا جو بعض وقت بڑا مزہ دیتا تھا - غیر لوگ آ آکر اصرار سے اس کا کلام سنتے تھے مگر دوستوں کو وہ خود سناتا ، وہ بھی محظوظ ہوتے اور خود بھی محظوظ ہوتا - اگرچہ ہندی نژاد تھا مگر فارسی کا اُستاد تھا - اتنا کچھ لکھا مگر کہیں محاورۂ فارسی میں لغزش نہیں ہوئی - اس کا کلام اُستادانہ تھا اور قدیم اساتذہ کی روش پر چلتا تھا اور اپنے شعر کو خوب بناتا اور سنوارتا تھا - اس کے کلام میں جوش ، گرمی اور شوکت پائی جاتی ہے اس نے بڑے بڑے معرکے جیتے اور بڑے بڑے استادوں کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور کہیں ہیٹا نہیں رہا - اس کی وفات سے ایک بڑے استاد کی جگہ خالی ہوگئی اور اب چونکہ فارسی کا رواج اٹھتا جاتا ہے اس لئے امید نہیں کہ پھر کوئی گرامی پیدا ہو —

شیخ مبارک علی نے مبارک کام کیا کہ مرحوم گرامی کا کلام چھپوادیا ' اگرچہ افسوس ہے کہ یہ اُس کا پورا کلام نہیں اس نے اس سے کہیں زیادہ لکھا تھا ' لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ رباعیات الگ شایع ہو رہی ہیں - دیوان نہایت عمدہ کاغذ پر بہت اچھا چھپا ہے - فارسی کلام کے دلدادہ اسے ضرور پڑھیں وہ پڑھ کر یقیناً خوش ہوں گے —

غالب

چند سال ہوے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ' حیدرآباد نے یہ کتاب انگریزی میں شائع کی تھی اب اس کا سید معین‌الدین صاحب قریشی سے اردو میں ترجمہ کرایا اور ایک خوش وضع سرورق کے ساتھہ صاف ستھرا چھپوادیا ہے -

معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کی آب و ہوا غالب مرحوم کو ساز گار نہیں ہے - ان کے دیوان کی وہ مشہور شرح جس میں خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی تھی ' حیدرآباد ہی کی پیداوار تھی - حال میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کے " محاسن کلام غالب " نے دوبارہ غالب کی تحسین کا غلغلہ برپا کیا ' تو گویا اس رسالے کے توڑ پر ' ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے زیر نظر کتاب ڈامھند کی - جس میں کلام غالب کے ساتھہ ساتھہ غریب شاعر کی سیرت و کردار اور عقائد و عادات پر بھی اس شد و مد سے جرح کی گئی ہے کہ دنیا کا کوئی شاعر مشکل سے اس کی تاب لاسکتا ہے — غالب کی شاعری پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے بہت سی دشوار شرطیں تجویز کی ہیں جن کا ایک نمونہ یہ ہے :-

" سب سے پہلے ان اثرات کی چھان بین کرنی چاہئے جو اس (غالب) کے گھر کی تعلیم و تربیت سے مترتب ہوے - اگر اس

کے والد اور اکلوتے چچا کا انتقال پانچ برس کی عمر سے پہلے ہو چکا تھا ' جیسا کہ خود غالب کہتا ہے ' تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس کی پرورش کی ؟ وہ کس قسم کے لوگ تھے اور کس ڈھب سے انھوں نے اس کے دل و دماغ پر نقش بٹھائے ؟ تعلیم کس قسم کی دی گئی اور اس کے تعلیم دینے والے کون تھے ؟ عبدالصمد اور شیخ معظم اس کے استاد بیان کئے جاتے ہیں - ان کی بزم تعلیم سے اس کو کیا فیض حاصل ہوا - اس کے اور بھی کوئی استاد تھے جن کے فیض و اثر کا پتہ چلایا جاسکتا ہے ؟ کون سے مضامین اور کتابیں اس کو سب سے زیادہ مرغوب تھیں ؟ بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے اس کی غزل گوئی پر نظیری ' عرفی ' ظہوری ' شیخ علی حزیں ' اور طالب آملی کے بھی اثرات پڑے ہیں - ان کا اثر ممکن ہے کہ اس کی تنظیم شعر پر ہوا ہو لیکن سوال یہ ہے کے اس کے خیالات پر اس کے اثرات کس طرح مترتب ہوے ؟ " (صفحہ ۶۳)

اس تفصیلی معلومات کے نہ ہونے کے باوجود جو لوگ غالب کی تحسین میں رطب اللسان ہیں ' ان سے ڈاکٹر عبداللطیف ناراض ہیں مگر خود غالب کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں تامل نہیں کرتے اور طول طویل بحثوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ " اس نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے - اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہوسکتا " — (صفحہ ۱۳۱) -

اس " ہم آہنگی " کے مضمون پر ڈاکٹر صاحب نے بار بار زور دیا ہے اُن کے نزدیک " عظمت شاعری " کا معیار ہی یہ ہے کہ شاعر زندگی میں ہم آہنگی کو پالے - اور چونکہ غالب کو یہ ہم آہنگی کبھی حاصل نہیں ہوئی ' لہذا وہ اعلی درجہ کا شاعر نہیں شمار ہوسکتا اگرچہ اردو غزل گو شعرا میں ایک ' لفظی صنعت گر " کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب اسے ایک بلند مرتبہ دینے پر آمادہ ہیں ' -

تقریباً پوری کتاب میں " ہوا سے لڑنے " کی کیفیت نظر آتی ہے اور

ادبی بحث میں خاصا عدالتی مناظرے کا رنگ پیدا ہوگیا ہے - افسوس ہے کہ غالب کے مقدمے میں خود ہمارا فیصلہ فاضل مصنف کے خلاف ہے لیکن ہم ان کی عرق ریزی اور قابلیت کی خوشی سے داد دیتے ہیں - انہوں نے نفس شاعری کے بعض پہلوؤں پر نہایت پر مغز بحث کی ہے جو ایشیائی شاعری کے معتقدوں کو غور سے مطالعہ کرنی چاہئیے اور ان کی کتاب ادبی تنقید کا ایک دلچسپ اور قابل قدر نمونہ ہے -

(حجم ۱۴۰ صفحہ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

رباعیات حالی (ترجمہ انگریزی)

مولانا حالی مرحوم کی اردو رباعیات کا انگریزی ترجمہ کچھ مدت ہوئی جی - ای وارڈ نے شائع کیا تھا - اب ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کے زیر نگرانی اس کی نظرثانی ہوئی اور پھر ٹیوٹ صاحب نے (جو عمر خیام کی رباعیات کا بھی ایک ترجمہ شائع کر چکے ہیں) وارڈ کے نثریہ ترجمے کو نظم کردیا اور اردو متن کے ساتھ یہ دونوں ترجمے آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نے بہت صاف ستھرے چھاپے میں شائع کردئے ہیں - نظم میں کہیں کہیں ترجمہ اصل مطلب سے دور ہوگیا ہے لیکن مجموعی طور پر کتاب قابل قدر ہے اور مطبع مذکور کی شاخوں سے جو کلکتہ ' مدراس ' بمبئی میں قائم ہیں ' جلد کی نوعیت کے اعتبار سے دو ' تین یا چھ روپے میں خریدی جا سکتی ہے -

تاریخ

رہنمایان ہند

مترجمہ بابونارائن پرشاد ورما المتخلص بہ مہر ' درمیانی تقطیع صفحات ۲۱۵ قیمت فی جلد تہرہ روپیہ ' ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن -

عرصہ ہوا کہ جناب بابوصاحب سلمتھہ ناتھہ دت ' ایم - اے ' ایم ' آر ' اے ' ایس رکنر کیشب اکیڈیمی کلکتہ نے انگریزی میں ایک رسالہ " پرافٹس آف انڈیا " لکھا تھا - اس کی مقبولیت اور افادے پر نظر کر کے انجمن ترقی اردو نے جناب مہر کا ترجمہ رہنمایان ہند کے نام سے شائع کیا تھا - یہ ترجمہ اس سے قبل تین بار چھپ کر شائع ہوچکا ہے - چوتھی بار اب پھر انجمن نے اس کو خاص اہتمام سے طبع کر کے شائع کیا ہے —

اس کتاب میں ہندو مذہب کے عقاید اور تعلیمات کا تذکرہ ہے ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنما سری کشن ' گوتم بدھ شنکر اچاراج ' رامانج ' راما نند اور کبیر کے حالات اور تعلیمات کا ذکر ہے ' خصوصاً سری کشن مہاراج کے حالات اور ان کی تعلیمات (بھگوت گیتا) کا کسی قدر تفصیلی خلاصہ درج ہے - بہت ہی کم وقت میں اور نہایت واضح طور سے ہندو مذہب کے برگزیدہ عقاید کا علم اس کتاب سے ہو سکتا ہے ' اس کے سوا ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماوں کی تعلیمات اور ان کی عملی جانفشانیوں اور سرگرمیوں سے بخوبی واقفیت ہو سکتی ہے - گو یہ کتاب ترجمہ ہے لیکن طرز بیان اس قدر فطری اور دلکش ہے اور زبان اس قدر

پاک صاف ہے کہ کہیں ترجمہ کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا —

(چ)

امراے ہنود

[مولفہ منشی سعید احمد صاحب مارہروی درمیانی تقطیع صفحات ۱۹۵ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے غیر مجلد تین روپے ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد]

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں ہندوؤں کو خاص دخل تھا - مالی' ملکی اور انتظامی شعبوں میں ہندو' مسلمانوں کے دوش بدوش تھے' چنانچہ مختلف تاریخوں میں ان مشہور ہندو امراء کے حالات بالتفصیل درج ہیں جو اسلامی حکومتوں میں ممتاز عہدوں پر مامور تھے - اس کا ثبوت کتاب زیر تبصرہ سے بھی بخوبی ملتا ہے جس میں لایق مولف نے تاریخ و تذکرہ کی مختلف (۴۱) کتابوں سے ان ہندو امرا کے حالات یکجا جمع کئے ہیں جو ہندوستان کی عظیم الشان اسلامی حکومت (مغلیہ) میں اعلیٰ خدمات اور مناصب پر سر فراز تھے —

یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے' یہ اس وقت کی یاد دلاتی ہے جب ہندو مسلمانوں کے تعلقات خوش گوار تھے اور شرمناک مذہبی تفریق اور تعصب کو دخل نہ تھا - اس کے ہر صفحے پر مسلمان حکمرانوں کی رواداری' بے تعصبی اور حق شناسی کی نمایاں مہریں ثبت ہیں اور اس میں جا بجا ہندو امرا کی وفاداری جاں نثاری اور فرض شناسی کی مثالیں موجود ہیں —

یہ کتاب انجمن ترقی اردو کی ابتدائی مطبوعات میں ہے - عرصہ ہوا اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا تھا - انجمن نے خاص اہتمام سے اس کا دوسرا اڈیشن طبع کر کے شائع کیا ہے —

(چ)

انقلاب سنہ ۱۸۵۷ ع کی تصویر کا دوسرا رخ

(مترجمہ شیخ حسام الدین صاحب بی اے بڑی تقطیع صفحات ۹۱ قیمت درج نہیں مترجم کے پتے ' ذوالفقار گنج لدھیانہ پنجاب سے مل سکتی ہے)

انگریزی حکومتوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں جو نفرت اور حقارت پیدا ہوگئی ہے وہ بالکل ظاہر ہے - آزادی اور حریت کا جو جوش اور ولولہ اہل ہند میں پیدا ہو گیا ہے وہ ایسا نہیں کہ آسانی سے سرد ہو سکے ' انگریز مفکرین اس کو محسوس کرتے ہیں چنانچہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے ایک رسالہ (The Other Side of The medal) کے نام سے لکھا ' جس میں اس نے بڑی حد تک ان اسباب وعلل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جن کی بنا پر ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہو گئی ہے - مصنف نے ہندوستانیوں کے ان افعال اور حرکات کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بنا پر انگریزوں کو شرمناک اور ناقابل بیان ظلم و تعدی اور خون ریزی و غارت گری سے کام لینا پڑا - مصنف نے مختلف واقعات اور حادثات کو لے کر اس عمدگی سے کتاب کو مرتب کیا ہے کہ اس کی سخن گستری کی داد دینی پڑتی ہے ' اس نے بہت کم طرف داری کو ظاہر ہونے دیا اور آخر میں صاف لکھ دیا کہ جب تک انگریزی حکومت اپنے مظالم کا کفارہ نہ دے حالات نازک سے نازک تر ہوتے جائیں گے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات تیز تر ہوتے جائیں گے - کفارہ سے مراد فاضل مصنف کی یہ ہے کہ انگریزی حکومت اپنے قبضہ و اقتدار کی بندش ڈھیلی کردے اور ہندوستان کو زیادہ دنوں آزادی سے محروم نہ رکھے - ان کا خیال ہے انگریزی حکومت اور ہندوستانی مجاہدین دونوں بڑی حد تک تھک چکے ہیں اور دونوں کے دلوں میں سمجھوتے کے آثار پائے جاتے ہیں - کتاب کے تین حصے ہیں پہلا غدر ' دوسرا ' غدر کے اثرات ' تیسرا خاتمہ یا نتیجہ - ترجمے میں بعض غیر اہم حصے حذف کردئے گئے ہیں - ترجمہ پاک صاف ہے - مصنف کے خیالات کی ترجمانی عمدگی سے ہوئی ہے ' کہیں کہیں زبان اور قواعد کی غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً

"اگر ہم نے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں رکھنا ہے" صفحہ ۱۰۱
" دیسی باشندوں کے درمیان رہائش بنائیں " صفحہ ۱۰۰

شروع میں مولوی عبدالرحیم خان پوپلزئی (پشاور) کا مقدمہ ہے جس میں کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کتاب کا نہایت مختصر خاکہ بھی درج کیا گیا ہے —

(چ)

مذہب و اخلاق

ملفوظ کبیر

مترجمہ مولانا مفتی محمد ابراہیم بدایونی ۔ دو حصے ، صفحات حصہ اول ۱۴۸ حصہ دوم ۱۹۷ بڑی تقطیع قیمت فی حصہ ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ۔ مولوی سید قادر بادشاہ صاحب مشائخ ۔ پٹن ضلع اورنگ آباد (دکن)

حضرت غوث اعظم سید عبد القادر جیلانی (رح) مسلمانوں کے اکابرقوم اور ابطال روزگار سے ہیں ۔ دنیا کی تقریباً ہر اسلامی آبادی میں ان کے عقید تمند ہیں ۔ ان کے مواعظ کا مجموعہ ملفوظ کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ ایک مدت ہوئی کہ اس کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ شایع ہوا تھا لیکن اب نہ تو ترجمہ ملتا ہے اور نہ اصل کتاب کے نسخے آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ مولوی سید قادر بادشاہ صاحب قادری مشائخ کے خاندان میں اس کا ایک نہایت قدیم اور صحیح نسخہ تھا ۔ انہوں نے اس کا اردو ترجمہ مولوی مفتی ابراہیم صاحب بدایونی سے کرایا اور خود اپنے خرچ سے طبع کرکے شایع کیا ہے ۔ دو حصے چھپ چکے ہیں دو زیر طبع ہیں ۔ پہلے دو حصوں میں ۴۲ خطبے ہیں اردو ترجمہ کے مقابل عربی متن بھی ہے ۔ ترجمہ اچھا ہے جو لوگ حضرت غوث اعظم کے پاکیزہ نصائح اور مواعظ سے مستفید ہونا چاہتے ہیں وہ ضرور اس کا مطالعہ کریں —

(چ)

متفرق

میں نے ایک کرور روپیہ کیسے کمایا

اصل انگریزی کتاب کے مصنف مسٹر مان تیگ وہ ذات شریف ہیں جنھوں نے دھوکے سے مہاراجہ کشمیر کو دھڑی دھڑی کرکے لوٹا تھا - مہاراجہ بہادر پیرس کے ایک ہوٹل میں مسزرابنسن کے ساتھہ عیش و نشاط میں مشغول تھے کہ مان تیگ صاحب اس مکار عورت کے شوہر کے روپ میں اس خلوت خانۂ عیش میں داخل ہوے - مہاراجہ صاحب کے اوسان خطا ہوگئے اور انھوں نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی غرض سے ریاست کشمیر کی پورے ایک سال کی آمدنی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ (یعنی ۲۲ لاکھہ روپیہ) مسز رابنسن کے جعلی شوہر کے حوالے کردیا ! چند سال کے بعد یہ سارا قصہ عدالتی تحقیقات کے دوران میں طشت از بام ہوا - اس وقت مسٹر مان تیگ کے جوہر کھلے اور اهل هند کو بھی ان سے روشناسی کا شرف حاصل ہوا - لیکن حقیقت میں یہ شور انگیز واقعہ ان کی عجیب و غریب سوانح عمری کی محض ایک فصل ہے - ورنہ اس مصروف زندگی میں معلوم نہیں کتنے روز و شب ایسے گزرے جن میں وہ ضرورت سے زیادہ روپے والوں کو طرح طرح سے مفلس بنانے کی مفید خدمت انجام دیتے رہے - فریب دہی اور جعلسازی کے فن لطیف میں انھیں ایک مجتہد کا مرتبہ حاصل ہے اور اسی غیر معمولی ذہانت کی بدولت بے حساب دولت کما چکے ہیں - آخر میں اس " بے قاعدہ " اور خطرناک ترک تاز کو چھوڑ کر غالباً کسی دوسرے نام سے انھوں نے فریب کاری کا باقاعدہ پیشہ اختیار کرلیا - یعنی کسی حکومت کے محکمۂ سیاسیات میں ملازم ہوگئے اور اس حفظ ماتقدم کے بعد اپنے گذشتہ کارناموں کو کتاب کی صورت میں شائع کردیا —

یہ دلچسپ اور سچی آپ بیتی ' جس قدر حیرت انگیز ہے اسی قدر سبق آموز ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یورپ علم و فن کے

دوسرے شعبوں میں اہل ایشیا سے فائق ہے ' اسی طرح اس کی عقل و ذہانت ' جرم و گنہ گاری اور فریب و شیطنت میں بھی ایشیا سے کئی میدان آگے نکل گئی ہے - کتاب میں انسانی زندگی اور اخلاق کے تیں بدترین دشمن ' یعنی زنا کاری ' قمار و نشہ بازی ' نئے نئے پیرایوں میں لوگوں کو تباہ کرتے نظر آتے ہیں - اسی کے ساتھہ یہ تصریح بلکہ تنبیہ کردینی ضروری ہے کہ یہ مغربی تہذیب کا صرف تاریک رخ ہے - نیز یہ کہ ہندوستان کے قدامت پسند حضرات جو ان واقعات کو اہل یورپ کی بے دینی اور بداخلاقی کے ثبوت میں مزے لے لے کر بیان فرماتے ہیں ' وہ اپنے حالات اور تاریخ پر بھی نظر ڈال لیا کریں تو غالباً زیادہ مفید و صحیح راے قائم کرسکیں گے ' —

انگریزی سے اس کتاب کو سید محمدعمرصاحب (حسنی) نے اردو میں ترجمہ کیا ہے - بعض حصے ایسے ہیں کہ جو لوگ یورپ کے تمدن اور طرز معاشرت نیز بیان کے طریقوں سے واقف نہیں ' وہ اچھی طرح مطلب نہ سمجھہ سکیں گے - لیکن جو باتیں صاف اور صریحی ہیں وہی کچھہ کم دلچسپ نہیں ہیں - اردو ترجمہ شیخ ضیاءالحق‌صاحب (سابق مدیر روزنامۂ پیشوا) نے بہت اچھا چھپوا دیا ہے اور شیخ‌صاحب موصوف سے ہاپوڑ (یوپی) کے پتے پر دو روپے میں مل سکتا ہے ' — (۲)

مشاہدات سائنس مولفہ سید‌محمد‌عمر‌حسنی‌صاحب -

(قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد)

سید محمد عمرصاحب نے علی گڑہ میں تعلیم پانے کے بعد جرمنی اور جاپان تک دھاوا کیا اور وہاں اینجینیرنگ اور دوسرے علوم کی علمی اور عملی تعلیم حاصل کی - غیر ممالک سے واپس آنے کے بعد وہ نچلے نہیں بیٹھے اور کچھہ نہ کچھہ برابر کام کرتے رہے - انہیں مطالعہ اور لکھنے کا ابتدا سے شوق ہے اور اپنے مفہوم کو اردو زبان میں ادا کرنے کا اچھا

سلیقہ رکھتے ہیں —

مشاہدات سائنس جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سیدصاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق سائنس سے ہے - یہ مضامیں جن میں تحت‌الثریٰ کی سیر سے لے کر توپ کے گولے تک اور بچوں کی نشو و نما سے نظام شمسی تک کی جولانیاں نظر آتی ہیں بہت دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں ' اگرچہ بعض مضامین کا عام زبان میں بیان کرنا مشکل تھا لیکن قابل مولف نے بڑی خوبی سے اس کام کو سر انجام دیا ہے - آخر میں انگریزی اصطلاحات کے مترادفت اردو زبان میں درج کر دئے ہیں - یہ بہت اچھا کیا ہے - کتاب اچھی چھپی ہے اور موزوں تقطیع پر ہے —

اردو کے جدید رسالے

پاسباں

(اڈیٹر لطیف انور صاحب گورداسپوری - گورداسپور - چندہ سالانہ ساڑھے تین روپے)

—

اسی سال ماہ اگست میں گورداسپور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے پنجاب میں شاید ہی کوئی ایسا ضلع باقی رہ گیا ہو جہاں سے دو ایک اردو رسالے نہ نکلتے ہوں - اس شوق کی داد دینی پڑتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل پنجاب کو اردو سے کس قدر محبت ہے - رسالہ زیادہ تر ادبی ہے اور نظم و نثر دونوں سے تفریح کا سامان مہیا کیا گیا ہے - عام اردو رسالوں کے مقابلے میں کوئی خاص امتیازی بات نہیں ہے —

آئینہ

(اڈیٹر محمد اسحاق صاحب - کلکتہ نمبر ۱۱ هرن باڑی لین سالانہ چندہ دو روپے)

یہ ماہانہ رسالہ مصور ہے اور ماہ اکتوبر سے کلکتہ سے شایع ہوا ہے - اگر چہ عنوان پر علمی ' ادبی ' تاریخی ماہوار رسالہ لکھا ہے لیکن پہلے' نمبر میں صرف چند ادبی مضامین ' فسانے اور نظمیں ہیں - لیکن رسالہ سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور دلچسپ ہے - کلکتہ سے ایک ایسے رسالے کا نکلنا مغتنمات میں سے ہے اور اس قلیل چندے پر قابل قدر ہے —

یادگار

(اڈیٹر نیر صاحب بی - اے - لاہور - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ خالص ادبی رسالہ ہے اور مصور ہے - ادب سے ہمارے رسالوں میں عام طور پر جو مراد لی جاتی ہے یعنے نظم اور نثر کے ایسے مضامین جو دلچسپ ہوں اور جن کا مطالعہ دماغ پر بار نہ ہو اور تھوڑی دیر کے لئے دل کا بہلاوا ہو جاے ' وہ اس رسالے میں سب موجود ہیں - لکھائی ' چھپائی اور ترتیب کے اعتبار سے خوشنما ہے —

فانوس

(اڈیٹر سردار علی احسن ونذیر احمد ام - ایس - سی - لاہور - سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے)

اس میں غزلوں ' نظموں اور فسانوں کے ساتھ علمی مضامین بھی ہیں عمر خیام کی ایک رباعی کو تصویر میں دکھایا گیا ہے - مضامین کے اعتبار سے رسالہ بہت اچھا اور دلچسپ ہے اور کم خرچ بالانشین ہے - بالکل حال ہی میں یعنے ماہ نومبر سے شایع ہونا شروع ہوا ہے —

دو جرمن رسالے

(۱) DIE WELT DES ISLAMS (دنیاے اسلام)

جرمنی کے دارالسلطنت برلن میں ایک انجمن عرصہ سے قائم ہے جس کا نام ہے " الجمعیتہ الالمانیہ ' المعارت الاسلامیہ " انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے متعلق ہر قسم کے تمدنی ' مذہبی ' تجارتی اور ادبی مسائل پر علمی تحقیق کو ترقی دے - اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی صورت یہ کی گئی ہے کہ علوم مشرقی کے ایک کتب خانہ کے قیام کے علاوہ اراکین انجمن کے سامنے تقریریں کرائی جاتی ہیں اور ایک سہ ماہی رسالہ " دنیائے اسلام " کے نام سے شائع کیا جاتا ہے —

جنوری سنہ ۳۲ ء کا " دنیائے اسلام " ہمیں تبصرہ کے لئے وصول ہوا ہے - اس کے اڈیٹر پروفیسر کامپف مایر ہیں جن کا شمار جرمن مستشرقوں کی پہلی صف میں ہوتا ہے - ان کی ادارت رسالہ کے اعلیٰ معیار کی کافی ضمانت ہے اور یہ بغیر کسی شبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ جرمن زبان میں Der Islam کے بعد یہ اپنی قسم کا بہترین رسالہ ہے - اس میں مضامین زیادہ تر ادب سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسرے جرمن سہ ماہی رسالوں کی طرح اپنی زبان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جاتا ہے —

اس نمبر میں تبصروں کے علاوہ تین مضامین ہیں شروع میں مصر کے نوجوان اور ہونہار ادیب محمود تیمور کے حالات زندگی ہیں اور اس کے بعد محمود تیمور نے اپنے افسانوں کے مجموعہ پر جو مقدمہ لکھا ہے اُس کا جرمن ترجمہ ہے - اس مقدمہ میں عربی افسانہ نویسی کی تاریخ اور تدریجی نشو و نما پر بہت گہری نظر ڈالی گئی ہے - ۳۶ صفحات میں عربی افسانے کی پوری تاریخ اس سے بہتر طریقہ سے پیش کرنا مشکل ہے - مقدمہ کے بعد محمود تیمور کی چودہ مصری کہانیوں کا ترجمہ ہے ' یہ مختصر کہانیاں خود مصنف کے خیال کے مطابق اُس کی افسانہ نویسی

کا بہترین نمونہ ہیں - ان سے اس کے انداز تحریر کا اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے - محمود تیمور پر روسی افسانہ نگاروں اور خصوصاً چیخوف کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے —

دوسرے مضمون میں شامی ادیب نعیمی نے اپنی سوانح عمری آپ دلچسپ پیرائے میں لکھی ہے - جس میں اس نے بتایا ہے کہ وہ کہاں تک امریکی اور روسی ادب کا رہین منت ہے —

تیسرا مضمون سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے بہت اہم ہے - اس میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ بالشویک تحریک کو عرب اور خود روس کے اسلامی علاقوں میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بالشویک پروپیگنڈے کو اسلامی دنیا میں کس حد تک کامیابی حاصل ہو رہی ہے - یہ ایسا موضوع ہے جس پر صحیح معلومات بہت کم ہیں اور جو کچھ معلومات ہیں وہ زیادہ تر یک طرفہ بیانات پر مبنی ہیں - اگر اس تحریر کو قابل اعتبار مانا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بالشویک خیالات کا عربوں ہی پر نہیں خود روسی مسلمانوں پر ابھی تک کوئی خاص اثر نہیں ' وہ اشتراکیت اور اشتمالیت کے اصولوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے - یہ سب کچھ صحیح ہے کہ فلسطین کے علاقے میں بہت سے نوجوان اس تحریک سے متاثر ہیں ' ادھر روس ' حجاز اور یمن سے تجارتی تعلقات بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اور روسی تجار اور روسی مبلغوں میں ہمیشہ فرق کرنا بہت مشکل ہے' مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم اب تک حجاز اور یمن کے بادشاہوں کو اس میں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ بالشویک خیالات ان کے ملکوں میں نہ پھیلنے پائیں - وہ سستا سامان خوشی سے خرید لیتے ہیں مگر روسی گماشتوں کو کسی قسم کی تبلیغ واشاعت نہیں کرنے دیتے - یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ صورت کب تک قایم رہ سکے گی —

رسالہ کے مالک کا پتہ یہ ہے :

Arthur Collingon, G. M. B. H., Berlin N. W. F.

(ممم)

۲　MOSLEMISCHE REVUE　(مسلم ریویو)

یہ رسالہ برلین سے مولوی صدر الدین صاحب اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کی ادارت میں سال میں چار مرتبہ شایع ہوتا ہے ۔ اس کا مقصد تبلیغ اسلام ہے ۔ اور انداز کم و بیش وہی ہے جو انگریزی رسالہ " اسلامک ریویو " کا جو ووکنگ سے شایع ہوتا ہے —

اکتوبر سنہ ۳۲ ع کے نمبر میں جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے صرف دو مضامین ہیں ۔ ایک تو ڈکٹر عبداللہ صاحب کا خطبہ " اسلام اور تلوار " پر اور دوسرا ہر انٹون ہارٹ مان کا مضمون " حکمت درویشان " کے نام سے ۔ ڈاکٹر عبد اللہ صاحب نے اپنے خطبے میں اسلام پر سے یہ الزام ہٹانے کی کوشش کی ہے کہ وہ تبلیغ کے لئے تلوار کے استعمال کی اجازت دیتا ہے ۔ ہرانٹون ہارٹ مان نے بعض اسلامی تعلیمات کو درویشوں کی زبان کے ذریعہ اچھے طریقہ سے ادا کیا ہے ۔ رسالہ کی قیمت چار مارک (تقریباً چار روپے) سالانہ ہے اور ملنے کا پتہ یہ ہے

Briennerstrasse 7, moschee, Berlin - Wilmersdorf

نیرنگ خیال کا اقبال نمبر

(قیمت دو روپے)

سر محمد اقبال مدفیوضہم نے اپنی شاعری کی بدولت وہ شہرت و امتیاز حاصل کیا ہے کہ ان کے کلام کی تفہیم و اشاعت میں جس قدر سعی کی جائے مشکور ہوئے بغیر نہ رہے گی ۔ اس سلسلے میں ' لاہور کے مشہور رسالے ' نیرنگ خیال نے اپنی دو اشاعتیں یک جا کرکے " اقبال نمبر " کے نام سے ۲۰۸ صفحہ کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے جس میں حضرت اقبال کے حالات زندگی اور شاعری پر ۴۲ مضامین نظم و نثر درج ہیں ۔ یہ سب تنقید کی بجائے تحسین کا پیرایہ رکھتے ہیں اور بے شبہ ان کا ممدوح ایسا ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے بجا ہے ۔ اس کے ساتھ چونکہ ہر لکھنے

والے کا خیال اور طرز بیان جدا ہے' لہذا اتنے بڑے مجموعے میں کافی دلکشی اور تنوع کا سامان موجود ہے - منشی محمدالدین صاحب (اڈیٹر اخبار "کشمیری") نے اقبال کی مختصر سوانح عمری تحریر کی ہے - مالک رام صاحب ایم اے نے مثنویات اقبال پر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کے فاضلانہ مضمون کا بہت خوبی سے اردو میں ترجمہ کیا اور جابجا اصل فارسی اشعار کا اضافہ کردیا ہے - اسی طرح پروفیسر نکلسن کے پیام مشرق پر انگریزی تبصرے اور خود سرمحمد اقبال کے ایک خط موسومہ پروفیسر موصوف' کے ترجمے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں - مگر غالباً سب سے پرمغز اور تازہ مضمون وہ ہیں جو مولانا اسلم جیراج پوری اور " چودھری " (محمد حسین صاحب ؟) نے حضرت اقبال کی تازہ ترین کتاب " جاوید نامہ " پر تحریر کئے ہیں - یہ نظم حقیقت میں دنیائے ادب' کم سے کم اسلامی اقوام کی شاعری میں اقبال کے حکیمانہ کلام کی ایسی یادگار ہے کہ نسل ہا نسل تک اس کے اثرات محو نہ ہوں گے —

متعدد تصاویر سے اقبال نمبر کی زینت دوبالا ہوگئی ہے اور مجموعی طور پر یہ رسالہ اتنا عمدہ اور اس قدر ارزاں ہے کہ حضرت اقبال کے ہر مداح و قدر شناس کے پاس محفوظ رہنا چاہئیے — (۲)

اعلان

آئندہ سے الہ آباد کے خریداروں کو رسالہ اُردو منیجر صاحب کتابستان الہ آباد سے ملا کرے گا - سالانہ چندہ بھی اُن کو دیا جاسکتا ہے —

انجمن ترقی اردو کی کل کتابیں بھی کتابستان الہ آباد سے مل سکتی ہیں —

منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی ۔ حجم کم از کم ایک سو صفحے ہوگا —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی ۔ اے ' آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

(باہتمام محمد صدیق حسن ملینجر انجمن ترقی اردو پریس ' اُردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)